خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۶۳ تا ۶۸

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ

جرنل

۶۳ تا ۶۸

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ترسٹھ تا اڑسٹھ
قیمت : ڈیڑھ سو روپے

سالانہ : ۳۰۰ روپے (ہند)
۶۰ ڈالر (ایشیا)، ۱۲۰ ڈالر (دیگر ممالک)

۱۹۹۱ء

مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اردو دانشوری

تازہ دانشوری

بازیافت

اہم رسائل کا اشاریہ

اردو اکادمیاں

مشرقی کتابخانے

●●

حرفِ چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے کے لیے کوئی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر بھی گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔ ۱۹۹۱ء سے **جرنل** کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے، تاکہ اس سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشتملات سے بہت کچھ فائدہ ہوا، اس کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت نہ رکھے۔

لیکن —— صرف ایڈیٹر کیوں؟ اس کارِ خیر میں آپ بھی برابر کے شریک کیوں نہ ہوں۔ آپ کی نظر سے بھی اچھی چیزیں گذرتی رہتی ہوں گی، اصلاً یا سہی ان کے حوالے ہی ہمیں بھجوا دیں۔

—— ع ب

تشکر

خدابخش لائبریری جرنل نمبر ۵-۶۲ میں شامل کچھ مضامین کے مآخذ کا حوالہ نہیں دیا جاسکا تھا۔ معذرت کے ساتھ ان رسالوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے:۔

۱) کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟ ــــــ ہماری زبان، ۲۲ اگست ۱۹۸۹ء

۲) عصر حاضر میں ادب کا کردار ــــــ صحیفہ، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۰ء

۳) چینی زبان کے الفاظ قرآن میں ــــــ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء

۴) اسلام اور ہندومت کی بعض مشترک تعلیمات ــــــ معارف، اپریل ۱۹۴۲ء

۵) ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ ــــــ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۰ء

۶) استنبول کے کتبخانے ــــــ معارف، ستمبر ۱۹۵۲ء

۷) بروصہ کے کتبخانے ــــــ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۱ء

ہندستانی مسلمان

○ ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ○———

ادارہ تحقیقات اردو اور خدا بخش لائبریری

کے تعاون سے یہ مقالہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ مرحوم

قاضی عبدالودود دونوں کو ملانے والی سنہری کڑی تھے۔

ان کی یاد میں یہ اشتراک ہنوز جاری ہے۔

ــــــ ادارہ

انتساب

اپنے نانا مرحوم مولوی مجید حسن

مالک اخبار "مدینہ" بجنور اور نانی

مرحومہ کنیز فاطمہ کے نام جن کی آغوشِ

شفقت میں میں نے حب الوطنی

کا پہلا سبق سیکھا۔

GOVERNOR OF WEST BENGAL

RAJ BHAVAN
CALCUTTA
700 062

ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں سبھی فرقوں اور تمام ہی طبقوں نے گرم جوشی سے حصّہ لیا۔ اس جامع تحریک کے تمام پہلو ہر ایک کی نظر میں نہیں رہتے۔ محترمہ عابدہ بیگم نے بڑی محنت سے جو مواد جمع کیا ہے اس سے متعدد اہم واقعات منظرِ عام پر آسکیں گے اور بہت سی مسلم خواتین کی خدمات کا مناسب اعتراف ہو سکے گا۔

ہندستانی جنگ آزادی کے تمام طالب علموں کے لئے یہ کتاب نہایت اہم اور مفید ثابت ہوگی۔

(سید نور الحسن)
۱۰ر اپریل ۱۹۹۰ء

پیش لفظ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی کتاب "ھندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ" کا مسودہ پڑھنے کا موقع ملا۔ بڑی خوشی ہوئی پڑھ کر۔ اس کتاب میں ان ۲۰ خواتین کے سوانحی خاکے شامل ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر، تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت اور پھر قومی جد و جہد کے آخری مرحلے میں حصّہ لیا۔ یہ ایک مفید کام ہو گیا جو حوالے کی کتاب کا کام دے گا کہ، اس میں بہت سی ایسی شخصیتوں اور ایسے حقائق پر روشنی پڑتی ہے جن سے ہم بہت کم واقف تھے۔

قومی تحریک پر اردو میں یوں بھی بہت کم مواد ہے، اور اردو دانشور نے اس جد و جہد میں قوم کو جو کچھ دیا ہے (اور ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کے مطالعہ میں آنیوالی یہ خواتین بھی اسی طرح اردو سماج سے متعلق ہیں)، خود اردو داں قارئین کو ان کے بارے میں یاددہانی کی ضرورت بھی ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں قومی جد و جہد کے اس عظیم اصول کو بھی پختگی ملے گی۔ —— یعنی مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا اصول —— جس پر کم فہم لوگوں کی طرف سے آج بھی اعتراض ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خواتین کی قدم سے قدم ملا کر ہندستان کی آزادی کے لیے شاندار جد و جہد خود بخود ان اعتراضات کا ایک مثبت جواب بنجاتی ہے۔

عرفان حبیب
پروفیسر شعبۂ تاریخ
علیگڑھ

ترتیب

ہندستان کی جنگ آزادی میں

مسلم خواتین کا حصہ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین
ریڈر ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو

ورق جب اس کے اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

مہاتما گاندھی نے کہا تھا "قومی جہدِ آزادی کی تاریخ ہندوستانی خواتین کے تذکرے کے بنا مکمل نہیں ہو سکتی"۔ زیرِ نظر اوراق میں مسلم خواتین کی جہد آزادی میں شرکت کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اس کا بنیادی مقصد آزاد ہندوستان کی نئی نسل میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ جس طرح ہماری جنگِ آزادی چند مستحکم اصولوں پر مبنی اور مشترک تھی اسی طرح ہماری آزادی بھی ایک قیمتی مشترک ورثہ ہے جس کی حفاظت ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں اور قوموں کے گمنام مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کی بازیافت اور انھیں ان کا مناسب مقام دینا ہمارا اولیٰ فریضہ ہے۔ امید ہے کہ یہ بازیافت قومی یک جہتی کی جانب بھی نمایاں پیش رفت ہوگی۔

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ" کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ان چند محب وطن اور بہادر خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے ملک کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملی طور پر حصّہ لیا۔

ہندوستان میں انگریز بحیثیت سوداگر آئے، ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ان کی کوٹھیاں بنیں لیکن اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا

آفتاب پورے جاہ وجلال کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ جیسے جیسے مغلیہ سلطنت کی چھاؤں ڈھلنے لگی سات سمندر پار کے ان مسکین صورت انسانوں کے سائے بھی لمبے ہوتے چلے گئے انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی و اودھ کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا تو ملک کے طول وعرض میں ایک آگ سی لگ گئی ۱۸۵۷ء میں سارا ہندوستان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس انقلابی جدوجہد میں ہندوستان کا چپہ چپہ ان کے لئے دوزخ بن گیا۔ اپنے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین نے بھی اس انقلابی دور میں غیرت وحمیت، بہادری وسرفروشی اور ایثار و قربانی کے دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد کے بعد جو ہندوستانی عوام کے غیر منظم ہونے کے سبب ناکام ہوئی، انگریزوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ غیر مسلموں کو ان کی طرف سے بدظن کیا گیا اور نئی سامراجی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی حالت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ نتیجے میں عرصۂ دراز تک مسلمانوں پر ایک جمود و بے حسی کی کیفیت طاری رہی۔ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کی کم وبیش یہی حالت تھی۔

سلطنتِ عثمانیہ جیسی عظیم و پرشکوہ حکومت بھی روبہ زوال تھی یہاں کا سارا معاشی نظام اور تجارتی کاروبار یوروپی اقوام کے ہاتھ میں تھا۔ جگہ جگہ بغاوت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں خود ترکوں میں سلطان کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

لیکن پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹) کے بعد جب سامراجی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے آپس میں بانٹ لئے تو اسلام کے اس زوال پذیر دور میں شیرازہ بندی کے لئے عہدِ رفتہ کی یاد ہی ایک واحد اور مضبوط رشتہ ثابت ہوئی۔ رہنمایانِ قوم نے ان جذبات کو قومی وملی اجتماعی خدمات کے لئے تعمیری پہلوؤں سے جوڑا، مسلمانوں کو درس دیا گیا کہ وہ اپنا ملی اتحاد اور تشخص قائم رکھنے کی خاطر اپنا شاندار ماضی نگاہ میں رکھیں۔ ہندوستان میں خلافت تحریک نے برطانوی سامراج سے

زبردست مورچہ لینے کا عزم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا "مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے، تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔" اُدھر گاندھی جی جنگ کے خاتمے پر رولٹ ایکٹ اور جلیان والا باغ کے خونی حادثوں سے انتہائی ناامید تھے۔ مسلمانوں کا اضطراب وہ سمجھ رہے تھے ان کی دانست میں ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا۔

تحریکِ خلافت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد غیر حقیقی مفروضے تھے نیز اس کا اصل مقصد اسلامی ممالک کی ایک عظیم فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اسلامی اقدار پر خصوصی زور دینے کے سبب یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئی وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا سوال ہے گاندھی جی اور دوسرے ممتاز ملکی رہنما یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ تحریکِ خلافت کا اصل نشانہ سامراجی طاقتیں تھیں، خلافت کا مسئلہ محض علامتی تھا۔ پان اسلامزم ایک مذہبی تصور تھا، سیاسی نہیں۔ اس کا بنیادی مقصد مسلم ممالک میں مذہبی معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کرنا تھا اور جہاں جہاں مسلم و غیر مسلم آبادی مشترک تھی وہاں ان میں اشتراکِ عمل پیدا کرنا اور انقلابی تحریکات کو منظم کرنا تھا تاکہ مغربی سامراج سے زبردست ٹکر لی جاسکے۔ یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہو سکتی کہ تحریکِ خلافت کا مقصد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ اپنے پان اسلامک مزاج کے ساتھ وہ قومی تحریک آزادی میں پوری طرح ضم ہو گئی تھی۔ اکثر مقامات پر مقامی کانگریس شاخیں، رضا کار جتھے، کسان سبھاؤں اور مرحوم رول لیگ اور ان کی سرگرمیوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ پنجاب میں جس طرح پریم سبھاؤں اور انجمن اسلام نے کام کیا اس سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا ؎

آئی ہیں آسماں سے چل کر وہ قوتیں
جو مسلم و ہنود کو شیر و شکر کریں

یہاں یہ یاد دلانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ کچھ پان اسلامی رہنماؤں نے کابل میں جو جلاوطن حکومت قائم کی تھی اس کے صدر راجہ مہیندر پرتاپ تھے اور ایک کابینہ درجے کے وزیر ڈاکٹر متھر اسنگھ تھے۔

یہ خیال بھی تاریخی اعتبار سے درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ بعد میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات تحریک خلافت کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے آرہ (بہار) میں بھیانک فساد ہوا تھا۔ گو شدھی تحریک کے اصل محرکات متعین کرنا بہت مشکل ہے تاہم ہندوستان پہونچتے ہی لارڈ ریڈنگ نے جو کردار ادا کیا اس کا جائزہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس الکشن کا کردار بھی اہم ہے جو سوراجسٹ موتی لال نہرو اور لبرلسٹ مالویہ اور چنتامنی کے درمیان ہوا۔ اس الکشن نے جس طرح ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دیا اس سے متعلق کاغذات ہوم ڈیپارٹمنٹ (پولیٹیکل) میں ۱۹۲۳ء کے بعد سے موجود ہیں اور جن سے لارڈ ریڈنگ کی حکمت علی پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ پنجاب میں جس حکمتِ عملی کے تحت زمینی اصلاحات کی گئیں وہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت کا بیج بونے کے لئے کافی تھیں۔

مندرجہ بالا مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مقصود ہے کہ تحریک خلافت قومی جنگِ آزادی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ولایتی سامان کا مقاطعہ، ترک موالات اور سامراجی استبداد کے خلاف اتحاد و یک جہتی کا جو دور شروع ہوا وہ تاریخ وطن کا ایک زرّین باب ہے۔ اس دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے وہ بڑے روح پرور تھے اس لئے تحریکِ خلافت سے وابستہ مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کو ایک مذہبی تحریک سے وابستہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا قافلہ آزادی جن جن مراحل سے گزرا ہر منزل کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اس منزل کا ہر ایک راہی ہماری ستائش و تعظیم کا مستحق ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قومی جہد آزادی کے اس موڑ پر بھی مسلم خواتین نے اپنے بھائیوں

کے دوش بدوش حصّہ لیا۔ تحریک عدم تعاون ہو یا انگورہ فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام خواتین ہر موقع پر پیش پیش رہیں، سودیشی کو عام کیا اور ولایتی کپڑوں میں آگ لگادی، خلافت فنڈ میں روپیوں اور زیور کے ڈھیر لگ گئے ملاحظہ ہو بطور نمونہ ضمیمہ (۱) جس سے پیرانہ سالی کے باوجود بی اماں (والدہ محمد علی) کے طوفانی دوروں، حکومت مخالف تقاریر اور چندے کی فراہمی کی کچھ تفصیلات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ خلافت کے ان چندوں سے گاندھی جی نے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے میں خلافت کے چندوں کا اہم کردار رہا ہے۔

تحریک خلافت کا بہر حال ایک منفی پہلو بھی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں جب کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تو ہندوستانی مسلمان کچھ عرصے کے لئے ششدر رہ گئے اور پھر کچھ عرصے بعد تحریک بھی سرد پڑ گئی۔ لیکن اس نے عوامی اتحاد و سیاسی بیداری کی جو فضا قائم کی اس نے کاروان آزادی کو ایک نئی جہت عطا کی گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں لکھا "اگر میں کوئی اوتار ہوتا اور میں یہ جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصّہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔"

کتاب کا دوسرا باب اُن خواتین کے تذکرے پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریکِ خلافت میں عملاً حصّہ لیا۔ بحیثیت مجموعی یہ سبھی خواتین پردہ نشین تھیں اپنے زمانے کے معاشرتی تناظر میں ان خواتین کا بیدار سیاسی شعور اور قومی سیاسی زندگی میں اُن کی شرکت قابلِ تحسین اور ایک انتہائی جرائت مندانہ اقدام تھی جس کا تصوّر بھی آج کے معاشرے میں مشکل سے ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) میں اکبری بیگم جیسی خاتونِ خانہ کے پختہ و بیدار سیاسی شعور کی ایک جھلک۔ قومی سیاست میں خواتین کے اثر و رسوخ کے بارے میں ایک برطانوی افسر سر ہرکورٹ بٹلر نے ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ

کو لکھا تھا کہ علماء اور خواتین ہندوستان میں انتہائی اہم اثرات کے حامل ہیں۔ جب تک ان دونوں کے بارے میں میری حکمت عملی کامیاب ہے مجھے سیاست دانوں کا کوئی خوف نہیں۔"

Butler to Lord Harding Jan. 16th, Butler Papers Mss. Eur. F 116/53/11. India Office Library, London Quoted in separate word by Hanna Papanek & Gail Minault P. 248.

کتاب کے تیسرے باب میں اُن مسلم خواتین کا تذکرہ ہے جو ۱۹۳۰ء کے نزدیک اور اس کے بعد کے زمانے میں براہِ راست گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیرِ اثر قومی محاذ آرائی میں شامل ہوئیں۔ ان خواتین کی اکثریت کالج یا اسکول کی فارغ التحصیل تھی اور یہ انڈین نیشنل کانگریس کے ہمہ جہت مقاصد، ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، دیہی ترقی، تعلیم بالغان، ہریجنوں کی فلاح و بہبود کے تعمیری منصوبے "عوامی رابطہ منصوبہ Mass Contact جیسے کاموں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہیں۔ وہ کھل کر عوامی جلسوں میں شریک ہوئیں، ولایتی کپڑوں اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دیا ان کی اکثریت قید و بند کی صعوبتوں کی تلخ چاشنی سے بھی نامانوس نہیں ہیں۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا واحد مقصد آزاد و متحدہ ہندوستان کا خواب تھا جو بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ ان خواتین میں سے اکثر نے بعد میں آزاد غیر مذہبی جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کے اس جائزے کو کسی بھی اعتبار سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسی دوسری مسلم خواتین رہی ہوں گی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔ خود جائزے میں جن شخصیتوں کو لیا گیا ہے وہ خاکے بی اماں اور بیگم حسرت موہانی کے علاوہ سبھی نامکمل ہیں۔ کہیں ابتدائی زندگی کے

حالات کا تذکرہ نہیں تو کہیں جنگِ آزادی میں شرکت کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہیں اس کی بڑی وجہ مواد کی کمیابی رہی ہے۔ جو حضرات اس سے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے تھے ان میں بہت سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں پُرانے اردو قوم پرست اخبارات ان تفصیلات کی فراہمی میں بہت کچھ معاونت کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو ضمیمے (۳)،(۴)،(۵) میں دی گئی چند اخباری خبریں لیکن افسوس کہ معتبر قوم پرست اردو اخبارات کے فائل ہندوستان میں بہت کم اور نامکمل ہیں، پاکستان میں موجود قوم پرست اخبارات ورسائل کے فائل ایثار و قربانی کی ان داستانوں میں اور بہت سے ناموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو بہرحال ایک مشکل اور طویل کام ہے اور کافی وسائل چاہتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اس نامکمل جائزے کی اشاعت کے بعد علم دوست اور قومی یکجہتی میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور تحریر فرمائیں گے کہ اس میں فلاں اہم شخصیتوں کے ناموں کا اضافہ ضروری تھا۔ یا فلاں خاتون کے متعلق دی گئی معلومات میں اس سے زیادہ اہم واقعات وحالات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور یوں ان بکھری ہوئی کڑیوں میں سے بہت سی کڑیوں کو مربوط کیا جا سکے گا۔ یہ تمام اضافے شکریے کے ساتھ کتاب کے انگریزی مسودے میں شامل کر لئے جائیں گے۔

"ہندستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی تیاری میں نہ صرف مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا بلکہ بہت سے افراد سے بذریعہ ملاقات نیز بذریعہ خط وکتابت معلومات حاصل کی گئیں۔ کچھ اہم معلومات "جمہور" کلکتہ اور "مدینہ" اخبار بجنور کے چند پرانے فائلوں سے دستیاب ہوئیں علاوہ ازیں Collected works of Mahatma Gandhi کی سبھی جلدوں سے بیش قیمت مواد حاصل ہوا۔

میں جناب پروفیسر نورالحسن صاحب گورنر مغربی بنگال کی انتہائی ممنون

ہوں جنھوں نے اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت فرمائی۔ میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی بھی شکر گزار ہوں جس نے کتاب کی تیاری کے لیے جزوی امدادی رقم مہیا کی اس سلسلے میں جن دیگر حضرات نے مواد کی فراہمی میں معاونت کی ان میں سے چند کے اسمائے گرامی کا خصوصی طور پر تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ شکریے کے دو بول نہ تو اُن کے پُر خلوص تعاون کا بدل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی میرے جذبۂ تشکر کے آئینہ دار ہیں اس کام میں معاونت کے لیے جناب اصغر علی انجینئر ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز بمبئی، ڈاکٹر بی این چوپڑا چیف ایڈیٹر فریڈم پروجیکٹ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ جناب پروفیسر عرفان حبیب ڈائریکٹر انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، جناب عابد رضا بیدار ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ، جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ، جناب انعام الکبیر، نائب آرکائوسٹ، نیشنل آرکائوز دہلی۔ جناب جے این گھیرا نائب کیپر (MASS) تین مورتی میوزیم لائبریری نئی دہلی، جناب کشن ترویدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگھرالیہ ہریجن آشرم احمد آباد جناب شہاب الدین لائبریرین جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ڈاکٹر کے کے سکینہ، اسٹیٹ پبلک لائبریری الہ آباد، پروفیسر نور الحسن خاں لائبریرین۔ جناب عشرت علی قریشی نائب لائبریرین، جناب ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری انچارج اردو سیکشن، ایس مقبول حسن اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب مہر الٰہی اسسٹنٹ لائبریرین کوچنگ سینٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی سابق ممبر راجیہ سبھا، جناب پروفیسر نذیر احمد پدم شری سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب پروفیسر عتیق صدیقی ڈائریکٹر سرسید اکاڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر شہریار، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بیگم کنور عمار احمد خاں علی گڑھ، بیگم قاضی عبدالغفار خاں

مرحوم علی گڑھ، بیگم سکینہ عمار حسن سابق ریڈر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب کوکب قدر ریڈر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی۔ سُرخ پوش مجاہد آزادی مرحوم خان غازی کابلی اور جناب عبداللطیف اعظمی ذاکر نگر دہلی کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں۔ میں پروفیسر احمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ او کالج لاہور کی علم دوستی کی خصوصی طور پر معترف ہوں۔ موصوف نے ضمیمہ الف کے لئے اخبار زمیندار کے وہ تراشے مہیا کئے جو میری دست رس سے باہر تھے۔ اس اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں جناب آغا جعفری ریڈر شعبۂ کامرس مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جو پُرخلوص تعاون مجھے حاصل رہا اس کے لئے میں تہہ دل سے اُن کی ممنون ہوں۔ کتابت کے لئے جناب حافظ عتیق احمد صاحب کی جانفشانی، لگن کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے۔ میں اپنے شوہر پروفیسر سمیع الدین شعبۂ کامرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بھی انتہائی شکر گزار ہوں جن کی معاونت کے بغیر اس کام کی تکمیل ناممکن تھی۔

مجھے امید ہے کہ میری اس ناچیز کاوش کو تحریک آزادی میں دلچسپی اور قومی یکجہتی میں اعتقاد رکھنے والے حلقوں میں سراہا جائے گا۔

عابدہ سمیع الدین

ریڈر شعبۂ سیاسیات

ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۷ر جون ۱۹۹۰ء

بابِ اوّل

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
ایک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

حضرت محل

۱۹۳۷ء میں مجاز مرحوم نے ہندوستان کی نوجوان عورت سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

لیکن ہندوستان کی ایک مایہ ناز دختر حضرت محل اس سے بہت پہلے یہ پرچم اٹھا کر قومی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ چکی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ مادرِ ہند نے طوقِ غلامی اُتار پھینکنے کے بعد بھی اپنی اس جیالی بیٹی سے نہ جانے کیوں ایسا تجاہل برتا کہ نہ کبھی برسہا برس کی پڑی تعصب کی گرد جھاڑ کر ان نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کا نام جنگِ آزادی کے پروانوں اور قومی یک جہتی کے متوالوں کی فہرست میں شامل ہو کر نئی نسل کی درسی کتابوں کی زینت بن سکا۔

انیسویں صدی عیسوی کا عہدِ وسطیٰ ہندوستانی تاریخ کا وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب سلطنتِ مغلیہ تیزی سے رو بہ زوال تھی، تاجر کی حیثیت سے آئے ہوئے انگریز کے قدم سرزمینِ ہند پر بحیثیت حکمراں پوری طرح جم چکے تھے۔ ہندوستانی راجے اور مہاراجے اپنی اندرونی ریشہ دوانیوں کے سبب لڑ بھڑ کر اتنا کمزور ہو چکے تھے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے تھے۔

لیکن "اکثر برسے ہوئے بادلوں میں بھی کچھ بجلیاں رہ جاتی ہیں" (نظارہ لکھنؤ بیگم حضرت محل نمبر ۲۸ اگست ۶۲ء)

بیگم حضرت محل بھی انگریزوں کے لئے ایک ایسی ہی بجلی ثابت ہوئیں جو اس دورِ انحطاط میں قطعی غیر متوقع تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عوام کے سبھی طبقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے طریقِ کار سے سخت نالاں

تھے۔کمپنی کا حلقۂ تجارت جب بڑھا تو جو نظریات مذہب، عزت اور دولت کے سلسلے میں عام کیے گئے وہ عوام کے لیے نہ صرف نئے بلکہ قطعی ناقابلِ قبول تھے۔جنرل بارلی کے وقت میں فوجیوں کے لیے جو نئے قانون بنے وہ ہندو مسلمان دونوں طرح کے فوجیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے والے تھے۔انھیں کے نتیجے میں ۱۸۰۶ء میں ویلور کی لڑائی ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس طرح ریاستوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔اس سے راجاؤں اور نوابوں میں شدید بے چینی پھیل رہی تھی۔

اعظم گڑھ کے مجاہدین کے ایک خط میں کہا گیا کہ" انگریزوں نے مال گذاری بڑھا کر انھیں برباد کر دیا ہے۔نیچے درجے کے لوگوں کا دعویٰ کرنے پر بھی انھیں عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا ہے جو باعثِ ذلت ہے۔تیل، افیون، کپڑے کی تجارت پر مکمل قبضے کے سبب تاجر برباد ہو رہے تھے۔ملازم پیشہ، دستکار، مولوی، پنڈت سبھی اپنی اپنی پریشانیوں کے سبب سرکار سے خفا تھے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ان ہی بچی کچھی حریت پسند جماعتوں کی انگریزی سامراج سے آخری بھرپور ٹکر تھی جسے سامراجی طاقت نے غدر کا نام دیا۔قومی آزادی کی اس لڑائی میں ہر طبقے ہر مذہب و ملت کے افراد شامل تھے انھوں نے وطنِ عزیز کی خاطر بڑی بہادری اور خلوص سے اپنی اپنی جانیں نذر کیں۔

دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے بغاوت کے شعلے بھڑکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

۴ فروری ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا، اور کمپنی کی فوج ۱۸۰۱ء اور ۱۸۳۷ء کے صلحناموں کو نظر انداز کرتی لکھنؤ میں زبردستی داخل ہو گئی اور معزول واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا تو کچھ عرصے کے لئے تو اودھ کے عوام بھونچکے رہ گئے اور پھر برافروختہ مؤرخین نے اودھ کے الحاق کو غدر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب مانا ہے۔سرجان کے الفاظ میں" انگریزوں کے ہاتھوں اس آخری ہندوستانی ریاست کی ضبطی کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اب کون محفوظ رہ سکتا ہے! اگر انگریز سرکار نے اودھ کے نواب جیسے اپنے وفادار دوست اور مددگار کی حکومت

چھین لی جس نے انگریزوں کی ضرورت کے وقت مدد کی تھی تو انگریزوں کے ساتھ وفاداری سے کیا فائدہ ہ؟" (بحوالہ پنڈت سندر لال: سن ستاون اردو ص ۵۵) پہلی بار اودھ کے عوام کو احساس ہوا کہ ان کے علاقے، ان کی عزت و وقار، ان کی زندگی سبھی کچھ غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں بک چکی ہے۔ اودھ میں علماء اور مجتہدینِ اسلام کی منظم جماعت موجود تھی۔ ایک سردار آغا مرزا نے جو کمبل پوش کے نام سے بھی مشہور تھے دو سو مجاہدین کے ساتھ محمدی جھنڈا بلند کیا لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے گرفتار ہوئے اور آغا مرزا کے ساتھ چودہ مجاہدین کو پھانسی دیدی گئی۔ اس کے بعد کمپنی کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا۔ پورے صوبۂ اودھ میں اشتہار تقسیم کیے گئے، اور ساتھ ہی عوام اور شاہی خاندان سے ہتھیار لینے کی پالیسی بھی عمل میں لائی گئی جس سے عوام اور بالخصوص علماء کے طبقے میں سخت ناراضگی اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

اودھ کے چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تمام افواج کو مچھلی بھون اور ریذیڈنسی میں جس کی تعمیر آصف الدولہ نے گومتی کے کنارے ایک اونچی جگہ پر کی تھی، جمع کر دیا۔ باغیوں کی جماعت تیزی سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی مقابلے کے لیے لارنس نے اپنی فوجوں کو شہر سے باہر فیض آباد روڈ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ ۳۰ر جون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ سے چھ میل دور چھوٹے سے گاؤں چنہٹ میں باغیوں اور انگریزی افواج کا مقابلہ ہوا۔ انگریزوں نے شکست کھائی اور لارنس نے اپنی فوجوں کو ریذیڈنسی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا۔ اور پورا شہر باغیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ انقلابیوں نے مچھلی بھون کے میگزین کو آگ لگا دی اور اس پر مکمل قبضہ کر لیا۔ مچھلی بھون پر قبضے کے بعد لکھنؤ اور گرد و نواح کی ساری انگریزی طاقت ریذیڈنسی کے حصار میں قلعہ بند ہو کر رہ گئی۔ ۳۱ر مئی اور ۳ر جون کے درمیان صرف اس حصہ کو چھوڑ کر پورا اودھ انگریزی حکومت کے چنگل سے نکل چکا تھا۔

اودھ کی سرحد نیپال سے ملی ہوئی ہے۔ سر ہنری لارنس نے خاص سفیر بھیج کر نیپال دربار کے وزیر اعظم سپہ سالار جنگ بہادر سے درخواست کی کہ آپ اس مصیبت

میں انگریزوں کی فوج کی مدد کیجیے۔

جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو ایک سربراہ کی تلاش تھی جو ان کے حوصلے بلند کر سکے۔ فوجی افسروں نے یکے بعد دیگرے شاہی خاندان کے چند سربرآوردہ افراد سے قیادت کی درخواست کی لیکن وہ ایک حضرت محل کی ذات تھی جس نے اس پُرآشوب زمانے میں قیادت کا بارِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جراٴت اور بہادری کا ثبوت دیا اور ان ہستیوں کی فہرست میں شامل ہو گئیں جن کے ہاتھوں آزادی کے شاندار قلعے کی خشتِ اول رکھی گئی۔

"۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب محمد خاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تختِ واجدی پر متمکن ہوئے۔ شہاب الدین اور سید برکات احمد رسالدار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گذرانی۔ ۲۱ ضرب توپ سلامی کی سر ہوئیں۔ شہر میں غلغلہ مسند نشینی ہوا۔" (کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ ص ۲۲۶) شہزادے کو محلاتِ شاہی، اکابر فوج اور مدبرین سیاست کے مشورہ کے مطابق تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن چونکہ برجیس قدر کی عمر اس وقت صرف چودہ سال کی تھی (مثنوی حُزنِ اختر تصنیف واجد علی شاہ) اس لیے حضرت محل ان کی مُختارِ کل بنیں اور اس طرح ہنگامی حالات کے تحت وہ انتخاب عمل میں آیا جس میں اُمرا سے زیادہ عوام کو دخل تھا۔ حضرت محل کے دوش بدوش لکھنؤ میں تحریکِ آزادی کے چلانے والے مولوی احمد اللہ شاہ، آزمودہ جنگ راجہ بینی مادھو سنگھ، راجہ مان سنگھ مدبّر راجہ جیالال جیسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں۔ بہمنی سرکار بہ جیبی کی رمز شناس یہ وہ تمام طاقتیں تھیں جن کا اس وقت اودھ میں دور دورہ تھا اور سوائے انگریزوں کے کوئی ایسا نہ تھا جو اس خود مختاری کا معترف نہ ہو۔ مُغلیہ تاجدار بہادر شاہ نے سفارت قبول کر کے مہر خطاب سے نوازا۔ (قیصر التواریخ ص ۲۴۲) پیشواؤں کے رہبر نانا راؤ نے پہلے وکیل بھیجا پھر خود تشریف لائے۔ گیارہ ضرب توپ سلامی ہوئی، ۱۷ پارچہ خلعت قبول کیا۔ (ایضاً ص ۲۵) فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان، جنرل بخت خاں روہیلہ، شفیع اللہ خاں رئیس نجیب آباد، ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ، مظہر علی خاں رئیس موانہ، عنایت اللہ خاں رئیس پیلی بھیت، غلام قادر خاں رئیس شاہجہان پور، بالا راؤ پیشوا اپنے اپنے

علاقے کے رئیس و حاکم یہ وہ افراد تھے جو توسل کے خواستگار بنے اور حسب مراتب سرکار برجیسی نے سب کا خیال کیا۔ (ایضاً) اور یوں ۱۸۵۷ء کے وسط سے جنگِ آزادی کا وہ درخشاں باب شروع ہوا جس نے سرفروشی حُبّ الوطنی ہند و مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی ایسی بے مثال یادگاریں چھوڑیں جو نئی نسلوں کے لیے باعثِ افتخار بھی ہیں اور نمونۂ عمل بھی۔

شہر میں منادی ہوئی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ دلی کا حکم برجیس قدر کا۔"
دوسرے روز تمام اہلِ وثائق پنشن یافتہ قدیم و جدید درِ دولت پر حاضر ہوئے اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے۔ برجیس قدر کے نام کا سکّہ بھی جاری ہوا۔ حسب ذیل شعر اس پر کندہ تھا ؎

نصاریٰ پہ قہرِ خدائی ہوا
جواں سال سُلطانِ لکھنؤ ہوا

(انیس فاطمہ بریلوی ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۲۹)

شہزادے کے نام سے مندرجہ ذیل فرمان جاری ہوا۔

فرمانِ برجیس قدر والی اودھ ۱۸۵۷ء

"سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین و دھرم دوسرے عزت و آبرو تیسرے جان اپنا و اپنوں کی چوتھے مال و اسباب۔ یہ چار چیزیں عملداریٔ ہندوستان میں بچی رہتی ہیں۔ اس عملداری میں کوئی دین و دھرم کو نہیں ٹوکتا ہے۔ ہر ایک مانس اپنے دین و دھرم پر رہتا ہے۔ عزت و آبرو ہر ایک مانس کی موافق اس کی درد کی رہی ہے۔ اشراف کسی قوم کا ہو سید اور شیخ اور مغل اور پٹھان مسلمانوں میں اور برہمن اور چھتری اور ویش اور کالستھ ہندو موافق اپنے اپنے رتبہ، عزت و آبرو رکھتے ہیں۔ کوئی پاجی جیسے چوہڑے

چمار اور دھانک اور پاسی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ اور کسی اشراف اور پاجی کی اس عمل داری میں جان نہیں ماری جاتی اور کسی کا مال و اسباب بھی بغیر کسی جرم اور بڑے پاپ کے چھینا نہیں جاتا اور انگریز لوگ ان چار چیزوں کے بیری ہیں دین اور دھرم ہندو مسلمان سب کا کھونا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ سب لوگ کرسچن ہوں، نصرانی بن جائیں۔ ان کے عمل سے ہزاروں آدمی کرسچن ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ عزت و آبرو تمام اشراف کی اور چوہڑے چمار کی ان کے نزدیک برابر ہے بلکہ نواب اور راجہ کو کھنچوا بلاتے ہیں اور بے عزت کرتے ہیں جہاں جاتے ہیں وہاں عزت دار لوگوں کو پھانسی دیتے ہیں اور اُن کے زن و بچے کو مار ڈالتے ہیں اور عورتوں سے ان کی فوج کے لوگ بُرا کام کر کے سب کو بے حرمت کرتے ہیں اور سب مال و اسباب سب لوگوں کا گھروں کو کھود کر سب لے لیتے ہیں۔ کچھ نہیں چھوڑتے۔ بنیئے مہاجنوں کو جان سے نہیں مارتے ان کا مال لے کر اور ان کی عورتوں کو بے عزت کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہاں کے سب لوگوں سے ہتھیار لے لیتے ہیں جب وہ نہتے ہو جاتے ہیں تو جس کو چاہتے ہیں پھانسی سے یا گولی یا توپ سے باندھ کر مار ڈالتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بیدم کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بے عزت کرتے ہیں۔ بعض جگہ یہ فریب کرتے ہیں کہ زمینداروں سے وعدہ پیسہ معاف کرنے کا کرتے ہیں۔ یا جمع میں تخفیف دیتے ہیں اس مطلب سے کہ جب عملداری خوب بیٹھ جائے گی اور قابو میں سب آجائیں گے پھر جو چاہیں گے ان کا حال کریں گے، یا کرسچین کر لیں گے یا پھانسی دیں گے یا بے عزت کریں گے۔ بعض زمیندار احمق ان کے فریب میں آجاتے ہیں اور جو چتر اور ہوشیار ہیں وہ فریب نہیں کھاتے ہیں۔ اس واسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین و دھرم اور عزت و آبرو ناموس و جان اپنی و اپنے لوگوں کی اور اپنے مال و اسباب کا جس کو منظور ہو وہ انگریزوں سے لڑنے پر بالاتفاق فوج سرکار کے مستعد رہے اور ہرگز ان کے فریب میں نہ آئے۔ سرکار سے ان کی پرورش اور تخفیف ہو گی۔"

(بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی، جنگِ آزادی، اٹھارہ سو ستاون ص ۵۵۶۔۵۵۷
ہندی وار دو میں فرمان بجنسہٖ یہی ہے)

حضرت محل نے بارقیادت سنبھالتے ہی بھرتی کا اعلان کیا۔ تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری کیے کہ "ملک آبائی خدانے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرنگ لازم ہے باہم شریک ہوکر باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کردو۔ جوانکو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ (قیصر التواریخ۔ ص ۲۲۹)

تمام امورِ سلطنت کو حضرت محل ایک مشاورتی کمیٹی کی رائے سے طے کرتیں جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ غدر کے زمانہ میں ان کا قیام چولکھی میں تھا اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا (عبدالحلیم شرر۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۱۳۴) مجمع عام میں اور محاذ جنگ پر تلوار ہاتھ میں لیے اپنے پرجوش الفاظ سے وہ عوام اور فوج کے دلوں میں قربانی، حب الوطنی اور آزادی کا جوش بھر دیتی تھیں اور دوران جنگ فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔ فوجی سرداروں کی ایک میٹنگ میں انھوں نے کہا تھا: "دلی کی عظیم طاقتور سلطنت نے بڑے امید افزا وعدے کیے تھے اور دہلی سے جو مراسلات لکھنؤ پہنچے تھے وہ میرے دل میں خوشی کی لہریں دوڑا دیتے تھے لیکن کتنی جلد بادشاہ کو معزول کردیا گیا۔ سکھوں اور جاٹوں کو انگریزوں نے خرید لیا ہے اور مواصلات کا سلسلہ کاٹ دیا ہے — نانا فرنویس کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور لکھنؤ کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیئے؟ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ لکھنؤ میں پوری فوج موجود ہے لیکن عزم و ولولے سے خالی ہے۔ اگر فوج میں جانبازی کا عزم اور حب الوطنی کا ولولہ موجود ہے تو وہ عالم باغ پر حملہ کیوں نہیں کرتی؟ کیا فوج اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ برطانوی فوج کو مزید کمک پہنچ جائے اور وہ لکھنؤ کا محاصرہ کرلے۔ مجھے جواب دو تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

(CORNEGY'S INTELLIGENCE FOR DEPT, Secret Branch, 26th February 1858 No.223 News of 22nd December 1857, National Archives New Delhi)

حضرت محل سپاہیوں کو حوصلے سے زیادہ انعام دیتیں۔ معرکہ عالم باغ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلے میں علاوہ خلعت، رومال اور دوشالے کے "فرزند خاص" کا خطاب اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور کہا کہ

بعد فتح کے بہت سا روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کرونگی (قیصر التواریخ ص ۲۶۷)

انگریزوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کے تحت انھوں نے لکھنؤ شہر کے چاروں طرف دیوار بنانے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ منظور کیا۔ جب انھیں علم ہوا کہ نیپال کے رانا جنگ بہادر کو بعوض گورکھپور اور اودھ کے کچھ حصّوں کے خرید لیا گیا ہے تو انھوں نے فوراً رانا کو اپنی حمایت کے بدلے میں گورکھپور، اعظم گڑھ، آرہ، چھپرا اور صوبہ بنارس کی پیش کش کی۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی سے ان کے جنگی تدبّر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے انھوں نے انڈین رجمنٹ کے ان افسروں سے بھی رابطہ قائم کیا جو کانپور کی فوج میں انگریزوں کی طرف سے شریک تھے اور اُن سے یہ طے کیا کہ پہلے وہ ہوائی فائر کریں گے اور پھر اچانک اُن کا رُخ انگریزوں کی طرف موڑ دیں گے"۔

—S.N.Chanda
(Untold Stories, P. 11)

امرت لال ناگر لکھتے ہیں کہ "بیگم حضرت محل نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کا ایک فوجی گروہ (سنگٹھن) تیار کیا تھا۔ محلوں کی باندیاں ان کی نگرانی میں قواعد کرتی تھیں انھیں عورتوں نے جاسوس عورتوں کا بھی ایک گروہ تیار کیا تھا۔ اس طرح اس آپسی نفاق کے مایوس کن حالات میں بھی ایک ایک فرد کے دل میں بغاوت کا جذبہ تقریباً پونے دو برس تک اودھ میں برقرار رکھنا بیگم ہی کا کام تھا"۔

(امرت لال ناگر۔ غدر کے پھول ص۔ ۲۶۰)

" حضرت محل کے تدبّر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز ممّو خاں اور احمد اللہ شاہ کے حسنِ تدبیر نے انقلابی تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی کے سبب طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا وہ یکدم رخصت ہو گیا، جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بیکار ہو گئے تھے وہ صیقل کیے گئے۔ ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج کر تیغ بستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی (۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۳۱)

یہ وہ وقت تھا کہ پورا اودھ کوہ آتش فشاں شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا اور عوام باوجود بے سروسامانی اور تہی دستی کے ایک تہار و باجبروت طاقت کے مقابلے میں سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔ وہ اضلاعِ اودھ سے لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے

وہ اِس تخت پر اپنی جان نثار کرنے آئے تھے جس سے ان کو بدگمان بنایا جاتا تھا۔ حاکمِ وقت سے ایسی عقیدت اِس زمانے میں دلی کے بعد لکھنؤ میں ہی ملتی ہے جو بقول مولوی عبدالحلیم شرر ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ گاؤں اور قصبوں تک کی یہ حالت تھی کہ "قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں جس کا رقبہ صرف پون میل تھا لڑنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور گاؤں کے تمام گھروں میں رینیاں بنی ہوئی تھیں۔

(مولوی ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۶۲)

انھیں مجاہدین کی اَن تھک کوششوں کے نتیجہ میں صرف گیارہ دن کے اندر انگریزی عمل داری کے سارے تانے بانے توڑ کر اودھ ایک آزاد ملک بن گیا۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ صرف گیارہ روز کے اندر اودھ کے تمام اضلاع میں حکومتِ برطانیہ کا کوئی حاکم موجود نہ تھا اور انگریزی عمل داری محض خواب معلوم ہوتی تھی (ایضاً ص ۸۱۸)

منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہوگا۔ مسلمانوں نے قرآن شریف اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کر کے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔

(قیصر التواریخ؛ ص ۲۳۲)

سر ہنری لارنس نے لفٹنٹ گورنر کو لکھا کہ "سارے اضلاع ہمارے ہاتھ سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے"۔ (عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۱۶)

بیلی گارد پر پہلا حملہ مولوی احمد اللہ کی سپہ سالاری میں ہوا۔ مولوی صاحب نے فوج میں اعلان کیا "بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو، تنخواہ بھی وہی دیں گی"۔ قیصر التواریخ ص ۲۶۰) حملے کے روز بیگم کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے"۔ (عبدالحلیم شرر؛ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ ص ۱۳۸)

دلی کی شکست نے تازیانے کا کام کیا اور حملوں کا زور اور بڑھ گیا۔ ایک اشتہار شایع ہوا۔ "سب خاص و عام بگوش ہوش سنیں کہ ان کافروں نے جب دلی کو ختم کیا۔ وہاں کسی کو

جیتا نہ چھوڑا - اسی طرح تمہارے بال بچے مار ڈالے جائیں گے۔ مقام غیرت ہے کہ آنکھوں کے سامنے عورت اور بچے مارے جائیں یا ذلیل ہوں۔ اے بہادرو یہ گورے ۵۰۰ سے زیادہ نہیں۔ اگر انھیں مارلو تو تمام عمر چین سے رہیں گے۔ (قیصر التواریخ ص ۲۶۴) ۵ ستمبر جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارد پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ مولوی ذکاءاللہ کے بقول اس کی سب سے بڑی خندق اڑ گئی، باغی زینے لے کے آگے بڑھے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے۔ انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے رات کو گھنٹوں شور و غل مچاتے۔ (عروجِ سلطنتِ انگلشیہ ص ۸۵۱)

ایک روز علی محمد خاں نے علم اٹھایا اور قرآن شریف کو مثل جنگِ صفین اس میں باندھا اور کلماتِ یاس کہتے رہے (قیصر التواریخ ص ۲۸۰) ایک فقیر منش بزرگ جنھیں عوام عقیدت میں شاہ جی کہتے تھے۔ ان کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ یکہ و تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر بیلی گارد پر اشعار ذیل پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے ؎

در بیانِ ایں و آں گر دد بسے جنگِ عظیم

قومِ عیسیٰ را شکستِ بے گماں پیدا شود (ایضاً ص ۲۸۵)

انھیں حملوں میں سر ہنری لارنس انقلابیوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔ لارڈ کیننگ تک کی رائے میں دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو لیکن اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت ہی سے دوچار تھی۔"

Canning Secret Committee of Court of Directors

17th June, 1858 Freedom Struggle in U.P. P. 353)

انگریز اپنی حفاظت کے لیے ریذیڈنسی میں مقیم تھے لیکن ہندوستانی سپاہی باوجود جان توڑ کوشش کے اس پر قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ ریذیڈنسی محاصرہ میں بھی ایک بیان کے مطابق انقلابیوں نے سینتیس ۳۷ بار اسے اڑانے کی کوشش کی مگر انگریزوں کے سکھ ساتھیوں نے تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔ پھر تناسب نہ فوج کا تھا نہ مالی بند و بست کا۔

"فیروز شاہ ناظم بخت کے لڑکے اور فرخ سیر بادشاہ دلی کے نواسے، نانا راؤ اور جنرل بخت خاں بھی اس وقت آ گئے تھے اور حضرت محل کے یہاں بطور مہمانِ خاص مقیم تھے ان ہر سہ فدائین کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔"

کانپور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی بھی لکھنؤ آئے۔ حضرت محل نے شیش محل میں آتارا۔ گیارہ ضرب توپ کی سلامی ہوئی، ۲۵ ہزار دعوت کے دو شالے، رومال اور خلعت اس کے علاوہ عطا ہوئے"۔ انیس فاطمہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص: ۲۵-۳۷)

اگست میں لڑائی کا زور پھر بندھ گیا کیونکہ کانپور سے شکست کھا کر فوج کی کافی تعداد فدا حسین رسالدار کی معیت میں لکھنؤ آ گئی تھی۔

اِدھر دوسری طرف ہیولاک زبردست فوج لے کر کانپور سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اودھ کی زمین پر قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ لکھنؤ تک پہنچنا آسان نہیں۔ انقلابی کیمپ میں باغی فوجیں اور تعلقدار دور دور سے آکر جمع ہو رہے تھے۔ ۲۹ جولائی کو اُناؤ اور بشیرت گنج کے زبردست معرکوں میں پسپائی کے بعد اس نے کلکتہ اوٹرم کے پاس مدد کے لیے پیغام بھیجا (سر جیمس اوٹرم ایران سے واپسی پر کلکتہ پہنچا تھا اور اودھ کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا) ہیولاک کے پیغام پر اوٹرم اپنی فوج کے ساتھ ۱۶ ستمبر کو کانپور پہنچا اور ۲۰ ستمبر کو لکھنؤ کی طرف کوچ کیا۔ ۲۳ ستمبر کو کمپنی کی مشترک فوجیں جس میں ایک رجمنٹ سکھوں کی بھی تھی لکھنؤ سے چھ میل دور کانپور روڈ پر واقع عالم باغ جو اس وقت شہر سے باہر کا علاقہ تھا پہونچیں۔ حضرت محل سے ان برطانوی افواج کا مقابلہ پہلے عالم باغ ہی میں ہوا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی بہت سے انگریز فوجی افسر مارے گئے۔ حضرت محل ایک گرانڈیل ہاتھی پر سوار فوج کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ سرفراز بیگم لکھنوی نے کلکتے کی اختر محل کو اپنے خط میں لکھا تھا "میں نہیں سمجھتی کہ حضرت محل ایسی آفت کا پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں سے مقابلہ کرتی ہے ..... اور اس کو ہراس مطلق نہیں ہے"۔ (بیگماتِ اودھ کے خطوط) سب سے خوفناک جنگ چارباغ کے پُل پر ہوئی لیکن بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی ہندوستانیوں کو شکست ہوئی جہاں تک شجاعت و ہمّت کا سوال ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں ع

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

زبردست جانی نقصان کے بعد انگریز ریذیڈنسی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور نو دن کی لگاتار جنگ کے بعد ریذیڈنسی کی فوجوں سے مل گئے شہر اب بھی انقلابیوں کے قبضہ میں تھا۔ ریذیڈنسی کا محاصرہ جاری تھا اب ہیولاک بھی ریذیڈنسی میں قید ہوگیا تھا۔

کمپنی کی فوجوں کا نیا کمانڈر انچیف سر کالن کیمپ بل مقرر ہوا۔ کلکتہ میں مکمل تیاری کے بعد ریذیڈنسی کا محاصرہ توڑنے کی خاطر وہ ۳ نومبر کو کانپور پہنچا اور ۹ نومبر کو عالم باغ میں جہاں انگریزی فوجوں کا پڑاؤ تھا اُن سے آملا۔ ریذیڈنسی کا ایک انگریز ہندوستانی بھیس میں ایک پرانے وفادار قنوجی لال کے ہمراہ نکل کر انگریزی کیمپ میں آگیا۔ اس انگریز کو بیس ہزار نقد کے علاوہ وکٹوریہ کراس دیا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ دیا گیا۔ قنوجی لال کو غداری کا انعام صرف تحصیل داری اور 5000 ہزار چاندی کے ٹکڑے دیئے۔ (سین: اٹھارہ سو ستاون شائع کردہ حکومت ہند ص ۲۲۸)

ان لوگوں کی رہنمائی میں سر کولن کیمبل ۱۳ نومبر کو روانہ ہوا۔ سکندر باغ، دل خوش باغ شاہ نجف اور موتی محل کی بھیانک خونریزی کے بعد انگریزی فوجیں ریذیڈنسی میں داخل ہوسکیں۔ ان معرکوں میں مردوں کے دوش بدوش کئی عورتیں بھی مصروف جنگ تھیں فوربس مچل نے ایک عورت کا ذکر کیا ہے جس نے ایک پیپل کے درخت سے بے شمار انگریز سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا (ایضاً ص ۲۴۲)

لارڈ کیننگ کا اصرار تھا کہ لکھنؤ جس قدر جلد ممکن ہوسکے فتح کر لیا جانا ضروری ہے لارڈ کیننگ نے ۲۰ دسمبر کو لن کیمبل کو لکھا کہ "بالفعل فوراً اودھ کو لے لینا چاہیئے اور سب جگہوں سے زیادہ باغی وہاں جمع ہیں۔ اس کام میں اودھ کے خاندان کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں کہ آیا ہم میں یہ قدرت ہے یا نہیں کہ اس پر اپنا تسلط قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کی مثال دہلی کی سی ہے کہ لکھنؤ کا دوبارہ فتح نہ کرنا ہمارے حق میں ایسا ہی ہے جیسا کہ دہلی سے واپس چلے آنا ہوتا۔" (تاریخ عروج عہد انگلشیہ تاریخ بغاوت ہند حصہ سوم ص ۴۴) ادھر برطانوی افواج کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ایک زبردست گورکھا فوج بھی سپہ سالار جنگ بہادر کے ماتحت لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ۲۵ فروری ۱۸۵۸ء حضرت محل خود برجیس قدر کو لے کر میدانِ جنگ میں آئیں۔ اس سے جوش وخروش میں اضافہ تو ہوا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء گورکھا

فوج بھی انگریزی لشکر سے آکر مل گئی اور انگریزی تلواریں لکھنؤ پر مکمل اقتدار کے لیے بے نیام ہو گئیں۔ ادھر کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں کے سائے میں اس اودھ کو ختم کرنے کے درپے ہو رہے تھے جہاں بقول گورنر جنرل سب سے زیادہ باغی جمع تھے۔ ادھر لکھنؤ کا بچہ بچہ سر سے کفن باندھ کر ملک و قوم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں "ستر اسی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت، مذہبی دیوانگی نے جواں مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔" (ایضاً ص ۵۹) بیگم حضرت محل ناکامیوں سے دل شکستہ ہونا نہیں جانتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس فوج نے ان پر یورش کی تھی تعداد و اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج کبھی صف آرا نہیں کی تھی۔ وہ ایک مقام سے ہٹ کر دوسرے مقام پر مورچہ بندی کرتی رہیں۔ ان کی کوٹھی چونکھی پر سخت لڑائی ہوئی۔ قریب تھا کہ چونکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اسی وقت خان علی خاں ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آگئے۔ خوب رن پڑا۔ چمن بھون کی نہر جاری تھی پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑھ ماری، سینکڑوں گر پڑے خان علی خاں بھی زخمی ہوئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ حملہ کا رخ چونکھی کی جانب ہے حضرت محل کسی طرح بھی چونکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ (قیصر التواریخ ص ۳۳۳) بقول ذکاء اللہ بیگم کی کوٹھی پر جیسی سخت لڑائی ہوئی ایسی کوئی اور لڑائی اس محاصرہ میں نہیں ہوئی۔ آٹھ نو گھنٹے تک گولہ زنی رہی تو ایک در اڑ پڑی (تاریخ بغاوت ہند حصہ سوم ص ۶) بالآخر نے پیر نے یورش کر کے اسے لے لیا حملہ آوروں کے بیان کے مطابق ایک ایک انچ زمین پر سخت لڑائی ہوئی اور اہم مقامات بیگم کوٹھی سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ وغیرہ پر سپاہیوں کی لاشوں سے گذر کر قبضہ ہو سکا (مرزا علی اظہر برلاس ہتاریخی شہ پارے۔ ص ۲۹۸) سکندر باغ کے ایک مقام پر زخمیوں اور مقتولین کا بھیانک ڈھیر تقریباً ایک گز یا اس سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ (تاریخی شہ پارے ص ۲۹۸) انگریزی سپہ سالار کولن کیمبل کے الفاظ میں "اس سے زیادہ بہادری کہیں نہیں دیکھی گئی۔" (علی گڑھ میگزین ۷۳-۱۹۷۲ء ص ۲۸۳)

لکھنؤ کے انقلابی عوام دس دن تک لڑتے رہے شہر کے چپے چپے پر شہیدانِ وطن کے پاک خون کی گلکاریاں ہوگئیں۔ دشمن کی متحدہ تازہ دم اور نئے ہتھیاروں سے لیس فوجیں بڑھتی جارہی تھیں (خورشید مصطفےٰ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۹۱) اسی دوران ایک صبح کو اشارۃً داروغہ واجد علی نے حضرت محل کو بہت سمجھایا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا لیکن بنگال اور دہلی کی طرح ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اودھ میں بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پسپائی کے آثار دیکھ کر ہزار ہا ملازم نمک حرام ہوگئے تھے۔ مہاراجہ بال کرشن انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ایماء پر بہت سے تعلقداروں کا تحصیلِ زر کے بہانے مع افواج کے چلے جانے سے تحریک میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ انگریزی افواج جدید اسلحہ اور توپ خانوں سے لیس تھیں اور ان وجوہات کے سبب جنگ نے اب جارحانہ انداز کے بدلے مدافعانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اس دوران جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال نے کالن کیمپبل اور جنرل اوٹرم کا ساتھ دے کر جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ آخر ۱۹ مارچ ۱۸۵۸ء میں موتی باغ کی شکست کے بعد لکھنؤ کی لڑائی بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ آخری جنگ عیش باغ پر ہوئی۔

دورانِ جنگ حضرت محل کی شخصیت میں کچھ عجیب و غریب کشش پیدا ہوگئی تھی ان کی غیر معمولی شجاعت و مستعدی کا تذکرہ کرتے ہوئے مارشمین نے اعتراف کیا "لکھنؤ میں باغیوں نے جو مقاومت کی وہ ایسی سخت تھی کہ کبھی انگریزی فوج کو سابقہ نہیں پڑا تھا حتی کہ دہلی میں بھی ایسی سخت مقاومت نہیں کی گئی۔ باغیوں کا جوش بیگم اودھ کی وجہ سے بڑھا ہوا تھا جو غیر معمولی مستعد اور سرگرم عورت تھی اور تمام بغاوت کی روحِ رواں رہی۔ پورے دس دن تک لڑائی ہوتی رہی جب کہیں جا کر اس مستحکم شہر کی تسخیر مکمل ہوئی (مارشمین ہسٹری آف انڈیا ص ۵۱۷)

حضرت محل نے قریب دس ماہ بے جگری سے انگریزی افواج کا مقابلہ کیا۔ (طفیل منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۹۱) اور جنگِ آزادی کی تاریخ میں ایک روایت بن گئیں۔

دورانِ جنگ جنرل اوٹرم نے صلح کی کئی شرطیں پیش کیں جنھیں غیور ملکہ

بے نیازی سے ٹھکراتی رہی۔ جنرل اوٹرم کی پہلی پیشکش یہ تھی کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافقِ عہد دولت نواب شجاع الدولہ ملے گا بشرطیکہ لڑائی موقوف کردی جائے اور ان باغیوں کو نکالنے کی تدبیر کریں گے اور مسافرانِ کلکتہ اور لندن کو بھی بلوادیں گے۔ حضرت محل کو اپنی فوج کی کامیابی پر اعتماد تھا۔ جنرل اوٹرم کی پیش کش کو اس قابل نہ سمجھا کہ جواب دیتیں۔ یا بہ الفاظ صاحب قیصر التواریخ۔ یہاں خود آئینی غلط بات کب سنتے تھے۔ بعض نے جانا اب یہ مغلوب ہو چکے ہیں جب یہ آئینی بات کرتے ہیں خدا نے چاہا تو ہم انھیں نکالے دیتے ہیں (قیصر التواریخ۔ ج ۲ ص ۳۴۴) اوٹرم کا دوسرا صلح نامہ حضرت محل کو اس وقت ملا جب وہ قیصر باغ سے شکست کھا کر غلام رضا کے مکان پر اپنی پسپا ندہ طاقت جمع کر رہی تھیں۔ اوٹرم کی شرط یہ تھی، ہم زمانۂ واجد علی شاہ کا بدستور تمہارا ملک دیں گے جنگ سے دست بردار ہو جایئے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس شرط کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلحنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ (ایضاً)

اوٹرم کو اپنی کامیابی کا جتنا یقین بڑھتا گیا صلح کی شرطیں بھی اتنی عامیانہ ہوتی گئیں اس کی تیسری اور آخری پیش کش جو حضرت محل کو نواب شرف الدولہ کے مکان پر ملی یہ تھی کہ صرف ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ ملے گا۔ (ایضاً) جس غیور دخترِ وطن نے عہدِ شجاع الدولہ و زمانۂ واجد علی شاہ کا ملک انگریزوں کا عطیہ سمجھ کر لینے سے انکار کر دیا ہو وہ ان چند ہزار روپیوں کی کیا حقیقت سمجھتی۔

جس وقت انگریزوں کی کامراں فوجیں لکھنؤ میں داخل ہوئیں شہر لکھنؤ شہر خموشاں کا منظر پیش کرتا تھا۔ ہر چہار طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ گلیوں سے کتے شہر کے معلوم نہیں کہاں چھپ رہے تھے، کوئی پرندہ آسمان پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہر کوچے سے وحشت برستی تھی اور خونِ ناحق کی بو آتی تھی اور عوراتِ پردہ نشین کو پردے کا کب ہوش رہا تھا، وارث سلح آگے عورات چادر اوڑھے پیچھے چلی جاتی تھیں۔"

(قیصر التواریخ ج ۲۔ ص ۳۳۶)

لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے جس طرح کھلے عام لوٹ، قتلِ عام اور قتل سے پہلے جس طرح کی اذیت لوگوں کو پہنچائی اس کی کئی مثالیں رسل نے دی ہیں مثلاً "کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور ان پر رحم کر کے انھیں مار ڈالا گیا لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر رنیلے میدان میں لایا گیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا۔ ایک سہولت کی جگہ پر لایا گیا۔ وہاں اس کو لٹایا گیا کچھ انگریز سپاہیوں نے اُس کے منہ اور جسم میں سنگین بھونک کر اسے لٹائے رکھا۔ دوسرے لاش کو جلانے کے لیے لکڑی لے آئے جب سب تیار ہو گیا تو اسے زندہ بھون دیا گیا۔ اس کام کو کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے لیکن کسی نے مداخلت نہ کی۔ اس دوزخی ظلم و ستم کی خوفناکی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب اس بدقسمت ستم زدہ نے ادھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی۔ یکایک کوشش کر کے وہ چتا سے کود پڑا۔ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ دور دوڑا پھر پکڑ لیا گیا، واپس لایا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہو گیا سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا۔

(رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز کی ڈائری ص ۲، ۴ بحوالہ سندر لال "سن ستاون" ص ۱۹۳)

اس کے برخلاف انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لکھنؤ میں انقلابیوں کا پلّہ بھاری تھا کچھ انگریز مرد عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے۔ لیکن چھ ماہ تک انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا جس وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر بے قصور لوگوں کا قتلِ عام شروع کیا کچھ جوشیلے انقلابیوں نے محل میں جا کر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ بیگم نے سات یا آٹھ انگریزوں کو ان کے حوالے کر دیا جنھیں فوراً گولی سے اڑا دیا گیا۔ لیکن عورتوں کے بارے میں بیگم نے ان لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ اقدام عورتوں کی شان اور آن کو بڑھانے والا تھا۔

(چارلس بال۔ انڈین میوٹنی بحوالہ سندر لال، سن ستاون۔ ص ۱۹۴)

لکھنؤ کی فتح کے بعد انگریزوں نے حضرت محل کو دشمن نمبر ایک ٹھہرایا۔ آخرکار

۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو انھیں لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا، قریب شام انتہائی دل شکستہ نا کہ عالم باغ سے پینس میں سواری نکلی، نواب محمد خاں اور احمد حسین کے علاوہ ایک لاکھ کا مجمع بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے ان کے بعد بھی لڑائی جاری رکھ کر برجیس قدر اور حضرت محل کیلئے آزادی کے ساتھ چلے جانے کا موقع پیدا کر دیا تھا"۔ (مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ص ۱۲۹) صبح کو بھراؤں پہونچیں۔ اب اس وقت بھی اگرچہ سوار انگریزی پہونچتے بے تکلف گرفتار کر لیتے اس کا سبب نہیں معلوم، حکام نے کیوں اس کا خیال نہیں کیا اور ایسی خبرِ عظیم سے کس وجہ سے غفلت کی۔... راجہ مردان سنگھ زمیندار نے ایک چوپال رہنے کو دیا اور خود حاضر نہ ہوا۔ خلاصہ باری ہو کر خیرآباد پہونچیں، ہر پرشاد ناظم قسمت اول خیرآباد، مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد ناظم بسواں باڑی جو سندیلہ میں لڑتا رہا اور بڑی نمود سے مارا گیا۔ بہ محبت سنتے خبر آمد جناب عالیہ تین کوس سے استقبال کیا۔ بڑی دھوم نقارہ و شانِ جلوس سواری سے مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اتارا۔ راہ میں فقراء کو دو ہزار خیرات کئے۔ جب داخل شہر ہوئیں توپیں سلامی کی چلیں۔ وہاں صلاح یہ ٹھہری کہ بریلی کو چلیں، اکثروں کا رجحان یہ ہوا کہ ابھی اپنے ممالکِ محروسہ میں توقف مناسب ہے جب اور گذرگاہ نہ رہے گی اور کہیں پناہ نہ ملے گی ملکِ غیر میں بمجبوری چلے جائیں گے۔ بعد اس کے محمود آباد راجہ نواب علی خاں کے گھر میں مہمان ہوئیں پھر بھٹولی راجہ منوا کی گڑھی میں رہیں۔ وہاں وکیل راجہ ہردت سنگھ میواتی حاضر ہوا۔ عرض کی کہ ہم آپ کے بہرحال شریک و فرمانبرداری میں ہیں احتمال راجہ منوا کا انگریزوں سے ساز کا ہے۔ پھر وہاں سے وکیل کے ساتھ داخل بونڈی ہوئیں جو ضلع بہرائچ میں تھا چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے اندرونی اور بیرونی مع سپاہ جنگی سب جمع ہو گئے اور زمین قدیم و جدید مع بیگات و محلات اور امراء و رعایا وغیرہ آپہنچے اور جتنے اہل حرفہ تھے اور اہلِ بازار مع اجناس از خود جمع ہوئے مثل لکھنؤ چوک آباد ہو گیا۔ بونڈی کی چہل پہل اور بازاروں کی رونق لکھنؤ کی یاد تازہ کرتی تھی"۔ (قیصر التواریخ ص ۳۳۶ تا ۳۳۸) اس کے سوا زمیندار و تعلقداروں

نے بے طلب زرِ تحصیل بھیجنا شروع کیا۔ اندازے کے مطابق اس وقت بھی ان کے ساتھ پندرہ سولہ زمیندار فرمانبردار تھے۔ یہ وہ زمیندار تھے جنھوں نے انگریزوں پر کئی حملوں کو منظم کیا تھا۔ غدر کی پوری تاریخ میں یہ معرکے انگریزوں کے لیے سخت ترین تھے۔ حضرت محل کئی معرکے گرم کرنے کے بعد جب بونڈی میں اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کر رہی تھیں اس اثنا میں برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم کر کے ہندوستان کا نظم ونسق براہِ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا۔ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو بمقام الہ آباد ایک پُر شکوہ دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا فرمان پڑھا گیا۔ حضرت محل اعلان کی خامیوں پر ہندوستانی لیڈروں کی خاموشی برداشت نہ کر سکیں۔ اپنی فرودگاہ بونڈی سے انھوں نے اس فرمان کو چیلنج کیا اور بتایا کہ اس میں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بیان کے تیکھے پن سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی یہ دخترِ عظیم جنگ ضرور ہار گئی تھی لیکن ہمت نہیں۔ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانے والی ملکہ کی فراست کے نکتے بھی ملاحظہ ہوں۔

”چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے یہ خبر مشہور کر رکھی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کی خطائیں اور جرم بخش دیے ہیں۔ ہماری نظر میں ایسا ہونا نہایت تعجب خیز ہے۔ کیونکہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریزوں نے کسی کا قصور چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا کبھی معاف کیا ہو، اور اس میں ایسی سختی برتی گئی ہے کہ اگر کبھی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی لاعلمی یا بے احتیاطی سے ہو جائے تو وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔

پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا جو اعلان ہمارے سامنے آیا ہے بالکل صاف ہے اور چونکہ کچھ نہ کچھ آدمی اس اعلان کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم ہمیشہ سے حکومت کرتے آئے اور اودھ کے لوگوں کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر موجودہ فرمان جاری کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر پہلے اعلان کی خاص خاص باتوں کا اصلی بھید کھل جائے اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا ملک جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا

اب ملکہ نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا ہماری حق شناس رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں سب جیوں کی تیوں بنی رہیں گی۔ تو پھر یہ نئی بات کونسی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہوا اور وہ اس پر بھروسہ کر سکیں۔

اس اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیمان کیے تھے ملکہ انھیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس چال کو غور سے دیکھیں، کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی، کمپنی نے بھرت پور کے راجہ کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا، لاہور کے راجہ کو لندن لے گئے اور پھر کبھی اُسے ہندوستان لوٹنے نہیں دیا۔ نواب شمس الدین خاں کو پہلے تو انھوں نے پھانسی پر لٹکایا اور پھر دوسری طرف اظہار افسوس کیا۔ پیشوا کو انھوں نے پُونا اور ستارہ سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لئے بٹھور میں قید کیا۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ ان کی عیاری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بنارس کے راجہ کو انھوں نے آگرے میں قید کر دیا، گوالیار کی ریاست کا انتظام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہاں انگریزی رسوم کو رواج دیا، بہار بنگال اور اُڑیسہ کے راجاؤں کا انھوں نے نام و نشان تک نہیں چھوڑا۔ فرخ آباد کے رئیس کو برائے نام وظیفہ دیا اور اس کی ریاست ہضم کر گئے، شاہجہاں پور، بریلی، اعظم گڑھ، جون پور، گورکھپور، اٹاوہ، الہ آباد، فتح پور وغیرہ جو ہماری قدیم مملکت میں شامل تھے انھوں نے اس وعدے پر لیے کہ فوج کو وہ خود تنخواہ دیں گے اور ہمارے ساتھ جو صلح کی (معاہدہ ۱۸۰۱ء) اس کی ساتویں دفعہ میں قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور کچھ طلب نہ کریں گے۔ اب اگر جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں وہ سب منظور کئے جائیں تو اس سے پہلے کے حالات میں اور موجودہ حالات میں کیا فرق پڑتا ہے؛ خیر یہ سب تو پُرانی باتیں ہیں۔ لیکن حال میں قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر اور باوجود اس بات کے کہ انگریزوں نے ہم لوگوں سے کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے انھوں نے بغیر کسی سبب صرف یہ بہانہ تراش کر کہ آپ کا انتظام اچھا نہیں ہے اور آپ کی رعایا خوش نہیں ہمارا ملک اور کروڑوں

روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہمارے پرانے نواب واجد علی شاہ سے خوش نہ تھی تو ہم سے کیسے خوش ہو گئی۔ کبھی بھی کسی رعایا نے حکمراں کے لئے اپنا جان و مال قربان کر کے اپنی وفاداری کا ایسا ثبوت نہیں دیا جیسا ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے۔

اعلان میں یہ بھی درج ہے کہ ان کو اپنی مملکت کی حدود بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن اس کے باوجود الحاق سلطنت کا جاری ہے۔ اگر ملکہ نے حکومت اپنی اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے تو ہمارا ملک ہم کو کیوں واپس نہیں کرتے۔ جب کہ ہماری رعایا کی بھی یہ دلی خواہش ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا ملکہ نے بغاوت کی سزا ساری فوج اور رعایا کو کبھی نہیں دی، سبھی کو معاف کیا جاتا رہا اور ذی فہم لوگ ہندوستان کے تمام باشندوں اور فوجوں کو سزا دینا کبھی پسند نہیں کرتے کیونکہ جب تک سزا دی جاتی رہے گی یہ فساد کبھی نہیں رک سکتا۔ مشہور مقولہ ہے کہ "مرتا کیا نہ کرتا"، یہ ممکن ہی نہیں کہ ہزار آدمی لاکھوں کا مقابلہ کریں اور سب بچ جائیں۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن کسی دوسرے مذہب کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اور سب کے ساتھ بحال انصاف ہوگا۔ عدالت گستری میں کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے سے کیا بحث ہے؟ مذہب وہی برحق ہے جو ایک خدا کو تسلیم کرتا ہے اور اس ایک کے علاوہ کسی کو نہ ماننے، اور جب کسی مذہب میں تین خدا ہوں تو صرف ہندو اور مسلمان بلکہ یہودی اور وہ بھی جو سورج اور آگ کی پوجا کرتے ہیں اس کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ سور کھانا، شراب پینا سور کی چربی لگے کارتوسوں کو کاٹنا، آٹے اور مٹھائی میں سور کی چربی ملانا، راستہ بنانے کے بہانے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنا، گرجے بنانا، عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے گلی کوچوں میں عیسائی راہبوں کو بھیجنا، انگریزی اسکول قائم کرنا، لوگوں کو روپے کی طرح دے کر اپنی مذہبی باتیں سکھانا جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معبد کا آج تک کوئی پرسان حال نہیں۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیونکر لوگ اعتبار کریں کہ ان کا دین محفوظ رہے گا۔ بغاوت کی ابتدا ہی مذہب سے

ہوئی۔ اور اسی مذہب کے لیے لاکھوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ہماری رعایا ہرگز دھوکے میں نہ آئے۔ شمال مغرب ہزاروں کی عاقبت برباد ہوئی اور ہزاروں نے مذہب نہ چھوڑنے کے باعث پھانسی پائی۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ جن لوگوں نے باغیوں کو پناہ دی ہے یا جو باغیوں کے سردار تھے یا جنھوں نے بغاوت پر لوگوں کو اکسایا ہے اُن سے اس کا قصاص لیا جائیگا لیکن یہ کہ جب یہ ہوگا سمجھ کے کیا جائے گا اور جن لوگوں نے قتل و غارت کیا ہے یا قاتل اور خونی کی مدد کی ہے اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی باقی سب کو معاف کر دیا جائیگا ایک معمولی آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار اور بے قصور کوئی بھی نہیں بچ سکتا سب ہی کچھ لکھا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں لکھا۔ ایک بات اس میں کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار کو چھوڑا نہ جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں اور علاقے میں ہماری سپاہ نے پڑاؤ کیا۔ اس کے باشندے نہیں بچ سکتے۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں صاف دشمنی بھری ہے ہمیں اپنی پیاری رعایا کی حالت پر افسوس ہے۔ اب ہم یہ صاف حکم جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں جن لوگوں نے بیوقوفی کرکے گاؤں کے چودھری کی حیثیت سے خود کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں حاضر ہوں۔ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور ان کی لیاقت کے مطابق اعزاز عطا ہوگا ہمارے اعلان کی صداقت اسی سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی فرمانروا، خطاپوش اور عطاشعار ہوتے ہیں۔ ہزاروں نے اس کو دیکھا ہے لاکھوں نے اسے سُنا ہے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا کہ کسی انگریز نے قصور معاف کیا ہو۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ امن و امان ہو جانے کے بعد لوگوں کی خوشحالی کے لئے عوامی فلاح کے کام مثلاً راستے اور نہریں بنانے کا کام شروع کئے جائیں گے۔ سوچنے کی جگہ ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستانیوں کے لئے راستہ بنانے اور نہریں کھودنے سے بہتر کوئی کام ہی نہیں اگر لوگوں کو اب بھی اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔ ہماری رعایا میں کوئی انگریزوں کے دھوکے میں نہ آئے"۔

Foreign Political Consultations, 17th Dec. 1858 Nos. 250/54
National Archives, New Delhi

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد انگریزوں کی معافی اور پنشن کے ہر اعلان کو غیور ملکہ نے ٹھکرا دیا۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں مجبور ہو کر بونڈی بھی چھوڑنا پڑا۔ اب علاوہ اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ جس زمین پر حاکم بن کر رہیں اس پر غلامی کی ذلت کے بجائے کسی آزاد زمین پر مستقبل کی تلاش کریں۔ چند وفادار سپاہیوں اور جاں نثاروں کی معیت میں ہمالیہ کی ترائی کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ نیپال پہنچیں لیکن شکست کے بعد بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے کے عہد پر قائم رہیں (S.N. Chanda Untold Stories, P. 12)

نیپال میں حضرت محل کو ہر قسم کی تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ٹوبلی کی پہاڑی پر واقع آصف الدولہ کی بارہ دری میں انھیں مہاراجہ نیپال نے خبردار کیا۔ "آپ یا انگریزوں سے صلح کریں یا کسی اور طرف کو چلی جائیں۔ ہم سے توقع کسی قسم کی امداد و اعانت کی نہ رکھیے گا۔ ہم انگریزوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۲۰۴)

حضرت محل کی طرف سے ممو خاں نے جواب دیا۔ ہم کسی طرف نہیں جائیں گے۔ یہیں رہ کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ کچھ تمہارے بھروسے پر ان سے نہیں بگاڑا ہے۔" (قیصر التواریخ ص ۴۱۴) اس کا جواب آیا "اُدھر سے انگریز اور اِدھر سے ہم ماریں گے یہاں سے نکل جاؤ۔"

غرض یہ کہ خط و کتابت کے نتیجے میں حضرت محل، برجیس قدر اور ان کے ساتھ عورتوں و بچوں کو نیپال میں رہنے کی اجازت مل گئی اور مجاہدین کی کثیر تعداد نیپال کے پہاڑوں میں درندوں کی خوراک بن گئی۔

حضرت محل اور برجیس قدر کے قیام کی اجازت میں دو باتوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اول عورت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک جس غیر معمولی جرأت اور اُولوالعزمی کا ثبوت دیا تھا اس سے جنگ بہادر کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے پاس جو کثیر تعداد میں قیمتی ہیرے اور جواہرات تھے انھوں نے ان سب کو حکومتِ نیپال کی نذر کر دیا۔"
(مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۵۵)

حضرت محل کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی کے سبھی رہنما یا تو اودھ چھوڑ کر چلے گئے یا مارے گئے تھے۔ ان کی لکھنؤ سے روانگی کے بعد صرف مولوی احمد اللہ شاہ تین ماہ تک مصروفِ کار رہے لیکن قضا و قدر کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی جہدِ آزادی کا ایک اہم ستون گر گیا۔

اودھ کی جنگِ آزادی ختم ہوئی لیکن ہندو مسلم اتحاد کی بے مثال یادگاریں چھوڑ گئی۔ انھیں میں سے ایک ناقابلِ فراموش کہانی کنور سنگھ کی ہے۔ "جو اودھ کے جنگی محاذ آرائی کے ایک اہم رکن اور ہردوئی کے تعلقدار تھے اور فوج کے ایک حصہ کی کمانداری ان کے حصہ کی تھی۔ ہردوئی کے معرکے میں اس کی فوج گھر گئی اور فتح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا اور اس کے حکم کے تحت سفید جھنڈے بلند کر دیئے گئے لیکن سفید جھنڈوں کے بلند ہونے کے بعد جب انگریز کمانڈر نے خود راجہ کنور سنگھ سے ہتھیار طلب کیے تو اس جواں مرد نے نہ صرف ہتھیار حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایک ایسا جواب دیا جو بہادری، وفاداری اور حب الوطنی کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہیگا ہتھیار حوالے کرنے کے اصرار پر اس نے جرأت سے کہا "یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے ان کی حفاظت اور خیر خواہی کا فیصلہ کرنا میرے اختیار میں تھا۔ انھیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ان کے حاکم کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑیں لیکن میرا معاملہ تو دوسرا ہے میں ہتھیار کیسے ڈال سکتا ہوں، میں تو برجیس قدر کی ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں"۔ یہ کہہ کر اس جواں مرد نے تلوار کھینچی اور تنہا انگریزی فوج پر حملہ کیا اور سینکڑوں گولیوں کی باڑھ میں آناً فاناً مارا گیا۔" (جمیل مہدی نیا دور، یوم آزادی نمبر، اگست ۱۹۷۲ء ص ۸)

اسی طرح کا ایک اور عدیم المثال واقعہ بینی مادھو سنگھ کا ہے۔ نیپال کی ترائی میں جن دنوں حضرت محل اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں انھیں دنوں شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ نے جب اپنا قلعہ بغیر مزاحمت کے جنرل ہوپ گرانٹ کے حوالے کیا تو وہ سمجھے کہ مصالحت پر آمادہ ہے رانا نے جواب دیا" میں اپنے قلعہ

کی مدافعت سے معذور تھا آپ کے حوالے کر دیا لیکن میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے۔ نیپال کی ترائی میں سرگباشی رانا نے اپنے ناموس کو حضرت محل کی سرپرستی میں دیا اور اپنا مال و متاع اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھ کر اجازت دی کہ جس کا جو جی چاہے لے اور چلا جائے اور جو مردانہ وار مرنے کی آرزو رکھتا ہو ساتھ آئے۔ ڈھائی سو جوانوں میں سے صرف ۲ نے راہِ فرار اختیار کی باقی سب رانا کے ساتھ اس گھاٹی میں جان پر کھیل گئے۔ (نیا دور لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۶ء ص ۱۶-۱۷، بحوالہ حالاتِ غدر، منشی رام سہائے)

اس عرصے میں جنگ بہادر اودھ پر انگریزوں کا قبضہ کرا کر واپس آگیا تھا۔ نواب علی محمد خاں اور نیپالیوں سے روزانہ جنگی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ آخر میں بہادر جنگ کی چالبازی ممو خاں کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہوئی جبس دوام بعبور دریائے شور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی اور وہیں فوت ہوئے ان کے ساتھ ہی ان کی جماعت بھی منتشر ہوگئی۔

خدا کی قدرت ہے "کجا وہ محلاتِ شاہی جن پر بلا شبہ جنتِ ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ کجا نیپال کی سنسان ویران پہاڑیاں۔ دیارِ غیر میں نگین کے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اس پر ستزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا لیکن پائے ثبات کو لغزش ہونا ممکن۔" (۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۷۴)

عرصے تک انگریزوں کی یہ خواہش بلکہ کوشش رہی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا یہ پیغام بھیجا کہ "حکم سرکار ہے۔ فیض آباد، لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آجائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ کیا جائے گا۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۳۶۸) لیکن ہند کی مایہ ناز بیٹی نے نہ خود غلامی کی فضا میں جانا قبول کیا نہ اپنے بیٹے کو زندگی میں اس کی اجازت دی۔

"بیگم حضرت محل نے بعد شکست لکھنؤ اپنے لڑکے اور چند ساتھیوں کے ساتھ گورکھوں کے ملک میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ علاوہ اس مشاہرے کے جو ان کے شوہر اودھ کے سابق بادشاہ کو دینا طے پایا تھا۔ ان کے شایانِ شان وظیفہ دیا جائے گا اور

انھیں یقین دلایا گیا کہ ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا لیکن بیگم کو ہندوستان بلانے میں کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ جنگ میں شکست کھا کر برٹش حکومت کی پنشن پانا اور اس طرح اپنے بیٹے برجیس قدر کے حق سے دست بردار ہو جانا اس غیور خاتون نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے آقا اور شوہر سے بہتر انسان تھیں۔"

(سین: اے ٹین نفٹی سیون ص ۳۰۰۔ شائع کردہ حکومت ہند)

انسان کی حقیقی تعریف وہ ہے جو اس کے دوست اور دشمن دونوں کریں۔ نیپال میں حضرت محل کو سیاسی پناہ دینے میں ایک بڑی وجہ جنگ بہادر کا ان کی جرائت اور اولوالعزمی سے مرعوب ہونا تھا۔ ان کی غیرت و حمیت، حب الوطنی اور قابلیت کے معترف ان کے سب سے بڑے دشمن انگریز بھی تھے۔ سر ڈبلیو۔ ایچ رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز نے "مائی انڈین میوٹنی ڈائری میں تحریر کیا ہے"۔ بیگم میں بڑی قابلیت اور طاقت دکھائی دیتی ہے۔ بیگم نے ہم سے لاتناہی جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے ان رانیوں اور بیگموں کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں"۔

(رسل کی ڈائری۔ ص ۲۷۵۔ بحوالہ پنڈت سندر لال، سن ستاون ص ۴۷)

بادشاہ کی عیش پسند بیگمات میں سے ایک "رشیدا بیگم" نے اپنے خط میں انھیں لکھا۔ "آپ کے جانے کے بعد وہ بلوائے عام ہوئے۔ وہ وہ مصیبتیں آئیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا"۔ انتظام اللہ شہابی بیگمات اودھ کے خطوط ص ۵۲)

غرض یہ کہ جنگ آزادی کے مورخ نے اپنے خزانے میں محفوظ کر لیا کہ "بیگمات اودھ نے ہندوستان کی تاریخ پر ہمیشہ باقی رہنے والا نشان چھوڑا ہے۔ اس خاندان کے آخری زمانے میں غازی الدین حیدر کی جوشیلی بیوی بادشاہ بیگم اور باغی سپاہیوں کی جودھا (ہیروئن)، حضرت محل کا ورود ہوا جو نرم مزاج رکھنے والے واجد علی شاہ کی اور بھی اولوالعزم بیگم تھی"۔ (سر جادو ناتھ سرکار کے پیش لفظ تاریخ بادشاہ بیگم مورخہ ۱۵ جون ۱۹۳۶ء کا ترجمہ)

نیپال میں حضرت محل نے ایک محل برف باغ کے نام سے تعمیر کرایا اور آزادی ہند کے لیے درپردہ سرگرم عمل رہیں۔ ۱۸۷۴ء میں اس برف باغ میں جس پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا یہ شمع حریت ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی۔ نیپال پہونچ کر انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا یہ اختتام نہیں آغاز ہے۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی روشن کی ہوئی شمع ۱۹۴۷ء تک وطن پرستوں کے سینوں میں شعلہ بن کر بھڑکتی رہی۔

کٹھ مانڈو میں حضرت محل کی بے نشان قبر گویا فریاد کر رہی ہے کہ آزاد ہندوستان نے اپنی اس عظیم مجاہدہ کو جس کی بہادری اور فراست پر خود شجاعت کو ناز تھا۔ جس کی سیاست نے انگریزوں کی شاطرانہ سیاست سے زبردست ٹکر لی، جس کی انتظامی صلاحیت کا لوہا بڑے بڑے مدبّروں نے تسلیم کیا، جس کے مقصد کی لگن نے جنرل بخت خاں روہیلہ نانا راؤ پیشوا، تانتیا ٹوپی جیسے سرداروں اور رسل، سین، جادو ناتھ سرکار جیسے تاریخ نویسوں کے دل جیت لئے، جو اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی علم بردار تھی۔ اور جس کی حرّیت پسندی نے پسپائی کے بعد بھی انگریزی سامراج کی تابعداری قبول نہ کی۔ شاید فراموش کر دیا ہے۔ کیا ہندوستان اپنے اس قرض کو کبھی اتار سکے گا؟

عوامی انقلاب

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ایک ایسی عوامی بغاوت تھی جس میں بادشاہ بیگمات، رجواڑے اور خواص ہی نہیں، عوام بھی برطانوی آمریت سے آخری بھرپور ٹکر لینے کفن بردوش میدان میں اُتر آئے تھے ان بے شمار و غیر معروف قوم پرستوں نے قربانی، جرائت و شجاعت کی جو شاندار مثالیں قائم کیں اس کی مثال ہندوستان کی ہزاروں سالہ تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انھوں نے ایک زندہ قوم میں حرارت باقی رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھیں بھولی بسری کہانیوں میں دو کہانیاں دہلی کی "سبز پوش" خاتون اور کانپور کی "عزیزن" کی ہیں۔

"سبز پوش عورت": اسی زمانے میں جرائت رندانہ اور ہمت مردانہ کی عبرت انگیز مثال ایک سبز پوش بوڑھی عورت قائم کر رہی تھی یہ دلیر بڑھیا مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی، شہر کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتی: "آؤ چلو خدا نے تمہیں بہشت میں بلایا ہے"۔ شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سُن کر جوق در جوق اس کے ہمراہ ہو جاتے وہ ان کو لے کر بہادری سے انگریزوں پر حملہ کرتی، اس کا وار بے پناہ ہوتا۔ وہ تلوار اور بندوق سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دیتی۔ اگر اس کے ساتھی میدان چھوڑ جاتے تو یہ جنگ جو، اور دلیر بڑھیا تنہا جنگ کرتی اور پھر زندہ واپس آجاتی

بعض لوگ چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ " اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا، کبھی گھوڑے پر سوار، وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی جرائت و ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا۔" (بیگمات کے آنسو ص ۱۲۶) واپس آ کر وہ کہاں جاتی تھی؟ وہ کون تھی؟ کسی کو پتہ نہ چل سکا، آخر ایک دن ماہ جولائی میں (غالباً ۲۷، ۲۸) وہ جنگ کرتی ہوئی انگریزی مورچے کے قریب جا پہنچی مگر زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑی اور گرفتار کر کے انبالہ بھیج دی گئی، لفٹنٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو ایک خط ۲۹ر جولائی میں لکھا:

" میں تمہارے پاس ایک مسلمان بڑھیا کو روانہ کر رہا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی تھی۔ جن سپاہیوں کو اس سے سابقہ پڑا وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔ اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے جس روز گرفتار ہوئی۔ اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی ۔۔۔۔ یہ بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے"!

(بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۱۸۷، ۱۸۸)

انبالہ کی گرفتاری کے بعد سبز پوش خاتون پر کیا گذری کسی کو اس کا علم نہیں! البتہ ہڈسن جیسا مغل شاہزادوں کا خون پینے والا شخص بھی اس اعتراف پر مجبور ہوا تھا کہ دہلی کی یہ "خاتون" ہندوستان کی "جون آف آرک" کے نام سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

عزیزن

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین کی خاصی بڑی تعداد اپنے انقلابی بھائیوں کے دوش بدوش جہدِ آزادی میں شریک رہی اور جامِ شہادت نوش کیا۔ جنگِ آزادی کی تاریخ نے جن چند ایسے ناموں کو محفوظ کرلیا ہے ان میں عزیزن کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر بٹھور کی اس مجاہدہ کی قربانی بے لوث تھی۔ اس میں نہ تخت و تاج کی خواہش تھی اور نہ محلوں کی آرام و آسائش کا خیال۔ وہ صرف آزادیٔ وطن کی خاطر ایک غاصب و جابر حکمراں سے برسرِ پیکار رہی تھی۔

حسن و نزاکت کی مورت یہ رقاصہ ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئی۔ والد حسین خاں اور والدہ حمیدہ بیگم تھیں جو اس کی ولادت کے کچھ عرصے ہی بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں، عزیزن مشہور امراؤ جان ادا کے یہاں سارنگی محل میں رہی۔ ایک روایت ہے کہ اسے شمس الدین سے دلی محبت تھی جو پہلے برطانوی فوج میں صوبیدار تھا اور بعد میں اسے چھوڑ کر نانا صاحب پیشوا سے مل گیا تھا قرینِ قیاس ہے کہ وہ شمس الدین کی معیت میں ہی کانپور سکونت پذیر ہوئی ہو گی

عزیزن کو اپنے حکمراں نانا صاحب کی وفاداری پر ناز تھا جس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی دشمن تھی۔ اس لئے زندگی کے آخری سانس تک اس کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کانپور انقلابیوں کا پڑاؤ تھا۔ سر جیورج ٹریولین کے مطابق ۷ جون ۱۸۵۷ء کو ناناصاحب پیشوا کی طرف سے ہندی و اردو میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی تھی، کہ وہ اپنے ملک و مذہب کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لئے متحد ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں۔ فوجی بھرتی کا اعلان سنتے ہی یہ مجاہدہ گھر بار چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ میں کود پڑی شمس الدین کے تعاون سے اُس نے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کی، وہ گھر گھر جاتی، عورتوں کو گھڑسواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی تھی۔ وہ خود اپنے فوجی دستے کی مخصوص وردی میں ملبوس، کاندھوں پر تمغے سجے ہوئے سوار بے خوف و خطر ادھر سے ادھر گھومتی تھی۔ عزیزن کی تنظیمی صلاحیت بھی بے پناہ تھی۔ حکومت اتر پردیش کی طرف سے شائع کی گئی آنند سروپ مصرا کی مرتبہ کتاب "ناناصاحب پیشوا اور جنگِ آزادی" میں خصوصی طور پر ذکر ہے کہ خواتین کے فوجی دستہ کا قیام اس عظیم مجاہدہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

خواتین کی یہ چھوٹی سی فوج زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتی، سپاہیوں کے لئے گولا بارود فراہم کرتی، ان کے لئے کھانے اور کپڑے فراہم کرتی، نیز ان بہادر سپاہیوں کے لیے جو جون کی تپتی ہوئی گرمی میں برطانوی سپاہ کے سامنے سینہ سپر تھے، گھر گھر سے تازہ پھل، مٹھائی اور میوے بھی اکٹھا کرتی تھی، علاوہ ازیں اس کے اہم فرائض میں جاسوسی کرنا، جنگی اطلاعات حاصل کرنا اور ان کو مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچانا اور ان بزدلوں کو شرم بھی دلانا تھا جو خوف کے سبب اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ عزیزن ایسے مردوں کو خود چوڑیاں پہناتی، اس شرمندگی سے بچنے کے لئے عوام کی بھاری تعداد نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔ خواتین کا یہ فوجی دستہ اپنی مخصوص وردی میں ملبوس گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں تلواریں لیے جب خاص خاص شاہراہوں سے

گزرتا تو سڑک کے دونوں طرف کھڑی بھیڑ "عزیزن زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے استقبال کرتی تھی۔

عزیزن "انقلابی کمان" کی بھی فعال ممبر تھی۔ نانا صاحب ان کے دست راست عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپی کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے متعدد محاذوں کی مانند کانپور میں بھی انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ کرنل ولیم نے جب باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سر فہرست رکھا۔ شہر کے ایک تاجر جانکی پرشاد نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا "دوسری سپاہی خواتین کے ساتھ وہ شب و روز فوجی وردی میں جس پر تمغے سجے ہوئے تھے ملبوس رہتی تھی۔ جب آزادی کا علم بلند ہوا تو اس نے اعلانیہ جنگ میں حصہ لیا۔ پیشوا کی افواج سے اس کا براہ راست تعلق تھا۔

ہندوستانیوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کارروائی شروع ہوئی جب عزیزن بحیثیت قیدی، جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کی گئی تو اس حسین عورت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے لیے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ گلاب کی مانند تر و تازہ اور پھول کی پتی جیسی نازک اندام یہ لڑکی فوجی وردی میں ملبوس ہتھیار سجائے میدانِ جنگ میں اُتر سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین جنگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہیولاک جیسے ظالم و سفاک کا دل بھی اسے دیکھ کر پسیج گیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے بچانا چاہتا تھا۔ اُس نے عزیزن سے کہا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے اور رحم کی درخواست کرے تو وہ اس کے خلاف الزامات واپس لے سکتا ہے۔ وہ جنگِ آزادی کی پہلی مجاہدہ تھی جس نے اس رعایت کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ قدم اس کے بقیہ انقلابی ساتھیوں کے حوصلے پست کر دے گا۔ ہیولاک نے پھر پوچھا آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ ہندوستان کی اس جیالی بیٹی کا جواب تھا "ہر ممکن طریقے سے برطانی حکومت کا خاتمہ"! ہیولاک نے مجبوراً سپاہیوں

کو فائر کرنے کا حکم دیا۔ پہلے ہی فائر پر اس نے نعرہ بلند کیا "نانا صاحب زندہ باد"، تو چند لمحوں کے لئے برطانوی سپاہ کا خون منجمد ہو کر رہ گیا اور گولیاں نازک بدن کو چھلنی کر گئیں۔

اب عزیزن ایک ناقابلِ فراموش روایت بن گئی تھی۔ بتھور کے گاؤں میں اس کی شجاعت تنظیمی صلاحیت اور مادرِ وطن کی خاطر بے لوث قربانی کی کہانیاں عرصۂ دراز تک کہی اور سنی جاتی رہیں۔

(ماخوذ)

(1) (AlKabir AlKausar: Prominent Muslim Women of India. Bibliographical Dictionary PP. 3942

(2) (Muslim Women Patriots of 1857, Thomas Smith, The Statesman March, 1986)

جھانسی کی گمنام شہید:

سینٹرل انڈیا کے لئے گورنر جنرل کے ایجنٹ روبرٹ ہملٹن نے اپنی رپورٹ مورخہ ۳۰/اکتوبر ۱۸۵۸ء میں اڈیسن اسٹون سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو رانی لکشمی بائی کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "رانی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ اس موقع پر ایک دوسری مسلمان خاتون بھی جو عرصے سے اس خاندان سے وابستہ تھی اور ہمیشہ رانی کی مصاحبت میں رہتی تھی، سوار تھی، دونوں کو گولی لگی اور دونوں ہی ساتھ زمین پر گر گئیں۔

(Foreign Political A 31st December 1858, NATIONAL ARCHIVES OF INDIA, NEW DELHI)

اصغری بیگم:

اصغری بیگم کی پیدائش ۵/جولائی ۱۸۱۱ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اتر پردیش

میں ہوئی۔ تھانہ بھون کے باغی رہنما قاضی عبدالرحیم کی والدہ تھیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں برطانوی افواج کی مزاحمت کے جرم میں پکڑی گئیں اور زندہ جلادی گئیں۔

(Dr. P.N. Chopra: Who is Who India Martyrs Govt. of India Publication P 11)

جلیبہ :

ضلع مظفر نگر، یوپی کے ایک گاؤں میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک مسلم گوجر خاندان سے تھا۔ برطانوی افواج کی مزاحمت کی پاداش میں گرفتار ہوئیں اور ۱۸۵۷ء میں پھانسی کی سزا پائی۔ (Ibid : P. 49)

رحیمی :

اس نوجوان خاتون کا تعلق ایک مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ پیدائش ڈسٹرکٹ مظفر نگر اتر پردیش کے ایک دیہات میں ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانوی فوجوں سے مزاحمت کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اندازاً دو سو پچپن ۲۵۵ خواتین برطانوی افواج سے لڑتی ہوئی شہید ہوئیں اور گیارہ نوجوان عورتوں کو پھانسی کی سزا دی گئی (Ibid : P 118)

قومی یک جہتی کا تقاضہ ہے کہ دیس کے ان سبھی عوامی مجاہدین پر تحقیق کی جائے جن کی قربانیاں ایک نام چاہتی ہیں۔ اس 'تاریخِ جنوں' کی صحیح تحقیق ہی نئی نسل کو پیغام عمل دے سکتی ہے۔

باب دوئم

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

بی اماں

(والدہ محمد علی)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی اپنی نصف منزل میں تھی کہ ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک عکس ابھرنا شروع ہوا جو ایمانِ راسخ، حب الوطنی قومی یک جہتی حق پسندی و راست گوئی، آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ فکر، بلند حوصلگی، عزم مسلسل غیر متزلزل سامراجی استبداد سے بے خوف و خطر ٹکرا جانے کی غیر معمولی جرأت و ہمت، پیرانہ سالی میں جوانوں جیسی سرگرمی عمل و کارکردگی، نہ جانے کتنے ہی خوبصورت رنگوں کا امتزاج تھا کسی ایسے ہی لطیف نقش کے تصور میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

حادثاتِ وقت کے ساتھ ساتھ جیوں جیوں نقوش واضح ہوتے گئے۔ ان رنگوں کی دل آویز آمیزش پرستارانِ وطن و ملت پر سحر کرتی چلی گئی۔ کاروان حریت کے مسافروں نے اپنے اس میر کارواں کو "ام الاحرار" کے خطاب سے نوازا لیکن پیار میں اپنے پوتوں و پوتیوں کی "بی اماں"، ان سبھوں کی "بی اماں" بن گئیں۔

نوٹ:۔ ان کے بیٹے انہیں بوا کہتے تھے مولانا محمد علی کے نومبر ۱۹۲۴ء کے کامریڈ میں شائع شدہ مضامین بہ عنوان "ماں کی یاد" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بی اماں کا اصلی نام آبادی بانو تھا اور امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پیدائش اور عمر کے متعلق محمد علی نے کامریڈ میں لکھا ہے کہ بی اماں کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ البتہ مرحومہ کہا کرتی تھیں۔ اچھی طرح مجھے یاد ہے کہ غدر کے زمانے میں میری عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ اس کی بنیاد پر مولانا نے ان کا سال پیدائش ۱۸۵۲ء اور ان کی عمر ۷۲ سال لکھی ہے (کامریڈ ۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء) شوہر عبد العلی کا تعلق رام پور سے تھا۔ ۲۷ سال کی جوان عمر میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں جیسا کہ سر سبرامنی آئر صدر مدراس ہوم رول لیگ کے نام اپنے ۴ اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں انھوں نے خود تحریر کیا ہے "میرے خاوند کی اچانک اور قبل از وقت موت نے مجھے ۲۷ سال کی عمر میں بیوہ بنا دیا۔"

آبادی بانو بیگم بڑی آن بان کی شریف زادی تھیں۔ رشتہ داروں نے جب نکاح ثانی پر زور دیا تو انھوں نے جواب دیا "تم میرے رتبے اور درجے کو نہیں پہچانتے۔ میں رام پور کی نہیں ہوں۔ امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی ہوں جو اعلیٰ درجے کے سیدوں سے بھرا ہوا ایک قصبہ ہے اور میرے باپ تو نہیں لیکن میرے دادا اور پردادا شاہان دہلی کے دربار میں وزارت کے مناصب پر فائز تھے اور میرے دادا کو ایک دفعہ بادشاہ دہلی نے امروہہ کا علاقہ جاگیر میں دینا چاہا تو میرے دادا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بالکل سیدوں کی بستی تھی اور وہ سیدوں پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خبردار جو کبھی کسی نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ یہ میرے چھ لخت جگر مجھے کیا کم ہیں۔ میری عمر بھر کی خدمت اور جاں نثاری کے لئے یہ کافی ہیں۔ (علی برادران اور ان کا زمانہ سید محمد ہادی، ص ۱۰) سبرامنی آئر کے نام ۴ اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں ہی بیوگی کے بعد وہ اپنی ذمہ داریوں اور بچوں کی تربیت کے متعلق لکھتی ہیں "اس وقت میرے چھ بچے تھے جن میں محمد علی سب سے چھوٹا اور دو برس کا تھا ان کی تعلیم میرے ذمہ ہوئی۔ ماسوائے اس کے ان کی ملکیت کی نگہبانی میرے سر پڑی۔ خدا کی مدد پر پورا بھروسہ کر

کے جو نیک کام کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے اعتقاد و مذہب پر یقین رکھ کر میں کام کرنے لگی اور باوجود تکلیف و مشکلات کے مجھے اس کا صلہ مل گیا یعنی ہماری کل اولاد جوان ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئی"۔

انیسویں صدی کے مسلم معاشرے کے پیشِ نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے جس طور پر پردے میں رہنے کے باوجود اپنی جائیداد کا انتظام، اپنے بچوں کی تربیت اور انھیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا وہ بڑی جرأت اور قدامت کا بھی کام تھا اور پُرانی روایتوں سے بغاوت بھی۔ شوہر کے بعد دیور کے اصرار کے باوجود وہ جائیداد کا ایک حصّہ بھی فروخت کرنے پر رضامند نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا میں چاہتی ہوں میرے بچوں کو ان کا مکمل حق ملے تاکہ وہ اپنی ماں کو الزام نہ دے سکیں کہ وہ عورت ہونے کے سبب جائیداد کا صحیح انتظام نہ کر سکیں۔ تنگدستی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں بیٹوں کی تعلیم کی خاطر چھپ کر ملازم کی معرفت پڑوس کے ہندو بنیکے کے یہاں زیور رہن رکھنا پڑا۔ بقول مولانا محمد علی "وہ خود معمولی کپڑا پہنتیں اور ہمارے لئے خاندانی کے کپڑے بنائیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خود چولائی کی سبزی پر گذارا کرتیں۔"

بی اماں کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق مولانا محمد علی فرماتے ہیں۔ "اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ اگرچہ عملی طور پر وہ بالکل اَن پڑھ تھیں لیکن جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا مجھے زندگی میں جن لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہے ان میں سے کسی ایسے شخص سے مجھے سابقہ نہیں پڑا ہے جسے میں والدہ سے زیادہ عقلمند اور یقیناً ان سے بڑھ کر خدا پرست اور روحانی کہہ سکوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہندوستان میں مسلم معاشرے نے اپنے زوال کے دنوں میں اپنی عورتوں کو سوائے عام جہالت کے ہر روشنی سے محروم رکھنے سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں کیا۔" (محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۴۶)

مولانا محمد علی نے اپنی سوانح حیات میں بی اماں کے بارے میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے شادی کے بعد اردو کیسے پڑھی اور ان کا کس بلا کا حافظہ تھا۔ مولانا

محمد علی مرحوم کے والد ایک پرانی وضع کے انسان تھے جس کی وجہ سے ان کے گھر کا ماحول بھی بیحد رجعت پسندانہ تھا۔ مولانا محمد علی کے والد باوجود سخت رجعت پسند ہونے کے ہر قسم کی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانے میں اس خیال سے لائے کہ سونے سے قبل وہ اسے پڑھ کر ختم کردیں گے مگر وہ رات میں اسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اُسے اپنے ہمراہ لیجانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچازاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک اردو ناول تھا۔ انھوں نے بی اماں کو اس کے بعض اقتباسات سُنائے جو بیحد دلچسپ تھے اور جو بی اماں کو بھی بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سوگئیں تو سوتے میں ان کے منہ سے اس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہوئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے انھوں نے جب سوتے میں بیوی کے منہ سے اردو ناول کے وہ اقتباسات سُنے تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ بعد میں بی اماں نے مولانا کے چچازاد بھائی سے شوہر سے چھپ کر اتنی اردو پڑھ لی تھی کہ شوہر کی زندگی میں ہی ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنے اور پڑھنے لگی تھیں پھر بعد میں تو انھوں نے باقاعدہ اردو پڑھی اور تحریکِ خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرروں میں کیا جاتا تھا۔

(از فرقت کاکوروی، علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ ص ۷۵-۷۶)

بی اماں کا شمار تاریخ انسانی کی ان چند معزز ہستیوں میں بہ آسانی کیا جاسکتا ہے جن کی آغوشِ تربیت میں طفلِ ناداں، غیور علم بردار حریت اور حقیقی معنوں میں رضاکارانِ ملک و ملت بن کر اُبھرتے ہیں۔ مولانا محمد علی کی تاریخ ساز شخصیت بھی بی اماں کی تربیت کی ہی مرہونِ منت ہے جس کا اعتراف اُنھیں خود بھی ہے۔ "مجھے اپنے والدِ مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ

کو کبھی نہیں بھول سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوندِ کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہونچایا ہے (نقوش آپ بیتی حصہ اول جون ۱۹۶۴ء)

عملی اعتبار سے بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم سے ہوتا ہے "قانون تحفظ ہند" کا نفاذ دورانِ جنگ ہوا ۔ یہ ایسی شمشیر برہنہ تھی جس نے صدہا حریت پسندوں کی آزادی کا خون کیا اور جس کے حربے کے سامنے تمام قانونی تحقیقات اور آئینی جوابات بیکار ثابت ہوئے ۔

لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں لکھے گئے مولانا محمد علی کے مضمون کو حکومت نے قابلِ اعتراض قرار دیا اور اس کی پاداش میں جب کہ ابھی قانونِ تحفظ ہند کو رائج ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے ۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کو چھندواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا ۔ (نظر بندی کا آخری زمانہ بیتول جیل میں گزرا) مجاہد بیٹوں کی قابلِ فخر ماں نے اپنی مرضی سے ۔ بیٹوں کی قربت کی خاطر چھندواڑہ میں ہی قیام پذیر ہونا پسند کیا ۔ اُن کی نظر بندی پر اظہار فخر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا "یہ صرف ایک عزت ان ہی لوگوں کے لئے ہے ۔ جن کو خدا اپنے ملک اور اپنے مذہب کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے" (خط بنام سر امنی آئر ۱۴ راگست ۱۹۱۷ء) یہ مرتبہ بلند ملا جن کو مل گیا ۔ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں جگہ جگہ ہوم رول لیگ کا چرچا تھا ۔ لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کی سرپرستی میں نہا لاسٹر ہوم رول لیگ کی شاخیں سارے ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھیں ۔

مسز بیسنٹ نظر بند ہوئیں اور ہندوستانی سیاست میں ایک نئی سرگرمی کی لہر دوڑ گئی ۔ بی اماں نے سر سبرامنی آئر کے نام اپنے خط میں جسے انھوں نے اس عظیم الشان جلسہ میں بحیثیت صدر پڑھ کر سنایا جو مسز بیسنٹ کی نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے مدراس میں منعقد ہوا تھا ۔ تحریر فرمایا "مجھے خوف ہے کہ یہ خط شاید آپ کو متعجب کر دے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ ایک اجنبی شخص کا

خط ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ راقم ایک مسلمان عورت ہے۔ جس کی پرورش پُرانی وضع کے مطابق ہوئی ہے۔ جس کی رو سے عورتیں اجنبی سے بہت کم خط و کتابت کرتی ہیں اور مردوں سے تو کبھی کرتی ہی نہیں لیکن زمانہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہے اور اس کی رفتار عجیب ہے کہ اگر مجھ جیسی پُرانی خیال کی عورت اس اصولِ قدیم کو بھُلا کر ایک ایسے معزز اور محترم شخص کو خط لکھے، جن کا تمام عالم مدّاح ہے اور پھر خط کا مضمون بھی وہ ہو جو آج سب کے دلوں میں جاگزیں ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں پرانے لوگ اور خصوصاً بوڑھی عورتیں عموماً دنیا میں ردوبدل کی خواہاں نہیں۔ گو میں ضعیفہ ہوں لیکن ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہوں جو آج ہمارے گردوپیش وقوع میں آ رہی ہیں۔ رول لیگ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے لکھا:" جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ گو میں صوبہ متوسط میں رہتی ہوں لیکن ہمارا اشٹر ہوم رول لیگ میں جس کو اس بہادر اور صائب الرائے شخص یعنی لوک مانیہ بال گنگادھر تلک نے قائم کیا ہے شامل ہو سکتی ہوں تو میں نے مع اپنی بہو (یعنی محمد علی کی بیوی) اور اپنے گھر کے تمام دوسرے لوگوں کے اس لیگ کی ممبری کا حلف لے لیا ہے۔ اس زمانے میں محض عقائد کافی نہیں اب تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کا اعلانیہ اظہار کریں اور اگر ضرورت ہو تو باآوازِ بلند اعلان کریں۔

مسز بیسنٹ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس کرتے ہوئے ان کے متعلق اظہارِ خلوص یوں کیا۔ ان کی نظر بندی میں سوائے مبارک بادیوں کے اور کوئی تحفہ نہیں بھیج سکتی، متحدہ ہندوستان میں نوجوان بوڑھے، ہندو اور مسلمان سب کی دعائیں ان کے حق میں ہیں۔ یہ دعائیں ان سختیوں کی تلافی ہوں گی جو ادنیٰ لوگوں کی ایک جماعت سے انھیں مل رہی ہیں اور ہمیں بھی ۲۷ مہینوں سے نصیب ہو رہی ہیں۔ دعائیں اور مبارکبادیوں کے سوا ان کی نذر کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نظر بندی کے متعلق جو فنڈ کھولا گیا ہے اس میں تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکتا ہے چندہ دوں۔ ہم لوگ کبھی متمول نہیں رہے بلکہ میرے بیٹے جب سے نظر بند ہوئے ہم اور بھی غریب ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی

بھی اس قابل نہیں کہ کسی قسم کا کاروبار جاری رکھ سکے اور بجائے کچھ کمانے کے صرف قرض کے لئے ہزاروں روپیہ کا سود دینا پڑتا ہے۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کی غرض سے اور ایک بڑے خاندان کے روزانہ اخراجات کے واسطے جس کی کفالت کو ہمارے بیٹوں کی تنخواہیں کافی نہیں ہو سکتیں۔ میں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا حصہ فروخت کر ڈالا۔ یہ جاگیر میرے خسر کی کمائی تھی جو انھوں نے غدر کے زمانے میں جب وہ نواب رام پور کی ملازمت کرتے تھے۔ روہیل کھنڈ اور کمایوں میں بہت سے انگریزی باشندوں اور افسروں کی جانیں بچانے کے صلہ میں حاصل کی تھی۔ جب تک میرے بچے کمسن تھے اور مجھے ان کی پرورش کرنی تھی۔ اس وقت تک میں نے اس امر کو ایک بڑا فرض سمجھا کہ اس جائیداد کے کسی حصے کو علیحدہ نہ کروں اور باوجود تنگ دستی کے اس کا ایک ایکڑ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ گیا تھا لیکن کیونکہ پوتوں کی نظر بندی کی وجہ سے ۱۹۱۷ء میں اس جاگیر کے فروخت کرنے کی ضرورت ہوئی جو دادا نے ۱۸۵۷ء میں حاصل کی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو اس فرض سے سبکدوش سمجھا اور مجھے اس کا مطلق غم نہیں کہ میں نے اس جاگیر کا اتنا بڑا حصہ علیحدہ کر دیا۔ رہا مستقبل تو اس کے لئے مجھے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے متعلق کوئی فکر نہیں، میں اپنی مشرقی مثل پر پورا اعتماد رکھتی ہوں یعنی

ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست

اب بھی میری یہ خواہش ہے کہ ہماری عالی مرتبہ بہن ہماری آمدنیاں شریک ہوں اور میں نہایت مشکور ہوں گی اگر آپ ہم سے دس روپیہ ماہوار قبول فرمائیں گے۔ پہلے مہینے کے لئے میں منی آرڈر روانہ کر چکی ہوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتادوں کہ یہاں ہمارے گھر کے ہر ایک شخص نے اس رقم میں کچھ نہ کچھ دیا ہے حتیٰ کہ بچوں اور نوکروں نے بھی نہایت شوق واصرار کے ساتھ اپنے حصے کی قلیل رقم اس روپے میں شامل کی ہے۔"

قانون تحفظ ہند کے آہنی پنجوں میں گرفتار بدنصیب بندوں، ان کی معاشی بدحالی اور پریشان حال پسماندگان کے متعلق اس خط میں ظاہر کئے گئے جذبات ان کی

انسانی ہمدردی، وطن پرستی اور ملکی آزادی کے لئے ان کی بے قراری کی بہترین عکاسی کرتے ہیں: "میرے بیٹے جوان وتندرست ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کے اتنے دوست واحباب ہیں کہ جو مدد چاہیں ان کو خوشی کے ساتھ مل سکتی ہے۔ لیکن مجھ ماں کا دل ان سینکڑوں بدنصیب بہادر لڑکوں کے غم میں خون روتا ہے جو بغیر کسی داد فریاد کے مجرم قرار دیئے گئے ہیں اور اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی کمانے کی آزادی سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یقیناً ان کے لئے بہن بیسنٹ کا دل بھی روتا ہوگا۔ میں اپنے سوا دو برس کے تجربے سے محسوس کر سکتی ہوں کہ وہ سینکڑوں مائیں جن کے گھر تباہ وبرباد ہوگئے آج کیا خیال کرتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ نوجوان کیا محسوس کرتے ہونگے جن کی جلاوطنی میں انکے آرام وآرائش کا خیال رکھنے اور تسلی ودلاسا دینے والی مائیں بھی نہیں ہیں۔ غم وفاقہ کشی کی دلخراش داستانیں کبھی کبھی ہمارے کانوں تک پہونچتی ہیں اور اُن سے ہم کسی قدر اندازہ کرسکتے ہیں کہ کتنے ایسے پردرد افسانے ہوں گے جو ہمارے کانوں تک پہونچتے بھی نہیں۔ کیا ان کو قانونی مشورہ اور مالی امداد دینے کی کوئی سبیل نہیں ہوسکتی؟ اور اگر ان بدنصیب لوگوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنے کا کوئی علاج نہیں ہے تو وہ اور ان کے متعلقین جو کبھی کسی جرم کے مرتکب اور ایسی سزا کے مستوجب نہیں ہیں بھوکوں کیوں مریں؟ کیا ہماری ہوم رول کی شاخیں ان نظربندوں کے علاوہ جنھیں پبلک جانتی ہے ہر نظربند کے حالات کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتیں اور انکو اور ان کے متعلقین کو ضروری مدد نہیں دے سکتیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اپیل کی جائے تو ہر گوشہ ہندوستان میں ہر گھر ان مقدس اغراض کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور دے گا۔ خواہ وہ مٹھی بھر اناج ہی کیوں نہ ہو۔"

ملک کے تمام حریت پسندوں کے پس ماندگان کے سلسلے میں عملی اقدامات کے تذکرے کے ساتھ اور ان کی امداد کے لئے مسز اینی بیسنٹ کے نام پر ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز کے ساتھ انھوں نے ایک بار پھر اپنے اس ایمان راسخ اور پختہ یقین کا اعادہ کیا کہ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہے اور فتح عنقریب ہی ہے (خط بنام مسز اینی آئرس ۴ راگست ۱۹۱۷ء "چند اہم خطوط" انجمن اعانت نظربندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۸ء ص ۹-۱۰-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵)

مختلف اشخاص کو لکھے گئے ان خطوط سے ان کی اندرون و بیرون ملک معاملات پر وسعت نظر، مسائل سے گہری واقفیت اور ان کے حل کی تلاش میں ان کے اضطراب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوش وفاداری میں اکثر حکّام ہوم رول لیگ کے جھنڈے گرا دیتے تھے اس سے متعلق سر سبرامنی آئر کے نام ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء کے خط میں بی اماں نے اپنے جذبات و احساسات کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا: "اگر ایک ہوم رول لیگ کا جھنڈا زبردستی آتار دیا گیا تو کیا اس کی جگہ ہزاروں نئے جھنڈے بلند نہ ہوں گے۔ اپنے جذبات سے اندازہ کرتے ہوئے مجھے پورا یقین ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی اس خوبصورت سرخ و سبز جھنڈے کو نہ صرف اپنے گھروں پر لگائیں گے بلکہ دلوں میں جگہ دیں گے۔ اپنے سارے زمانۂ بیوگی میں میں نے کبھی کوئی رنگین چیز نہیں پہنی۔ لیکن اب میں سُرخ و سبز جھنڈے کو خدّامِ کعبہ کے مقدس نشان کے نیچے اپنے سفید برقعے یا بالفاظ دیگر نقاب وار پوشش پر جو کہ میں باہر نکلتے وقت پہن لیتی ہوں لگاؤں گی۔ میں شیخی یا نمائش کے لئے ایسا نہ کروں گی بلکہ میرے اس عمل کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے شرمانا یا اس کے نتائج سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں مجھے تو بجائے غصّے کے اس بات پر افسوس آتا ہے کہ حکام اپنی بیوقوفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اس قسم کے خفیف اظہار ستحکم سے سلطنت کی جڑ پختہ ہوتی ہے، کاش کہ وہ ان چیزوں کو ہماری آنکھ سے دیکھ سکتے اور معلوم کرتے کہ پردہ نشین عورتیں تک اس بات کو خوب سمجھتی ہیں کہ اس قسم کی تلون مزاجی کا اثر صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی بنیاد کو صدمہ پہونچے۔

چند سال گذرے کہ "بندے ماترم" کا نعرہ جو ایک بے ضرر بلکہ قابلِ تعریف نعرہ ہے، بنگال میں باغیانہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے محبانِ وطن کو تکلیف اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس پر بھی مجھکو معلوم ہوا ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کی کارروائیاں "بندے ماترم" کے راگ سے شروع ہوتی تھیں اور وہی بہادر نوجوان بنگالی جوان الفاظ کے زبان پر لانے سے سزائیں جھیلتے تھے۔ اب اس کو اپنی جگہ مقبول جنگی نعرہ کی طرح میدانِ جنگ میں اپنی جان دینے کے وقت

استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی قوم اور اپنی مردانگی کے دامن کو بدنما دھبے سے پاک کر دیتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو جو زبردستی ہوم رول کا جھنڈا گرا دیتے ہیں سبق لینا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک روز یہ سبق سیکھ لیں گے خدا کرے کہ وہ جلد اس سبق کو سیکھیں ایک پرانے شاعر کا قول ہے ؎

ہرچہ دانا کند کند ناداں

لیک بعد از خرابیٔ بسیار

مہربانی کر کے میری بہن سے کہدیجئے کہ گو میں پیغمبر یا غیب داں نہیں تاہم مجھے اس کا یقین کامل ہے کہ انشاءاللہ وہ اور میں اپنی موت سے قبل ہوم رول کو ہندوستان میں قائم دیکھ لیں گے لیکن اگر مشیتِ ایزدی یہ ہوئی کہ ہم اپنی دل کی حسرت پوری ہونے سے قبل اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائیں تو ہم مسرت اور شکریہ کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیں گے اور اپنے بنانے والے کے سامنے بخوشی اس خیال کے ساتھ جانے کو تیار رہو جائیں گے کہ شاید ہماری وہ کوششیں جو کہ ہم اپنے مذہب، قوم اور غم زدہ بنی نوعِ انسان کے لئے کر رہے ہیں۔ ہماری دوسری خامیوں کا کفارہ ہو سکیں ۔۔۔ بعض اوقات فنا فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے لیکن اس سے زیادہ بڑی چیز اور بہادری کی بات اور بعض اوقات مشکل تر شئے یہ ہے کہ آدمی اچھے مقصد کے لئے زندہ رہے اور بے انتہا مشکلات اور روز مرہ کی ذلتوں اور تکالیف کے باوجود اس کے پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اس لئے میں جناب باری کی درگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ میری بہن مسز بسینٹ کو اور جناب کو جو اس جواں مردی اور بہادری سے کام کر رہے ہیں۔ بہت تندرستی خوشی اور اس سے زیادہ کار آمد زندگی کے بہت سے سال عطا کرے ۔

آج میں مبلغ ع۵۰ روپیہ آپ کو بذریعہ منی آرڈر بھیجتی ہوں یہ بسینٹ فنڈ میں ہماری طرف سے دوسری قسط ہے ۔ مجھے محمد علی کی زبانی یہ سن کر تعجب ہوا کہ گورنمنٹ نے آپ کے نام جو میرا خط گیا تھا اس کی بابت کچھ عجیب سوال کئے اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ سوال تھا کہ میں یہ دس روپے ماہوار کی رقم بسینٹ فنڈ میں کس طرح دے سکتی

ہوں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میرا خط جو آپ کے نام لکھا گیا ہے وہ غور سے نہیں پڑھا گیا۔ ایک عورت جو اپنی چالیس ہزار کی جائیداد فروخت کرکے اپنے بچوں کا قرضہ پندرہ ہزار روپیہ سال کے اندازسے گزشتہ دو سال کے زمانۂ نظر بندی میں ادا کرتی رہی ہو کیا یہ قدرت بھی نہیں رکھتی کہ وہ یہ قلیل رقم فروخت کی حاصل میں سے نکال سکے۔ اور کیا دس روپیہ ماہوار اپنی ضروریاتِ زندگی کو کم کرکے ماہوار مصارف میں سے بچالینا کوئی غیر معمولی بات ہے بالخصوص جب کہ یہ رقم ایک ایسے مقصد کے لئے ہو جو کہ ہمارے دلوں کو اس قدر عزیز ہے۔" (چند اہم خطوط، سلسلہ حالات نظر بندانِ اسلام نمبر ۲۔

انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی۔ ص ۱۷۔ ۱۸۔ ۲۱)

محترمہ بی اماں کا وہ بیان جس میں انھوں نے تفصیل سے فرمایا ہے کہ محمد علی شوکت علی کیوں آزاد نہ ہوئے۔ بتعدد رسائل میں شائع ہوا۔ آپ نے اس بیان میں تحریر فرمایا، ستمبر کی صبح کو ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اس صبح کو مسٹر عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمہ خفیہ پولیس جو شملہ سے آئے تھے میرے دونوں لڑکوں کے پاس آئے۔ ان کو سر چارلس کلیولینڈ محکمہ خفیہ پولیس کے ڈائرکٹر نے بھیجا تھا۔ مسٹر عبدالمجید نے میرے لڑکوں کو ایک عہد نامہ دکھلایا اور کہا کہ سر چارلس کلیولینڈ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس عہدنامہ پر دستخط کریں۔ اس عہدنامہ کا مضمون یہ تھا۔ "میں بقیہ ایام جنگ میں کوئی ایسا کام کرنے، ایسی تحریر لکھنے یا کسی ایسی بات کے کہنے سے جس کا منشا یہ ہو کہ دشمنانِ تاج کی ہمت افزائی ہو یا ان کو اس سے مدد پہنچے، بچوں گا۔ میں کسی ایسے کام کرنے یا کسی ایسی بات کہنے سے بھی پرہیز کروں گا جس سے بادشاہ کے دوستوں یا حامیوں پر حملہ ہو یا حملہ معلوم ہو۔ میں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوئی ایسا غیر آئینی اور سخت ایجی ٹیشن نہیں کروں گا جس سے امن عامہ کے خطرے میں پڑجانے کا اندیشہ ہو۔ تشریح: اور یہ وعدہ جو میں نے ابھی اوپر کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاست میں اپنی حدود کے اندر رہ کر حصہ لینے سے باز رہوں گا۔"

(دستخط سر چارلس)

پھر تحریر فرماتی ہیں کہ میرے بیٹوں نے کچھ دیر تک مطلوبہ طمانیت کی نوعیت، دائرۂ اثر کی بابت مسٹر عبدالمجید سے گفتگو کی اور بعد ازاں محمد علی مسودہ لکھنے کے لئے قلم لینے اپنے کمرے میں آیا اور اسی وقت پہلی مرتبہ مجھے یہ حالات معلوم ہوئے میں نے ان کی ڈھائی سال کے بعد آزادی کی شروط سے واقف ہونا چاہا اور بہ ضرورت بُرقعہ اوڑھ کر اسی کمرہ میں آکر بیٹھ گئی جہاں مسٹر عبدالمجید سے گفتگو ہو رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے حسب ذیل الفاظ سے ان کو مخاطب کیا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ گورنمنٹ میرے بیٹوں کے آزادی بحال کر کے آخر کار ان کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے۔ قدرتی طور پر میں اس سے خوش ہوں کیونکہ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ پچھلے ۲۸ ماہ کے اندر انھوں نے کیا کیا تکالیف اٹھائی ہیں اور ان تکلیفوں کو کس طرح برداشت کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں گورنمنٹ ان سے کوئی عہد لینا چاہتی ہے ان کی عمر اتنی کافی ہے کہ وہ فائدہ اور نقصان کو خود سمجھ سکتے ہیں۔ آج یقینی ان کو میرے کسی صلاح و مشورے کی ضرورت نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ میری طرف سے گورنمنٹ سے یہ کہدیں کہ میرا ایک فرض ان کے ذمہ ہے جو تمام ان فرائض سے مقدم ہے جو دوسروں کے ان کے ذمہ ہوں۔ کیونکہ میں نے نو مہینے ان کو پیٹ میں رکھا۔ ان کی ابتدائی عمر میں ان کو دودھ پلایا اور ہمارے رسول اکرمؐ نے ان کو بتایا کہ ان کی جنت میرے قدموں کے نیچے ہے (ان الجنۃ تحت اقدام امھاتکم) اپنی طویل جلا وطنی اور نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے ان سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ان کے لئے کسی ایسی شرط کو مسترد کر دینا کیسا سخت ہوگا جن کے قبول کرنے میں زمانہ دراز کی ان تمام صعوبات کا خاتمہ ہو سکتا ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لئے وہ کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی

گو یہ مجھے عزیز ہیں اور طاقتور اور رحیم وشخیم دکھائی دیتے ہیں۔ باقی ماندہ تمام باتوں کے متعلق میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمیشہ حضور شاہ قیصر کی پابندِ قانون رعایا رہے ہیں اور آپ (مسٹر عبدالمجید) کے سامنے میں ان کو یہ حکم دیتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسے ہی رہیں۔ اور یہی مجھے کہنا تھا اور میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس کو گورنمنٹ سے کہدیں۔"

اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آنے کو تھی لیکن میرے بیٹوں نے مجھے روکا اور اس طمانیت نامے کا جو ان سے مانگا گیا تھا... اور اس کا جواب جو مسٹر عبدالمجید کو لکھ کر دینے والے تھے تاکہ وہ اس کو بذریعہ تار سر چارلس کلیو لینڈ کو روانہ کریں، ترجمہ کرکے سُنایا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"ہم دونوں ہمیشہ خدا ترس مُسلمان رہے ہیں جو تمام باتوں سے فائق ان احکام الٰہی کو سمجھتے ہیں جو قرآنِ پاک اور ہمارے رسولِ اکرمؐ کے واقعاتِ زندگی اور اقوال کی صورت میں ہم کو پہنچائے گئے ہیں۔ اس اعتقاد کو ضرر پہونچائے بغیر ہم دونوں ہمیشہ اپنے ملک کے پابندِ قانون اور تمام غیر آئینی وشدت انگیز طریقوں کے مخالف رہے ہیں اور خواہ جنگ ہو یا نہ ہو ہم دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہنے کے خواہش مند ہیں اور اُمید ہے کہ ایسے ہی رہیں گے۔ لہٰذا اگر اب بھی اس مضمون کی کسی طمانیت کی ضرورت ہے تو ہمیں اس کے کردینے میں کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اطاعت اسلام کو ضرر پہنچے بغیر ہم ایسا کوئی کام کرنے یا تحریر لکھنے، یا کوئی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دشمنوں کو مدد پہنچانی مقصود ہو یا معقول طریقے سے مدد پہنچنے کا احتمال ہو۔ اور کوئی ایسا کام کرنے یا ایسی تحریر لکھنے، ایسی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دوستوں اور حلیفوں پر کوئی حملہ مقصود ہو یا معقول طور سے اس کا کوئی احتمال ہو کہ اس کے حملے کے معنی لگائے جائیں گے اور ہم کسی شدت آمیز یا غیر آئینی ایجی ٹیشن سے بھی محترز رہیں گے جس سے حفظ عامہ پر اثر پڑنے کا احتمال ہو ہم سمجھتے ہیں اور مندرجہ بالا طمانیت کو اس صاف سمجھوتے پر مبنی کرتے ہیں کہ اوپر جن

احترازوں کا قرار کیا گیا ہے ان سے ہمارے تمام مذہبی فرائض کو ملحوظ رکھنے کی آزادی کو خفیف ترین درجہ میں بھی محدود کرنا یا ہمیں آئینی حدود کے اندر سیاسیات میں حصّہ لینے سے باز رکھنا مقصود نہیں ہے۔"

میرے بیٹوں نے اپنی پوزیشن کا جو بیان دیا ہے اس نے کامل طور سے مجھے اطمینان دلا دیا ہے اور میں خیال کرتی ہوں کہ ہر شخص کو یہ مطمئن کرے گا۔" (مدینہ اخبار بجنور ۵ راکتوبر ۱۹۱۷ء)

آزادی ایک نعمت ہے جس کے حصول کی خاطر انسان سبھی کچھ کر گزرتا ہے۔ اس نازک مرحلے پر بڑے بڑے قوی ہیکل مردوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن سرکاری مخبر کی موجودگی میں مجاہد بیٹوں کی اس عظیم ماں نے جس ثابت قدمی اور فقید المثال جرأت مندی کا ثبوت دیا وہ ان کے ایمان راسخ اور غیر متزلزل عزم کی روشن مثال ہے ام الاحرار کا بیان ایک ضعیف مجاہدہ آزادی کی عظمت اور کردار کی بلندی کی ناقابل فراموش یادگار ہے۔

مسز اینی بیسنٹ نے اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد وائسرائے سے ملاقات کی، دوران ملاقات علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش ہوا جس میں انھیں ناکامی ہوئی اور جس کے نتیجے سے انھوں نے پبلک کو بذریعہ ایک گشتی مراسلے کے آگاہ کیا۔ بی اماں نے جواب میں ایک طویل خط مسز بیسنٹ کے نام لکھا جس نے بہت سی حقیقتوں پر سے پردہ ہٹایا۔ ایک اقتدار پسند جماعت کے حکام کے جبر و تشدد کی کہانی کو انھوں نے عوام کے سامنے بکمال جرأت و ہمت پیش کیا ہے۔ خط کا مکمل متن حسب ذیل ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھندواڑہ (ممالک متوسط)

۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء

عزیز بہن! اگرچہ کچھ عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا ہے، لیکن عرصہ ایک

ماہ کا ہوا کہ آپ نے ہزایکسیلینسی حضور وائسرائے سے میرے بیٹوں کی آزادی سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد اپنی کوششوں کے متعلق پبلک کی آگاہی کی غرض سے ایک مراسلت شائع کرائی تھی جس کا جواب لکھنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں ۔

میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتی لیکن میری طبیعت ناساز تھی، اور محمد علی شوکت علی اور میری ایک پوتی بھی بیمار ہو گئی تھی ۔ اس کے علاوہ مسٹر گھاٹے مجھے خط و کتابت میں مدد دیتے ہیں۔ ایک مقامی سیاسی کام میں مصروفیت کے باعث موجود نہ تھے ۔

اس معذرت کے اظہار کو میں نے اس بناء پر ضروری سمجھا کہ کہیں میری خاموشی سے غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ہزایکسیلینسی وائسرائے کی ملاقات کے بعد آپ کے اور اس نصیحت کی نوعیت کے متعلق جو آپ نے پبلک کو کی تھی بعض طبقوں میں افسوس ناک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ۔

میں ان صعوبتوں کا جو آپ جیسی عمر و تندرستی والے شخص کو ان دو طویل سفروں میں جو آپ نے میرے بچوں کی رہائی کی خاطر برداشت کئے اٹھانا پڑی ہونگی محض رسماً نہیں بلکہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپکی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کا کوئی اثر آپ کے اس بار احسان پر نہیں پڑتا جو ہم پر ہے، نہ اس سے کوئی تبدیلی اس عقیدے میں پیدا ہوتی ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی ۔

جہاں تک میرا اور میرے بیٹوں کا تعلق ہے میں کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہے، اور اس کی حفاظت میں دے دیا ہے ۔ ہمیں ایسی بڑی امید کا سہارا ہے جسے کوئی مایوسی توڑ نہیں سکتی، نہ دور کر سکتی ہے، مایوسی بے دینی اور بد اعتقادی سے پیدا ہوتی ہے جن کا کہ ہم وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے ہیں، چونکہ ہم کو توفیقِ الٰہی پر بھروسہ ہے، اسی لئے ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ہمیں ہمارے احباب اور ساتھیوں سے کیا مدد پہنچی ہے نہ اس امر کا کہ ہمارے مہربانوں کی کوششیں جلد یا دیر میں بار آور ہوتی ہیں، صورت واقعات پر کچھ زیادہ اثر ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہم ان کی کوششوں کو محسوس نہیں کرتے، یا ہم کو ان کی تدابیر کے موثر یا غیر موثر ثابت ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں، جو وہ نظربندوں کی آزادی کے لئے اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ مجھے اس اصلی دشواری سے جو میرے بچوں کی رہائی کے راستے میں حائل ہیں۔ سرکاری نقطۂ نظر سے سمجھنے کا وہ موقع نہیں ملا جو آپ کو ملا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گی۔ اگر میں آپکی رائے سے پورے طور پر اتفاق نہ کروں، خصوصاً جب کہ آپ اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ بحیثیت اس شخص کے جو ان کا عزیز رفیق ہے مجھے ان تمام معاملات کے اپنے بچوں کے نقطۂ نظر جاننے کا بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ موقع ملا ہے، میں فی الحقیقت بڑی خوشی سے آپکی طرح اس امر کے باور کرنے کے لئے تیار ہوتی کہ اگر جنگ موجودہ نازک صورت اختیار نہ کر لیتی، تو حضور والسرائے اور ان کی ممبران کونسل بطیب خاطر میرے لڑکوں کو رہا کر دیتے، لیکن ان وجوہ کی بناء پر جو مسٹر گھاٹے کہتے ہیں کہ وہ اپنے جداگانہ خط میں آپ پر ظاہر کرنے والے ہیں۔ میں آپکی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آسکتا کہ جب گورنمنٹ کے یہ نیک ارادے ہیں تو پھر محمد علی اور شوکت علی کو اصلاحات ملکی سے متعلق وزیر ہند اور والسرائے سے ملاقات کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، اور اس بات پر کیوں اصرار کیا گیا کہ محمد علی اُس وفد کے رکن بھی نہ ہوں جو منجانب انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ جناب وزیر ہند اور والسرائے کی خدمات میں حاضر ہونے والا تھا، آپ فرماتی ہیں "کہ مسٹر محمد علی ٹرکی کے ساتھ جو بے انتہا گو مجہول ہمدردی ظاہر کر چکے ہیں میرے خیال میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کے بموجب اس خطرے سے خالی نہ تھی کہ کہیں یہ مجہولیت سے عملی صورت اختیار نہ کرے۔

حضور والسرائے سے آپ کی ملاقات کرنے سے قبل یہ امر صاف طور سے نہیں معلوم ہوا تھا کہ ملک معظم کے کس دشمن کے ساتھ میرے لڑکوں نے آزادانہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اب یہ بات صاف ہے کہ میرے لڑکے آسٹرین، بلغارین اور جرمنوں سے نہیں بلکہ صرف ترکوں سے ہمدردی کرنے کے الزام پر نظربند کئے گئے ہیں

اس لئے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آیا حقیقت میں گورنمنٹ کو ہم مسلمانوں کی حالت کا بخوبی احساس بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ہمارے صحیح حالات کے سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں کو ٹرکی سے اس سے زیادہ خاص ہمدردی نہیں ہے جتنی کہ انھیں چین سے ہے، لیکن مثل اور دوسرے لوگوں کے جن کا قرآن مجید پر ایمان ہے انھیں صاف الفاظ میں متعدد جگہ پہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں، اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کریں۔ کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ ٹرکی کے ساتھ ویسے ہی ہمدردی کا آزادانہ اظہار نہ کرے اور اس ہمدردی کی تبلیغ کے لئے کوشاں نہ ہو جیسا کہ وہ مسلمانانِ ایران، ہندوستان و عربستان کے ساتھ کرتا ہے گذشتہ چھ سات سال کا عرصہ دنیائے اسلام کے لئے سخت مصیبت اور رنج کا زمانہ گزرا ہے اور میں فخر کرتی ہوں کہ اس زمانے میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا دیکھا یا سنا، میرے بیٹوں نے اس درد کو محسوس کیا اور ان کے ساتھ رنج میں شریک ہوئے۔ چنانچہ ایران، مراقش اور طرابلس کے مسلمان ٹرکی کے مسلمانوں سے ان کی ہمدردی کے کم مستحق نہ تھے۔ سب کے ساتھ ان کی ہمدردی یکساں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ سب مسلمان تھے اور کلام مجید کی تعلیم کے مطابق وہ سب یکساں ہمدردی کے مستحق تھے۔ یہ بات بھی ناقابل فراموش ہے کہ طرابلس اور بلقان کے ہنگامہ آرائیوں میں مظلومین کے ساتھ جو ہمدردی آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی اس کو وائسرائے و دیگر اعلیٰ حکام گورنمنٹ نے نہ صرف پسند کیا اور اس میں مدد دی بلکہ اعلانیہ اس کو پھیلایا اور مسلمانوں کی اس کے اظہار میں ہمت افزائی کی اور میرے بچوں نے بھی بوجہ سیاسی عقائد بلکہ بطور جزو مذہب کے اس ہمدردی کو آزادانہ طور پر ظاہر کیا اور پھیلایا، اور اس وقت کی بات سے اب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی جس سے اس مذہبی فرض کی بجا آوری کو کوئی جرم یا گناہ قرار دیا جائے۔

اسی کے ساتھ ہی اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ خواہ وہ کسی خطے کے رہنے والے ہوں، ان کے برادرانِ ملّت کی ہمدردی لازمی اور ضروری ہے لیکن اعلیٰ حضرت سلطان ٹرکی کی ایک مخصوص حالت ہے۔ بحیثیت ایک دنیاوی تاجدار ہونے کے وہ دنیا کے ایک خطے پر جو ٹرکی کے نام سے موسوم ہے ایسے ہی حکمراں سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ شاہ کجکلاہ سرزمین فارس میں۔ اور اعلیٰ حضرت امیر افغانستان افغانستان میں سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دنیاوی حکمراں سے جداگانہ سلطانِ ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے مسلم تاجداروں کو حاصل نہیں ہے۔ یہ امتیاز ان اختیارات، مرتبہ اور عظمت کی وجہ سے ہے جو خلافت کے ساتھ وابستہ ہے سلطان المعظم خلیفۃ الرسول یعنی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور امیر المومنین ہیں، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کم سے کم ہماری گورنمنٹ اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ یہ مذہبی مسئلہ (خلافت) غیر مسلمین کے اختیار سے باہر ہے لیکن عملاً اس اعتراف سے کیا فائدہ جبکہ گورنمنٹ ہندوستان کے بہترین مسلمانوں کو صرف اس جرم میں آزادی سے محروم کر رہی ہے کہ وہ اعلانیہ عالمِ اسلامی کے روحانی پیشوا اور اس کی مسلم رعایا سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں، حالانکہ یہ بھی اقرار ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی مجہول تھی یا اس کے جو کچھ بھی معنی ہوں)

میں دوبارہ اس امر پر زور دیتی ہوں کہ مسلمانانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حکمراں کو مذہبی پیشوا ماننا کوئی سیاسی عقیدہ نہیں ہے جس کو اپنی نجات عقبیٰ کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کا دل چاہے تو تسلیم کرے اور نہ چاہے تو نہ تسلیم کرے نہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس کے تسلیم کرنے والے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے جو ہمارے مذہب کی روح سمجھا جاتا ہے اس کے حدود بھی مذہب میں سختی کے ساتھ قائم کئے گئے ہیں جس طرح کہ دوسرے مذہبی مسائل ہیں۔ میں کوئی مذہبی عالمہ نہیں ہوں نہ میرے لڑکے عالم دین ہیں۔ ہم لوگ اس مسئلے میں بھی مثل دوسرے دینی مسائل کے پیشوایانِ دین کی رہنمائی پر کاربند ہوتے ہیں

تاہم اس قدر تو ہماری طرح تمام مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ اپنے برادرانِ مذہب کے ساتھ جس ہمدردی کے برتنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی حدود کل حالتوں میں یکساں اور ناقابلِ تغیّر ہیں۔ کیا میرے لڑکوں نے اس عجیب مسئلہ کو برطانیہ کے ٹرکی کے خلاف، اعلانِ جنگ کے بعد گورنمنٹ کو پریشان کرنے کے لئے تراشا ہے یا یہ مسئلہ اس مذہب کا جزو ہے۔ جو تیرہ سو برس ہوئے مکمل اور نہ بدلنے والی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا گیا تھا۔ جاہل اور غیر معتبر شخصوں کی رپورٹوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے گورنمنٹ کو اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا اگر غور کیا تو اس فیصلہ کے نتائج پر کاربند ہونے کو تیار نہیں جس کے علاوہ سچائی سے وہ کسی دوسرے فیصلہ پر پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ کم از کم اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ میرے بیٹوں نے دشمنانِ بادشاہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار آزادانہ طور پر کیا۔ اور اسی طرح اس ہمدردی کو پھیلایا اور چونکہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ ہمدردی کب اور کس صورت میں ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی۔ اس لئے یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے ان دعاؤں کے غلط معنی سمجھے ہیں جو تمام مسلمان ہمیشہ سے خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کی افواج کے مظفر و منصور ہونے کے لئے مانگتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ صوبہ متوسط کے چیف کمشنر نے شوکت علی کو ایسی دعا مانگنے سے روکا تھا۔ چنانچہ ان دعاؤں کی نسبت جب مذہبی احکام ان کے سامنے پیش کئے گئے تب وہ حکم امتناعی منسوخ کر دیا گیا۔ اگر میرے بیٹوں نے (اس کے علاوہ) کوئی دوسرا طریقہ ہمدردی کا اختیار کیا تو صاف طور سے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔

ہم کو مسلمانانِ ٹرکی سے جو ہمدردی اور سلطانِ ٹرکی سے جو روحانی عقیدت ہے وہ ہمارے ناقابلِ تغیر مذہب کا ایک لازمی و ضروری جزو ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں، انھیں وجہ سے عملی اور مجہول ہمدردی میں جو امتیاز پیدا کیا گیا ہے ہم مسلمانوں کے لئے ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ رہی جذبات کی زیادتی تو اس کی نسبت یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ بمقابلہ فتح و کامیابی کے ہمارے مسلمان بھائیوں کی تکالیف

و مصائب ہمارے دلوں میں ان کے لئے زیادہ ہمدردی پیدا کرتی ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ روسی ہزیمت جس نے بقول آپ کے اگر جرمنوں اور ترکوں کے حوصلے بڑھا بھی دیئے ہوں کس طرح میرے لڑکوں کی ہمدردی اور کامل ترین قانونی آزادی پر اثر ڈال سکتی ہے۔

گورنمنٹ اس امر کی مختار ہے کہ وہ میرے لڑکوں کی رہائی کے لئے شرائط پیش کرے اور جب وہ اُن مجوزہ شرائط کو اپنے تحفظ مذہب کے ساتھ قبول کر لیں تو ان کو واپس لے لیں۔ اگر اُن کا (میرے لڑکوں کا) طرز عمل کسی سیاسی خیال پر مبنی ہوتا تو (گورنمنٹ کا یہ رویہ) اس میں تبدیلی پیدا کر سکتا تھا لیکن ان تکالیف نے جو اس ڈھائی سال کے عرصہ میں انھیں پہونچی ہیں اور جو ان کی سیاسی حماقت بخوبی دور کر سکتی تھیں ان کو اپنے اس ارادے میں اور پختہ کر دیا کہ وہ کوئی ایسا فعل نہ کریں جو ان کی نجات آخری کے مانع ہو۔ اور اس معاملہ میں وہ اپنی رائے کو بلا ان تمام چیزوں کے چھوڑے ہوئے جن کو وہ نہایت عزیز اور مقدس سمجھتے ہیں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کر سکتے اور یقین مانئے کہ یہ الفاظ ایک ماں کے منہ سے نکلے ہیں۔

میری عزیزہ بہن میں نے اس مسئلہ پر آپکی بہت سمع خراشی کی لیکن میں افسوس کے ساتھ یہ بتلانا چاہتی ہوں کہ چونکہ اس مسئلہ پر اس وقت تک پبلک اخبارات میں بھی کوئی ایسا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا اور میں آپکو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ باوجود اپنی عبادت اور گھر کے فرائض کی انجام دہی کے جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ میں تمام اردو اخبارات پابندی کے ساتھ پڑھواتی ہوں اور اکثر انگریزی اخبارات کا بھی خلاصہ کروا کر سنتی ہوں جو مجھے اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ ہماری غیر مسلم حکومت نے ہم مسلمانوں کی مذہبی پوزیشن کو اصلی اور حقیقی صورت میں سمجھا ہے اور اس امر کا اظہار میں غصّہ سے نہیں بلکہ کمال حزن و ملال کے ساتھ کرتی ہوں۔ ہماری وفاداری دنیاوی بادشاہ کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو ہماری کامل مذہبی آزادی کے ساتھ مشروط ہے اور خدا سے ڈرنے والے مسلمانوں کی حیثیت سے ہم دُنیا

کے کسی حکمراں کے ایسے احکام کی تعمیل نہیں کرسکتے جو احکم الحاکمین کے احکام کے خلاف نافذ کئے جائیں اس لیے کہ خدا کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے خواہ وہ اطاعت بادشاہ کی ہو یا ملک کی۔ باپ کی ہو یا ماں کی۔ بھائی کی ہو یا احباب کی۔ میری رائے میں اگر کوئی بادشاہ یا حکومت کسی مسلمان کے اس قرار پر اعتماد کرکے کہ وہ حکومت کی اطاعت کو خدا کی اطاعت پر مقدم رکھتا ہے تو وہ بادشاہ یا حکومت ٹوٹی ہوئی لکڑی کے بل پر کھڑی ہے، میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ دنیاوی حکومتوں کی ضروریات بسا اوقات اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ خدا کی اطاعت ان کی وفاداری کے مساوی سمجھی جاوے اور ہر مذہب کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کی رواداری بعض اوقات دشوار ہو جاوے۔ دنیاوی حکمرانوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ رعایا کے حقیقی مذہبی جذبات سے آگاہ ہوں اور اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق طے کریں تاکہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ رعایا کی مذہبی اطاعت اس کی دُنیاوی اطاعت کے متضاد ہو ہر گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ رعایا کی اس نازک حالت کو پورے طور سے محسوس کرے جبکہ اس کو خدا کی فرمانبرداری اور انسان، یا انسانوں کی ایک جماعت کی اطاعت شعاری میں انتخاب کرنا ہوتا ہے خواہ وہ انسان یا جماعت کیسی ہی اعلیٰ مرتبت کیوں نہ ہو۔ ایسے انتخاب کے وقت دوسرے چاہے کچھ کریں لیکن مُسلمان صرف ایک راستہ اختیار کرسکتا ہے ملک اور بادشاہ کے لئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے اور کرنا چاہیئے کوئی شخص دوسرے سے اس کی روح کے حوالے کردینے کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میرے لڑکوں نے کبھی اپنے مذہبی عقائد کو پوشیدہ رکھا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے عقائد دیگر مسلمانانِ ہند کے عقائد سے مختلف ہیں اس لئے کہ تمام مسلمانانِ ہند بالا اعلان کہہ رہے ہیں کہ جو محمد علی اور شوکت علی کا عقیدہ ہے وہ ہی ہمارا بھی عقیدہ ہے اس لئے ہم سب بھی اگر ان سے زیادہ نہیں تو ان سے کم نظر بندی کے سزاوار نہیں اپنی نظر بندی سے برسوں پہلے انھوں نے بارہا گورنمنٹ کو اپنے عقائد سے مطلع کیا ہے اس لئے ان پر یہ الزام عائد نہیں کیا جاسکتا

کہ انھوں نے دفعتاً گورنمنٹ کے سامنے کوئی انوکھے خیالات پیش کیے ہیں۔ میری عزیز بہن! یہ بہت کمزور قسم کا تدبّر ہے کہ پہلے تو رعایا کے مقدّس عقائد کو نظر انداز کیا جائے اور پھر بعد میں ان کو اُن عقائد رکھنے کے بنا پر سزا دی جائے اگر گورنمنٹ کا منشاء سات کروڑ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرض کے ادا کرنے سے روکنے کا ہے تو چند مسلمانوں کی نظر بندی خواہ وہ کیسے ہی عزیز مذہبی اور سیاسی رہنما کیوں نہ ہوں بہت معمولی سزا ہے۔ کیا مسلمان کا ہر فرد اپنے مقدّس پیغمبر کے اس عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا ہے کہ "تحقیق میری عبادت اور ریاضت حیات و موت اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے جس کا کوئی شریک نہیں میں اس کی طرف سے معمور ہوا ہوں اور اس کی اطاعت گذاری میں سب بندوں سے آگے ہوں"؟ کیا باوجود اس اعتقاد کے کوئی سچا مسلمان نظر بندی، زندان یا موت سے ڈر سکتا ہے؟

میں بہت کچھ لکھ چکی ہوں مگر آپ کی اس تجویز کے متعلق کہ میرے لڑکوں کا مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش کیا جائے اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر میں یہ خط ختم نہیں کر سکتی افسوس کہ میں قانون سے واقف نہیں نہ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہے جو میری رہنمائی کر سکتا۔ مگر میرے لڑکوں کو اس کا کچھ تجربہ ہے اور اُن کے بعض دوست اور ہمارے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے قانون سے بخوبی واقف ہیں اور اس کے عملدرآمد کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میرے لڑکوں کے مقدمہ کے لیے موافق پہلو پر عدالت میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور ہائی کورٹ کا فیصلہ قانون تحفظِ ہند کے جواز یا عدم جواز تک محدود رہے گا جس کو وائسرائے کی کونسل نے پاس کیا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس بات کو منظور کر لیتی کہ میرے بچوں کے اوپر ایک باقاعدہ عدالت میں غیر جانبدار اور منصف ججوں کے سامنے مقدمہ چلایا جائے گو کہ میں جانتی ہوں کہ محمد علی کی شکستہ تندرستی پر ایسے مقدمے کے جوش کا نہایت خوفناک اثر پڑے گا لیکن جو چاہے سو کہے قانون سے فائدہ صرف روپیہ والے اٹھا سکتے ہیں۔ اور اگر اس کے حریف کے تمام اخراجات مقدمہ

خزانہ عامرہ سے دیے جائیں تو ہمارے مالدار سے مالدار آدمی کا بھی دوالہ نکل جائے۔ آپ نے خاص ہمدردی و عنایت سے قانونی اخراجات کے لئے ایک فنڈ کھولا ہے اور ہمیں اپنی جیب خاص سے بھی چندہ عنایت کیا ہے لیکن میں آپ سے صاف طور پر پوچھتی ہوں کہ کیا اس میں کوئی فائدہ بھی ہے۔ اگر ہم نے اپنے حاکموں کے خلاف کوئی فیصلہ کرا بھی لیا تو کیا آپ اُمید کرتی ہیں کہ وہ اس معاملے کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ اور نچلے بیٹھ جاویں۔ اگر ہم آپ کی طرح یہ یقین بھی کر لیں کہ اگر جنگ کی حالت اس قدر نازک نہ ہوتی جتنی کہ آجکل ہے تو وائسرائے اور ان کی کونسل میرے بیٹوں کو بخوشی رہا کر دیتی تو کیا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جنگ اور میرے بچوں کی رہائی کے تاریخ کے متعلق اپنے موجودہ خیالات رکھتے ہوئے وہ میرے بیٹوں کی رہائی کو صرف اس وجہ سے خوشی سے دیکھ سکیں گے کہ ہائی کورٹ ہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسے میرے بیٹوں کو آزادی سے محروم کرنے کا کوئی اختیار نہیں؟ اور کیا وہ ایسی زبردست طاقت (قانون تحفظ ہند) کو اپنے ہاتھوں سے ایسی آزادی کے ساتھ نکل جانے دیں گے اور ہزاروں ہندوستانیوں کو جو اب قید میں پڑے سڑ رہے ہیں آزاد ہوتے دیکھ سکیں گے؟ کیا اس وقت برطانوی پارلیمنٹ سے قانونِ تحفظ ہند کو جائز قرار دینے یا اسی قسم کا کوئی دوسرا قانون بنا دینے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا؟

لیکن ان سب باتوں پر غور کر کے فیصلہ کرنے کا انحصار آپ لوگوں پر ہے جو عام حالات سے بخوبی واقف ہیں مگر میری رائے میں ان باتوں سے بدرجہا زیادہ ضروری ایک اور مقصد کیلئے چندہ کرنا ہے اور وہ مقصد اُن نظربندوں اور ان کے متعلقین کی امداد ہے جو اس نفرت انگیز قانون کی وجہ سے سخت مصائب اور آلام اٹھا رہے ہیں۔ آئے دن ان مُصیبت زدوں کے دردناک قصّے سُنے جاتے ہیں جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو گورنمنٹ نے آزادی سے محروم کر دیا ہے اور پھر ان کو اس بات کا بھی اختیار نہیں کہ کمائی کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکیں اور اس کے ساتھ ہی حکومت نے ان کی گذر اوقات یا ضروریاتِ زندگی

کے لئے اپنی طرف سے کسی قسم کی امداد دینے کے خیال کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی حالتوں میں خودکشی کی خبریں بھی سُنی گئی ہیں۔ میں پھر وہی کہتی ہوں جو میں نے اپنے عزیز بھائی سر سرامنی آئر کو لکھا تھا کہ کوئی صورت ان بدنصیبوں اور ان سے زیادہ بدنصیب ان کے متعلقین کے لئے جن کی معصومیت میں قطعی کلام نہیں روپیہ مہیا ہونے کی ہو سکتی ہے؟ گزشتہ ڈھائی برس میں حکومت کے قطعی ناکافی امدادی رقم میں گذر اوقات کرنے کا جو تجربہ مجھے ہوا ہے اس سے اندازہ کر سکتی ہوں کہ ان لوگوں کو ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے کی کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا جو ہم سے بھی زیادہ بدقسمت ہیں۔ ہمارے پاس کچھ جائیداد تو ہے جو سخت ضروریات کی حالت میں فروخت کی جا سکتی ہے (کچھ عبارت مٹ گئی ہے) جو ہماری تکلیف کی خبر سنتے ہی اس کو رفع کرنے کے لئے مستعد ہوتے ہیں۔ علاوہ مالی امداد کے یہ خیال کر کے بھی بہت ہمت بندھتی ہے کہ اگر ہم جلاوطن یا شہر بدر ہیں تو ہمارے ان ہم وطنوں کو ہماری حالت کا احساس ہے جو آزاد ہیں اور آرام بلکہ عیش کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ صرف ان بیسیوں مسلمانوں کا جس میں زیادہ تر مذہبی رہنما یا مقدس کتابوں کے پڑھنے والے ہیں۔ جن کے متعلقین کی مصیبتوں کا حال اُردو اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے بلکہ سینکڑوں بنگالی نوجوانوں کا خیال کر کے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے جو مختلف جگہ نظر بند ہیں اور جن میں سے بعض تنہا کوٹھریوں میں قید ہیں اور جنھوں نے دوامی فاقہ کشی کا مستقل ارادہ کر لیا ہے کہ یہ ہماری حب الوطنی پر ایک بدنما دھبہ نہیں کہ تقریباً تین سال تک ایک نفرت انگیز قانون پر سختی کے ساتھ عملدرآمد ہونے کے باوجود ہم نے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا جس سے ایک تفصیلی یادداشت تمام نظر بندوں کی رہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون کون شخص اور کس کس جگہ نظر بند ہیں یا کس وجہ سے نظر بند کئے گئے ہیں۔ اور کس قسم کی قیود ان پر عائد کی گئی ہیں اور بعد میں اکثر بغیر کسی سبب کے ظاہر کئے ہوئے ان پر کس قسم کی تازہ سختیاں

عائد کی گئی ہیں۔ ان کے لئے اور ان کے متعلقین کے لئے جن کی پرورش ان پر لازمی ہے کس قدر وظیفہ مقرر ہے اور نظر بندی سے پہلے جس طریقے سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس کو خیال کر کے ان کی بسر اوقات کے لئے اُن کو مقررہ امداد کے علاوہ کس قدر دیگر امداد کی ضرورت ہے اور نظر بندوں کے وظائف مقرر کرتے وقت ان امور کو بالعادات فراموش کر دیتی ہے۔ نظر بندوں کے متعلق کفالت کا انتظام ان بچوں کی مناسب تعلیم گورنمنٹ کے پاس ان کی (تحریر مٹ گئی ہے) سلسلہ میں قائم رکھنا اور نظر بندوں کو مقامی حکام کے جائز استعمال اختیارات سے بچانے کے لئے جو بعض اوقات اس حکومت سے بھی زیادہ ان لوگوں سے ناراض ہوتے ہیں جن کے حکم سے یہ لوگ نظر بند ہوئے ہیں اور جو عملی تشریحات اور شہر والوں پر خفیہ سرکاری دباؤ ڈال کر نظر بندوں کی پابندیوں کے اضافہ کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان تمام اُمور کے متعلق یادداشت کا مرتب کرنا میرے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کے انتظام کی راہ میں کوئی ایسی دشواری حائل نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی تدابیر پر بھی عمل کیا جائے جو نظر بندوں کی رہائی کے لئے مناسب سمجھی جائیں خواہ وہ قانونی چارہ جوئی ہو یا سرکاری عمال سے اپیل ہو اور یا برطانوی قوم اور پارلیمنٹ سے درخواست ہو یا خود اپنی ہی قوم کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نظر بندوں کے شریکِ حال ہوں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ خوش قسمتی سے میرے بچوں کو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پوری مدد مل جاتی ہے مگر دوسرے لوگ ایسے خوش قسمت نہیں ہیں اور ان کی طرف خاص طور سے دست امداد بڑھانا چاہیئے۔ ان بچاروں نے پبلک لائف میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی اور جب کہ ہم چند مشہور لوگوں کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں جو اپنی قومی کوششوں کے باعث مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ جو زیادہ مشہور

نہیں ہیں بھلا دیئے جاویں اور اگرچہ ان کی تکلیف دوسروں سے زیادہ ہیں اور ان پر کسی سے کم زیادتی نہیں ہوئی ہے۔

ایک اور امر ہے جس کے متعلق زیادہ نہیں تو سرسری اشارہ کرنا چاہتی ہوں اور وہ شاہ آباد اور گیا و پٹنہ کے اضلاع میں عیدالضحیٰ کے موقع پر فسادات کے جگر خراش واقعات ہیں ان واقعات کا مسلمانان ہندوستان پر قدرتاً بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اثر اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ان مسلمان مردوں اور عورتوں کی خوفناک مصیبتوں اور مذہبی توہین کا آپ کو بھی انتہائی افسوس ہوا ہے جتنا کہ مجھے۔ میرے دل پر ان واقعات کا جیسا کہ چاہیئے بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ واقعات ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوئے جبکہ ان کو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ان حادثات نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہمیں اس مذہبی تعصباب کی کتنی بیخ کنی کرنی باقی ہے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور جن کو ہمارے حریف ہم کو ہمارے گھر کی ملکیت سے محروم رکھنے کا بہانہ بنائے ہوئے ہیں جو کچھ ہم کر چکے ہیں ہمیں اس پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دل سے کوشش کرتے رہنا چاہیئے کہ اس قسم کے ناگفتہ بہ واقعات دوبارہ ظہور پذیر نہ ہوں اور خاص کر اس وقت میں جبکہ برعکس موجودہ زمانے کے ہم خود اس قسم کے بدنظمی کے انسداد کے تمام وکمال ذمہ دار ہوں۔ یہ معلوم کر کے مجھے تسکین ہوتی ہے کہ باہمی شکوہ و شکایات کے باوجود ہماری قوم اس وقت کی شدید ترین ضرورت کو نظر انداز کر رہی ہے اور وہ ضرورت ان سے زیادہ مصیبت زدوں کی امداد کرنا ہے۔ جن کے پاس نہ پیسہ ہے نہ روٹی نہ کافی کپڑے ہیں نہ رہنے کا جھونپڑا ہی ہے جسے وہ اپنا گھر کہہ سکیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ان کی مدد کرنے کے لئے اور زیادہ کوشش کی جائے۔

ایک بات جس پر میں فخر کرتی ہوں اور جسے دیکھ کر مجھے مسرت ہوتی ہے یہ ہے کہ ان جگر خراش واقعات نے میرے ہم مذہبوں کے عقیدے میں کوئی فرق

نہیں ڈالا ہے کہ بالآخر ہندوستانی مفاد ایک ہی ہے نہ ان واقعات نے ان کے اس عزم میں کسی قسم کی کمزوری پیدا کی ہے کہ اقوام عالم میں جس درجہ اور مرتبہ کا ہندوستان ایک مدت سے مستحق ہے اس کو بلا توقف حاصل کرنا چاہیئے۔ خودغرض اشخاص کروڑہا بے زبان ہندوستانیوں کی ترجمانی کرنے کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن وہ کتنا ہی حقیقت کو چھپانا چاہیں اور وزیر ہند صاحب سے جن کا ہم نے خوشی سے خیر مقدم کیا ہے ملنے والوں کے بجائے وزیر ہند کے خود انتخاب کر کے کتنے ہی واقعات کی پردہ پوشی کرنا چاہیں کبھی وزیر ہند صاحب اس امر کو بغیر محسوس کئے ہوئے نہیں رہ سکتے کہ باوجود اس اشتعال کے (واقعات اضلاع شاہ آباد، گیا، پٹنہ) سمجھدار مسلمانوں کی حب الوطنی مثل سابق کے ہے۔ اور وہ اس راہ سے جو انھوں نے اپنی قوم کے لئے بڑے غور و فکر کے بعد طے کی تھی منحرف نہیں ہوئے۔ ان بے انتہا پریشان کن حادثات کے صدمہ کے موقع پر وہ ثابت قدم رہے ہیں۔ اس سے بہترین طور پر ثابت ہے کہ مسلمان اپنے قومی احساسات کو محو کئے بغیر تمام ملک کے ساتھ کس قدر خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ مجھے ایک طرح خوشی ہے کہ یہ سانحات خاص ایسے ہی وقت میں ظہور میں آئے۔ یہ ہوم رول کا ابتدائی پھل یا مزہ نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کا رعایا کو جواب دِہ ہونے کا لوازمہ ہے۔ میں دُعا کرتی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ مسلمانوں نے ان واقعات سے پریشان ہوئے بغیر اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا جو تہیہ کر لیا ہے اس کے اجر میں امن و عافیت اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے ان کو کامل آزادی اور پوری ذمہ داری ملے گی۔ اور یہی چیزیں امن و انتظام اور کامل رواداری کی بہترین ضمانت ہیں۔

عزیز بہن! میں اب آپ سے جُدا ہوتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ کلکتہ میں قوم کے بحث و مباحثہ میں کامل غور و خوض کے بعد آپ کامیابی کے ساتھ اس کی راہ نمائی کریں۔

میں صرف یہ اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ یہ خط میں نے مسٹر گھاٹے کی مدد سے

لکھا ہے جو دو سال سے ہم لوگوں کے پاس آتے جاتے ہیں اور ہمارے تمام حالات سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ مجھے مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے کیونکہ گذشتہ ستمبر میں جو خط میں نے اخباروں کو بھیجا تھا اس کے بابت سرکار نے غلطی سے یہ یقین کر لیا کہ اس کو میرے بیٹوں نے لکھا تھا۔ اور اس بنا پر ان کو دھمکی بھی دی گئی کہ اگر ان سے وہ خطا جس کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے دوبارہ سرزد ہوئی تو ان پر اور زیادہ قیود لگائی جاوینگی۔

اگر وہ آزاد ہوتے تو میں قدرتاً ان سے امداد لیتی لیکن جیسا کہ آپ جانتی ہیں ان کے آزاد نہ ہونے کی وجہ سے مجھے مسٹر گھاٹے سے متعدد بار مدد لینا پڑی۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ ہم غریب پردہ نشینوں کو کس قدر ناقابل خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرے زمانے کی بیبیاں اسکول اور کالجوں میں نہیں جاتی تھیں لیکن تعلیم ہمیشہ سے اس قسم ہی کی درسگاہوں میں نہیں دی گئی ہے اور آج بھی تعلیم صرف ان ہی کے ذریعہ سے نہیں دی جاتی ہے۔ میں خود ایسی عورتوں سے واقف ہوں جن کو میری طرح کم سنی میں بیوگی میں تمام بار برداشت کرنا پڑے جن کا تعلق مردوں سے تھا۔ اور انھوں نے ان غیر معمولی خدمتوں کو اس عمدگی سے انجام دیا کہ جو نہ صرف ان کے لئے قابل تعریف ہے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی مفید ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ستمبر کے سادہ بیان میں کونسی ایسی بات تھی جو مسٹر گھاٹے جیسے یونیورسٹی کے قابل گریجویٹ اور تجربہ کار شخص کی قابلیت سے باہر تھی۔ میں نے مسٹر گھاٹے کو بڑی محنت کے ساتھ وہ تمام باتیں سمجھا دی تھیں جو میں لکھوانا چاہتی تھی۔ اور پھر آخر میں اس بات کا اطمینان بھی کر لیا تھا کہ جو میں چاہتی تھی وہ ہو گیا۔ غالباً اس بات کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ جب بدقسمتی سے ان معصوم بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تو یہ غریب پردہ نشین ماں تھی جو ان کی تعلیم کی منتظمہ و نگہبان تھی۔ اور آج بھی ان تمام گھر کی مالک ہے اور تمام اہم معاملات میں کم از کم ان سے مشورے کئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

ان کی ماں جو ان کے ساتھ زبردستی کے جلاوطنی میں رہ کر خود بخود اپنے آپ کو چھنڈواڑہ سے باہر بقیہ دنیا سے کلیتہً علیحدہ نہ کر سکی تو اس میں نہ میرا کوئی بس

ہے نہ ان کا۔ یہ خیال کرکے ان کو کچھ تسکین ضرور ہوگی کہ اگرچہ پہلی مرتبہ بغیر کسی وجہ یا سبب کے ظاہر کئے ان پر مزید قیود عائد کی گئی تھیں۔ اور ان کی تمام فکر و احتیاط حکام کے ناجائز استعمال اختیارات سے ان کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ اس مرتبہ ان کو بوڑھی ماں کی بدولت یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ ان کو یہ معلوم ہوگا کہ کس گناہ کی پاداش میں ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ چاہے وہ اپنے مذہبی عقیدہ کے باعث مصیبت جھیل رہے ہوں جیسا کہ سرکاری باتوں سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، یا اپنے ملک کی بدولت جس کی خدمت گذاری میں انھوں نے ان لوگوں کی ناراضگی اور کینہ کے باعث مصیبت اٹھائی جنھوں نے حکومت کا اجارہ لے لیا ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس بات کا فیصلہ ہے کہ ان کو آزاد کیا جائے یا نہیں؛ میں دعا کرتی ہوں اور آپ سے بھی دعا کرنے کی درخواست کرتی ہوں کہ خدا یا آخر تک ان کو برداشت کی قوت دے۔ خواہ اس قید ستم کی انتہا قریب ہو یا دور میرا کامل یقین ہے کہ فتح حق و انصاف اور صداقت ہی کی ہوتی ہے۔ ہم بھروسے کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے ہیں اور جب تک وہ حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک جیسا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ صبر و دعا سے کام لیتے ہیں۔"

انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۶ء	آپ کی عزیز بہن
(چند اہم خطوط: تذکرہ ص ۲۳ تا ۲۸)	(آبادی بانو عبدالعلی بیگم)

جب محترمہ بی اماں کو ہندوستانی خواتین کے اس وفد کا ایک رکن مقرر کیا گیا جو ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والا تھا تو انھوں نے اپنی عدم شرکت کی وجوہ کی توضیح کرتے ہوئے مسز سروجنی نائیڈو (؟) کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

""اس کے علاوہ چند اور امور ہیں جن کو میں نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ آپ کو جتا دینا چاہتی ہوں اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ میری تحریر کا مطلب

غلط نہ سمجھا جائے گا۔ خواہ باہر کے لوگ جو ہمارے ملک کو مشکل ہی سے دنیا کا کوئی ملک خیال کرتے ہوں گے۔ ہندوستان کی مُصیبت زدہ پردہ دار عورتوں کے متعلق کچھ بھی خیال کیوں نہ کریں مگر آپ جانتی ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ اپنی چھوٹی سی حکومت میں کیا حیثیت رکھتے ہیں عورتیں اپنے گھروں کی ملکہ ہوتی ہیں اور ہمیں اپنے گھروں میں کس قدر وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کے لئے نئے طریقے اختیار کریں اور یہ بھی قابلِ اجازت ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی اپیلوں کو لے کر غیروں کے سامنے بھی جائیں خواہ ہم اپنے مقصد کی کامیابی کے متعلق کتنے ہی مشتبہ کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر کیا میں آپ سے دریافت کر سکتی ہوں کہ آیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اپنی متحدہ چاردیواری کے اثرات ڈال کر اپنے بیٹوں، بھائیوں یا باپوں سے مطالبہ کرتے۔ بجائے اس کے کہ ہم بھکاری کے طور پر کسی دوسرے کے پاس جائیں خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس معاملے میں میری رائے بہت سخت ہے اور آپ کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک ایسی عورت کی رائے ہے جو پُرانے زمانے کی ہندوستانی عورت ہے مگر وہ اپنے آپ کو نئے خیالات سے بھی بہرہ ور رکھنے کی کوشش کرتی ہے:

اس کے بعد اسی خط میں آپ لکھتی ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی وفد پرانے ایام میں کسی ہندو یا مسلمان بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو اسے "رعایا کے باپ" سے ۹۹ فیصدی وہ ثمر مراد حاصل ہو جاتا جس کا وہ طالب ہوتا، خواہ اس کے عطیے سے مردوں کو متعدد بار بھی انکار کیا جا چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ خیال کرتا کہ اس طرح اس کی غیر معمولی عزت کی گئی ہے۔ اس کے قصر کے طائر اس واقعے کے راگ گاتے اور لوگ اس بادقار کو رانہ دار بنا دیتے۔ آپ کے وفد کے نتیجے کی نسبت میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر ہماری یہی بہادر بہن مسز بیسنٹ کے ساتھ ان کی اس کوشش اور جد و جہد کی وجہ سے جو

انھوں نے سلطنتِ برطانیہ کو دوام بخشنے کے لئے کی ہے جو کچھ برتاؤ ہوا اس کو مدنظر رکھ کر میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتی ہوں کہ بہادر اینگلو انڈین پریس کی طرف سے آپ لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو گا۔ کاش ہندوستانی عورتوں کی عزت کی خاطر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مردوں کی عزت کی خاطر کوئی ایسا وفد وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے نہ جاتا۔ بلکہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس جاتا اور نہایت صفائی سے اعلان کر دیتا کہ ہندوستان کی خواتین اپنے مردوں سے کیا چاہتی ہیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ عورتیں جو کچھ طلب کرتیں مرد جلد یا بدیر ان کے مطالبات پورے کر دیتے۔ یہ تمام دنیا کی تاریخ کا ایک سبق ہے۔ یہ آخری وجہ جو آپ اپنے مدراس کے وفد میں شریک نہ ہونے کے متعلق پیش کرتی ہیں وہ ذاتی ہے۔ امید ہے کہ اینگلو انڈین حضرات اور مسٹر مانٹیگو اس کی پورے طور پر قدر کریں گے۔

تمام باتوں کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ میں کس وجہ سے مدراس میں آپ لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہو سکونگی اور یہ وجہ میری ذاتی وجہ ہے۔ صاحب وزیر ہند ایک آزاد ملک سے آئے ہیں اور آزاد آدمی کی حیثیت سے وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں سے ملیں اور گفت وشنید کریں جن کی حیثیت یہ ہو کہ وہ انھیں بتائیں کہ ہمارے ملک کی ضروریات کیا ہیں اور ہم اپنے ملک کی بہبودی، خوشحالی، اس کو بلند کرنے کے لئے کیا چاہتے ہیں مگر طاقت اور انگریزی سرکاری ملازمین نے جو تحقیقات سے خواہ ان کے کسی اہل ملک کے ہاتھوں کی جائے یا کسی ہندوستانی کے ہاتھوں سوائے کچھ کھونے کے کچھ حاصل نہیں کرتے۔ یہ مناسب خیال کیا کہ جس وقت تک صاحب وزیر ہند اس ملک میں رہیں ہم لوگوں کی طرح پردہ نشین رہیں اور ان لوگوں سے نہ ملیں جو نہایت آزادی کے ساتھ صورت حال کو ان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔ ان لوگوں میں میرے نظربند بچے بھی شامل ہیں اور جن کو ملنے دیئے جانے کی اجازت سے گورنمنٹ ہند نے انکار کر دیا۔ یہ نہایت تعجب انگیز امر ہو گا کہ صاحب وزیر ہند جن کی رگ و پے میں ایک آزاد ملک

میں پرورش و نشوونما پانے کی وجہ سے آزادی کی روح ہے۔ ان کو تو مشرقی ملک کی آب و ہوا میں رہنے کے قابل بنانے کے لیے پردہ میں رکھا جائے اور میں جو پردہ نشین عورتوں کی طرح پلی ہوں پردہ سے نکل کھڑی ہوں۔ اگر میں رسم و رواج کو چھوڑ کر (وفد میں شریک ہونے کو) تیار بھی ہو جاؤں تو یہ ممکن ہے کہ اسی دوران میں صاحب وزیر ہند پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ میں ان سے اہم معاملات مثلاً مذہبی عزت و احترام، ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی زندگیوں اور آزادی کے متعلق کچھ نہ کہہ سکوں میں ان سب باتوں کو ایک ایسی لازوال قوت کے سامنے پیش کرنے کے لئے اٹھائے رکھتی ہوں جس کی ذات کسی التجا کرنے والے کو نا امید کرنے سے بہت اعلیٰ ہے اور جو خود لوگوں کو التجائیں پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ انھیں پورا کیا جائے" (اخبار جمہور کلکتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۱۸ء)

وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والے زنانہ وفد کی فہرست میں بی اماں کا اسم گرامی اخبارات میں دیکھ کر مدراس کے آنربیل یعقوب حسن نے آپ کو دعوتی خط تحریر کیا کہ آپ مدراس تشریف لائیں تو میرے یہاں قیام فرمائیں جواباً جو خط تحریر کیا گیا (۷ر دسمبر ۱۹۱۷ء) اس کا بقول ایڈیٹر اخبار "مدینہ" "ایک ایک حرف غیوری کا نقش اور خدا پرستی کا نشان ہے"۔ وہ فرماتی ہیں ...." علاوہ ازیں میں نہیں جانتی کہ اس وفد کی کون سی ضرورت ہے جو مطالبات ہندوستان کی عورتیں پیش کرنا چاہتی ہیں ان میں سے چند تو ایسے ہیں جن کو ہمارے مردوں کو ہی پیش کرنا چاہیئں۔ ہاں اگر وہ مطالبات کو مردانہ وار پیش کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو ہم عورتوں کا فرض ہوتا کہ خود جا کر ان کو وزیر ہند کے سامنے پیش کرتے اور اپنے مردوں کو غیرت دلاتے۔ مگر خدا کے فضل سے مردوں نے اب تک ایسی کمزوری نہیں دکھائی ہے کہ ہمیں انھیں غیرت دلانے کی ضرورت پیش آئے۔ باقی مطالبات جو عورتوں کے مخصوص حقوق سے متعلق ہیں ان کے بارے میں کیا یہ کہنا مناسب ہے کہ انھیں اپنے مردوں کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کریں اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جس سے مردوں اور عورتوں دونوں

کی شبکی ہے۔ خاص میرے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کہ وزیر ہند وائسرائے گورنمنٹ کے مشورے پر مرد ہو کر میرے لڑکوں سے پردہ کرتے ہیں تو مجھے تو عورت اور پردہ نشین ہو کر اُن سے اور بھی زیادہ پردہ کرنا چاہیئے۔ مجھے نہ اپنے لئے اور نہ اپنے بچوں کے لئے ان سے کچھ مانگنا ہے۔ میرے لئے خدا کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور دن ورات میں کم از کم پانچ سات بار اس چوکھٹ پر سر جھکاتی اور ہاتھ پھیلاتی ہوں جو مجھے درکار ہے صرف وہیں سے مل سکتا ہے اور جب اس کا ملنا مناسب ہو گا آپ مل رہے گا۔ مجھے میرا خدا کافی ہے"۔ (اخبار مدینہ بجنور ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء بحوالہ قومی رپورٹ)

اسی دوران علی برادران کی اسیری سے متعلق اہل وطن کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی لیکن ان کی رہائی کیلئے ملک کے مختلف گوشوں اور تنظیموں کی طرف سے اٹھائی گئی ہر آواز برطانوی سامراجیت سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے کلکتہ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے محترمہ بی اماں ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ تشریف لائیں عوام کے بے پناہ جوش وعقیدت کے درمیان وہ "اجلال سکندری اور شانِ جمشیدی کے ساتھ کلکتہ میں داخل ہوئیں شاید اس ملکۂ حریت کے استقبال کو شکوہ اسکندری یا جلالت جمشیدی کے ساتھ تشبیہ دینا غلط ہے کیونکہ جلوس شاہانہ ہمیشہ استبداد کا علم بردار ہا ہے اور ظاہر داری کا منظر عام ہوتا ہے۔ عقیدت واخلاص سے شاید ایک متنفس بھی اس میں شریک نہ ہوتا۔ مگر اس بے تاج کی ملکہ حریت کے جلوس استقبال سے اس خلوص وعقیدت کی آوازیں ہمارے کانوں میں آرہی ہیں جو گدایانِ الٰہی کے سوا ملوک اقالیم کو نصیب نہیں ہوتیں۔"

(مدینہ بجنور یکم جنوری ۱۹۱۸ء)

کلکتہ میں کانگریس کا دوسرا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بی اماں کی موجودگی میں ہوا اس میں علی برادران کی رہائی کا ریزولیوشن متفقہ رائے سے منظور

کیا گیا۔ اجلاس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جناب قاضی عبدالغفار نے اپنے اخبار "جمہور" میں لکھا "۲۸ر دسمبر کو ۱۲ بجے مسز بیسنٹ کے تشریف لانے کے غلغلے سے کانگریس کا پنڈال گونج اٹھا اور اس وقت جو نظارہ مادرِ ہند کے فرزندوں نے دیکھا وہ کانگریس کی ۳۲ سالہ تاریخ میں پہلا نظارہ تھا۔ کانگریس کے سربرآوردہ فدائیوں کے حلقے میں سن رسیدہ محترم خاتون (مسز بیسنٹ) برقعہ پوش قابلِ احترام خاتون (والدہ محمد علی)، مسلمانوں کے ہر دلعزیز اور سچے فدائیوں کی ماں کا بازو پکڑے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئیں۔ مسٹر محمد علی و شوکت علی کی والدہ کے داخل ہونے کا صحیح خاکہ پیش کرنا سخت مشکل ہے مگر ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ آگے آگے والنٹروں کی ایک جماعت تھی اور اس کے بعد محمد علی کی والدہ سپید برقعہ اوڑھے لکڑی کے سہارے چل رہی تھیں۔ مسز بیسنٹ ان کا بازو پکڑے ہوئے تھیں اور ان دونوں خواتین کے جلو میں ہندوستانی سیاست کے تاج کے درخشاں ہیرے تھے جن میں مسٹر تلک کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ سادہ مگر دلوں پر اثر کرنے والا جلوس بندے ماترم، محمد علی، شوکت علی کی جے کی پرجوش آوازوں میں سے ہو کر ڈائس تک پہنچا۔ محمد علی و شوکت علی کے متعلق ریزیولوشن پر تقریر کرنے کے لئے مسٹر تلک کو مدعو کرتے ہوئے مسز بیسنٹ نے فرمایا" محمد علی و شوکت علی کی والدہ ماجدہ آپ لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔۔۔ آپ نے اپنے بچوں کی تربیت و تعلیم اس طرح کی کہ آج وہ بچے مسلمان اور مخلص محبِ وطن ہیں۔ آپ میں نسوانی محبت کا جذبہ ہے مگر آپ کے پہلو میں شیر کا دل ہے۔ آپ رنج و افسوس نہیں کرتیں بلکہ آپ خوش ہیں کہ آپ کے فرزند ملک کی خدمات کے قابل ہیں۔

ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے بال گنگادھر تلک نے کہا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ محمد علی و شوکت علی کو چھوڑ دیا جائے یا حکومت مقدمہ چلائے گورنمنٹ کو آئینیت کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہ وقت عجیب و غریب ہے کہ اس ریزولیوشن کو ہم ان کی والدہ کی موجودگی میں پاس کر رہے ہیں۔ بہادر بچوں کی والدہ ہونے کا جو اعزاز انھیں حاصل ہے وہ بہت با وقعت ہے اس وقت ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے

کہ آپ اس سختی کو بھول جائیں جو گورنمنٹ نے آپ کے بچوں کے ساتھ کی ہے ہم سب کو آپ سے ہمدردی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ ملک ایسی بہت سی بہادر مائیں پیدا کرے ... مسٹر ایس ایس سیتا مورتی نے ریزو لیوشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا" اب میں ایک بات اور کہہ کر اپنی تقریر ختم کردوں گا۔ ہندو شاستروں میں لکھا ہے کہ قومیں دولت اور روپے سے سربلند اور سرتاج نہیں ہوتیں بلکہ اپنی قربانیوں سے، وہ قربانی جو حق و صداقت کے لئے ہو۔ نظر بند علی برادران نے قربانی کی اور ملک نہ صرف ان کے سامنے خراج وفاداری اور اطاعت پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان کی والدہ کے سامنے بھی سر نیاز خم کرتا ہے"۔

(اخبار جمہور کلکتہ، ۸ رجنوری ۱۹۱۸ء)

۳۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو کلکتہ میں ہی منعقد ہوا بی اماں کی طرف سے ایک پیام بنام مسلمانانِ ہند پڑھا گیا جس کے ولولہ انگیز الفاظ نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی پڑھنے کے فرائض محترم قاضی عبدالغفار نے انجام دیئے۔ دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق بی اماں کے پیغام عمل کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔

(سیرت محمد علی، رئیس احمد جعفری۔ ص ۲۶۰)

ملک کے سبھی اخبارات نے اس کا مکمل متن شائع کیا جو درج ذیل ہے۔

"ملکۂ حریّت کا پیام"

مسلمانانِ ہند کے نام

یعنی ام الاحرار مسٹر شوکت علی و مسٹر محمد علی کی والدہ مکرمہ کا پیام جو ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرزندانِ اسلام۔ میرے عزیزو اور بچو۔

آج کا دن جب کہ تمہاری مجلس میں پہلی دفعہ اور شاید آخری دفعہ (اس لئے کہ اب عمر کی آخری منزل آ لگی ہے) آئی ہوں۔ میری زندگی میں اس قدر عجیب نہیں جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں عجیب اور معنی خیز ہے۔ جس محبت اور جوش کے ساتھ تم نے میرا خیر مقدم کیا اس کا اجر سوائے خدائے کریم کے اور کوئی نہیں دے سکتا لیکن تم نے اپنی محبت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا جو انشاء اللہ تادمِ مرگ میرے صفحۂ دل سے محو نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ جوش ہمیشہ قائم رہے اور اسلام کی خدمت میں صرف ہو۔

بیوگی اور مصیبت کے ۴۵ سال میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کاٹ دیئے اور اس آخری وقت میں جب کہ گور کی اندھیری کوٹھری میں جانے کا وقت ہے نہ کہ گھر سے باہر نکل کھڑی ہونے کا۔ میں یہاں تمہارے روبرو آ موجود ہوئی۔ ع

میرے دریائے بیتابی میں ہے ایک موجِ خوں یہ بھی

مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے روبرو آئی ہے نہ اس لئے کہ آوارۂ وطن ہو کر اور چھندواڑہ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں اگر میں محض اپنے بچوں کی عافیت و خیریت کی طلبگار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی یا ان مصائب کی داستان سناتی جو ہر ایک سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنے پڑتے ہیں، تو یقین جانو تمہارے دل غم سے بھر آتے مگر میں ان اغراض کے لئے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں بلکہ صرف ایک پیغامِ عمل لے کر آئی ہوں اور یہ پیغامِ عمل نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا اور جنھوں نے میری گود میں پرورش پائی۔ یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل شوکت علی و محمد علی

جیسے بچوں کی محبت سے لبریز ہونا چاہیئے میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی جذبات محبت مادری سے ناآشنا نہیں لیکن میرے عزیزو، یاد رکھو کہ تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو تمہارا قدرتی رشتہ ہے اس رشتہ سے زیادہ مستحکم ایک اور تعلق بھی ہے جس کو تم بھول تو سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔

وہ رشتہ، وہ تعلق، وہ قرابت ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشۂ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا اس جادو کا نام "اسلام" ہے اور وہ منتر

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ہے۔ میرے بچو اگرچہ تم بھی ماں کی محبت بھری گود میں، اور باپ کے سایۂ حفاظت میں پلے ہو مگر یاد رکھو کہ تم سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو۔ دنیا کے تمام رشتے ایک سانس کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں مگر رشتہ مذہب تمہارے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔

فرزندانِ اسلام تم نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ کا افسر اُن کے پاس کچھ شرائط لے کر آیا تھا اور وہ وقت شوکت علی اور محمد علی کے لئے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ انسپکٹر خفیہ ان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہو گا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور شوکت علی و محمد علی سے کیا کہا۔

میں نے خفیہ کے انسپکٹر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دے اور ان کو اچھی طرح بتا دے کہ اگرچہ اس ضعیف اور سن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ شوکت اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف ہو، وہ مفاد ملک کے منافی ہو گی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراطِ مستقیم سے پلٹ سکیں میں انشاءاللہ

اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ میرے عزیزو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے وطن کی آسائش کو محبت مادری کی وجہ سے چھوڑا، اور نظر بندوں کے ساتھ دردر خاک چھانتی پھرتی ہوں تو بیجا نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنا کچھ سکھادیا ہے کہ میرا دل اب دنیوی تعلقات سے آزاد ہو گیا ہے۔ میرا اصلی مدعا جس وجہ سے میں مہرولی سے لینیڈون اور لینیڈون سے چھندواڑہ جاتے وقت ان کے ساتھ رہی صرف یہی نہیں تھا میں جانتی ہوں کہ جس راہ حق پر وہ چل رہے ہیں وہ مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ گو میرے بچے ہمت والے ہیں پر مجھ سے زیادہ تجربے کار یا مجھ سے زیادہ گرم و سرد دیکھے ہوئے نہیں، مجھے ان کے ایمان پر بھروسہ ہے پھر بھی میں ان کے ساتھ ہوں کہ اگر ذرا بھی ان کے ارادے میں خامی، ان کے ایمان میں تزلزل، ان کے عزم میں کمزوری دیکھوں تو ٹوک دوں اور کہدوں کہ بس! آگے گمراہی اور ضلالت ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں نے دو سال سے زیادہ خاموشی کے ساتھ اس طرح گزار دیئے کہ گویا میں خود بھی شوکت و محمد علی کے ساتھ نظر بند ہوں، لیکن اب تم پوچھو کہ اس دو سال کی خاموشی کے بعد مجھے کس چیز نے کھینچ کر یہاں بلایا، تم سوال کرو کہ میں دنیا کی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر یہاں کیوں آگئی، کیا طاقت تھی جو مجھ کو چھنڈواڑے سے کلکتہ لے آئی، میں تمہیں ابھی بتاؤں گی! جس وقت تک کہ میرے لڑکوں کی آزادی کا مسئلہ معرض بحث میں نہ آیا۔ میں خدا پہ بھروسہ کئے صبر و شکر کے ساتھ بیٹھی رہی اور شاید اسی طرح بیٹھی رہتی اس لئے کہ مصائب و مظالم میرے لئے خوفناک چیزیں نہیں ہیں۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ میں خود اپنا پیام لے کر نکلوں حکومت کے خودغرضی

اور انتقام پسند عمال نے جب دیکھا کہ شوکت علی اور محمد علی کی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے تو ان پر ایک ایسا الزام لگایا گیا جس کا جواب دینا ان پر فرض ہو گیا اور ان سے زیادہ مجھ پر اس لئے کہ میں ان سے زیادہ آزاد تھی۔ وہ الزام یہ تھا کہ میرے بچے ترکوں سے جن کا اس وقت حکومت کے دشمنوں میں شمار کیا جاتا ہے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ اے فرزندانِ اسلام آج میں تمہارے سامنے کہتی ہوں کہ یہ الزام اسلام کی ایک ایسی توہین ہے ایک ایسی اہانت ہے جس کو کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب دینا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کیا رشتۂ اخوتِ اسلامی کو کسی حکومت کے بے معنی شبہات اور جابرانہ احکام کاٹ سکتے ہیں؟ کیا حمیت و غیرت مذہبی کی اس عمارت کو جس نے تیرہ سو برس تک زمانے کے بہت سے طوفان دیکھے ہوں حاکموں کی ناراضگی اور خفگی صدمہ پہنچا سکتی ہے۔ اے مسلمانوں آج میں تم سے اپنے اس سوال کا جواب مانگتی ہوں! کیا کل مسلم اخوۃ کے کوئی معنی نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، ٹرکی میں ہوں یا مراقش میں افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہوں یا شام کے سبزہ زاروں میں ہمدردی نہیں اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی اور محمد علی ہی باغی نہیں ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان باغی ہیں، اور اگر حکومت نے یہ سوال پیدا کیا ہوتا اور اس عذر کو اپنے طرز عمل کے لئے پردہ نہ بنایا ہوتا تو شاید میں اب بھی باہر نہ نکلتی مگر جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں اب سوال میرا تمہارا نہیں۔ سوال اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو۔

میری تقریر طویل ہو گئی لیکن دل میں جب درد ہوتا ہے تو الفاظ کی طوالت نگاہ میں نہیں رہتی زخم جب ہرے ہوتے ہیں تو ضرور رستے ہیں۔ ادھر تو ہندوستان کا کتنا ہی بیش قیمت خون میدانِ جنگ میں برطانیہ کے لئے بہہ گیا اور ادھر ہم کو غیر وفاداری اور بغاوت کے طعنے دیئے جا رہے ہیں پہلے تو گورنمنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ اسلام کے مقدس مقامات میں دخل اندازی نہ کرے گی اور پھر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ پھر

پھر یہودیوں سے بیت المقدس میں خاص مراعات کی گفت وشنید ضروری کردی اور دوسری طرف عرب کے باغی کو ایک آزاد حکمراں سمجھا گیا۔ میرے عزیزو! یہ واقعات ایسے نہیں کہ کانوں سے دل تک نہ خاموش اور دل سے زبان تک نہ آئیں۔ متخاصمین کے توپوں کے گولے مقاماتِ مقدسہ اسلامی کے دیواروں کے سایہ میں گر رہے ہیں اور مسلمانانِ ہند اپنے مذہبی مقامات کے تحفظ کے متعلق حکومت کے وہ وعدے یاد کر رہے ہیں جو ابتدائے جنگ میں کئے گئے تھے۔ کیا حکومت کے عمال اب اس قدر بے خبر ہو گئے ہیں کہ وہ معاملات کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں سکتے! کیا مقاماتِ مقدسہ کی قسمت کا فیصلہ کروڑوں مسلمانوں کی خواہشوں اور دعاؤں اور التجاؤں کے خلاف ہوگا؟

آج اس جگہ اپنے ہندو بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھ کر میرے دل میں باوجود غم والم کے خوشی کی ایک لہر اٹھتی ہے مگر وہ لہر شکوہ شکایت کی آمیزش سے پاک نہیں ہے۔ آرہ وشاہ آباد کے واقعات نے میری امیدوں کا خون کر دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ ہندو، ہندو قوم کے وہ رہنما جو ہندوستان میں صبح سے شام تک اتحاد واتفاق کے وعظ کہتے ہیں، کہاں تھے جب کہ آرہ وشاہ آباد میں ہزاروں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ سے تباہ وبرباد ہو رہے تھے! میں اپنے ہندو بھائیوں کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر کسی دن ہندوستان کے لئے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا جائے تو انشاء اللہ وہ اس ضعیفہ کو طالبانِ ہوم رول کی صفِ اول میں پائیں گے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ کوئی شخص جو اپنے مذہب اور مذہبی حقوق کے ساتھ وفاداری نہ کرے وہ نہ اہلِ وطن کے ساتھ وفادار ہو سکتا ہے نہ حکومت کے ساتھ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے تو وہ دعویٰ قابلِ اعتماد نہیں۔ میرے نزدیک ہر شخص کا اپنے مذہب پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ قائم رہنا ہوم رول کا جزو لازمی ہے۔

آخر میں پھر اپنے عزیزوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ دنیا میں سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے ایمان پر بھروسہ کر کے یقین رکھیں کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو فتح ان کی ہے۔ واللہ مع الصابرین۔

میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ ۱۳ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیئے۔ یعنی یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ولنبلونکم بشیئٍ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات و بشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ط اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المفلحون ط۔

(بحوالہ "مدینہ" بجنور ۵ جنوری ۱۹۱۸ء)

"مسٹر گاندھی نے لیگ کے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ جس دن محمد علی صاحب کی والدہ جلسے میں آئی تھیں تو میرے لڑکے نے بہت سے آدمیوں کو روتے دیکھا جب اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا رونے کا وقت نہیں ہے کام کرنے کا وقت ہے۔ (جمہور کلکتہ ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء)

بی اماں کے اس "پیام عمل" کے متعلق نیو انڈیا نے لکھا "یہ پیام ان دونوں بھائیوں کی والدہ کے شایانِ شان ہے جو ان نا انصافانہ قیود کی وجہ سے تکلیف اُٹھا رہے ہیں جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہیں۔ ایک خاتون کا پرانے رسم و رواج کو ترک اور پردے سے باہر آکر مردانی مجلسوں میں شرکت کرنا صورتِ حال کی افسوسناک حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس موجودہ صورتِ حال میں ترقی کے غیر متوقع طور پر تیز ہونے کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ قابلِ قدر خاتون نے فرمایا کہ میں اس لئے آئی ہوں کہ مسلمانوں سے کہوں کہ وہ میرے بچوں کے لئے نہیں اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لئے اپنے فرائض کو انجام دیں ہمیں یقینِ کامل ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے دلوں پر بھی یہ پیام گہرا اثر کرے گا اور ان کو میدانِ عمل کی طرف آنے کی ہدایت کرے گا۔"

سروجنی دیوی نے کہا کہ "ہندوستان کی نسوانی آواز کو اس کی اجازت دینا کہ وہ اٹھیں اور جو مطالبات مردوں کی طرف سے ہو رہے ہیں ان کی تصدیق کریں۔ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہم کامل اور ذمہ دارانہ سیلف گورنمنٹ کی قابلیت رکھتے ہیں۔ خواتین سابقہ روایات کے مطابق مردوں کو ان کی جدوجہد میں مدد کریں گی خدا کرے کہ ہندوستانی مرد اس طرح کام کریں کہ وہ ہندوستانی خواتین کی امداد حاصل کر سکیں"۔ (اخبار جمہور کلکتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۱۶ء بحوالہ نیو انڈیا)

ہفتہ نظر بندانِ اسلام منانے کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کے آئینہ میں آج بھی ہمارے ملی طرز فکر کے خدوخال کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

پیام عمل :

حقیقت یہ ہے کہ ہم اور قوموں کی تقلید میں انجمنیں تو قائم کرتے ہیں اور ان کی تشہیر بھی خوب کی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ اب تک ہم میں تقلید کی بھی پوری صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے ہم ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انجمنوں اور جماعتوں کے قیام کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ ایک اچھا نام رکھ لیا، چند سر برآوردہ اشخاص اس کے عہدے دار ہو گئے اور اخباروں اور قومی مجالس میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم اب تک یہ نہیں سمجھے کہ یہ تمام کارروائی صرف اسی قدر اصلیت رکھتی ہے کہ ایک جسم بے روح بنا کر کھڑا کر دیا گیا لیکن کسی انجمن کے قیام سے کوئی کام لینا مقصود ہو تو ہم کو سب سے اول اس کی فکر کرنا چاہیئے کہ کام کرنے والے افراد مہیا کئے جائیں۔

تم شاید یہ سمجھو کہ میں گھر میں بیٹھنے والی عورت ہوں مشکلات کو کیا جان سکتی ہوں جو تم مردوں کو قومی کام کرنے والوں کے فراہم کرنے میں پیش آتی ہیں۔ اسی لئے میں غالباً اس کام کو آسان سمجھتی ہوں مگر عزیزی میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں سے پردہ میں رہ کر بھی بالکل ناآشنا نہیں رہی ہوں اور شوکت و محمدؐ کی

نظر بندی کے بعد سے تو قدرتی طور پر مجھے ان قومی تحریکوں اور قومی کام کرنے والوں سے اور بھی زیادہ واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ گذشتہ تین سال میں مجھے کافی تجربہ ہو چکا ہے اور قومی کاموں کی مشکلات اور کام کرنے والوں کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا مجھے پورا احساس ہے میں خوب جانتی ہوں کہ شہرت کے طالب ہم بہت زیادہ ہیں اور محنت و مستعدی سے کام کرنے والے بہت کم۔ لیکن اس قحط الرجال کے باعث تو کام کرنے والوں کی تلاش اور ان کا فراہم کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

.... عزیزی سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی مستند اور کارگزار مرکزی جماعت اگر ہوتی تو ان تمام قیود کا کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ مسلمان ممبر کاؤنسلوں میں سوال کرتے ریزولیوشن پر ریزولیوشن زیر بحث آتے اور یکے بعد دیگرے قانونِ تحفظ ہند کی تنسیخ یا کم از کم ترمیم کے لئے نئے نئے قوانین کے مسودے پیش ہوتے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا عشرِ عشیر بھی ہے خیر ان تمام کارروائیوں کا انحصار تو چند سر برآوردہ افراد قوم پر ہے اگر وہ اپنے فرض کو نہ پہچانیں یا باوجود اپنے فرض کو پہچاننے کے اس کی ادائیگی میں پہلو تہی کریں تب بھی عامۃ المسلمین ان پر اعتراض و نکتہ چینی کر کے اپنے فرائض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ خطاب خداوندی ہم سب کے لئے یکساں ہے عوام نے بھی اگر خواص کا طرزِ عمل اختیار کیا تو سب کے سب مواخذۂ آخرت میں گرفتار ہوں گے .... البتہ میں اس قدر ضرور کہوں گی کہ عوام ہمیشہ رہنمائی اور رہبری کے حاجتمند ہوتے ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ اب بھی چلنے کو تیار ہیں مگر راستہ بتانے والے درکار ہیں۔ اور اگر زیادہ سر برآوردہ قوم اس کام کو انجام نہیں دینا چاہتے تو ان سے کسی قدر کم معروف مگر تعداد میں کہیں زیادہ قوم کے جواں ہمت و جواں سال تعلیم یافتہ کہاں ہیں جو رہنمائی نہ سہی ہم سفر ہی بن کر عامۃ المسلمین کے ساتھ چل سکیں ....

دوسروں کے پست خیالات پر معترض ہونا ضروری ہے مگر اس کا بھی خیال

رہے کہ تمہاری بلند خیالی اوروں کی پست خیالی سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اگر تمہاری قوّتِ عمل ضائع ہوچکی ہے اور تمام تر کام میں یہی رہ گیا ہے کہ اوروں کے کام پر ناک وبھوں چڑھاؤ اور کسی میں ایک عیب نکالو تو کسی میں دوسرا۔" (اُم الاحرار والدہ محمد علی وشوکت علی صاحبان کا خط بنام مسٹر تاج الدین اخبار "جمہور کلکتہ" ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء)

پانچ برس نظر بند رہ کر جنگ ختم ہونے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی بھی اور لوگوں کے ساتھ آزاد کئے گئے اور لوگوں کے دل خوشی اور جوشِ مسرت سے بھر گئے۔ سبھوں نے دہلی، لاہور، بمبئی وغیرہ میں نہایت شان وشوکت سے ان کا استقبال کیا اور جلوس نکالے۔ بی اماں فطرتی خواہش کے مطابق چاہتی تھیں کہ اب دونوں بچے کچھ دنوں میرے پاس رہیں لیکن لوگ محمد علی کو صدر وفد خلافت بنا کر انگلستان بھیجنے کی تجویز کر رہے تھے اور کئی مہینوں کے لئے گھر ہی سے نہیں بلکہ وطن سے ان کا علیحدہ رہنا ضرور تھا۔ بی اماں سے کہا گیا کہ آپ انھیں ملک و قوم کی خدمت کرنے دیں تو اپنی دلی اور دیرینہ آرزو پر انھوں نے اس بات کو ترجیح دی۔ چنانچہ اس بارے میں جو پیغام انھوں نے اخباروں میں بھیجا اس کے ایک حصے میں وہ لکھتی ہیں "میں قدرتاً یہ چاہتی تھی کہ اب جو میرے لڑکے میرے پاس آگئے ہیں تو کچھ عرصہ پاس رہتے لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس کام کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اس میں ان کا مصروف رہنا میرے پاس یا اپنے خاندان میں رہنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے اور چند مہینوں کے لئے ان میں سے ایک کو یا دونوں کو باہر رہنا پڑے گا۔ اس لئے ہم بہت خوشی کے ساتھ ملک و قوم کے مطالبے کو منظور کرتے ہیں۔ ہندوستان اور اسلام کے کام کے لئے ہمیں ان کی جدائی گوارا ہے۔"

غرض انھوں نے نہ صرف انھیں اجازت دی بلکہ بہو یعنی مسز محمد علی اور چھوٹی پوتی بنتِ محمد علی کو ہمراہ لے کر خود بمبئی پہنچانے گئیں۔ (تہذیب نسواں راقمہ خاتون اکرم یکم اپریل ۱۹۲۲ء ص ۲۰۰)

۱۹۱۹ء کا زمانہ ہندوستانی جنگِ آزادی میں سیاسی سرگرمیوں اور برطانوی

استبداد کے اظہار قوّت کے اعتبار سے بڑا اہم ہے ہندوستان میں برطانوی دفتری اقتدار کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ جب کبھی کسی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا گیا تو ساتھ ہی تشدّد کی تلوار بھی علم کی گئی تاکہ بُزدل رعایا ڈر کر جلد از جلد ناقص و ناکام اصلاحات کو قبول کرلیں۔ چیمسفورڈ مانٹیگو اصلاحات اسکیم شائع ہوئی تو اس کے ایک عشرہ بعد ہی رولٹس کمیشن کی تہدید آمیز رپورٹ بھی شائع کردی گئی جس کے تحت رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) کا نفاذ ہوا۔ مادرِ ہند کے فرزند وفاداری کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے خون و دولت کی قیمت نہ مانگ سکیں ان کے منہ میں لگام دینے اور قلم توڑ دینے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کا خونچکا حادثہ پیش آیا عوام کا جوش و غضب اپنی آخری حدوں کو پہنچ رہا تھا اور صبر و ضبط کا ہر بندھن سرفروشی کے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔

ادھر جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب سلطنتِ عثمانیہ کی قطع و برید کی گئی تو خاص طور پر مسلمانانِ ہند میں غم و غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی نے انتہائی کوشش کی کہ ہر جگہ مسلمانوں کے ظالمانہ استحصال کے مقابلے کی خاطر انھیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا جائے۔ انھوں نے خلافت تحریک چلائی جس کا مقصد تھا کہ مسلمان نہ صرف ایک بار پھر عظیم طاقت بن کر ابھر سکیں بلکہ تیزی سے ابھرتی و بڑھتی ہوئی مغربی سامراجیت سے بھی بھرپور ٹکّر لی جاسکے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو اس سے بہت تقویت ملی۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں مشاہدے میں آیا وہ قومی زندگی کا روشن ترین باب ہے۔ ترکِ موالات کی تجویز پہلے خلافت کانفرنس اور پھر کانگریس کے اجلاس میں منظور ہوئی۔ بی اماں باوجود پیرانہ سالی کے دل و جان سے شریکِ تحریک رہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے پنڈت سندرلال کے ایک انگریزی مضمون کے حوالے سے لکھا ہے "۱۹۱۹ء تھا کہ مراد آباد میں صوبے کی پولیٹکل کانفرنس ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں منعقد

ہوئی وہاں مہاتما جی موجود تھے۔ میں نے ترک موالات والا ریزولیوشن پیش کیا سارے پرانے لیڈروں نے مخالفت کی۔ تین دن گذر گئے اور ریزولیوشن پاس نہ ہو سکا۔ آخر میں مولانا شوکت علی آئے اور انھوں نے مہاتما جی کی تجویز آزادی کی تائید کی۔ اس کے بعد مولانا کی والدہ بی اماں آئیں اور انھوں نے ریزولیوشن کی تائید کر دی۔ اس حیرت انگیز تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور خود ڈاکٹر بھگوان داس نے مخالفت چھوڑ کر تائید کر دی اور ووٹنگ کے وقت کہا جب خود بھارت ماتا بی اماں کے روپ میں آگئی ہیں تو میں بھی تائید کرتا ہوں"۔ (صدق جدید لکھنؤ ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۰)

تحریک خلافت کے سلسلے میں علی برادران ستمبر ۱۹۲۱ء میں کراچی پہنچے۔ وہاں خلافت کانفرنس میں ایک جوشیلی تقریر میں مولانا محمد علی نے کہا کہ "برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے"۔ پاداش میں دو سال قید کا حکم دیا گیا اور ہندوستان ان کی دوبارہ طویل المیعاد جدائی پر ماتم کدہ بن گیا لیکن بی اماں نے ان کی عارضی جدائی پر جیسا صبر و شکر کیا وہ ذیل کے خط سے واضح ہوگا جو انھوں نے آغا محمد صفدر صاحب کی گرفتاری پر ان کی بیوی کو لکھا ہے، وہ لکھتی ہیں:

"آج عزیزم صفدر کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی خدمات خداوندِ عالم کی بارگاہ میں مقبول ہوئیں۔ میں اس زمانے کو یاد کیا کرتی ہوں جب میں نے شوکت و محمد کی سزا کی خبر سن کر دو رکعت نمازِ شکر ادا کی تھی۔ تم بھی ہمت سے کام لینا اور ہمت نہ ہارنا مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہے"۔ (تہذیب نسواں متذکرہ)

علی برادران گرفتار ہوئے بی اماں خاصی نحیف ہو چکی تھیں اور کسی سہارے کے بغیر مشکل سے ہی کھڑی ہو سکتی تھیں لیکن بیٹوں کی گرفتاری نے ان میں ایک تازہ روح پھونک دی انھوں نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ بی اماں اب مکمل طور پر عوام کے سامنے آگئی تھیں وہ دور دراز کے سفر کرتیں۔ بڑے بڑے اجتماعات کو مخاطب کرتیں دورانِ سفر اسٹیشنوں پر مشتاقِ زیارت ہجوم سے ملتیں اور انھیں مخاطب کرتیں

ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے تحریک خلافت کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ جگہ جگہ انکی آواز پر ہزاروں کے عطیات خلافت فنڈ میں جمع ہوئے۔ ایوانِ حکومت میں کھلبلی تھی مسٹر ملکم ہیلی نے علی برادران پر لگائے گئے الزامات میں یہ الزام بھی شامل کیا تھا کہ " ان کے گھر کی عورتیں بھی عطیات جمع کر رہی ہیں "۔

جیسے جیسے اربابِ حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا بی اماں کا لب و لہجہ بھی شدت اختیار کرتا گیا۔

وہ عوامی جلسوں میں زور و شور سے تقاریر کر رہی تھیں اور خلافت اور قومی آزادی کے حصول کی خاطر ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ان تھک کوشش میں مصروف تھیں مشہور نظم " صدائے خاتون "،

(تحریک خلافت کے ایام میں سہارنپور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم صدائے خاتون تحریر کی جس کو محمد قادر حسین نے بی اماں کا پیام فرزند کے نام سے مدراس میں طبع کیا) (لطیف حسین ادیب، آواز دہلی یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء ص۱)

بولیں اماں محمد علی کی ٭ جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم تو جاتے ہو دو دو برس کو ٭ بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا ٭ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی دور کی یادگار ہے اس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے طول و عرض میں حریت پسندوں کے لئے پیغامِ عمل بن کر پہنچی۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شرکاء اجلاس میں شریمتی کستور با گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی انوسیا بائی، شریمتی چودھرائن، شریمتی سرلا دیوی، محترمہ مجدی بیگم محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم، محترمہ بیگم ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محترمہ نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ اور محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے نام قابلِ ذکر ہیں ان کے علاوہ ہزاروں دوسری خواتین نے بھی کانفرنس میں حصہ لیا جس سے ثابت

ہوتا ہے کہ غیر مسلم بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین بھی تحریکِ آزادی میں جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لیتی رہی ہیں۔ چند مقرر خواتین کے بعد بی اماں نے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

" پیاری بہنو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط واستوار، وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مابین اتحاد واتفاق پیدا کریں تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد واتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد واتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پرامن و باعزّت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن جس وقت برطانوی تجّار ہندوستان میں اپنی تجارتی مہم پر آئے اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ان کی کامیابی کا انحصار ہماری پھوٹ اور تفریق پر ہے چنانچہ جس وقت سے بیرونی حکومت یہاں قائم ہوئی۔ ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی وبربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بُری عادتیں سیکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہو گئے۔ خدائے قادر وتوانا جسے زندہ رکھنا چاہے اسے خواہ کتنا ہی زہر دیا جائے لیکن وہ نہیں مر سکتا جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کے رولٹ ایکٹ پنجاب کی خوں ریزی اور خلافت کی تقسیم کا تجزیہ کر کے دیا تھا۔ وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالی کا وقت تھا ہندوستان کو یہ معلوم ہو گیا اس کا علاج غیر ہمدرد برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کے پاس ہے اور اب ہم خود ہی جد وجہد کر کے اس کی کوشش

کر رہے ہیں تاکہ جن مختلف امراض کا ہم شکار ہو رہے ہیں ان سے آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بہنو! خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہوگئی ہیں اور انھوں نے اپنے آپکو کل حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔ زمانہ موجودکی تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا نورجہاں، چاند بی بی، رانی لکشمی بائی آف جھانسی، زیب النساء، اہلیہ بائی، پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں لیکن خداوندِ عالم کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نسل میں مسز کستوربا گاندھی مسز سروجنی نائیڈو انسویا بائی، سرلا دیوی چودھرانی بیگم محمد علی بیگم انصاری بیگم خواجہ بیگم حسرت موہانی بیگم کچلو وغیرہ ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی ہمت و جذبات حب الوطنی اور عزم و استقلال میں شہرۂ آفاق ہیں اور جنھوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورّخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈروں کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ پیاری بہنو تمہارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کردیئے گئے ہیں یا قیدخانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور کنتکا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اپنے کو والنٹیروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے اسے اپنے کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہیئے ہم ہندوستانیوں میں ہر مرد اور عورت والنٹیر ہے خواہ مصلحت اور یقین کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے

تم معاہدہ پر دستخط نہ کر سکو۔

میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہے۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اس کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب نہ پیدا کرو لیکن اسی کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو اس سے بھاگو بھی نہیں وہ تمہاری جرأت اور بے خوفی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع پذیر آئے گی تمہیں قرآن پاک اور شاستر کے احکامات کا پابند رہنا چاہیئے یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اسی وقت آزادی کے پھریرے کو اڑتے ہوئے دیکھ لوگے“

اوراق گم گشتہ۔ ترتیب و تہذیب سید رئیس احمد جعفری۔ ندوی
محمد علی اکیڈمی۔ لاہور۔ ص ۱۸۳-۸۴-۸۵

۱۹۲۱ء میں ہی بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے بی اماں نے کہا:

”اس وقت ہندو مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحد رہیں کھدر پہنیں اور تمام دن کپڑا بنیں۔ ملکی مفاد کی خاطر دونوں کا اتحاد ضروری ہے.... آخر تم کھدر کیوں نہیں پہنتے؟ کیا میں پہلے مہین کپڑے نہیں پہنتی تھی؟ کیا میں اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں پاتی؟ کیا تم زمانہ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے؟ کیا پیغمبرؐ نے کھدر نہیں پہنا؟ اس لئے میرے بھائیو! میری خواہش ہے کہ تم سیدھے راستہ پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ دلیر بن جاؤ، خدا تمہیں عزت بخشے“

گاندھی جی نے ان کی تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ینگ انڈیا میں لکھا ”اگرچہ سن رسیدہ تھیں لیکن ان میں نوجوانوں جیسی طاقت تھی

انھوں نے خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لئے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور ہندوستان کی آزادی ان کے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی! اس لئے انھوں نے اتحاد کے لئے زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزوِ ایمان تھیں"۔

علی برادران کی رہائی کے بعد بھی بی اماں کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں گرچہ صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ کانگریس کے اندرونی اختلافات، ہندو مسلم نفاق جزیرہ نما عرب میں ہونے والے واقعات بدستوران کی توجہ کا مرکز رہے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ مولانا شوکت علی کی رہائی کے بعد ان سے ملنے کاٹھیاواڑ گئیں، پھر بمبئی، بیجاپور اور رکو کناڈہ کے سفر کئے، مولانا شوکت علی کے ساتھ کانگریس کے اجلاس کے بعد وہ سیلون بھی گئیں اور موثر تقاریر کیں۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں لکھا ہے" بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم آگئے ہیں اور پوری ہمت و معروفیت کے ساتھ کام کریں گے آپ کے اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام کیجئے اور مطمئن رہیئے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گذاری کا اٹھا نہ رکھیں گے مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر پڑی رہوں اور اپنے ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کر سکوں"۔ (ہمدرد۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۴ء)

عمرِ عزیز کے آخری لمحات میں وہ بغرض علاج دہلی آئیں اور اس کے بعد مسوری اور پھر رام پور چلی گئیں۔ وہاں جاکر طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں "ہم لوگ فوراً ہی رام پور گئے مگر کئی دنوں تک بوجہ امتناعی احکامات رام پور میں داخل نہ ہو سکے اور اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ بی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے نہیں اور میں بچوں سے نہیں مل سکتی تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار کیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً اُن کو دلی لانا پڑا یہاں ڈاکٹر انصاری کا علاج ہوتا رہا۔

جن دنوں بی اماں دہلی میں بغرض علاج مقیم تھیں اسی زمانے میں گاندھی جی نے مولانا محمد علی کے مہمان کی حیثیت سے ان کے یہاں قیام فرمایا اور دوشنبہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یکایک ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خاص طور پر مولانا محمد علی جو گاندھی جی کے میزبان تھے سخت پریشان ہوئے ان لوگوں نے انتہائی کوشش کی کہ گاندھی جی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب ان بزرگ رہنماؤں کو کامیابی نہ ہوئی تو بی اماں نے کوشش شروع کی مگر اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی کی دعوت پر مولانا عبد الماجد دریابادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے اور مولانا کے یہاں مقیم تھے وہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں بی اماں نے گاندھی جی کو پیغام بھجوایا کہ "تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو اور اپنے اس ارادے سے باز آؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمہارے پاس کوٹھے پر آتی۔" گاندھی جی نے کہلوایا "اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس بات میں کر سکتا تو آپ کی بات ضرور مان لیتا۔"

(بحوالہ ہماری زبان۔ بی اماں عبد اللطیف اعظمی یکم اپریل ۱۹۸۵ء)

بی اماں کا انتقال ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی شب ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اور یوں ۷۲ سال کی عمر سے جہاد زندگانی میں مشغول یہ مجاہدہ عظیم اپنے معبود حقیقی کی آغوش رحمت میں دائمی سکون کی نیند سو گئی۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تصور کرنا بڑا کٹھن ہے کہ بی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کون بی اماں کی باوقار شخصیت اور عوامی اجتماعات میں ان کی آواز کی گونج سے ناواقف ہے.... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں موت کی رات ان کے قریب ہی تھا۔ میں اور سروجنی فوراً پہنچ گئے تھے مولانا محمد علی رو رہے تھے مگر شوکت علی خاموش تھے وہ بہت ضبط کر رہے تھے اور اللہ کا نام لے رہے تھے کامریڈ کا پریس بی اماں کے کمرے کے قریب تھا لیکن وہاں کام ایک لمحہ کے لئے نہیں رکا نہ ہی مولانا نے اپنے مدیرانہ فرائض سے غفلت برتی۔"

ہمدرد کے ۸ مئی ۱۹۲۵ء کے اداریے بعنوان ملّت کا خدمت گزار میں مولانا نے اس حادثے کی تفصیل میں لکھا ہے۔

"جب بی اماں مرحومہ کا انتقال ہونے والا تھا اور چہارشنبہ کی شام کو بعد مغرب جب وہ رات کے دو بجے تک ان کی پٹی کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ جب سوا دو بجے ان کا انتقال ہو چکا اور ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں تو اٹھ کر آیا اور پریس میں بیٹھ کر پروف پڑھنے لگا۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر فرش پر لیٹ گیا گھنٹے دو گھنٹے بعد ایک لیڈنگ آرٹیکل تھا وہ لکھتا رہا۔ ظہر کے بعد لوگوں نے اطلاع دی کہ غسل دیا جا چکا، کفن پہنا دیا گیا، تم بھی چلو، اسی وقت مضمون بھی ختم ہوا۔ قلم رکھ کر شریک جنازہ ہو گیا" (مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، ص ۲۱۷) تدفین سہ پہر ۱۳ نومبر درگاہ شاہ ابوالخیر میں ہوئی۔ ہندوستان بھر میں ان کی شاندار قومی و ملی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مسز اینی بیسنٹ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

"میں خراجِ عقیدت پیش کرنے میں خود کو دوسروں کے ساتھ شریک کرتی ہوں اس شیر دل اور انتہائی مذہبی خاتون کے تئیں جو کسی خطرے سے خوفزدہ نہیں ہوئی اور جس نے اس دھرتی پر کسی چیز کو اپنے عقیدے پر فوقیت نہیں دی.... ایسی روحیں دوسروں کو بھی باوقار بناتی ہیں اور مثال پیش کرتی ہیں..... وہ آزادی کی راہوں کو منور کرتی ہیں اور ہموار بناتی ہیں، اپنے خون بہتے ہوئے پاؤں سے جس پر قومیں چلتی ہیں انھیں ابدی روشنی میسّر ہو"

۱۴ نومبر کو پٹودی ہاؤس دہلی میں منعقد ہوئے تعزیتی جلسے میں سوامی شردھانند سرسوتی جی نے ہندو مسلم اتحاد کی اس علامت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ "لوگوں کو شاید خیال ہو کہ علی برادران کام کرتے تھے اس لیئے ان کی والدہ صاحبہ ان کے شریک ہو گئیں لیکن میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک لگن ہندو مسلم اتحاد کے لیے کسی کے دل میں تھی تو وہ بی اماں کے

دل میں تھی اور ان کا ہی یہ سبھاؤ تھا جو مولانا محمد علی اور شوکت علی کے اندر کام کر رہا تھا۔ یہ وقت زیادہ کہنے کا نہیں ورنہ میں بتلاتا کہ اُن سے زیادہ سیاسی لیڈر بھی اس ہمت اور جوش سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے جیسی وہ کرتی تھیں.... (ہمدرد دہلی ۱۶، ۱۷ر نومبر ۱۹۲۴ء ص ۶)

گاندھی جی نے پہلے علی برادران سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح علی بھائی اور میں، ہندو مسلمان ہو کر بھی ساتھ رہ سکتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے "ایک ماں کے تین لڑکے"، پھر بی اماں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "جیسے اپنی سگی ماں کے لئے کہنے میں مجھے مشکل ہوتی ویسے ہی بی اماں کے لئے کہنے میں ہے۔ میں نے ۱۹۱۷ء میں ان کے درشن کئے تھے اس وقت سے بی اماں کو جانتا ہوں۔ عدم تعاون کے وقت بی اماں نے ملک کا دورہ کیا تھا۔ بی اماں بحیثیت مسلمان ہوتے ہوئے بھی دورہ کر رہی تھیں کہ اسلام پر مصیبت ہے، تو جس جگہ وہ اسلام کے لئے کچھ کہتی تھیں وہاں ہندو مسلمانوں کی ایکتا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی ضرور کہتی تھیں۔ میں ہندو مسلم جھگڑے کو مٹانے کے لئے دہلی میں ایک عرصے سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ بی اماں بھی یہیں موجود تھیں میں بی اماں سے ملتا رہتا تھا وہ ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھیں کہ میں (۱) ہندوستان میں سوراج (۲) ہندو مسلم اتحاد کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہندو مسلمان ایک ہو کر بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے، آزادی ناممکن ہے۔۔ ہم کو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایکتا کرنی چاہیئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم غلام رہیں گے (ایضاً)

مولانا عارف ہسوی نے ہمدرد کے اسی شمارے میں اپنے تعزیتی نوٹ میں لکھا:

"اس بڑھاپے اور ضعیفی کے زمانے میں ان کے اندر قومی کاموں کے لئے جو ہمت، جوش اور ولولہ تھا وہ جوانوں میں بھی نہیں پایا جاتا اور اس لحاظ

سے ان کا مقدس وجود ملک و قوم کے لئے ایک برکت تھا۔ انھوں نے گذشتہ دس سال کے اندر اپنے مجاہدانہ اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اگر مذہب اور ملک کی سچی تڑپ انسان کے دل میں ہو تو ضعف و نقاہت اور عمر کا تفاوت اس میں حارج نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اس میدان میں بوڑھے اور جوان سب کے لئے گنجائش ہے اور اگر خدائے بزرگ و برتر توفیق دے تو پچھتر سالہ ضعیفہ بھی بیس سالہ نوجوان سے زیادہ ہمت کے ساتھ ملک و ملّت کی خدمت کا مقدس فرض انجام دے سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۴)

علی گڑھ کے ایک تعزیتی جلسہ میں سوامی ستیہ دیو جی نے بی اماں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا "بھائی ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں جب ہم جوان ہمت ہار جاتے تھے تو وہ آگے بڑھتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دکن میں دورہ کر رہے تھے ایک اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے آئے۔ ہم نے پوچھا تمہارا گاؤں کتنی دور ہے اور وہاں کیسے جاتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ گاؤں اسٹیشن سے تیس میل پر ہے۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ وہ نراش ہو کر جانے لگے ماتا جی کو پتا چلا تو لوگوں کو بلا کر کہا کہ بیٹا تمہارے ساتھ میں چلوں گی موٹروں پر تو سبھی جاتے ہیں بیل گاڑی میں جاؤں گی۔ بوڑھی ماتا اتر پڑیں۔ ہم جوان بھی اُتر پڑے اس طرح ماتا جی ہم کو بتا گئیں کہ کام کیسے ہوتا ہے۔"

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی سوانح و خدمات ص ۲۴۔ ۲۵)

لیکن بی اماں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والے ان گنت پیغامات میں عوام کی ان سے محبت و عقیدت کی عکاسی شاید ہی کوئی اس تعزیتی خط سے بہتر کر سکے جو پنجاب کی ایک ہندو خاتون نے مولانا محمد علی کو اس تاکید سے لکھا تھا کہ اسے ہمدرد میں شائع ہونے والے تعزیتی پیغامات میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن جو مولانا نے معذرت کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے اس کا ہر ہر لفظ خلوص کے آنسو میں ڈوبا ہوا ہے، ایک گہرے درد کی کسک لئے ہوئے ہے۔

مولانا کا نوٹ:

"پنجاب کا یہ مراسلہ اس شاندار مستقبل کے لئے جس کے ہم آرزومند ہیں نہایت روح پرور شگون ہے۔ بی اماں کی سب سے بہتر یادگار یہ ہوگی کہ ہندوستان کے تمام بہادر فرزند اپنے حقیر اختلافات کو بھلادیں اور اپنے مصیبت زدہ وطن کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے متحد ہوجائیں۔"

محمد علی
شوکت علی } دہلی ۱۲ دسمبر ۱۹۲۴ء

پنجابی بہن کے تعزیت نامے کی نقل

نمبر ۴ پنج محل روڈ، تاریخ ۹ دسمبر

"میرے محترم و ممتاز بھائی مولانا صاحب نمسکار

نہیں جانتی کہ کس تمہید کے ساتھ اپنا خط لکھنے کا مقصد بیان کروں۔ کانفرنس میں آپ کی اسپیچ کے اس حصے میں جہاں آپ نے ہماری بی اماں کا ذکر کیا تھا نہایت ہی دردانگیز تھا۔ شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جس نے اس قابلِ قدر خاتون کے لئے اس وقت آنسو نہ بہایا ہو۔ اور میں تو اول دن سے ہی یعنی میں نے جب پہلی مرتبہ ان کے درشن کئے تھے۔ ان کی بہت ہی معتقد تھی۔ میں جانتی ہوں کہ ایسی روحیں دنیا میں کبھی کبھی آتی ہیں اور ابھی تک ان کی سی خاتون میری نظر سے نہیں گذری۔ مجھ کو ان کے مرنے کا اس قدر رنج ہوا کہ میں لفظوں میں اس کو بیان نہیں کرسکتی۔ وقت کے حساب سے وہ سن رسیدہ تھیں مگر غریب ہندوستان کے لئے ان کی بہت ضرورت تھی۔ اس لئے ان کا رنج ہمارے لئے بہتیری نوجوان عورتوں سے زیادہ تھا۔ میں نہیں جانتی کہ کون اس خالی جگہ کو پُر کرے گا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ عورتیں خاص طور پر جمع ہوکر ان کے رنج و غم کا اظہار کریں لیکن آجکل حالت ہی درست نہیں۔ ان کی نیک اور بہادر عورتوں کے کارنامے تو سنہری حرفوں میں چھپنے چاہئیں اور گھر گھر پہنچنے چاہئیں اور ہر عورت

والٹر کی کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔

میں چاہتی ہوں کہ اپنی شردھا اور بھگتی کے پھول ان کی قبر پر چڑھاؤں۔ لیکن میرے لئے اس وقت ممکن نہیں اگر کبھی الہ آباد آتے جاتے دہلی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو انشاءاللہ پورا کروں گی۔ میں خود ان کی قبر پر جاؤں گی اور وہاں کی خاک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاؤں گی لیکن اب تو دس روپے کی ناچیز رقم آپ کے پاس بھیجتی ہوں آپ پانچ روپے کے پھول میری طرف سے ان کی قبر پر چڑھا دیجئے گا اور پانچ روپے کا پھل یا مٹھائی غریب بچوں کو ان کے نام پہ کھلا دیجئے گا۔

پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل ان کے خیال سے کتنا بھرا ہے اور میں کتنی دفعہ اپنے دل میں ان کو یاد کر چکی ہوں ہمارے لئے تو ایسی بیش بہا ہستیاں ویسے ہی بڑی ناپید ہیں لیکن اس پر جو تھوڑی سی ہیں وہ بھی ہم سے چھین لی جاتی ہیں - یہ ہندوستان کی کم نصیبی ہے۔ بہر حال پرماتما کے سامنے سر تسلیم خم ہے، کیا چارہ ہے؟"

(ہمدرد ۱۵ ردسمبر ۱۹۲۴ء ص ۴)

بے شک بی اماں ان چند خوش نصیب رہنماؤں میں تھیں جنھیں اپنی حیات میں ہی یہ دیکھنا نصیب ہوا کہ "شہرتِ عام و بقائے دوام" کے دربار میں ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ قومی جہدِ آزادی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر ان کی بے لوث خدمات اور ملّت کے لئے ناقابلِ فراموش ایثار کے عوض جہاں رضا کارانِ ملک نے انتہائی فراخدلی سے ملک کے طول و عرض میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا وہیں پرستارانِ ملت نے ٹوٹ کر ان کے قدموں میں گلہائے عقیدت نذر کئے۔ تاہم ایک تابندہ عکسِ لطیف کو زمانے کی گرد دھندلا نہ دے اس لیے ضروری ہے کہ ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

بیگم حسرت موہانی (نشاط النّساء بیگم)

آج کے ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے ہم لوگوں کے لئے اس وقت جب کہ صدائے حق بُلند کرنے والوں کی زبانوں پر پریس ایکٹ نے قفل ڈال رکھے ہوں، قانون تحفظِ ہند کا آہنی پنجہ انھیں اپنی گرفت میں دبوچ لینے کے لئے ہر آن مستعد ہو اور قید خانوں کی بھیانک تاریکی انھیں نگلنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو، ان شمعِ حریّت کے پروانوں کی اولوالعزمی و جانبازی کا اندازہ لگانا آسان نہیں جو اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی خاطر سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔

حسرت و بیگم حسرت کی کہانی بھی دار و رسن کی آزمائش کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک ہے اور ساتھ ہی ان بہت سی بھولی بسری داستانوں میں شمار کی جاسکتی ہے جن کے ساتھ آزاد ہندوستان کی تاریخ نے مناسب انصاف نہیں کیا۔

بیگم حسرت کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ مولانا حسرت سے ہی روایت منسوب ہے کہ اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال و البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال سے زیادہ

ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے یہ عورتیں وفا پرست اور ایثار مجسم تھیں انھوں نے جان دے دی مگر ہم سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستار واتم تو جبیل جارہے ہو۔ ہمارا کیا ہوگا؟

(علیم اختر مظفر نگری۔ مقالہ مولانا حسرت موہانی شبستان اردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۶۶ء ص ۱۲۷)

بیگم حسرت کو ان خواتین میں پوری امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے حسرت کو جن کی تمام تر زندگی آزادی کی مکمل تفسیر رہی نہ صرف لیلائے حریت کے سپرد کر دیا بلکہ اپنی زندگی کو بھی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ چکبست نے ان کی قومی خدمات کو سراہتے ہوئے "صبح امید" میں قوم کے جوانوں کو مشورہ دیا تھا۔

"بیگم حسرت کی زبان عام جلسوں میں پولٹیکل مردانگی کا راگ گانے کے لئے خلق نہیں ہوئی ہے مگر اس شہیدِ وفا کی زندگی کا نغمۂ خاموش، وطن پرستوں کی روح کو وجد میں لانے کے لئے کافی ہے.... ہم قوم کے نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس دیوی کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر استقلال اور ایثارِ نفس کا سبق حاصل کریں۔" (چکبست، صبحِ اُمید۔ ۲/۱ ۱۹۱۶ء)

پروفیسر عبدالشکور نے اپنی تالیف "حسرت موہانی"، میں رسالہ "رہبر نسواں" نومبر ۱۹۳۴ء کے حوالے سے نشاط النساء (بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے:

"محترمہ نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) کے ایک معزز خاندان سادات میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیب حسن موہانی مرحوم رائچور (ریاست حیدرآباد) میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم وکمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔

زمانۂ دوشیزیت میں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔" (حسرت موہانی، عبدالشکور اشاعت سوم۔ لکھنؤ۔ ص ۱۱۷) اور جس سے ان کے پختہ سماجی شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب وہ حسرت کی زندگی میں داخل ہوئیں تو محض کندۂ ناتراشیدہ نہ تھیں۔ گمان غالب ہے کہ قومی و ملکی مسائل سے بھی وہ کچھ نہ کچھ آشنا ضرور رہی ہونگی کیونکہ لکھنؤ سے قربت کے سبب قصبہ موہان میں بھی اردو اخبارات پہنچنے لگے تھے۔ ہر چند کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ عہد طفولیت تھا تاہم لوگوں کی ملکی سیاست میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ "یہ دیہاتی ماحول کی پلی ہوئی لڑکی نہایت جری باحوصلہ اور ہر طرح حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں تھی...... حسرت نے مالی اعتبار سے کبھی کسی قسم کی فراغت واطمینان کو محسوس نہیں کیا لیکن کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ہر کٹھن موقع پر وہ حسرت کی رفاقت کے لئے آمادہ رہا کرتی تھیں حسرت کو ہمیشہ ان کی رفاقت پر فخر رہا ہے۔"

(رابعہ بیگم، حسرت کی خانگی زندگی، اردو ادب حسرت نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۵۱ء علی گڑھ ۹۸-۹۹)

اور حسرت کا یہ فخر بے جا نہ تھا۔ "اگر نشاط النساء بیگم کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہم خیالی شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم ثبات کا شاید ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے۔" (عارف ہسوی۔ حالات حسرت دہلی ۱۹۱۸-۱۹۱۹)

جس طرح حسرت کی سوانح عمری کے مصنف کے مطابق "مولانا کی لائف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیگم حسرت کے واقعات وحالات شامل نہ کئے جائیں کیونکہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی کی ہر طرح کی شریک رہی ہیں اور مولانا کے کاروبار قومی میں ہمیشہ معاون رہیں ——— " (ایضاً)

اسی طرح جدوجہد آزادی میں بیگم حسرت کے ایثار اور ان کے سیاسی شعور کے ارتقاء کا جائزہ حسرت کی سیاسی نظریات وعقاید کے تجزیے کے بغیر

ممکن نہیں ۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب کہ حسرت ابھی علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے وہ علی گڑھ آئیں اور اس کے مختصر سے وقفے کے بعد ہی حسرت کی دار و گیر کا وہ طویل سفر شروع ہوا جس کی داستان انھیں کی زبان میں سنیے

اذیت، مصیبت، ملامت بلائیں - اس اک عشق میں میں نے کیا کیا نہ دیکھا

علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے فراغت پاتے ہی حسرت نے اپنے نظریات و عقاید کی اشاعت و ترویج کی خاطر ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے شراب حریت کے جام پر جام لنڈھانا شروع کر دیئے۔ حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے علانیہ علی گڑھ تحریک سے انحراف کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانگریس میں وہ گرم دَل کی سیاست کے علمبردار تھے اس لئے ۱۹۰۶ء کے سورت اجلاس میں نرم و گرم دَلوں کے ٹکراؤ کے بعد بال گنگا دھر تلک کے ساتھ وہ بھی باقاعدہ گرم دَل میں شامل ہو گئے اردوئے معلیٰ کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں کالج کے ایک طالب علم کا مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کی زد میں آگئے لیکن انھوں نے طالب علم کا نام بتانے سے انکار کرتے ہوئے تمام ذمہ داری اپنے سر لی۔ مسلم معاشرہ پر سیاسی جمود کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج کی وحشت بھی اس قدر غالب تھی کہ انھیں ایک بھی وکیل یا بیرسٹر مقدمے کی پیروی کے لئے میسّر نہ ہو سکا اور ایک دو پیشیوں میں ہی دو سال قید با مشقت کی سزا ہوئی حسرت مسلمانوں میں پہلے سیاسی قیدی ہیں یہ پہلی گرفتاری ہی نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی اور حبس دوران انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ شوہر کی محض چند سالوں کی رفاقت میں ہی اس دیہاتی ماحول میں پلی ہوئی لڑکی

کا شعور کتنا بیدار، کتنا پختہ ہو گیا تھا اور اب ایک واضح منزل کی طرف گامزن تھا۔ مصیبت کے اس نازک وقت میں وہ نہ صرف ہر اعتبار سے رفیق سفر ثابت ہوئیں بلکہ یہ اُن کی مستقل مزاجی، ہم خیالی ہی تھی کہ مجاہد آزادی ہر اس افتاد کو جھیل گیا جو بڑے سے بڑے رہنماؤں کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی تھی۔ بقول حسرتؔ "گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن انکی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ اور استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کار پردازان زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہٖ امر حق کی پیری کے باعث یونہی قوی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں لیکن آخر تک ان کی جرأت، ہمت میں فرق نہ آیا"۔

(مشاہداتِ زنداں، بحوالہ حسرتؔ کی سیاسی زندگی عبدالقوی دسنوی ص ۱۷-۱۶)

دورانِ نظر بندی جب علی گڑھ مجسٹریٹ نے حسرت کو پڑھنے لکھنے کی اجازت دے دی تو بیگم حسرت برابران کے پسندیدہ اخبار ان تک پہونچاتی رہیں۔ حسرت کی درویشی پانچسو روپے جرمانہ کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی عزیز و نایاب کتابیں حکومت کی طرف سے صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دی گئیں۔

دورانِ قید حسرت نے جن مصائب اور سختیوں کا سامنا کیا اس کی ہولناک داستان "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے اردوئے معلی میں قسط وار شائع ہوئی جو سامراجی آمریت و بربریت کی ایک مستند تاریخ ہے۔

رہائی کے بعد حسرت کا جوش عمل قید فرنگ کی بناء پر مزید ترقی کر گیا۔ دوستوں نے ہزار نرم روی کا مشورہ دیا مگر یہ نشہ اُترنے والا نہ تھا۔ یہاں تو عالم یہ تھا

ع بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

"دو چار پتھر کا بندوبست کر کے اپنے مختصر سے مکان میں ہی انھوں نے کاٹھ کا ایک پریس لگایا جس کا نام اردو پریس رکھا۔ اس مطبع میں بقول عتیق صدیقی اگر اسے مطبع کا شاندار نام دیا جا سکے تو حسرت کتابت کرنے کے علاوہ پریس مین کی خدمت انجام دیتے اور نشاط النساء بیگم پیپر مین کی"۔

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، عتیق صدیقی دہلی۔ ص ۲۸)

اب صوبہ متحدہ کی جیمس ٹن کی گورنمنٹ کو اردوئے معلی کھٹک رہا تھا چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو اردو پریس سے جس کی کل کائنات ایک لکڑی کی دستی مشین اور دو پتھر تھے قانون مطابع کے تحت تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی حسرت کے پاس اردوئے معلی اور پریس بند کر دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت کی مطلق العنانی پر احتجاج کرتے ہوئے الہلال کی دو مسلسل اشاعتوں میں "اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت" کے عنوان سے لکھا جو خصوصیت سے اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں انھوں نے بیگم حسرت کو حسرت کی "کوہِ عزم و ثبات" بیوی سے تعبیر کیا ہے۔ (الہلال ۲۱ - ۲۸ مئی ۱۹۱۲ء)

اسی دوران پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی ہندوستان میں سیاسی ہل چل اپنے عروج پر تھی اور ساتھ ہی برطانوی آمریت بھی۔ ترکی سے ہمدردی کے سبب جو اس لڑائی میں جرمنی کا حلیف تھا ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی طبعاً جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مقاماتِ مقدسہ کے سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ مکمل دستور زبان بندی کے تحت سبھی احراری لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے حسرت ابھی تک آزاد تھے اور مسلم

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں انھیں بھی نظر بندی کا حکم ملا جسے ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا جس کی پاداش میں بالآخر انھیں قید کر دیا گیا۔

حسرت کی دوسری گرفتاری اور بیگم حسرت:

۱۳ر اپریل ۱۹۱۶ء میں حسرت دوسری بار گرفتار کیے گئے۔ نشاط النساء بیگم کی زندگی میں یہ تاریخ "ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سیاسی زندگی عملی زندگی کا آغاز ہے جب انھوں نے گھر کی چہار دیواری سے نکل کر حسرت کے مقدمے کی پیروی اپنے ذمہ لی اور یہ کام انتہائی نامساعد حالات میں بڑی دلیری اور ہمت سے انجام دیا۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور بعد میں ان کے اسیری کے زمانے میں بھی انھوں نے بڑی ہمت اور قابلیت کے ساتھ حسرت کے پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمت بھی انجام دی۔ مقدمے کی پیروی کے ساتھ ساتھ اخبارات کی وساطت سے حسرت کے حالات سے بھی عوام کو باخبر رکھا۔

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۲۹)

اس بار حسرت کو کئی جگہ قید رکھا گیا۔ پہلے علی گڑھ جیل میں رہے پھر للت پور لائے گئے۔ وہاں سے جھانسی، الہ آباد، پرتاپ گڑھ۔ فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں میں رہے۔ باہری دنیا کو ان تمام حالات کا علم بیگم حسرت ہی کے ذریعہ ہوا مثلاً یہ خبر:

" ہندوستانی لکھنؤ رقم طراز ہے کہ مسز حسرت موہانی کی ایک تحریر سے جو انھوں نے ہم کو ارسال کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کو للت پور میں نظر بند رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

(بحوالہ مدینہ اخبار بجنور۔ مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۱۶ء)

حسرت کو ۱۹۱۶ء میں قانون تحفظ ہند کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس

کے مذہبی اور اخلاقی جواز کو وہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا نے للت پور میں نظر بندی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا علم بھی اخبارات کو بیگم حسرتؔ ہی کے ذریعے ہوا آپ فرماتی ہیں کہ "آج حسرتؔ کا خط آیا ہے۔ ان کا مستقل ارادہ ہے کہ ایسے حکم کی تعمیل سے جو بغیر اظہار جرم و موقع تردید سزا دینا ہے۔ انکار کر دیں گے۔" (ایضاً)

مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام آزاد حسرتؔ کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ ابتداً نشاط النساء بیگم بھی اس سے مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھیں جیسا کہ مولانا عبد الباری کے نام ایک ذاتی خط مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا تھا:

"کل محمد علی صاحب کا خط بھی (چھنڈواڑے سے) آیا ان لوگوں کی بھی یہی رائے ہے حسرتؔ خدا کرے راضی ہو جائیں ورنہ مصیبت تو ہی ہے"

(بیگم حسرتؔ موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۵۸)

لیکن جب احکام نظر بندی کی خلاف ورزی میں حسرتؔ پر مقدمہ چلایا گیا تو وہ پوری طرح غیر ملکی سامراجیت سے ٹکر لینے کے لئے سینہ سپر تھیں۔ مولانا کو للت پور جیل میں انھوں نے جو حوصلہ افزا خط لکھا وہ ملاحظہ ہو:

۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء

آج کارڈ ۲۷ کا لکھا ہوا اور لفافہ بھی ساتھ ملا۔۔۔۔ تمہارے استقلال کی حد ہو گئی، میں تعریف کرتی ہوں مگر افسوس کہ تم سے علیحدہ رہنے کا خیال سخت تکلیف دہ ہے۔ ناقابلِ برداشت ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے خیالِ غالب یہی ہے کیونکہ تم اپنی دھن کے پکے ہو۔ اور واقعی حق سے اجتناب کرنا ایک سچے مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔ ظلم خدا ہرگز پسند نہیں کرتا وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ مگر ہم کو کیا۔ ہماری چند روزہ زندگی تو گورنمنٹ کی مہربانیوں کی نذر ہو گئی خیر دنیا میں تو انصاف نہیں رہا نہ سہی۔ خدا منصف ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کی

مہربانی اور مدد پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ جو ظلم کرتا ہے وہ اپنی تلوار سے اپنا زیاں کرتا ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے مگر ہم ظلم نہیں کرتے۔"

(بحوالہ اسلم ہندی، برازوانِ حیات سوانح حسرت موہانی، ص ۲۷، ۱۲۸)

مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا:

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا تھا کہ حسرت اپنی دھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے اسی پر بھروسہ ہے۔ خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے آمین۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر خدا نہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہیئے اور خدا سے دعا کرنا چاہیئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرتِ کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہو جائے"۔

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۶۱)

برطانوی استبداد کے سامنے سر جھکانا حسرت کی سرشت میں تھا نہ بیگم حسرت کی بلکہ معاملہ بالکل ہی برعکس تھا ؎

جی مانتا نہیں کہ رہوں بے خطا کئے   تعزیر دے کے آپ نے عادت بگاڑ دی

چنانچہ جب احکامِ نظر بندی کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہو کر حسرت ڈیڑھ سال کے لئے جیل چلے گئے تو اپنے اخباری بیان میں ان کی کوہِ عزم و ثبات" بیوی نے کہا:

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس رائے کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے ایسی نظر بندی سے قید بہر حال بہتر ہے حسرت نے خوب کیا مجھے اُن سے یہی امید تھی۔ (بیگم حسرت اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۲۰) واضح رہے کہ "یہ رائے کسی خوشحال گھرانے کی عورت کی نہیں۔ بیگم حسرت کی تھی۔ جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اور اُجرت پر سلائی کر کے چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں"۔

(کرشن بلدیو شرما آجکل اگست، ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۳۳)

دورانِ مقدمہ نشاط النساء بیگم نے حسرتؔ کے مقدمے کی پیروی کا کام انتہائی نامساعد حالات میں کیا۔ ان کی زندگی کا یہی وہ دور ہے جب انھوں نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا۔ "وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتیں اور کسی کی پرواہ نہ کرتیں۔"

(سید سلیمان ندوی "نگار" لکھنؤ حسرت نمبر جنوری، فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۱۸)

بقول پنڈت کشن پرشاد کول "یہ جرأت مندانہ اقدام انھوں نے اس وقت کیا جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔" (ایضاً ص ۵۹)

حسرتؔ کے بیرسٹر دوستوں نے ان کے مقدمہ کی پیروی سے گریز کیا۔ اس سلسلے میں وہ جن صبر آزما مرحلوں سے گزریں اس کے کرب و بے بسی کا اندازہ مولانا عبدالباری کے نام خط کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے "افسوس ہے کہ کوئی وکیل بیرسٹر پھانسی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیسی مجبوری و افسوس کا مقام ہے۔" (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط۔ متذکرہ ص ۵۷) تاہم باوجود اس عالم کس مپرسی کے جس ہمت و جرآت مردانہ کا انھوں نے ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان دنوں خود ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت رانچی میں نظربند تھے انھیں کے نام اپنے ایک طویل خط میں کیا ہے:

"اخبارات میں صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ کا کمیونک نظر سے گذرا اور آپ کا خط بھی جو سنٹرل (مسلم) بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی خالی نہیں ہوئی ہیں ....

جب میں آپ کے عزم و استقلال اور اس کے ساتھ تنہائی و کس مپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا قلب کا کیا حال ہوتا ہے، یہ اللہ ہی کی مدد ہے جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجہ عزم بخشا ہے جو کسی مرد کو

بھی آج نصیب نہیں۔ ” مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۱۷۔۰۰۹“

انھیں دنوں حسرت کے نام اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی نے بھی جو اس وقت چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے بعض ہم عصر لیڈروں کی روش سے اظہار مایوسی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے زیادہ بہن (نشاط النساء) کا جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس جرائت و ہمت سے سنبھالے ہیں اور ساکت و صامت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو با آواز بلند سب کو سُنا رہی ہیں تو بے اعتباری دور ہو جاتی ہے (محمد علی بنام حسرت موہانی نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۳۳)

بیگم حسرت کے نام بھی علیحدہ ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں احساسات کا اظہار کیا:

” بھائی حسرت سے کہہ دیجئے کہ برادرم! باوجود عزم و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں تم سے بھی بڑا ایک دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر بھی نہ دے سکے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہ دیا۔“ (احمد لاری، حسرت موہانی حیات و کارنامے، لکھنؤ ص ۱۴۶)

حسرت نے اس بار بھی قیدِ فرنگ میں جن صعوبتوں کا سامنا خندہ پیشانی سے کیا اس کی اطلاع بھی بیرونی دنیا کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ملی۔ مولانا عبد الباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۱۶ء میں لکھتی ہیں:

” ۷ر محرم کو دفعتاً الہ آباد جیل میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں یعنی ان کا سامان ضروری لوٹا، جوتا وغیرہ زبردستی لے لیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رو سے پھانسی جیل میں اور اب تک الہ آباد جیل میں ان چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کر دے کہ مسلمان

ہونے کی حیثیت سے میں نے قیدی کے ساتھ کوئی رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ حالانکہ اس نے کوئی رعایت بجز سختی کے نہ کی تھی۔ کھانا بھی وہی جوار باجرہ کی مٹی ملی ہوئی روٹی ملتی ہے جو دردِ گردہ کی وجہ سے حسرت کے لئے سخت مضر ہے۔ چنانچہ حسرت نے بھی یہ عہد کرلیا کہ، محرم سے جھگڑا شروع ہے اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی بحمداللہ پیروئی حسین کے لئے اچھی طرح تیار ہوں۔"

(بیگم حسرت اور اُن کے خطوط متذکرہ۔ ص ۱۱۳)

لیکن ان ایامِ بلا" میں بھی بیگم حسرت کی غیور طبیعت نے حسرت کے سیاسی دوستوں کی مالی اعانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا۔ تفصیل کشن پرشاد کول کی ہے "غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مُصیبت اور عُسرت سے گذر رہی ہے میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچّا پکّا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پُرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جاکر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بیمار بوڑھی ماں اور بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے درودیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں آپ اس کی زحمت گوارا نہ کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعراء کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلی

بند ہو گیا۔ یہ کاروبار ہی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں بیکار پڑا جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائیگی میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے، سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے منخیر" تھے۔ کئی لاکھ روپے انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لئے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپیہ کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصے تک 'ہندوستانی' اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔" (کشن پرشاد کول نگار یادگار حسرت نمبر ۵۹)

پنڈت کشن پرشاد کول کے اس بیان کی تصدیق بیگم حسرت کے مندرجہ ذیل خط سے بھی ہوتی ہے جو کم وبیش اسی طرح کی مالی اعانت کے سلسلے میں انھوں نے ایڈیٹر "ہمدم" کو لکھا تھا۔ اسی قیدِ فرنگ کے دوران ان کے یہاں حوصلہ شکن چوری ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے بی اماں نے مسٹر تاج الدین کے نام اپنے خط میں لکھا تھا "حسرت کے واقعات سے تم مجھ سے بھی زیادہ واقف ہو۔ سرکاری پولیس اس ناکردہ گناہ کو گرفتار کرنے میں تو بے حد مستعد کار تھی مگر کسی سے اس کی دوکان کی حفاظت نہ ہو سکی جو اس غیرت مند مسلمان اور اس کی بیوی و بچی کے گذر اوقات کا ذریعہ تھی۔ کئی ہزار کا مال چوری ہو گیا مگر چور کا سراغ نہ ملا۔"

(اخبار جمہور۔ کلکتہ: ایڈیٹر قاضی عبدالغفار۔ ا ر جولائی ۱۹۱۶ء)

بعض ہمدرد نامہ نگاروں نے توجہ دلائی کہ بیگم حسرت موہانی کی چندے سے امداد کی جائے عارف ہسوی صاحب کو ان کی طبیعت کے پیشِ نظر شک تھا کہ وہ یہ امداد قبول نہ کریں گی جواب میں بیگم حسرت نے جو خط ایڈیٹر ہمدم کو تحریر کیا اس کی نقل

مندرجہ ذیل ہے۔

"۵ دسمبر ۱۹۱۷ء، علی گڑھ

برادر محترم تسلیم۔ "ہمدم" میں چوری کے متعلق نوٹ عارف صاحب اور آپ کا نظر سے گزرا آپ کے اظہار ہمدردی کا دلی شکریہ۔ ہمدردی کے جواب میں عرض یہ ہے کہ آپ اس کو شائع فرما دیجئے مشکور ہوں گی۔ اپنے نقصان کا بار دوسروں پر ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم اگر لوگ ہمارے دفتر کی موجودہ کتابوں کی خریداری کے ذریعہ سے مدد کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ اس کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی۔اے ایڈیٹر ہندوستانی، کا شکریہ خاص طور پر ادا کرنا لازم ہے کہ ان کے ذریعے سے اس قسم کی اعانت پہلے بھی ملتی تھی۔ اور اب پھر ۵۰ روپے نقد خریداری کتب کے لئے وصول ہوئے ہیں کہ اس رقم کی جو جو کتابیں بہ آسانی بھیجی جا سکتی ہیں بھیج دیجئے چنانچہ شرح دیوان غالب اور دیوان حسرت وغیرہ کتابیں ان کو جلد یہاں سے روانہ کر دی جائیں گی۔ یہی طرزِ عمل اور لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خاکسار بیگم حسرت موہانی" (بحوالہ مدینہ اخبار بجنور ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء) یقیناً ایسی ہی قابل احترام ہستیوں کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بیگم حسرت کا یہی کردار تھا جس سے متاثر ہو کر سید سلیمان ندوی نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

" شوہر کے قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری و استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔" (نگار لکھنؤ حسرت نمبر تذکرہ ص ۱۱۸)

حسرت ابھی قیدِ فرنگ میں ہی تھے کہ بیگم حسرت نے وزیر ہند سے ملاقات

کرنے والے ہندوستانی خواتین کے ایک نمائندہ وفد میں شرکت کی۔ اس شرکت کی اہمیت دو وجوہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ نشاط النساء بیگم نے دوران ملاقات جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ تنہا ان کے کردار کی عکاسی کے لئے کافی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کُل ہند وفد میں ان کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اس وقت تک وہ قومی سیاسی زندگی میں بہت اہم مقام حاصل کر چکی تھیں۔

۱۹۱۷ء وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ قومی آزادی کے سلسلے میں عوام کی توقعات میں اضافہ ہوا تھا جنھیں وہ اپنی جنگی خدمات کا جائز صلہ سمجھتے تھے۔ ادھر جنگِ عظیم اپنے فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستانی امداد کی مزید توقع اور دستوری اصلاحات کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو نے ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد کو بھی ان سے ملاقات کرنے کے لئے مدعو کیا گیا، اس وفد میں بی اماں (والدہ محمد علی) اور بیگم حسرت کے نام بھی شامل تھے گو بی اماں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر وفد میں شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن نشاط النساء بیگم اس میں شریک ہوئیں۔ اس کا ایک گروپ فوٹو آل انڈیا ویمنس کانفرنس نئی دہلی کے دفتر میں موجود ہے جس میں مسز این دلوی۔ بیگم حسرت موہانی، ڈاکٹر مس این جوشی، مسز جبار داس، مسز چندر سیکر آئر۔ مسز ایس کروسوامی چیٹی مسز لزراس، مسز سروجنی نائیڈو اور مسز بیسنٹ وغیرہ شامل ہیں (حسرت موہانی ایم حبیب خاں دہلی ۱۹۷۲ء ص ۲۳)

اس ملاقات کا پس منظر اور اس کی اخباری رپورٹ درج ذیل ہے:

"مسٹر محمد علی کو صاحب وزیر ہند سے ملنے کی اجازت نہ ملی۔ پھر اسی لئے صاحب وزیر ہند کی تشریف آوری سے قبل یہ اعلان کیا گیا کہ وہ ریفارم اسکیم کے سوا کوئی ایڈریس نہ لیں گے۔ پھر اسلامی جلسہ شوریٰ لکھنؤ منعقدہ ۱۴ر نومبر سے دو دن قبل لیگ کو یہی فیصلۂ آسمانی یاد دلایا گیا۔ اسی مستحکم دلیل اور قومی محبت سے

صوبہ متحدہ کی لیگ کے وفد کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی نظر بندی کے مضمون پر سرخ نشان پھیر کر آئے ورنہ بارِیاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تمام مسلمانانِ ہند کے قائم مقام وفد سے کہا گیا کہ وہ بھی نظر بندوں کے مضمون کو اپنے ایڈریس سے خارج کر دے۔ باوجودیکہ وفد کے صدر عالی جناب نواب اسحاق خاں صاحب نے بار بار عرض کیا کہ ہم ارکانِ وفد اس بارے میں مجبور رہیں لیکن دفتری اقتدار کی جانب سے جواب ملا کہ مزاجِ شاہانہ تابِ خلاف ندارد۔ آخر کار اسلامی وفد، کروڑ مسلمانانِ ہند کی امیدوں کا خون کر کے بے نیل مُرام واپس آ گیا۔ غرض صاحب وزیر ہند پر پہرے بٹھائے گئے اور سخت سے سخت امور کا ارتکاب کیا گیا تا کہ صاحب وزیر ہند کے سمع مبارک تک نظر بندوں کی فریاد نہ پہنچے مگر بیگم صاحبہ حسرت موہانی کی اس دلیری پر دفتری اقتدار انگشت بدنداں ہو گا اور یا پھر غصہ سے ہاتھ کاٹ رہا ہو گا کہ بیگم حسرت نے صاحب وزیر ہند کے روبرو نظر بندوں کی آزادی کا پیغام پہنچا دیا۔ چنانچہ جب وہ خاتون ہند کے وفد میں ان کے سامنے پیش ہوئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا تو فوراً ہی بلا تکلف انگریزی زبان میں کہا "جب کہ باغیانہ آئرلینڈ کو رہا کر دیا گیا ہے تو نظر بندانِ ہند کو بھی آزاد فرما دیجئے"۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ نیو ایرا (NEW ERA) کا وہ پرچہ پیش کر دیا جس میں مسٹر مانٹیگو اور مسلمان کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہو چکا ہے اور جو حال ہی میں حکومت صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا ہے۔

راستہ روک کے کہہ دوں گا جو کہنا ہو گا
کیا ملو گے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

ہم اپنی بہن کی خدمت میں تمام ملک کی طرف سے اس جرات و شہامت پر صرف یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں۔ "آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو"

(بحوالہ اخبار مدینہ بجنور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء)

مندرجہ بالا اخباری رپورٹ سے ایک نیا انکشاف بیگم حسرت سے متعلق یہ بھی ہوتا ہے کہ انھیں اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ یہ

استعداد انھوں نے کب اور کیوں کر بہم پہنچائی، اس پر ان کے قریبی اعزا ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

کل ہند زنانہ وفد کی اس نمائندگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرتؔ کے کردار اور قومی محاذ پر ان کی سرگرمیوں کے سبب جدوجہد آزادی کی عظیم مجاہدہ بی اماں (والدہ محمد علی) کی نظر میں ان کے لئے کتنی وقعت و عزت تھی اسی سلسلے میں مسز راما نہرو کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء میں انھوں نے تحریر کیا تھا:

"اخباروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اس بہادر اور پیاری بیٹی نشاط بیگم (بیگم حسرت موہانی) کے ساتھ مجھے بھی ممالکِ متحدہ کی خواتین کی قیادت اس وفد میں کرنا ہے جو تمام خواتین ہند کی جانب سے جناب وزیر ہند کی خدمت میں ۱۸ ماہ حال کو الٰہ آباد میں حاضر ہونے والا ہے۔" شوکت علی و محمد علی صاحبان کی نظر بندی کے چند اہم خطوط (انجمن اعانت نظر بندان اسلام (نمبر ۲) دہلی ۱۹۱۸ء ص ۶۹)

حسرتؔ کی قید کی یہ مدت تو ۲۲ر مئی ۱۹۱۸ء کو ختم ہوگئی، تاہم نظر بندی کے احکام اپنی جگہ بدستور رہے۔ نشاط النساء بیگم کی قوتِ ارادی کا اب پھر وہی امتحان اور عزم و استقلال کی پھر وہی آزمائش تھی۔ بوقت رہائی وہ نواب اسحاق خاں صاحب اور قاضی بشیر الدین وکیل کے ہمراہ جیل کے دروازے پر استقبال کے لئے موجود تھیں۔ رہائی کے بعد کی تفصیل ایڈیٹر جمہور کی زبانی سنیے۔

"قاضی بشیر الدین صاحب کا تار اور بیگم صاحبہ حسرت موہانی کا ایک مفصل خط ملا جس سے حسب ذیل امور معلوم ہوئے:

(۱) مولانا حسرتؔ نے گورنمنٹ کے احکام کو لینے سے انکار کر دیا

(۲) وہ آئندہ پھر پہلے کی طرح احکامِ نظر بندی کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ ہیں۔

(۳) گورنمنٹ ۶۰ روپیہ ماہوار وظیفہ دینا چاہتی تھی مگر مولانا نے اس کے

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

(اس کی تصدیق مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے بھی اپنے متذکرہ خط میں کی ہے۔" حسرت کی مثال اور بھی حیرت انگیز ہے حکومت نے جو دینا چاہا اسے لینے سے انکار کر دیا اس کو یاد آگیا کہ اسی کے نانا نے تو فاطمہ کے لاڈلے کے منہ میں سے بیت المال کی کھجور کخ کخ، کہہ کر نکلوائی تھی کہ صدقہ اس کی اولاد پر حرام ہے جس کا نانا ایسا ہو اس کا نواسہ بھی حسرت کی طرح غنی کیوں نہ ہو۔ سچ ہے اسی کو یہ کہہ کر حکومت کا ملتا ہوا روپیہ ٹھکرا دینا سزاوار ہے ؎

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی اُمید ہے میری بڑا دل

(جمہور کلکتہ ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۶ء)

(۴) نواب اسحاق خاں صاحب و دیگر حضرات میموریل تیار کر رہے ہیں جو پندرہ دن کے اندر نینی تال میں پیش ہو گا۔ اگر منظور نہ ہوا تو بقول بیگم صاحبہ " وہی حالتِ سابقہ بدستور اور خود بخود قائم ہو جائے گی یعنی علانیہ قیام کٹھور کیا جائے گا اور تمام واقعات گذشتہ از سر نو واقع ہوں گے۔"

گو ممدوحہ کا یہ خط پرائیویٹ ہے اور ہمیں حق حاصل نہ تھا کہ ہم اس کے کسی حصّے کو شائع کرتے مگر حسرت کے ہم قوموں کے لئے اس کے اندر جو پیامِ عبرت موجود ہے اسے ان تک پہنچانے کے لئے ہم نے یہ بے ضابطگی بھی گوارہ کی۔ موصوف فرماتی ہیں " افسوس اپنا ساتھ دینے والا اس وقت کوئی نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم آپ ہی کوشش کر دیجئے۔ . . . میں عورت ہو کر کیا کر سکتی ہوں۔ خدا مسلمانوں میں اخوتِ اسلامی اور ہمدردی پیدا کرے تو شاید بھلائی کی کوئی صورت نظر آئے ورنہ اس مرتبہ بھی خدانخواستہ وہی ہوا تو صبر کر کے بیٹھ رہوں گی۔"

(جمہور، کلکتہ مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۱۶ء)

بیگم حسرت کے اس خط سے گو ایک طرح کی بے بسی اور کس مپرسی کا اظہار

ہوتا ہے جوان کی قوتِ ارادی کی فولاد جیسی صلابت اور عزم محکم کی چٹان جیسی مضبوطی سے میل نہیں کھاتا۔ لیکن یہ کیفیت یقیناً عارضی تھی جس کا واحد سبب اپنوں کی بے حسی اور بے رُخی تھی۔ اِسی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے مرحوم قاضی عبد الغفار نے لکھا تھا:

"بقول ہمارے نامہ نگار کے مسٹر حسن امام اور آنریبل مسٹر سمیع اللہ بیگ کی رائے یہ ہے کہ حسرتؔ قانون تحفظ ہند کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مسٹر حسن امام کا تو ذکر ہی فضول ہے لیکن مرزا سمیع اللہ بیگ کو ہم ایک سمجھدار محب قوم سمجھتے ہیں اس لئے ہم صاحب ممدوح سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے خیال میں مسٹر گاندھی کا طرزِ عمل بھی قابلِ اعتراض ہے؟ کیا حق کے لئے جھگڑنے کا یہ طریقہ کسی حیثیت سے نامناسب ہے؟ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ گاندھی ایک ایسی قوم کے فرزند ہیں جو زندہ ہے اور حسرتؔ ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے ہیں جو عزت اور عظمت کے ساتھ ہی اپنی عصبیت اور غیرت بھی کھو بیٹھی"۔ (ایضاً)

چند ماہ میرٹھ اور موہان میں نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں بالآخر حسرت کو پھر سے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن پابندیاں ختم ہوتے ہی وہ پھر سے اپنے معمولات میں سرگرم نظر آنے لگے۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ایک بار پھر انھیں گاندھی جی کے قریب لے آیا۔

۱۹۱۹ء کے امرتسر اجلاس میں حسرتؔ کے ساتھ حسب معمول بیگم حسرت نے بھی شرکت کی جس کا تذکرہ عبد المجید سالک نے اپنے مقالے حسرت موہانی میں کیا ہے۔

"مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہوا جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے اور محترمہ نشاط بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔"

(آجکل اگست ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۸)

۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ چھوڑ کر کانپور منتقل ہوئے تو بیگم حسرت بھی کانپور

آگئیں۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جس سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بیگم حسرت کی طبعی خوش مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس تلاشی کی غرض سے علی گڑھ میں ان کی قیام گاہ پر آئی بیگم حسرت نے چپہ چپہ دکھایا مگر ایک مقفل صندوق کے بارے میں کہا کہ اسے ہاتھ نہ لگایئے گا اگر اندر کا بم پھٹ گیا اور آپ لوگ ہلاک یا زخمی ہوگئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی پولیس انسپکٹر نے سپاہی سے کہا کہ صندوق کھول کر دیکھو اس میں کیا ہے۔ "سپاہی خوف زدہ تھا اور اس لئے اس نے اپنے افسر سے کہا کہ ذرا انتظار کر لیجئے اس صندوق کو مولانا سے ہی کھلوائیں گے جب وہ واپس آئے تو بتایا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں جب اسے کھولا گیا تو وہ اندر سے بالکل خالی نکلا۔ مولانا کو جب سارا واقعہ بتایا گیا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا" بیگم نے مذاق کیا ہوگا"

(ضیاء الدین احمد برنی" عظمتِ رفتہ کراچی ص ۱۹۲)

دسمبر ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستانی غم و غصّہ سے بیتاب تھے۔ ناگپور کے دسمبر اجلاس میں کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کی۔ اس میں حسرت کی شرکت ناگزیر تھی۔ بقول گاندھی جی یہ راہ حسرت کی دکھائی ہوئی تھی۔

(My experiments with truth - M.K. Gandhi P 478-82)

حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سودیشی تحریک کی قیادت کی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے علی گڑھ خلافت اسٹور بھی قائم کیا تھا۔ بیگم حسرت نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور مسلم خواتین میں اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے سودیشی کپڑے کی تجارت کی۔ اسی پر شبلی نے کہا تھا "تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے پھر پالی ٹیشن بنے اور اب بنیئے ہوئے"۔ اس کا اعتراف گاندھی جی نے 'روز بروز سودیشی' کے عنوان سے اپنے مضمون "ینگ انڈیا"، مورخہ ۱۹ ارمئی ۱۹۲۰ء میں کیا ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ تحریک کو مقبول بنانے کے لئے وہ برابر ملک میں مختلف دورے بھی کرتی رہی تھیں۔ "سودیشی کی مقبولیت کا سب سے زیادہ خوشگوار اور حیرت انگیز تجربہ شریمتی سرلا دیوی چودھری اور محاذ آزادی کے مخلص انتھک مجاہد مولانا حسرت موہانی کی بیگم کا ہوا۔ اپنے بریلی کے تجربات کے سلسلے میں سرلا دیوی نے لکھا ہے کہ بیگم حسرت کی بلائی گئی میٹنگ میں پندرہ مسلم خواتین نے سودیشی کا عہد لیا

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol. XVII, P 429)

۱۹۲۱ء کا سال کانگریس کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احمد آباد کے تاریخی شہر میں اسی سال خلافت کانگریس و مسلم لیگ کے اجتماعات ہوئے۔ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی اور پھر کھلے اجلاس میں حسرت نے گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود مکمل سوراج کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پر امن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کے لئے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہے جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو (Report of thirty six Indian National Congress 1921 P 50)

اس وقت کسی فرد واحد نے بھی اس کی تائید نہیں کی مکمل آزادی کی یہ تجویز انھوں نے اسی سال خلافت کانفرنس کے اجلاس میں بھی پیش کی تھی۔ لیکن وہاں بھی کسی نے اس کی حمایت نہیں کی تاہم یہی تجویز آٹھ سال بعد کانگریس کے مقاصد میں شامل ہوئی۔ لیکن تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا پہلا اعلان حسرت کی زبانی ہوا۔ بیگم حسرت یہاں بھی حسرت کی ہم نوا و ہم سفر تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی راوی ہیں "یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں حسرت مع بیگم کے بیٹھے ہیں اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں۔ مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں اسی میں کھانا پینا ہے۔ ہجوم کی کوئی پرواہ نہیں۔ دوسری طرف دیکھا

کہ پنڈت موتی لال نہرو کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبے میں لگ رہا ہے اور وہ اس میں آرام سے سوار ہو رہے ہیں۔ اسی وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے۔ حسرت جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے با سرو سامان کے لئے۔"

(سید سلیمان ندوی مقالہ واحسرتا! یادگار حسرت نمبر اردو اکاڈمی لکھنؤ نومبر ۱۹۸۱ء ص ۱۷۱، ۱۸۱)

بیگم حسرت کی اس بے سرو سامانی کی کیفیت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا انکی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس کے علاوہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہی کل ہند زنانہ کانفرنس کا اجلاس بھی بی اماں (والدہ محمد علی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، شریمتی چودھرائن سرلادیوی اور دیگر ہزاروں مسلم و غیر مسلم خواتین کے ساتھ نشاط النساء بیگم بھی شریک تھیں

(مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری۔ اثر بن یحییٰ انصاری ص ۱۰۱)

حسرت کی تیسری گرفتاری اور بیگم حسرت:

خلافت اور کانگریس کے اجلاس میں تقاریر کی بناء پر حکومت بمبئی نے حسرت پر تاج برطانیہ کے خلاف اقدام جنگ اور بغاوت کے الزام میں دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ چلایا گرفتاری اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ اس بار وہ یرودا (پونا) جیل میں رکھے گئے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی بھی اسی جیل میں مقیم تھے۔ انھیں پہلا درجہ دیا گیا لیکن حسرت جیسے "خطرناک" قیدی کے حصے میں ہمیشہ کی طرح جیل کا تیسرا درجہ ہی آیا اور یزیدی انداز بھی حسب سابق تھا جس کی تصدیق بیگم حسرت کے مولانا باری کے نام پونا سے لکھے گئے ۲۸ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط سے ہوتی ہے "اب تک مولانا کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کا برتاؤ نہایت سخت ہے بلکہ روزانہ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا ہے حال میں

مزید لغویت یہ کی ہے کہ برش، آئینہ، سرمہ، قرآن شریف رکھنے کا تختہ حتیٰ کہ پانی کا گھڑا تک اٹھوا لیا ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ روٹی ایک گیہوں کی صبح کو ملتی ہے وہ بھی بند جوار، باجرہ مٹی ملی ہوئی ترکاری خراب ملتی ہے۔ یہ سب سزائیں روزانہ اس لئے دی جاتی ہیں کہ کام کیوں نہیں کرتے مگر مولانا بھی اپنی دھن کے پکے ہیں۔ برابر سے مقابلہ کرتے ہیں۔" (بیگم حسرت موہانی اور انکے خطوط۔ متذکرہ ص ۹۷)

حسرت و بیگم حسرت کے تذکرے میں اس پس منظر کو دھیان میں رکھنا یوں ضروری ہے کہ قید و بند کی بڑی سے بڑی سختی بھی ان کو جادۂ مستقیم سے ہٹلنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ سچا جہاد ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان ہے۔ یہ ان کا ایمان تھا اور وہ زندگی بھر اس جہاد میں مصروف رہے۔ بحیثیت عورت طبعی نرم دلی کے باوجود بیگم حسرتؔ ہر ہر قدم پر حسرت کی ہمنوا و دمساز رہیں۔ چنانچہ اس بار بھی وہ مع بیٹی و داماد کے پونا میں ہی مقیم رہیں اور اپنی کفیل آپ رہیں۔ اس بارے میں انھوں نے کسی کا احسان لینا قبول نہیں کیا۔

(ضیاء الدین برنی۔ بیگم حسرتؔ عظمت رفتہ کراچی ص ۱۹۵) دورانِ قید حسرتؔ کو باہر سے کتابیں منگانے اور لکھنے دپڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ بیگم حسرتؔ انھیں کتابوں کے حاشیوں پر خط کا مضمون لکھ دیا کرتی تھیں۔ ضیاء الدین کے جو اس زمانے میں حکومت بمبئی کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں تھے، استفسار پر انھوں نے بتایا تھا کہ "نہ تو میرا کوئی خط ہی مولانا تک پہنچتا ہے اور نہ مجھے ملاقات کی ہی اجازت ملتی ہے۔ اس لئے خطوں کی باتیں کتابوں کے حاشیے پر لکھ کر بھیجتی ہوں۔ (ایضاً)

دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے گیا اجلاس کے موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے ان کی عدم موجودگی میں تحریک موالات کی مخالفت اور کانسلوں میں شرکت کے سوال پر زور دار بحث ہوئی حسرتؔ بھی ان دنوں قید تھے۔ نشاط النساء بیگم نے نہ صرف اجلاس میں شرکت کی بلکہ ترک موالات کی وکالت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "مکمل آزادی کے جو لوگ علمبردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک

کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں وہ کانسلوں میں جا کر آئینی اصلاحات کی قسط وصول کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ احمد آباد میں (کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ) مکمل آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی تھی، آج داخلۂ کونسل کے حامیوں کا زور اسی کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔

(انڈین انیول رجسٹر ۲۳-۱۹۲۲ء جلد اول ص ۹۱-۸۷۲)

سزا کی مدت میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا کہ حسرتؔ رہا کر دیئے گئے اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد کانگریس سے بد دلی کے سبب ۲۹ ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو وہ اس سے مستعفی ہو گئے۔

مولانا حسرتؔ کے مصائب سے بھرپور اس تمام عرصے میں جس طرح بیگم حسرت نے حق رفاقت ادا کیا اس کے پیشِ نظر خواجہ حسن نظامی نے ان کا شمار مشاہیر ہند میں کرتے ہوئے درویش جنتری میں لکھا تھا "حسرت کی بیوی مسلمانان ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایام بلا میں ایسی وفاشعاری اس عورت سے ظاہر ہوتی ہے جیسی سیتاجی نے رام چندر سے کی تھی۔"

(درویش جنتری ۱۹۲۳ء بحوالہ کتابی دنیا۔ کراچی جنوری و فروری ۱۹۶۷ء ص ۱۴) تاہم "ایام بلا" کے دوران اس وفاشعاری سے جو نتیجہ عتیق صدیقی نے اخذ کیا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط میں انھوں نے تحریر کیا ہے "حسرتؔ کے ایام بلا" ان کے قید و بند کی زندگی کا دور ختم ہوا تو نشاط النساء بھی اپنی گھریلو زندگی کے خول میں واپس چلی گئیں اور اپنی بقیہ زندگی کے دس سال اسی خول میں بسر کیے۔" (ص ۷۴)

یہ تاثر کہ نشاط النساء بیگم تمام تر سیاسی سرگرمیوں کے پس پشت محض ایک جذبۂ رفاقت تھا۔ جدوجہد آزادی میں ان کی عظیم الشان خدمات کا مناسب اعتراف نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے سیاسی شعور کا آغاز اور ارتقاء حسرت کی معیت

میں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ارتقاء کے مراحل جس تیزی سے انھوں نے طے کئے اس میں بڑا دخل ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھی تھا۔ عملی زندگی میں جوں جوں سامراجی آمریت و استبداد سے ٹکراؤ بڑھتا گیا اس کے استحصال کے حکمت عملی کے گھناؤنے نقوش بھی واضح ہوتے چلے گئے۔ اور سیاسی شعور میں پختگی کے ساتھ ساتھ آزادی کامل کا یقین بھی ایمان کی شکل اختیار کر گیا جس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیاں محض حسرت کے مقدمات کی پیروی تک ہی محدود نہ تھیں حسرتؔ کے ساتھ ہر اہم سیاسی اجلاس میں ان کی شرکت اور اس کے لئے بے سروسامانی کی حالت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کی انتھک جدوجہد، کل ہند زنانہ کانفرنس میں شرکت ہم خیال سیاسی رہنماؤں سے خط وکتابت، قومی اخبارات سے مسلسل ربط اور کل ہند زنانہ وفد میں مسز بیسنٹ و سروجنی نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت جو قومی سطح پر ان کی منفرد حیثیت کی واضح نشاندہی ہے۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدوجہد آزادی میں بھی ان کی حیثیت منفرد تھی۔ کشن پرشاد کول کا یہ بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وطن پرستی ان میں بھی ایسی ہی تھی کہ جیسے حسرت میں۔ ان کے خلقی رجحانات کے علاوہ غالباً حسرتؔ کی صحبت نے ان میں چار چاند لگا دیئے تھے لیکن میرے خیال میں وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرتؔ کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور پڑتا رہا،، (نگار، حسرتؔ نمبر متذکرہ ص ۶۰) اس بیان کا مقصد موازنہ یا حسرت کی عظمت کو کم کرنا ہرگز نہیں۔ یقیناً حسرت کی عظمت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ خود انتہائی فراخدلی سے ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء میں بیگم حسرت کی دائمی جدائی کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ " راقم کو بیگم حسرت کی جدائی اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر

باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں اس لئے انھیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔" (حسرتؔ اردوئے معلی فروری تا اپریل ۱۹۳۶ء ص ۲)

بیگم حسرت کی جرأت وہمت کی صفات، ان کی کارکردگی کی اہلیت وصلاحیت اور ملک کی آزادی کی خاطر جد وجہد کا تجزیہ اگر ہم اس زمانے کے مسلم معاشرے کے پس منظر میں کریں تو ان کے کارناموں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

رہی عمر کے آخری حصے میں "گھریلو خول میں واپس چلے جانے کی بات تو میرے خیال میں عمرِ عزیز کے آخری دور میں صحت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ خود مولانا حسرتؔ کے سیاسی مسلک کی تبدیلی بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس سے مستعفی ہونے کے بعد جو باوجود اندرونی اختلافات کے ملک کی سب سے زیادہ فعال جماعت تھی، خود حسرتؔ کی زندگی بہت کچھ بدل گئی تھی۔ گو بعد میں وہ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی رہے اور مزدور تحریکات میں بھی برابر حصہ لیتے رہے لیکن ان تمام کاموں میں اب وہ سرگرمی نہ رہی تھی جو اس سے پہلے کے دور میں ملتی ہے حسرتؔ اور بیگم حسرت دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے اس لئے سیاسی سرگرمیوں کے نشیب وفراز میں بھی یکسانیت لازمی بات تھی۔ تاہم زندگی کے اس دور میں بھی شواہد موجود ہیں کہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں کانگریس اجلاس کے موقع پر مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت وہ دونوں مشترکہ طور پر کر رہے تھے۔ بہرحال نشاط النساء بیگم کی عوامی زندگی کا یہ آخری واقعہ ہے جس کا تحریری ثبوت ملتا ہے۔

اس تمام تر تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ قومی جنگ آزادی میں بیگم حسرت کی قربانیوں کے پس پشت جذبۂ رفاقت وجذبۂ حب الوطنی دونوں ہی مساوی طور پر کارفرما تھے اور قربانی جہاں ہو جس شکل میں ہو اس کا اعتراف خود اپنی بقا کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس اعتراف کے بغیر نہ ہم میں جوشِ عمل پیدا ہو سکتا ہے نہ حُسنِ کردار آسکتا ہے۔ نئی نسل کا یہ شعور ہی کہ قومی آزادی ہم سب کی مشترکہ میراث ہے، یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ اس قیمتی ورثے کی حفاظت بھی ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔

امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی)

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۹ء) کے دوران جب دنیائے اسلام کے مفکرین ایک نازک دوراہے پر کھڑے شش و پنج میں مبتلا تھے کہ آیا وہ بھی وطنیت کی آگ میں کود پڑیں یا وطنیت کے دیو کو ختم کر کے بذریعہ مذہب امن و امان کا علم بلند کرنے کی کوشش کریں تو مولانا محمد علی جوہر نے ایک نسخہ پیش کیا! "جب وطن کا معاملہ ہے تو میں اول ہندوستانی بعد میں مسلمان ہوں۔ اور اسلام کا معاملہ ہے تو میں پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی ہوں"! بالفاظ دیگر انھوں نے یہ ثابت کرنے میں زندگی صرف کر دی کہ پان اسلام ازم اور حب الوطنی میں کہیں پر کوئی تصادم نہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے اس علمبردار نے کہا تھا! "آپ جو کہتے ہیں کہ جب تک انگریز رہیں گے پھوٹ رہے گی یہ میں نے مانا کہ درست ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ جب تک ہم میں پھوٹ رہے گی اس وقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے"! (ہمدرد، ۱۲ راکتوبر ۱۹۲۵ء) اپنے اس مشن کی تکمیل میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھوں نے قیدیوں کے کپڑے ٹوپی پہن کر ملک و ملت کی خاطر جیل میں پتھر بھی توڑے اور زمین بھی کھودی اور جرائت و بے باکی، حب الوطنی اور مذہبی حمیت کی جو مثالیں قائم کیں وہ

جنگِ آزادی کی تاریخ کی سُنہری سرخیاں ہیں۔

امجدی بیگم اسی مجاہد ملک و ملّت کی رفیقہ حیات تھیں۔ ان کا تعلق رامپور کے ایک باحیثیت اور باوقار خاندان سے تھا۔ گھر میں دینی و مذہبی کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے سبب مذہب کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ مولانا محمد علی جوہر سے شادی کے بعد سراسر انھیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ طبیعت انتہائی قانع پائی تھی مولانا کی فقیرانہ و قلندرانہ زندگی بھی اپنائی اور سیاسی مسلک بھی۔

برطانوی سامراج سے برسرِ آزمائی کے سبب خاندان کی مالی مشکلات کا بی اماں (والدہ محمد علی) کے اس خط سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے مولانا کی نظر بندی کے دوران "ہفتہ نظر بندی اسلام" کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کو لکھا تھا، "ہمارے نظر بندوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی مالی حالت اس نظر بندی میں خراب نہ ہوگئی ہو اور جس کو باوجود بار بار کی یاد دہانی کے حکومت کی طرف سے خورد و نوش کے لئے بھی کافی رقم ملتی ہو۔ علاوہ روزمرّہ کے اخراجات ضروری کے مالی نقصانات کا معاوضہ تو حکومت نے ایک کو بھی نہیں دیا۔ شوکت و محمد کی ہزاروں کی آمدنی یک قلم مسدود ہوگئی اور گھر سے پندرہ ہزار سالانہ سود وغیرہ تین برس سے دینا پڑ رہا ہے۔ ایک قرض خواہ نے شوکت پر بارہ تیرہ ہزار کی نالش کر دی ہے اور دوسرا ایک سکھ نالش کا نوٹس دے چکا ہے۔ روئی کا کارخانہ تین سال سے بند پڑا ہے اور اس کو چلانے کے لئے رام پور عارضی طور پر بھی جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ محمد کا پریس بھی بند ہے ہزاروں کا خانگی اور دفتر کا سامان پچیس تیس ہزار روپے کا باقی ہے۔ وہ زنگ گرد اور کیڑوں کی نذر ہو رہا ہے.... نظر بندوں میں شاید سب سے بڑی رقم حکومت شوکت و محمد کو دیتی ہے۔ مگر حکومت نے خود اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو رقم ایک عرصہ تک انھیں دیتی رہی وہ ان کی ضروریات زندگی کو بقدر نصف کے بھی پورا نہ کر سکتی تھی۔"

(اخبار جمہور، کلکتہ اڈیٹر قاضی عبدالغفار ۱۵ ؍جولائی ۱۹۱۸ء)

مولانا محمد علی اور امجدی بیگم کے خوشگوار آپسی تعلقات ہی کے سبب مولانا کی طویل مجاہدانہ زندگی قید و بند کی صعوبتیں ہنسی و خوشی جھیلتے گزر گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں۔

"میاں و بیوی میں میل محبت شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیئے عشق کی کیفیت تھی، عشق ایسا نہیں جس میں سوزش و شورش ہو اور جو تمام ترجوانی کے قوئی کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے اور عربی میں اس کے لئے لفظ "اُنس" ہوتا ہے"۔

(عبدالماجد دریابادی۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ص ۳۶۹)

مولانا نے ان کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے "امجدی بیگم ہر جلسہ، ہر سفر، خلافت کانفرنس میں مولانا کے ساتھ شریک رہتیں اور برابر جلسوں اور دوسری کارروائیوں میں حصہ لیتیں انھوں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں جس کے اجلاس ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸، دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہوئے یوپی کی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔"

(A.M., S.G. Zaidi - Encyclopaedia of I N C. Vol. VIII 1921-24 p 66)

گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کانگریس کی ستیہ گرہ تحریک اور خلافت فنڈ کے لئے بی اماں (والدہ محمد علی) اور امجدی بیگم نے اپنے دوروں سے کروڑوں کا چندہ جمع کیا! انھوں نے ستیہ گرہ تحریک جسے خلافت کمیٹی اور کانگریس نے مشترکہ طور پر منظور کیا تھا۔ اس کے مقاصد انگریزی سامان کا مقاطعہ، شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ، فوجی بھرتی حرام، انگریزی نوکریوں سے استعفیٰ کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کے دور دراز کے سفر کے اخراجات کا بار اٹھانے میں تحریک خلافت کے رضاکاروں اور مولانا محمد علی کے خاندان کی خواتین کے فراہم کئے ہوئے چندوں کے اہم کردار کو نظر انداز

نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے میلکم ہیلی ممبر ہوم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں مولانا محمد علی کی فرد جرم گناتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کے گھر کی عورتیں تک چندہ جمع کرتی اور شورش برپا کرتی پھرتی ہیں"۔

امجدی بیگم کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ "انکے متعدد بار جیل کے سفر اس بات کا محرک بنے کہ آزادی کے جو چند لمحات ان کی معیت میں گذریں انھیں بیش قیمت جان کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔" میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کافی لمبا سفر کیا ہے اور پبلک مصارف پر کیا ہے کیونکہ ہوا یہ کہ جب اس نے میرے ساتھ سفر کرنا شروع کیا تو اسے میرا بیکار کا ضمیمہ بننا ناگوار گزرا۔ اور چونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا حساب وکتاب رکھنے والی تھیں اور کم سے کم اپنے عورتوں کے حلقے میں یقیناً وہ اتنی ہی اچھی منتظم بھی تھیں۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی عورتوں میں بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ اور خلافت فنڈ میں اتنی رقمیں جمع کیں کہ منتظمین نے انھیں اپنی طرف سے سفر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرتے اکٹھے گذارے۔ ہم مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سیکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فساد زدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے، مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے لیکن یہ بات میرے لئے تسکین بخش ہے جس میں کہ کچھ میری حیرانی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر"۔

(مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ وتاریخ ساز، مرتبہ محمد سرور ص ۱۸۵)

اس گرفتاری کی داستان کا گاندھی جی نے مختلف موقعوں پر تذکرہ کیا ہے اور امجدی بیگم کی قوت ارادی کو بھی جگہ جگہ خراج تحسین ادا کیا ہے۔

۲۲ر ستمبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے اس گرفتاری

کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:" مولانا محمد علی کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب ہم مدراس کے لئے سفر میں تھے۔ میں ٹرین سے ہی یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ والٹیر اسٹیشن پر ٹرین ۲۵ منٹ سے بھی زیادہ دیر تک رُکی۔ مولانا محمد علی اور میں ٹرین سے اُتر کر ایک میٹنگ کو خطاب کرنے چند قدم چلے ہی تھے کہ میں نے مولانا کو زور زور سے وہ نوٹس پڑھتے ہوئے سُنا جو انھیں اسی وقت دیا گیا تھا۔ میں ان سے چند قدم آگے تھا۔ اس گرفتاری کے لئے دو سفید فام اور آدھی درجن ہندوستانی سپاہیوں کی پارٹی تعینات کی گئی تھی! افسر انچارج مولانا کو وہ نوٹس ختم کرنے سے قبل ہی بازو پکڑ کر لے گیا۔ انھوں نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر، خدا حافظ کہا۔ میں مطلب سمجھ گیا۔ اب اس علم کو مجھے تنہا ہی بلند رکھنا ہے خدا مجھے اس ساتھی کے مشن کو پورا کرنے کی صلاحیت بخشے جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے باعثِ فخر تھا۔۔۔۔۔۔

میں نے مجمع سے خطاب کیا اور عوام کو پُرامن رہنے نیز کانگریس کا پروگرام کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ بعد میں مڑ کر میں اس مقام پر گیا جہاں مولانا کو حراست میں رکھا گیا تھا اور ان سے ملاقات کی اجازت چاہی، جواب ملا کہ صرف ان کی بیگم اور سکریٹری ہی کو اجازت ہے"!

(Collected works of Mahatma Gandhi, Ministry of Information Govt. of India Vol. XXI, P. 176)

اسی سلسلے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کے " نوجیون " میں بھی امجدی بیگم کے زبردست صبر و تحمل اور جذبۂ ایثار کی تعریف میں انھوں نے لکھا " مجھے بیگم صاحبہ محمد علی کی جرائت پر غیر معمولی حیرت ہے جب وہ مولانا سے مل کر والیٹر اسٹیشن پر واپس ہوئیں تو میں نے اُن سے پوچھا آیا آپ کے دل میں کسی طرح کا کوئی خوف تو نہیں ؟ انھوں نے فوری جواب دیا " قطعاً نہیں، میرے شوہر نے اپنا فرض پورا کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا"! اس گرفتاری کے بعد بھی وہ اسی

جرائت وہمت سے میرے ساتھ سفر کرتی رہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برقع میں ملبوس وہ زنانے و مردانے سبھی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اور مختصر سی تقاریر بھی کرتی ہیں۔ جس کا براہِ راست اثر عوام کے دلوں پر ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر شخص سے کھادی پہننے چرخہ کاتنے اور مسلم عوام سے سمرنا فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل بھی کی ہے کچھ ہی عرصہ قبل ان کی زندگی ایک آرام و آسائش کی زندگی اور نفیس و ملائم لباس ان کا پسندیدہ لباس تھا لیکن اب وہ موٹی کھادی کا ہرا برقعہ پہنتی ہیں جبکہ ایک مسلم خاتون کو اپنی ہندو بہن کے مقابلے میں کپڑے بھی زیادہ پہننے ہوتے ہیں اور بیگم صاحبہ کا جسم بھی کچھ ہلکا پھلکا نہیں ہے لیکن وہ ان تمام تکالیف کو ملک و مذہب کی خاطر ہنسی خوشی برداشت کر رہی ہیں۔ مدراس میں میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ مسلم خواتین کے سفید موٹے لباس میں ایک طرح کا تقدس نمایاں ہے، ہندو خواتین کے رنگا رنگ ملبوسات مجھے موجودہ حالات میں پسند نہیں آئے۔" (Ibid : P 205)

قومی محاذ پر ہندوستانی خواتین کی خدمات کے تذکرے میں ۲۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے امجدی بیگم کے لئے "ایک بہادر خاتون" کے عنوان سے خصوصی طور پر لکھا۔ "بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے مجھے جو تجربات ہوئے میں اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ سال انھوں نے پبلک کاموں میں اپنے شوہر کی مدد کرنا شروع کیا۔ ابتداء سمرنا فنڈ کے لئے چندہ کرنے سے ہوئی۔ تب سے وہ ہمارے طویل اور دشوار ترین۔ ہمارے آسام بنگال کے سفر میں بھی شریک رہیں۔ انھوں نے خواتین کے جلسوں سے بھی خطاب شروع کر دیا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے باوجود انتہائی پُر اثر ہوتی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا وہ اپنے شوہر کو بھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا یہ آرٹ سکھا سکتی ہیں یا نہیں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش اور اس میں فتح کا وقت آیا جب اُن کے شوہر کو اسٹیشن پر ان سے

چھین لیا گیا۔ میں نے انھیں اس وقت دیکھا ہے جب وہ اس کمرے سے نکلیں جہاں ان کے شوہر کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ وہ اسٹیشن کی طرف جمے ہوئے قدموں سے چل رہی تھیں اور جب میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے شوہر کی گرفتاری کے سبب خوش ہیں؟ ان کا فوری جواب تھا یقیناً۔ وہ اپنے ملک وملت کی خاطر جیل گئے ہیں"۔ ہم نے اپنا مدراس کا سفر جاری رکھا، سمندر ساحل پر زبردست عوامی جلسہ ہوا، سامعین اس وقت تک اُن سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے اونچی آواز میں بغیر کسی لڑکھڑاہٹ کے خوبصورت ہندوستانی میں عوام سے خطاب کیا اور میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ صحیح معنوں میں بہادر شوہر کی بہادر بیوی ہیں"۔ (Ibid P 218 - 219)

جیل کی اذیت ناک زندگی اور محبوب شریکِ حیات سے جُدائی کے لمحات میں مولانا کے لئے قومی زندگی میں امجدی بیگم کی شرکت اور دار ورسن کی آزمائش میں ان کی ثابت قدمی کا تصور نہ صرف انتہائی خوش کن تھا بلکہ نئے عزم وولولے کا محرک بھی تھا۔

ہم میں اور تم میں ہوئے محبس وزنداں حائل
آؤ رویا میں کریں اپنی تمنّا حاصل

کراچی جیل سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کے نام ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں تشکر کے طور پر لکھا:۔

"پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں لیکن بوجہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپکے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی توصیف میں ان کارروائیوں کے متعلق جو وہ والنٹیر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی ہیں پڑھیں! اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ غالباً میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم میاں بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق ومحبت کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی اور یہ ہندوستان

میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے اس جُدائی نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز شریک زندگی بنا دیا۔ اور گذشتہ عرصے میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے اختیار کی تھی اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پُرخطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ میری نظروں میں جس قدر عزیز و محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی۔ وہ ریلوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور نہایت فراخدلی سے مجھ سے کہا "ہراساں نہ ہونا، میری اور میری بچیوں کی فکر نہ کرنا"۔ مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہوگئی اور نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی ..... آپ نے جو کچھ ہماری وکالت اور تعریف کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لیے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جانباز اہلیہ کی تعریف کی ہے۔ حقیقتاً میں اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں کرتا۔ مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان بھی جلد ختم ہو جائیگا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی سے جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک انگیز داد لیتی رہے گی"۔ (رئیس احمد جعفری۔ علی برادران، ص۔ ۵۵)

۲۷ نومبر ۱۹۲۱ء کے "ینگ انڈیا" میں اس خط کو شائع کرتے ہوئے گاندھی جی نے نوٹ لکھا تھا کہ اس خط کی اشاعت کی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسی دستاویز ہے جس میں مولانا کے اندر کا انسان مکمل طور پر دیکھا جا سکتا ہے"۔ (Collected works of Mahatma Gandhi OP. Cit. P 350)

لے "نوٹ: یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں بھی مولانا نے اس مختصر ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ دشمنانِ ملک و ملت کے سامنے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ تم ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رازق تھا اب بھی وہی رازق ہے تم صرف ایک واسطہ تھے، خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے رہا تمہارا کام سو اگر اجازت دو تو میں اسے کرتی رہوں۔"

والیٹر اسٹیشن پر گرفتاری کے وقت امجدی بیگم کی ثابت قدمی اور "سپاہیانہ رویے کا تاثر کتنا گہرا اور مولانا کو اس پر کتنا فخر تھا۔ اس کا کھل کر اظہار انھوں نے کراچی جیل سے ہی لکھے گئے "بی اماں" کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ "میں بھی چالیس اکتالیس سال کی عمر سے مہمان داخل، گھر پر آیا کرتا ہوں۔ پہلے بیتول کی قید، پھر رہائی ہوتے ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ، بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا کر چھ سات مہینے کو چھوڑ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی میں ہی بسر ہوا اور ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر کے اسٹیشن پر قید کی ابتدا کا خیال کیا جائے تو یہی غنیمت ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں بھی ملاقات کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے۔ ورنہ منی غریب کس کس کے بچوں کو پالتیں ...... آپ میرا یہ خط امجدی کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی الفاظ اسے یاد دلا دیں کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی والیٹر کے اسٹیشن کا سپاہیانہ رویہ جواب تک قائم رکھا ہے قائم رکھو جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد شامل ہے تو یہ عورت اپنے مسلمان اور ہندوستانی بھائیوں کے سامنے کسی تھڑدلی کے اظہار سے نہ خود شرمندہ ہوگی، نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور اپنے شیر دل ہزاروں مرنے والوں کو شرمندہ کرے گی۔" (علی برادران تذکرہ۔ ص ۵۷۹)

"مقدمہ کراچی کے دوران امجدی بیگم کراچی چلی گئیں تھیں۔ مولانا کو سزا ہو جانے کے بعد وہ واپس علی گڑھ آئیں۔ طلبا جامعہ نے ان کی ہمدردی میں ایک جلسہ محمد علی ہال میں کیا۔ نہایت دکھے دل سے اچھی زبان میں آپ نے ایک دلدوز تقریر کی۔ طلبا جامعہ زار و قطار رو رہے تھے، وہ تو ان کو کیا ڈھارس دیتے الٹی بیگم صاحبہ ہی ان کو ڈھارس دے رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا "بچو بے شک مولانا کی سزایابی سے میں سخت مغموم ہوں، لیکن خداوند قدوس پر بے حد بھروسہ رکھتی ہوں۔ آدمی کی موت و زیست کا کوئی بھروسہ نہیں ہے ٹھوکر لگی اور آدمی مر جاتا ہے۔ پھانسی لگتی ہے اور آدمی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے یہ تو دو برس کی بات ہے

میں تو یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ چاہے گا تو یہ دن بھی نکل جائیں گے۔"

(سید محمد ہادی علی برادران ص ۱۱۵)

مولانا محمد علی جب تک جیل میں رہے ان کا کام جیل سے باہر ان کی والدہ اور بیوی انجام دیتی رہیں جیسا کہ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں مولانا نے لکھا ہے۔

"ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا دروازہ بند ہو گیا تو میری ماں نے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں عصائے پیری کو لیا، نقاب اُلٹ کر وہی کام کرنا شروع کیا جو ہم کیا کرتے تھے مگر جسے حکومت نے خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال کر ہم سے چھڑا دیا تھا۔ میری اہلیہ نے اس سے پہلے ہی عورتوں میں جن کا ذوق و شوق مردوں سے کہیں بڑھ کر تھا اس کام کو شروع کیا تھا اور وہ میری رفیقِ کار اور رفیقِ سفر بن گئی تھیں"۔ اور یہ رفاقت زندگی کے آخری سانس تک باقی رہی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی، دوسری آنکھ کی بینائی بھی جواب دے رہی تھی، گٹھیا کے اثرات بھی تھے اور ذیابیطس کے حملے بڑی شدت سے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر مکمل آرام و علاج کا مشورہ دے رہے تھے لیکن یہ مجاہد تھا کہ میدانِ جنگ کے لئے مچلا ہوا تھا۔ اسی شدید علالت کی حالت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وہ لندن روانہ ہوئے۔ حسبِ دستور امجدی بیگم اس آخری سفر میں بھی رفیقِ سفر تھیں۔ اس سفر کے بارے میں مولانا نے کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطانِ جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر جس طرح بھی ہو سکے تین چار ہزار درہم فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے چلوں گا اس لئے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل میں میری رفیقِ سفر رہی ہیں"۔

(محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق متذکرہ دوئم ص ۱۵۶)

مولانا کی شدید علالت اور وفات کے درمیانی وقفے میں امجدی بیگم نے جو خطوط ہندوستان اپنی بیٹی کے نام لکھے وہ اہم تاریخی دستاویز ہیں معالجوں کے پیہم اصرار کے باوجود ملک و ملّت کی خاطر بستر مرگ پر بھی مولانا محمد علی کے آخری سانس تک مسلسل کام کئے جانے کی لگن ان خطوط کے آئینے میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے آخری شبانہ روز کی مشغولیات کی تفصیلات کا واحد ماخذ بھی یہی خطوط ہیں مثلاً!

۹۲ نمبر مرٹن روڈ

S.W.1   ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ ...... تمہارے ابا کی طبیعت پھر تین روز سے خراب ہے کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا جلنا رہتا ہے۔ کمزور بہت ہوگئے ہیں۔ اس وجہ سے تھک جاتے ہیں، ۷ سے کانفرنس شروع ہے وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں۔ تمہارے ابا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا ہے چونکہ کوئی آدمی نہیں کام کرنے کے لئے اس لئے تھک جاتی ہوں، خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ...... تمہاری والدہ امجدی

(رئیس احمد جعفری، علی برادران متذکرہ ص ۶۱۴)

ہائڈپارک ہوٹل نائٹس برج لندن   ۲۷ر نومبر ۱۹۳۰ء

S.W.1

...... "تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے لیکن پیروں اور رانوں پر ورم بہت زیادہ ہے اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں آرام کر رہے ہیں" (ایضاً ص ۶۱۵)

ان خطوط میں اکثر لوگوں سے ملاقات کا تذکرہ ہے جس میں بیگم بھوپال مہاراجہ الور، مہاراجہ جام، مہاراجہ اور مہارانی بڑودہ کے نام خاص ہیں۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن　　　　۱۴ر دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

...... اس ہفتے تمہارے ابّا پلنگ پر لکھ رہے ہیں لیکن جب سے یہاں آئے ہیں لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ آرام نہیں کرتے جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ اب چار پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا......

...... کل تمہارے ابّا کا فاقہ تھا، سوجن ہے اس کی وجہ سے ڈاکٹر پلنگ سے نہیں اٹھنے دیتے۔ ویسے طبیعت اچھی ہے تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو جس کام کے لئے آئے ہیں بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ وسلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں۔" (ایضاً ص ۶۱۶-۶۱۸)

اور وہ مشن کیا تھا جس کی خاطر موت وزیست کی کش مکش میں بھی وہ برطانوی سامراج سے نبرد آزما تھے؟ ملک وملت کی خاطر۔ سوراج اور قومی یک جہتی کے لئے ہندو مسلم اتحاد۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن　　　　۲۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

پیاری زہرہ دعا۔ تم زندہ وسلامت و تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے ماں باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہو گی اس کا مجھے بھی اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے اخبار والے نہیں مانتے لکھ دیتے ہیں۔ میری رائے نہیں تھی۔ اس خط میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد کی تفصیل اور خاندان کی مالی مشکلات کا بھی ذکر ہے۔ تمہارے دو خطوط جس میں تم نے روپے کا لکھا تھا تمہارے ابا کے نام تھا وہ ان کو نہیں دکھا سکے۔ صرف کہدیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، وہ خیریت سے ہے۔ تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔ صاحب نے جنوری میں بھوپال سے چچا کو خط لکھدیا تھا۔ اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا او

برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو ہزار نہیں۔ چار ہزار نہیں صرف تین چار سو روپے کا ہمارا کسی کو اعتبار نہیں۔

...... میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم پردیس میں ہیں ہم کیا کریں گے"۔ (ایضاً ص ۶۲۰)

امجدی بیگم کا خط ۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کا مولانا کی وفات کے بعد کا ہے جس میں باوجود انتہائی صبر و ضبط کے ایک ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھدیا ہے۔

"پیاری زہرہ۔ میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بد تر۔ میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جس کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا، وہ سامنے آکر رہا۔ میری ایک بھی دُعا قبول نہیں ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے میں ابھی نہیں جاؤں گا، جب پورا کام ہو جائے اس کے بعد پیرس جاؤں گا علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا"۔ ..... دو ڈاکٹروں کے ساتھ یہاں کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی آئے تھے، مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی سب پیتے رہے۔ مسٹر نہرا نے کہا آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں انھوں نے کہا بھائی ابھی ہندو مسلمانوں کا معاملہ ٹھیک ہو جانے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکناڈا میں جھنڈا اٹھایا تھا اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤنگا ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔ .... ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے اگر اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں تک رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر مار دو تو ٹوٹ جائے گا اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جائیے"۔ (ایضاً ص ۶۲۲-۶۲۵)

اور بالآخر شیشہ ٹوٹ گیا۔ مجاہد حریت لندن اس عزم کے ساتھ گیا تھا

کہ غلام ہندوستان واپس نہیں ہوگا۔ خدا نے اپنے محبوب بندے کی لاج رکھ لی۔ آخری سانس آزاد لندن ہی میں لیا اور فلسطین میں تدفین جس انداز سے ہوئی اسی کے لئے شاعر نے کہا تھا ؎

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

امجدی بیگم کے یہ غم جان لیوا تھا گو لندن سے واپسی پر کافی عرصے تک وہ خلافت کمیٹی سے وابستہ رہیں لیکن اندر ہی اندر گھلتی رہیں اور تقریباً پندرہ سال بعد سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔

آزاد ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر جیسے پیکرِ حریت اور شہیدِ قوم کو کبھی خراجِ تحسین پیش نہیں کیا گیا۔ نتیجے میں امجدی بیگم کی شاندار اور بے لوث اور بے مثال قربانیاں بھی تاریخ کا ایک ورقِ پارینہ بن گئیں۔ اس کی بڑی وجہ کوہاٹ کے ہندو مسلمان فساد پر گاندھی جی اور محمد علی میں اختلاف تھا مولانا محمد علی نہرو رپورٹ سے بھی خفا تھے جو ان کی قید کے دوران تیار کی گئی تھی اور جس کے بعد انھوں نے کانگریس سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اختلاف بہرکیف انڈین نیشنل کانگریس اور انقلابی رہنماؤں کے درمیان ہی نہیں، خود اندرونِ کانگریس نرم و گرم رہنماؤں کے درمیان ہمیشہ ہی رہا گو راہی سبھی ایک منزل کے تھے اور عوام کے کان ابھی تقسیمِ وطن کے تصوّر سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

اچھا ہوا جو آپ نے دل سے بھلا دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

خود گاندھی جی نے ان کی موت پر کہا تھا کہ ملک ایک انتہائی نڈر و عظیم "قوم پرست" سے محروم ہوگیا۔ شاید کوئی آنے والا غیر جانبدار مورّخ ان سبھی مختلف راستوں کے مجاہدینِ حریت کی قربانیوں پر جمی گرد کو جھاڑ کر ان کے صحیح خدوخال کو نمایاں کر سکے۔ اگر ایسا ہو سکا تو یہ قومی یک جہتی کی جانب نمایاں پیش رفت اور ملک کی ایک عظیم خدمت ہوگی۔

نوٹ: امجدی بیگم زندگی کے آخری برسوں میں مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئی تھیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

سعادت بانو کچلو

سعادت بانو کی پیدائش ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء میں امرتسر کے ایک متمول ... دوست خاندان میں ہوئی علمیت اور قابلیت کے مختلف مدارج انھوں نے گھر ... کئے۔ ان کے والد میاں حفیظ اللہ صاحب اور بڑے بھائی سعید اللہ صاحب ... کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ سعادت بانو نے بہت جلد اردو فارسی میں ... حاصل کرلی اور اپنے دائرہ اثر میں مختلف سماجی عیوب کے خلاف نیز ... رسائل پردکن ریویو، تہذیب نسواں، خاتون وغیرہ رسائل میں پُر زور ... لکھنا شروع کردیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم نسواں اور ان کی مضمون نگاری کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ سعادت بانو کا مضمون "حریت نسواں" تہذیب نسواں ... میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں تحریر کئے گئے اس مضمون سے ان کی دور بینی اور وسعت مطالعہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "حقوقِ نسواں ... میں تکلیف نیا فیشن، تہذیب کی جہلی، علم سے خطاب اور نئی جنتری ..." جیسے عنوانات سے ان کے متعدد مضامین ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء کے ... ہوئے خصوصاً تین مضامین بعنوان "شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم ... اور سر سید مرحوم" اپنی نوعیت وطرز نگارش کے اعتبار سے ہی اعلیٰ

مقام نہیں رکھتے بلکہ ان سے مضمون نگار کے وسعت مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔
اسی زمانے میں انھوں نے گھر پر انگریزی تعلیم بھی شروع کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شعر وسخن اور ادب لطیف سے بھی ان کی دلچسپی شیفتگی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اردو فارسی کے کلاسیکی شعراء کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور نیچرل شاعری کے سبزہ زاروں میں آزاد مرحوم کے اتباع میں ایک نئی راہ نکالی تھی۔
سعادت بانو کی تمام تر نظمیں قومیت اور حبّ الوطنی کے جذبات کا مظہر ہیں"۔ اسیر قفس" جو علامہ اقبال کی نظم "ایک بُلبل کی فریاد پنجرے میں" کی تضمین ہے ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی جب ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے دل کسے سناؤں میں غم بھرا فسانہ
گلشن سے اب قفس میں میرا ہوا ٹھکانہ
رنج والم سے دل پر لگتا ہے تازیانہ
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

پنجرے میں دیکھتا ہوں آزادیاں جہاں کی
آتی ہے یاد مجھ کو اب اپنے آشیاں کی
میں قید میں پڑا ہوں طاقت نہیں فغاں کی
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

یارب کدھر گئے وہ اب دن مری خوشی کے
گلشن میں جن دنوں میں کرتا تھا اڑ کے پھیرے

گلشن کی سب بہاریں پیشِ نظر تھیں میرے
پتوں میں ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

سلگی ہے جان میری افسوس جل گیا جی
سینے میں سوزِ غم نے وہ آگ تیز پھونکی
چھوٹے سے اک قفس میں میں ہو رہا ہوں قیدی
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

کس سے کہوں میں اپنی اس بے لبی کا عالم
قسمت دکھا رہی ہے اب مجھ کو نت نئے غم
کرتا ہوں اپنے ٹوٹے پھوٹے پروں سے ماتم
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آ کر پھولوں کا منہ دُھلانا

آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ آشیاں کی مورت
ڈھونڈھوں کہاں سے اب میں آرام و عیش و عشرت
آتی ہے یاد دل کو ہوتی ہے سخت وحشت
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

"تاروں سے گفتگو" بھی ۱۹۱۰ء میں ہی شائع ہوئی۔

پُر لطف کیا سماں ہے تمہارے بہار کا
نکلا مگر نہ حیف میرے دل کا مدّعا
تم سے غرض ہے مجھ کو نہ کچھ آسمان سے
مطلب ہے اپنے ملک سے ہندوستان سے
کیا وہ بھی دن خدا کبھی مجھ کو دکھائے گا
ہندوستان تمہاری طرح جگمگائیگا
اہلِ زمانہ دیکھیں گے ہندوستان کو
اس کی چمک لبھائے گی سارے جہان کو
پیارے وطن کے نام پہ جاؤں نثار میں
اجڑے چمن میں دیکھوں الٰہی بہار میں

سعادت بانو کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی ان کا دل جذبۂ حبّ الوطنی سے سرشار تھا۔ ایک مسلم لڑکی، زمانۂ دوشیزگی، پردے کی قیود اور قوم پرستی کے ایسے جذبات واحساسات کی حزنیہ داری آج کے زمانے میں کوئی اہم بات نہ ہو لیکن اس زمانے کے تناظر میں یقیناً وہ حیران کن اور قابل ستائش ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے ۱۹۱۱ء سے مسلمانِ ہند کی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جنگِ طرابلس وبلقان اور قضیۂ مسجد کانپور نے ان کے طرزِ فکر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ہر شخص بے چین ومضطرب تھا۔ ان واقعات نے سعادت بانو کو بھی نئے میدان تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ 'زمیندار' اور 'ہمدرد' نے انھیں دنیائے سیاست کی نئی راہوں سے روشناس کرایا اور وہ نئے انہماک کے ساتھ قومی وملی خدمات کے لئے کمربستہ ہو گئیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں پہلے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کیا اور پھر ہلال احمر اور مجروحین کانپور کے لئے باوجود طویل سلسلۂ علالت کے وہ ہمدرد، وکیل اور زمیندار میں بھی گاہ بہ گاہ سیاسی مضامین لکھنے لگیں۔

۳۰ ر اکتوبر ۱۹۱۵ء میں سعادت بانو فدائے ملک و ملت، فخر قوم جناب سیف الدین کچلو بیرسٹرایٹ لار کی رفیقۂ حیات بنیں ۔ ڈاکٹر کچلو کا خاندان کشمیر سے ترکِ سکونت کر کے امرتسر میں آباد ہوا تھا۔ امرتسر، آگرہ، علی گڑھ میں تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ لندن سے بارایٹ لا۔ جواہر لال جی کے ساتھ کیا اور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری جرمنی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایک عظیم محبِّ وطن اور شعلہ بیان مقرر تھے اور وکالت چھوڑ کر کانگریس اور خلافت تحریک کے لئے اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں انھیں ایک تقریر کی پاداش میں بنگال سے نکالا گیا تھا۔ ایسے جیون ساتھی کی رفاقت میں سعادت بانو کی قومیت کے جذبات امڈ پڑے اور دبی ہوئی چنگاری شعلہ زن ہو گئی ۔ دونوں شمعِ آزادی کے پروانے ایک نئے عزم و استقلال سے ملک و ملت کی خدمت میں دل و جان سے لگ گئے۔

جب آنجہانی لالہ لاجپت رائے اپنی جلاوطنی کے خاتمے پر امرتسر آئے تو سعادت بانو نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کئے ؎

اتحادِ ہندو و مسلم خوشی کی بات ہے
قابلِ افسوس ہے گو سخت حالت قوم کی
سیکڑوں افراد گر غافل ہیں کچھ پروا نہیں
لاجپت جیون نے رکھ لی لاج اور پت قوم کی

لالہ دُنی چند جی صدر صوبائی کانگریس امرتسر جب ان کے یہاں ملاقات کی خاطر گئے تو مندرجہ ذیل رباعی ان کی نذر کی ؎

نہ ہار و ہمتیں اپنی نہ تم ملول رہو
شگفتہ گلشنِ ہستی میں بن کے پھول رہو
یہ التجا ہے سعادت کی بھول مت جانا
ہو جس طرح سے بھی تم ہوم رول لے کے رہو

رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کے درمیان انھوں نے زبان وقلم سے ہر ممکن خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی پنجاب میں ۱۹۱۹ء کا زمانہ قیامت خیز تھا۔ کونسی سختی، کونسا ظلم اور کونسی بے عزتی تھی جو مارشل لا کے پردے میں جابر حکام نے مظلوم عوام پر روانہ رکھی تھی۔ آگ تیزی سے سلگ رہی تھی۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے پابجولاں نامعلوم مقام پر لے جایا گیا۔ جلیان والا باغ آگ وخون کے دریا میں ڈوب گیا۔ سعادت بانو جیسی باوفا حوصلہ مند خاتون جانتی تھیں کہ اب ان کے فرائض کی اہمیت کتنی بڑھ گئی ہے۔ شادی کے پانچ سال بعد ہی محبوب شوہر کی طویل غمناک مدت اسیری جس پر گمان ہوتا تھا کہ اس تاریک رات کی کبھی سحر ہی نہ ہوگی۔ انھوں نے انتہائی پامردی واستقلال سے گزاری دوران مقدمہ دو بار اور دوران اسیری ایک بار جیل میں ان سے ملیں اور ہر بار انھیں یقین دلایا کہ "آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ بچوں کی پرورش اور گزرانِ حیات میں آپ مجھے ایک ثابت قدم اور سچی قوم پرست پائیں گے۔ اس وادیٔ پُرخار میں میں جان تک دینے سے گریز نہ کروں گی"۔ فدائے ملک وشوہر کی ہمتیں اس عزمِ صمیم سے نہ صرف تازہ ہو جاتی تھیں بلکہ ان پرجوش الفاظ سے قدرتی طور پر جو تشویش پیدا ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ مقدمے کے بعد ڈاکٹر کچلو کو لاہور سے نکال دیا گیا اور نظر بندی کا حکم ہوا۔ حکم سن کر محبِ وطن بیوی نے سجدۂ شکر ادا کیا اور بنا کسی اضطراب واظہارِ غم کے اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہیں۔ جب گاندھی جی بسلسلۂ تحقیقات مظالم پنجاب امرتسر آئے اور سعادت بانو سے بھی ملاقات کی تو انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کئے ؎

بنا ہے سب کے دلوں میں ترا مکاں گاندھی
ہے تیری مدح وثنا در دہر زباں گاندھی
ہر اک طرف ہیں عقیدت کے تیرے پھول کھلے
نہ آئے گی کبھی اس پھول میں خزاں گاندھی

پھنسے ہیں سخت مصیبت میں اہلِ امرتسر
عیاں ہے آپ پران کا غمِ نہاں گاندھی
یقین ہے گوہرِ مقصود ان کو مل جائے
اگر ہوں آپ حقیقت کے ترجماں گاندھی
کچھ ایسی بات کریں اپنی دست گیری سے
جو قید میں ہیں پڑے وہ چھٹیں اسیری سے

ڈاکٹر کچلو کے زمانۂ اسیری میں محترم سی آر۔ داس، پنڈت نہرو اور سوامی شردھانندجی وغیرہ متعدد قومی رہنما تسکین دہی کی خاطر سعادت بانو سے ملے انھوں نے سب سے یہی کہا "مجھے فخر ہے کہ ملکی خدمات میں ان کو قید و بند نصیب ہوئی۔ اس راہ میں جان تک دینا ہزار زندگی حاصل کرنا ہے"۔ دراصل جلیانوالہ باغ کے مشہور جلسے میں وہ خود بھی حالاتِ حاضرہ پر ایک پرجوش تقریر کرنے جارہی تھیں شہر میں دھوم تھی، زبردست جوش پھیلا ہوا تھا لیکن وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر عزیز و اقارب نے جبراً روک لیا۔ اور ان کے قدم اس جلوہ گاہ شہادت تک پہنچنے سے رہ گئے۔ شاید ہی کوئی بڑا سیاسی جلسہ ہو جس میں سعادت بانو نے شرکت نہ کی ہو، خصوصاً زنانہ جلسوں میں وہ پرجوش تقاریر کیا کرتی تھیں اس بلند حوصلہ خاتون نے سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شوہر کے دوش بدوش حصّہ لیا۔ ۲۲-۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون میں ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے دوران انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ سوراج آشرم کے چیرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

ڈاکٹر کچلو گرچہ تحریک آزادی کے سرگرم و فعال سپاہی کی حیثیت سے مختلف اہم منصبوں پر فائز رہے، ۱۹۲۹ء میں جواہر لال جی کے مکمل آزادی کے ریزولیوشن کی تائید بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ لیکن آزادئ وطن کے بعد ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف بڑھتا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے

اسٹاک ہالم میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہ قومی امن کاؤنسل کے صدر اور بین الاقوامی امن کاؤنسل کے پریذیڈیم کے ممبر بھی رہے انھیں عالمی لینن امن انعام سے بھی نوازا گیا۔ سعادت بانو ان کی شروع کی گئی امن تحریک کی بھی فعال ممبر رہیں۔ وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی بھی سرگرم رکن تھیں اور ۱۹۵۰ء کے وسط میں اس کی دہلی شاخ کی خازن کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ وہ تاحیات انجمن ترقی اردو کی بھی سرپرست تھیں۔

جنگِ آزادی میں شریک نوجوان سعادت بانو کی توجہ کا خصوصی مرکز تھے، ان کی ہر ممکن امداد اور اپنی ماں جیسی ممتا کے سبب وہ بلا تفریق مذہب وملّت ان سبھی نوجوانوں کی "آپاجی" بن گئی تھیں۔ وہ ایک سچی مسلمان خاتون تھیں۔ اپنے غیر مسلم دوستوں کی دل آزاری سے بچنے کے سبب انھوں نے کبھی اپنے گھر گائے کا گوشت پکنے کی اجازت نہیں دی۔ عمرِ عزیز کے آخری لمحات تک وہ نہ صرف خود کھادی پہنتی رہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی ہمیشہ کھادی ہی پہنایا۔

تقسیمِ وطن کے بھیانک طوفان میں کچلو خاندان کا بھی امرتسر میں سب کچھ لٹ گیا لیکن انھوں نے سرحد پار جانا گوارا نہیں کیا اور مسلم "پناہ گزین" بن کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دونوں جیون ساتھی تقسیمِ وطن کے سخت مخالف تھے قوم نے بحیثیت مجموعی ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی اور جد وجہد آزادی میں کی گئیں ان کی تمام قربانیاں تاریخ کا ایک گمشدہ ورق بن کر رہ گئیں۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر کچلو کے انتقال کے بعد سبھی خاندان منتشر ہو گیا۔ گو کچلو خاندان نے مادرِ وطن کی خاطر ان گنت ذہنی، جسمانی اور مالی قربانیاں دیں لیکن اپنی خودداری وغیور فطرت کے سبب کبھی حکومتِ وقت کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ مرحوم ڈاکٹر کچلو کو پنڈت جواہر لال نہرو نے زبردستی اسپتال میں داخل کیا تھا لیکن پرجوش مجاہدہ آزادی، روشن خیال ادیبہ وشاعرہ اور وسیع القلب وسیع النظر سعادت بانو کچلو آزاد ہندوستان میں بے کسی و

مفلسی کی حالت میں بغیر دوا علاج کے ۱۸ اگست ۱۹۷۰ء میں اپنے مالک حقیقی سے یوں جا ملیں جیسے غالب نے اپنے لئے تمنا کی تھی ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(ماخوذ: بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق، لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۹ تا ۶۷ اور جناب طلعت کچلو (ڈاکٹر کچلو کے صاحبزادے) سے ۷ رجون ۱۹۸۷ء کو تین مورتی میوزیم میں لیا گیا انٹرویو۔)

بیگم خورشید خواجہ

بیگم خورشید خواجہ کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد سر بلند جنگ حیدر آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، ان کے دادا سمیع اللہ خاں سر سید مرحوم کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق خورشید بیگم کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں وہ مسز سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ ان کی شادی علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر خواجہ عبدالمجید صاحب سے ہوئی۔ جو جنگِ آزادی کے نامور مجاہد بھی تھے۔ شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور قومی محاذ پر قوم پرست شوہر کے شانہ بشانہ چلنے کا فیصلہ کیا نیز اس دشوار ترین راہ میں ہر قسم کی ذہنی و معاشی پریشانیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔

خورشید بیگم ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر بنیں اور تا حیات اسے برقرار رکھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں یو پی کی نمائندہ تھیں۔ ان کے ساتھ یوپی سے دوسری خواتین بیگم حسرت موہانی، بیگم محمد علی، شریمتی کملا نہرو اور شریمتی سروپ رانی نہرو بھی تھیں۔ سبجیکٹ کمیٹی کی نشستیں ۲۴، ۲۵، اور ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد میں ہوئیں۔

(Encyclopaedia of Indian National Congress, A.M. Zaidi & S.G. Zaidi Vol. Eight, 1921 - 24 P 66)

انھوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے ہی 'ہند' نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا جس کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے خود ہی انجام دیئے۔ اپنے ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا کہ وہ انھیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں اس قوم پرست جوڑے کی خدمات کے تذکرے میں گاندھی جی نے بعنوان "گرفتار نہ ہونے پر افسوس" تحریر کیا تھا کہ "موجودہ حالات میں ہر اس ہندوستانی کے لئے جو عزت نفس رکھتا ہے، جیل ہی ایک مناسب جگہ ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ میں ہر شخص مولانا شیروانی اور ان کے ساتھیوں کو رشک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ بیگم خواجہ نے مجھے لکھا ہے کہ انھیں اپنے شوہر کے اب تک آزاد رہنے کا افسوس ہے جب کہ میدانِ عمل کے ان کے ساتھی جیل پہنچ چکے ہیں۔ جذبۂ صادق اسی کا نام ہے۔ سوراج تب ہی ممکن ہے۔ جب ہمارے سبھی خواتین و حضرات آزادی وطن کی خاطر جیل جانا اپنی خوش قسمتی سمجھیں گا"

(Collected works of Mahatma Gandhi Vol. XX April, August 1921 P 490)

"میرے نوٹس میں" "ایک باعزت قابلِ احترام بیوی" کے عنوان سے مہاتما گاندھی نے مرحوم خواجہ عبدالمجید کے تذکرے میں لکھا تھا" میں انھیں ایک انتہائی راست باز انسان سمجھتا ہوں۔ انھیں جتنا فخر اپنے مذہب پر ہے اتنا ہی ناز اپنے وطن پر بھی ہے ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے۔ بیرسٹر کی حیثیت سے وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے لیکن اب ملک و ملت کی خاطر انھوں نے درویشانہ زندگی کو اپنا لیا ہے مجھے ابھی ابھی ان کی بیگم خورشید کا تار موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ وہ لکھتی ہیں "آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میرے شوہر کو حکومت نے گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے انتظام سے متعلق میں ان کے سبھی کاموں کو خود انجام دینے کی کوشش کروں گی"۔ مجھے اس تار کی انتہائی خوشی ہے۔ خواجہ صاحب

اور دوسرے حضرات کی قربانیوں کے سبب اب کون حصولِ آزادی کو روک سکتا ہے؟ بیگم خورشید کو ان کا کام دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کیونکہ جامعہ کے بہادر اور حق پسند طلباء ان کے ساتھ ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ان کی خاطر یہ طلباً ان کاموں سے بھی گریز نہ کریں جنھیں انھوں نے خواجہ صاحب کی موجودگی میں نہیں کیا اس کے علاوہ بیگم خورشید چرخہ کاتنے کی تربیت انھیں خواجہ صاحب سے بہتر طور پر دے سکیں گی .... جب ایک پاکباز عورت میں بہادری اور مادرانہ شفقت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جس کی برابری کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر محمود عالم نوجوانوں کی ذہنی نشو و نما کو دیکھیں گے۔ لیکن بیگم خورشید ان کے دلوں کو تسخیر کریں گی اور انھیں کندن بنا دیں گی۔"

(Collected work : Vol.XXII December, 1921, March 1922 P 46)

خواجہ عبدالمجید صاحب اس گرفتاری کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ بیگم خورشید تاحیات کانگریس کے نصب العین سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے الہ آباد میں حمیدیہ گرلس سکنڈری اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنا۔ آج یہ ایک ڈگری کالج ہے۔

بیگم خورشید خواجہ کا انتقال جولائی ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ درستند حوالوں کے علاوہ بقیہ معلومات بیگم خورشید کے صاحبزادے پروفیسر جمال خواجہ سمیع منزل نمائش روڈ، علی گڑھ کے توسط سے حاصل ہوئیں۔

زلیخا بیگم (بیگم مولانا ابو الکلام آزاد)

تحریک آزادی میں خواتین کی شرکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس زمانے میں ان کے مجاہد شوہر جیلوں میں چکی کی مشقتیں برداشت کیا کرتے تو ان کی ہمدم و ہمساز رفقائے حیات گھروں کا انتظام ہی نہیں سنبھالتی تھیں بلکہ ہر طرح کی معاشی سختیوں، ذہنی الجھنوں اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اپنے شوہروں کے حوصلے بڑھاتیں اور دوسرے اسیرانِ آزادی کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ سخت سے سخت آزمائش میں بھی کبھی کوئی شکوہ ان کے لبوں پر نہیں آیا۔ ایسی ہی بلند حوصلہ خواتین میں زلیخا بیگم آزاد کا نام بھی سرِفہرست آتا ہے۔

زلیخا بیگم کی خوبصورت قلمی تصویر کھینچتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے: نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں، یوسف ہندی، حضرت ابو الکلام آزاد

کی رفیقِ حیات زلیخا بیگم تھیں "!

(حمیدہ سلطان۔ رسالہ صبح، سہ ماہی ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۷۰ء کا پہلا شمارہ ص ۱۳۲)

جنتِ ارضی کی یہ حور جو مجسم پیکرِ صبر و قناعت تھی، صرف چھ سال کی عمر میں "یوسف ہندی" کی جو تقریباً اس وقت بارہ سال کے تھے، رفیقۂ حیات بنا دی گئی اور یوں بچپن سے شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے "یوسف" کے رنگ میں رنگ گئی۔ بڑی شخصیتوں کی سوانح حیات میں اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ ایسی شخصیتوں کے پیچ و خم کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ زلیخا بیگم مولانا پر فدا تھیں۔ ان کے جذبۂ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے کہ ایک دن جب وہ مع اپنی والدہ کے مولانا کے یہاں پہونچیں تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سُرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے اُن سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔ وہ ہنس کر بولیں آپ کو عادت ہی ہے بنانے کی۔ آجکل مولانا قرآنِ پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو ۲ بجے کے بعد اُٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں"! (ایضاً ص ۱۳۵)

یہ ایثار و وفا محض شوہر کی خدمت تک ہی محدود نہ تھا۔ مولانا کا بار بار جیل جانا، ہجر کی سختیاں جھیلنا اور معاشی مشکلات برداشت کرنا اس کو انھوں نے خاموشی سے گلے لگا لیا تھا بوجہ سیاست مولانا کی مالی حالت کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ زلیخا بیگم نے نہ اچھا کھانے و پہننے کی شکایت کی اور نہ کبھی اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیا بلکہ ہر طرح محبوب شوہر کو آرام پہنچانے میں لگی رہیں تاکہ گھریلو فضا کے خوشگوار ماحول میں تازہ دم ہو کر وہ نئے ولولے اور جوش سے جنگِ آزادی کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہی نہیں انھوں نے مولانا کے سیاسی عقائد و افکار کو بھی مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ مولانا ہی کی زبان میں "زلیخا بیگم نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات

کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت سے ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار"

(ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر، تیسرا اڈیشن لاہور ص ۲۸۴)

تحریک خلافت کے سلسلے میں ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب مولانا کو سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا تو زلیخا بیگم نہ صرف ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ تھیں بلکہ ایک سال قیدِ با مشقت کی اس سزا کو وہ کم سمجھتی تھیں جو ایک طرح سے لیلائے حریت کے شیدائی کی توہین بھی تھی۔ گاندھی جی کے نام ایک برقیئے میں انھوں نے مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔ "میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ آج سنوایا گیا۔ انھیں صرف ایک سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا و قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے ان کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

یہ میرے لئے ایک بہت بڑا بوجھ ہے، لیکن خدا سے مدد کی پوری اُمید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں ہی خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں اس کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ابتدائی آزمائش پوری کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اُتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں

حصّہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کردینا چاہیئے۔ میں آج سے بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔" (مولانا آزاد قولِ فیصل۔ چمن بک ڈپو دہلی ص ۱۴۶) اسی برقیے میں بطورِ ضمیمہ انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی لکھا تھا کہ میرے شوہر نے نہایت محبت و تکریم کے ساتھ اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہوئے مندرجہ ذیل پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے کہا ہے۔

"حکومت اور ملک اس وقت کسی قسم کی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا فرض اس وقت اپنے کو پوری طرح تیار رکھنا ہے۔ بنگال آئندہ بھی اس پیش قدمی کو باقی رکھے گا جو اس وقت اس نے قائم کی ہے۔ باردولی تعلقہ کے ساتھ اب بنگال کے نام کا بھی اضافہ کر دیجئے تو عنایت ہوگی اور اگر کوئی موقعہ مصالحت کا آتا بھی ہے تو برائے مہربانی ہماری رہائی کو کوئی اہمیت نہ دیجئے جو بدقسمتی سے اس کے ساتھ آجکل وابستہ ہوگئی ہے صرف ایک مقصد کے مدنظر، قومی مفاد و خواہشات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی صلح کی شرائط واضح رکھئے، جس کا ہماری رہائی سے قطعی کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے۔"
(Collected Works of Mahatma Gandhi : Publication Division، Govt. of India Vol. XXII P. 459)

دن ورات کی گردش تیز تھی، سیاسی سرگرمیوں میں ہلچل کے سبب مولانا کی غیر معمولی مصروفیت بھی بڑھ رہی تھی۔ ان کے بار بار جیل جانے اور روزافزوں پریشانیوں کے باعث زلیخا بیگم کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نینی تال جیل میں قید تھے ان کے خطوط باکفیں ملتے رہے تھے جس میں علاوہ اپنی بیماری کے سبھی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ رہائی کے بعد ہی مولانا کو علم ہوسکا کہ یہ پورا زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں ہی گزرا تھا۔ رہائی کے بعد علاج اور تبدیلئ آب و ہوا سے کچھ افاقہ ہوا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا پھر قید کرلئے گئے اور کافی عرصے تک قید کا محل بھی پوشیدہ رکھا گیا۔

اپنے صدیق محترم نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے نام

احمد نگر جیل سے لکھے گئے ایک طویل مکتوب ۱۱؍اپریل ۱۹۴۳ء (جو رہائی کے بعد شائع ہوا) میں مولانا نے اپنی گرفتاری، زلیخا بیگم کی علالت اور وفات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ مکتوب گرچہ طویل ہے تاہم زلیخا بیگم سے متعلق یہی واحد ماخذ ہے ملک و قوم کی خاطر اس بے مثال ایثار کی داستان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس تمام زمانے میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے گذر رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی، ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی...... جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا یہ وہ وقت تھا کہ طوفان ابھی آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا اور یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کے مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳؍اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے

آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ راگست تک واپسی کا مقصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول سا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں ہماری آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا۔"

(ابوالکلام آزاد۔ غبارِ خاطر۔ متذکرہ ص ۲۸۱-۸۲-۸۳-۸۴)

عرصے بعد جب احمد نگر جیل کے اسیروں کو اپنے عزیزوں سے خط و کتابت کی اجازت ملی تو مولانا کو زلیخا بیگم کا ایک خط ملا جس میں سبھی اِدھر اُدھر کی باتیں تھیں لیکن اپنی علالت کا انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر اخبارات سے ان کی شدید علالت کی خبریں ملنا شروع ہوئیں۔ آخر میں خطرناک صورتِ حال کا تار ملا

حکومتِ بمبئی کے ایما پر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے پیرول پر رہائی کی بات کی۔ دوستوں خصوصًا پنڈت نہرو نے لاکھ اصرار کیا کہ وہ اس پیرول کی بات مان لیں لیکن مولانا کی خود داری کب اس سُبک سری کی متحمل ہو سکتی تھی۔ البتہ جذبات و احساسات کی جو کیفیت تھی اس کا حال خود انھیں کی زبانی سُنیے۔

"جوں ہی صورتِ حال کی پہلی خبر ملی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی یہ جدوجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔" (غبارِ خاطر تذکرہ ص ۲۸۸)

بالآخر ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو زلیخا بیگم ان کے دیدار کی حسرت ہی لئے اس دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئیں ؎

کام تو عشق میں بہت تھے میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اور یوں بقول مولانا " ہماری چھبیس ۲۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے ۔۔۔۔۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں یہاں احاطے کے اندر ایک پُرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے، لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔" (غبارِ خاطر تذکرہ ص ۲۹)

اس مرثیے کے مطلب کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں

تو اس نے مجھے ملامت کی اس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ ایک اس قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے میرے لئے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں۔" (محمد اجمل خاں دیباچہ غبار خاطر متذکرہ)

پورے ملک میں زلیخا بیگم کی اس المناک موت پر ماتم کیا گیا اور سامراجی حکومت کے ظلم و استبداد پر شدید غم و غصّے کا اظہار کیا گیا جس نے مولانا کو اپنی شریکِ حیات کی خطرناک علالت کے باوجود بھی غیر مشروط رہائی دینا منظور نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ نے بھی مولانا کے سیاسی عقائد و نظریات سے سخت بیزاری کے باوجود کلکتہ میں تعزیتی جلسہ کیا۔ جلسے میں ابراہیم ہوش کی تعزیتی نظم کو سن کر سبھی سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں:

اے زمیں حق ہے اگر تو اپنے سر پر خاک اُڑائے
اے فلک حق ہے اگر تو خون کے آنسو بہائے
حق ہے گیتی پر جو چھائیں یاس کی تاریکیاں
حق ہے دُنیا میں اگر شمعِ مسرت جھلملائے
آج تک دیکھا نہ ہوگا عالمِ ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگمِ آزاد نے

آؤ اے مرغانِ گلشن اشک افشانی کریں
آؤ اے صحرا کے ذرو مرثیہ خوانی کریں
آؤ اے اہلِ وطن سب مل کے ہوں ماتم گسار
آؤ ہم رو رو کے اپنے خون کو پانی کریں
باغ پر آئے خزاں اور باغباں ہو قید میں
کارواں لٹ جائے میرِ کارواں ہو قید میں

اس کی بیگم جان دے اور وہ سر بالیں نہ ہو
یا خدا ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو

مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی بھی مملکت میں جبر کا آئین نہ ہو

آہ وہ آنکھیں جو ترسے رہ گئیں دیدار کی
یہ بھی اک طرزِ عنایت تھی مرے سرکار کی

ایسی موتیں ہوتی ہیں سرمایۂ نقشِ دوام
تا ابد باقی رہے گا ہوش مرحومہ کا نام

جب مرتب ہو گی مستقبل میں تاریخ وطن
حرف خونیں سے رقم ہو گا یہ قصۂ لا کلام

انقلاب ایسا بھی ہونے کو ہے زیرِ آسماں
ظلم خود دہرائے گا صبر و رضا کی داستان

(رسالہ ماحول، کراچی آزاد نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۰۵-۱۰۶)

رہائی سے کچھ عرصے قبل مولانا کو احمد نگر قلعہ سے باکورہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد جب ہاوڑا اسٹیشن سے وہ کار میں روانہ ہوئے تو بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبا بیا پر بھاد تا اور دیگر مقامی لیڈر بھی ان کے ہمراہ تھے جس وقت کار پل سے گزری مولانا پر کیا گزری اسے جانے بغیر اس داستانِ غم کا خاتمہ ممکن نہیں۔ "مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آرہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا۔

"مگر اب وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے! میری دنیا کیسی بدل گئی ہے"۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا"

(ابوالکلام آزاد۔ ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورینٹ لونگ مینس ص ۲۰۷)

مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں "مولانا کے گھر پہونچتے ہی میں بھی حاضر ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

(عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، ص ۳۵۴)

اپنی سب سے قیمتی متاع بھی قوم پر نچھاور کر کے مولانا کے قدم آزادی کی منزل تک بڑھتے ہی رہے۔

آزادی کی اس منزل کو پالینے میں زلیخا بیگم جیسے کتنے ہی پیکرِ مہر و وفا وخلوص و ایثار، مادرِ وطن پر خاموشی سے پروانہ وار نثار ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کیا کبھی ان کا شمار کر سکے گی؟ شاید کبھی نہیں۔

سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

ایک خوش فکر شاعرہ، علمبردار حقوقِ نسواں اور باشعور محبِ وطن۔ ز۔خ۔ش

زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت علی گڑھ کے قریب قلعۂ بھیکم پور میں ۸ ر دسمبر میں ہوئی۔ وہ نواب محمد مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور و سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صاحبزادی تھیں۔ کم سنی ہی میں والدہ کے انتقال کے سبب والد نے بڑی شفقت سے پرورش کی اور گھریلو تعلیم بھی ایک خاص اہتمام کے ساتھ دلوائی۔ انکی معلمہ آغا کمال الدین سنجر کی رشتے کی بہن فرخندہ بیگم طہرانیہ تھیں۔ صرف و نحو، حساب و فقہ کے لئے ایک دوسرے معلم حضرت مولوی محمد یعقوب اسرائیلی مقرر تھے۔ اعلیٰ عربی تعلیم مولوی سید احمد صاحب ولایتی نے دی جو فرصت کے اوقات میں انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ دس سال کی عمر میں زاہدہ خاتون نے شعر کہا تھا ؎

ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم مری دیکھتا رہے

اور انھوں نے اس کمال کی منزل کو پا بھی لیا تھا۔ اپنی عمر کی پندرہ سولہ منازل طے کرنے کے بعد زاہدہ خاتون شروانیہ گاؤں کے ایک شریف اور امیر گھرانے کی بھولی بھالی بے خبر، بے احساس، ناز پروردہ اور الّھڑ لڑکی نہ تھی بلکہ اس وقت اس کو ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، بالغ نظر، خوش فکر شاعرہ اور ادیبہ کہا جا سکتا

تھا جس کی ذہانت اور ذکاوت لمحہ بہ لمحہ ترقی پر ہو۔" (حیاتِ ز۔خ۔ش"۔ مؤلفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد، دکن ۱۹۴۲ء ص ۷۸)

زاہدہ تحصیل علم پر ٹوٹ کر گریں لیکن "والد کا منشا یہ نہ تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چل نکلیں اگرچہ زاہدہ نے ذوقِ شعری انھیں سے ورثے میں پایا تھا، لیکن وہ کوئی سیدھا سادہ شعر بھی کبھی باپ کے سامنے لانے کی جرأت نہ کر سکی"۔

(نکتہ راز" شان الحق حقی عصری کتب کراچی ۱۹۷۲ء ص ۳۰۱)

ز۔خ۔ش کے مخفی نام سے اُن کی نظمیں مشہور ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور مشاہیر سے دادِ تحسین لیتی رہیں۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے جن سے وہ خاص عقیدت رکھتی تھیں خواجہ حسن نظامی کے مکان پر ان کے کلام کے متعلق کہا تھا "اگر یہ اشعار کسی خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے"۔

(حیات ز۔خ۔ش۔ متذکرہ۔ ص ۷۷)

دراصل اس زمانے میں خواتین میں تعلیم کا ایسا فقدان تھا کہ لوگوں کا یہ باور کرنا بھی مشکل تھا کہ کوئی گھریلو لڑکی ایسی شاعری بھی کر سکتی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ان کے انتقال کے بعد ۱۹۲۱ء میں دارالاشاعت پنجاب سے "فردوس تخیل" کے نام سے شائع ہوا۔

زاہدہ خاتون اصلاحِ معاشرت "خصوصاً آزادیٔ نسواں کی خصوصی طلبگار تھیں۔ انھوں نے عورتوں و مردوں کو بڑی دلسوزی سے انقلاب پر ابھارا ہے، خاص طور پر عورتوں کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پُرجوش تلقین کی ہے"۔ (نکتہ راز۔ متذکرہ ص ۲۹۲)

کس طرح افراد پر واجب نہ ہو اصلاحِ قوم
فرضِ عین باغباں کیا باغ پیرائی نہیں (رسالہ خاتون علی گڑھ جولائی ۱۹۱۲ء)

ہندوستانی اسلامی معاشرہ میں عورت کی بے بسی کا ایک واضح خاکہ ان کا مندرجہ ذیل شعر ہے

سراپا جرم ہوں کس کس خطا کا نام لوں نزہت
مسلماں ہوں صداقت کیش ہوں ہندی ہوں عورت ہوں

(فردوسِ تخیل، ص ۱۶۲)

"ان کا طویل مسدس "آئینہ حرم" اقبال کے شکوے کا ہم رنگ و ہم آہنگ ہے
یہ ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا تھا جب شاعرہ کی عمر ۱۲ سال تھی ؎

دل کو ارماں کہ زنِ ہند کا کچھ حال لکھوں
طبع حیراں کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں

میں پریشاں کہ پشیماں نہ کرے بحثِ زبوں
ہاں کہی بات پرائی ہے کہوں یا نہ کہوں

آ گیا لب پہ مگر ذوقِ تکلم سے سخن
منہ پہ آئی بھی کہیں رُکتی ہے اے مشفقِ من

(فردوسِ تخیل ص ۱۱۹)

مندرجہ ذیل اشعار میں عورتوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بڑا پر تاثیر ہے۔
جستہ جستہ اشعار دیکھیے:

ڈاکٹر کہتے ہیں در کھولو ہوا آنے دو
سنگدل کہتے ہیں ہرگز نہیں مر جانے دو

خود بھلے بنتے ہیں اوروں کو برا کہتے ہیں
"ناقص العقل" ہمیں یہ عقلاء کہتے ہیں

پُر دغا کہتے ہیں بے مہر و وفا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں

جسمِ اسلام کو افگار کیا ظُلم کیا
نصفِ محمود کو بیکار کیا ظُلم کیا

ان کو رہ رہ کے ستاتا ہے یہ بے عقل خیال
گھر میں پڑھ لکھ کے خواتین کا رکنا ہے محال

کہیں اُٹھے نہ مساوات کا غم خیز خیال
کہیں ہو جائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال

ہائے ان خود غرضوں کو نہیں اتنی بھی خبر
زوجۂ جاہلہ ہے آفتِ جانِ شوہر

(ایضاً ص ۱۲۲-۱۲۳)

عروجِ اسلام کے زمانے میں مسلم خواتین کے کارناموں کا ذکر یوں ہے۔

ہم تھے اس عہد ہمایوں میں نہ یوں مشقِ ستم
بے دل و روح اندھا دھند نہ کہلاتے تھے ہم

قفسِ خشت میں گھٹ گھٹ کے نکلتا تھا دَم
ہم نے کھائی تھی نہ یوں گھر سے نکلنے کی قسم
عضوِ مفلوج کی مانند نہ بے کار تھے ہم
قصرِ اسلام کی تعمیر میں معمار تھے ہم

(ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷)

بیسویں صدی کا دوسرا دہا فرسودہ جاگیردارانہ نظام کسی خاتون کو آہ کھینچنے کی اجازت بھلا کب دے سکتا تھا۔ زاہدہ خاتون بھی "زمانے کی ہوا" لگ جانے کے

طنز کا شکار ہوئیں ذہین مجاہدہ بھی ہتھیار ڈالنے والی شخصیت نہیں تھیں۔ انھوں نے اس طنز کا جراٴت مندانہ جواب دیا ؎

نہ ہوتا گر اثر ہم پر زمانے کا تو حیرت تھی
اثر ہونے پہ کیوں ہے شیخ حیراں وقفِ حیرت ہوں

ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی طرح عورتوں کی سیاست سے بے خبری بھی قوم کو قعرِ مذلت میں ڈھکیل دے گی اور باعثِ ادبار ہوگی۔" رسالہ استانی، بابت ماہ ربیع الاول ۳۶ھ سیاسی استانی کے عنوان سے انھوں نے لکھا " تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص قسم کے دل و دماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر مصلح کی حدّت طراز اور ولی کی فنا فی اللہ۔ جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنایا بگاڑا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی، مادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاسی عظمت کی ٹھیکیدار قوموں پر نظر ڈالیں گے تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیا صحیح مذاق رکھتی ہیں اور حبِّ وطن کے پاک جذبے سے کس قدر سرشار ہیں! ان کا وجود ماں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ فلاحِ عامہ کے ہر ایک شعبہ میں کارکن کی حیثیت سے ملک و قوم کے لئے رحمتِ الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی مستورات کو جاہل رکھنا اور پھر تعلیم دے کر سیاست سے بے تعلق رکھنا تھی۔ قومی ماؤں کی سیاست سے ناواقفیت کے سبب افرادِ قوم میں بھی صحیح سیاسی مذاق اور سچا جوش مفقود ہے۔" اگر آپ ذلت و ادبار کی تلخ غذا سے سیر ہو چکے ہیں تو مہربانی سے گذشتہ پر صلوٰۃ بھیج کر آئندہ کے لئے احتیاط کیجئے۔ تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی تعلیمِ نسواں کی نشر و اشاعت میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھائیے اور تعلیم کے ساتھ انھیں اصولِ سیاست سے آگاہ کیجئے۔"

(حیاتِ ز۔خ۔ش متذکرہ ص ۷۸-۷۹-۸۱)

زاہدہ خاتون نزہت کے یہ افکار و عقائد آج اتنا عرصہ گذر جانے پر بھی

بھی فکر و عمل کے محتاج ہیں۔

برطانوی سامراجیت اور جاگیردارانہ نظام کے جس گٹھ جوڑ میں زاہدہ خاتون نے آنکھ کھولی اسی کی بنیادوں پر غیر ملکی حکومت و آمریت کے قلعے کی تعمیر ہوئی تھی لیکن حب قومی اور جذبۂ حریت سے سرشار وہ ایک نڈر و بے باک مجاہدہ تھیں اپنے جذبۂ بغاوت کے دفاع میں انھوں نے کیا خوب کہا تھا۔

علم بردارِ حریت ہوں حکمِ شاہ عالم سے
نہ سمجھو مجھ کو باغی تابعِ قانونِ قدرت ہوں

اسی کی سمت چل دینے کی ٹھانی ہمت دل نے
کہا جس رہ گذر نے معرضِ خوف ہلاکت ہوں

(فردوسِ تخیل، ص ۱۶۴۔ ۱۶۵)

یہاں اس موقع پر ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے نئی کروٹ بدلی تھی۔ ان میں قوم پرستی کی ایک نئی روح پیدا ہو چکی تھی۔ اندرون و بیرون ملک اسلامی معاملات جیسے ہندو مسلم یونیورسٹیوں کا قیام استرداد تقسیم بنگال، ہندو مسلم اتحاد، شہادت مسجد کانپور، جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پھر جنگِ عظیم جیسے مسائل نے اہلِ ملک اور عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ز۔ خ۔ ش کے اشاراتِ مخفی سے زاہدہ خاتون بے تکان لکھ رہی تھیں اور ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ان کے دلچسپ مضامین اور پر مغز نظمیں خصوصی مقبولیت حاصل کر رہی تھیں جن کا بیشتر حصہ اخبار 'زمیندار' لاہور میں شائع ہوتا تھا۔ زمیندار لاہور کو ضمانت و قید و بند کی صعوبتوں کا اکثر سامنا رہتا تھا۔ زاہدہ خاتون ان ضمانتی چندوں میں دل کھول کر حصہ لیتی تھیں۔ ان کے سیاسی خیالات پر اس زمانے کے قومی اخبارات زمیندار، ہمدرد اور الہلال

کا گہرا اثر تھا۔ ان اخبارات کے افکار اور تخیلات کو ان کے سیاسی معتقدات کی اساس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا یہ وہ وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال، ملک بھر میں بے مثال مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ زاہدہ خاتون مولانا کو اخی فی الدین مانتی تھیں۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا اس پر اپنے ایک خط میں وہ لکھتی ہیں "کیا تم نے اخبار ہمدرد، دہلی میں آزاد بھائی پر پولیس کانپور کا ظلم دیکھا؟ کیا رئیس الاحرار سلمہ الرب پولیس کی مخصوص اہانتیں مثلاً تمام پولیس اور افسران پولیس کا ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لینا اور برادر ممدوح کا فوٹو ان کے پاس سے نکلنا، ان کو کسی سے عام بات کی اجازت نہ دینا۔ ٹایلر کی سخت بدکلامی، مسجد، جیل خانہ، ہوسپٹل کے دیکھنے سے روکنا اور بالآخر کانپور سے نکلوا دینا، ان کا لیفٹننٹ گورنر کو تار دینا، وہاں سے جواباً عدم مداخلت کا اعلان کیا جانا ان تمام باتوں پر مطلع ہو کر بھی تم عنانِ ضبط مضبوط تھامے رہو گی۔" (سوانح حیات متذکرہ ص ۱۵)

واقعہ کانپور پر ان کی متعدد نظمیں "زمیندار" لاہور میں شائع ہوئیں جنگِ طرابلس کے غمگین تاثرات کو لے کر جب علامہ شبلی نے ملک و ملت کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی ؎

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

تو زاہدہ خاتون خلوصِ دل سے لبیک کہہ کر آلِ عثمان کی مدد کے لئے تیار ہو گئیں اور دامے درمے، قدمے سخنے اپنی تمام تر مساعی جمیلہ کو ان کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے طرح طرح سے صرف چندہ ہی جمع نہیں کیا بلکہ اپنے قلم کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ اسی زمانے کی ان کی مشہور مثنوی موسومہ "عالمِ خواب"، جس کے اشعار تعداد میں ۳۰ تھے ۱۹۱۳ء کے رسالہ خاتون علی گڑھ میں شائع ہوئی۔ الحاق طرابلس اور شرائط صلح پڑھ کر تمام عالم اسلام کی مانند زاہدہ خاتون کو بھی ازحد ملال ہوا اور اس واقعہ کی تاریخ مندرجہ ذیل رباعی میں نکالی ؎

کیا پوچھتے ہو آہ شراغِ طرابلس
گلچیں ہوا ہے قابضِ باغِ طرابلس
نزہت جو پوچھے حادثۂ جاں گسل کا سال
کہہ دو بکا کے ساتھ ہے داغِ طرابلس

۲۳ ۱۳۳۰ھ ۱۳۰۷

(فردوسِ تخیل، ص ۳۵۷)

لیکن یہ مذہبی المیہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ دول یوروپ کی ریشہ دوانیوں کے سبب جلد ہی جنگِ بلقان شروع ہوئی۔ اس بار سلطنتِ عثمانیہ کا مقابلہ سربیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور جبل اسود تھا جن کی پشت پناہی یوربین طاقتیں کر رہی تھیں حکومت ہندوستانی مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رہی تھی اس کے باوجود مسلمانوں نے جہاد بالمال میں دل کھول کر حصہ لیا۔ زاہدہ خاتون کے افکار و خیالات کی ملک بھر میں دھوم تھی؛ "اپیل منظوم برائے امداد ہلالِ احمر" "عید کی خوشی میں شہداء کی یاد" "مرثیہ کنگ جارج والی یونان" "زندہ باد انور پاشا" اور "آشوب اسلام" اس زمانے کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں "آشوب اسلام" سے دو اشعار ؎

نہ ہو گی نقشۂ بلقاں میں اینچ بھر ترمیم
نہ تھا ارادہ ایفا تو کیوں قرار کیا

فلک زدوں کو ستانا یہی ہے کیا انصاف
فغاں فغاں کہ زمانے سے اٹھ گیا انصاف

("خاتون" علی گڑھ، اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۴۰)

پہلی جنگ عظیم کے دوران اپنی مشہور نظم "موصل کا تیل" میں بھی انھوں نے کھل کر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور نظم "جلوۂ شب" کے عنوان سے ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں شائع ہوئی۔ جس پر اظہارِ خیال کرتے

ہوئے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار نے لکھا تھا "گو نور جہاں بیگم اور زیب النساء بیگم خود تو دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی ایک معنوی یادگار اب بھی ہندوستان کے عالم نسواں کا سرمہ بینش ہے۔" (بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۵)

قومی رہنماؤں کی شخصیتیں بھی زاہدہ خاتون کی توجہ کا خاص مرکز تھیں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی اور آنجہانی گوکھلے ان سب کی وفات کے قومی حادثے پر ان کے قلم نے کھل کر اشک فشانی کی۔ مرثیہ ہائے شبلی کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

دامن صبر کاٹ لے سوزن سے رشتہ تو
یوں چاک ہو کہ پھر نہ کبھی ہو سکے رفو
اشک گہر فشاں تو مرا ہی بپے لہو
بہہ بہہ کے گرد بوئے نہ دریا کی آبرو
ہاں برقِ آہ اور ذرا زور سے چمک
اُٹھ اے فغانِ دل سوئے عرشِ بریں لپک
ہاں گر کے خاک پر تڑپ لے رفعتِ خیال
اے قوتِ بیان تو رو رو کے ہو نڈھال
خاک اے عروسِ نظم تو تزئین مو پہ ڈال
غم اپنی بے سری کا کر اور کھول سر کے بال
قومی شرف کا آج پھٹا جامۂ حیات
پائی جناب شبلی علامہ نے وفات

(فردوس تخیل، ص ۳۲۹)

شمس العلماء مولانا حالی کی رحلت پر ان کے قلم نے "وائے حالی" کے نام سے اشک فشانی کی ؎

نام چمکے گا "مسدس" سے سدا جوں خورشید
مرنے دیگی کبھی اس کو نہ "حیاتِ جاوید"

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۵)

آنجہانی گوکھلے کی وفات پر بھی زاہدہ خاتون کا دل تڑپ اٹھا تھا ۔

کیوں یاس ہو نہ مجھ کو بہبود ہندیاں سے
سنتی ہوں گوکھلے بھی رخصت ہوئے جہاں سے
بڑھتی ہوئی امیدیں اٹھتی ہوئی اُمنگیں
مٹی میں مل گئیں سب اس مرگِ ناگہاں سے
ماتا کی پہلے سیوا صحت کی فکر پہلے
ایسا سپوت بھارت تو لائے گی کہاں سے
حب وطن ہمیں بھی اور گوکھلے کو بھی تھی
پر تھا وہاں تعلق دل سے یہاں زباں سے
سرگوشیاں کریگی اک روز آسماں سے
ہاں ہاں یہی ادھوری تعلیم گوکھلے کی
تعلیم ابتدائی ہو کر رہے گی لازم
روشن کرے گی آنکھیں تنویر گوکھلے کی
حب وطن کو جزوِ ایماں کہا گیا ہے
واعظ سمجھ کے کیجو تکفیر گوکھلے کی
اے معترض حصار باطل ہو لاکھ محکم
کرے گی پر صداقت تسخیر گوکھلے کی

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۶)

"ماتم شیخ الہند" میں وہ ان کی رحلت پر یوں آنسو بہاتی ہیں ۔

جس کا منہ دیکھو وہی ہے اشک خوں برسا رہا
جس جگہہ جاؤ وہیں ہے نالۂ نا منتہا
حیرت دانش نے پوچھا کس کا غم ہے قوم کو
ہائے محمود الحسن کا غم ہے ہاتف نے کہا

۱۳ھ ۳۹

زاہدہ خاتون علی برادران سے بھی خاص عقیدت رکھتی تھیں ان کی نظر بندی پر بھی "جرم عشق" کے نام سے ایک نظم "فردوس تخیل" میں شامل ہے۔

ز۔خ ۔ش۔ نے بھونرے میں پرورش پانے کے باوجود اپنے کلام میں جس بیدار مغزی اور صحت فکر کا ثبوت مہیا کیا ہے وہ بجائے خود کمال کی بات ہے وہ کہاں اور ترقی پسند تحریک کہاں لیکن اس نے اپنے ہی زمانے میں مزدور اور کہار کی دردمندی میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ کسی تحریک کی پاسداری نہ تھی محض اس کے باشعور دل کی آواز تھی۔" ؎

(نکتہ راز متذکرہ ص ۲۹۰)

علم و تہذیب و ترقی و شکون و تفریح
ہیں ظہور عمل سحر نمائے مزدور
ثبت جس پرزے پہ ہے ملکیت سرمایہ
کس کا مرہونِ کرم ہے وہ سوائے مزدور
کل جہاں اس کیلئے جیل ہے پھانسی گھر ہے
خاص کر ہند تو دوزخ ہے برائے مزدور

(فردوس تخیل ص ۲۳۰-۲۳۱)

ملکی سیاست کے بارے میں ان کے پختہ شعور کا اندازہ ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ "ہمارا قومی جوش جس قدر اپنی خوفناک

شدت کے لئے دنیا میں مشہور ہے اسی قدر سرعت فنا میں زبان زد خلائق ہے۔ ہمارا مجموعہ سیاست کیا ہے؟ ایک طومار خرافات، ہمارا میدانِ عمل کیا ہے؟ ایک بازیچۂ اطفال ہماری متفقہ آواز کیا ہے؟ ایک قہقہہ انگیز تمسخر ہمارے رہنما سیاست کو تسخیر عوام کا چلتا ہوا جادو، عزت حاصل کرنے کا نسخہ، سونے و چاندی کا مینہ برسانے والا چشمہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا رعب و اثر اقوام عالم کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا ہے۔" (حیات زخ۔ش متذکرہ ص ۸۱) کیا یہ افکار و عقائد آج بھی مسلمانوں کی خصوصی توجہ کے مستحق نہیں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب قومی سیاست کے بارے میں زاہدہ خاتون ایک مستحکم عقیدے پر پہنچ گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر ان پر بھی چل چکا تھا، قومی آزادی کا مطلب، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ سبھی سیاسی تحریکات جو اس وقت ہندوستان میں اپنے شباب پر تھیں وہ ان سب کی خلوص دل سے مؤید تھیں ملکی اتحاد پر ایک نظم "ترانۂ اتحاد" میں وہ کہتی ہیں ؎

جنت کی دید سے ہے دل شادماں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کہنے کو ہم ہیں ہندی حُبِّ وطن ہے ایماں
کیا پوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا

دورِ نفاق دم الاخوین چاہتا تھا[1]
شاکر ہے قاتلوں کا آرام جاں ہمارا

روتے ہیں ہم جو مل کر گنگ و جمن کی صورت
شاداب ہو کے ہنستا ہے گلستاں ہمارا

---

[1] جلیان والا باغ کی طرف اشارہ ہے جہاں ہندو مسلمانوں کا مشترکہ خون بہا تھا۔

ہو جائے کاش ثابت روحوں کی کوچہ گردی
بن جائے کاش گاندھی ہر نوجواں ہمارا

جاں سے بدن سے خوں سے ہندوستان کے ہیں ہم
حیرت ہے کیوں نہیں ہے ہندوستاں ہمارا

(فردوس تخیل، ص ۲۴۰)

زاہدہ خاتون سودیشی تحریک اور ترک موالات میں عملی طور پر شریک ہونا چاہتی تھیں۔ سعادت مند بیٹی اور شفیق باپ کے خیالات میں تصادم ناگزیر تھا تاہم انھوں نے دیسی کپڑے پہننے کے عزم کا اپنی ایک تحریر میں عہد کیا: "اگرچہ ترکِ موالات کے طریق عمل سے بعض صورتوں میں مجھے اختلاف ہے اور نظامِ تحریک میں بھی تعلیمی مقاطع کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہوں[1] مگر اس اہم اور اعلیٰ اقدامِ حریت سے اصولاً مجھے اتفاق ہے اور سودیشی تحریک پر تو میں عاشق ہوں آج سے نہیں ہمیشہ سے اب چونکہ تازہ واقعات نے بدیشی مال سے ناقابلِ برداشت نفرت پیدا کردی ہے۔ اس لئے ان تمام مشکلات پر کامل غور کرنے کے بعد کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی۔"

(حیات ز۔ خ ش۔ متذکرہ ص ۱۰۴-۱۰۰)

"قدرت اس کشش قلم پر مسکرا رہی تھی۔ اور یہ عہد پورا کرنے کی بشارت دے رہی تھی کہ "اب کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی۔" اس تحریک کے ٹھیک گیارہویں روز یہ محبِ وطن خاتون مرض الموت میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی داؤد احمد خاں نے وہی دیسی کپڑا ان پر اڑھادیا جو کہ اس عہد کے وقت انھوں نے اپنے لئے خریدا تھا۔"

(ایضاً ص ۱۰۶)

اس قبل از وقت حادثے پر سجاد حیدر یلدرم نے ۱۸ فروری ۱۹۲۳ء

---

[1] آنجہانی ٹیگور نے بھی تعلیمی مقاطع پر اس طرح کا اظہارِ خیال کیا تھا۔

کے تہذیب لنسواں میں لکھا" وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے۔ یکایک خاموش ہو گئی...... وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی۔ قفس میں ہی تھی اور قفس میں ہی دم توڑ دیا۔"

اپنی جواں مرگ کا ذکر وہ بڑے رجائی انداز میں اس وقت سے بہت پہلے ہی کر چکی تھیں ؎

مرے رُخ کو چھپا کر خاک سے جب اقربا نکلے
پکاری معنوی صورت کہ زندہ ہوں سلامت ہوں

(فردوس تخیل، ص، ۱۶۵)

خدیجہ بیگم

خدیجہ بیگم کا تعلق ایک معزز سرحدی خاندان سے تھا، ان کے والد ضلع بنوں میں انسپکٹر مدارس تھے۔ پردے کی قیود کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی صوبہ سرحد میں مسلمان بڑی اکثریت میں تھے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی رہنمائی میں وہاں کی سیاسی فضا پر کانگریس پوری طرح حاوی تھی۔

۳۰ر اپریل و یکم مئی ۱۹۳۱ء کو پنجاب صوبائی کانگریس کا اجلاس راولپنڈی میں ہوا۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صدر جلسہ تھے۔ جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ۔ لالہ لاجپت رائے، خان عبدالقیوم پشاوری، مولانا سید حبیب ایڈیٹر سیاست کے علاوہ خدیجہ بیگم نے بھی اس میں تقریر کی۔ کھادی کے برقعے میں ملبوس انھوں نے تقریر کے ساتھ اس عظیم الشان جلسے میں ایک نظم بھی پیش کی جس سے ان کی حب الوطنی اور آزادیٔ مادرِ وطن کی خلش کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم کے چند اشعار:

مسرور گو بظاہر رہتی ہوں میں زمن میں
کٹتا ہے وقت میرا اسیرِ گلِ چمن میں

اغیار نے بٹھایا سکہ میرے وطن میں
اس سے نہ چین دل میں نہ شانتی ہے من میں

جا کر چمن میں سنتی بلبل کے ہوں ترانے
کوئل کی میٹھی کو کو آتی ہے دل لگانے

آتی ہوں گو چمن سے بستی میں دل لگانے
لیکن ہو شانتی کیا جی کو کسی بہانے

ملتی ہے درد و غم سے کچھ بھی ذرا فراغت
ہوتا ہے گر ذرا سا بھی کم ملال فرقت

حسرت بھری نکلی منہ سے ہے یہ عبارت
پھر اوج پر الٰہی کب ہوگا پیارا بھارت

خدیجہ بیگم نے نہ صرف خود ہمیشہ کھدر کا استعمال کیا بلکہ بنوں میں گلی گلی اور خانہ بخانہ پھر کر خواتین کو چرخہ کاتنے، کھدر پہننے اور سودیشی تحریک کو ترقی دینے کی ترغیب دیتی رہیں۔ (ماخوذ بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۳۴) ان کی بقیہ زندگی کی تفصیلات نیز قومی زندگی میں سرگرمیوں کا تذکرہ آزاد ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

خدیجہ بیگم کے علاوہ صوبہ سرحد کی کچھ اور خواتین کے نام بھی اکثر قومی رہنماؤں کے کاغذات میں پائے جاتے ہیں مثلاً گاندھی جی کے خطوط میں خان عبدالغفار خاں کی بیٹی مہر تاج اور ڈاکٹر خان صاحب کی بیٹی مریم کا متعدد بار ذکر ہے۔ مہر تاج گاندھی جی کے آشرم میں بھی رہی ہیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے اپنی پشتو سوانح عمری میں خواتین رضاکار کی حیثیت سے ان کا تذکرہ کیا ہے (دیکھئے تذکرہ صوفیہ سوم جی) بادشاہ خان نے اپنے بڑے بھائی عبدالغنی خاں کے تذکرے میں خورشید بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت و بہادر خاتون تھیں۔ کابل سے جو بادشاہ خان کے خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں ایک خط "خورشید بہن کے نام

بھی ہے۔ احمد آباد جیل سے ۲۲ر فروری ۱۹۳۰ء کو سری رام سنگھ بنوں والے ۱/۱۲ کے خط میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ " خورشید بہن میری ملاقات کو آئی تھی۔ اس بہادر لڑکی کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اس نے جس جرأت و قربانی اور تکلیفوں کو صوبہ سرحد کے افغانوں کے لئے برداشت کیا ہے اس کی مثال نہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اس بہادر لڑکی خورشید بہن کی طرح تکلیفیں برداشت کی ہوں گی " (مکتوب سرحدی گاندھی ص۱۲ بحوالہ خط سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۸ار دسمبر ۱۹۸۶ء) تفصیلات نہ ملنے کے سبب قومی شرکت سے متعلق ان بکھری ہوئی کڑیوں کو مربوط کرنا ممکن نہیں۔ البتہ وہاں کی سیاسی فضا کے پیش نظر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اور بھی سرحدی خواتین تحریک آزادی میں پیش پیش رہی ہونگی۔

زبیدہ بیگم داؤدی

محترمہ زبیدہ بیگم کی پیدائش پارو گاؤں، ضلع مظفر پور (بہار) میں اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ ان کے والد مرحوم سید عبدالفتح سب رجسٹرار تھے اور پارو گاؤں نیز قرب وجوار میں بڑی زمینوں کے مالک تھے۔ زبیدہ بیگم کی شادی بہار کے مشہور ایڈوکیٹ اور ممتاز قومی رہنما شفیع داؤدی سے ہوئی جو مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت موتی لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ مولانا شفیع داؤدی کے سیاسی نظریات کا زبیدہ بیگم نے پورا اثر قبول کیا۔ بی اماں (والدہ محمد علی) کا ان کے یہاں قیام اور ان کی شعلہ بار تقاریر سے بھی زبیدہ بیگم خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر تھیں اور اپنے معزز شوہر کی سیاسی سرگرمیوں میں برابر کی شریک تھیں۔

خلافت و تحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی نے فعال کردار ادا کیا۔ انھوں نے قانون کی پریکٹس چھوڑ دی۔ اس وقت وہ تین ہزار روپے ماہوار کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اتنی بڑی آمدنی ایک دم ختم ہو گئی لیکن زبیدہ بیگم نے خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مالی سختیوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی سابقہ بچت بڑی رہائش گاہ کی تعمیر اور ولایتی کپڑوں پر پہلے ہی صرف ہو چکی تھی۔

انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس جب تحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی کو گرفتار کرنے کی خاطر شفیع منزل پہونچا تو تین چار سیڑھی چڑھ کر ہی مولانا کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں لڑکھڑا گیا۔ یہ مولانا کی شخصیت اور رحب توی کا رعب تھا جس نے اسے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وارنٹ گرفتاری بھی بمشکل تمام دکھا سکا۔ مولانا نے اسے بڑی فراخدلی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ وہ چلنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اُٹھ کر زنان خانے گئے اور ہدایت دی کہ زبیدہ بیگم شفیع منزل چھوڑ کر فوراً تلک میدان کانگریس کے دفتر پہونچیں اور اس وقت تک وہاں قیام کریں جب تک مولانا کے خاص رفیق کار رام دیالو مظفر پور ہیڈ کوارٹر نہ پہنچ جائیں" جس سے عوام میں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ مولانا شفیع داؤدی کی گرفتاری سے قیادت میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ بیگم زبیدہ داؤدی فوراً ہی تلک میدان پہونچیں اور کانگریس کے دفتر میں اس وقت تک قیام کیا جب تک رام دیالو بابو نے آکر قیادت کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال لیا۔ مولانا کو ایک سال قید کی سزا ہوئی۔

زبیدہ بیگم نے سب سے پہلے اپنے شوہر کے تمام قیمتی ولایتی کپڑے (مولانا کا شمار اپنے زمانے کے مشہور جامہ زیب حضرات میں ہوتا تھا ان کے کپڑے کلکتے سے سل کر آتے تھے) پھر اپنے نیز اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ولایتی کپڑے بھی کانگریس کے دفتر تلک میدان بھیج دیئے۔ جہاں انھیں ہنسی و خوشی آگ لگا دی گئی۔ اس طرح ولایتی کپڑوں کی ہولی جلانے میں انھوں نے بقیہ لوگوں کی قیادت کی وہ اپنے ساتھ ایک یا دو بیٹیوں کو لے کر بگھی میں سوار دوپہر کو گھر گھر جایا کرتیں اور ولایتی کپڑے اکٹھا کرتیں۔ شفیع منزل کی شاندار سرخ عمارت کے پورٹکو میں ایسے کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا، ہفتے کے اختتام پر ان میں باقاعدہ رسم کے طور پر آگ لگادی جاتی تھی۔

زبیدہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون تھیں، شوہر کے ہمراہ وہ ہر عوامی جلسے میں شریک ہوتی تھیں اور خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں۔ وہ ان

سبھی خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔ جن کے شوہر نیز دوسرے عزیز قومی آزادی کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ کھادی کے کپڑوں میں ملبوس خواتین شفیع منزل کی شاندار احاطے میں جمع ہوتی تھیں۔ بیگم زبیدہ چرخے کی کلاس بھی وہیں پر لیتی تھیں۔ اسی عمارت کے وسیع و عریض لان میں گاندھی جی نے بھی خواتین سے خطاب کیا تھا۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلباء نے گورنمنٹ اداروں سے اپنے نام کٹوالئے تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے شفیع داؤدی احاطے میں قومی اسکول و کالج قائم کئے گئے تھے۔ روپیہ فراہم کرنے کی خاطر محب وطن خواتین کھانا پکانے سے قبل ایک ایک مٹھی اناج بچالیا کرتی تھیں۔ زبیدہ بیگم طلباء کی غذا و صحت کا خاص خیال رکھتی تھیں خصوصاً ان کا کھانا وہ اپنی نگرانی میں تیار کراتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے جنہوں نے خود گورنمنٹ ادارے سے اپنی تعلیم منقطع کرلی تھی میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن مالی مشکلات اور حکومت کی طرف سے مستقل پریشان کئے جانے کے سبب یہ ادارے زیادہ عرصے تک نہ چل سکے۔

نہرو رپورٹ سے مخالفت کے سبب مولانا داؤدی کانگریس سے علیحدہ ہوگئے تھے اور ۱۹۳۷ء میں احرار پارٹی کی شکست کے بعد سیاست سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ ان کی تین سال کی طویل علالت کے دوران زبیدہ بیگم ان کی تیمارداری میں مشغول رہیں اور ۱۹۴۹ء میں ان کے انتقال کے بعد بقیہ زندگی خاموشی سے گذاردی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب زبیدہ بیگم کو اپنا رہائشی مکان کرائے پر دے کر ایک مختصر سے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ گذر بسر کی خاطر زبیدہ بیگم نے اپنی زمینیں بھی فروخت کیں لیکن آزاد ہندوستان میں دستِ طلب دراز کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

(بشکریہ جناب عطاء الرحمٰن داؤدی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفر پور۔ خط مورخہ ۹؍ مارچ ۱۹۸۶ء)

کنیز سیّدہ بیگم

کنیز سیدہ بیگم کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں چھپرہ (سارن)، بہار میں ہوئی۔ آپ سید مبارک حسین کی پوتی اور بہار کے ممتاز کانگریسی رہنما سید صلاح الدین کی چھوٹی بہن تھیں۔ اردو عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، ان کی شادی جناب ریاست حسین صاحب سے ہوئی جو بیرسٹر ایٹ لا تھے۔

کنیز سیدہ بیگم مہاتما گاندھی، علی برادران اور مولانا آزاد جیسے قوم پرست رہنماؤں کے سیاسی نظریات و عقائد میں یقین رکھتی تھیں اور انتہائی قوم پرور جذبات کی خاتون تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں انھوں نے سودیشی اور چرخہ تحریک کے لئے خواتین کو منظم کیا۔ تحریک خلافت کے دوران خواتین کے جلسوں کو خطاب کرتی تھیں۔ ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں میں ان کے بڑے بھائی سید صلاح الدین حسین کی ہدایات شامل ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۳۱ء میں کنیز سیدہ بیگم کے شوہر ریاست حسین صاحب کا صرف پینتالیس ۴۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس سانحے سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے سبھی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر لیا اور ۱۹۵۵ء میں اپنی وفات کے وقت تک ایک مذہبی خاتون کی حیثیت سے خاموشی کے ساتھ زندگی گزار دی۔

(بشکریہ جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن۔ نمائش روڈ پٹنہ۔ بہار۔ ذاتی انٹرویو۔ ۳ مارچ ۱۹۸۶ء)

منیرہ بیگم

منیرہ بیگم بہار کے ممتاز قومی رہنما مولوی مظہر الحق کی اہلیہ تھیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بدرالدین طیّب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی شادی ۱۹۱۶ء میں مولوی مظہر الحق سے ہوئی جن کا پٹنہ کے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق تھا انھوں نے لندن سے بارایٹ لا کیا اور وہیں وہ گاندھی جی، مسٹر علی امام اور مسٹر سچدا نند سنہا کے قریب آئے۔ سیاسی عقائد کے لحاظ سے وہ جداگانہ انتخاب کے حق میں نہیں تھے۔ اور ہندو مسلم اتحاد ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انھوں نے پٹنہ سے باہر دگھا کے مقام پر صداقت آشرم کی تعمیر کی اور مغربی طرز کی بود و باش نیز سبھی دنیاوی عیش و آرام کو تج کر فقیرانہ زندگی اختیار کی۔ اکبر حیدری کے نام گاندھی جی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیرہ بیگم نے قوم و وطن کی خاطر اس عظیم قربانی میں شوہر کا پورا ساتھ دیا۔ خط کا متن حسب ذیل ہے۔

" آرہ جاتے ہوئے

۴ر دسمبر ۱۹۲۰ء

عزیز دوست! ہم ابھی ابھی بانکی پور پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں مظہر الحق

نوٹ:- بیگم حیدری اور بیگم مظہر الحق دونوں بہنیں تھیں اور طیب جی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہمارے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ گذشتہ شب میری بلائی ہوئی خواتین کی نشست میں بیگم مظہر الحق نے اپنے چار عدد ہیرے سے مرصع بیش قیمت کنگن ہمیں بطور عطیہ دیے ہیں۔ کیا آپ بیگم حیدری کو ایک ایسی خاتون کی بہن ہونے پر مبارکباد پیش کریں گے جو ملک و قوم کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے سکے؟ جب انھوں نے کنگن پیش کئے تو میرا دل جذبات سے بھر آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے طیب جی خاندان سے قریب ہونے کا موقع دیا۔"

(م۔ک۔گ)

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol.XIX 1920 - 1921, P. 70)

بھتی سیا یا دین و دنیا کا سبق تیری جان

عصمت آرا بیگم

جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے حکیم عبدالقوی صاحب کو ملکی سیاست سے بہت تعلق تھا۔ خلافت کمیٹی کے ایک جلسہ میں علی برادران نے چندہ کی اپیل کی لوگوں نے بہت کچھ نچھاور کیا۔ عورتوں نے زیور تک پیش کئے۔ حکیم صاحب نے گھر آکر اپنی بھتیجی عصمت آراء بیگم سے اپنے گھر خواتین کا جلسہ منعقد کرانے کی خواہش کی اور فرمایا کہ بدیسی کپڑوں میں آگ میرے گھر پر ہی لگائی جائے۔ عصمت آراء نے جلسے کے انعقاد کا نہایت خوش دلی سے اہتمام کیا اور بی اماں (والدہ مولانا محمد علی و شوکت علی) کی موجودگی میں بڑی شان سے جھوائی ٹولہ میں جلسہ ہوا۔ عصمت آراء کے علاوہ بی اماں نے بھی تقریر کی، اس جلسے میں حکیم صاحب نے گھر کے سارے بدیسی کپڑے جلوا دیے۔ عصمت آرا بیگم نے جہیز کے کپڑوں کو خود اپنے ہاتھ سے آگ لگائی اور اپنی شادی کا زیور اسی جلسہ میں بطور چندہ پیش کیا (حکیم سید ظل الرحمن: تذکرہ خاندان عزیزی ۱۹۰۸ ص ۲۲۳)

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

صغریٰ خاتون

صغریٰ خاتون عرف "بگن" کی پیدائش عثمان آباد ریاست نظام حیدر آباد میں ہوئی۔ والد کا نام سید ہادی اور والدہ کا سعید النساء تھا۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے سبب وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ناہال موضع بھٹولی، ضلع بارہ بنکی آگئیں۔ وہیں تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی محمد ضمیر صاحب سے ہوئی جو صرف چھ سال بعد ایک دو سال کی بچی "زاہدہ" کو چھوڑ کر طاعون میں انتقال کر گئے۔ سسرال میں جائداد کی رنجشوں کے سبب صغریٰ بیگم اپنے ماموں کے پاس لکھنؤ چلی آئیں۔ لکھنؤ میں ان دنوں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی اور پردہ نشین خواتین بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ صغریٰ خاتون بھی تحریک آزادی میں سرگرم عمل ہوگئیں۔ وہ سروجنی نائیڈو، شریمتی موتی لال نہرو اور دوسری خواتین کے ساتھ سبھی زنانہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور باوجود برقعہ پوشی کے ستیہ گرہوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ جب ولایتی کپڑوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو دوسری خواتین کے ہمراہ وہ بھی دکانوں کے سامنے راستے روکنے میں شریک تھیں۔ اس وقت پولیس نے خواتین پر کوڑے برسائے۔ سروجنی نائیڈو زیادہ زخمی ہوئیں۔ پھر سب خواتین کو گرفتار کر کے

جنگل لے جایا گیا اور درختوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا لیکن صغریٰ بیگم برقعے کے سبب چھوڑ دی گئیں۔ انھوں نے خود اپنے سبھی ولایتی کپڑوں کو آگ لگا دی تھی اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ و کرتا پہننا شروع کر دیا تھا جس پر ان کے ماموں جو بیوہ ہونے کے بعد ان کے سرپرست تھے ان سے ناراض رہنے لگے تھے، سرکاری ملازم ہونے کے سبب وہ کھدر پہننے کے سخت مخالف تھے۔

جب خلافت کے جلسے میں شرکت کی خاطر بی اماں پہلی بار لکھنؤ آئیں تو صغریٰ خاتون بھی بی بی آفتاب النساء بنت شیخ عبدالرحمٰن قدوائی ساکن بڑا گاؤں کے ساتھ بی اماں کے استقبال کی خاطر فرنگی محل گئیں اور تحریکِ خلافت کے زنانہ جلسوں کی روحِ رواں بن گئیں۔ جب بی اماں نے لکھنؤ میں چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا تو وہ ایک تخت پر بیٹھ گئیں اور ان کے سامنے ایک چوکور کپڑا بچھا دیا گیا۔ سب سے پہلے صغریٰ بیگم نے اس پر اپنا پورا زیور لا کر رکھ دیا جو تقریباً پچاس تولے سونا اور کچھ جواہرات پر مشتمل تھا (ان کے شوہر محمد ضمیر بڑے زمیندار تھے) اس کے بعد انھوں نے ایک پُرجوش مختصر سی تقریر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں پر موجود سبھی خواتین نے اپنا سب کچھ لا کر چندے میں دے دیا۔ اس وقت صغریٰ خاتون کے بیان کے مطابق جواہرات سے لے کر ایک چوّنی تک چندے میں آئی۔ اس واقعہ کا ذکر انھوں نے متعدد لوگوں سے کیا۔ ہر بار اس کو بیان کرتے وقت ان کا چہرہ شدتِ جذبات سے تمتما اٹھتا تھا۔ اور آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔

تحریک کے دیگر کاموں کے سلسلے میں وہ بی بی آفتاب النساء کے ساتھ بی اماں سے ملنے رام پور بھی جاتی تھیں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں بی اماں کی آمد کے موقع پر "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ہنگامی اجلاس میں موصوفہ رضا کاروں میں شامل تھیں اور جلسے کا نظم و نسق سنبھال رہی تھیں۔ چندہ فراہم کرنے کے سلسلے میں انھوں نے بارہ بنکی، کانپور، الہ آباد، اور دہلی وغیرہ کے سفر بھی کئے۔

صغریٰ بیگم کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور قومی و بین الاقوامی حالات سے

سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کئی اخبارات ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔ خود ان کے مضامین 'ہمدم'، 'زمیندار'، 'ہمدرد' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے پاس اخبارات نیز اپنے مضامین کا بڑا ذخیرہ تھا جو ایک بار گھر میں آگ لگ جانے کے سبب سب ضایع ہو گیا۔

نہرو خاندان سے صغریٰ بیگم کے خصوصی مراسم تھے وہ تفصیل سے اس خاندان کی طرز معاشرت کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں بھی انھوں نے حصہ لیا لیکن اسی دوران انھیں کئی بار حیدر آباد جانا پڑا جس کے تحت اس میں میں کوئی نمایاں کام نہیں کر سکیں۔

آزادی سے قبل وہ اپنی بیٹی اور نواسی دنواسوں کے ساتھ حیدر آباد دکن چلی گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شہادت پر وہ تڑپ کر روئی تھیں اور کہا تھا کہ قوم نے اپنے ہاتھوں ملک کے سب سے مضبوط ستون کو گرا دیا ہے۔" نظام کی حکومت کے خاتمے کے بعد وہ حیدر آباد سے ایک بار پھر لکھنؤ واپس آگئیں اور وہیں ۱۹۶۸ء میں ۱۰ر مئی بروز جمعہ انتقال کیا۔ وہ ایک انتہائی با وقار و خوش شکل خاتون تھیں۔

(اطلاعات محترمہ سیدہ ضیا احتشام فرحت کدہ، سر سبد نگر علی گڑھ اور محترمہ نفیسہ عزیز، تاریخ کی استاد کرامت حسین کالج لکھنؤ نے مہیا کیں)۔

باب سویم

قافلے شوق کے رُکتے نہیں دیواروں سے
سینکڑوں محبس و زنداں کے دیار آئے ہیں

وفاداری بشرط استواری اصلِ ایماں ہے

بی بی امت السلام

بی بی امت السلام پٹیالہ کے ایک رئیس، محب وطن راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کرنل عبدالحمید خاں ریاست پٹیالہ میں وزیر مالیات تھے۔ ان کی پیدائش غالباً ۱۹۰۷ء میں موتی باغ محل پٹیالہ میں ہوئی۔ بی بی امت السلام نے بچپن سے ہی آزاد طبیعت پائی تھی۔ ایک بیمار و لاغر جسم، بنی نوعِ انسان کی خدمت کا بے پناہ جذبہ، ملکی حریت کی تڑپ شک و شبہ سے بھرا دماغ اور روایات سے بغاوت کا آہنی عزم ان کی شخصیت کے متضاد پہلو تھے محبت و عقیدت سے بھرپور دل لئے وہ تمام سماجی بندشوں کو توڑ کر گاندھی جی کے سابرمتی آشرم پہنچی تھیں۔ طبعاً انتہائی سادہ لوح تھیں جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے۔ "یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ گاندھی جی پہلے شخص تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لقب "قائدِاعظم" کو رواج دیا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ لوح مگر نیک خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ انھوں نے کچھ اخبارات میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ قائدِاعظم لکھا ہوا دیکھا تھا جب گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات کے لئے خط لکھ رہے تھے تو انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائدِاعظم کہتے ہیں۔ اس لئے آپ بھی اسی نام سے

خطاب کیجیے۔ ایک منٹ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر خطاب کیا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہتے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ حقیقت میں یہی مرتبہ رکھتے ہوں گے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۹۳)

۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء کی ستیہ گرہ کے دوران ۲۵ سال کی عمر میں وہ سابرمتی آشرم پہنچ گئی تھیں بطورِ مہمان اور بن گئیں غلام"۔ یہ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر تھا مگر کیسا؟ ؎

اور ہی کچھ ہے گرفتاریٔ دل کی ترکیب
سختیٔ طوق و گرانباریٔ زنجیر نہیں

ایک جاگیردار گھرانے کی مسلم لڑکی 'پردے کی سخت قیود کو توڑ کر جنگِ آزادی میں خود کو ہر قربانی کے لئے تیار کرنے کی خاطر کس طرح آشرم پہنچی'، یہ ایک ناقابلِ یقین کہانی ہے، سُنیے ان کی اپنی زبانی، "باپو کے پاس"

"میری پیدائش پٹیالہ کے اس مشہور خاندان میں ہوئی جس کے ہندو سکھ سبھی خاندانوں سے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے اور اس دوستی و خلوص کو یاد کر کے ہم سبھی محبت کے آنسو بہاتے ہیں۔ اس خاندان میں مذہبی تفریق کا کبھی سوال ہی نہیں اٹھا۔ میرے والدِ مرحوم محمد عبدالحمید خاں مجھے تیرہ سال کی عمر میں چھوڑ کر چل بسے۔ میں اپنی والدہ امۃ الرحمٰن کی اکلوتی لڑکی اور چھ بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ والد کا اس دنیائے فانی سے گذر جانا میری زندگی کا پہلا حادثہ تھا جس کی چوٹ سے آج تک نہ سنبھل سکی۔

میں تیرہ سال کی عمر میں قرآن مجید مع ترجمہ اور چند مذہبی کتابیں ہی ختم کر سکی تھی۔ ہمارے خاندان میں پردے کی اتنی سختی تھی کہ صرف حقیقی بھائیوں کے سامنے ہی آنے کی اجازت تھی، اس لیے اسکول جانے کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ والدِ مرحوم مجھے علی گڑھ لڑکیوں کے اسکول بھیجنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان میں سماجی بندشوں کو توڑنے اور قومی ترقی کی خاطر کوئی بھی قدم اٹھانے کی جرأت بھی تھی لیکن افسوس کہ اس کا فائدہ مجھے نہ مل سکا اور میری تعلیم اردو لکھنے پڑھنے تک ہی رہ گئی۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ کو جلد ہی میری شادی کی فکر ہوئی میرے بڑے بھائی محمد عبدالرشید خاں جنھوں نے قومی خدمت کے لیے راستہ ہموار کرنے میں میری رہنمائی کی ۱۹۲۱ء میں بیرسٹری چھوڑ کر قومی جنگِ آزادی میں کود پڑے تھے۔ انھوں نے والدہ کو سمجھایا کہ اتنی کم عمری میں شادی میں گناہ سمجھتا ہوں۔ آپ نے ایسا کیا تو میں بہن کی شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔ اب اس کے بعد چھوٹے بھائیوں کی جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بچپن سے ہی مجھے دنیاوی عیش و آرام، زیورات اور کپڑوں سے دلی نفرت تھی۔ یوں میرے سامنے نہ کوئی نصب العین تھا نہ ہی مجھ میں اپنے جذبات کا ماں یا بھائیوں کے سامنے اظہار کرنے کی جرأت تھی۔ ماں اکلوتی بیٹی کے لئے ہمیشہ ریشم و زردوز کپڑے اور زیورات تیار کراتیں جو مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ میری صحت ابتدا سے ہی خراب تھی، جسم میں کمزوری تھی اور سابرمتی آشرم جانے سے پہلے ہی میں ٹی۔ بی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس درمیان والدہ نے پھر بڑے بھائی پر میری شادی کے لئے زور دیا۔ بھائی نے بمبئی میں ڈاکٹر بلیموریا سے مشورہ کیا۔ میں پردے کے پیچھے سے سن رہی تھی، انھوں نے کہا کہ "بخار رہتے ہوئے شادی میں جان کا خطرہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تین سال تک بخار نہ رہے"۔ اب میں ہر ممکن طریقے سے صحت خراب کرنے پر تل گئی تھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔"

بیس سال کی عمر میں کچھ صحت سنبھلی تو بھائیوں نے پھر میری پسند کی بات شروع کی۔ میری پسند کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مجبوراً کہا "آپ جہاں مناسب سمجھیں میری شادی ضرور کر دیں لیکن میری طرف سے شوہر کو دوسری شادی کر لینے کی پوری اجازت

ہو گئی؛ بھائیوں کو ایک طرف میری پسند کی خواہش تھی۔ دوسری طرف دنیا کا خوف تھا کہ والد کے بعد چھ بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک بہن کی شادی نہ کرسکے۔

۱۹۲۲ء میں بڑے بھائی عبدالرشید خاں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے چھ ماہ کے لئے جیل گئے۔ قوم پرستی کا جوش بڑھ رہا تھا، میں نے برقعہ پہن کر انبالہ میں گلی گلی کھادی کی تبلیغ اور کھادی فروخت کرنا شروع کیا۔ میں مختلف جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگی تھی (بیگم محمد علی جوہر اور ان کی والدہ "بی اماں" کے اکثر پنجاب کے دورے ہوا کرتے تھے۔ ان دوروں کا بھی میرے اوپر گہرا اثر تھا۔ بھائی رشید چھ ماہ جیل رہے اس دوران گھر میں سب بچوں کے جسم پر کھادی ہی کھادی تھی، والدہ نازک مزاج تھیں، موٹی کھادی پہننے سے ان کے جسم پر زخم ہو گئے تھے۔ تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے انھیں بھلانا ممکن نہیں۔ باپو کے اکیس دن کے برت کا بھی میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

میرے سامنے اب مستقبل کا سوال تھا۔ شادی نہیں کرنا تھی لیکن زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیئے۔ اخبارات میں باپو کی مختلف تحریکات کے بارے میں تو پڑھتی ہی رہتی تھی۔ ڈانڈی کوچ میں حصہ لینے کو بے اختیار دل مچلا لیکن آزادی کی کسی تحریک میں عملاً حصہ لینے کی اس کے لئے گنجائش ہی کہاں تھی جو خود آزاد نہ تھی۔ پٹیالے میں تو پردہ تھا ہی لیکن ۱۹۲۵ء تک بمبئی میں کافی حد تک اس سے آزادی تھی۔ بھائی عبدالرشید غلامی میں بیرسٹری نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ ان کے دوست انھیں مہاراجہ اندور کا سکریٹری بنا کر اندور لے گئے۔ بھائی کی لائبریری میں باپو کی خود نوشت سوانح عمری تھی۔ میں نے ایک بار شروع کی تو ختم کر کے ہی دم لیا۔ مجھے مستقبل کے لئے نئی روشنی نیا نصب العین مل گیا تھا۔ جب بھائیوں سے کہا میں سابرمتی آشرم جانا چاہتی ہوں تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ میری مشکل تھی کہ کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ باپو سے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا بہن کا نام اخبار میں پڑھا تھا، انھیں کو خط لکھا۔ جواب کافی انتظار کے بعد آشرم کے منتظم نارن داس گاندھی نے دیا "تمہارا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" کچھ گھر کی حالت پوچھی تھی گھر

میں کوئی دکھ تو نہیں؟" تندرستی کا سرٹیفکٹ بھی مانگا تھا۔ اسے لینے میں نارنول سے بمبئی ڈاکٹر بلیموریا کے پاس گئی۔ ڈاکٹر جنھوں نے میری ٹی۔ بی کا تین سال تک علاج کیا تھا سُن کر ہلکی سی ڈانٹ سُنائی: "کیا بات کرتی ہے، تیری ایسی طبیعت کہاں کہ آشرم کی سخت زندگی گزار سکے"۔ سچائی کی پرستار میں بچپن سے ہی تھی۔ نہیں تو نارنول سے دلی بہت دور نہیں تھی وہاں سے بہ آسانی کسی ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ لے کر بھیج سکتی تھی میں نے ڈاکٹر بلیموریا سے کہا میں سچا سرٹیفکٹ بھیجنا چاہتی ہوں۔ آپ میری جسمانی کمزوری سے واقف ہیں۔ چار سال سے آپ کے زیرِ علاج ہوں۔ آپ کو جو بھی لکھنا ہو لکھ دیں۔ میں جاؤں گی نہیں بھیج دوں گی میری قسمت ہے۔ مرحوم ڈاکٹر بلیموریا نے لکھ دیا کہ "میں چار سال سے اس کا علاج کر رہا ہوں ٹی بی تھی لیکن اب ٹھیک ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ آشرم کی سخت زندگی نہیں گزار سکے گی"۔ میں نے وہی آشرم کو بھیج دیا اور لکھا کہ آنے کیلئے اجازت کی منتظر ہوں۔ اس کا جواب آنے میں بھی کافی دیر لگی جب کہ میرے لئے ایک ایک منٹ بھاری تھا۔ بھائی نے خط کھولا اور ہنستے ہنستے کہنے لگے، "تو تمہیں وہاں داخل کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں"۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی بھائی برداشت نہ کر سکے اور خط مجھے دے دیا اس میں لکھا تھا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو داخل نہیں کر سکتے ہاں آشرم کی زندگی دیکھنے آپ بطور مہمان یہاں آسکتی ہیں"۔ میں خوشی سے اُچھل پڑی دل میں یہ بھی خیال تھا کہ جانے کے لئے بھائیوں پر کیوں بوجھ بنوں۔ ماں کے مجبور کرنے پر ہاتھ، کان اور گلے میں زیور تو رہتے ہی تھے، انھیں کو فروخت کرنے بمبئی کے جھویری بازار گئی، کچھ دلال پیچھے لگ گئے جو کچھ ہاتھ آیا وہ بس اتنا تھا کہ آشرم پہونچ کر دودھ، گھی کے کوپن لینے کے بعد صرف پانچ روپے باقی بچے انھیں میں نے وہاں جمع کر دیا۔ دو چار دن میں ہی باپو احمد آباد آئے وہ شام کو سابرمتی کے کنارے ٹہلنے آتے تھے آشرم والے ان سے یہیں ملتے تھے میں نے بھی اپنی رام کہانی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں لکھ لی تھی کیونکہ میں نہ ہندی جانتی تھی نہ گجراتی، باپو نے محبت سے استقبال کیا یوں لگا جیسے ہمارے برسوں پرانے تعلقات ہوں۔ میری جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں بتانا

ممکن نہیں۔ خیر باپو نے دوسرے دن دوپہر کو شری امبالال سارہ بھائی کے گھر ملنے کا وقت دیا۔ خط میں میں نے لکھا تھا کہ "آشرم میں رہ کر آپ کے سائے میں ملک کی خدمت کے لئے تیار ہونا چاہتی ہوں لیکن جسمانی طاقت نہ ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔" باپو نے کہا "اگر حقیقت میں تمہاری یہ دلی خواہش ہے تو جسم آشرم کی سخت زندگی کو برداشت کر لے گا۔" جب چاہو مجھ سے مل سکتی ہو، داخلے کی فکر مت کرو، جسم جتنی اجازت دے اتنا ہی کام کرو بس پھر کیا تھا "گئی تھی مہمان بن کر اور بن گئی غلام۔"

میں نے بھائیوں کو لکھ دیا کہ اب آپ میری فکر نہ کریں۔ میں کتائی بنائی" دھنائی کے کورس سیکھنے میں لگ گئی دو گھنٹے باورچی خانے میں کام کرتی، کوٹھار میں رہتی ہریجن باڑے میں جاتی، وہاں کے بھائی بہنوں سے مجھے غیر معمولی محبت تھی۔ گنگا بہن دید کی محبت مادرانہ شفقت جیسی تھی پیارے لال بھائی کی والدہ تو پنجابی زبان بھی جانتی تھیں۔ اپنی بچی کے مانند پیار کرتیں جس کا احسان بھلا نہیں سکتی۔ آشرم کے سبھی اصولوں کو میں مجبوراً نہیں شوق سے پورا کرتی تھی۔ علی الصبح ندی پر جا کر نہا لیتی تھی کیونکہ میں کپڑے پہن کر نہانے کی عادی نہیں تھی۔ میری ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو لالٹین جلاتے نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں سے پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی تھی اس لئے ہوسٹل میں جب کوئی بہن لالٹین جلاتی تو چپ چاپ جا کر دیکھتی تھی کہ چمنی نکال کر کس طرح صاف کی جاتی ہے غرض زندگی محنت سے بھرپور تھی جسمانی کمزوری کو بھلا کر میں صبح سات سے دس تک دھنائی کرتی تھی۔ جوانی میں بھی تھکان تو ہوتی ہی ہے۔ مگر پسینے سے شرابور ہو کر بہت اچھا لگتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں پرانی پلورسی پھر غالب آگئی، بخار بھی رہنے لگا تھا اس لئے پھر کام کم اور مفت خوری زیادہ تھی لیکن پھر بھی سلائی والے حصے میں جا کر میں ۱۲ آنے ایک روپیہ کی سلائی ضرور کر لیتی تھی۔ غرضیکہ آنے والی زندگی میں جو بھی مشکلات پیش ہوئیں ان پر میں باپو کی روحانی طاقت کے بھروسے

پر ہی قابو پاسکی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے میں باپو کی غیر موجودگی میں اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے میں نے بہت کچھ سوچا اور ان کے ذریعے شروع کئے گئے بہت سے کاموں میں سے ایک کام "ہندو مسلم اتحاد" کو اپنے لئے چن لیا۔ باپو نے کانفرنس سے واپسی پر اس کی بھرپور تائید کی۔ وہی ان کی اپنی زندگی کا مشن بھی تھا" (باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام (ہندی) مرتبہ کاکا صاحب کالیلکر نوجیون پرکاشن مندر احمد آباد ص ۱۹ تا ۲۶)

باپو نے انھیں سمجھایا "میں چاہتا ہوں آشرم میں تمہاری ذہنی و جسمانی ترقی ہو اور روحانی طاقت بڑھے۔" امت السلام شرمندہ تھیں آئی تھیں دوسروں کی خدمت کے لئے لیکن نازک مزاج ہونے کے سبب دوسروں کی خدمت کا سہارا لینا پڑا، باپو نے ہمت بندھائی صبر سے کام لو، خدا تمہیں خدمت کی طاقت بھی دے گا۔ جسمانی خدمت ہی تو سب کچھ نہیں، وقت پر ایک میٹھا بول، دل میں کسی اچھے خیال کا آجانا بھی بڑی خدمت ہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا:

"تمہارے دوسروں کی سیوا کے لئے جلد باجی (بازی) نہیں کرنا چاہیئے پہلے تو تمہاری صحت اچھی کرلو پیچھے سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔ باپو کی دعا" ۲۸/۲/۳۳ (باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام نہرو میوزیم لائبریری فائل نمبر ۱۲۵، جلد اول)

آشرم میں رہتے ہوئے انھوں نے ہندی و گجراتی سیکھی۔ باپو انھیں اردو میں خط لکھتے تھے کبھی کبھی انھیں پڑھنے میں ایک گھنٹہ بھی لگ جاتا مگر وہ ختم کر کے ہی چھوڑتے۔ بی بی امت السلام کے ہندی اور گجراتی سیکھ لینے کے بعد وہ کبھی کبھی ہندی و گجراتی میں لکھتے اگر بہت جلدی میں کسی اور سے گجراتی میں لکھاتے تو آخر میں "باپو کا آشیرواد"، اپنے ہاتھ ہی سے لکھتے۔ ان کو ہمیشہ بی بی امت السلام کی صحت کی فکر رہتی تھی وہ ان کا علاج کبھی ڈاکٹر سے کراتے کبھی خود مٹی، پانی کا قدرتی علاج کرتے دھن کی پکی امت السلام اکثر سر پر مٹی کی پٹی لئے اپنے کام میں ہمہ تن مشغول رہتی تھیں

خرابی صحت کی بناء پر انھیں ہمیشہ فکر رہتی کہ شاید وہ جیل نہ جا سکیں ۔ باپو انھیں پرسکون رہنے کی تلقین کرتے ۔ مندرجہ ذیل خط ان سے متعلق بہت سے خطوط میں سے ایک ہے ۔

"پیاری بیٹی امت السلام"

تمہارا خط کل ملا سارا پڑھ لیا ۔ مجھے رنج ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیل جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے ۔ تم نے قبول کیا ہے جب تک بالکل اچھی نہیں ہوتی ہے تب تک جیل جانے کی بات نہیں کرے گی ۔ یہ بھی سمجھو کہ راجہ جی کا سنگ جتنا لے اتنا ہی اچھا ہے وہاں رہ کر جو سیوا بن سکے کیا کرو ۔ اب پاگل مت بنو ۔ خُش (خوش) رہو مجھے لکھا کرو ۔" (باپو کی دعا ۔ ۲ مارچ ۱۹۳۳ء (ایضاً جلد نمبر ۳)

بی بی امت السلام نے اپنی زندگی کا ہر عیش و آرام تج کر اپنے کو آشرم اور اس کے آدرشوں کے لئے وقف کر دیا تھا ۔ بڑودہ سے گاندھی جی نے ایک خط مورخہ ۵ جون ۱۹۳۱ء میں نارن داس گاندھی جی کو لکھا تھا ۔

"ہمیں امت السلام کو اگر وہ عمر بھر رہنا چاہے تو آشرم میں رہنے کی اجازت دے دینی چاہیئے ۔ اسے باہر سے روپیہ منگانے کی آزادی بھی ہونا چاہیئے بالفرض اگر باہر سے کوئی روپیہ نہ بھیجے تو ہمیں اس کے اخراجات اس کے اکاؤنٹ سے برداشت کرنا چاہیں ۔"

۱۹۳۳ء میں جب باپو نے سابرمتی آشرم کو ختم کر کے جن دوسرے آشرم والوں کے ساتھ راس گاؤں کی طرف کوچ کیا تو بی بی امت السلام بھی ساتھ تھیں ، آشرم کی دوسری خواتین کے ساتھ انھیں جیل بھیج دیا گیا ۔ ۱۹۳۴ء میں ستیہ گرہ بند ہونے پر وہ بھی رہا ہوئیں تو جیسے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا ۔ باپو کی شفقت نے انھیں مستقبل کی ایک نئی جہت عطا کی تھی ۔

سیوا گرام آشرم میں باپو کی ذاتی خدمت کی خوش قسمتی انھیں کے حصے میں آئی باپو کے ملک گیر دوروں میں بھی وہ اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہیں ۱۲ جولائی ۱۹۳۸ء کے خط میں

انھوں نے راجکماری امرت کور کو بی امت السلام کی خدمت کے بارے میں لکھا تھا امت السلام میرے نزدیک ہی سوتی ہے مجھے پنکھا کرتی ہے اور جب ضرورت ہو ڈھانکتی بھی ہے۔ وہی مجھے کھانا کھلاتی ہے۔

(Collected Worksof Mahatma Gandhi, Ministry of Information Vol. LXVII. P. 165)

باپو سے ان کا پیار بیٹی سے بڑھ کر تھا اور خود باپو بھی انھیں کتنا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ یکم مئی ۱۹۳۷ء کے اس خط سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے "بی بی جان پیاری بیٹی امت السلام" کہہ کر انھیں مخاطب کیا ہے

(Collected Works Vol. LXV, P. 162)

بی بی امت السلام ہریجنوں کی خدمت جس انداز سے کرتی تھیں باپو کے دل میں اس کے لئے بڑی وقعت تھی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔

" میرا اچا ہنا کیا چیز ہے۔ آج میں کتنا پیار کر رہا ہوں اس کا تجھے پتہ نہیں۔ جتنا میں تیرے لئے کر رہا ہوں اتنا میں نے کسی لڑکی کیلئے نہیں کیا۔ یہ کوئی مہربانی کی بات نہیں ہے۔ میں دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ تیرا غصّہ ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ مگر تیری خدمت کی لگن کے آگے ہر کسی کا سر جھک جاتا ہے اور تیرے غصّے کو برداشت کر لیتے ہیں۔

(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص ۱۵)

سردار پٹیل کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ " امت السلام پھر بستر پر لیٹ گئی ہے اس کا دل سونا ہے مگر جسم پیتل "

ایک بار ہریجنوں کی خدمت کرتے ہوئے امتُ السلام دہلی میں بیمار پڑ گئیں باپو کو بڑی فکر ہوئی لکھا۔ میری بات مانو تو مہربانی۔ میرے پاس آجاؤ تمہارا سب دُکھ بھاگ جائے گا۔ اتنا میرا مانو گی تو میں تمہاری بڑی مہربانی مانوں گا مہربانی کر کے یہاں آجاؤ۔ یہ نہ کرسکو تو پھر مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے "۔ (ایضاً ص ۹)

ایک بار بی امت السلام نے کاکا صاحب کالیلکر سے اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھیں بتایا تھا کہ " جب بھائیوں نے دیکھا کہ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکی ہوں تو انھوں نے جائداد میں سے نصف جائداد مجھے دینے کیلئے طے کیا۔ ہمارے اوپر ان دنوں ہندو قانون (سوریہ ونشی راجپوت) کا اطلاق ہوتا تھا۔ بھائیوں سے

پوچھا گیا آپ کس قانون کے تحت ایسا کر رہے ہیں تو ان کا جواب تھا کہ ہم اسے عطیہ دے رہے ہیں۔ ایک بار ماں کی بیماری کے سبب میں پٹیالہ کی طرف آئی ہوئی تھی، گاؤں پہونچی تو دیکھا کہ بسوے داری کے ٹیکس غریبوں کیلئے آفت جاں ہیں۔ میں نے مختار سے کہا سب ٹیکس معاف کردو وہ پریشان ہوا کیونکہ دوسرے بھائیوں کے ٹیکس پر اس کا بُرا اثر ہونا لازمی تھا۔ بھائیوں کے پاس پہنچا، انھوں نے کہا امتل جو چاہتی ہے وہی سب کے لئے کرو۔ بھائیوں کی دلی خواہش تھی کہ کسی بھی بہانے بہن گھر واپس لوٹ آئے اس کے لئے وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار تھے۔..... "ہزاروں ایکڑ کی زمین بٹائی کرانے میں گھوڑے پر جاتی تھی۔ گھوڑ سواری کا شوق بھی تھا اور راستہ چلنا بھی مشکل تھا ایک شام کو گھومتے گھومتے باہر گئی تو دیکھتی ہوں کہ ہریجن بہنیں لائن سے کنوئیں پر کھڑی ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں پانی چاہیئے۔ پوچھا بھرتی کیوں نہیں جواب دیا ہمیں کون بھرنے دے گا، میں سُن کر آگ بگولہ ہو گئی۔ کنواں میرے ہی نام سے تھا بسوے داری کا نشہ بھی تھا کہا ہریجن میرے ہی کنوئیں سے پانی بھریں گے خواہ دوسری ذاتیں بھلے ہی اجڑ جائیں۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ برہمن ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ہم فوراً کنواں کھود دیتے ہیں تب تک ہم خود پانی بھر کر انھیں دیں گے۔ رات بھر کام ہوا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پانی نکل آیا۔ اب چنائی کا سوال تھا۔ والد کا ہی ایک اینٹوں کا بھٹہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں بھائیوں کا حصہ تھا گھوڑے پر ایک آدمی ان کے پاس گیا، جواب ملا۔ جتنی اینٹیں چاہے لے لو۔ غریبوں کی خدمت سے میرا دل انتہائی خوش ہوتا تھا۔" (ایضاً) کا صاحب کا لیکر مد ۱۴) بنگال میں بورکامتہ کے مرکز میں بی بی امت السلام نے جو کام کیا اسے باپو نے ان کے انتہائی عمدہ کام (Excellent Work) سے یاد کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے گول میز کانفرنس سے باپو کی واپسی کے بعد بی بی امت السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا یہی وہ مشن تھا جس کی خاطر خود انھوں نے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دی ۱۹۴۰ء میں سندھ کے خوفناک فرقہ وارانہ فساد کے دوران

باپو نے انھیں سندھ بھیجا۔ سندھ بھیجتے وقت آنند ٹی ہنگورانی کے نام اپنے خط مورخہ ۲ رنومبر ۱۹۴۰ء میں انھوں نے لکھا "امت السلام سندھ میں ہو رہے قتلِ عام کو روکنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جا رہی ہے وہ وہاں چند مسلم دوستوں سے ملے گی، نیز حاجی پیر عبداللہ سے اپنے کام میں معاونت کی درخواست کرے گی۔ تمہیں اس کی ہر ممکن مدد کرنا ہے اس کو کی کی بہن سے ملا دو اور جو کچھ اس کے لئے کر سکتے ہو دریغ نہ کرو۔ تمہارا باپو۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 154)

سیواگرام سے باپو نے اپنے خط مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۴۰ء میں پیر عبداللہ ہارون رشید کو بی بی امت السلام سے متعارف کراتے ہوئے لکھا "اس میں بچپن سے ہندو مسلم اتحاد کی لگن ہے۔ سندھ میں جو قتل و خون ہو رہا ہے اس سے میں بھی پریشان ہوں اور امت السلام بھی۔ آپ سے زمانۂ خلافت کے پرانے تعلقات کی بنا پر اسے میں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میں اس وقت موجودہ حالت کے سیاسی مضمرات کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ بی بی امتُ السلام نہ سیاست سمجھتی ہے اور نہ ہی اس میں دلچسپی رکھتی ہے وہ ایک سچی مسلمان ہے۔ باقاعدگی سے قرآن پڑھتی ہے اور جب بیمار نہ ہو تو رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھتی ہے۔ . . . . وہ بہادر ہے اور اس قتل و غارت گری کو روکنے کیلئے اپنی جان بھی دینے کو تیار ہے۔ میں نے حصول مقصد کی خاطر اس کی ہمت افزائی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ اسے اور مجھے سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔ میرے پاس اس سے زیادہ شریف اور دُھن کا پکا کوئی مرد یا عورت نہیں ہے جب وہ ہندوؤں کی جان بچانے نیز اسلام کا وقار بڑھانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہے تو میں اسے اپنی نیک خواہشات دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 145)

خود بی بی امت السلام کو انھوں نے لکھا تھا۔ جیوں جیوں تیرا خیال کرتا ہوں تیری قدر بڑھتی ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔ تجھے تیرا کام اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہیئے۔ سچ تو یہ

ہے تو یہی مشن لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور تیرا ہی یہی مشن لے کر سندھ گئی تھی اور جائے گی۔ سندھ کے مسلمانوں کو تجھے بتانا ہے کہ سیاسی اور دوسرے معاملات میں خون خرابے، زبردستی یا جھوٹ سے انصاف نہیں ملتا۔ تیرا سندھ جانا اور جان تک کی پرواہ نہ کرنا صرف قتل و غارت گری روکنے کے لئے ہے یہ میرا مقصد تجھے بھیجنے میں تھا اور اب بھی ہے۔ خدا تیرا راستہ صاف کرے۔ وہی ایک رہنما ہے۔ اور تو، میں سب اس کے بندے ہیں باقی سب جھوٹ ہے۔ باپو کی کروڑوں دعائیں۔"

(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص۱۲۱)

"گھنے جنگلوں سے گزرتی، گھوڑوں پر سوار بی بی امت السلام بے خوف ہو کر فساد زدہ علاقوں میں پہنچیں اور فساد ختم کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔"

(ذاتی انٹرویو، محترمہ سروجنی ناناوتی صدر ہندوستان پرچار سبھا سن ندھی، راجگھاٹ، نئی دھلی، ۱۸، اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بی بی امت السلام بہت سے دوروں میں گاندھی جی کے ساتھ رہی تھیں۔ جب نواکھالی میں قتل و خون کا ہولناک طوفان آیا تب وہاں کے دورے میں بھی وہ اپنے باپو کے ساتھ تھیں۔ وہاں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کیلئے برت رکھا اور حصول مقصد کے بعد باپو ہی کے ہاتھوں سے رس پی کر توڑا نواکھالی میں ان کے تعمیری کاموں سے سبھی مسلم خواتین متاثر تھیں وہاں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر شیطانیت اور بربریت کے بھیانک طوفان میں انھوں نے اپنے کو جھونک دیا وہ باپو کی کروڑوں دعاؤں، کے بل پر ہی ممکن ہو سکتا تھا اور جب سرحد میں بھی انسان وحشی بن گیا تو وہ وہاں جانے کے لئے بھی بے چین ہو گئی تھیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے انھیں خط لکھا:

شملہ ۱۰-۵-۴۶ ۱۹ء

پیاری امت السلام سلامت رہو۔

تمہارے دو خط مجھے دو دن پہلے ملے تھے اور ایک خط آج ملا ہے.... باقی

رہا سرحد کا معاملہ میں بھی حیران ہوں۔ یہ ایک عجیب سا معاملہ ہے۔ آپ اس کا فکر نہ کریں۔ اس کو ہم خدا پر چھوڑ دیتے ہیں اور میرا یہ ایمان ہے کہ جب اور جس وقت بھی اسے منظور ہوگا اسے کرے گا۔ ہم تو یہ سب کچھ اسی لئے کرتے ہیں۔ کوئی اپنی غرض نہیں۔ تم ایک عجیب لڑکی ہو۔ تم نے اپنے خط میں میری ناراضگی کا لکھا تھا، میں کیوں آپ سے ناراض ہو جاؤں آپ نے تو کافی کوشش کی اور انسان اگر ناراض بھی ہوتا ہے تو اپنے کام سے اور یہ کام تو کوئی میرا نہیں اور نہ میں اس کو اپنے لئے کرنا چاہتا ہوں تم ایسے فکر دل سے نکال دو بلکہ امید رکھو اگر تمہارا خیال اور ارادہ مضبوط ہے تو ضرور ایک دن تم کو مہاتما جی اس کام کی اجازت دیں گے بلکہ آپ کو سرحد کے لئے خود روانہ کریں گے۔ باقی خیریت ہے۔ فقط

"آپ کا عبدالغفار"

(کاغذات مہاتما گاندھی، گاندھی میوزیم لائبریری راجگھاٹ ص ۵۲۵)

سرحد ہی سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ سرحد کے سفر میں ایک شام پرارتھنا کے وقت انھوں نے تھوڑے زیادہ انگوروں کا رس نکال کر باپو کو دیا۔ باپو نے خدائی خدمت گاروں کی بھری سبھا میں رس کا گلاس ہی اٹھا کر پھینک دیا تھا پھر وہ آٹھ دن تک معافی مانگتی رہیں اور باپو انھیں سمجھاتے رہے وہ بڑے پیار و لگن سے ان کی شخصیت کو سنوار نکھار رہے تھے۔

غصّے میں امت السلام بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ اس واقعہ سے پہلے ایک مرتبہ جب وہ باپو کو کھانا کھلا رہی تھیں تو نہ جانے کس غلط فہمی کی بناء پر اُن کے لئے بنائی روٹی ہی پھینک دی تھی۔ باپو کا وہ خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے انھوں نے لکھا۔

"پاگل بیٹی! آج تو نے پورا رنگ بتایا۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ اچھی طرح ثابت کیا۔ میں نے کہا تھا آج روٹی کھاؤں گا، بھاجی کھاؤنگا اگرچہ میرے لئے الگ پکے ہوئے ہیں تو بھی۔ پھر روٹی پھینک دینا۔ میں نے جو کہا اس میں تمھارے ہاتھ کی روٹی بھاجی نہ کھانے کی میرے خوابوں میں بھی

بات نہ تھی۔ اتنا غصّہ کیسا گناہ، اتنا غصّہ میرے جیسے غریب پر کرنے سے بھی تیرا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اچھا ہے میرا مون برت ہے۔ کہو اب میں کیا کروں، فاقہ کروں"۔
(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام، مرتبہ کاکا صاحب کالیکر، تذکرہ ص ۱۱)

باپو نے بڑی محبّت ولگن سے ان کی شخصیت کو بنایا سنوارا تھا، کبھی ڈانٹ، کبھی نصیحت اور کبھی پیار سے۔ ایک خط میں انھوں نے سمجھایا تھا "میرے باپ جو حکم کرتے تھے وہ مجھے واجب ہی لگتے تھے۔ زندگی بھر میں نے دلیل نہیں کی۔ ماتا نے کہا بیٹا یہ کر، میں نے کیا ہی ہے۔ میں باپ ہوں، ماں ہوں۔ میری ایک بات بھی بغیر دلیل کے تو نے مانی ہے؟ جاننے کے بعد بھی تیرا دماغ کہاں نہیں پھرا ہے۔ یہ سب وچار کرنے کے لائق ہیں۔ جب تک یہ نہیں سمجھے گی تب تک نہ میں سکھی ہونے والا ہوں نہ تو سکھی ہونے والی ہے۔ تو مجھے چھوڑ نہیں سکتی نہ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں"۔
(ایضاً ص ۱۲)

باپ بیٹی میں جب محبت کا ایسا اٹوٹ رشتہ ہو تو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ باپو کی شہادت چہیتی بیٹی کے لئے کیسا صدمۂ جانکاہ رہا ہوگا۔ وہ رات بھر ان کی سمادھی پر روتے ہوئے گذار دیتیں لیکن کب تک۔ امت السلام صحیح معنوں میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے سیکڑوں عقیدتمندوں میں ایک ممتاز فرد تھیں۔ اپنے دل ودماغ پر قابو پاتے ہی وہ باپو کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں تن من دھن سے جٹ گئیں۔ مسز سبھدرا جوشی اور مس مردولا سارہ بھائی کے ساتھ انھوں نے مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے ناقابلِ فراموش کام کیا، اس سلسلے میں وہ کئی بار پاکستان بھی گئیں۔

کستوربا گاندھی سے بی بی امت السلام کو ماں جیسا پیار ملا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے راجپورہ (پنجاب) میں ایک آشرم "کستوربا مندر" کے نام سے قائم کیا اور اپنی تمام جائیداد اس کے لئے وقف کر دی۔ پنجاب کے مختلف قصبوں اور شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں جس سے ہزاروں ضرورتمند لوگوں کو کام ملا۔ آشرم میں

وہ ان خواتین کو مختلف کاموں کی تربیت بھی دیتی تھیں۔ گاندھی جی کے سیوا گرام آشرم میں جو جاپانی سادھو آتے تھے انھوں نے واپس جا کر جاپان میں سرودے کا کام شروع کیا۔ بی بی امت السلام اپنے منہ بولے بیٹے سنیل کمار کو لے کر اسے دیکھنے جاپان گئیں اور وہاں سے واپسی پر اپنے راجپورہ مرکز میں ایک جاپانی بدھ مندر بھی بنوایا کستوربا مندر میں بچوں کیلئے اسکول بھی قائم کئے گئے اور خواتین اساتذہ کے بچوں کے لئے نرسری بھی۔ وہاں کھیتی بھی ہوتی تھی۔ کھادی بنی جاتی تھی اور سلک کی ساڑیوں کا بھی ایک کارخانہ تھا۔ ہریجنوں کی خدمت اس آشرم کا خصوصی مقصد تھا۔ راجپورہ میں ہوائی پٹی بھی ہے۔ یہاں سے وہ ہیلی کوپٹر میں ۱۹۶۱ء ہندوستان پر چین کے حملے کے دوران نیفا فوجیوں کیلئے کھانا، کمبل، اور دوائیں لے کر جاتی تھیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ کے دوران بھی وہ بلڈ پریشر کی مریض ہونے کے باوجود اسی مقصد کی خاطر لدّاخ جاتی تھیں۔ سرحدی گاندھی مرحوم خان عبدالغفار خان صاحب جب ۱۹۶۹ء میں ہندوستان آئے تو ان کا کھانا وہ خود بناتی تھیں اور ملک گیر دورے میں بھی ان کے ساتھ رہی تھیں۔

'بی بی امت السلام کی اپنی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ بغیر پلے کی کھادی کی ساڑی پہنتی تھیں۔ چٹائی پر سوتیں اور رات کو صرف ایک گول لکڑی سرہانے رکھ لیا کرتی تھیں۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی، پنجابی اور انگریزی سے بھی بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ آشرم میں رہ کر انھوں نے گجراتی و ہندی بھی سیکھ لی تھی پھر کیوں کہ آشرم کے مقاصد کی خاطر وہ جنوبی ہندوستان اور بنگال میں بھی رہی تھیں۔ اس لئے اڑیہ، تیلیگو، تامل اور بنگالی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئی تھیں اور جاپانی زبان بھی وہ اچھی طرح سیکھ گئی تھیں انھوں نے راجپورہ سے 'ہندوستان' نام کا ایک اردو اخبار بھی نکالا تھا۔

(ذاتی انٹرویو بیگم کنور عمار احمد خاں صاحب علی گڑھ، بی بی امت السلام کی بھتیجی ہیں)

بی بی امۃ السلام ایک محاذ پر اپنی بیماریوں اور صحت سے لڑتی دوسرے
پر ان گنت تعمیری کاموں کا بوجھ سنبھالتی اب تھک چکی تھیں۔ آخر طویل عرصے
س مسلسل جدوجہد کے بعد ۲۹ راکتوبر ۱۹۸۵ء کو ان کی شمعِ حیات ہمیشہ کے
گل ہوگئی۔ شام کو جنازہ سن ندھی (قریب راجگھاٹ) کے دعائیہ ہال میں رکھا
اور شب بھر کی دعاؤں کے بعد اگلے دن جامعہ ملیہ کے قریب انھیں اُن کی ابدی
م گاہ پہونچا دیا گیا۔ اور یوں عمر بھر کی ایک بیقرار زندگی آخر قرار پاگئی ؎

سرھانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

آمنہ قریشی

آمنہ قریشی ہندوستانی نسل کے جنوبی افریقہ میں مقیم امام عبدالقادر باوزیر کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ امام صاحب گاندھی جی کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف جدوجہد میں برابر کے شریک تھے ٹرانسوال میں مذہبی درس وتدریس کے سبب وہ امام صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ آمنہ قریشی کے جذبہ قوم پرستی اور حب الوطنی کے تجزیے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اُن کی پرورش اور تربیت کس ماحول میں ہوئی اس لئے اس سلسلے میں ملک وملّت کی خاطر امام خاندان کی عظیم قربانی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

امام صاحب کا جنوبی افریقہ میں عربی گھوڑوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شرکت کی خاطر کیوں کر آئے اس کا تذکرہ گاندھی جی کی زبانی سُننے۔

" امام صاحب کا گھر انگلش وضع پر آراستہ کیا گیا تھا۔ حاجی صاحبہ بچپن سے اسی انداز کی عادی تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں فاطمہ اور آمنہ کی پرورش بھی انگریز بچوں کی طرح ہی کی گئی تھی۔ ایسے اشخاص کے لئے ایک عیش وعشرت کی زندگی کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن امام صاحب کے لئے ایک بار عزم کر لینے کے بعد اسے نبھانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسی لئے جب جوہانسبرگ چھوڑ کر میں نے

فونکس میں رہائش اختیار کی تو امام صاحب نے بھی میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی اولوالعزمی سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد بھی میں حیران تھا کہ انھیں کیا جواب دوں جس شخص نے کبھی زندگی میں تکلیف نہ اٹھائی ہو وہ کس طرح سب عیش و آرام کو تج کر فونکس میں ایک مزدور کی زندگی گزار سکتا ہے! میں نے انھیں فونکس کی سخت زندگی کے بارے میں بتایا اور پوچھا اگر وہ بذاتِ خود بھی یہ تہیہ کرلیں تو حاجی صاحبہ اور فاطمہ و آمنہ کا کیا بنے گا؟ انھوں نے جواب دیا "مجھے خدا پر پورا اعتماد ہے اور تم حاجی صاحبہ کو نہیں جانتے۔ وہ جہاں میں رہوں، جس حال میں رہوں رہنے کے لئے تیار ہوں گی۔ کسی کو علم نہیں ہماری جدوجہد کب ختم ہوگی۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنے گھوڑوں کی تجارت جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ اور نہ ہی اب کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرسکتا ہوں۔ ایک ستیہ گرہی کے لئے تمام عیش و آرام اور دولت کی محبّت ترک کردینا لازمی ہے"۔ مجھے اس جواب سے دلی خوشی ہوئی میں نے فونکس کے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی لکھا، ان سب نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور یوں امام صاحب اور ان کا خاندان ہمارے ساتھ آگیا۔

فونکس میں مقیم حضرات کے ساتھ امام صاحب نے ہر کام میں برابر کا حصّہ لیا۔ فونکس میں عمارتیں پہاڑی پر تھیں۔ ہر شخص کو اپنے استعمال کا پانی نیچے چشمے سے لانا ہوتا تھا۔ امام صاحب کی صحت اس وقت بھی نازک تھی لیکن ہر صبح وہ کاندھے پر پانی سے بھری بالٹیاں لٹکائے پچاس فیٹ اوپر چڑھتے تھے۔ جو جگہ اب فونکس میں چرخہ کاتنے کے کام آتی ہے وہاں پہلے چھاپہ خانہ تھا۔ آشرم میں مقیم سبھی لوگوں کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکی، نوجوان ہوں یا بوڑھے کچھ نہ کچھ کام کرنا لازمی تھا۔ امام صاحب حاجی صاحبہ، فاطمہ اور آمنہ چاروں ہی چھاپہ خانہ میں کام کرتے تھے۔ امام صاحب نے کمپوز کرنا سیکھ لیا تھا جو ان کے جیسے مزاج، عادتوں اور عمر رسیدہ شخص کے لئے بڑا حیرت انگیز تھا۔ ان کا خاندان گوشت خور تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں فونکس میں انھوں نے ایسا کوئی کھانا پکایا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امام صاحب کا جذبۂ ایمانی

کچا تھا۔ ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی نہ ہی ان کے خاندان نے کبھی روزہ قضا کیا۔ آشرم میں مقیم دوسرے حضرات جیسی طرزِ زندگی اختیار کر کے انھوں نے اسلامی طرزِ فکر کی وسعت کا ہی مظاہرہ کیا، لیکن ابھی امام صاحب کے جذبۂ قربانی کو کچھ اور منزلوں سے گزرنا تھا وہ کئی بار قید ہوئے اور مثالی قیدی ثابت ہوئے اصل امتحان کا وقت ۱۹۱۴ء میں آیا جب آشرم کے زیادہ تر حضرات نے ہندوستان لوٹنے کا قصد کیا جنوبی افریقہ امام صاحب کا وطن بن چکا تھا۔ حاجی صاحبہ فاطمہ اور آمنہ کے لئے تو ہندوستان ایک بالکل اجنبی ملک تھا۔ وہ لوگ ہندوستان کی کسی بھی زبان سے آشنا نہیں تھے اور صرف انگلش و ڈچ زبانیں ہی جانتے تھے۔ لیکن امام صاحب کو یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا کہ وہ مع خاندان میرے ساتھ ہی ہندوستان آئیں گے۔ ستیہ گرہ اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یہ ان کی عظیم قربانی تھی۔

سابرمتی آشرم کے سبھی اشخاص کو ان کی روزانہ زندگی کے بارے میں علم ہے۔ وہ دن بدن عام انسانی سطح سے اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ ان کا دل زیادہ پاک و صاف اور اللہ تعالیٰ سے ان کی قربت بڑھ رہی تھی۔ آشرم کے اصولوں میں بھی ان کا اعتماد دن بدن پختہ ہو رہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ امام صاحب سے متعلق سبھی اشخاص اپنی اپنی یادداشتوں کو قلم بند کر دیں۔ اور پھر وہ یکجا کر لی جائیں۔

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XLIX, January - May, 1932, PP. 217 - 219)

غلام ہندوستان میں بھی امام صاحب نے ہنسی و خوشی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آمنہ قریشی انھیں مجاہد آزادی کی دوسری بیٹی تھیں۔ ملک و قوم کی خاطر ایثار و قربانی کے راستے پر چلنا انھوں نے بچپن میں ہی اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ امام صاحب اپنا کاروبار چھوڑ کر ڈربن میں فونکس آشرم میں مقیم ہوئے تو آمنہ بہت کم عمر تھیں ۱۹۱۶ء میں جب امام صاحب کو چھرب آشرم آئے تو آمنہ مشکل سے سات برس کی رہی ہوں گی ۱۹۱۷ء میں امام خاندان سابرمتی آشرم میں منتقل ہوا۔ آشرم کی زندگی انتہائی سخت تھی

اس کے اصولوں کی پابندی بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص کے لئے لازم تھی ننھی آمنہ جوں جوں بڑی ہوتی گئیں ان کی خوش مزاجی، ذہانت اور جذبہ خدمت نے آشرم میں ہر شخص کا دل جیت لیا۔ گاندھی جی کو تو وہ حقیقی بیٹی جیسی عزیز تھیں۔ وہ بچپن سے آشرم کی سبھی مصروفیات میں پیش پیش رہیں۔ امام خاندان سابرمتی آشرم میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا تحریک آزادی میں شریک جتنی اہم شخصیتیں آشرم میں آتیں امام صاحب کی رہائش گاہ امام منزل کی مہمان ہوتیں، حب الوطنی اور جذبہ آزادی سے سرشار مجاہدین سے ملاقاتوں نے آمنہ کی نہ صرف ذہنی تربیت میں معاونت کی بلکہ انھیں زندگی کا ایک نصب العین بھی عطا کیا۔ ۱۳ رمئی ۱۹۲۴ء میں ان کی شادی ایک گجراتی نوجوان غلام رسول قریشی سے ہوئی۔ جو خود بھی حریت وطن کی خاطر برطانوی سماج سے برسرِ آزما تھے۔ شادی کا دعوت نامہ امام صاحب کے حقیقی بھائی کی حیثیت سے گاندھی جی کی طرف سے بھیجا گیا۔ ہندو رسم و رواج کے مطابق کنیادان بھی گاندھی جی نے ہی کیا۔

(ماخوذ: نوٹس کشن بھائی ترویدی ڈائرکٹر گاندھی اسمارک سنگرہالیہ، ہریجن آشرم احمد آباد، ۱۰ رنومبر ۱۹۸۵ء)

اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود باپو ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھتے تھے۔ شری نارن داس کے نام اپنے خط مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ء میں انھوں نے لکھا" آمنہ کی اُردو کی تعلیم کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ گری راج اسے پڑھاتے تھے انھیں اب پھر سے شروع کر دینا چاہیئے یا پھر کوئی دوسرا انتظام فوری ہونا ضروری ہے۔"

(Collected Works Vol. XLV, 1930-31, P. 25)

آمنہ قریشی کو اپنی اسکول کی تعلیم نہ ہو سکنے کا افسوس تھا جس کی شکایت انھوں نے باپو سے کی۔ باپو نے جواب دیا۔

۲۰ رنومبر ۱۹۳۲ء

فرزند۔ آمنہ۔ تمہارا خط ملا، اچھا لگا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے صفائی سے لکھ دیا ہے۔ تمہاری صحت بہتر ہونے کا صرف وہی ایک طریقہ ہے جو میں نے تمہیں تجویز کیا

ہے۔ اگر تم تعلیم حاصل نہیں کر سکیں تو کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔ تھوڑا سوچو۔ زیادہ غلطی میری ہے کہ میں نے آشرم کے بچوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی۔ بہرحال اگر تم سنجیدگی سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہو تو میں تمہیں اسکول میں داخل کرانے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم بھاؤنگر جانا چاہو تو میں تمہیں لڑکیوں کے اسکول میں داخل کر سکتا ہوں۔ امریلی میں بھی لڑکیوں کا ایک اچھا اسکول ہے دونوں ہی جگہوں میں تمہیں خصوصی توجہ ملے گی۔ میں تمہاری پریشانی دور کرنے میں مدد کر سکتا ہوں۔ لکھو تم کیا چاہتی ہو۔ نارن داس سے بھی کھل کر بات کرو۔ خدا تمہیں ذہنی سکون دے۔ باپو"

(Collected Works, Vol.LII, November 1932, January, 1933, P. 25)

واضح رہے یہ خط امام صاحب کی وفات کے بعد کا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے گاندھی جی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آمنہ قریشی کی اسکول کی تعلیم نہ سہی لیکن آشرم میں جس زندگی کی تربیت ہوئی تھی، اُس نے آزادیٔ وطن کی راہ میں جینے مرنے کا ایک نیا سلیقہ عطا کیا تھا۔ امتحان کا اصل وقت ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی مارچ کے موقع پر آیا، باپو سبھی آشرم والوں سے اپنا سب کچھ آزادی وطن کی راہ میں قربان کر دینے کی اُمید رکھتے تھے۔ آمنہ کے والد امام صاحب اور شوہر غلام رسول قریشی نے بقول باپو "پورا حق ادا کر دیا۔" امام صاحب نے باوجود خرابی صحت کے دھرسنا کی ستیہ گرہ کی رہنمائی کی اور پولیس کی وحشیانہ مظالم کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ غلام رسول قریشی ان دو ہراول دستوں میں سے ایک دستے کے رہنما تھے جو ڈانڈی مارچ سے ایک روز قبل روانہ کئے گئے تھے۔ امام صاحب غلام رسول قریشی دونوں گرفتار ہوئے اور سزا ہوئی۔ جوشیلی آمنہ کا جذبۂ بغاوت بھی کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن ابھی باپو نے خواتین کو باہر آکر کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آمنہ قریشی بار بار ان سے یہ اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

*

جمعرات، ساڑھے دس بجے شب

یکم مئی سنہ ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ تم اچھی طرح اس کا سبب بھی جانتی ہو کہ میں نے تم کو گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی۔ پریشان نہ ہو تم گھر پر رہ کر جو چاہو کر سکتی ہو۔ مجھے آزادی سے لکھا کرو۔ امام صاحب جلد ہی جیل میں ہونگے۔ وہ شاید مجھ سے پہلے ہی وہاں پہونچیں کاش ایسا ہی ہو۔ باپو کی دُعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 359)

باپو نے جب یہ خط لکھا آمنہ کے یہاں ولادت کے دن قریب تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل خط سے علم ہوتا ہے:۔

" ۲۶ر مئی سنہ ۱۹۳۰ء

پیاری آمنہ۔ آخر کار امام صاحب جیل پہونچ ہی گئے شاید قریشی بھی اب تک جا چکے ہوں لکھو تمہاری صحت اب کیسی ہے؟ زچگی کا اب کیا انتظام کیا، بچے کیسے ہیں؟ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 430

باپو ان کی صحت کی طرف سے پریشان تھے اپنے خط مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا " یرودا مندر۔ چرنجیو آمنہ۔ میں ہر دن تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ تمہاری زچگی اب ختم ہو گئی ہوگی۔

بچے کی پیدائش کی خبر سُن کر باپو نے مُبارک باد دی۔

یرودا مندر۔

۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ میں تمہارا خط پاکر بہت خوش ہوں مجھے خوشی ہے کہ تم ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی ہو۔ خدا اسے طویل عمر دے اور وہ بھی بہادر و باہمت

نکلے۔ جتنا تم اور قریشی۔ کیا بچیاں مجھے یاد کرتی ہیں؟ اُمید کہ تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIV, July, December, 1930, P. 5)

نومولود بچّہ ابھی صرف چند ہفتوں کا ہے۔ لیکن جذبۂ شوق ہے کہ راہ کی کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جیل کے لئے بے قراری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ باپو نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

یرودا مندر۔

۱۹ر جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

چر بچو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ والد اور قریشی دونوں ہی جیل میں ہیں اور تم بھی وہیں جانا چاہتی ہو۔ تم آشرم میں رہتی ہو۔ یقین جانو آزادی کی اس لڑائی میں تم برابر کی شریک ہو۔ خدا ہمیں جہاں اور جس حال میں رکھے اس پر قناعت کرنی چاہیئے۔ اپنی اردو کی تعلیم جاری رکھو۔ گری راج تمہاری مدد کریں گے۔ والد اور قریشی جس سے بھی ملاقات ہو کہنا میرے لئے ان میں سے کسی کو بھی بھول ممکن نہیں۔ باپو کی دُعائیں۔ (IBID, P. 29)

باپو نے غلام رسول قریشی کے نام بھی خط لکھا "آمنہ جیل جانے پر مُصر ہیں۔ میرے لئے اجازت دینا مشکل ہے۔"

"۱۸ر دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء .... آمنہ کے عزم وہمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کا نام بحیثیت رضا کار دینے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوتا لیکن گرفتاری کی صورت میں وہ کس طرح بچوں کو جیل میں ساتھ رکھ سکے گی؟ بہتر یہی ہوگا کہ وہ آزاد رہ کر جو کچھ کر سکتی ہے کرتی رہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جیل کے لئے بھی تیار رہے۔ یہی بہت کافی ہے۔ باپو کی دعائیں۔" (IBID, P. 151)

غلام رسول قریشی ابھی جیل ہی میں تھے اور آمنہ قریشی ان سے بار بار گرفتاری کی اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے پھر انھیں لکھا:

چرنجیو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ امام صاحب سے علم ہوا کہ تم گرفتاری کے لئے بے قرار ہو۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ خدا کو جب منظور ہوگا بغیر کوشش کے ہی تمہیں یہ موقع بھی ملے گا۔ تم اس کے لئے تیار ہو یہی بہت ہے جب تک یہ موقع آئے تم بچوں کی پرورش کرتی رہو۔ اپنی صحت اچھی رکھو اور گھر پر رہتے ہوئے جو خدمت بن سکے کرتی رہو۔ تم نے خوف وہراس پر فتح پالی ہے۔ یہی کافی ہے۔ باپو کی دعائیں۔ (IBID, P. 346)

آمنہ کے والد امام صاحب کی صحت جیل میں خاصی خراب ہوگئی تھی۔ رہائی کے کچھ عرصے بعد ہی ۹ دسمبر ۱۹۳۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ باپو نے ان کے انتقال پر "نوجیون" (گجراتی) مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء میں ان کے تفصیلی حالات زندگی کے تذکرے میں لکھا "... ہندوستان آنے پر پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوا پھر بڑی بیٹی فاطمہ کا اور اب وہ خود چلے گئے۔ ان کی یادگار اب اُن کی بیٹی آمنہ اور داماد غلام رسول قریشی ہیں۔ دونوں ہی ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مجھے خود اُن کی وفات سے گہرا صدمہ ہوا ہے۔ ان کا انتقال میرے پہنچنے سے پہلے ہی ہوگیا اس کا مزید غم ہے۔"

باپو انھیں تسلّی دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے لیکن مشفق باپ کی جدائی سے آمنہ کے جذبۂ حرّیت کی تڑپ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آخر ان سب خواتین کی بے قراری بھی رنگ لائی جنھیں ڈانڈی مارچ میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی "باپو نے گجرات کی خواتین کو شراب اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے کا حکم دیا۔ گجرات کے کونے کونے سے خواتین نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ریحانہ طیب جی، حامدہ بہن اور آمنہ قریشی بھی ان میں شامل تھیں۔ نوساری، میں آمنہ قریشی کو گرفتار کیا گیا اور انھیں چھ ماہ کی قید ہوئی۔

(نوٹس کشن بھائی ترویدی، متذکرہ)

غلام رسول قریشی کی متعدد گرفتاریاں ننھے منّے بچے، پھر گرفتاری

آمنہ قریشی نے مثالی ستیہ گرہی کا ثبوت دیا۔ باپو نے ایک خط میں انھیں لکھا:

چرنجیو آمنہ۔ مجھے متعدد اشخاص نے لکھا اور بتایا ہے کہ تم بے مثال جرأت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اگر امام صاحب کی بیٹی جس کی پرورش اور تربیت فونکس اور آشرم میں ہوئی ہو ایسا نہیں کرتی تو پھر بھلا ہم کس سے ایسی توقع کر سکتے ہیں؟

(Collected Works, Vol. LIV, P. 252)

تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے حکومت وقت نے لوگوں کی جائدادیں ضبط کرنا شروع کیا۔ باپو نے آشرم کو بھی ضبطی کے لئے پیش کیا لیکن حکومت نے اسے ضبط نہیں کیا۔ گاندھی جی نے آشرم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، آشرم میں مقیم حضرات نے بخوشی یہ فیصلہ منظور کیا اور قریب کے گاؤں میں ستیہ گرہ مارچ کرنے کا ارادہ کیا لیکن یکم اگست ۱۹۳۳ء کو علی الصبح مارچ سے پہلے ہی سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ آمنہ بھی گرفتار ہونے والی تھیں۔ باپو کے کہنے پر وہ غلام رسول قریشی سے جو ان دنوں خود جیل میں تھے اس کی اجازت لے چکی تھیں۔ گرفتاری سے ایک روز قبل ان کے تینوں چھوٹے بچے انوسویا بین کے ہریجن آشرم میں پہونچا دیئے گئے۔ (انوسویا بین احمد آباد کی مشہور مزدور لیڈر تھیں) ولبھ بھائی پٹیل کے نام اپنے خط میں باپو نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ”آنندی اور دوسری لڑکیاں نیز قریشی کے بچے انوسویا بین کی ہریجن بورڈنگ میں ہیں۔ میں نے سوچا ہمارے بچوں کے لئے وہی ایک بہتر جگہ ہو سکتی تھی۔ بچے وہاں بہت خوش ہیں۔“

(Collected Works, Vol. LVI, September 13, 1933 - January 15, 1934 P. 405)

جب جمنالال بجاج نے گاندھی جی سے واردھا آشرم میں منتقل ہونے کا اصرار کیا تو سابرمتی آشرم کو ہریجن فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا گیا اور آشرم کے کچھ پرانے اشخاص کو اس کام کی ذمہ داری سونپی

گئی۔ غلام رسول قریشی کو باہر کے متعلق کام اور آمنہ قریشی کو آشرم کے اندرونی معاملات کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ آمنہ نے اپنے بچوں کے ساتھ آشرم کے سبھی بچوں کی مادر مہربان کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا سنہ ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (نوٹس کشن بھائی ترویدی متذکرہ)

آمنہ قریشی کی بیٹی سلطانہ تنہا آج بھی ہریجن آشرم میں مقیم ہیں۔ اور تیاگ و قربانی کے عہدِ رفتہ کی ایک خوشگوار یاد ہیں۔

فاطمہ عریضی

فاطمہ بیگم عریضی امام صاحب عبد القادر باوزیر کی بیٹی اور آمنہ قریشی کی بڑی بہن تھیں۔ خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ انھوں نے بھی اپنی زندگی کا خاصا عرصہ سابرمتی آشرم میں گزارا تھا۔ نیز آشرم کے مختلف کاموں میں فعال کردار ادا کیا تھا۔

لاہور سے مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے ایستھر فارنگ کے نام اپنے خط میں گاندھی جی نے آشرم کی زندگی کی تشریح کرتے ہوئے ان سے معلوم کیا تھا "کیا فاطمہ کتائی کا کام کر رہی ہیں؟ اگر نہیں تو فاطمہ اور آمنہ دونوں سے کہو کہ اس سے غفلت نہ برتیں انھیں یہ کام ایک مقررہ وقت پر روزانہ کرنا ہے۔ آشرم کی دوسری خواتین کے لئے بھی یہی ہدایت ہے۔"

(Collected Works : Vol.XVI, P. 343)

انھیں کے نام ایک دوسرے خط میں بتاریخ ۲۵ر جنوری ۱۹۲۰ء باپو نے لکھا تھا "نرہاری سے یہ سن کر میں بہت خوش ہوں کہ تمہارا قیام امام صاحب کے ساتھ ہے۔ یہاں تمہیں زیادہ اپنائیت کا احساس ہوگا کیونکہ مستقل انگریزی بولنے کی سہولت رہے گی۔ تمہیں فاطمہ پر اپنی محبت نچھاور کرنے کا بھی

موقع ملے گا جس کے نتائج فوری ہوں گے۔" Ibid : P. 506

فاطمہ بی بی کی شادی ستیہ گرہ آشرم سے ہی ہوئی۔ دعوت نامہ گاندھی جی کی طرف سے تھا۔ کارڈ کی پیشانی پر بسم اللہ لکھی تھی، پھر ستیہ گرہ آشرم، سابرمتی ۲ر اپریل ۱۹۲۰ء درج تھا۔ دعوت نامے کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"عزیز دوست۔ فاطمہ بی بی میرے دوست و بھائی امام عبدالقادر صاحب کی بڑی بیٹی ہیں۔ امام صاحب اور میرا جنوبی افریقہ، ہندوستان میں آشرم اور جیل کا برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ فاطمہ بی بی کی شادی حسین میاں عریضی کے ہمراہ بروز شنبہ ۲۶ر اپریل ۱۹۲۰ء بوقت شام ۷ بجے ہونا قرار پائی ہے۔ ساڑھے چھ بجے میلاد شریف ہوگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ تقریب سعید میں شریک ہوکر دولھا دولہن کو اپنی نیک خواہشات سے نوازیں۔ موہن داس کرم چند گاندھی۔" (Collected Works : Vol. XVII, P. 399

اس شادی کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے "نوجیون" بتاریخ ۹ر مئی ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا، "میں آشرم کی اس شادی اور باہری شادیوں میں فرق کئے بنا نہیں رہ سکتا۔ امام صاحب کا تعلق ایک دیندار اور معزز مسلم خاندان سے ہے۔ دو مختلف مذاہب کو ماننے کے باوجود ہم دونوں ابتدا سے ہی حقیقی بھائیوں کی مانند رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے مذہب کا خلوصِ دل سے احترام کیا ہے۔ ان کے نماز ادا کرنے پر آشرم میں کسی کو اعتراض نہیں ہوا اور وہ ہندوؤں کے طریق عبادت پر کبھی معترض نہیں ہوئے ان کی بڑی بیٹی فاطمہ کی شادی ہوئی ہے۔ فاطمہ بیس سال کی ایک ذہین لڑکی ہے۔ اس کے مشورے کے بعد ہی آشرم کے اصولوں کے مطابق یہ رسم انتہائی سادگی سے ہونا قرار پائی۔ امام صاحب، دولھا بھائی سید حسین عریضی کے عزیز نیز آشرم سے متعلق سبھی افراد مدعو کئے گئے تھے۔ ان کی تواضع گھر میں بنے شربت اور پھلوں سے

کی گئی۔ روشنی کے لئے دیوار پر صرف ایک لیمپ ٹنگا ہوا تھا۔ رسم شادی دو گھنٹہ چلی۔ آدھا گھنٹہ میلاد شریف ہوا۔ پھر قاضی صاحب نے دولھا و دلہن کی موجودگی میں نکاح نامہ لکھا وہ پڑھا گیا۔ پھر اس پر دستخط ہوئے جس میں بیس منٹ صرف ہوئے۔

بعد خطبہ و دعا مہمانوں کی تواضع شربت و پھلوں سے کی گئی۔ دولھا کا لباس بہت سادہ تھا۔ شادی کی رسم جو ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی ساڑھے آٹھ پر ختم ہو گئی فاطمہ بی بی آشرم کے سبھی ساتھیوں سے ملنے گئیں۔ رخصت کا وقت قریب آ رہا تھا۔ یہ نظارہ بڑا اثر کرنے والا تھا۔ فاطمہ رونے لگیں۔ انھیں سمجھایا گیا کہ اب ان کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی آشرم کی تربیت، سچائی، حلیمی سودیشی اور قومی خدمت کے پیغام کو اپنے نئے گھر میں عام کریں"۔ Ibid.

افسوس کہ فاطمہ بی بی کی زندگی نے ان سے وفا نہیں کی اور امام صاحب کی زندگی میں ہی ان کی وفات ہو گئی۔

امینہ طیّب جی

امینہ طیب جی گجرات کے ممتاز سیاسی رہنما عباس طیب جی کی اہلیہ اور بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۶ء اور انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔

(Narish Kumar Jain : Muslims in India, A Bibliographical Dictionary, P. 194)

امینہ طیب جی ابتدا سے ہی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے شوہر کی متعدد گرفتاریوں میں ان کی ہمت بندھائی بلکہ قومی محاذ پر خود بھی آگے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ملاحظہ ہو مہاتما گاندھی کا ایک خط جس میں انھوں نے عبّاس طیّب جی کی سیاسی سرگرمیوں میں ان کی اہلیہ اور بیٹیوں کے کردار کا ذکر کیا ہے۔ خط بنام عباس طیّب جی۔

" آشرم

۱۳ر مئی ۱۹۳۰ء

میرے پیارے دوست۔ آپ کا خط ملا۔ بڑی مسرّت ہوئی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ قومی محاذ پہ مزید کام کے لئے سوچ رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ نے مجھے غلط مبارک باد دی۔ میں صرف آپ کو لاہور تک کھینچ لانے اور زبردست

ذہنی تناؤ کے باوجود آپ کو وہاں رکھنے کے لئے ضرور مبارکباد کا مستحق ہوں آپ نہیں جانتے دوسری صورت میں ہم نے کیا کچھ کھو دیا ہوتا۔ میرا حصّہ اس مبارکبادمیں آپکی بیگم اور دونوں عظیم بیٹیوں کے ساتھ برابر کا ہے۔ جنھوں نے آپ کو لاہور کے لئے آمادہ کیا۔ پھر ہنسی وخوشی روانہ کیا اور ہمت بڑھائی۔ ان لوگوں کی تکالیف اور برداشت کے مقابلے میں، میں صرف ایک چوتھائی مبارکبادہی کا حقدار ہوں "۔

گاندھی جی اور عباس طیب جی کانگریس پنجاب انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں لاہور میں تھے۔ مندرجہ بالا حوالہ اسی کا ہے

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XVII, February to June, 1920, P. 414-415)

قومی محاذ پر امینہ طیب جی کو نیا میدانِ عمل ۱۹۳۰ء میں ملا جب گاندھی جی نے انھیں بیٹی کے ساتھ گجراتی خواتین کی کانفرنس میں مدعو کیا۔

"ڈانڈی!

۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

میری پیاری ریحانہ، میں چاہتا ہوں کہ تم اور والدہ (امینہ طیب جی) مع دیگر افراد کے بروز اتوار یہاں آجاؤ۔ میں گجراتی خواتین کی ایک کانفرنس طلب کر رہا ہوں جس میں شراب اور ولایتی کپڑوں کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی مناسبت اور امکانات پر غور کیا جائے گا"۔

(Collected Works : Vol. XLIII, March - June, 1930, P. 238)

گجراتی خواتین کی اس کانفرنس میں امینہ طیب جی نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر کانفرنس نے لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے جو پانچ نفری کمیٹی بنائی انھیں اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ملاحظہ ہو

کانفرنس کی روئداد:

"گجراتی خواتین کی یہ کانفرنس جو ڈانڈی میں ۱۳ راپریل ۱۹۳۰ء کو منعقد کی گئی گاندھی جی کو سننے کے بعد یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خواتین، شراب اور ولایتی کپڑے کی دوکانوں پر دھرنا دیں گی اور دوکانداروں نیز خریداروں سے درخواست کریں گی کہ وہ ان کی خرید و فروخت سے باز رہیں۔

کانفرنس کا یہ بھی خیال ہے کہ ولایتی کپڑوں کا بائیکاٹ صرف کھادی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس لئے خواتین کا یہ اجتماع یہ عہد کرتا ہے کہ وہ صرف کھادی کا ہی استعمال کریں گی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے باقاعدگی سے سوت کاتیں گی، اپنے پڑوس میں کھادی کی تبلیغ کریں گی۔ پڑوسیوں کو کاتنا سکھائیں گی، اور پابندی سے سوت کاتنے کی ہمت افزائی کریں گی۔

یہ کانفرنس مندرجہ ذیل ممبروں کی ایک مجلس عاملہ بھی مقرر کرتی ہے جو کام کا لائحہ عمل تیار کرے گی اور ضرورت کے لحاظ سے اُسے بدلنے کی بھی مجاز ہوگی۔

مسز امینہ طیب جی	صدر		ممبرس
شریمتی مینتھو بہن	سکریٹری	شریمتی	منی بہن پٹیل
		شریمتی	روہنی دیسائی
		شریمتی	چندو بہن

(Collected Works : Vol. XLIII, P. 271)

یہ طے ہو جانے پر کہ شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکان پر پکٹنگ میں خواتین بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں، مہاتما گاندھی نے امینہ طیب جی کو لکھا۔

"۲۷ راپریل ۱۹۳۰ء

پیاری بہن۔ وائسرائے کے نام جانے والا خط بھیج رہا ہوں برائے

مہربانی دستخط کر کے ڈاک کے سپرد کرنے کے لئے واپس بھیج دیجیے۔

مخلص م۔ک۔ گاندھی

(IBID : P. 347)

وائسرائے کو بھیجے گئے خط کا متن حسب ذیل ہے:

"یور ایکسی لینسی! ہم گجراتی خواتین اب یہ سمجھتے ہیں کہ ملک جس ہنگامی دور سے گزر رہا ہے۔ اس میں ہم موجودہ واقعات سے اپنے کو علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ ہم نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں چل رہی سول نافرمانی کی تحریک سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ ہماری دیہاتی بہنوں نے تو پہلے سے ہی نمک پر عائد پابندی کو توڑنا شروع کر دیا ہے۔

لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم خواتین کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک مخصوص میدانِ عمل تلاش کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں گاندھی جی کے اس خیال میں وزن ہے کہ خواتین غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک میں فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ شراب و نشیلی اشیاء نے بہت سے گھروں کو تباہ کیا ہے اور ولایتی کپڑوں کے سبب ہندوستان کی بہت سی خواتین سے ان کا فالتو اوقات کا روزگار چھن گیا ہے جس کا اوسط سال میں چار ماہ سے کم نہیں پڑتا۔ یہ دو ایسے مسئلے ہیں جن سے مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ متاثر ہیں۔ ان اشخاص سے درخواست کرنے میں جو ان چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں اور ان سے جنھیں شراب اور ولایتی کپڑے کی چاہ کھینچ کر لاتی ہے ہم اپنی کوششوں میں مردوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم خواتین کے کام کرنے کا مطلب ہی پُرامن طریقے پر کام کرنا ہے۔

اپنی تحریک کے آغاز پر ہم ادب سے یہ بھی گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ شراب اور دیگر نشیلی اشیاء کی خرید و فروخت اور ولایتی کپڑوں کی درآمد پہ پابندی عائد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اول الذکر نہ صرف افراد کے جسم و ذہن

تباہ کرتی ہے بلکہ ان کے گھروں کی بربادی کا بھی باعث ہے۔ آخر الذکر اس بدقسمت ملک کے دیہاتوں میں معاشی بدحالی کی ذمہ دار ہے۔

ولایتی کپڑوں کی درآمد سے متعلق دلیل کا اطلاق کچھ حد تک ہندوستانی ملوں میں تیار شدہ کپڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ گو ان ملوں کا پیدا شدہ مال ابھی ضرورت سے اتنا کم ہے کہ کھادی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ اگر وقت اجازت دیتا تو ہم اپنی دوسرے صوبوں کی بہنوں کی خواہشات کی بھی ترجمانی کرتے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے کا ہمیں بخوبی احساس ہے کیونکہ ہم کسی نئے مسئلے پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ قومی تنظیم کانگریس کی وساطت سے پوری قوم کو ان مسائل کا علم ہے۔ ہمارا مقصد بہ نسبت اور دوسرے متعلقہ مسائل کے جو قومی آزادی کے سلسلے میں درپیش ہیں صرف ان دو مسائل پر ہی اپنی خصوصی توجہ مرکوز کرنا ہے اور اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر دینا ہے۔"

ہم ہیں آپ کے تابعدار

دستخط

(Collected Works : Vol. XLIII, PP. 336 - 337)

مندرجہ بالا خط میں چوبیس خواتین کے دستخط ہیں۔ اس میں مسلم خواتین آمنہ قریشی، آمینہ طیب جی اور ریحانہ طیب جی ہیں۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۳۰ء کے "نوجیون" اور ۱۷ر اپریل ۱۹۳۰ء کے "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کر کے گجراتی خواتین نے اہم ذمہ داری سنبھالی ہے اور بیگم آمینہ طیب جی اور ان کی کمیٹی نے خواتین کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی ہے۔ خدا ان کو طاقت دے۔"

عباس طیب جی کی وفات کے بعد گلیڈ مین اُودین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا: "بڑودہ میں

عباس طیب جی سے ملنے کی تم بہت خواہش مند تھیں لیکن افسوس کہ اب وہ نہیں رہے ۔ ان کا تعلق ان غیر معمولی شریف انسانوں سے تھا، جن سے ملاقات میرے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی ۔ لیکن ان کے خاندان سے ملنے کی خواہش تمہیں اب بھی ہونا چاہیئے ۔ وہ سب لوگ انھیں پرانی روایات کے علمبردار ہیں ۔"

(Collected Works : Vol. LXIII, June 1 - November 2, 1936 P. 128)

بیگم سکینہ لقمانی

بیگم سکینہ لقمانی جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں جو انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھے۔ ان کے شوہر مسٹر لقمانی بمبئی کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ سکینہ لقمانی بذاتِ خود مقامی کانگریس شاخ کی صدر تھیں اور قومی سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ مہاتما گاندھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ریحانہ طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ر جولائی ۱۹۳۰ء میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے گاندھی جی نے لکھا۔ "لقمانی کیسی ہیں؟ طیب جی خاندان نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔"

(Collected Works : Vol. XLIV, July - December, 1930, P. 5-2

وِلے پارلے بمبئی میں ۱۸ر مارچ ۱۹۳۱ء کا ایک جلسے میں مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا تھا "آپ لوگوں نے جو سپاس نامہ اور رقم میری نذر کی ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس خوشی میں مزید اضافہ کا سبب چند اور بھی وجوہات ہیں۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے صدر جلسہ نٹ راجن میرے دوست ہیں سپاس نامہ مسز لقمانی نے پڑھا ہے جو طیب جی خاندان سے ہیں جس سے میں محبت کی اٹوٹ بندشوں سے جکڑا ہوا ہوں۔"

(Collected Works : Vol. XLV
1930 - 31, P. 308)

شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹنگ کے سلسلے میں بیگم سکینہ لقمانی نے فعال کردار ادا کیا۔ واضح رہے گجراتی خواتین کی طرف سے جو خط وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اس پر بیگم سکینہ لقمانی کے بھی دستخط تھے۔ بیگم لقمانی شراب کی دوکانوں پر دھرنا دینے کے لئے پانچ سو گز کی دوری پر بیٹھی تھیں۔ ان کی صرف موجودگی کا ہی اتنا اثر تھا کہ خریدار ان دوکان تک پہونچنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ عاجز ہو کر دوکانداروں نے ان پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگایا۔ سکینہ لقمانی گرفتار کرلی گئیں۔ کرلا (ضلع تھانہ) میں اُن پر مقدمہ چلا اور چار ماہ قید بامشقت نیز سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں قید مزید ایک ماہ بڑھ جانے کا حکم تھا۔ بیگم سکینہ لقمانی کی عمر اس وقت پینسٹھ[65] سال کی تھی۔ جرم کی نوعیت، سزا کی سختی اور ان کی ضعیفی، ہندوستان کے طول و عرض میں اس سزا کے خلاف احتجاج ہوا۔ ملاحظہ ہو بمبئی کرانیکل میں شائع ایک خط بنام اڈیٹر جناب:

ہم دیش سیوکائیں اس معزز و محترم دیش سیوکا کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتی ہیں جنھیں اس عمر میں ۴ ماہ قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ مسز لقمانی کا جرم کیا ہے؟ یہ سزا ایک ایسے کام کے لئے ہے جس کام پر ہر ملک و مذہب میں اس شخص کو عزت کا تاج پہنایا جاتا ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی ہو۔ یہ خاتون انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک معزز شخص کی بیٹی ہیں جو بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس بھی رہ چکے ہیں وہ اپنے ایک بدنصیب بھائی کو شراب سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دیش سیوکائیں مادر وطن کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار ہیں۔ اب جبکہ ماں کو کام کرنے سے زبردستی روک دیا گیا ہے۔ ان کی بیٹیاں ان کا کام آگے بڑھائیں گی۔ کل خواتین کے جلوس میں مسز لقمانی نے جو جھنڈا اٹھایا وہ امن و انسانیت کے لئے ہماری مسلسل جدوجہد کا مظہر ہے۔ آپ کی سیوکا۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۰ جولائی ۱۹۳۰ء)

اسی اخبار میں مسٹر جی کے۔این نے احتجاج کیا۔

وحشیانہ و ناعاقبت اندیش: ہندوستانی عوام کا ردعمل مسز سکینہ لقمانی کے معاملہ میں وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ انھیں چار ماہ کی قیدِ با مشقت دی گئی ہے۔ شاید رپورٹ کرنے میں کہیں پر غلطی ہوئی ہے۔ سیاسی قیدیوں کے ساتھ سخت سزا کا حکم سُنائے جانے کے بعد بھی عموماً سختی نہ برتنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اپنے اصولوں پر کاربند ایک مہذب خاتون کو جو جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی بھی ہیں ایسی سخت سزا ہندوستانی رائے عامہ کو بھڑکانے کے لئے کافی ہے ... میں شراب کی دوکانوں پر پکیٹنگ اور مذہب کی آڑ میں جو کچھ کہا گیا اس کے خلاف ہوں۔ لیکن سزا کے وحشیانہ انداز کے مقابلہ میں خاتون کا جرم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ چار ماہ کی قید بامشقت اور سو روپے جرمانے کی سزائیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی عوام کو یہ سند مانگنے کا حق ہے کہ آیا کُرلا کے یہ مجسٹریٹ اس جگہ پر کام کرنے کے لئے بھی موزوں ہیں یا نہیں۔" (IBID)

سزا کی خبر سُن کر بمبئی کی خواتین نے جلوس نکالا۔ پھر مہادیو باغ میں خواتین کی ایک نشست ہوئی۔ مسز ہنسہ مہتا نے اپنی تقریر میں کہا "ایسا نظامِ حکومت جس میں مسز لقمانی جیسی ضعیف خاتون کو پانچ مہینے کی قید بامشقت کا حکم سُنایا جائے۔ جلد از جلد ختم ہونے کا مستحق ہے۔" اس نشست میں یہ بھی طے کیا گیا کہ خواتین کو جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لینا چاہیئے۔ مسز لیلاوتی منکر نے مسز لقمانی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "مسز منشی، مسز لقمانی، مسز پیرن کیپٹن کو جیل بھیج کر جو ہندو مسلمان اور پارسی فرقوں کی نمائندگی کرتی ہیں، حکومت نے یہ مان لیا ہے کہ آزادی کی لڑائی درحقیقت ایک قومی لڑائی ہے جس میں ہندوستان کے سبھی فرقے ایک ساتھ لڑ رہے ہیں۔"

ایک دوسری خاتون اسپیکر نے کہا "جب ہماری مسلم بہنیں جو پردے کے پیچھے زندگی گزارنے کی عادی ہیں اب میدانِ عمل میں آگئی ہیں اور آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار

ادا کر رہی ہیں تو ہم ہندو خواتین جو بیرونی دنیا کی عادی ہیں، پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو شرمندگی کا باعث ہوگا۔ (

(بمبئی کرانیکل جولائی ۱۹۳۰ء۔ تاریخ مٹی ہوئی ہے)

عوامی غم و غصے کے اظہار کے سبب چوبیس گھنٹے کے اندر گورنر (HUDGSON) کے حکم سے سزا کو آسان قید میں تبدیل کر دیا گیا نیز رہنے کے لئے بھی اے (A) کلاس دیا گیا۔ بیگم سکینہ لقمانی دو ماہ جیل میں رہیں اس زمانے میں کانگریس کا کوئی شخص اپنا دفاع خود نہیں کرتا تھا۔ پھر وکلاء کی ایک جماعت نے ان کا مقدمہ لڑا اور ہائی کورٹ نے اُن کی رہائی کا حکم جاری کیا۔

گاندھی جی کی گرفتاری پر بیگم سکینہ لقمانی نے مسلم خواتین کی ایک میٹنگ بلائی یہ میٹنگ بلاواٹسکائی لوج میں بوقت شام منعقد ہوئی صدارت بیگم سکینہ لقمانی نے کی۔ متعدد مسلم خواتین کی تقاریر کے بعد مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

"مسلم خواتین کا یہ جلسہ مہاتما گاندھی کے برت پر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی فوری و غیر مشروط رہائی کی مانگ کرتا ہے۔"

(بمبئی کرانیکل۔ بمبئی منگل ۲۳ فروری ۱۹۴۳ء)

مہاتما گاندھی کی شہادت پر بمبئی کی خواتین نے سوا میل لمبا جلوس نکالا جس کی قیادت باوجود انتہائی ضعیفی کے ہاتھ میں جھنڈا لئے بیگم سکینہ لقمانی کر رہی تھیں بیگم سکینہ لقمانی کا انتقال ۶ر فروری ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

(بمبئی کرانیکل کے تراشے اور بقیہ اطلاعات بیگم سکینہ لقمانی کی پوتی محترمہ یاسمین لقمانی نے مہیا کیں۔)

(154, Jolly Maker Apartments in CAFE PARADE, BOMBAY, 400005
Dated : 28.5.86)

ریحانہ طیبؔ جی

ریحانہ طیب جی کی پیدائش ۲۶ جنوری ۱۹۰۱ء میں ریاست بڑودہ گجرات میں ہوئی۔ وہ مشہور قومی رہنما اور بڑودہ کے جج عباس طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ امینہ طیب جی کی قومی خدمات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر قربانی کا جذبہ انھیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ جنگِ آزادی کی تحریک میں وہ ابتدا سے ہی پیش پیش رہیں۔ تعلیمی حیثیت سے وہ گریجویٹ تھیں۔ انگلش، گجراتی اور اردو ہندی سے بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی کام کیا تھا۔ اپنے خط میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا۔ "اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تم کو جو کام مل گیا ہے سو تو بہت اچھا ہے۔ اب تو ریحانہ اسکالر کہلائے گی۔ آسمان میں اڑے گی اور ہم سب دیکھتے رہیں گے۔" (باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام۔ گاندھی میموریل لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔ ص۔ ۲۹۳)

گاندھی جی کو ریحانہ طیب جی کتنی عزیز تھیں اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں گاندھی جی نے انھیں "بیٹی ریحانہ، استانی صاحبہ، پاگل ریحانہ، شریر لڑکی ریحانہ، چر بجھو ریحانہ، پربیہ ریحانہ، اور بھلی بیٹی" جیسے پیار بھرے

ناموں سے مخاطب کیا ہے (ایضاً) ایک خط کے خاتمے پر لکھتے ہیں "باباجان واماں جان کو آداب اوروں کو بندے ماترم۔ تم کو تھپڑ۔"

(ایضاً مورخہ ۲۳ جون ۱۹۳۲ء ص ۳۳۶)

ریحانہ طیب جی نے بچپن سے صوفیانہ مزاج پایا تھا، شادی نہیں کی۔ اسلامی تصوف اور ہندو فلاسفی پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ ہر ایک مذہب کی سچّائی پر انھیں کامل یقین تھا۔ ان کی عملی زندگی اور عقائد میں مکمل یکسانیت تھی۔ انتہائی روشن خیال تھیں شاردا بل کی حمایت میں پیش پیش رہیں۔ ان کے عقائد سے متعلق گاندھی جی نے لکھا تھا: "بی بی ریحانہ طیب جی کچھ دنوں کے لئے سیوا گرام میں ہمارے پاس رہنے کے لئے آئی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک سچی مسلمان ہیں لیکن ان کے عظیم والد کے انتقال سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن شریف کی اتنی اچھی قرأت بھی کرسکتی ہیں۔ جب "گجراتی ہیرے" عباس طیب جی کا انتقال ہوا تو کمرے کی گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی سسکیوں میں ریحانہ کی قرأت گونج رہی تھی۔ عباس طیب جی جیسے افراد کبھی مر نہیں سکتے۔ ملک کی خاطر ان کی قربانیاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ بی بی ریحانہ گاتی بھی بہت اچھا تھیں اور ہر طرح کے بھجن انھیں یاد تھے۔ وہ روزانہ بھجن بھی گاتی تھیں اور قرآن کی آیتوں کی تلاوت بھی کیا کرتی تھیں۔ میں نے اُن سے آشرم میں کسی کو کچھ قرآنی آیتیں سکھانے کے لئے کہا اور انھوں نے بخوشی ایسا کیا۔

آشرم کے دوسرے افراد کی مانند وہ سب میں ایسا گھُل مل گئی تھیں جیسے وہ ہمیشہ سے اپنی ہوں رہائش کی مدّت ختم ہونے پر ریحانہ واپس چلی گئیں لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی مہک چھوڑ گئیں جو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتی رہے گی۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXV, October 11, 1941 March 31, 1942, P. 281)

ریحانہ طیّب جی گاندھی جی سے متاثر ہی نہیں تھیں وہ ان کے لئے خاندان

ے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے جن سے وہ نہ صرف دل کی بات بلکہ اپنی ہر
ہنی الجھن پر بلا تکلف تبادلۂ خیال بھی کر سکتی تھیں وہ صحت کی ہمیشہ سے کمزور تھیں
ندھی جی نہ صرف علاج کے بارے میں صلاح دیتے بلکہ ذہنی سکون کے لئے روحانی
کا انتظام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے لکھا " جیون کے ساتھ مرن
ھی خدا نے رکھا ہے، اس لئے ہم ایک سے خوش نہ ہوں، دوسرے سے ناخوش
ہوں۔ (لفظ مٹا ہوا ہے) کی دو بازو کی مانند دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جینے
ے موہ میں ہم موت کو الگ و برا مانتے ہیں۔"

(گاندھی جی کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام۔ مذکورہ ۲۱ جون ۱۹۳۲ء ص ۲۸۹)

ان کی علالت کے دوران اگر کچھ دن خیریت نہ ملے تو باپو بے چین ہو جاتے تھے
ودا جیل پونا سے خط لکھا: " پیاری بیٹی ریحانہ۔ میرا کارڈ ملا ہوگا۔ میں نے جو ڈر
تھا وہی ہوا۔ تم نے رواج کر رکھا ہے اس لئے جب تمہارا خط نہیں ملتا تو
ں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اسی حالت میں ابا جان یا اماں جان سے بھی ایک کارڈ
سوا سکتی ہو۔ کیسے بھی میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ۔ بیمار ہوتے ہوئے بھی تمہارے
ھنا۔ کیوں بیمار ہو گئی بہت کام کیا تھا؟ تمہارے تو بیمار ہونا بھی نہیں چاہیئے اب
ھی ہو گی اس کارڈ کا جواب تمہارے دینے کی کوئی زورورت (ضرورت) نہیں
ا جان ایک کارڈ بھیج دیں تو کافی ہوگا۔" خدا حافظ باپو کی دعائیں۔

(ایضاً۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۲۹)

ایک اور جگہ نصیحت کرتے ہیں " کیوں تھوڑا آرام لے کر بالکل اچھی نہیں ہوتی
ھی رہے گی تو کام بہت ہے جو سیوا ہی کرنا چاہتے ہیں ان کو سیوا کی کمی نہیں
ہوتی۔ باپو کی دعائیں۔"

(ایضاً۔ ۲۳ جنوری ۱۹۳۳ء ص ۳۲۱)

ریحانہ طیب جی بہت خوش الحان تھیں کانگریس کے اجلاس اور
اندھی جی کی دعائیہ نشستوں میں قومی گانے اور بھجن گایا کرتی تھیں

احمد آباد میں جب عدمِ تعاون ریزولیوشن پاس ہوا تو وہ سب سے پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے بندے ماترم گایا۔ میٹنگ کی صدارت حکیم اجمل خاں مرحوم نے کی تھی (حقیقی بہن بیگم سہیلہ حبیب، بدر باغ علی گڑھ، گاندھی جی تو ان کے گائے ہوئے بھجنوں کے شیدائی تھے۔ اپنے جیل سے بھیجے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ریحانہ کو خدا تندرست رکھے اور مندرست (من درست) کرے اور رکھے۔ تمہارا بھجن سنے بنا اچھا نہیں لگتا۔ آکر سُنا دو۔ تب بن سکتا ہے اس لئے تمہارے لڑکا بن کر جیل میں آنا ہوگا۔ دیکھتا ہوں مہادو (مہادیو) گا سکتا ہے کیا؟" (گاندھی جی کے خطوط۔ متذکرہ۔ ۴ اپریل ۱۹۳۲ء ص ۲۸۲)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اکثر بھجن اور غزل لکھ کر بھیجتی رہتی تھیں جس کا اکثر خطوط میں تذکرہ ہے۔ ملاحظہ ہو ایک خط: "پیاری بیٹی ریحانہ تمہارا خط اور بھجن ملا ہے۔ بھجن اچھا ہے آج زیادہ لکھنے کا وقت نہیں ہے۔ فاقہ کرنے کا ارادہ تم سب کو پسند آیا ہوگا۔ ابا جان کو تو یہ چیز سمجھنے میں مشکل ہی نہیں ہونی چاہیئے۔ خدا کے نام سے خدا کے کام کے لئے شروع کیا ہے۔ وہ ہی انجام پہونچادے گا۔ مجھے اباجان کی اماں جان کی دعائیں چاہیئے تو کیا بھیجے گی؟ تجھے تو ناچنا چاہیئے کہ خدا نے باپو کو ایسی قربانی کرنے کا موقہ (موقعہ) دیا ہے۔ باپو کے آشیرواد۔" (ایضاً ۱۹ استمبر ۱۹۳۲ء ص ۲۴)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت چالاک لڑکی ہے۔ اپنا بھجن کے لئے مجھے فاقہ کروانا چاہتی ہے۔ میں نہیں کروں گا اور بھجن تو گاکر سنائے گی تب دل کو بھائیگا۔ (بھائے گا) اگر اٹھ جاگ مسافر، میں نہ سنتا تو مجھے ایسا دلچسپ نہ لگتا اگر جیل کی دیوار کے بہار (باہر) سے بھی گائیگی (گائیگی) تو بھی تیری آواز مجھے پہونچ جائے گی۔ باپو کی بہت دعائیں۔" (ایضاً ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۳۳۶)

اکثر وبیشتر بھجن ان کے اپنے ہی لکھے ہوتے تھے۔ اس کا تذکرہ بھی

ندھی جی کے خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً "پیاری بیٹی ریحانہ۔ فاقہ کے بعد یہ پہلا اردو
ط ہے۔ تمہارے بھجن بہت اچھے ہیں۔ فاقہ شروع کرنے کے وقت جو بھجن گایا
تمہارا نہیں ہے تو کیا ہوا آخر ہے تو تم نے دی ہوئی عمدہ چیز۔ ہاں تمہارا ہی ہوتا
مجھے بہت زیادہ اچھا لگتا۔ ٹھیک ہے۔ دوبارا (دوبارہ) جب فاقہ کا
وقہ (موقعہ) خدا بھیج دے گا تب تمہارا ہی بنایا ہوا بھجن مجھے چاہیے۔ آج سے
مجھے تیار کرو۔ باپو"۔

(ایضاً ص ۳۶۔ اس خط پر تاریخ نہیں ہے)

ریحانہ طیب جی کے گائے ہوئے بھجنوں کو یاد کر کے باپو کے دل میں
پیار کا ساگر امڈ آتا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت دن
سے تم کو لکھنا کوشش کر رہا ہوں لیکن وقط (وقت) نہیں ملتا تو تو مجھے بھول
گئی ہے لیکن میں کیسے بھولوں۔ پرسو (پرسوں) بی نانا دتی نے اٹھ جاگ
مسافر گایا۔ اور تمہاری مورت میرے سامنے کھڑی ہوں"۔

(ایضاً، جولائی ۱۹۳۷ء ص ۳۵۹)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اردو سکھانے میں بھی مدد کرتی تھیں۔ گاندھی
جی کے متعدد خطوط میں اس کا تذکرہ ہے جیسے ۔۔۔۔ میں غلطیا (غلطیاں)
بہت کرتا ہوں وہی رخ رکھنا۔ جب تھکان آوے تب درست کرنے کا چھوڑ دو
میں تو ہر ہفطے (ہفتے) میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ شروع کیا ہے اسے
نہیں چھوڑ دوں گا۔ میری استادنی کی عمر خدا دراز کرے۔

(ایضاً۔ ۹ فروری ۱۹۳۲ء، ص ۲۷)

اسی سلسلے کا ایک دوسرا خط۔۔۔۔ اور ریحانہ وہاں بیٹھی بیٹھی کیا
کر رہی ہے کیسی استانی۔ اب حرف اچھے بنانے کے لئے کاپی بوک (بک)
منگوالی (منگوالی) ہے۔ آج کل میں شروع ہو جائیگ (جائے گی)، اردو کتاب
تو پڑ (پڑھ) رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بوجھ بہت اور وقت کم۔ دیکھیں خدا
کے نام سے اور اسی کے کام کے لئے سب کر رہا ہوں وہ چاہے گا وہاں

لے جائے گا۔ تم نے تو گایا ہے۔

ٹک نیند سے انکھیاں کھول ذرا۔ اے غافل رب سے دھیان لگا۔ جو کال کرے وہ آج تو کر۔ جو آج کرے وہ اب کرلے۔ اب کرلینے کی کوشش تو ہو رہی ہے۔ انجام پہونچانا اسی کے ہاتھ ہے (ایضاً ۹ رمئی ۱۹۳۲ء ص ۲۸۸)

یرودا جیل سے ریحانہ طیب جی کے نام ایک خط کے جواب میں گاندھی جی نے لکھا تھا: "اگر میں حروف اچھے نکلے اور غلطی ایک بھی نہ رہے تو کبھی اردو نہیں لکھ سکوں گا۔ مجھے سکھاتی ہے اس کے ساتھ وقت بھی ڈاک سے بھیج دو تو غلطیاں نہیں رہنے دوں گا۔ (ایضاً ۲۳ رجنوری ۱۹۳۳ء ص ۳۲۰)

گجرات میں جب پہلی بار گاندھی جی نے شراب اور ولایتی کپڑوں پر پکیٹنگ کے لئے خواتین کا اجلاس کیا تو خصوصی طور پر ریحانہ طیب جی اور ان کی والدہ جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے امینہ طیب جی کو مدعو کیا گیا تھا۔ وائسرائے کو جو ریزولیوشن اس سلسلے میں بھیجا گیا اس پر ریحانہ طیب جی کے بھی دستخط تھے۔ وہ یوتھ لیگ (کانگریس کے نوجوانوں کی تنظیم) کی صدر بھی تھیں۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے پٹنہ میں ولایتی کپڑا فروخت کرنے والوں کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی تھی۔

۱۹۴۲ء میں ریحانہ طیب جی کو 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کے دوران ایک جلوس میں شرکت کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور دیگر ساٹھ خواتین کے ساتھ ایک سال قید کی سزا ہوئی ان میں سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ ان سب کو سینٹرل جیل ناگپور میں رکھا گیا تھا۔

ریحانہ طیب جی سیاست داں نہیں جنگِ آزادی کی مجاہدہ تھیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ مزاج ابتدا سے ہی صوفیانہ تھا۔ گلیڈس اوڈین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۶ء گاندھی جی نے لکھا تھا "ریحانہ روحانیت میں گہرا اعتقاد رکھتی ہیں"۔ اسی لئے آزادی کے بعد بقیہ زندگی کا کا صاحب

کالیلکر' جنھیں وہ اپنے والد کے جیسا اور سروجنی ناناوتی، جنھیں وہ اپنی حقیقی بہن سمجھتی تھیں، کے ساتھ خاموشی سے گزار دی۔ آخر زندگی تک وہ نہ صرف قومی یکجہتی بلکہ عالمی بھائی چارے کے لئے کام کرتی رہیں۔ ہر روز سینکڑوں اشخاص ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ریحانہ طیب جی جنگِ آزادی کے ان ہزاروں مجاہدوں میں سے ایک تھیں جن کی قومی خدمات بے لوث اور صرف زنجیر غلامی کو توڑنے کے لیے تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے ایک کتاب (THE HEART OF GOPI) کی مصنفہ تھیں اس کتاب کا ہندوستانی نیز کئی غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اور اس کی بہت شہرت ہوئی۔

ریحانہ طیب جی کا انتقال ۱۶ ارمئی ۱۹۷۵ء میں ہوا۔

(انٹرویو سروجنی ناناوتی صدر ہندوستانی پرچار سبھا، سن ندھی راج گھاٹ، ۷ رجولائی ۱۹۸۷ء)

حمیدہ طیب جی

حمیدہ طیب جی گجرات کے مشہور مجاہد آزادی عباس شمس الدین طیب جی کی پوتی اور مجاہدہ آزادی ریحانہ طیب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی پیدائش بڑودہ میں غالباً ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ سینئر کیمبرج کے بعد تحریک آزادی میں شریک ہونے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔

سیاسی خیالات و نظریات میں وہ گاندھی جی اور اپنے دادا شمس الدین طیب جی کی معتقد تھیں۔ "انڈین نیشنل کانگریس اور یووک سنگھ" کی ممبر بھی تھیں۔

انھوں نے اپنے زمانے کی جنگ آزادی کی تقریباً سبھی تحریکات میں نمایاں حصہ لیا۔ مثلاً سودیشی تحریک، شراب کے خلاف ستیہ گرہ وغیرہ وغیرہ۔ حمیدہ طیب جی ایک لاٹھی چارج میں زخمی بھی ہوئیں۔ وہ خواتین کی اس ستیہ گرہ تحریک میں بھی شریک تھیں جسے منتشر کرنے کے لئے گھوڑ سواروں کی ایک ٹکڑی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور جس میں گھوڑ سواروں نے خواتین پر گھوڑے دوڑا دیئے تھے۔

تحریک آزادی کے سلسلے میں انھیں دو بار جیل کی سزا بھی ہوئی۔ ایک بار سول نافرمانی کی تحریک اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں شمولیت کے سبب انھیں گرفتار کیا گیا اور جیل بھیجا گیا۔

سورت: مسٹر عباس طیب جی کی پوتی مس حمیدہ طیب جی اور سورت ضلع کے

پہلے ڈکٹیٹر کنہیا لال دیسائی کی اہلیہ مالویکا دیسائی اور بیٹی مس روہنی دیسائی کو آج خلاف قانون کارروائیوں میں شریک ہونے کی بنا پر سزا دی گئی۔ مسز ڈیسائی کو تین ماہ قید، سو روپے جرمانہ یا ڈیڑھ ماہ مزید قید کی سزا ہوئی۔ مس روہنی دیسائی اور حمیدہ طیب جی چار چار ماہ قید اور ساٹھ ساٹھ روپے جرمانہ یا چھ چھ ہفتے مزید قید کی سزا ہوئی۔ (مدینہ اخبار بجنور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء)

گاندھی جی کے اکثر خطوط میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً مہادیو دیسائی کو اپنے خط مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا: "اولپاڈ مسلمان بستی ہے اس لئے حمیدہ وہاں کام کرے گی۔ کانجی بھائی کی بیٹی بھی وہیں ہے۔"

(Collected Works : Vol. LXIII, P. 250)

۲۷ اپریل ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے امینہ طیب جی کو لکھا کہ "حمیدہ اولپاڈ میں بہت اچھا کام کر رہی ہے۔"

۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں انھوں نے ریحانہ طیب جی کو لکھا: "اب اور دو (اردو) شرو (شروع) ہوتا ہے۔ حمیدہ بہادر لڑکی ہے خدا اس سے بڑا کام لے گا اور اس کو بڑپن (بڑکپن) دے گا۔ بس خدا حمیدہ کو اومر دراج (عمر درازہ) کرے۔ اس بارے میں تم کو بھی دھن داد ہونا چاہیئے کیونکہ حمیدہ آخر میں تمہاری چیلی ہے نہ؟ (ریحانہ طیب جی کے نام باپو کے خطوط (گاندھی میوزیم لائبریری، راج گھاٹ ص ۲۷۵)

ریحانہ طیب جی کے نام ایک اور خط میں باپو نے معلوم کیا: "سنیچر کو سنا کہ حمیدہ چھوٹ گئی۔ یہ ٹھیک بات ہے کیا اگر ٹھیک ہے تو مجھے سب حال لکھے (ایضاً ۱۲ اپریل ۱۹۳۲ء ص ۲۹)

گاندھی جی کے کچھ خطوط براہ راست بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں لیکن ان کی نوعیت ذاتی ہے۔

حمیدہ طیب جی نے انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کے مسٹر پربودھ مہتا (بمبئی) سے شادی کی تھی۔ آزادی کے بعد انھوں نے بقیہ زندگی ایک اچھی شہری خاتون خانہ اور ایک اچھی ماں کی حیثیت سے گزاری (خطوط کے علاوہ معلومات محترمہ سروجنی ناناوتی، صدر ہندوستانی پرچار سبھا، راج گھاٹ نئی دہلی نے مہیا کیں جو اسکول میں محترمہ حمیدہ طیب جی کی ساتھی بھی رہی ہیں اور خود ایک سرگرم مجاہدہ آزادی تھی)

فاطمہ طیب علی

فاطمہ۔ ایف طیب علی کی پیدائش ۲ر نومبر ۱۹۰۲ء میں کیمبے (گجرات) میں ہوئی۔ والد کا نام عبدالعلی تھا جو طیب علی کے پوتے تھے جنھوں نے طیب جی خاندان کی بنیاد ڈالی اور بدرالدین طیب جی صدر کانگریس کے والد تھے۔ شادی بدرالدین طیب جی کے پوتے سے ہوئی ان دنوں کیمبے میں لڑکیوں کیلئے اسکول نہیں تھے اس لئے ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔

فاطمہ طیب علی سیاسی نظریات وعقائد کے اعتبار سے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل سے خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ ابتداء سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ نمک ستیہ گرہ میں بیٹویا، ضلع احمد نگر میں نمایاں حصہ لیا۔ گاؤں کی عورتوں کو کتائی کی تعلیم دی۔ اور کھادی کی تبلیغ کی۔ فاطمہ طیب علی ایک بار گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے سلسلے میں جیل گئیں۔

فاطمہ طیب علی آزادی کے بعد سوشل ورک میں لگ گئیں۔ وڈے لا گاؤں میں صفائی ستھرائی کے لئے بہت کام کیا ان کے گاؤں کو شانی گاؤں کے لئے احمد نگر ضلع میں پانچ سو روپیہ کا انعام بھی ملا ہے۔ اب بہت ضعیف ہیں اطلاعات بذات خود محترمہ فاطمہ طیب علی سب پوسٹ وڈے لا ضلع احمد نگر، مہاراشٹر نے بذریعہ بیگم سہیلہ حبیب، علی گڑھ بذریعہ خط مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء مہیا کیں۔

صوفیہ سوم جی / سعد اللہ خاں

بمبئی کی صوفیہ سوم جی ہندوستانی سیوا دل میں خواتین کے شعبے کی نگراں و منتظم تھیں۔ مرحوم بادشاہ خان عبدالغفار خاں کے خطوط و تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ صوفیہ سوم جی آل انڈیا کانگریس کی عورتوں کے شعبہ کی صدر اور رضا کاروں کی کمانڈر بھی تھیں۔ بادشاہ خان نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۵۸۵ پر لکھا ہے۔

"کانگریس نگر بڑے پیمانے پر تیار تھا۔ سرحد سے کوئی نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ مہر تاج (میری لڑکی)، اور مریم (بڑے بھائی صاحب کی لڑکی) تھیں اور یہ سب (صوفیہ) کے ساتھ لڑکیوں کے کیمپ میں تھیں۔ صوفیہ بمبئی صوبے کی رضا کار لڑکیوں کی کمانڈر تھی اور یہ رضا کار لڑکیاں ذرا پہلے مہمانوں کی خدمت کے لئے آئی تھیں۔ میری لڑکی مہر تاج اور مریم بھی ان رضا کاروں میں شامل تھیں اور سارا دن خدمت کرتی تھیں۔"

(بحوالہ ذاتی خط، سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ء)

صوفیہ سوم جی نے قومی جہد آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اس کی خاطر قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی۔ جنگ آزادی میں ان کی خدمات کا تفصیلی علم تو نہیں ہو سکا ہے تاہم دو خبروں سے ان کی دو بار گرفتاری کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ پہلی خبر ہے: "بمبئی ۱۲ مارچ۔ بمبئی کی مشہور خاتون مس صوفیہ سوم جی رہا ہو گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ

وہ بمبئی چھوڑ دیں۔" مدینہ" اخبار بجنور ۱۷ مارچ ۱۹۳۲ء دوسری خبر: " بمبئی کی مس صوفیہ سوم جی جو ہندوستانی سیوادل میں خواتین کے شعبے کی نگراں اور منتظم تھیں، ہنگامی آرڈی نینس کی خلاف ورزی کے الزام میں کل دوپہر کو بمبئی میں گرفتار کرلی گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ شہر میں داخل نہ ہوں "۔ ایضاً ۹ مئی ۱۹۳۲ء

صوفیہ سوم جی کی شادی ڈاکٹر خان صاحب (سرحدی گاندھی بادشاہ خان کے بھائی) کے عزیز بیٹے سعد اللہ خاں سے غالباً شری جمنالال بجاج کے ایما پر ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو، گاندھی جی کا ایک خط بنام جمنالال بجاج مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء

" معلوم ہوتا ہے تمہیں شادیاں طے کرانے میں خاصی مہارت ہے۔ یہ شادی اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی شادی ہوگی۔ غریب صوفیہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ وہ ایک پٹھان سے شادی کرے گی۔ نہ ہی سعد اللہ خاں کے وہم وگمان میں ہوگا کہ اس کی شریک حیات ایک خوجہ لڑکی ہو سکتی ہے۔ مجھے تمہارا انتخاب بہت پسند آیا دونوں خوش رہیں گے اور صوفیہ اپنی خواہش کے مطابق قوم کی زیادہ خدمت کر سکے گی "۔

شادی کے موقع پر گاندھی کی طرف سے مہادیو دیسائی نے دولھا دولہن کو مبارکباد کے خط میں لکھا :" اگر باپو کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ذاتی طور پر آپ کو لکھتے۔ اب اس مبارک موقع پر ان کی طرف سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے یہ رشتہ آپ کی قومی لگن وقربانیوں کو مزید تقویت دے اور یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن آپ کی ازدواجی زندگی کو زیادہ فعال اور با مقصد بنائے۔ آپ کا مخلص مہادیو دیسائی "۔

(IBID Vol. LXII, P. 182) (ایضاً

مرحوم بادشاہ خان نے اپنی مختلف تحریروں میں ان کا تذکرہ خانم سعد اللہ کے نام سے کیا ہے۔ اور متعدد مقامات پر ان کی قومی خدمات کو سراہا ہے۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۵۶۳ پر انھوں نے لکھا ہے۔" سعد اللہ خاں بمبئی کارپوریشن میں انجینئر تھے۔ ایک خوبصورت مکان بھی تھا۔ صوفیہ جوان کی اہلیہ ہے، بہت خوبصورت واچھی لڑکی ہے اور بے حد قوم پرست اور محبِّ وطن ہے میری بے حد عزت ہی نہیں

خدمت بھی کرتی تھی۔" (بحوالہ ذاتی خط مرحوم خان غازی کابلی، متذکرہ)

بریلی جیل سے "میٹھی صوفیہ" کے نام سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مرحوم بادشاہ خان نے انھیں لکھا تھا:

"جیل میں ملاقات پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ ۲۰ یا ۲۵ منٹوں کی ملاقات کے لئے تکلیف اٹھاؤ۔ بمبئی سے یہاں تک آنے میں پیسے بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔ میں اچھا ہوں اور کسی قسم کی تکلیف مجھے نہیں ہے۔" (ایضاً)

شفاعت النساء بی بی

آپ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب نقشبندی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ مولانا نے اپنی تمام زندگی جس بہادری، قوم پر مرمٹنے کے عزم اور حصولِ مقصد کی خاطر مستقل مزاجی سے سرگرم عمل رہنے میں گزاری وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے اور احترام کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ ہیں "وہ ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے ہماری جنگِ آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔" بی بی شفاعت انھیں کی مانند محب قوم اور پُر جوش مجاہدہ آزادی تھیں وہ جمعیۃ العلماء اور انڈین نیشنل کانگریس کی مخصوص و فعال رکن تھیں۔ شفاعت بی بی اور ان کے خاندان نے جنگِ آزادی میں زبردست قربانیاں دیں مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے صاحبزادگان کی زندگی دار و رسن کی آزمائش کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔

مولانا نے اکثر مجلسوں میں کہا کہ "اگر مجھے اس عالی ہمت خاتون کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو شاید میں اتنا سیاسی کام نہ کرسکتا۔ اکثر رہنماؤں کو خانگی زندگی کی مجبوریوں سے سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ کچھ رہنماؤں کو خوش قسمتی

سے ایسی رفیقہ حیات کا سہارا ملتا ہے جو ان کے سیاسی کردار کو اور بلند کردیتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس رہنما کو اس رفیقہ کا ساتھ نہ ملتا تو ان کی زندگی اور انکا کام ادھورا رہ جاتا۔" غرض مولانا محترم کے لئے شفاعت بی بی کی رفاقت انھیں اثرات کی حامل تھی۔ مولانا اور ان کے صاحبزادگان جیل گئے۔ شفاعت بی بی نے تمام مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کئے انھوں نے ان کا سیاسی کام بھی جاری رکھا" خدا نے اس خاندان کو قوم و وطن کی محبت کی آگ بخشی ہے۔ قید و بند گرفتاریاں، خانہ تلاشیاں، حکومت کی دشمنی بتیس سال تک یہی کھیل رہا۔ لیکن شفاعت بی بی کی چیتون پر کوئی بل تک نہ آیا۔ مولانا سات بار جیل گئے۔ ملاحظہ ہو ان ایام مصائب و آلام کی ایک جھلک اور اس دوران اس مجاہدہ بی بی کی صبر و استقامت کی ایک داستان۔

" مولانا حبیب الرحمن کو ۱۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ قید با مشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ۷ اگست ۱۹۲۲ء کو آپ کی قید کے چھ ماہ پورے ہوجاتے تھے اچانک تاریخ رہائی سے چار یوم پہلے پولیس لدھیانہ جیل میں لے آئی۔ آپ پر دوسرا کیس تیار کر کے مقدمہ چلا دیا گیا۔ اور ایک سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ قید کے ساتھ مولانا پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا آپ نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ ایک شام مغرب کے بعد پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت گھر میں مولانا مرحوم کی اہلیہ اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو کارروائی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتی کہ روزانہ استعمال کے برتن توا اور دست پناہ تک اٹھا لیا۔ زنانہ پولیس کے ذریعہ آپکی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں۔ ۱۶ اگست ۱۹۲۳ء کو آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے

لدھیانہ پہونچے، گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آرہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گزار دیئے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا۔ پھر جہاں پولیس تو اور آتشگیر تک اٹھا کر لے گئی ہو اس گھر میں چور کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی غربت سامان کی ضبطی آپ کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔ آپ نے اپنی اہلیہ کے چہرے پر کوئی شکن نہ پائی بلکہ وہ زندگی کے آخری سانس تک آپ کی معاون رہیں۔"

(مولانا عزیز الرحمٰن جامعی ثم دہلوی : رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی در حدیثِ دیگراں۔ ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

قیام پاکستان کی مخالفت میں انھوں نے کافی کام کیا اور ہمیشہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی مختلف تحریکات سے وابستہ رہیں۔

لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اس جلیل القدر خاندان اور اس علو ہمت خاتون پر بھی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے طوفان میں ان کا بھی کچھ نہ بچ سکا اور تمام خاندان کو انتہائی مجبوری کے عالم میں گھر چھوڑنا پڑا۔ آبائی گھر بھی چھن گیا اور مجاہدینِ آزادی خود پناہ گزینوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ شفاعت بی بی پر اس صدمے کا غیر معمولی اثر ہوا اکثر کہتی تھیں "جلا وطنی ہماری خدمت کا صلہ ہے۔" انھیں لدھیانے سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ جب فسادات انتہائی شدت پر تھے تو بڑے اصرار سے مولانا سے کہا کرتی تھیں "ہم کو لدھیانہ نہیں چھوڑنا چاہیئے ہم کو یہیں مرجانا چاہیئے۔" جب وہ لدھیانے سے بہاولپور پہنچیں تو مولانا سے اکثر کہتی تھیں کہ میں کسی سکھ بہن کا بھیس بھر کر لدھیانہ جاؤں اور اپنا گھر دیکھ آؤں۔ ایک مرتبہ بہاولپور سے لاہور چلنے کی فرمائش کی۔ مولانا کے استفسار پر کہا لاہور لدھیانہ سے بہت قریب ہے۔ لیکن زندگی کے اس موڑ پر بھی انھوں نے نقل وطن کا خیال تک نہیں کیا۔ آخری دنوں میں دہلی آگئیں۔ یہاں جس مکان میں مقیم تھیں اس کی مالکہ واپس

اپنے مکان میں آگئی تھیں۔ اس خبر کو سن کر انھوں نے بڑی بے قراری سے کہا "وہ دن کب آئے گا جب ہم بھی اپنے گھر لوٹ سکیں گے"۔ لیکن افسوس ان کی زندگی میں یہ دن کبھی نہ آیا۔

۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو شفاعت بی بی ہیضہ میں مبتلا ہوئیں۔ اس کے بعد نمونیہ اور بخار کا دور رہا۔ ان کے معالج ڈاکٹر شنکر داس نے ہزار جتن کئے لیکن مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ قدرت کا فیصلہ اٹل تھا یکم جون کی رات کو وہ ہمیشہ کے لئے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ سیکڑوں ہندو سکھ بھائی بھی شریک تھے۔ نماز جنازہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے پڑھائی اور مسجد شاہجہانی کے سائے میں انھیں ان کی آخری آرام گاہ میں پہونچا دیا گیا۔

شفاعت بی بی ایک برگزیدہ ہستی تھیں۔ ان کی دریا دلی بنی نوع انسان سے ان کی محبت جس میں ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تخصیص نہیں تھی، غریب و مجبور انسانوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا، پر وقار زندگی اور ملک و قوم کے لئے مرمٹنے کا مستقل جذبہ، ان کے کردار کی ایسی خصوصیات تھیں جن کی یادوں کے چراغ ان لوگوں کے دلوں میں آج بھی فروزاں ہیں جنھیں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سدا رہے نام اللہ کا (ماخوذ اخبار الجمعیۃ ۵ جولائی ۱۹۴۸ء)

(A BIBLIOGRAPHICAL DICTIONARY OF PROMINENT MUSLIM WOMEN,- AL- KABIR AL-KAUSAR AE PP. 334-335)

اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، در حدیث دیگراں

مرتبہ: مولانا عزیز الرحمٰن جامعی ص ۵، ۶، ۷، ۷۷)

بیگم ماجدہ بانو

بیگم ماجدہ بانو مصطفیٰ احمد صاحب کی صاحبزادی تھیں جن کا تعلق لکھنؤ کے شیخان اودھ خاندان سے تھا۔ ماجدہ بانو کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد دکن میں ہوئی جہاں انکے والد تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ کچھ عرصہ کرامت حسین گرلز انٹر کالج میں ہوسٹل میں رہیں، پھر کشمیری محلہ میونسپل گرلز انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دسویں کلاس کی طالبہ تھیں کہ جناب محمد صدیق۔ ایڈوکیٹ سول لائنز بارہ بنکی سے شادی ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ماجدہ بانو کا خاندان ابتدا ء سے خلافت تحریک میں شریک تھا۔ مرحوم رفیع احمد قدوائی سے تعلقات کی بناء پر کانگریس میں شرکت اختیار کی اور انھیں کی ایماء پر ماجدہ بانو ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی مخالفت میں لکھنؤ کی مسلم کانسٹی ٹیونسی سے کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء کا الیکشن ہندوستانی جنگِ آزادی کی تحریک میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا ملک گیر الیکشن کے نتائج سے یہ اخذ کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کی حامی ہے یا ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح نمائندہ مسلم لیگ ہے یوں تو اس الکشن میں متعدد نشستیں ایسی تھیں جن کو حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور نہ صرف ان کے حاصل کرنے کے لئے روپیہ

ہی پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا بلکہ ہر دو فریق کے لیڈروں نے بقول شخصے پوٹے ٹیک دیئے تھے۔ انھیں اہم نشستوں میں ایک زنانی نشست لکھنؤ کی تھی جہاں انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" کی سالی بیگم ماجدہ اور بیگم انعام حبیب اللہ کا مقابلہ تھا بیگم ماجدہ بانو کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئی تھیں اور بیگم حبیب اللہ مسلم لیگ کی اُمیدوار تھیں۔ عالم یہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما کلام پاک ہاتھوں پر لئے جلسہ گاہ میں اور لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً آجاتے اور کہتے کہ اس وقت الکشن کا سوال نہیں کلام ربّانی کی عزّت کا سوال ہے مولانا شوکت علی مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ مولانا محمد علی کی روح کا واسطہ بھی مسلمانوں کو دیتے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل مولانا شوکت علی بھی پہونچ گئے، ان کے گلے میں کلام پاک پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے میرے بھائی تم مجھے جانتے ہو کہ محمد علی کا بڑا بھائی ہوں آج میرے چھوٹے بھائی کی روح عالمِ بالا سے تمہارے ووٹ کی طالب ہے۔ (از غلام احمد فرقت کاکوروی علی برادران رئیس احمد جعفری۔ ص ۴۷۳۔ ۴۷۴)

ماجدہ بانو نے الکشن کے دنوں میں زبردست کام کیا۔ اس الکشن کے متعلق الٰہ آباد کے روزانہ اخبار لیڈر نے لکھا "ماجدہ بانو کو جو کم عمر خاتون ہیں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ جگہ جگہ برقعے میں جاتی ہیں اور تقاریر کرتی ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی متوسط کلاس اور غریب طبقوں میں برابر بڑھ رہی ہے" لیکن مقابلہ بہت سخت تھا۔ ماجدہ بیگم اکیسو چوہتر ووٹوں سے یہ الکشن ہار گئیں۔

۱۹۳۶ء میں ماجدہ بانو نے آزاد مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف مظاہرے میں بھی حصہ لیا یہ تنظیم چند قوم پرست نوجوانوں نے بنائی تھی۔

۲ار فروری ۱۹۷۴ء میں بیگم ماجدہ بانو کا انتقال بارہ بنکی میں ہوا۔ (بشکریہ جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز مکتوب مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۸ء)

بیگم کلثوم سایانی

مسلمانوں کی خوجہ جماعت کا ایک فرقہ سنی خوجہ ہے جن کی تعداد بہت کم ہے ڈاکٹر رجب علی پٹیل کا تعلق اسی فرقہ سے تھا، ان کا خاندان قومی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ ڈاکٹر پٹیل گاندھی جی کے خصوصی رفیقِ کار اور معالج بھی تھے۔ گاندھی جی اکثر ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ان کی بیٹی کلثوم کی پیدائش ہوئی۔ کلثوم شروع سے ہی اپنے ماحول کے اثر سے قومی وسماجی کاموں میں حصہ لینے لگی تھیں۔ گاندھی جی سے وہ خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ انگریزی وگجراتی بہت اچھی جانتی اور بولتی تھیں۔

انیس سال کی عمر میں کلثوم کی شادی ڈاکٹر جان محمد سایانی سے ہوئی جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رحمت اللہ سایانی کے بھتیجے تھے۔ ڈاکٹر سایانی بڑے نیک دل اور مقبول ڈاکٹر تھے۔ وہ امن کمیٹی کے جسٹس، آنریری مجسٹریٹ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے معالج خصوصی ہونے کے علاوہ دوسرے کئی عوامی اداروں سے بھی منسلک تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ہر طرح سے بیوی کی حوصلہ افزائی کی جس کے سبب کلثوم سایانی کو سیاسی وسماجی میدان میں عملی سرگرمیوں کے اظہار کا مناسب موقعہ ملا۔ اور وہ بڑی لگن وخلوص کے ساتھ کام میں لگی رہیں۔ ۱۹۲۷ء میں وہ ڈونگری میں چرخہ

کلاس کی ممبر بنیں۔ عوامی شعور کی بیداری کی خاطر پیری بین کیپٹن نے "یونٹی کلب" کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۰ء میں بیگم سایانی اس کی سکریٹری مقرر ہوئیں اور ۱۹۳۶ء میں جب پہلی قومی پلاننگ کمیٹی بنی تو بیگم کلثوم سایانی اس کے خواتین کے شعبے کی ممبر بنائی گئیں۔ بیگم سایانی کی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب صوبائی خودمختاری کی بنیاد پر بمبئی میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں کانگریس وزارت قائم ہوئی۔ وزیراعلیٰ بالا صاحب کھیر نے اپنے پروگرام میں تعلیم بالغاں کو خصوصی اہمیت دی۔ بمبئی شہر کے لئے ایک کمیٹی بنی جس کے صدر خود کھیر صاحب اور بعد میں گلزاری لال نندہ صاحب رہے۔ بیگم کلثوم سایانی ۱۹۳۹ء سے اس کی رکن اور بعد میں نائب صدر رہیں یہ کمیٹی آئندہ چل کر سوشل ایجوکیشن کمیٹی میں تبدیل ہوگئی۔

بیگم سایانی تعلیم بالغاں کے پروگرام میں خاص طور سے بمبئی شہر کی مسلمان خواتین کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس میں انھیں متعدد دشوار مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف مسلم خواتین اپنی ناخواندگی سے مطمئن تھیں دوسری طرف کانگریس میں مسلم لیگ کی آپسی رقابت کے سبب کانگریس کی طرف سے کئے گئے ہر کام کو مسلم لیگ شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اسی لئے تعلیم بالغان کی تحریک کو بھی عرصے تک مسلم ماس کانٹیکٹ کی ترکیب سمجھا گیا۔ سیاسی مخالفت کے سبب بعض لوگوں نے متوازی تحریک چلانے کا فیصلہ بھی کیا تاکہ "کھدر پوش" مسز سایانی کے اثرات ختم ہوجائیں لیکن بیگم سایانی نے ہر قسم کی مخالفت کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

بمبئی شہر کے کئی علاقے ایسے ہیں جن میں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے بھنڈی بازار ڈونگری، ناگپاڑہ، مدن پورا، کرلا، ماہم وغیرہ، ان میں شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ بسے ہیں۔ میمن، کوکنی، دکنی مقامی بولیوں کے علاوہ اردو ہی کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں۔ ان ہی کی عورتوں میں تعلیم بالغاں کا کام کرنا تھا۔ مسز سایانی کے نزدیک سب سے پہلا مرحلہ عورتوں کو اکٹھا کر کے انھیں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلانا تھی۔ ان کو کسی ہال یا عام جگہ پر جمع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے مسز سایانی نے ایسے وقت جب کہ

عورتیں نسبتاً فرصت میں ہوتی ہیں۔ بلڈنگوں کی کئی کئی منزلیں طے کر کے فرداً فرداً ان عورتوں سے باتیں کرنا شروع کیا۔ بڑی عمر میں پڑھنے لکھنے کی جھجک دور کی۔ کتابیں پنسل کاغذ، سلیٹ کی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا اور اس طرح مسلسل کوشش کے بعد انھیں آمادہ کیا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ اس کام کے لئے دیا کریں۔ اس ابتدائی کام کے بعد عورتوں کو بلڈنگوں سے باہر کہیں کلاس روم یا کسی اور جگہ لے جانے کی بجائے بلڈنگ ہی میں جہاں کہیں کچھ بھی کھلی جگہ ملی وہیں کلاس شروع کر دی گئی۔ کہیں زینے کا چبوترہ اور کبھی کمروں کے سامنے کا راستہ کلاس روم بن جاتا۔ یہاں تختہ سیاہ، تعلیم کے سامان، ٹیچر وغیرہ کا انتظام کمیٹی کی طرف سے کیا جاتا۔ بمبئی کی بلڈنگیں عموماً تین چار منزل کی ہوا کرتی تھیں۔ موسم کیسا ہی ہو موسلا دھار بارش، شدت کی گرمی، مسز سایانی، ایک مجاہد کی طرح اونچے اونچے زینے طے کرتی ہوئی ان کلاسوں کی نگرانی کرتیں۔ ان عورتوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ نوشت و خواندگی کی اہمیت سمجھاتیں، عام معلومات سے ان کے علم میں اضافہ کرتیں۔" (سید شہاب الدین دسنوی، ایک مجاہد خاتون، کلثوم سایانی ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بیگم کلثوم سایانی کی مسلسل کوششوں کے سبب بمبئی میں تیس سال کے عرصے میں پانچ لاکھ خواتین کو خواندگی کی تعلیم دی گئی جس میں برقعہ پوش خواتین کی تعداد تیس ہزار تھی انھوں نے نو آموز بالغوں کے لئے اردو میں ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنے کا بھی فیصلہ کیا جس کا نام "رہبر" تجویز ہوا، غالباً یہ پہلا اخبار تھا جو نو آموز بالغوں کے لئے نکالا گیا۔ اس کی زبان گاندھی جی کے تصور کی ہندوستانی تھی، مضامین معلوماتی اور ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔" (ایضاً) بیگم سایانی نے اردو رہبر کے ساتھ دیوناگری اور گجراتی رسم الخط میں بھی "رہبر" نکالنا شروع کیا جو ایک انقلابی قدم تھا۔ رہبر ۱۹۶۰ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری بیگم سایانی کی اپنی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب مسز ہنسا مہتا جیل گئیں تو بیگم سایانی آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی ایکٹنگ جنرل سکریٹری مقرر ہوئیں اور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک اس کی باقاعدہ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام

...اس دوران انھوں نے ۶۵۰۰ ممبران سے ۳۲،۵۰۰ تک کی تعداد بڑھانے
...زبردست کارکردگی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ بمبئی کی شہری ایجوکیشن کمیٹی
...سے وہ ۱۹۳۹ء کے آغاز سے ہی منسلک رہی تھیں، نائب صدر مقرر ہوئیں۔
...تعلیم بالغان کے علاوہ بیگم سایانی سماجی فلاح و بہبود کی متعدد تنظیموں کی بھی
...ممبر رہیں مثلاً ممبر مہاراشٹر سوشل ایجوکیشن کمیٹی، صدر بورڈ آف ٹرسٹیز سجن بھائی
...لی گرلس اسکول، ممبر انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نئی دہلی (۱۹۴۰ء میں
...کے آغاز ہی سے) ممبر ہندوستانی پرچار سبھا (۱۹۳۶ء میں اس کے آغاز
...ہی) ممبر انڈین کانفرنس آف سوشل ورک (۱۹۴۷ء میں اس کے آغاز سے ہی)
...ممبر گاندھی اسمارک ندھی بمبئی بورڈ وغیرہ۔

...آزادی کے بعد بھی نئے ہندوستان کی تعمیر میں بیگم سایانی نے ایک فعال کردار ادا
...ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر حکومت نے انھیں متعدد اہم جگہوں کے لئے نامزد
...مثلاً جسٹس آف پیس، نوعمر ملزموں کی عدالت کی آنریری مجسٹریٹ، سنٹرل ایڈوائزری
...آف ایجوکیشن، نیشنل کمیٹی ویمینس ایجوکیشن، قومی یکجہتی کانفرنس نئی دہلی۔
...یو ایڈوائزری بورڈ بمبئی اور بمبئی بورڈ آف فلم سنسر۔

...بیگم کلثوم سایانی نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی جن کی تفصیل درج
...ں ہے۔

...۱۹۵۲ء ورکرس ورک شاپ ایجوکیشن سمینار اور ایکسپرٹ ورک شاپ
فرانس (Loe Breviere)

...۱۹۵۶ء ہندوستانی وفد کی رہنمائی جس نے دو ماہ تک چین کا دورہ کیا۔
...۱۹۵۷ء یونسکو کی تعلیم بالغان کی مشاورتی کمیٹی میں ہندوستان کی نمائندگی پیرس
...۱۹۵۹ء تعلیم بالغان پر سمینار، ڈنمارک۔

ڈنمارک سے واپسی پر بیگم سایانی لندن، پیرس، میونخ، وی آنا، قاہرہ جدہ، مکہ
...ینہ، یروشلم اور کراچی رکتی ہوئی تعلیمی ادارے دیکھتی اور تعلیم بالغان پر لکچر دیتی ہوئی

ہندوستان لوٹیں۔

۱۹۷۰ء میں گاندھی جی کے صلح امن و آشتی کے پیغام کے فروغ کے لئے بیگم سایانی نے گیارہ ممالک کا دورہ کیا اور مختلف تعلیمی اداروں کو دیکھا نیز خواتین کی تنظیموں سے ملاقات کی۔ ان کے لکھے ہوئے چار مضامین، تعلیم بالغان اور میرے تجربات" ہند پاکستان دوستی اور میری کوششیں" "ہندوستانی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار" ہندوستان میں تعلیم بالغان" انڈیا ہاؤس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔

بیگم کلثوم سایانی کی خدمات کو کئی اداروں، انجمنوں اور حکومت کی طرف سے سراہا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں انھیں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۶۹ء میں انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی جانب سے صدر جمہوریہ نے، نہرو لیٹرلیسی ایوارڈ" دے کر عزت افزائی کی۔

۲۸ رمئی ۱۹۸۷ء کو چھیاسی سال کی عمر میں کینسر کے موذی مرض میں یہ فعال مجاہدہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔

مندرجہ ذیل رسائل و میگزین میں بیگم سایانی کی مختلف سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ FEMINA ۱۰ ر جون ۱۹۶۰ء۔

سنڈے ٹائمز آف انڈیا، ۲۸ ر ستمبر ۱۹۶۷ء

ایوز ویکلی، ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

سنڈے اسٹینڈرڈ، ۱۴ ر ستمبر ۱۹۶۹ء

ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۰ ر مارچ ۱۹۷۰ء

ہندوستان ٹائمز۔ نئی دہلی، ۱۱ ر مارچ ۱۹۷۰ء

انڈین ایکسپریس، نئی دہلی، ۱۱ ر مارچ ۱۹۷۰ء

پیٹریاٹ نئی دہلی۔ ۱۱ ر مارچ ۱۹۷۰ء

اسٹیٹسمین نئی دہلی، ۱۱ ر مارچ ۱۹۷۰ء

نوبھارت ٹائمز ۱۶ر مارچ ۱۹۷۰ء
بھارت جیوتی ۲۹ر مارچ ۱۹۷۰ء
الاہرام قاہرہ، ۱۰ر جولائی ۱۹۷۰ء
انڈین نیوز، لندن یکم اگست ۱۹۷۰ء
فری پریس جبلپور ۔ ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء

(Directory of Indian Women Today India International, 1976)

علاوہ ازیں: دیگر معلومات سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی۔ این بنرجی روڈ پٹنہ نے مہیا کیں۔

کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کو

فاطمہ اسماعیل

فاطمہ اسماعیل بمبئی کے ایک مشہور کچھی میمن خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ والد کا نام حاجی یوسف سوبانی تھا۔ ان کے بھائی عمر سوبانی اور عثمان سوبانی ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں پیش پیش رہے۔ چھوٹے بھائی نے گزشتہ جنگ کے دوران میں نیوی کی بغاوت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس خاندان کا شمار بمبئی کے متمول خاندانوں ہوتا تھا۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک میں مالی امداد کے علاوہ ان لوگوں نے عملی حصہ بھی لیا۔ تحریک خلافت کے دوران ان کی والدہ مسز حاجی یوسف سوبانی نے اپنے گھر پانچ سو خواتین کے احتجاج میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستانی دلوں کے بادشاہ کو خیر مقدم کہہ کر ہم بہت خوش ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک مہاتما رشی ہیں، عیسائی انھیں سینٹ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک حریت و مساوات اور جمہوریت کا وعظ کرتے ہیں۔ سنت رسول پر چلنے والے ہیں" (بھارت کی دیویاں تذکرہ ص ۳۲)

فاطمہ نے ۴، فروری ۱۹۰۳ء کو اسی قوم پرور ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کے گھر کی تہذیب حیدر آبادی طرز کی تھی۔ وہ نہایت شستہ اردو اور اچھی انگریزی بولتی تھیں۔ وہ ایک باوقار تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے سینئر کیمبرج اور ۱۹۲۰ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس

کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک دی آنا میں میڈیسن کا کورس کیا جو نامکمل رہا۔ ان کے شوہر ہاشم اسماعیل صاحب کئی سال تک مشرقی افریقہ میں ٹریڈ کمشنر رہے انھیں اردو فارسی کا اچھا ذوق تھا، شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

فاطمہ اسماعیل کی طبیعت میں فرسودہ خیالات اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت تھی جس کا اظہار وہ برملا کرتی تھیں۔ جن دنوں سودیشی کی تحریک چل رہی تھی۔ فاطمہ اسماعیل دیسی صنعتوں کے سامان ریل کے ایک خاص ڈبے میں لے کر شہر شہر پھریں اور ان کی نمایش و فروخت سے سودیشی کا پیغام عام کیا۔

۱۹۳۴ء میں وہ انجمن اصلاح نسواں کی سکریٹری اور ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی سکریٹری مقرر ہوئیں، انھوں نے بمبئی کے مسلم محلوں میں تعلیم بالغان کے لئے بھی بہت کام کیا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی پبلسٹی اور ہوسٹل سکریٹری رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ صوبہ بمبئی کی ویمنس کاؤنسل کی لیبر ذیلی کمیٹی کی صدر بنائی گئیں انھوں نے ملوں کے گرد و نواح کی چالوں میں سماجی بہبود کے مراکز قائم کئے۔ وہ کل ہند دیہی صنعتوں کی تنظیم کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھیں۔ شملہ کی پہاڑیوں میں انھوں نے دستی ملوں کا آٹا و چاول عام کرنے میں بھی نمایاں کام کیا۔

فاطمہ اسماعیل آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۳۴ء کے بمبئی اجلاس اور ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ اجلاس میں شریک ہوئیں۔ اور کھادی، سودیشی نیز، ہندو مسلم اتحاد کے لئے بمبئی شملہ اور مشرقی افریقہ میں مسلسل کام کرتی رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ پلاننگ کمیشن کی ویمنس کمیٹی کی ممبر مقرر ہوئیں۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں نمایاں حصہ لینے کے سبب وہ انڈر گراؤنڈ رہیں۔ اگست ۱۹۴۴ء میں ان کی سات آٹھ سال کی بچی کو پولیو ہو گیا جس کے سبب اس کا پیر مفلوج ہو گیا۔ اس کے علاج کے لئے فاطمہ اسماعیل پورے ہندوستان میں پھریں، امریکہ گئیں مگر اس کا علاج نہ جب تھا نہ اب ہے۔ البتہ اس مرحلے میں اتنا معلوم ہوا کہ اس مرض سے پیدا شدہ خرابی خاص

قسم کی ورزش سے بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ورزش کے وہ خاص طریقے سیکھے اور خود ہی بچی کو ورزش کرانے لگیں۔ یہ کوشش انتہائی صبر آزما ثابت ہوئی مگر فاطمہ اسماعیل دھن کی پکی تھیں وہ ہار ماننا نہیں جانتی تھیں۔ جب انھیں بچی کے معاملے میں کچھ مہینوں کے بعد کامیابی کے آثار نظر آئے تو انھوں نے سیاسی نیز دوسرے کام چھوڑ کر بمبئی کے مشہور سرجن بالیگا کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کے لئے ایک کلنک کھولا۔ گذشتہ عالمی جنگ کے دنوں میں بمبئی کے جنوبی حصے کے ایک میدان میں فوجی ضرورتوں کے لئے ایک شیڈ بنا تھا۔ اس کے ایک حصے میں حکومت نے ان دونوں کو کلینک کے لئے جگہ دے دی۔ اس میں ورزش کے لئے سامان مہیا کئے گئے، معذور بچوں کو لانے کے لئے ایک بس خریدی گئی۔ فاطمہ اسماعیل نے اپنا سارا وقت اس مرکز کے لئے مختص کر دیا عطیات، چندے سرکاری و نیم سرکاری امداد غرض ہر طرح سے انھوں نے اس کے اخراجات کے لئے روپے جمع کئے۔ بیرونی ممالک کے فلاحی اداروں نے بھی مدد پہنچائی لوگوں میں بھی اسکی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ ان معذور بچوں کو ہمیشہ کیلئے اپاہج ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں فاطمہ نے دوسرے سماجی کارکنوں کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کو برسر کار لانے کیلئے ایک سوسائٹی قائم کی وہ نہرو خاندان سے بہت قریب تھیں ان کی سفارش پر حکومت بمبئی نے حاجی علی کے سامنے ایک قطعہ زمین اس سوسائٹی کو دینا منظور کر لیا۔ اس پر ایک اچھی خاصی عمارت بنائی گئی جس کا افتتاح خود وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کیا۔ یہ مرکز آج بھی پولیو زدہ بچوں کو برسر کار لانے میں بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بچے آتے ہیں۔

فاطمہ اسماعیل نے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ معذور بچوں کی بحالی خواتین کے حقوق نیز سماج کے بچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح و بہبود کیلئے انکی کوششیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی! انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہندوستانی

مندوب کی حیثیت سے شرکت کی ۔جسمانی طور پر معذور بچوں کی بحالی کی خدمات کے عوض ۱۹۵۶ء میں انھیں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۷۲ء میں 'دلت متر' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں بیرونِ ملک کے بھی اعزاز ملے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک فاطمہ اسماعیل راجیہ سبھا کی ممبر نامزد رہیں۔ ملک کے مختلف رسایل میں ان پر مضامین لکھے گئے ۔ پیرس سے ان کی سوانح حیات بھی شائع ہوئی ۔

۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو طویل بیماری کے بعد چھیاسی سال کی عمر میں انکا انتقال ہو گیا ایک ممتاز سماجی خدمت گار اور مجاہدہ آزادی کی حیثیت سے ان کے کارنامے نئی نسل کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے اور ان حیات بخش نقوش سے نئی نسلیں زندگی و آزادی کی قندیلیں روشن کر سکیں گی۔

(Directory of Indian Women Today India International, P. 461 1976, P. 383)

نوٹس : جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ)

بیگم سلطانہ حیات انصاری

بیگم سلطانہ حیات نے قوم پرستی وراثت میں پائی ہے۔ ان کے خاندان نے ہمیشہ ہی انگریزی سامراجیت سے ٹکر لی۔ ان کے پر دادا کے والد قاضی ضیاء الدین صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کے شہر قاضی اور کسی سرکاری عہدے پر بھی فائز تھے جس سے انھوں نے بعد میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب بخت خاں، بہادر شاہ ظفر کے انکار کے بعد مایوس ہو کر ہمایوں کے مقبرے سے نکلے تو چڑھتی ہوئی جمنا کے کنارے کنارے شمال کی جانب رُخ کیا اور قاضی صاحب کو اطلاع دی۔ انھوں نے بخت خاں اور ان کی فوجوں کو اپنا بجرا بھیج کر بلایا۔ بجرے کو آگ لگوا دی تاکہ انگریزی فوجیں اسے استعمال نہ کر سکیں۔ اور پھر بخت خاں کو مع ان کی فوج کے فرار ہونے میں مدد دی جس کے سبب ہڈسن نے ان کے گھروں کو مسمار کر دیا تھا۔ کچھ افراد کو توپ سے اڑا دیا گیا تھا۔ ان کے دادا مرحوم قاضی نجم الدین صاحب نے اپنے گھر "قاضی نجم الدین ہاؤس میرٹھ" کا ایک حصہ کانگریس و خلافت وغیرہ کے دفتر بنانے کے لئے مفت دے رکھا تھا نجم الدین ہاؤس میں یہ دفتر ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ ۱۹۲۷ء تک کھادی بورڈ کا دفتر بھی اسی گھر میں تھا۔ قاضی نجم الدین صاحب عرصے تک کبھی شہر کانگریس اور کبھی ضلع میرٹھ کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔

بیگم سلطانہ حیات کے والد قاضی بشیر الدین احمد صاحب ۱۹۱۲ء میں ہلال احمر

میں طبی وفد کے ہمراہ اپنے ذاتی خرچ پر ٹرکی گئے تھے۔ غالباً وہ واحد شخص تھے جو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی بھی بہ آسانی بول سکتے تھے۔ انھوں نے وفد کے مترجم کی خدمت بھی انجام دی۔ آصف علی مرحوم جب دہلی میں گرفتار ہوئے وہ اس وقت صوبہ دہلی کے کانگریس کے سکریٹری تھے انھوں نے قاضی صاحب کو دلی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا۔ ایک عرصہ تک کانگریس میں سرگرم عمل رہنے کے بعد انھوں نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

بیگم سلطانہ حیات نے جس عہد آزادی کی سرگرمیوں کے درمیان آنکھ کھولی اس کے نقوش ان کے دل و دماغ پر بچپن سے ہی بہت گہرے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات و عقائد پر اپنے دادا مرحوم کی چھاپ تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانے کے کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کی بھی ان کے یہاں آمد و رفت تھی۔ مثلاً موتی لال نہرو، سیٹھ چھانی، مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی، مسز کملا دیوی چٹوپادھیائے مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حفظ الرحمان صاحب وغیرہ، ان شخصیتوں نے انھیں ابتدا ہی سے متاثر کیا ان کے گھر کی آئے دن خانہ تلاشی ہوا کرتی تھی۔

بیگم سلطانہ حیات شروع ہی سے کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ جب جب کانگریس کی کوئی تحریک چلی وہ جلسے جلوس میں شرکت کرتی رہیں اور دوسری بہنوں کے ساتھ جھنڈا اونچا رہے ہمارا نظمیں بھی گاتی رہیں۔ خاصی کم عمری میں انھوں نے میرٹھ کی جامع مسجد میں بھی تقریر کی تھی۔

"ہندوستان چھوڑو"، تحریک کے وقت انھوں نے لڑکیوں کی ایک تنظیم بھی بنائی تھی جس کا مقصد ہر ممکن طریقے پر انگریز سرکار کو پریشان کرنا تھا۔ اس چھوٹی سی تنظیم نے جس میں ہندو مسلمان سبھی لڑکیاں شامل تھیں، فرسٹ ایڈ کی ایک جماعت بھی بنائی تھی جس نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں جہاں بھی مرد و عورتوں پر لاٹھیاں پڑیں گی وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے

پہونچ جائیں گی۔ یہ لڑکیاں محکمۂ ڈاک کو پریشان کرنے کے لئے ڈاک میں بغیر ٹکٹ کے خطوط ڈالتی تھیں تاکہ وہ بیرنگ ہو جائیں۔ اس وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ سبھی لڑکیاں وخواتین اپنی عزت وناموس کی خاطر چھوٹے چھوٹے خنجر رکھیں گی۔ سلطانہ بیگم نے اپنے دادا کی مدد سے یہ خنجر بنواکر سیاسی سرگرمیوں میں ملوث خواتین میں تقسیم کئے تھے (حالانکہ اب وہ خودکشی حرام سمجھتی ہیں) سیاسی تحریک کا یہ وہ موڑ تھا جب تنظیم کی لڑکیاں جوش سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن کام کے لئے عملی اعتبار سے میدان بہت کم تھا۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کو سیاست میں براہِ راست حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی ایک قریبی ساتھی ویر بالا جی کا تو اسی سبب دماغ بھی خراب ہو گیا تھا۔ سلطانہ خود بھی بیمار رہیں۔ ان کا وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہوا تھا۔ لیکن کسی سبب گرفتاری عمل میں نہیں آئی ان کے اس زمانے کے احساسات اور کچھ واقعات انھیں کی زبانی سنیئے:

"جب ہمارے گھر سے بدلیسی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹنگ کرنے کے لئے خواتین کی ٹولیاں جاتی تھیں تو میں بہت چھوٹی تھی اور جب بڑی ہو گئی تو پتہ چلا کہ مسلمان لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ہندو لڑکیاں بھی کسی طرح کی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں بس گھروں میں رہ کر جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ کیا گیا۔۔۔۔۔

یہ کوئی ۳۴-۱۹۳۳ء کا واقعہ ہو گا کہ میرٹھ میں بیگم نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم نے بزم خواتین کے نام سے خواتین کی ایک جماعت بنائی اور اس سے ملحق لڑکیوں کے لئے خدمات ملت کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ مسوری کے ایک اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے مجھے پی۔ ٹی۔ آتی تھی۔ چنانچہ میں بیگم صاحبہ کی خواہش کے مطابق "خادمات ملّت" کو پی۔ ٹی کراتی تھی جس میں چھوٹی بڑی سب لڑکیاں شامل تھیں۔ اسی زمانے میں عربک کالج دہلی میں مسلم خواتین کی ایک کانفرنس بہت دھوم دھام سے بلائی گئی۔ جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر سے خواتین آئی تھیں۔ شلاً فاطمہ بیگم صاحبہ مرحومہ محبوب عالم صاحب

نیہ اخبار، کی صاحبزادی لاہور سے، مسز حکیم صاحبہ کلکتہ اور بیگم اعزاز رسول صاحبہ لکھنؤ سے آئی تھیں، میرٹھ سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے اور میری بہن زہرا بیگم صاحبہ کو بھیجا گیا تھا خیال تھا کہ یہ دو روزہ کانفرنس مسلمان خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے منعقد کی جا رہی ہے مگر دہلی آکر مجھے پتہ چلا کہ اس کانفرنس میں مسلم گرلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے اور یہ کانفرنس مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کے اشارے پر بلائی گئی ہے۔ اگر یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو یقین ہے کہ بیگم اسماعیل خاں صاحبہ مرحومہ کم ازکم مجھے نمائندہ بنا کر نہ بھیجتیں۔ کیونکہ میرے خیالات سے سب واقف تھے اور میں اس وقت کانگریس کے جلسوں میں برابر شرکت کرتی تھی۔ کانگریس کی والینٹر لڑکیوں میں شامل تھی اور لاٹھی وغیرہ چلانا سیکھ رہی تھی۔

جب مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا ریزولیوشن پیش ہوا تو میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ جب گرلس فیڈریشن موجود ہے تو مسلم لڑکیوں کے لئے الگ فیڈریشن کی کیا ضرورت ہے۔ چند اور لڑکیوں نے بھی ساتھ دیا۔ یہ بحث پورے دن چلی۔ چاروں طرف سے اتنا زور پڑا کہ ہمارا ساتھ دینے والی لڑکیاں اور خواتین نے ہمارا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ بیگم اعزاز رسول صاحبہ نے سخت ترین طریقے پر ہماری مخالفت کی اور اگلے دن ہم دونوں بہنیں اکیلی رہ گئیں۔ ہماری ساری دلیلوں کا جواب یہ تھا "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ چنانچہ مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن بن گئی اور سارے ہندوستان کے اخباروں میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔"

"میں کانگریس کی تحریکوں میں کھل کر تو سماجی قیود کی وجہ سے نہ آ سکی مگر ہر تحریک کی جس قدر بھی مدد کی جا سکتی تھی کی۔ مثلاً ۱۹۴۱ء جب انفرادی ستیہ گرہ ہو رہی تھی میں اس وقت سیواگرام آشرم میں تھی۔ ایک روز یہ پتہ چلا کہ باپو نے پیارے لال بھائی کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت

دے دی ہے۔ اور وہ اگلے روز صبح سیواگرام آشرم ستیہ گرہ کرنے لئے چلے جائیں گے۔ میں مسز کستوربا گاندھی کی کٹیا میں تھی جو مجھ سے ہمیشہ بہت محبت سے باتیں کرتی تھیں۔ یہ دوستی اتنی جلدی بڑھ گئی تھی کہ اپنا دکھ درد بھی بتاتی تھیں۔ اسی وقت خبر آئی کہ باپو نے یاد کیا۔ میں بھاگتی ہوئی باپو کے پاس پہنچ گئی۔ باپو کے پاس چند حضرات کے علاوہ سردار وٹھل بھائی پٹیل، پیارے لال بھائی بھی بیٹھے تھے اور پیارے لال بھائی کے آگے کچھ مسودات رکھے تھے۔ پتہ چلا کہ پیارے لال بھائی نے صوبہ سرحد میں باپو کے دورے کے متعلق جو مسودہ ہندی میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ بھی کر لیا ہے مگر وہ اشاعت سے پہلے کسی اردو داں کو دکھانا چاہتے ہیں اور یہ کام صبح ان کے جانے سے پہلے پورا ہو جانا چاہیئے اور یہ خواہش باپو کی بھی تھی۔ سردار صاحب بولے اردو آتی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا "تھوڑی سی"۔

سردار صاحب بولے "رات بھر جاگ لوگی؟" مسودہ موٹا سا تھا۔

"پیارے لال بھائی ستیہ گرہ کرنے جا رہے ہیں ان کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے" میں نے کچھ اس طرح کا جواب بڑی عقیدت سے دیا تھا۔

باپو سونے کے لئے اٹھ گئے اور جاتے جاتے فرما گئے کہ یہ کتاب کل چھپنے چلی جاتی تو اچھا ہوتا۔ جاتے جاتے مڑے اور پھر مجھ سے کہا "بہت نیند آئے تو سو جانا"۔ پیارے لال بھائی اور میں باپو کی کٹی میں ہی بیٹھ گئے کیوں کہ یہاں جو لالٹین جل رہی تھی اس میں غالباً تیل زیادہ تھا اور روشنی بھی تھی۔ پیارے لال بھائی نے مجھے اردو مسودہ دے دیا اور خود ہندی کا لے لیا۔ کبھی وہ زور سے پڑھتے تھے اور کبھی میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے تاکہ صبح تک یہ کام پورا ہو جائے۔ بیچ بیچ میں تصحیح بھی کی جا رہی تھی۔ نیند کا جب شدید حملہ ہوتا تھا تو باہر برآمدے میں جا کر منہ دھو لیتی تھی اور پانی پیتی تھی ایک

عجیب ولولہ تھا کہ کتاب ختم کر دوں ۔ ایک ستیہ گرہی کی خواہش اور باپو کا حکم ۔ چنانچہ جب صبح کاذب کا وقت ہوا اور چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تو مسودے کے ایک یا دو صفحے باقی تھے ۔ میں تصحیح کر رہی تھی تو پیارے لال بھائی اٹھ کر باہر چلے گئے باپو اپنی کٹی کے باہر ہی میدان میں سوتے تھے پیارے لال بھائی اس طرف سے گزرے تو مجھے باپو کی آواز آئی ۔

"کتنا کام ہوا ؟"

پیارے لال بھائی نے جواب دیا کہ کتاب پوری ہو گئی ۔ پھر باپو نے یہ بھی سوال کیا کہ میں سوئی تو نہیں تھی "نہیں بہت مستعدی سے کام کیا" ۔ پیارے لال بھائی نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہ میری تصحیح سے بہت مطمئن ہیں ۔ بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی ۔"

"میں نے دوسرا کام انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں یہ کیا کہ مجھے ناگپور میں اپنے دادا ابا قاضی نجم الدین مرحوم کا خط ملا کہ انھوں نے باپو کو خط لکھا ہے کہ ان کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت دی جائے مگر ابھی تک اجازت نہیں ملی ۔ میں اس خط کو لے کر باپو کے پاس گئی ۔ باپو خوش ہوئے ، بولے یہ بتاؤ کہ قاضی صاحب کی عمر کیا ہے ۔ باپو نے ابا جی مرحوم کو بڑی محبت کا خط لکھا مگر ستیہ گرہ کی اجازت نہیں دی ۔ میں میرٹھ واپس چلی آئی ۔ اسی زمانے میں کراچی میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا ۔ اخبارات میں کانگریس کے ایک ریزولیوشن کا ذکر تھا ۔ میں نے باپو کو خط لکھا کہ کانگریس کراچی میں جو ریزولیوشن پاس کر رہی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس نے ستیہ گرہ کو بطور اصول نہیں بلکہ بطور پالیسی اختیار کیا ہے تو یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے وغیرہ ۔

باپو نے جواب میں کارڈ لکھا جو میرے پاس اب تک ہے اور پھر کراچی کے اجلاس کے بعد انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا ۔" کارڈ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۴۲ء میں انھوں نے لکھا "اس بارے میں تمہاری رائے بالکل صحیح ہے" ۔

بیگم سلطانہ کے نام مہاتما گاندھی کا ایک اور خط مندرجہ ذیل ہے۔

"بی بی سلطانہ کو میں نے میرا سوت دیا ہے، اس کو وہ بیچے گی اور اس سے جو پیسے ملیں گے وہ دین بندھو معموریل (میموریل) میں دیئے جائیں گے"۔ موک گاندھی

اس زمانے میں گاندھی جی اردو میں دستخط اس طرح کرتے تھے۔

سلطانہ حیات صاحبہ نے ایک مرتبہ گاندھی جی سے شکایت کی تھی کہ آپ نے کہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہے تو اسے رکھیں، چاہے تو مٹا دیں وہ جس دن اُن سے ملیں وہ گاندھی جی کی خاموشی کا دن تھا۔ شکایت کا جواب انھوں نے لکھ کر دیا۔ "تم نے بحث دیکھی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کر بھیج سکتا ہوں"۔ اس پر سلطانہ نے کہا کہ اردو کے ہر اخبار اور رسالے میں آپ کے اس جملے کو دہرایا جا رہا ہے۔" تو پھر گاندھی جی نے لکھ کر دیا۔ "کیا کیا جائے؟ اخباروں میں بہت سی باتیں غلط لکھی جاتی ہیں۔ اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ"۔ "کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا"۔

مہاتما گاندھی کے علاوہ بیگم سلطانہ حیات کی اردو کے سلسلے میں پنڈت سندر لال جی، راجکماری امرت کور اور پیارے لال بھائی وغیرہ سے بھی خط و کتابت رہی تھی۔

۱۹۴۶ء میں ان کی شادی حیات اللہ انصاری صاحب سے ہوئی جو بذات خود قومی رہنماؤں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بیگم سلطانہ حیات کی تعلیم بی اے تک ہے۔ نیز جرنلزم کی ٹریننگ بھی لے چکی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد سے انھوں نے سیاست سے الگ ہو کر اردو کا کام کرنا شروع کیا۔ اترپردیش کی دستخطی مہم جس نے اردو کی حمایت میں ۲۰ ۱/۲ لاکھ دستخط جمع کئے تھے، بیگم سلطانہ حیات اس کی آفس سکریٹری بھی رہی ہیں۔ اس وقت وہ ریاستی انجمن ترقی اردو اترپردیش کی صدر ہیں۔ انھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا

ہے۔ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں انھوں نے عورتوں کی مشہور جماعت "بزمِ خواتین" کی بنیاد ڈالی۔ جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی شاخیں بھی دوسرے شہروں میں قائم ہو رہی ہیں۔ آزادی سے قبل انھوں نے مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اور آج بھی ہندو احیا پرستی اور مسلم فرقہ واریت سے مقابلہ میں مصروف ہیں۔

(ذاتی انٹرویو بیگم سلطانہ حیات انصاری۔ ۲۴ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ نئی دہلی۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۸۸ء)

ہاجرہ زیڈ احمد

بیگم ہاجرہ زیڈ احمد جو عام طور پر ہاجرہ آپا کے نام سے جانی جاتی ہیں، ۲۲ دسمبر ۱۹۱۰ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ریاست رام پور میں نائب تحصیلدار تھے، والدہ کا نسب روہلکھنڈ کے نواب نجیب الدولہ سے ملتا ہے والد والدہ دونوں روہیلہ پٹھان تھے۔ والدہ کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا، والد کے ساتھ انھوں نے متعدد شہروں میں رہائش اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم قرآن شریف اور اردو فارسی میں ہوئی۔ نوابی خاندان سے تعلق کی بنا پر لاہور کے کوئینز میری کالج میں داخلہ ہوا۔ ہاجرہ بیگم ایک اچھی طالب علم تھیں انگریزی، حساب، اردو اور کھیل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے پنجاب سے میٹریکولیشن امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں ان کی شادی خاندان ہی میں ایک پولیس افسر کے ساتھ ہوئی جن کے ہمراہ وہ گونڈہ، رائے بریلی اور لکھنؤ رہیں۔ ۱۹۳۱ء میں وہ ایک بیٹے کی ماں بنیں اور ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں انھوں نے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔

۷ راگست ۱۹۳۳ء میں اپنے دو سالہ بیٹے کے ساتھ بذریعہ سمندری جہاز لندن گئیں اور ۱۹۳۵ء میں مانٹی سوری کالج سے ٹیچرس کا ڈپلوما حاصل کیا۔

ہاجرہ بیگم، لندن میں سجاد ظہیر اور پرمود داس گپتا کی رہنمائی میں قائم کردہ

طالب علموں کی تنظیم کی رکن بن گئیں۔ سی۔جی۔بی کے واسطے سے رالف فوکس سے رابطہ قائم کیا۔ نیز دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ انھیں مختلف مباحثوں، لکچرس اور عوامی جلسوں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا۔ پارٹی کا لیٹریچر فروخت کرنے نیز چندہ جمع کرنے میں انھوں نے فعال کردار ادا کیا۔ اٹلی میں وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئیں۔ ہندوستانی وفد کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے فاشزم اور جنگ کے خلاف برسلز میں منعقد ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۵ء میں طالب علموں کے ایک گروپ کی ممبر کی حیثیت سے وہ پندرہ دن کے لئے لندن سے روس بھی گئیں غالباً وہ روس جانے والی پہلی مسلمان لڑکی تھیں۔

ہندوستان واپس آنے پر ستمبر ۱۹۳۵ء میں کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ میں ہاجرہ بیگم کا تقرر بحیثیت ٹیچر انچارج جونیر اسکول ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر کے ساتھ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے لئے بہت کام کیا۔ کمیونسٹ پارٹی ان دنوں غیر قانونی پارٹی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے پی۔سی جوشی کے ساتھ جو ان دنوں لکھنؤ میں انڈر گراؤنڈ تھے، پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

۲۰ مئی ۱۹۳۵ء میں پارٹی کی اجازت سے ان کی دوسری شادی مسٹر زیڈ احمد کے ساتھ سجاد ظہیر کے مکان پر ہوئی۔ زیڈ احمد ان دنوں سندھ میں ایک کالج کے پرنسپل تھے۔ پارٹی کی ہدایت پر ہاجرہ بیگم لکھنؤ اور زیڈ۔اے۔ احمد حیدر آباد سے تدریسی کام سے مستعفی ہو گئے اور الہ آباد میں پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ پارٹی کے فیصلے کے مطابق انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کی، لیکن خفیہ طور پر آر۔ڈی۔ بھاردواج کی رہنمائی میں مسٹر زیڈ احمد۔ مسٹر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ انھیں خصوصی طور پر خفیہ پتوں کا ریکارڈ رکھنے، لٹریچر تقسیم کرنے اور پارٹی کے اخراجات کا حساب دیکھنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں عرش دیو مالویہ۔ اوپی سنگال،

رمیش سنہا اور رپی۔ ڈی ٹنڈن وغیرہ کے ساتھ پارٹی کے الہ آباد سیل سے وابستہ کر دی گئیں۔ ایودھیا پرشاد، ارجن ارورہ، سنتوش چند کپور، سنت سنگھ اور دوسروں کے ساتھ یوپی کی پہلی خفیہ کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کی۔ ہاجرہ بیگم پارٹی کی صوبائی کمیٹی میں بھی رہیں اور الہ آباد میں ضلع کمیٹی منظم ہو جانے پر اس کی با قاعدہ رکن بن گئیں۔ بعد میں اس کی سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالا اس وقت صرف چند خواتین ہی ضلع کمیٹی کی سکریٹری تھیں۔

۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر بنے تو انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کئی شعبوں میں تقسیم کیا۔ مسٹر زیڈ۔ اے احمد کو معاشیات کے شعبۂ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ہاجرہ بیگم نے "ماس کانٹیکٹ (Mass Contact" پروگرام کے تحت خصوصی طور پر خواتین میں کام کیا۔ کانگریس کے سبھی ضمنی الکشنوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اور محلہ محلہ جا کر اس کے لئے کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مسٹر ہری کے لئے الہ آباد میں اور ڈائریکٹر اشرف کے لئے فیروز آباد کے الکشن میں فعال کردار ادا کیا۔ پنڈت سندر لال کی رہنمائی میں "امن دستوں" میں شامل ہو کر فرقہ دارانہ فسادات ختم کرانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ہاجرہ بیگم کانگریس کے فیض پور، ہری پورا اور رام نگر کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئیں۔ انھوں نے کچھ عرصہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے سٹی آفس کی سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں ہاجرہ بیگم اور مسٹر زیڈ۔ اے احمد کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کی با قاعدہ ممبر کی حیثیت سے ہاجرہ بیگم نے متعدد عہدوں پر کام کیا۔ ٹریڈ یونین تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواتین کی تنظیموں میں نمایاں کام کیا اور آج بھی ادبی سماجی تحریکات میں پیش پیش رہتی ہیں۔ لینن صدی تقریبات کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء میں پسریم سوویت کے جوبلی میڈل کے اعزاز سے بھی انھیں نوازا گیا ہے۔ (تفصیلات ہاجرہ بیگم نے بذات خود مہیا کیں)

زہرہ انصاری

انڈین نیشنل کانگریس کی جہدِ آزادی میں قربانیوں کی داستان ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اہم کردار کے تذکرے کے بنا مکمل نہ ہو سکے گی جن کے قومی جوش اور مجاہدانہ جذبے کو سیاسی نشیب و فراز قیدِ فرنگ نیز اپنے اور بیگانوں کی خفگی بھی متزلزل نہ کر سکی۔ انصاری صاحب کی غیر معمولی فعال زندگی کے پس پشت شمس النساء بیگم انصاری کا کردار بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ میدانِ عمل میں ان کی برابر کی شریک تھیں۔ گو دائرۂ کار مختلف تھے۔ محترمہ زہرہ انصاری کے بارے میں کچھ تحریر کرنے سے قبل اس ماحول کا جاننا ضروری ہو گا جس میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔

ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے مطابق بیگم انصاری ایک معزز و متمول مسلم پردہ نشین خاتون کا مثالی نمونہ تھیں۔ وہ فارسی، عربی نیز اردو کی عالمہ تھیں اس لئے فرصت کے اوقات مطالعے میں گذارتیں۔ وہ انتہائی نیک اور مخیّر خاتون تھیں۔ پردے کی سخت پابندی کے باوجود مہاتما گاندھی کے سامنے آتی تھیں۔"

Halide Edib; Inside India (London, 1937) quoted in "Muslims and the Congress: P. 312

ڈاکٹر انصاری اکثر و بیشتر گاندھی جی کو پندرہ بیس منٹ کے لئے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے جاتے تھے جہاں وہ بیگم صاحبہ سے ملاقات و گفتگو کرتے تھے۔

Zohra Ansari : Oral History Transcript Part II

Teen Murti Library, New Delhi.

گاندھی جی جب لارڈ اردن سے گفتگو کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھے تو انھوں نے لعنوان "انصاری دھرم شالہ" بتاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کے "نوجیون" (گجراتی) میں بیگم انصاری کے متعلق لکھا تھا۔ "مجھے ڈاکٹر انصاری کی فیاضی کا بخوبی تجربہ تھا لیکن میرے دہلی کے دوران قیام تو اس کی انتہا ہی ہوگئی ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا کہ ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبران ان کے یہاں قیام کریں گے ان کا وسیع و عریض بنگلہ بھی جب اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا تو کمپاؤنڈ میں ہی شامیانوں کا انتظام کیا گیا۔ تقریباً سو اشخاص روزانہ ان کے یہاں کھانا کھاتے تھے۔ ان کی بہت بڑی پریکٹس بھی تھی۔ مختلف مقامات سے لوگوں کے آنے کا تانتا بھی بندھا رہتا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے بحث و مباحثہ بھی جاری تھا۔ اس پر اتنے افراد کی میزبانی لیکن اس مصروفیت کے باوجود میں نے کبھی ڈاکٹر صاحب کو پریشان یا خفا ہوتے نہیں پایا۔ نہ ہی میں نے کبھی ان پر تھکن کے آثار پائے۔ اس غیر معمولی بندوبست کے پس پشت صرف بیگم انصاری کا ہاتھ تھا۔ ایک دن بیگم صاحبہ کی موجودگی میں ہی میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "آپ کس طرح اپنے غیر معمولی فرائض کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کے فرائض بھی ایسی خوش دلی سے انجام دے لیتے ہیں انھوں نے جواب دیا اس کا سہرا صرف بیگم صاحبہ کے سر ہے میں جو کچھ کماتا ہوں انھیں سونپ دیتا ہوں وہ اردو و حساب میں ماہر ہیں۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہیں۔

اور جس طرح چاہتی ہیں خرچ کرتی ہیں۔ اس لئے گھریلو محاذ پر مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ سن کر میں نے فرطِ عقیدت سے اپنا سر بیگم انصاری کے سامنے جھکا دیا۔"

Collected Works: XLV (1930-1931), p.361.

نمبر ایک دریا گنج میں تین علیحدہ باورچی خانے تھے ایک مسلم باورچی خانہ دوسرا سبزی کھانے والے حضرات کے لئے اور تیسرا یوروپین کھانوں کے لئے مخصوص تھا بیگم انصاری سبزی والے باورچی خانے کیلئے اتنی محتاط تھیں کہ انھوں نے کبھی مسلم باورچی خانے کے برتن وہاں لے جانے کی اجازت نہیں دی ایک پنڈت جسے روزانہ کا راشن اور دیگر ضروریات کی اشیاء دی جاتی تھیں وہی علیحدہ ملازموں کے ساتھ سبزی والے حضرات کو کھانا کھلاتا تھا۔ بیگم ایک اعلیٰ درجہ کی منتظم اور میزبان تھیں۔

بیگم انصاری سیاسی عقائد کے اعتبار سے بھی انصاری صاحب کی ہم عقیدہ تھیں مثلاً "دہلی ویمنس خلافت کمیٹی کی سربراہ بیگم اجمل خاں اور بیگم انصاری نے بی اماں کے دورانِ ملاقات خواتین کی آٹھ نشستوں کا اہتمام کیا اور دو ہزار سے اوپر چندہ جمع کیا۔"

Gail Minault: The Khilafat Movement, p.150.

ڈاکٹر انصاری قومی سیاست میں جتنا سرگرم تھے اتنا ہی مشغول اپنی پریکٹس میں بھی تھے۔ اس زمانے میں ان کی ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی بیگم انصاری نے کبھی ان کی غیر معمولی مصروفیت کا شکوہ نہیں کیا بلکہ اندرونِ خانہ انھیں ہر ممکن سکون، تعاون اور فرصت مہیا کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ملک و قوم کو جو کچھ دیا اسکے پس پشت بیگم انصاری کا کتنا اہم کردار تھا اس احساس کے پیشِ نظر ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے ان کے انتقال پر ان کی بیٹی کو دیئے گئے اپنے تعزیتی تار میں لکھا تھا "آپ کے والد نے اپنی حیات میں جو کچھ حاصل کیا وہ صرف آپ کی والدہ کے سبب ہی ممکن ہو سکا"۔ یہ خراجِ عقیدت ایک ایسے انسان کی طرف سے تھا جو سیاست اور پیشہ دونوں ہی اعتبار سے انصاری خاندان سے انتہائی قربت رکھتا تھا۔

Zohra Ansari : Oral History transcript
Teen Murti Library, New Delhi.

بیگم انصاری کا انتقال ۱۹۳۸ء میں انصاری صاحب کے دو سال بعد ہوا۔

زہرہ انصاری ڈاکٹر انصاری کی بھانجی اور گود لی ہوئی بیٹی تھیں۔ ان کی محبت انصاری صاحب کی بڑی کمزوری تھی جس کا اعتراف انھوں نے شوکت اللہ انصاری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۴ء میں بھی کیا ہے۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا "میری غیر موجودگی میں بیگم انصاری، زہرہ اور قدسیہ کا قیام زیادہ تر دہلی میں ہی رہے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ماہ اگست میں جب اسکول بند ہوں یہ لوگ کسی پہاڑی مقام یا کم از کم حیدر آباد دکن ہی چلی جائیں لیکن زہرہ کو اپنے اساتذہ سے اتنی لمبی رخصت ملنا مشکل ہے خصوصاً کیمسٹری اور انگریزی کے استادوں کی خواہش ہے کہ انھیں تعطیلات میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہیئے۔ خود زہرہ کی بھی یہی خواہش ہے مجھے ان کی صحت کی طرف سے فکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دو ماہ کی تعطیلات کے بعد وہ اپنی پڑھائی بہتر طور پر کر سکینگی لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو زہرہ میری کمزوری ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیئے میں نے کہدیا ہے کہ وہ اپنی اماں جان اور قدسیہ کے ساتھ اس وقت تک کے لیئے چلی جائیں جب تک تعلیم کا نقصان نہ ہو۔"

Mushirul Hasan: Muslims and the Congress, p.155.

(بعد میں انھیں شوکت اللہ انصاری کے ساتھ جو ڈاکٹر انصاری کی بہن قمر النساء کے بیٹے تھے ان کی شادی ہوئی)

"زہرہ انصاری" "دارالسلام" (ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دہلی رہائش گاہ کا نام جس کے معنی ہیں امن و سلامتی کا گھر، اسلام کا گھر) کی پروردہ تھیں اور اس کی تمام روایتیں انھوں نے وراثت میں پائی تھیں۔ ترکی کی ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے ان کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا! "ان کی زندگی میری ۳۵ سال قبل کی زندگی کا ایک عکس ہے وہ اتنی منفرد شخصیت کی مالک ہیں کہ اسے بیرونِ پردہ یا اندرونِ پردہ، کسی ایک خانے میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ گو "دارالسلام" کا طرزِ معاشرت قطعاً مشرقی ہے تاہم بیگم انصاری اپنے شوہر یا دیگر افراد کے مغربی انداز میں کبھی مخل نہیں ہوئیں۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں۔ اسی لئے نوجوان

زہرہ کو آزاد زندگی کے منازل طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ۔ وہ کھانے میں شریک ہوتی ہیں لیکن جب مہمانِ خصوصی مدعو ہوں ۔ ساڑی پہننے میں انھیں قطعاً کسی دشواری کا احساس نہیں۔ موٹر اسی اعتماد سے چلاتی ہیں جیسے کوئی امریکن لڑکی انھیں اپنے ملک کے تمدن اور سیاسی مسائل سے انتہائی دلچسپی ہے ۔ ایک مسلمان لڑکی کو آئندہ زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنے میں ان کا ماحول انتہائی صحت مند ہے...... زہرہ کو میری ہی طرح تاریخ و ادب سے دلچسپی ہے جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لئے باعثِ سکون بھی ہے ۔ زہرہ کو یقین ہے کہ لوگ جس عبوری دور سے گذر رہے ہیں وہ ان کے لئے سبق آموز بھی ہے۔ زہرہ کو اپنے ملک کی تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ لیکن ایک نوجوان رومانی تخیل کے باوجود ان کے فیصلے جذبات سے متاثر نہیں ہوتے۔ شاید مسلمان ہونے کے سبب انھیں نہ احساس برتری ہے ۔ نہ احساس کمتری۔ وہ مسلمانوں کو کوئی غیر قوم نہیں سمجھتیں جس کی ایک اجنبی زمین میں پیوندکاری کی گئی ہو اور اب وہ اس کا مقدر بن چکی ہو۔ وہ ہر اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کی زندگی میں اشوک کی اتنی ہی تاریخی اہمیت ہے جتنی ہمایوں اور بابر کی۔ میرا قیاس ہے کہ جامعہ کے اساتذہ کی قربت نے ان کے زاویۂ نظر کو متاثر کیا ہے"

"میں ان کی صبح کی آمد کی منتظر رہتی تھی۔ وہ اکثر دہلی کی سیاحت میں میرے ساتھ ہوتی تھیں ۔ دہلی کی یادگار تاریخی عمارتوں کو انھوں نے میرے لئے ایسا جیتا جاگتا روپ عطا کر دیا تھا جس کے بغیر وہ شاید میرے لئے پتھروں کا ایسا ڈھیر ثابت ہوتے جنھیں محض خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہو۔ وہ ان تمام افراد سے وابستہ روایتوں سے بھی باخبر تھیں جن کی زندگی ان کھنڈرات سے سے منسلک تھی"

Halide Edib, Inside India (London, 1937) quoted in

"Muslims and the Congress: p.313-314.

ملکی سیاست سے زہرہ انصاری کو گہری دلچسپی تھی۔ گاندھی جی سے ان کی قربت اور ان کے مسلک کی ہم آہنگی کا اندازہ کئی خطوط سے لگایا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل ایک خط:

" ۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

پیاری بیٹی زہرہ۔ تمہارے دونوں خطوط ملے، خدا کے فضل سے میری صحت بہتر ہو رہی ہے۔ میرا برت خدا ہی کی طرف سے تھا، اسی نے مجھے بحفاظت بچا لیا۔ آؤ ہم سب ہندو مسلم اتحاد کے لئے دعا کریں۔ جب تک یہ مقصد پورا نہ ہو جائے مجھے سکون میسر نہیں ہو سکتا۔ مجھے ابا جان کے خطوط بھی ملتے رہے ہیں۔ تمہیں اب میری اُستاد بننا بھی قبول کر لینا چاہیئے۔ تمہارے خطوط سے میں اپنے سبق کا کام بھی لیتا ہوں۔ چند ہی افراد مجھے اردو میں خطوط بھیجتے ہیں لیکن تمہاری جیسی خوبصورت تحریر کسی کی نہیں۔ اسی لئے تمہارے خطوط بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ باا س وقت پورے دن کے لئے میرے ساتھ ہیں، سردار اور مہادیو بھی ہیں۔ اباجان سے سلام کہنا۔ میری طرف سے ڈھیروں دعائیں۔ گاندھی"

Collected Works: Vol.LI, p.185.

ایک اور خط ڈاکٹر انصاری کے نام:

" یرودا سنٹرل جیل

۲۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء

پیارے ڈاکٹر انصاری! زہرہ اور میری خط و کتابت پابندی سے جاری ہے تمہیں اس کی تدریسی استعداد پر اعتبار ہو یا نہ ہو لیکن میری اردو ٹھیک کرنے کے لئے تو وہ بہت محنت کر رہی ہے۔ مجھے جتنے لوگ اردو میں خطوط بھیجتے ہیں کسی کا خط اس سے بہتر نہیں۔ مجھے ہر ہفتے اس کے خط کا انتظار رہتا ہے مجھے اس کی لفظی بندش پسند ہے ہم سب کی طرف سے پیار مخلص م۔ک گاندھی۔

Ansari's Letter Vol.13. Zakir Husain Library, Jamia Millia Islamia, New Delhi.

گاندھی جی کی شخصیت نے زہرہ انصاری کو لڑکپن سے ہی متاثر کیا تھا۔ مدراس کے اجلاس ۱۹۲۷ء سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: گو میں ان دنوں خاصی کم عمر تھی تاہم اس زمانے کی اتنی یاد ضرور ہے کہ میں ہمیشہ ان والنیٹرس کے ساتھ رہتی تھی جو ہمارے خیمے سے کانگریس پنڈال میں جایا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ وہاں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی اور ان کے ساتھ ہی خیمے میں واپس آتی تھی۔ جہاں ہمارا قیام تھا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part II

گاندھی جی جب ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے ساتھ دارالسلام میں مقیم تھے ان دنوں کے تذکرے کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا "میں ان دنوں اسکولی طالبہ تھی لیکن میں جب بھی اسکول سے واپس ہوئی میں نے اپنا گھر مہمانوں سے بھرا دیکھا۔ میں نے باپو کی دعائیہ نشست کبھی نہیں چھوڑی رام دھن میں مجھے خاص لطف کا احساس ہوتا تھا" (Ibid)

کنچن ایم۔ شاہ کے نام واردھا سے گاندھی جی کے خط مورخہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۹ء سے زہرہ انصاری کے آشرم میں قیام کی بھی اطلاع ملتی ہے۔

"چر نجیو کنچن! تمہارا خط ملا۔ تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ جلد آجاؤ۔ منالال ابھی واپس نہیں لوٹے۔ باورچی خانہ امت السلام دیکھ رہی ہیں۔ زہرہ ان کی مدد کرتی ہیں۔ یادھلی ہیں۔ کانو راجکوٹ چلے گئے ہیں"۔ باپو کی دعائیں۔

Collected Works: Vol.LXXI, p.35.

زہرہ انصاری جنگِ آزادی میں جیل جانے کی بھی خواہش مند تھیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل خط سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۹؍جون ۱۹۴۱ء

"بیٹی زہرہ! تمہارا خط ملا۔ فرید بھائی نے لکھا ہے کہ تم ان کی والدہ کی بہت اچھی تیمارداری کر رہی ہو۔ خدا تمہارے لئے بہتر ہی کرے گا۔ تھوڑا صبر سے

کام لو۔ ایک دن میں ضرور تمہیں جیل جانے کی اجازت دوں گا۔ امید کہ شوکت بخیریت ہوں گے۔ بچوں کو پیار باپو کی طرف سے دعائیں۔"

Collected Works: Vol.LXXIV, p.131.

(وہ جیل گئیں یا نہیں اس کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں)

"دارالسلام کے سلسلے میں بھی ان کی قربانی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں اس گھر کی اہم تاریخی حیثیت ہے۔ اس میں نہ صرف کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کا قیام رہا ہے بلکہ اس زمانے کے سبھی علمائے کرام کی میزبانی کا بھی اسے شرف حاصل رہا ہے۔ کانگریس اور سوراج پارٹی کی اہم نشستیں بھی یہاں پر ہوئی ہیں۔ زہرہ انصاری صاحبہ کے بیان کے مطابق اس گھر کو اسی انداز پر قائم رکھنا ہمارے لئے بڑا مشکل تھا۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائیں اور "دارالسلام" کو کرائے پر اٹھادیں۔ ہمارے دوستوں کا مشورہ تھا کہ اسے ہم انجمن ترقی اردو کو دے دیں۔ لیکن اچانک ۱۹۴۶ء میں الکشن کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میرے شوہر نے محسوس کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت ہے مسلم لیگ سے مورچہ سخت ہے اور پیسوں کا انتظام انتہائی دشوار۔ میں نے اس وقت اپنے شوہر کی مدد کی اور ورثے میں ملے اپنے اس گھر کو جس کا رقبہ بارہ ہزار اسکوائر یارڈ تھا فروخت کر کے اس رقم سے یوپی میں الکشن کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part I

ان کا انتقال ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء میں انگلینڈ میں ہوا۔ اور وہیں پر تدفین ہوئی۔

مائی بخت آور

مائی بخت آور ایک سندھی کسان خاتون تھیں۔ شوہر کا نام ولی محمد لاشاری تھا۔ لاشاری گاؤں ضلع تھرپارکر سندھ میں واقع ہے۔ زمینداری ظلم و استبداد برطانوی آمریت کے نظام کا ایک جزو لاینفک رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، زمیندار کے آدمیوں نے لاشاری کے کسانوں کے اناج پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تو اور گاؤں والوں کے ساتھ مائی بخت آور نے بھی بڑی بہادری سے مزاحمت میں حصہ لیا۔ پولیس نے نہتے کسانوں پر فائرنگ کی اور ۲۲ جون ۱۹۴۶ء میں مائی بخت آور اس فائرنگ میں شہید ہوگئیں۔ ان کے آخری الفاظ تھے "دیکھو وہ ہمارا اناج نہ لے جاسکیں"۔ اس فائرنگ میں ان کے شوہر بھی زخمی ہوئے۔ لاشاری گاؤں میں مائی بخت آور کی شہادت کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ہری کمیٹی ہر سال ان کی یادگار مناتی ہے۔ اسی زمانے کے مشہور سندھی شاعر شیخ ایاز نے ان پر ایک نظم لکھی تھی جو آج بھی عوام میں مقبول ہے۔ اس میں کہا گیا تھا "ہمیں موت کے سائے میں آگے بڑھنا ہے، ہماری محبوب ماں بخت آور نے اپنا خون بہایا ہے وہ فردوس بریں سے انھیں سلام بھیجتی ہے جو اس کے نصب العین پر چل رہے ہیں۔ مائی بخت آور کا خون بھی منصور کی مانند "انا الحق" پکارتا ہے۔

مشہور سندھی ادیب منیر مانک نے "شہید بخت آور" کے نام سے

۱۹۶۷ء میں ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی دورِ حکومت میں ۱۹۴۲ء کی "حر" تحریک میں بھی کئی سندھی خواتین شہید ہوئیں۔ ان سے متعلق تفصیلی معلومات ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

(بشکریہ سندھی ادیب جناب اے۔ جے۔ اتم۔ بی۔ ۹ ستیلا دیوی روڈ، سندھی نواس، ماہم بمبئی، ذاتی انٹرویو ۲۳ر جولائی ۱۹۸۶ء)

ماجدہ حسینہ بیگم

غیر معمولی جرأت اور نصب العین میں اپنے کو جذب کر دینے والی ماجدہ حسینہ بیگم کلکتہ کے نچلے طبقے کے عوام کے حقوق کی علمبردار تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جیل گئیں رہائی کے بعد پھر پولیس کے مظالم، سماجی عدم مساوات اور مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئیں۔

(SHANTIMOY RAY : FREEDOM MOVEMENT AND INDIAN, MUSLIMS, People's Publishing House, P. 84)

ظہیرہ بیگم - سلطانہ بیگم

'ابھو دایہ' نے اپنی اشاعت بتاریخ ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء، بنگال میں پہلی بار دو مسلم خواتین کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ ظہیرہ بیگم و سلطانہ بیگم دونوں پروفیسر عبدالرحیم ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صاحبزادیاں ہیں۔ انھیں شراب و ولایتی کپڑوں کی دوکانوں کے سامنے دھرنا دینے پر گرفتار کیا گیا ہے۔

Women in India's Freedom Struggle : National Archives, New Delhi P. 13

فاطمہ بیگم

فاطمہ بیگم پنجاب کانگریس کی بڑی فعال رکن تھیں۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک کانگریس کے ماس کونٹیکٹ (Mass Contact) پروگرام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہر ضلع کانفرنس میں شریک ہوتی تھیں اور جلسوں کو مخاطب کرتی تھیں
(ڈاکٹر ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا)

بیگم صفیہ عبدالواجد

۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو صفیہ بیگم کی پیدائش بمقام (اٹیہ) یوپی ہوئی۔ ان کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ والد ڈپٹی کلکٹر اور نانا ڈسٹرکٹ جج تھے۔ ان کا خاندان ایک روشن خیال خاندان تھا۔ سیاسی نظریات میں وہ اپنے ماموں مولوی سید عبدالودود سے متاثر تھیں۔ صفیہ بیگم نے بی۔اے ازابیلا تھوبرن کالج سے کیا اور ایم اے ایل۔ٹی کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کے شوہر مولوی عبدالواجد بریلی کے مشہور وکیل اور ممتاز قوم پرست رہنما تھے۔ وہ یوپی بورڈ برائے مرکزی وصوبائی اسمبلی الیکشن" کے سکریٹری بھی تھے۔ صفیہ بیگم ان کی قومی کارکردگی میں برابر کی شریک تھیں۔ ابتدا سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں خفیہ سرگرمیوں کی سزا میں انھیں گورنمنٹ گرلز انٹر کالج کی لکچررشپ سے برطرف کر دیا گیا۔

گاندھی جی کی خواہش تھی کہ وہ پردہ ترک کر دیں اور پبلک محاذ پر کھل کر سامنے آئیں۔ مولوی عبدالواجد چاہتے تھے کہ وہ صرف بریلی میں برقعہ استعمال کریں لیکن صفیہ بیگم کا اصرار تھا کہ اگر پردہ ترک کیا تو پھر کبھی برقعہ کو ہاتھ نہیں لگائیں گی اور انھوں نے یہی کیا بھی۔ تحریک آزادی میں ان کی خدمات کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں انھیں یوپی اسمبلی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ دیا گیا۔ وہ الیکشن

میں کامیاب ہوئیں اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک ممبر قانون ساز اسمبلی کی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صفیہ بیگم بڑی پرلطف و پرکشش شخصیت کی مالک ہیں۔ آج کا ہندوستان ان کے خوابوں کے ہندوستان سے قطعی مختلف ہے اس کا انھیں شدت سے احساس ہے۔

ضعیفی کے باوجود وہ آج بھی فعال ہیں اور سماجی خدمات میں مشغول رہتی ہیں۔ وطن عزیز کے لئے اپنی نیز اپنے خاندان کی نمایاں خدمات کے باوجود ان کی خودداری طبیعت نے مجاہدینِ آزادی کو دی گئی پنشن کو قبول نہیں کیا۔

(بشکریہ مکتوب بیگم صفیہ عبدالواجد مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء،
۶۹ آواس وکاس، سول لائنز بریلی)

ضمیمہ نمبر (۱)

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ محمد علی پنجاب میں

دورہ کا نظام نامہ

تاریخ	مقام	روانگی از مقام		آمد بوقت	
۲۹-۸-۱۹۲۲	امرتسر	لاہور	۸.۲۴ دن	امرتسر ۹.۲۹ دن	ریل
۳۰-۸-۱۹۲۲	”	قیام امرتسر			
۳۱-۸-۱۹۲۲	گجرات	امرتسر	۷.۳۹ دن	گجرات ۱۱.۴۶ دن	ریل
۱-۹-۱۹۲۲	جہلم	گجرات	۷.۰۰ دن	جہلم ۹.۰۰ دن	موٹر
۲-۹-۲۲	راولپنڈی	جہلم	۱.۴۲ رات	راولپنڈی ۶.۱۸ دن	ریل
۳-۹-۲۲	”	راول پنڈی قیام			
۴-۹-۲۲	پشاور	”	۱.۳۷ دن	پشاور ۶.۵۰ شام	ریل
۵-۹-۲۲	پشاور		شام ۵.۲۰	” ”	”
۶-۹-۲۲	میانوالی	”	”	میانوالی ۶.۴۰	”

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

شہر انبالہ میں ام الاحرار و بیگم محمد علی کا وُرودِ مسعُود

۲۴ راگست کو دن کے ½ ۱۲ بجے بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی شہر انبالہ پہنچیں۔ مولوی زاہد علی صاحب صاحبزادے مولانا شوکت علی ہمرکاب تھے۔ اسٹیشن پر ہزار ہا مرد و زن ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ عہدہ دارانِ خلافت و کانگریس و جوشش رضا کاران استقبال کے لئے حاضر تھے۔ ان کی تشریف آوری پر اس قدر جوش پھیلا کہ "اللہ اکبر" اور قومی نعروں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہجوم کی وجہ سے تل رکھنے کو جگہ نہ تھی چونکہ سخت گرمی کا وقت تھا اس لئے جلوس ملتوی رکھا گیا اور ہر دو خواتین اور انکے ہمراہیوں کو خان عبدالرشید خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کی کوٹھی پر پہنچا یا گیا جہاں تا روانگی یہ معزز مہمان قیام فرما رہے۔ سہ پہر کو ہر دو خواتین جلوس کے ساتھ امام باڑہ میر عبدالرحیم صاحب مرحوم میں تشریف لے گئیں اور وہاں زنانہ جلسہ ہوا۔ حاضرات کی کثرت سے کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں تھی۔ اور سینکڑوں مستورات مایوس واپس ہو گئیں۔ رات کے وقت میدان غلّہ منڈی میں زیرِ صدارت جلسہ لالہ بینی پرشاد صاحب وکیل، عام جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کی خدمت میں اہل شہر کی طرف سے ایک عقیدت نامہ پیش کیا گیا جس کو خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکریٹری ضلع انبالہ کانگریس کمیٹی نے پڑھا اور بی اماں نے اور ان کے بعد بیگم محمد علی صاحبہ نے تقاریر کیں لیکن ہنوز بیگم صاحبہ نے نصف تقریر بھی نہ کی تھی کہ بارش زور سے ہونے لگی اور مجبوراً جلسہ برخاست کرنا پڑا۔

۲۵ راگست کو مسلم ہال میں ایک اور زنانہ جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرات کی کثرت نے

اس وسیع عمارت کو ناکافی ثابت کر دکھایا۔ سہ پہر کو انبالہ چھاؤنی تشریف لے گئیں
وہاں اوّل جلسہ زنانہ اور شب کو بصدارت غلام بھیک نیرنگ وکیل صدر ضلع خلافت
کمیٹی انبالہ جلسہ عام نہایت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ۲۶ر اگست کو اول آپ میر
غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل کے مکان پر تشریف لے گئیں وہاں بھی مستورات
کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس کے بعد سہ پہر کو ہندو ہال میں زنانہ جلسہ اور شب کو
میدان منڈی میں خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکریٹری ضلع کانگریس کمیٹی انبالہ
کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔

چونکہ جلسۂ سابق کے بارش کی وجہ سے منتشر ہو جانے کے باعث لوگوں کو
سخت مایوسی ہوئی تھی اور اسی سبب سے سخت اشتیاق تھا۔ اس لئے اول
بیگم صاحب نے اپنی تقریر دلپذیر کو مکمل کیا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے
ایک لاجواب تقریر فرمائی۔ بارش پھر آئی لیکن لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا
کہ بھیگتے رہے اور دونوں کی تقریر سنتے رہے۔

اسی شب کو ایک بجے کی ٹرین سے بی اماں اور بیگم صاحبہ معہ رفقاء لاہور
تشریف لے گئیں۔

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

نوٹ: "نیشنل آرکائوز میں بی اماں کی اس تقریر کے نوٹس ہیں جو انھوں نے لاہور
میں ۲۰ر اگست ۱۹۲۲ء میں کی تھی انھوں نے کھل کر کونسلوں میں داخلے کی مخالفت،
کھادی کے استعمال اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ بھائیو جیل
سے خوف نہ کھاؤ۔ گولیوں سے مت ڈرو، موت برحق ہے اگر گولیوں
سے ہوئی تو شہید کہلاؤ گے۔"

نوٹس کے مطابق وائسرائے نے ہوم منسٹر سے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن سیاسی
مصلحتوں کے پیشِ نظر گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ (مصنف)

اُمّ الاحرار امرتسر میں

عظیم الشان جلسہ

[از مولوی غلام ربانی صاحب]

۲۹ر اگست کی شب کو جلیان والا باغ میں کانگریس و خلافت کمیٹی کی طرف سے عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد تخمیناً ۱۵ ہزار تک تھی جلسہ کے باقاعدہ افتتاح سے قبل چند نظمیں اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد باقاعدہ جلسہ زیر صدارت ملک لعل خاں معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور شروع ہوا۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ جس چیز نے بی اماں کو اپنے اس ضعف و نقاہت کے باوجود ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں صعوبات سفر برداشت کرنے پر مجبور کیا وہ ان کی شفقتِ مادری اور بے مثل جذبۂ ہمدردی ہے۔ اسی طرح بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کو بھی مسٹر لائڈ جارج کا وہ نار بر سرِ عام زلایا ہے جو مسٹر موصوف نے جنرل ایلین بی کو فتح بیت المقدس کے وقت بھیجا تھا۔

سپاسنامہ

مولوی ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہلِ حدیث، امرتسر نے بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس کا جواب اُمّ الاحرار نے حسب ذیل فرمایا۔

"جو تعریف اس سپاسنامے میں میرے اور میرے بیٹوں کے متعلق ظاہر کی ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ یہ تعریف ہماری خدمات سے بہت بڑی ہوئی ہیں۔ جو کچھ میں نے اور میرے بیٹوں نے کیا وہ ہمارا

فرض تھا۔ مجھے امید ہے کہ میرے تمام ہندوستانی بچے اپنے فرض کو پہچانیں گے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکیں گے"!

بی اماں کی تقریر

سپاسنامہ کے جواب اور تقریر سے بی اماں بالکل معذور تھیں گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے مولوی عزیزالرحمن صاحب کارکن مجلس خلافت بمبئی آپکے ملفوظات مبارکہ کو دہراتے جاتے تھے۔ بی اماں نے فرمایا کہ "سکھ بھائیوں پر مجھے فخر ہے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ منحوس خبر میرے کانوں میں پہنچی کہ سکھ بھائیوں پر ظلم ہو رہے ہیں اس سے میرے دل میں سخت صدمہ ہوا لیکن ان کی مردانگی اور بہادری کو دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوئی۔ ان کی پابندی عدم تشدد، قابلِ فخر ہے۔ اپنے مسلمان بیٹوں سے مجھے بہت شکایت ہے کہ انھوں نے میری بوڑھی ہڈیوں کی پرواہ نہ کی۔ سکھوں کا مذہب مہاتماجی کے مذہب سے مختلف ہے لیکن انھوں نے مہاتماجی کے ایک لفظ کو پکڑا اور آج تک اس پر ثابت قدم ہیں۔ انھوں نے ہر قومی کام میں صداقت سے قدم رکھا ہے اور مکمل ارادے اور عقیدے سے کیا ہے لیکن مسلمانوں نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر کھدر تک بھی نہ پہنا۔ مسلمانو! اپنی بوڑھی ماں کی لاج رکھو۔ اپنے خدا اور رسول کا پاس کرو۔ اگر میرے کہنے سے تم نے کھدر بھی نہ پہنا تو کل مجھ پر (خدا نخواستہ) بجلی گرے تو پانی کا چھینٹا نہ دے سکو گے۔ اب میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلامی سے چھڑائے۔ ہندوستان کے کتے بلیاں بھی غلامی کی زنجیروں میں نہ بند رہیں۔

زمیندار - ۲؍ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

محترمہ بی اماں کا حضرو میں ورود

راولپنڈی سے حضرو یہ خبر پہنچی کہ محترمہ بی اماں صاحبہ کچھ دیر کے لئے حضرو تشریف لے جائیں گی۔ یہ خبر آناً فاناً تمام علاقہ چھچھ میں پھیل گئی اور سر شام ہی ۱۵-۲۰ ہزار عقیدت مند شوقِ دیدار سے جمع ہو گئے۔ یہاں سے حضرو تک چار میل کی وسعت میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ ہندو مسلمان فرط ارادت سے آنکھیں فرش راہ کرنے کو مضطرب تھے۔ ۴۰-۵۰ تانگے، سو ڈیڑھ سو سوار اور رضا کارانِ خلافت ایک بڑی جمعیت میں جلوس کے لئے موجود تھے۔ راولپنڈی سے محترمہ بی اماں صاحبہ اور پارٹی بذریعہ موٹر روانہ ہوئیں لیکن ایک تو روانگی میں دیر ہو گئی تھی اس پر طرہ یہ کہ موٹر راستہ میں بگڑ گئی اور محترمہ بی اماں صاحبہ ۱۰ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکیں۔ اگرچہ بہت سا وقت ہو جانے کے باعث بہت سے لوگ مایوس ہو کر چلے گئے تھے لیکن پھر بھی پانچ چھ ہزار کی تعداد موجود تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہندوستان کی واجب الاحترام ماں کے احکام و نصائح سننے کے لئے جمع تھے۔ مولانا محمد اسحٰق مانسہری صدر جلسہ تھے۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب، رانا فیروزالدین صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر مختصر تقاریر کیں۔ پھر بی اماں نے تقریر شروع کی جسے حاضرین نے نہایت سکون و سکوت سے سنا۔

---

۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں کی کیمبل پور میں آمد

۵ ستمبر کو ۳ بجے کے قریب بذریعہ ریل پارٹی کیمبل پور پہنچی۔ چونکہ محترمہ بی اماں صاحبہ کے داخلہ کی صوبہ سرحد میں حکومت کی جانب سے مخالفت ہو چکی تھی اور امتناعی احکام مجلس خلافت پشاور اور محترمہ بی اماں کو پہنچ چکے تھے! اسلئے سرفروشانِ پشاور ہزاروں کی تعداد میں کیمبل پور پہنچ گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ پشاور اور دوسرے اسٹیشنوں سے کیمبل پور کا ٹکٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ رضاکارانِ پشاور کا ایک دستہ ریلوے اسٹیشن پر کھدر کی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے استقبال کے لئے ہلالی جھنڈا لئے موجود تھا۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اللہ اکبر کے غلغلہ انداز نعروں سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ جلوس مرتب کیا گیا۔ رات کو میدان پریڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی صوبہ سرحد سے باوجود گوناگوں بندشوں اور رکاوٹوں کے ہزار ہا حضرات شاملِ جلسہ ہوئے۔ فخر قوم میاں گل حمید کاکاخیل بھی تشریف لائے تھے اور مجلس نصرت الاسلام زیارت کاکا صاحب کی جانب سے سپاسنامہ بی اماں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

شیخ محمد غوث صاحب نے کیمبل پور میں مجلس خلافت کے انعقاد کی جانب توجہ دلائی اور بی اماں نے ایک موثر تقریر کی۔ جس کا ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔

میانوالی میں ورود اور اظہار جوش

۶ ستمبر کو محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی بمعیت رانا فیروزالدین صاحب معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور کیمبل پور سے روانہ ہو کر بوقت صبح ۸ بجے میانوالی پہنچیں۔ اسٹیشن پر کانگریس اور خلافت کے کارکنان معززین شہر اور جماعت رضا کاران استقبال کے لئے موجود تھے۔ گاڑی کے ٹھہرتے ہی قومی نعرے بلند ہوئے اسٹیشن کے باہر ہزارہا مشتاقانِ دیدار بینڈ لئے کھڑے تھے۔ شاندار جلوس مرتب کیا گیا اور شہر کے بڑے بازاروں میں سے جو جھنڈیوں سے آراستہ تھے گذر کر ملک مولا بخش صاحب وکیل کے مکان پر ختم ہوا جو مہمانان محترم کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ۵ بجے شام خواتین کا جلسہ ہوا۔ محترمہ اماں اور بیگم صاحبہ نے مستورات کو فرائض مذہبی اور ملک کی طرف متوجہ کیا۔ مبلغ ۵۶ روپے نقد اور دو طلائی چوڑیاں چندہ ہوا۔ ۶ بجے شام پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ جو جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا۔ حاضرین کی تعداد ۵ - ۶ ہزار کے قریب تھی۔ مجالس کانگریس و خلافت و اہالیانِ شہر کی جانب سے ملک مولا بخش صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ محترمہ بی اماں نے مناسب الفاظ میں جواب دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر زور دیا۔ اور حاضرین سے پُرزور الفاظ میں اپیل کی کہ سکھ بھائیوں کی قابل تقلید مثال سے سبق حاصل کریں۔

زمیندار - ۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

اُمّ الاحرار ضلع جھنگ میں

اُم الاحرار ۱۲ ستمبر کو صبح چینوٹ روانہ ہوئیں جس میں نواب عبدالرحمٰن صاحب غازی اور ملک نصراللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے۔ چینوٹ میں ایک پرجوش اور شاندار جلوس میں وفد شہر میں گھومتا ہوا جائے قیام پر پہنچا۔ بی اماں کی زیارت کے لئے مستورات کا تمام دن تانتا بندھا رہا۔ پچھلے پہر ۶ بجے مستورات کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بی اماں اور بیگم صاحبہ نے تقریریں کیں۔ ۳ سو روپے نقد اور بہت سے چاندی سونے کے زیورات جمع ہوئے۔ رات کے ۹ بجے جھتو تھان میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ بی اماں نے کھدر، سوراج اور اتفاق پر تقریر کی۔ ۱۳ ستمبر کی شام کو مستورات کا ایک اور جلسہ ہوا۔ بی اماں نے اپنے پند و نصائح سے محظوظ فرمایا اور چندہ جمع کیا۔ چینوٹ کھدر کے معاملے میں پنجاب کی تمام بستیوں سے پس ماندہ ہے۔ الحمدللہ کہ بی اماں کے ورود مسعود کی برکت سے عورتوں اور مردوں میں کھدر کا شوق اور پیدا ہو گیا ہے۔

چک جھمرہ میں جلسہ

بعد شام ۱۳ ستمبر کو بی اماں چک جھمرہ تشریف لائیں۔ ۱۰ بجے رات کے زیرصدارت ملک نصراللہ خاں عزیز جلسہ منعقد ہوا جس میں بی اماں نے ملتان کے واقعات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ آپس میں جھگڑنا چھوڑ دو۔ اس سے گورنمنٹ کے گھر میں گھی کے چراغ جلتے ہیں اور ہمارے گھروں میں ماتم ہوتا ہے۔

کھدر پہنو اور پنچایتیں قائم کرو۔

مراسلہ معتمد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی، لائل پور

(زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵۔)

بی اماں فیروز پور میں

بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی رات کے بارہ بجے چک جھمرہ سے روانہ ہو کر آج مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۲ء دن کے ۱۱ بجے فیروز پور پہنچے بارش کے باوجود اسٹیشن پر رضا کارانِ کانگریس وخلافت اور باشندگان شہر کا ہجوم تھا۔ قیام مولوی کمال الدین صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل بی کے مکان پر ہوا۔ ۳ بجے عورتوں کا جلسہ ہوا جس میں محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ نے حالات وضروریات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے مسلمان عورتوں سے استعمال کھدر کی درخواست کی۔ رات کو زیر صدارت چوہدری عبدالحق بیرسٹر جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد قریباً ۸ ہزار تھی جس میں تقریباً ایک ہزار مستورات ہوں گی۔ چند نظموں کے بعد صدر صاحب کی مختصر تقریر کے بعد محترمہ بی اماں نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے کھدر کے استعمال و ہندو مسلم پنچایت پر زور دیا۔

زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ضلع لائل پور میں بی اماں کا ورود مسعود

بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی ۱۰ ستمبر کو صبح ۶ بجے وارد لائل پور ہوئیں۔ ایک نہایت شاندار جلوس کے ہمراہ آپ کو دفتر خلافت میں بغرض قیام پہنچایا گیا۔ مغرب کے بعد ۸ بجے گول باغ میں زیرِ صدارت خواجہ عبدالرحمٰن غازی بی اے صدر مجلسِ خلافت لائل پور ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز نے تلاوت کے بعد بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور سردار کبیر سنگھ جتھہ دار اکالی دل نے اس کو بی اماں کے حضور پیش کیا۔ بی اماں نے اپنے بیٹے بھائیوں کو خطاب کر کے اتحاد، اتفاق کھدر اور پنچایتوں پر زور دیا اور کہا کہ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ نیز فرمایا کہ آپس میں رواداری اور درگزر کے ساتھ رہو۔ میں خالصہ کو گورو کے باغ میں قربانیوں پر مبارک باد دیتی ہوں حکومت روپے کے بل پر ناچ رہی ہے اس سے روپیہ چھین لو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ بی اماں کا ایک ایک لفظ سادگی کے ساتھ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔

مورخہ ۱۱ ستمبر کو صبح ۸ بجے بی اماں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سانگلہ کو مشرف فرمایا۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے بی اماں نے سادہ مگر پُر تاثر انداز میں غصّہ کو ضبط کرنے، دشمنوں کے فریبوں سے ہوشیار رہنے اور قومی خدمت کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ بس کھدر پہنو، کھدر پہنو۔

(مراسلہ معتمد کانگریس لائل پور)

روزنامہ زمیندار ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ کی سرگرمیاں شملہ میں جلسۂ عام

لدھیانہ - ۲۲ر ستمبر -

محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے شملہ میں چار جلسوں میں تقریریں کیں مجالس خلافت کانگریس وسکھ لیگ کی طرف سے محترمہ ام الاحرار کی خدمت میں مشترکہ سپاسنامہ پیش کیا گیا - ام الاحرار نے موزوں الفاظ میں جواب دیا اور حاضرین سے استدعا کی کہ محض زبانی اتحاد کی نہیں بلکہ حقیقی اتحاد اور دلوں کے اتحاد کی ضرورت ہے کیونکہ یہی کلید کامیابی ہے -

---

زمیندار - ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ہوشیار پور میں بی اماں صاحبہ کی تقریر

محترمہ بی اماں و بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کل صبح دس بجے کی گاڑی سے ہوشیار پور پہنچیں - ہزارہا مرد و عورتوں نے آپ کا پر جوش استقبال کیا - شہر کے بازار نہایت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے اور جگہ جگہ پتوں اور پھولوں کی محرابیں لگائی گئیں تھیں -

چار بجے دوپہر اسلامیہ قومی پرائمری اسکول کی کھلی عمارت میں بی اماں صاحبہ و بیگم صاحبہ نے ہزارہا مستورات کے جلسے میں تقریر فرمائی - رات کے آٹھ بجے چوک کمیٹی گنج میں عام جلسہ منعقد ہوا - شیخ خان محمد صاحب صدر جلسہ منتخب ہوئے - شیخ محمد معراج الدین صاحب صدر سٹی کانگریس کمیٹی نے ایک مناسب موقعہ

خودساختہ نظم پڑھی جس کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔ نظم کے بعد پنڈت ہرجن داس صاحب نائب صدر ضلع کانگریس کمیٹی نے مجالس خلافت و کانگریس کی جانب سے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر قومی سنگھ صاحب نے کھدر پر چھپا ہوا ایڈریس ایک ہوشیار پور کی بنی ہوئی کشتی میں رکھ کر پیش کیا جس پر ہاتھی دانت کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے لوگوں کو کامل استقلال، ہمت اور حوصلہ سے کام کو جاری رکھنے کے لئے زبردست اپیل کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر بہت زور دیا اور اسلامیہ اسکول ہوشیار پور کا دوبارہ سرکاری یونیورسٹی کے ساتھ الحاق ہونے کے خلاف زوردار الفاظ میں فرمایا کہ ایسی کوششیں دین اسلام اور اس کے محافظوں کی صریحاً مخالفت ہے اور کفر سے کچھ کم نہیں۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ نے تقریر فرمائی۔

آج صبح پانچ بجے کی گاڑی سے بی اماں معہ رفقاء جالندھر روانہ ہوگئیں۔

(درگاداس سکریٹری)

زمیندار۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۷

فہرست آمدنی دورہ پنجاب بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی

۲۶ ۸/۱۹۲۲ ۱۴۵ اروپے ۱۳۲ بالیاں نقرئی انگوٹھیاں چھلے نقرئی ۱۳ عدد

۲۸/ اگست لاہور ۱۶۰ روپیہ - ۳۱/ اگست - امرتسر - ۹۲ روپے لونگ طلائی کمعید چوڑی نقرئی - ایک عدد - بالیاں نقرئی ۲ عدد

۳۱/ اگست گجرات ۴۳ روپے ۸ آنہ بالیاں نقرئی ۵ چوڑی نقرئی ایک عدد

یکم ستمبر جہلم ۱۵ اروپے ۶ آنے چوڑی ۲ بالیاں ۲ انگوٹھیاں ۲ چھلے نقرئی ۶

۲، ۳/ ستمبر راولپنڈی ۱۱۵ روپے ۸ آنے بالیاں نقرئی ۲ -

۴/ ستمبر حضرو ۸۳ روپے ۸ آنے چوڑیاں نقرئی ۶

۶/ ستمبر میانوالی ۵۶ روپے چوڑیاں طلائی ۲

۸/ ستمبر سرگودھا ۲۳ روپے انگوٹھی طلائی ۲ - بالیاں طلائی ۲

۹ - ۱۰/ ستمبر جھنگ ۱۰۵ روپے ۶ آنے بالی طلائی ۱ بالیاں نقرئی ۲ چوڑی نقرئی ۱ انگوٹھی نقرئی ۳

۱۱/ ستمبر لائل پور ۴۴ روپے ۵ آنے ۳ پائی چوڑیاں نقرئی ۱۰ - بالیاں نقرئی ۲

۱۳/ ستمبر چنیوٹ - ۶۱۵ روپے تین آنے چھلے ۲ - بالیاں ۴ پھول ناک ۱ انگوٹھی طلائی ۱ بالیاں ۸۴ - چھلے انگوٹھیاں ۲۴ - چوڑیاں نقرئی ۳

۱۴/ ستمبر فیروزپور ۴۳ روپے ۱۱ آنے ۶ پائی

۱۵/ ستمبر رہتک ۲۴ روپے ۹ آنے ۳ پائی - بالیاں ۱۶ - چوڑیاں ۲ چھلے انگوٹھیاں ۶۲ - تیے ۲۱ بالے نقرئی ۲

۱۶ ستمبر مجلس خلافت پانی پت ۵۰۰ روپے متفرق ۶۸ روپے ۱۰ آنے - بالیاں طلائی ۲ - چوڑیاں پاؤں کی ۱۴ - چوڑیاں دستی ۱۴ - نونگے ہاتھ کے ۲ آرسی ۱، بارے ۳ - بالیاں ۶۴ - چھلے وانگوٹھی ۳۴ - بٹن دو جوڑہ نقرئی

۱۷ ستمبر کالکا ۵۳ روپے ۴ آنے

۲۰ ستمبر شملہ ۶۴۴ روپے ۱۴ آنے ۳ پائی - پاؤں کے توڑے - ۲ - نونگے ۴ چوڑیاں ۲ بالی ۱ - انگوٹھی نقرئی ۱

۲۲ ستمبر لدھیانہ ۱۵۰ روپے بالیاں طلائی ۲ - بالیاں نقرئی ۱۸ - چھلے وانگوٹھیاں نقرئی ۳

۲۳ ستمبر ہوشیارپور ۱۵۰ روپے چار آنے ۹ پائی - بالیاں نقرئی ۸۴

۲۴ ستمبر جالندھر شہر ۸۳ روپے ۱۰ آنے ۶ پائی - بالیاں طلائی ۲ - بلاق خورد طلائی ۱ کٹرہ نقرہ

۲۵ ستمبر بستی شیخ درویشی - ۱۱۶ روپے ۱۰ آنے

۲۶ ستمبر گوجرانوالہ ۸۴ روپے ایک آنہ - بالیاں طلائی ۲ انگوٹھیاں طلائی ۳ - انگوٹھی نقرئی ۱ -

وزیرآباد ۱۴ روپے ۳ آنے ۶ پائی - بالیاں طلائی ۲ - انگوٹھی نقرئی

۲۶ ستمبر سیالکوٹ ۷۴ روپے ۱۰ آنے بالیاں نقرئی ۲ چوڑی نقرئی ۱

۳۰ ستمبر قصور ۶۰ روپے بالیاں نقرئی ۳ - چوڑی نقرئی ۱

یکم اکتوبر مجلس خلافت ٹبالہ ۱۰۰ روپے ٹبالہ زنانہ جلسہ ۷۵ روپے بالیاں نقرئی ۵ چوڑی نقرئی ۱

کل نقد ۳۹۳۴ روپے ایک آنہ چھ پائی

زمیندار ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں صاحبہ کا دورہ

سرمایہ طیارہ کی فراہمی کی سرگرم کوششیں

سہارن پور ۲۴ دسمبر۔ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ام الاحرار و بیگم محمد علی صاحبہ سہارنپور دوسرے دورے پہ تشریف لائیں۔ شام کو شاہ مدار کے میدان میں خلافت کمیٹی کا جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ام الاحرار نے زبردست تقریر فرمائی۔ تقریر کا زیادہ تر حصہ داخلہ کونسل کی مخالفت میں تھا۔ ام الاحرار نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے کونسل میں داخل ہو کر بے عزت ہوں۔ جلسہ عصر کے وقت برخاست ہو گیا۔ ۱۴ دسمبر کو دونوں بہ ہمراہی مولانا خلیل الرحمن صاحب صدر ضلع خلافت کمیٹی بابو محمد یوسف صاحب ناظم ضلع قصبہ رام پور ضلع سہارن پور تشریف لے گئیں جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ تین جلسے زنانہ و مردانہ منعقد ہوئے۔ آخری جلسہ میں خلافت کمیٹی رام پور کی طرف سے موفت حکیم حافظ محمد احمد صاحب صدر خلافت کمیٹی رام پور (جو ایک واجب التعظیم بزرگ ہیں اور جنھوں نے تمام بار رہمانی اپنے ذمہ لیا تھا) مبلغ ۱۹۴۰ روپے سوا چھ آنے طیارہ فنڈ کے ام الاحرار کی خدمت میں پیش کئے اور اشیاء موصولہ طیارہ فنڈ کو جلد فروخت کر کے ایک معقول رقم روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کو رڑکی تشریف لے گئیں جہاں شاندار استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۶۷۶ روپے طیارہ فنڈ کے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۷ دسمبر کو قصبہ منگلور تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں۔ دو جلسے مردانہ و زنانہ ہوئے جس میں خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۲۳۱ روپے طیارہ فنڈ آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۸ دسمبر کو قصبہ سکروڈہ تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں جہاں پُرجوش استقبال کیا گیا جس

کی نظیر قصبات میں کم ملے گی۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک زنانہ دو مردانہ جلسے ہوئے جلسے میں ۳۵۰۰ روپے دینے کا اعلان ہوا جن میں مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے گئے اور مبلغ ۱۳۰۰ روپے کے قریب سامان ہے جس کو فروخت کر کے قیمت داخل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۱۹ دسمبر کو ۱۲ بجے شب کے کلکتہ میل سے رام پور بیکانیر تشریف لے گئیں جہاں سے آپ گیا کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جائیں گی۔

اس دورہ میں کل نقد مبلغ پانچہزار انہتر روپے پونے تین آنے اور بالی نقرہ ۳۳ عدد، آرسی نقرئی ایک عدد چھلے نقرئی ۵ عدد ہار نقرئی ایک عدد۔ کٹورہ مسی ۲ عدد کرتہ کھدر ایک عدد طیارہ فنڈ کے لئے پیش کئے گئے۔ بارہ ہزار روپے اس سے پہلے ورود میں بی اماں کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے۔ گذشتہ رقوم کو شامل کر کے جو ضلع سہارن پور کی طرف سے وقتاً فوقتاً مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی و صوبہ خلافت کمیٹی آگرہ کو روانہ کی جا چکی ہیں چندہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے ہو چکی ہے۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶+۷

بی اماں اور بیگم صاحبہ محمد علی بیجاپور میں مولانا محمد علی سے ملاقات

۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء

ام الاحرار بی اماں صاحبہ اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی، مولانا محمد علی سے ملنے کے لئے بیجاپور تشریف لائیں۔ مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اراکین نے اسٹیشن پر خیر مقدم کیا۔ انھوں نے شام کو ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی جس میں مرد و عورت سب شریک تھے۔ بی اماں نے حالاتِ حاضرہ پر نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے تقریر کی۔ اور برطانیہ کی نازک حالت، غازی مصطفٰے کمال کی فتوحات اور مسئلہ خلافت پر اس کے اثرات پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ انگلستان نے

اپنی یونان نواز حکمت عملی کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ فرانس، اٹلی اور دیگر اقوام کی ہمدردی و اعانت کھو دی۔ آپ نے مجمع کو نصیحت کی کہ وہ حصول سوراج اور مسئلہ خلافت کے حل کرنے کے لئے پوری قوت و طاقت سے کام کریں۔ آپ نے آگاہ کیا کہ اگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا گیا تو یہ ایک عظیم ترین غلطی ہوگی اور ہمیشہ پچھتانا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے بھی ایک موثر تقریر کرتے ہوئے فصیح الفاظ میں خواتین سے استدعا کی کہ وہ اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی امداد کریں قومی معرکہ آرائی میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔

زمیندار۔ ۶ر نومبر ۱۹۲۲ء ص ۳

بی اماں صاحبہ سکروڈہ ضلع سہارنپور میں

جنابہ بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی ۱۹ر دسمبر کو یہاں تشریف فرما ہوئیں اور انھوں نے تقریر فرمائی۔ حاضرین نے بہت جوش کے ساتھ طیارہ فنڈ میں حصہ لیا اور خلافت سکروڈہ نے حسب تفصیل مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے۔

بتوسط پروفیسر احمد سعید صاحب ایم اے۔ ا د۔ کالج لاہور

زمیندار۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ضمیمہ (۲)

اکبری بیگم

"مئی ۱۹۲۰ء میں دہلی میں منعقد ایک نشست میں ایک ممتاز شیعہ خاتون نے جلسے میں موجود خواتین سے اپنے مذہب کے تحفظ کی تحریک عدمِ تعاون کی حمایت کرنے کی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا "کیا ہم اپنے گھروں کی حاکم و مختار نہیں ہیں؟ اگر ہاں! تو ہمیں اپنے مردوں کو تحریک عدم تعاون بطور مذہب ماننے کے لئے پابند کرنا چاہیئے ہمیں اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے جو اس سے منحرف ہوں "ان کا سماجی مقاطعہ کرنا چاہیئے ہمیں اپنے مردوں کو پابند عمل بنانا چاہیئے۔ اگر آپ کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی قربت اور بہشت میں بی بی فاطمہ کی خدمت میں حاضری کی خواہش ہے تو اپنے مذہبی عہد پر سختی سے قائم رہیے۔"

GAIL MINAULT: SEPARATE WORLD P. 235

اکبری بیگم مشہور قومی رہنما بیرسٹر آصف علی کی والدہ تھیں۔

ضمیمہ (۳)

دہلی کی پہلی مسلم خاتون کو سزا

دہلی ۲۱ اپریل بیگم محبوب فاطمہ (مسز طاہر محمد) جن کو بہن ستیہ وتی کے ہمراہ جلیانوالہ باغ ڈے کے سلسلے میں چاندنی چوک سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو آج مسٹر اے ایس ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپ کے خلاف دفعہ ۱۷۔ الف ترمیم قانون ضابطہ فوجداری کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ آپ نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے آپ کو چھ ماہ قید محض و پچاس روپے جرمانے کی سزا دی۔ عدم ادائے جرمانہ آپ کو ڈیڑھ ماہ مزید قید بھگتنی ہوگی۔" (مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ اپریل ۱۹۳۲ء)

مدراس سٹی کانگریس کی آٹھویں ڈکٹیٹر مس سوا بیگم کو پکٹنگ کے سلسلے میں ایک سال قید محض اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔"

(مدینہ اخبار، بجنور۔ ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۴)

بیگم ڈاکٹر محمد عالم

ڈاکٹر عالم لاہور کے مشہور رہنما اور بیرسٹرایٹ لا تھے۔ ۱۹۳۲ء میں گرفتاری کے وقت ان کے شانے میں پھوڑا اور گردے میں تکلیف تھی۔ جیل میں جب ان کی حالت تشویشناک ہوئی تو ملک بھر میں پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تمام قومی اخبارات میں ان کی شدید علالت پر اظہار تشویش کیا گیا لیکن بیگم عالم نے بڑی بہادری سے صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور برطانوی آمریت کے سامنے سر جھکانے سے یکسر انکار کر دیا۔ ملاحظہ ہو ایک خبر:

ڈاکٹر عالم کی تشویشناک علالت: ڈاکٹر عالم کی صحت بد سے بدتر ہوتی گئی ہے۔ بخار ۱۰۴ درجے تک پہونچ گیا ہے۔ پیشاب کے ساتھ خون بھی آنے لگا ہے اور وزن نہایت تیزی کے ساتھ کم ہو رہا ہے مگر حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین کو زیادہ سے زیادہ تکالیف پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو رہا کرنا نہیں چاہتی۔ آپ سن کر تعجب کریں گے کہ اتنی شدید تکلیف کے دوران نہ تو جیل کے کسی ملازم کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا اور نہ ڈاکٹر صاحب ہی کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے کسی ملازم کو خدمت کے لئے بلالیں۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو ملاقات تک کی اجازت دینا حکومت نے گوارا نہ کیا۔ اب جب کہ ڈاکٹر صاحب موصوف تقریباً موت

کے منہ میں پہونچ گئے ہیں حکومت نے آپ کو جیل سے میو ہسپتال میں علاج کے لئے تبدیل کر دیا ہے۔ میو ہسپتال کے ڈاکٹر متشوش ہیں کہ عمل جرّاحی کیا جائے یا نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ عملِ جراحی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ ادھر تو یہ حالت ہے ادھر حکومت ابھی اسی چیز پر غور کر رہی ہے کہ بمبئی سے دو خاص ڈاکٹر طلب کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت ڈاکٹر صاحب کو مشروط طور پر رہا کر دیتی یا کم از کم ڈاکٹر صاحب کو پرائیویٹ طور پر علاج کرانے کی اجازت دے دیتی مگر حکومت کو ان چیزوں کی نہ کبھی پرواہ ہوئی ہے اور نہ ہے۔"

(مدینہ اخبار بجنور ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

بیگم عالم نے مصیبت کی اس گھڑی میں جس عزم و استقلال کا ثبوت دیا وہ قابل ستائش ہے۔ لوگوں کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیگم محمد عالم نے حسب ذیل بیان اخبارات میں اشاعت کے لئے دیا:

"میرے شوہر کی زندگی سب سے پہلے قوم کی ملکیت ہے اور بعد کو میری یا کسی اور کی ہے۔ اس لئے قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا استعمال کرے۔ بیگم عالم نے محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر عالم کی رہائی کا مطالبہ نامناسب ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلے جب ان کی حالت اس حد تک نہیں پہنچی تھی تو حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ کسی غیر سرکاری ڈاکٹر سے ان کا معائنہ کرانے کی اجازت دی جائے اور بعد کو مقامی سرکردہ ڈاکٹروں کی ایک فہرست بھی پیش کی گئی تھی کہ ان میں سے انتخاب کر لیا جائے لیکن اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ درخواست میں یہ گزارش بھی نہیں کی گئی تھی کہ ڈاکٹر عالم کو غیر سرکاری ڈاکٹر کے زیر علاج رکھا جائے۔" مجھے آجکل اپنے شوہر کی خدمت کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور میرے علم میں جو ان کی حالت ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کو میں تیار نہیں ہوں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس اعتماد کی خلاف ورزی کی جو مجھ پر کیا گیا ہے۔

بیگم عالم نے قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ مجھے نیم مردہ شوہر کو واپس لینے پر مجبور نہ کرے، بہتر ہے کہ ساری ذمہ داری حکومت پر چھوڑ دی جائے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے دیا جائے، ہمیں اجازت دینی چاہیئے کہ وہ بہادری کی موت مر جائیں، قومی زندگی میں انفرادی ہستیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں قوم کے مفاد کے لئے متعدد عالم اور دیگر اشخاص قربان کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے شوہر اس بیماری سے صحت یاب ہو جائیں گے لیکن میری نظر میں ایک باعزت آدمی کی لاش ایک ذلیل زندہ شخص سے بدرجہا بہتر ہے۔"

(مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۵)

بیگم صاحبہ مولوی ظفر علی خاں:

مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار کی گرفتاری پر ان کی اہلیہ محترمہ نے عامۃ المسلمین کے نام حسب ذیل پیغام ۲۴ ستمبر ۱۹۲۰ء کے روزنامہ "زمیندار" میں شائع کرایا:

"میرے مسلمان بھائیو اور بہنو! آپ کو معلوم ہے کہ میرے شوہر مولوی ظفر علی خاں کو حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ہے اور اب ان پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ میرے شوہر کے عقائد و خیالات کی معلومات مجھ سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ مدۃ العمر اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی ایسے امر کے مرتکب نہیں ہوئے جس پر حکومت قانوناً گرفت کر سکے۔ چونکہ وہ میرے نزدیک بے گناہ ہیں اس لئے میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ عدالت میں اپنی صفائی ہرگز ہرگز پیش نہ کریں۔ نظر بندی ہو، قید ہو، حبس دوام ہو، پھانسی ہو، کچھ ہو خدا اور رسول کے راستے میں ہر قسم کی کڑی مشکلات اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ امتحان کی منزل بہت سخت ہے۔ خدائے بزرگ استقلال و استقامت دے کہ تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ ہندوستان بھر میں جتنے بھائی اور جتنی بہنیں خدمت خلافت میں مصروف اور خدا اور رسول کے راستے پر سرگرم کار ہیں ان سب سے میری یہ **التجا** ہے کہ وہ حقیقی اسلامی تڑپ سے کام کریں۔

اور حکومت کے جبر و تشدد کو بے حقیقت سمجھیں۔ خلافت کی بحالی بڑی قربانی چاہتی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لئے ہر وقت تیار رہے اور مصیبتوں کو ہنسی وخوشی برداشت کرے۔ ہماری فریاد سننے والا وہی ہے جو مالک الملک ہے جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلت کے غار میں اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔ آؤ تمام بہنیں اور بھائی مل کر اسی بارگاہ میں دعا مانگیں کہ وہ اپنی خلافت کے خادموں کو مصیبت کے عالم میں ثابت قدم اور راضی برضا رکھے اور کامیابی کی منزلیں ان پر آسان کر دے۔ آمین!"

آپ کے اس پیغام سے ملک میں آپ کی اولوالعزمی، حب قومی اور ایثار و قربانی کا ایک غلغلہ پیدا ہو گیا۔ سہسوان ضلع بدایوں کی خلافت کمیٹی نے ایک طویل تحریر کے ذریعہ اُم الاحرار کا خطاب پیش کیا۔ اس پر آپ نے پھر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

"اگر ناعاقبت اندیش حاکموں نے ظلم و ناانصافی کا شیوہ اختیار کر لیا تو خلافت کے علمبردار صبر و رضا اور جفاکشی کا شیوہ اختیار کریں اور حق و صداقت کے لئے جیل خانوں کو بھر دیں۔ ممکن ہے حاکم اسی طرح بیدار ہوں۔ حکومت کو ہوش آئے اور وہ اس راستے پر چلنے سے پرہیز کرے جس پر گام فرسا ہونے کا نتیجہ یقیناً بربادی ہے۔ آج ملک و مذہب کی طرف سے ہر ہندو ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حکومت سے عدم تعاون کرے۔ ہر بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت کو چاہیئے کہ جس طرح بھی ممکن ہو عدم تعاون کا ثبوت دے۔ ایک سودیشی کی تحریک ہی کو دیکھو۔ اگر اس پر پورا پورا عمل کیا جائے تو آج ہندوستان اور خلافت کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ میں خود آج سے عہد کرتی ہوں کہ کبھی غیر ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال نہ کروں گی اور جہاں تک ممکن ہوگا صرف ہندوستان کے بنے ہوئے پارچہ جات پر اکتفا کروں گی۔ خدا مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

نوٹ:۔ بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق اگست ۱۹۳۱ء لاہور سے ماخوذ ص ۲۵، ۲۶، ۲۷

اعتراف

"ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی ترتیب کے سلسلے میں شکر وسپاس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ میں نے مندرجہ ذیل کتابوں، رسائل، اخبارات اور اشخاص سے استفادہ کیا ہے۔

کتابیات

۱۔ ابوالکلام آزاد: ۔غبار خاطر، مکتبہ احرار لاہور (تیسرا اڈیشن) ۱۹۳۶ء۔

۲۔ ابوالکلام آزاد:۔ ہماری آزادی، مرتبہ محمد مجیب، اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۰ء۔

۳۔ ابوالکلام آزاد:۔ قولِ فیصل، چمن بک ڈپو دہلی۔

۴۔ اثر بن یحییٰ انصاری، مولانا آزاد، ایک سیاسی ڈائری۔ عالیہ پبلی کیشنز دھولیہ (مہاراشٹر) ۱۹۸۲ء۔

۵۔ احمر لاری: حسرت موہانی۔حیات وکارنامے، ادبستان، گورکھپور۔ ۱۹۷۳ء۔

۶۔ اسلم ہندی: رازدانِ حیات ۔سوانح حسرت موہانی، دانش محل لکھنؤ ۱۹۷۵ء۔

۷۔ اشتیاق اظہر و نصرت موہانی، مولانا حسرت موہانی حصہ اول ذاتی زندگی، حسرت میموریل سوسائٹی۔

۸۔ اظہر علی برلاس: تاریخی شہ پارے، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی۔

۹۔ امداد صابری: سیاسی رہناؤں کی مائیں و بیویاں، جمال پریس، دہلی ۔۶۔ ۱۹۸۶ء۔

۱۰- امرت لال ناگر، غدر کے پھول، ایک ڈائری (ہندی) پرکاشن شاکھا سوچنا وبھاگ، اتر پردیش ۱۹۵۷ء۔

۱۱- ایم حبیب خاں: حسرت موہانی، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۱۲- انتظام اللہ شہابی: بیگمات اودھ کے خطوط، مکتبہ ادب اردو بازار۔ دہلی ۱۹۵۷ء۔

۱۳- انیس فاطمہ بریلوی: ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۹ء۔

۱۴- انیسہ ہارون شروانیہ: حیات ز۔خ۔ش، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۲۰ء۔

۱۵- پنڈت سندر لال: سن ستاون (اردو)، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔

۱۶- خورشید مصطفےٰ رضوی: جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی ۱۹۵۹ء۔

۱۷- ذکاء اللہ: تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، شمس العلماء محمد ذکاء اللہ۔ شمس المطابع، دہلی ۱۹۰۴ء۔

۱۸- رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۳۲ء۔

۱۹- رئیس احمد جعفری: علی برادران، محمد علی اکاڈمی لاہور۔ ۱۹۶۹ء۔

۲۰- رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ، محمد علی اکاڈمی لاہور ۱۹۶۹ء۔

۲۱- ز۔خ۔ش: فردوس تخیل (دیوان)، دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۳۲ء۔

۲۲- سید ظل الرحمٰن: تذکرہ خاندان عزیزی، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۷۸ء۔

۲۳- سید محمد ہادی: علی برادران اور ان کا زمانہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۸ء۔

۲۴- شان الحق حقی: نکتہ راز، عصری کتب، کراچی ۱۹۷۲ء۔

۲۵- صبح امید لکھنؤ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، تیسری جلد ۲۱ ۱۹۱۶ء خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۰۔

۲۶- ضیاء الدین احمد برنی: عظمت رفتہ، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء۔

۲۷- طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل (پانچواں ایڈیشن) کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۳۵ء۔

۲۸- عارف ہسوی: حالات حسرت، انجمن اعانت نظربندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۸-۱۹۱۹ء۔

۲۹۔ عبدالحلیم شرر: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، سلطان حسن اینڈ سنز بندر روڈ کراچی ۱۹۵۶ء۔

۳۰۔ عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۸ء۔

۳۱۔ عبدالشکور: حسرت موہانی، (تیسرا اڈیشن)، انوار بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۳ء۔

۳۲۔ عبدالقوی دسنوی: حسرت کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں، حلقۂ احباب، پٹنہ ۱۹۵۴ء۔

۳۳۔ عبدالماجد دریابادی: محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، معارف پریس اعظم گڑھ

۳۴۔ عتیق صدیقی: بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی ۱۹۸۱ء۔

۳۵۔ عتیق صدیقی: حسرت موہانی قیدِ زنگ میں، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۱ء۔

۳۶۔ عزیزالرحمٰن جامعی: رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، کوچہ رحمان
چاندنی چوک، دہلی، ۱۹۷۵ء۔

۳۷۔ کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ، ج ۱-۲، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔

۳۸۔ محمدالدین فوق: چند محب وطن خواتین (بھارت کی دیو یا ں)، ظفر برادرس،
تاجرانِ کتب لاہور، ۱۹۲۱ء۔

۳۹۔ محمد سرور: محمد علی بحیثیت تاریخ داں و تاریخ ساز، سندھ ساگر اکادمی،
لاہور ۱۹۶۲ء۔

۴۰۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین: سن ستاون میری نظر میں، آئینہ ادب، چوک انارکلی
لاہور ۱۹۵۷ء۔

۴۱۔ نعیمہ بیگم: حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی، سعید آرٹ پریس حیدرآباد سندھ ۱۹۷۳ء۔

۴۲۔ "باپو کے پتر بی بی امت السلام کے نام" مرتبہ کاکا صاحب کالیلکر، نوجیون پرکاشن مندر احمد آباد۔

۴۳۔ باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام، جلد اول فائل نمبر ۳۵ ۱۹۳۵ء نہرو، میوزیم لائبریری نئی دہلی۔

۴۴۔ باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام، نیشنل گاندھی میوزیم و لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔

۴۵۔ چند اہم خطوط: صدر دفتر انجمن اعانتِ نظربندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۸ء۔

رسائل

۱۔ **آج کل**، دہلی، مارچ ۱۹۵۹ء، اگست و ستمبر ۱۹۸۱ء، نومبر ۱۹۸۸ء (مولانا آزاد نمبر)۔

۲۔ **اردو ادب**، دہلی (حسرت نمبر) ۱۹۸۱ء، شمارہ ۱ تا ۴۔

۳۔ **اردو ادب**، علی گڑھ (حسرت نمبر)، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء۔

۴۔ **اردو اکادمی**، لکھنؤ (حسرت نمبر)، نومبر ۱۹۸۱ء۔

۵۔ **اردوے معلّٰی**، علی گڑھ، کانپور، اپریل ۱۹۰۸ء، فروری تا اپریل ۱۹۲۷ء۔

۶۔ **آواز** (آل انڈیا ریڈیو)، دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء۔

۷۔ **خاتون**، علی گڑھ، جولائی ۱۹۱۲ء، اپریل ۱۹۱۳ء۔

۸۔ **شبستان** اردو ڈائجسٹ، دہلی، مارچ ۱۹۶۸ء۔

۹۔ **صبح امید**، یکم فروری ۱۹۱۸ء، چکبست، لکھنؤ۔

۱۰۔ **صبح** (سہ ماہی) انجمن ترقی اردو ہند، دہلی (ابوالکلام آزاد نمبر) ۱۹۷۰ء۔

۱۱۔ **صدق جدید**، لکھنؤ، ۲۶ر جنوری ۱۹۶۸ء۔

۱۲۔ **علی گڑھ میگزین**، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۳-۷۴ء۔

۱۳۔ **کتابی دنیا**، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۷ء۔

۱۴۔ **ماحول** (ہفت روزہ) کراچی (ابوالکلام آزاد نمبر)، ستمبر ۱۹۶۰ء، شمارہ ۱۷/۱۸۔

۱۵۔ **نظارہ**، لکھنؤ (بیگم حضرت محل نمبر)، ۲۸ر اگست ۱۹۶۲ء۔

۱۶۔ **نظارہ**، لکھنؤ (ملکہ حضرت محل نمبر)، ۸ر ستمبر ۱۹۶۳ء۔

۱۷۔ **نقوش** (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء۔

۱۸۔ **نقوش** (آپ بیتی نمبر)، فروغ اردو لاہور، جون ۱۹۶۴ء

۱۹۔ **نگار**، لکھنؤ (حسرت نمبر) جنوری، فروری ۱۹۵۲ء

۲۰۔ **نگار**، کراچی (سالنامہ) ۱۹۷۶ء۔

۲۱۔ **نیا دور**، لکھنؤ (یوم آزادی نمبر)، اگست ۱۹۸۲ء۔

۲۲۔ **ہماری زبان**، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، یکم اپریل ۱۹۸۵ء، ۸ر اکتوبر ۱۹۸۷ء۔

۲۳۔ **تہذیب نسواں**، لاہور، یکم اپریل ۱۹۲۲ء۔

اردو اخبارات

۱۔ **الجمیعۃ**، دہلی: ۵ جولائی ۱۹۴۸ء۔

۲۔ **الہلال**، کلکتہ: ۲۱-۲۸ مئی ۱۹۱۳ء۔

۳۔ **جمہور**، کلکتہ: ۸ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۰ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۷ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۹ مئی ۱۹۱۸ء، ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء، ۱۵ جولائی ۱۹۱۸ء۔

۴۔ **زمیندار**، لاہور: ۲۴ ستمبر ۱۹۲۰ء، یکم ستمبر، ۲ ستمبر، ۱۷ ستمبر، ۱۸ ستمبر، ۲۳ ستمبر، ۲۵ ستمبر، یکم اکتوبر، ۲۶ اکتوبر، ۲۹ دسمبر، ۳۰ دسمبر ۱۹۲۲ء۔

۵۔ **مدینہ اخبار**، بجنور: ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء، ۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء، ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء، یکم جنوری ۱۹۱۸ء، ۵ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ۱۷ مارچ ۱۹۳۲ء، ۲۵ اپریل ۱۹۳۲ء، ۹ مئی ۱۹۳۲ء، ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

۶۔ **ہمدرد**، دہلی: ۱۱ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۶-۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء، ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء، یکم دسمبر ۱۹۲۶ء۔

ذاتی انٹرویو

۱۔ مجاہد آزادی **جناب غلام رسول قریشی**، امام منزل، سابرمتی ہری جن آشرم ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء۔

۲۔ **بیگم ہاجرہ زیڈ احمد**، جی۔ ٹو، پارک کالونی پارک روڈ، لکھنؤ، ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ء۔

۳۔ **جناب طلعت کچلو**، تین مورتی میوزیم لائبریری دہلی۔ ۷ جون ۱۹۸۷ء۔

۴۔ **محترمہ سروجنی ناناوتی**، صدر ہندستانی پرچار سبھا سن ندی، راج گھاٹ، نئی دہلی ۷ جولائی ۱۹۸۷ء۔

۵۔ **محترمہ بیگم کنور عمار احمد خاں** صاحب میرس روڈ، علی گڑھ، ۱۰ اگست ۱۹۸۷ء۔

۶۔ **محترمہ بیگم سہیلہ حبیب** صاحبہ، بدر باغ، علی گڑھ، ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۷۔ **جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی** صاحب، ممبر راجیہ سبھا، ذاکر باغ، علی گڑھ، ۹ نومبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ **جناب ڈاکٹر اقبال حسین** صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن ۲۸ جنوری ۱۹۸۸ء۔

بذریعہ خطوط فراہم کی گئی معلومات

۱۔ جناب کشن تردیدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگرالیہ، ہری جن آشرم احمد آباد مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء۔

۲۔ محترمہ یاسمین نعمانی ۱۵۲ جولی میکر اپارٹمنٹ III کیفے پریڈ، بمبئی مورخہ ۲۸ر مئی ۱۹۸۶ء۔

۳۔ جناب اے، جے، اتم، بی ستیلا روڈ، ستدھی نواس ماہم بمبئی۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء۔

۴۔ محترمہ فاطمہ طیب علی، سب پوسٹ وڈے لا، ضلع احمد نگر مہاراشٹر مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

۵۔ جناب عطاء الرحمن داؤدی ماریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفر پور مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۸۷ء۔

۶۔ سرخ پوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم ۲۹۹۲ کوچہ رحمان چاندنی چوک دہلی مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۷ء۔

۷۔ محترمہ بیگم سلطانہ حیات انصاری، ۲۴ ویسٹرن کورٹ جن پتھ نئی دہلی مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ جناب سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی این بنرجی روڈ پٹنہ بہار مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۸۸ء۔

۹۔ جناب پروفیسر جمال خواجہ، سمیع منزل، علی گڑھ۔ مورخہ ۲۶ر مئی ۱۹۸۸ء۔

۱۰۔ جناب عشرت علی صدیقی، چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

۱۱۔ محترمہ صفیہ واجد بریلوی، ۶۹ آواس وکاس، سول لائنز، بریلی مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۸۹ء۔

۱۲۔ سیدہ ضیا احتشام، فرحت کدہ سرسید نگر، علی گڑھ، یکم فروری ۱۹۸۹ء۔

OTHER ENGLISH BOOKS

1. Chanda, S.N. : Some untold stories, Sterling Publishers, Private Ltd., 1976.
2. Chopra, P.N. : Who is Who of Indian Martyrs, Ministry of education & youth services Delhi, 1969.
3. Gail Minault : Khilafat Movement, Religious symbolism & political mobilisation in India-Oxford University Press, 1982.
4. Gail Minault : The extended family-women & political participation in India and Pakistan. Chanakya Publications, Delhi, 1981.
5. Gandhi, M.K. : My experiments with truth: Navjivan Press, Ahmedabad, 1963
6. Hanna Papanek & Gail Minault : Separate Worlds-Studies of Purdha in South Asia. Chanakya Publications, Delhi, 1982.
7. Hasan Mushir : Muslims & the Congress, Manohar, 1979.
8. Jain Naresh Kumar : Muslims in India, Vols.I-II, Manohar Publications, Delhi, 1979-1983.
9. Kabir Kausar & Inam Kabir : Bibliographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies, Life and Light Publishers, New Delhi, 1982.
10. Marshman, J.C. : Memoirs of Sir Henry Havelock, London, 1908.
11. Ray Shantimoy : Freedom movement and Indian Muslims, People's Publishing House Private Ltd. New Delhi, 1983.
12. Rizvi, S.A. & Bhargawa, M.L. (ed.) : Freedom Struggle in Uttar Pradesh, Lucknow, 1957.
13. Rudrangshu Mukherji : Awadh in Revolt-1857-1858. Oxford University Press, 1984.
14. Savarkar, V.D. : The Indian War of Independence 1957, Bombay, 1947.
15. Sen Surendra Nath : Eighteen Fifty Seven. Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1957.
16. Tarachand : History of Freedom Movement in India. Vol.I-II Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1961-1967.
17. Zaidi, A.M. & S.G. : The Encyclopedia of the Indian National Congress, Vol.VIII, S. Chand & Company Ltd., New Delhi, 1980.

COLLECTED WORKS OF MAHATMA GANDHI, PUBLICATION DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION AND BROADCASTING GOVERNMENT OF INDIA

Vol. XVI	:	August, 1919 - January, 1920.
Vol. XVII	:	February - June, 1920.
Vol. XIX	:	November 1920 - April, 1921.
Vol. XX	:	April - August, 1921.
Vol. XXI	:	August - December, 1921.
Vol. XXII	:	December, 1921 - March, 1922.
Vol. XLII	:	October, 1929 - February, 1930.
Vol. XLIII	:	March - June, 1930.
Vol. XLIV	:	July - December, 1930.
Vol. XLV	:	December, 1930 - April, 1931.
Vol. XLVI	:	April 16, - June 17, 1931.
Vol. XLVIII	:	September, 1931 - January, 1932.
Vol. XLIX	:	January - May, 1932.
Vol. LI	:	September 1, - November 15, 1932.
Vol. LII	:	November, 1932 - January, 1933.
Vol. LIV	:	March 6 - April 22, 1933.
Vol. LVI	:	September 16, 1933 - Jaunary 15, 1934.
Vol. LVIII	:	May 18, - September 15, 1934.
Vol. LX	:	December 16, 1934 - April 24, 1935.
Vol. LXII	:	October 1, 1935 - May 31, 1936.
Vol. LXIII	:	June 1, - November 2, 1936.
Vol. LXV	:	March 15, - July 31, 1937.
Vol. LXVI	:	August 1, 1937 - March 31, 1938.
Vol. LXVII	:	April 1, - October 14, 1938.
Vol. LXIX	:	March 1, 1939 - July 15, 1939.
Vol. LXXI	:	December 1, 1939 - April 15, 1940.
Vol. LXXIII	:	September 12, 1940 - April 15, 1941
Vol. LXXIV	:	April 16 - October 10, 1941.
Vol. LXXV	:	October 11, 1941 - March 31, 1942.

REPORTS, PAPER AND LETTERS

- Cornegy's Intelligence, for Dept., Secret. Branch. 26th Feb., 1858 No. 228 (News of 22 Dec., 1857). National Archives, New Delhi.
- Foreign Consultation 17th Dec., Nos. 250/34 National Archives, New Delhi.
- Foreign Political (A) 31 Dec., 1858. National Archives, New Delhi.
- Subermati Series: File No. 21, Part III, S.Letter No. 17991-19172. Gandhi Museum Library, Rajghat, New Delhi.
- The Bombay Chronicle, July 10, 1930 & February 23, 1943
- Comrade, Delhi November 21, 1924.
- The Statesman, Delhi, March 19, 1986.
- Directory of Indian Women Today, India International Publication, 1976.
- Oral History Transcript Zohra Ansari Recorded on 3.11.1974 Teen Murti Library, New Delhi.

******

اقبال

○ اقبال کے کلام کی ابتدائی اشاعت
اقبال کے نام پر رسائل

اقبال کی نظمیں / غزلیں ان کی زندگی میں پہلی
بار جن رسالوں میں چھپیں، اور ــــــــــ
اقبال کے نام پر آزادی سے قبل جو رسالے نکلے،
ان کے عکس پیش خدمت ہیں۔

ـــــــــ ادارہ

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء

الکاشف



الکاشف

اپنی طرز کا ایک جدید میگزین جس میں علمی۔ اخلاقی۔ ادبی تاریخی اور سائنٹفک حالات کے علاوہ صنعت و حرفت کے مفید ملک مضامین چھپینگے۔ مذہبی مباحث اور ذاتیات کے جھگڑوں سے اسے کوئی کام نہیں۔ قیمت سالانہ معہ محصول صرف ۱/۲ روپیہ

ما ئیم و خلق جملہ جہان دوستدار ما

(جلد اول) مضامین کی تفصیل (نمبر اول)

ایڈیٹر و پرنسپل قاضی حمید الدین احمد حمید۔ ا۔ ڈسٹرکٹ فینسر

منشی فیض علی پرنٹر پنجاب پریس سیالکوٹ سے چھپوا کر قاضی حمید الدین مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

غزل اقبال

زمانہ کی مسلسل تفرقہ اندازیوں سے ایک مدّت کے بعد ہمیں اپنے معزز ہمعصر و ہموطن اور مکرم دوست جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے سیالکوٹ ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ صاحب موصوف کا نام نامی زیادہ تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ ہمیں اُنکی ایک غزل اتفاق سے ملی ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں :—

"ایڈیٹر"

جو مضموں زندگی میں حرفِ موزوں بنکے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں

سبب اے ہمنشینوں کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بنکے نکلے ہیں

نہ تڑپایا کسیکو تیرے نظّارے کے ارمانونے
کہ سارے دیکھنے والے تیری چلمن کے نکلے ہیں

کبھی اس رہ سے بھی شائد سواری تیری گذری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا تیرے توسن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمند دل نے
خدا جانے تیری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

کوئی کیا جانے وسعت فزا ہے اُنکی ہوا کیسی
تیری درگاہ سے ذرّے بیاباں بنکے نکلے ہیں

میرے جان داستان میری کلیجہ تھام کر سُننا
کہ میری حال پر آنسو میرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر بن چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے
متاعِ دل کو لیکر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنوں بادِ محبت کی
عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر اِدھر کا رُخ نہیں کرتے
جو مثلِ بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیہ گر چاکِ محبت ہو تو کیونکر ہو
میرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی تیری دانے میرے خرمن کے نکلے ہیں

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

برہمن روز محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو　　صنم جو تھے وہ پتھر وادیٔ ایمن کے نکلے ہیں
تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی　　ہزاروں دشت اک گوشے میں دامن کے نکلے ہیں
وہ مذبوح ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے　　پرانے آشنا میری رگ گردن کے نکلے ہیں

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُسکے دامن میں ہیں وہ کچھ بن کے نکلے ہیں

اقبال

("سید"۔) شیخ صاحب موصوف نے جس خوش اسلوبی سے مقطع میں اس لفظ کو رکھا ہے اُس کا مزا کچھ واقفان راز ہی لے سکتے ہیں۔ جناب قبلہ مولینا سید میر حسن صاحب سیالکوٹ میں ایک نہائیت ہی نیک نفس اور روشن خیال خوش اخلاق عالم و فاضل بزرگ ہیں جنکے شاگردان رشید کی ایک معتد بہ جماعت گورنمنٹ کی ملکی اور مالی خدمات کے معزز عہدوں پر ممتاز ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنی ابتدائی تعلیم سے لیکر ایف۔ اے تک انہیں کے سایۂ عاطفت میں نشوونما پائی ہے۔ اور انکا مذاقِ شاعری بھی حضرت ممدوح کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے جسکا اشارا اُنہوں نے مقطع میں کیا ہے۔

••

إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم

الاخوت

انجمن اخوت اسلام پنجاب کا سہ ماہی علمی رسالہ

ماہ جنوری ۱۹۰۹ء

ایڈیٹر

بخشی حضور علی

فہرست مضامین

جملہ خط و کتابت منیجر کے نام ہونی چاہیے

مطبوعہ خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور

میں منشی محمد عبد العزیز جنرل منیجر کے اہتمام سے چھپا

اطلاع

ہمارے خاص قلمی معاونین

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال - ایم اے - پی ایچ - ڈی - بیرسٹرایٹ لا لاہور + منشی احمد حسین خانصاحب بی - اے - ایم - آر - ایس شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب دہلی + میرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جالندھر - منشی نذر محمد صاحب بی - اے - اسسٹنٹ انسپکٹر حلقہ مدارس امرت سر +

مندرجہ بالا فہرست میں جن بزرگان قوم کے اسمائے گرامی درج ہیں انھوں نے نہایت فراخدلی سے الاخوت کی دائمی امداد کا مستقل وعدہ فرمایا ہے - اس فہرست کے کھولنے سے ہمارا یہ منشا ہے کہ الاخوت کی قلمی معاونت کے لئے چیدہ چیدہ اصحاب کی ایک خاص جماعت پیدا کر جائے۔ تاکہ اسکی دائمی زندگی کا کافی یقین ہو جائے - مذکورہ اصحاب کا اس قومی خدمت کو سرانجام دینے کا ٹھیکہ لینا ہی کافی ہے - مگر پھر بھی احتیاطاً ہمیں یقین ہے کہ ہم اگلے پرچے کے جاری کرنے تک اس فہرست میں معتدبہ اضافہ کرنے کے قابل ہو جائینگے - جو صاحب خود بخود ہی اپنے آپ کو اس قدر خدمت کے لئے والنٹیر بنانا چاہیں انکے اسمائے گرامی بکمال شکریہ کے ساتھ درج کئے جائینگے ۔

گذارش

جن معزز اصحاب کی خدمت میں رسالہ کا پہلا نمبر بطور نمونہ کے بھیجا جاتا ہے براہ مہربانی اپنی منظوری یا نامنظوری سے دفتر کو مطلع فرمائیں اگر کوئی اطلاع نہ پہنچی تو یہ سمجھ لیا جائیگا کہ انھوں نے خریداری منظور فرمالی ہے - اور دوسرا نمبر ان کے نام بذریعہ وی پی ارسال کیا جائیگا -

مینیجر

کلامِ اقبال

الاخوت کی اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جناب ڈاکٹر اقبال دام فیضہ جیسے صاحب علم و کمال نے اسکا سرپرست ہونا منظور فرما لیا ہے۔ اس سے ہم ضرور یہی نتیجہ مستنبط کرینگے کہ اس بروا کے چکنے چکنے پات بلاشبہ زبانِ حال سے ہونہاری کی پیشگوئی کر رہے ہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر اقبال شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خان مرزا سلطان احمد صاحب اور احمد حسین خان صاحب جیسے بزرگانِ عالی پایہ اپنی گراں بہا عنایات کیساتھ اسکی جانب توجہ ملتفت فرماتے؟۔

ڈاکٹر صاحب موصوف ابھی مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ ان دنوں آپکے جملہ علمی مشاغل بے توجہی کا شکار بن رہے ہیں۔ یہی حال شغل شعر و سخن کا ہے تاہم بعض وقت تقاضائے طبیعت سے مجبور ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی بن آتی ہے۔ لیکن جو لطف فراغت اور سکون میں نظم لکھنے آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

امید ہے کہ ہمارے دوسرے پرچے کے چھپنے تک آپ استحکام کیساتھ یہاں مقیم ہو جائیں گے۔ اور ہمارے دامنِ امید کو گوہر مقصود سے پر کرتے رہا کرینگے۔ ذیل کی فارسی غزل جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اس پرچہ کے لئے مرحمت فرمائی ہے۔ کمال شکریہ کیساتھ چھاپی جاتی ہے غزل سرتاپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔ ایڈیٹر۔

اے گل ز خارِ آرزو آزاد چون رسیدۂ	تو ہم ز خاکِ این چمن مانند ما دمیدۂ
اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدہ	دامن ز سبزہ چیدہ تا بہ فلک رسیدۂ
افتی اگر بدستِ ما حلقہ بگرد تو کشم	ہنگامہ گرم کردہ خود از میاں رمیدۂ
شورش کعبہ یکطرف ہنگامہ دیر یکطرف	از آفرینش جہاں دردِ سرے خریدۂ
ہستم گدائے تو با تو گدائے ماستی	باہر نیاز سجدہ در لبِ ما دمیدۂ

با من مگو کہ مثل گل ہموارہ شاخ بستہ باش — مانندِ موج بوم را آوارہ آفریدہ

اِقبال غربت توام نشتر بدل ہمے زندہ

تو در ہجوم عالمے یک آشنا نہ دیدہ

اقبال

۳۳۶

اللہ اکبر

تنظیم



نگران پالیسی: کچلو

ایڈیٹر: قریشی

امرتسر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۶۱۷

تنظیم

جلد ۱/۲ — نمبر ۵ و ۱/۶

فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

قیمت سالانہ تین روپے (سے) ایک نمبر کے لئے پانچ آنہ کے ٹکٹ بھیجیں

سوراج

(در حدودِ دوائرِ سلطنت)

(از ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب)

شبے بہ می کدہ پیرِ کلیسیا می گفت ۔۔۔ کہ رندِ می کدۂ تو بستۂ ننگ جام است
گرفتم ایں کہ ثمر پختہ شد ولے گویم ۔۔۔ اگر بُرید ز شاخِ نہالِ ما خام است
ترا ز پنجۂ شاہیں اماں دہد صیّاد ۔۔۔ فغاں چہ سود آزادگی تہِ دام است
من ستم زدہ ایں نکتہ را نہ فہمیدم ۔۔۔ کہ فکرِ کہنۂ ہندی اسیرِ اوہام است
سروشِ مطلعِ میر رضی بیادم داد ۔۔۔ چہ مطلعے کہ سراپا نوائے الہام است

"نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخلِ خانۂ صیاد آشیاں بستند"

معرفت ٹیلیفون نمبر ۲۳۷ — تار کا پتہ

اقبال کا ترانہ ... ہادۂ عیار کہ رواں ہمارا
جس سے ... گا زمانہ کا نام
وہ کرے گا آپ کا اقبال کام

ملکی و ادبی شاہکار دلچسپ اور تازہ ترین اخبار

ہندوستان کا بہترین اخبار

اقبال
ہفت روزہ
رام پور

دار الطباعت: طباعت گاہ سیحا بک ڈپو، اخلاقی پریس، اخلاقی ہاؤس، اردو اسٹریٹ، رام پور

اجرت اشتہار: پورا صفحہ، نصف صفحہ، ایک کالم، آدھا کالم، پاؤ کالم، فی سطر

دار الاشاعت: اشاعت گاہ مجلہ سیحا، عرش الادب، سیحا منزل، اردو اسٹریٹ، رام پور

قیمت اخبار

ایڈیٹر حکیم سیحا نظامی

یوم جمعہ ۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۳۸ء | پہلا سال

ڈاکو پانچ اشخاص کو پکڑ کر لے گئے

مدراس اسمبلی کا آئندہ اجلاس

خوشامد!

اے خوشامد کانپتے ہیں تجھ سے خودداروں کے دل
اعتماد نفس کے چھکے چھڑا دیتی ہے تو
جس میں لیلائے غلو بیٹھی ہو وہ محمل ہے تو
تو وہ شیشہ ہے نہاں ہو جس میں غیبت کی پری
تیرے ہر شوشے پہ کٹتی ہے ترے شیدا کی مت
تو لگا سکتی ہے ہر موقع پہ وہ باتوں کا باغ
کاذبوں کو پیکر صادق جو وصفاً کہتی ہے تو
تیرا اعادی خلق میں ملعون بھی مطعون بھی
دیکھتی ہے جب مخاطب میں کوئی شان عتاب
رہزن تحقیق ہیں تیری قصیدہ بازیاں

تو رخ جرأت پہ حائل تو ترقی میں مخل
پائے استقلال کے تو اور ادیتی ہے تو
چاپلوسی کا جہاں سایہ ہو وہ منزل ہے تو
ہے تری راہ بازی تک تری خوش منظری
قاز کا روغن لئے پھرتی ہے تیری شیطنت
ست ہو جاتا ہے جس میں خودپسندی کا دماغ
اپنے متوالوں کو رو در رو بڑا کہتی ہے تو
چوستی ہے تو رگ انسانیت سے خون بھی
تو پلا دیتی ہے کانوں کو تملق کی شراب
محسنوں کو تو سکھا دیتی ہے ناانصافیاں

آہ وہ ناداں جو آتے ہیں تیری چال میں
تیری تعریفیں نہیں پٹتے ہیں جوتے شال میں

سیماب شاہجہانی ... شاداں

رامپور میں خودکشی کا سنسنی خیز واقعہ

اسٹیشن روڈ کے درخت کیوں کاٹے گئے

جلد ۱ نمبر ۱

اقبال

علی گڑھ

مدیر

ظفر احمد صدیقی

ایم۔ اے (علیگ)

مقاصد

"اقبال" "حلقۂ اقبال علی گڑھ" کی آواز ہے۔

اقبال کا مقصد ہے۔

علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت۔

مسلمانوں کی زندگی کی تمام مشکلات کا حل اسلام کی تعلیمات میں تلاش کرنا۔

ادبی کج راہی اور بدذوقی کی اصلاح کرنا۔ "ظ"

قواعد

۱۔ رسالہ اقبال ہر انگریزی مہینے کے شروع میں شایع ہوا کرے گا۔

۲۔ رسالہ میں نظم و نثر کے وہی مضامین شایع ہو سکتے ہیں جو رسالہ کے مقاصد اور پالسی کے مطابق ہوں۔

۳۔ رسالہ میں بیرونی اشتہارات حسب ذیل نرخ پر شائع کئے جا سکتے ہیں۔ ایک صفحہ ۱۰ روپے۔ نصف صفحہ ۵ روپے۔ ربع صفحہ ۳ روپے۔

(نوٹ۔ صرف وہی اشتہارات شائع کئے جا سکتے ہیں جو رسالہ کی پالسی کے منافی نہ ہوں)

"منیجر"

۳۴۲

۴۸۶

ماہنامہ

اقبال

جلد۱ اپریل ۱۹۴۰ء نمبر۱

مدیر

ظفر احمد صدیقی

ایم۔ اے (علیگ)

شبلی روڈ۔ علی گڑھ

فی پرچہ ۶ آنے

قیمت سالانہ چار روپے ۴

فہرست مضامین

یہ خط علامہ اقبال نے میری اُس نظم کے جواب میں ارسال فرمایا تھا جو ''نذرِ اقبال'' کے نام سے گزشتہ صفحہ پر درج کی گئی ہے۔ (ظافر)

لاہور، ۱۲ / دسمبر ۳۶ء

جناب ن۔ ا۔ ظافر

قرآن کریم کی تعلیم کے لحاظ سے [illegible] مظاہر الٰہیہ [illegible]

وہ تاریخ اور [illegible] آیات اللہ [illegible] ۔ [illegible] جاتا ہوں [illegible]

اس [illegible] مسلمانوں [illegible] جس سے [illegible] آئندہ [illegible]

کے [illegible] تاریخ سے [illegible] ۔ [illegible]

مجبور ہو جاتا [illegible] تعلیم سے [illegible]

[illegible] ۔

۲۔ [illegible] اسلام [illegible] مسلمانوں کے عقیدہ [illegible]

[illegible] حدود [illegible]

ان حدود [illegible] اسلام [illegible] شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ [illegible]

قانون الٰہی کا پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ [illegible]

[illegible] ۔ قرآن [illegible]

[illegible] قانون الٰہی [illegible] ۔ [illegible] حدود [illegible]

[illegible] شریعت [illegible] ۔ جب احکام الٰہی

حدود [illegible] اللہ

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔ [illegible] مسلمانوں [illegible] ۔ [illegible] عقیدہ [illegible]

[illegible]

۳. مسٹر فرہاد کا یہ کہنا کہ اسلام ایک دینِ تبلیغ ہے (جنگ اس کا جزو ہے) غلط ہے۔ یہ جنگ [illegible] جب کوئی مسلمانوں کو ان کے دین سے مرتد کرنے
کی کوشش کرے [illegible]۔ قرآن کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں، محافظانہ اور
مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمانوں کو تلوار
اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)۔ دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے ۴۹:۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو
غور سے پڑھو تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ چیز جس کو [illegible] جمعیت اقوام [illegible]
کتاب یعنی قرآن نے اس کا اصول [illegible] بیان کیا ہے۔ [illegible] گذشتہ زمانے میں مسلمانوں [illegible] قرآنی
[illegible] اصول [illegible] صورت اختیار [illegible]۔ [illegible] اقوام [illegible]
بنائی گئی ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جمعیت اقوام [illegible] قانون [illegible]
[illegible] — [illegible] — جوع الارض کی تسکین کے لئے
جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

۴. شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات
پائے جاتے ہیں۔ (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ
آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔

[illegible]
[illegible] والسلام

محمد اقبال

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا انفاذ علیگڑھ میں	پروفیسر رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الٰہی	۲۰ روپے
رقعاتِ رشید صدیقی	مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰ روپے
اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر) (ہندی)	ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد	۱۵ روپے
قومی یکجہتی کی روایات	مسٹر بی۔ این۔ پانڈے	۱۵ روپے
مقدمہ طلسم ہوشربا	مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار	۲۰ روپے
طلسم ہوشربا (نو جلدیں)	منشی محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر	۸۰۰ روپے
فرہنگ زفانِ گویا	بدر ابراہیم، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد	۵۰ روپے
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت	منشی رام پرشاد ماتھر	۳۰ روپے
جنید احمد کی آٹوگراف بک	مرتبہ جنید احمد	۲۰ روپے
ایک نادر روزنامچہ	مظہر علی سندیلوی	۲۵ روپے
دیوانِ مصحفی	منتخبہ امیر مینائی و اسیر	۵۰ روپے
من موہن کی باتیں (قرآن مجید کا ترجمہ) (ہندی)	مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی	۱۵ روپے
داستاں میری (بیسویں صدی کے بہار کی تہذیبی تاریخ)	ڈاکٹر اقبال حسین	۳۰ روپے
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	۴۵ روپے
یادگارِ روزگار (تذکرہ کاملانِ پٹنہ)	بدر الحسن (م ۱۹۳۴ء)	۱۲۵ روپے
گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	۲۵ روپے
تحفۃ السعداء	خواجہ کمال (م بعد ۱۰۱۶ھ)، پیشکش حکیم حسین خاں شفا	۲۰ روپے
قطعاتِ دلدار	دلدار بیگ، مرتبہ قاضی عبدالودود	۲۰ روپے
اقبال، ہندستان اور پاکستان (ہندی)	پروفیسر سید حسن احمد، ترجمہ نرندر کمار بھوجڑی	۱۵ روپے
ایک نادر روزنامچہ	پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۳۰ روپے
تواریخ نادر العصر	منشی نولکشور، تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن	۲۵ روپے
دیوانِ حافظ (شاہانِ مغلیہ کے ذاتی نسخے کی عکسی اشاعت)		۱۰۰ روپے
نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد (۱۳-۱۹۱۰ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۲ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۴۵ روپے
برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
خوشتر منگر دلی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ابوالکلام آزاد

○ یادِ آزاد

○ مرتبہ: محمد حبیب (مرحوم)

عبدالسلام صاحب ابن محمد حبیب صاحب کی پیشکش

۱۹۸۷ء میں رانچی جانا ہوا تو محمد حبیب صاحب زندہ تھے جنھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بھی کہ انھوں نے اس وقت کی یادداشتیں بھی کہیں لکھ رکھی ہیں۔

۱۹۹۰ء میں پھر جانا ہوا تو حبیب صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ان کے فرزند گرامی جناب عبدالسلام صاحب نے ان کے مسودات بکمال مہربانی ہمارے سپرد کیے، جو اب آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ اس کے لیے اردو دنیا اور ابوالکلام شناسی کے طالب علم ان کے شکر گزار ہیں۔

ادارہ

ابوالکلام آزاد رانچی میں

رانچی نظر بندی زمانے کے
ملفوظات
معمولات
متعلقات

مرتبہ
محمد حبیب
(رانچی)

کچھ محمد حبیب صاحب (رانچی) کے بارے میں

یہ خاکہ ہمیں محمد حبیب صاحب کے صاحبزادے عبدالسلام صاحب سے ملا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

● **نام والد صاحب** :۔ محمد حبیب ولد عظمت علی ● **مکان** :۔ ڈاکٹر فتح اللہ لین، رانچی ● **تاریخ پیدائش** مطابق اسکول سرٹیفکٹ ۱۴-۵-۱۸۹۷ ● **تاریخ وفات** :۔ ۹-۱-۱۹۹۰ ● ابتدائی اردو، فارسی اور دینی تعلیم گھر میں۔ بعد میں اپنی کاوش سے average standard کی عربی تعلیم حاصل کی۔

انگریزی اور اسکول کی تعلیم کے لئے مقامی St. Paul's school کے طالب علم رہے۔ ۱۹۱۹ء میں First Division سے Matriculation کا امتحان پاس کیا۔ مقامی طور پر اس زمانہ میں کوئی کالج نہیں تھا لہٰذا تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

۱۹۲۰ء میں Inspector of school Ranchi کے آفس میں ملازم ہو گئے اور پھر وہاں سے Resign کر کے ۱۹۲۹ء میں Indian Mental Hospital, Kanke (Ranchi) کے دفتر میں بحیثیت خزانچی کے بحال ہوئے اور وہاں سے ۱۹۵۵ کی مئی میں Retire کر گئے۔

Retirement کے بعد سکریٹری، انجمن اسلامیہ رانچی کے عہدہ پر معمور ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک رہا۔

● **مولانا آزاد سے رابطہ** :۔ نظر بندی کے عالم میں مولانا اکثر ہملوگوں کے محلے سے ٹہلتے ہوئے گذرتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی۔ محمد حبیب صاحب اکثر مولانا کے ساتھ نشست میں شامل رہتے تھے۔

۷ دسمبر ۱۹۱۷ء (جمعہ) جامع مسجد رانچی

(خطبہ) برادران من

تم اس شخص کو کیا کہو گے جو معمار بنکر کسی مکان کو بنانے کے لیے گیا ہو اور بجائے اس کے کہ اس کے ہاتھ اینٹوں کے جمع کرنے اور دیواروں کو درست کرنے میں مشغول ہوتے ایک تیشہ ہے کہ دیواروں کو توڑ رہا ہے اور مکان کو ڈھا رہا ہے تو تم تعجب کی نگاہوں سے دیکھو گے۔ مگر افسوس ظلمت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، تاریکیوں اور اندھیرے بادلوں سے گھرے ہوئے ہیں اور اس پر بھی غفلت در غفلت۔

حقیقت یہ ہے، عزیزان من، شریعت دنیا کو جس تاریکی سے بچانے کے لیے آئی تھی آج بعینہ وہی تاریکیاں ہم پر بھی پڑی ہوئی ہیں۔ شریعت کے آنے کے قبل زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے الگ مہینوں کے الگ الگ شگون خیالی اوہام کے بنا پر قرار دیدیا تھا۔ نہ تو ان کو کسی الہامی کتاب نے تعلیم دی تھی اور نہ کسی شریعت نے بتلائی تھی ایک مہینہ کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مہینہ بہت اچھا ہے اور دوسرے مہینہ کو منحوس سمجھا کرتے تھے تو اریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ان مہینوں کے ایک مہینہ صفر کا بھی تھا جس کو لوگ نہایت بدشگون سمجھتے تھے۔ مگر افسوس آج یہی سب چیزیں ہم میں رائج ہیں۔ اس مہینہ کے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس مہینہ میں کوئی خوشی کا کام نہیں کرنا چاہیے اور اگر کریگا تو نقصان اٹھائیگا اور کوئی اس مہینہ کے آخری چہار شنبہ میں خوشی مناتا ہے کہ جس سے سال بھر تک اس کو خوشی حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں کہ جس کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو دفتر کے دفتر چاہیے میں کس کس بات کو دکھلاؤں۔ لوگ تعویز گنڈے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب تمام دنوں کے گناہ معاف ہو گئے حالانکہ اس میں

کوئی بات مطابق شرع کے نہیں ہے۔ سب باطل اور لغو ہیں اس کو نہ تو قرآن نے بتلایا ہے اور نہ اس کے رسول ؐ نے۔ سب برابر ہیں ہر روز سورج نکلتا ہے اور غروب ہوتا ہے اس کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں۔ تواریخ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے قبل اس مہینہ میں بیمار ہوئے اور وہ دن چہارشنبہ کا تھا تاریخ ۲۸ صفر۔ اس کے بعد آپ کی وفات ربیع الاول کی بارہویں تاریخ بعض روایتوں کے مطابق ہوئی۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اس کے علاوہ کچھ کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔

آخری چہارشنبہ کوئی چیز نہیں اور نہ اس کی کوئی خصوصیت ہے۔

(خطبہ کے بعد) مولانا عبدالرؤف صاحب تشریف لاتے ہیں یہ ایک عالموں میں سے ہیں داناپور کے رہنے والے ہیں اور ان کا مطب کلکتہ میں ہے۔

۹ دسمبر ۱۷ء (یکشنبہ)

ایک آدمی دیکھنے میں بہت سیدھے مسجد میں آتے ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

قبل مغرب ایک شخص نے مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا حضور۔ دو بھائی تھے۔ کول۔ ایک بھائی مسلمان ہوگیا اور دوسرا اپنے قدیم مذہب پر قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد جو بھائی مسلمان نہیں ہوا تھا مر گیا۔ لوگوں نے اس کے بھائی سے کہا دیکھو تمہارا بھائی مر گیا ہے اب اس کا کوئی نہیں ہے لکڑی تمہارے گھر موجود ہے جلانے کے لیے دیدو اگر قیمت مانگو گے تو قیمت بھی ملے گی یوں تو تمہارا بھائی ہی ہے اس نے لوگوں کے اصرار پر لکڑی اس کے جلانے کے لیے بھیج دیا اب ڈورندے کے ایک مولوی نے فتویٰ دیدیا کہ وہ شخص مسلمانوں سے خارج ہونے کے قابل ہوگیا ایک تو وہ نومسلم دوسرے مذہب سے ناواقف۔ یہ سنتے ہی گھبرا اٹھا۔

مولانا نے فرمایا — بات یہ ہے میرے بھائی فتوی دینے والے کو چاہیے کہ قبل اس کے کہ وہ فتویٰ دے مجرم کی حالت پر بھی غور کرلے اور پھر عام اثر جو لوگوں پر ہوگا اس کو بھی سوچ لے۔ اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کو تنبیہ کریں ایسا نہ ہو لوگ دیکھ کر ویسا ہی کام کرنے لگیں تو یہ عین شریعت ہے اور چاہئے بھی یہی کیونکہ جب اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی ہر مسلمان پر فرض ہے اور جو ایسا نہیں کرتا ہے وہ اپنے ایمان میں مکمل نہیں ہوا ہے ایمان کمزور ہے۔

اسلام تو ایسی تعلیم اخلاق و آداب کی غیر مذاہب کے لیے دیتا ہے جو دوسرے قوموں کو حاصل نہیں ہے۔

جنگ بدر میں جب کفار مارے گئے تو آپ کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ آپ نے ان لاشوں کو زمین کھدوا کر ڈلوا دیا بغیر نماز جنازہ

پڑھے ہوئے اور درحقیقت اس میں اگر تباہی کیا تھا ہم سے جہاں تک ہو سکے غیر مذہب والوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آویں اب فرض کر لیجئے ایک شخص جو ہندو تھا مسلمانوں کے محلہ میں مرگیا اور اب اس کا کوئی نہ رہا اس حالت میں اگر ہم لاش کو چھوڑ دیتے ہیں تو وہ سڑتا ہے اور اس سے بیماری پھیلتی ہے تو اس وجہ سے چاہئے کہ اس لاش کو زمین کھدوا کر ڈال دیں۔

۱۰ دسمبر ۱۷ء (دوشنبہ)

وہ شخص جو کل مسجد میں آیا تھا مشہور کیا کہ میرے پاس کچھ زیارت کی چیزیں ہیں۔ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے موذن ضیاء الحق سے کہلا دیا کہ اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ راہی چھوڑ کر چلا جائے۔

بعد مغرب مولانا نے فرمایا:

لوگ چندے کے حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب سے عام مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ میں نے خود حیدرآباد میں دیکھا ہے عید کی نماز کے بعد ایک شخص لوگوں سے ایک کاغذ پر سجدہ کرا رہا تھا اور پیسے وصول کر رہا تھا۔ نہ معلوم ایسے لوگ اپنے جی کو کیونکر تسکین دیتے ہونگے کہ توبہ کرینگے۔ ایسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے اور کسی جگہ سنٹر مقرر کر کے انکا استاد بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ادھر اُدھر بھیجتا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں اور دو چار لڑکے گانے بجانے والے بھی رہتے ہیں۔ موقعہ دیکھ کر گانے بجانے لگے اور جب لوگ جمع ہو گئے تو اپنا کام شروع کر دیا۔

عام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی چیز نسبت کی جاتی ہے تو انکے دل میں ایک طرح کی محبت ہوتی ہے اور اس حالت میں روپیہ دو روپیہ دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

یہ لوگ آثار قدم اور پیراہن جسکا کوئی ثبوت نہیں لیے پھرتے ہیں اور خانہ کے اندر اس کو رکھتے ہیں نکالتے وقت لوبان جلاتے ہیں اور لوگوں سے سجدہ کراتے ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ واقعی یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں تو اس آدمی کو جس کے پاس یہ چیز ہے اس سے محبت ہوتی اور اس کو اپنے جگر سے لگاتا نہ یہ کہ ٹکے دو ٹکے میں ذلیل کیے پھرتا اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو شرعی قانون کے مطابق دُرّے لگائے جاتے۔ ایک آثار قدم آگرہ میں ہے تو دوسرا حیدرآباد میں اور لطف یہ بنانے والے نے یہ سمجھا کہ چونکہ آپ ایک بڑے آدمی تھے اس بنا پر آپ کا پیر بھی بڑا ہوگا۔ ایک دو فٹ کے پیر کا نقش پتھر پر کھود دیا حالانکہ یہ ہی غلط ہے بخاری میں آپ کے وجود گرامی کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ آپکا ہر عضو

درمیانی حالت پر تھا۔ نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا

۱۱ ؍ دسمبر ۶۱۷ (سہ شنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب مسجد میں آئے رانچی میں ان کے چند مرید بھی ہیں۔ نماز مغرب انہوں نے پڑھائی مولانا نماز پڑھ کر چلے گئے۔

۱۲ ؍ دسمبر ۶۱۷ (چہار شنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب نے مغرب کی نماز پڑھائی اور مولانا ابوالکلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ افسوس مولانا کی قدر رانچی کے مسلمان نہیں جانتے۔ اگر کچھ علم ہوتا تو آنکھیں کھل جاتیں جناب مولانا کو علماء کا طبقہ عزت کرتا ہے اور یہ محدث محقق اور ہمدرد قوم ہیں۔

۱۳ ؍ دسمبر ۶۱۷ (جمعرات)

جمعدار صاحب نے مولانا سے کہا:

حضور، رانچی میں آدمی کے مرنے کے بعد لوگ قرآن شریف یا گیہوں کے قسم کا غلہ فدیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میت نے جو کچھ فرائض یا واجبات اپنی زندگی میں جان بوجھ کر یا سہواً ترک کیا ہے تو بالعوض اس کے یہ قرآن اور اس قدر گیہوں فدیہ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب قبول کرتے ہیں اور دیگر اشخاص جو تعداد میں سات ہوتے ہیں ایک دوسرے کی طرف ان چیزوں کو بڑھاتے ہیں ایسا کرنا شریعت سے جائز ہے یا نہیں مولانا نے فرمایا:

یہ صورت جو آپ نے فدیہ کی بیان کی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ حقیقت یہ ہے کہ فرائض یا واجبات سے کیا معنی کوئی گناہ بھی کرے اور اس کا بدلہ زمین کو سونا سے بھر کر دینا چاہے کہ معاف ہو جائے تو یہ محال ہے۔ آیت کریمہ مجکو بتلا رہی ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ ایک ذرہ برابر گناہ کے لیے اگر تم دنیا کو سونا سے بھر دو اور چاہو کہ معاف ہو جائے تو یہ محال قطعی ہے۔ یہاں پر یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ جب خدا نے انسانوں کو مخاطب کر کے سنا دیا تو لے عزیزان من! کب ہوسکتا ہے کہ جس شخص نے نہ صرف ایک وقت کی نماز بلکہ سوال یہ ہے کہ عمر بھر کی نمازیں اور روزے قصداً ترک کیے ہوں اور بعد مرنے کے فدیہ دیدیا جائے اور معاف ہو جائے اس کے معنی ہیں کہ آدمی عمر بھر ضلالت اور گمراہی میں مبتلا رہے اور صرف اتنا کرے کہ دس بیس روپئے چھوڑ کر مرے تو اس کے تمام ذنب وگناہ معاف ہو جائینگے۔ درحقیقت جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ شریعت اور احکام الٰہی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ سخت معصیت کر رہے ہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے اور تمام فقہاء نے اس پر بالاتفاق اجماع کیا ہے کہ کوئی شخص بوجہ مسافرت یا اور کسی مجبوری سے روزہ نہ رکھ سکا ہو

اور درمیان میں قبل روزہ رکھنے کے قضا کر گیا ہو تو اس کے وارث پر واجب ہوگا، اگر وہ مسلمان ہے، اس کے ترکہ میں سے دو شام کے کھانے کے حساب سے ہر روزہ کے بدلہ فدیہ کو دے۔ بس اور یہ مسئلہ صرف روزہ ہی کے متعلق ہے نزدیگر فرائض کے گناہ معاف ہونے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد فدیہ ادا کر دیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ اگر کوئی آدمی صدق دل سے توبہ کرتا ہے تو دو چار روزہ کے گناہوں کے کیا معنی اگر اس کے تمام گناہوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور زمین سے آسمان تک پہنچ جائے تو ایک لمحہ اور ایک آن میں معاف ہو سکتا ہے توبہ کرنے والے کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ ان سے رضامند ہوا اور وہ اللہ سے رضامند ہوئے۔ یہ تعبیر فرشتوں کو بھی میسر نہیں۔ پس ہر مرد انسان اور عورت پر واجب ہوا کہ وہ درگاہ الٰہی میں ہمیشہ توبہ و اجابت کا سر جھکائے رہے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہے۔

(اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد)

اگر مسلمانوں کے مقدمے، طلاق اور نکاح کے قاضی فیصلہ کرتے تو آج یہ ذلتیں جو ہم اٹھا رہے ہیں اور غیر لوگوں کے سامنے جو نہ شریعت سے واقف اور نہ اسلام کی خوبیوں کی خبر رکھتے ہیں جو جی میں آتا ہے فیصلہ لکھ دیتے ہیں ان کے سامنے ہمارا مقدمہ جاتا ہے۔ دراصل پہلے سے مسلمانوں نے اس کی کوشش نہیں کی حالانکہ گورنمنٹ کو کوئی عذر نہ تھا انگریزوں نے ہندستان ہندوؤں سے تو لیا نہ تھا یہ حکومت مسلمانوں کی تھی۔ گورنر جنرل نے عالم گیر سے تخت لیتے وقت یہ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے مقدمے ان کے قرآن اور حدیث کے مطابق فیصل کیے جائیں گے۔

گورنمنٹ کو بہت آسانی ہوتی بلکہ ایک بہت بڑا جھگڑا طے ہو جاتا۔ ایک شیخ الاسلام ہوتا جس کے صلاح کار بہ ہوتے اور قاضی مقرر کیے جاتے مسلمانوں کا جو مقدمہ ہوتا قاضی فیصلہ کرتا۔ یہی سب حق تلفی کی سزا ہے جو آج ہم پا رہے ہیں۔

گزشتہ مردم شماری میں ایک خانہ اور بڑھا دیا گیا تھا جس میں مختلف پیشوں کے حالات خاص کر بازاری عورتوں کی تعداد کتنے دنوں سے وہ اس کام کو کر رہی ہیں اور کیا وجہ ہے، معلوم کر سکیں۔

(۱) پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کی غفلت اور سستی کی وجہ سے بھی مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھتی جا رہی ہے اور ہندو دن بدن گھٹتے جا رہے ہیں۔

(۲) بہت سے مسلمانوں کی وہ عورتیں جو بازاری ہو گئی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جنکے شوہر ان سے برطرف ہو گئے اور آخر ان عورتوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔

(۳) ہندوؤں میں وہ عورتیں جو لڑکپن میں بیوہ ہو گئیں اور شادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کام کو اختیار کر لیا۔

یہ باتیں کس قدر قابل افسوس ہیں اور یہ سب نتائج عورتوں کے حق کو چھوڑ دینے کے ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے حق کو ادا کریں تو ایسا ہی ہم لوگوں پر فرض ہے کہ ہم ان کے حقوق ادا کرتے رہیں۔

آج اگر گورنمنٹ کو کوئی اس طرف متوجہ کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ قانون ایک بار پاس کر دیا گیا اب بدل نہیں سکتا۔ لاکھ آپ بکا کیجئے مگر کارگر نہیں ہوتا یہ سب باتیں جب ہی قرار پا سکتی ہیں جب رعایا کو حکومت میں دخل ہو۔

۱۶ دسمبر ۱۷ء (یکشنبہ)

طاہر صاحب نے دریافت کیا۔

جس عورت کے گود میں بچہ ہو اور وہ ہمیشہ لڑکے کی وجہ سے پاک وصاف نہیں رہ سکتی ہو تو اس حالت میں اس کے نماز پڑھنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔

مولانا نے فرمایا۔ وہ عورت اگر اس بات سے مطمئن ہے کہ غسل کرنے سے کوئی ضرر خود یا لڑکے کو نہیں پہنچ سکتی تو اس حالت میں بہتر اور اولیٰ ہے کہ وہ غسل کر کے نماز ادا کرے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر میرے بھائی عذر کی حالت میں غسل سے بغیر نماز ہو جاتی ہے۔ صرف اس جسم کو صاف کرے جہاں ناپاکی کا احتمال ہو اور اگر یہ خیال نہ ہو کہ کون سا عضو صاف کرے تو چاہئے کہ صرف وضو کر کے نماز پڑھے۔ شریعت میں کسی قسم کا جبر اور تشدد نہیں ہے۔ دین اسلام ایک آسان مذہب ہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے عورتیں جو مجبور ہیں اور نہیں ہو سکتا کہ پانچوں وقت غسل کر سکیں اگر اس بات کی پابندی لگائی جائیگی کہ بغیر غسل کے نماز ہی نہیں ہو سکتی تو نتیجہ یہ نکلیگا کہ نماز ہی نہیں پڑھی جائیگی۔

نماز ہر حالت میں پڑھنا چاہئے۔ غسل کرنے سے ضرر کا خوف ہو تو صرف وضو ہی کر لے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے، مگر نماز ضرور پڑھے۔

اب اس کو دیکھئے کہ لوگ کس قدر بیجا تشدد کرتے ہیں جس کی اک قلم ضرورت نہیں اور لطف تو یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی پر دباؤ چل سکتا ہے تو اس پر بالکل سختیوں کا حد کر دیتے ہیں نرمی کی جگہ پر سختی اور سختی کی جگہ پر نرمی مگر وہ لوگ جو ذرا قوی پنجہ رکھتے ہیں اور پیسے والے ہیں تو مفتیوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ اگر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ حرام کو حلال ثابت کر دیں تو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں صرف سوال ہے پیسوں کا اور وہ غریب بیچارے جو مسکین ہیں تو ان پر جس قدر بے جا سختیاں کی جائیں درست ہے۔

اب اس کو کیا کہئے گا۔ لوگ جھگڑا کرتے ہیں حرف ضاد پر کوئی کہتا ہے سورۂ فاتحہ میں ولا الضالین کو ولا الدالین اور کوئی کچھ غرض یہ ہے کہ نہیں پڑھنے سے گنہگار تھے اب پڑھنے سے کافر کیا خوب ایک لطیفہ گونے

کہا ہے۔ صاحب میں نماز نہیں پڑھتا تھا اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ سخت معصیت کر رہا ہوں مگر جب اس بات کا پتہ چل گیا کہ حرف ضاد کو جب تک کوئی صحت کے ساتھ عربوں کی طرح نہ ادا کر سکے گا وہ نماز نہ پڑھے ورنہ کافر۔ حالانکہ یہ سمجھنا لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ حرف ضاد کو صرف عرب والے ادا کر سکتے ہیں دوسری زبان میں یہ حرف کا ادا کرنا عربوں ہی کی خصوصیت ہے۔ جب آپ کتب ادب عربی پڑھیں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ منجملہ عربوں کی خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اہل ضاد کہلاتے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ، جو دوسرے خلیفہ گزرے ہیں، ان میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حرف ضاد داہنے جانب منہ سے ویسے ہی صحت کے ساتھ ادا کر سکتے تھے جیسے بائیں جانب سے اور دائیں جانب سے ادا کرنا مشکل ہے کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جب تک کوئی آدمی حرف ضاد کو عربوں کی طرح نہ پڑھ سکے گا تب تک وہ مسلمان ہی نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان عجمی بھی تھے۔ حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور دیگر اشخاص جنکی زبان عربی نہیں تھی۔ آپ نے یہ نہیں کہا، ان لوگوں کو حرف ش، ص، یا ض پڑھاؤ بلکہ آپ نے یہی کہا قرآن پڑھاؤ

حضرت بلال رض کا واقعہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے حرف ش ادا نہیں ہوتا تھا بجائے ش کے س کہتے تھے مگر جس دن اذان نہیں پکارتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان میں مزہ نہیں آتا تھا وہاں حضرت بلال رض کا "س" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر محبوب تھا اور آج یہ حال ہے کہ ہم صرف ضاد پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں گے حالانکہ عشرہ مبشرہ، جنکو جنت کی بشارت وحی سے ملی تھی، اور واقعہ یہ تھا کہ جب وحی آئی کہ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف منہ پھیر لو تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پھیرنے پر اول دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا تو وہ لوگ تھے، عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے مگر عمر رضی اللہ عنہ جب دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں صہیب رض میرے جنازہ کی نماز پڑھائیں گے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ مسجد نبوی میں ہر ملک کے لوگ جو ایمان لائے تھے، قرآن تلاوت کر رہے تھے۔ سبھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا تو فرمایا۔ زبانیں تو مختلف ہیں مگر قرآن ایک ہے۔ ان بحثوں کا نچوڑ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن اس لیے نہیں آیا ہے کہ ہم حرف ض اور ظ اور ع پر ایک دوسرے کو کفر کا فتویٰ دیں بلکہ اس لیے کہ ہم اس کے مطالب پر غور کریں اپنے اندر نور ایمان پیدا کریں اور تب دنیا و دین کی سعادت و برکت حاصل ہو سکتی ہے آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہندستان میں کہیں عربی کی اصلی تعلیم نہیں مسلمانوں نے اگر کوشش کرکے کچھ روپے جمع بھی کیے کہ ایک مدرسہ کھولیں گے کس لیے کہ قاری پیدا کیے جائیں۔ ان سب باتوں سے

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ قرآن کے معنی سے غفلت کیے جارہے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں جو اتنا ضروری نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ قرآن کے الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرے مگر بعد مطالب کے، یہ نہیں کہ زبان سے لفظوں کو کہتے جارہے ہیں اور معنی سے بے خبر ہیں۔ میری مادری زبان عربی ہے میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا، گیارہ برس عربی کی تعلیم پائی مگر حرف ضاد کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوتا کہ میں صحت کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔

۱۷ دسمبر ۱۹۱۷ء (دوشنبہ)

محمد اسمٰعیل شہید کو دیکھئے، دلی کی مسجد میں انکا یہ حال تھا کہ ایک گھنٹہ مصافحہ میں لگ جاتا تھا اور فرصت نہیں ملتی تھی کہ سیڑھی سے نیچے قدم رکھیں۔ انہوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرکے شاہانہ زندگی بسر کی اور آخر میں شہید ہوگئے۔

اسکا واقعہ یہ ہے کہ۔ جب سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم کرنا شروع کیا تو اسمٰعیل نے، خدا انکو جنت نصیب کرے، جہاد کا فتوی دینا شروع کر دیا۔ پہلے لوگوں کو تعجب معلوم ہوا کہ جہاد کا حکم بادشاہوں اور امیروں سے ہوتا ہے۔ کہاں اسمٰعیل اور جہاد۔ بعض لوگ بیان کرتے ہیں۔

محمد اسمٰعیل کی زبان میں اتنی تاثیر خدا نے دی تھی کہ ان کے آدھ گھنٹہ کے وعظ میں لوگ لاکھوں روپئے کا مال چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو جاتے تھے اور یہ واقعہ لارڈ الگن کے زمانہ میں ہوا تقریباً ۱۸۶۲ء میں۔ بس وہ یہی کہتے تھے اب نماز روزہ کا وقت گیا اب وقت آگیا جہاد کا دشمنوں کی راہ میں کمر باندھو اور خدا کی راہ میں اپنے کو قربان کردو۔ چنانچہ بہت سے لوگ جمع ہوگئے، مگر منافقین ادھر آگ لگانے لگے اور لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ بہتوں نے اسمٰعیل کا ساتھ چھوڑ دیا ایک مقام پر دشمنوں کی فوج نے حملہ کر دیا۔ اسمٰعیل کے ساتھ کل گیارہ سو آدمی تھے اور دشمن پچاسوں ہزار۔ اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔

ایک شخص مجھے اجمیر میں ملا وہ بہت بوڑھا تھا اسکا نام غنی تھا۔ اسکی کتابوں کی دکان تھی۔ اس نے مجھ سے کہا اسمٰعیل کی یہ حالت تھی کہ جس وقت وہ وعظ کرتے تھے اسی وقت لوگ اپنے تمام اشیا، واہل و عیال کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لیتے تھے اور میرا بھی جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ ہو جاؤں۔

محمد اسمٰعیل سے لوگوں نے پوچھا آپ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور آپ نے سید احمد سے بیعت کر لی۔ اسکے جواب میں انہوں نے کہا۔ نماز روزہ کے مسئلوں سے میں خوب واقف ہوں اور ایک مسئلہ پر گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے نماز پڑھنا نہیں آتا تھا۔ مولانا سید احمد نے مجھے نماز پڑھا دی۔ دراصل یہ وہ جماعت تھی، میرے بھائی، جو صحابہ کرام کے گروہ میں سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اور سب سے پہلے تو آدمی کو نمونہ بننا چاہیے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ ویسا ہی کریں اور جب اپنے ہی میں وہ صفت نہیں ہے تو دوسرے اس کی باتوں پر کیا عمل کرینگے۔ ایسے کوئی کتنا ہی بکا کرے، کیا ہوتا ہے۔

ایک شخص۔ حضور یہ جو لوگ کہتے ہیں۔ فلاں شخص بڑا ولی اللہ ہے تو اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور میں بھی۔

مولانا۔ بھائی یہ جو تم نے کہا بہت صحیح کہا ان کے پاس کوئی نئی شریعت نہیں آئی۔ وہ اسی پر عمل کرتے ہیں جس پر میرا عمل ہے۔ مگر حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ سے ارشاد فرمایا میں ابوبکر کو دوست رکھتا ہوں نا سلئے کہ وہ بہت نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ زیادہ نماز پڑھنے سے کوئی شخص خدا و رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا بلکہ اصل چیز ایمان ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جس کو تم بارہا سن چکے ہوگے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شریعت کی خدمت کرنے میں سبقت لے جائیں اب خیال کیجئے صحابہ کرام کو رشک بھی ہوتا تھا، خدمت شریعت میں اور مال خرچ کرنے میں اور یہاں یہ حال ہے کہ ہم رشک کرتے ہیں مال جمع کرنے، برے کام کرنے اور پہننے اور اوڑھنے میں۔ بہر کیف آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی آپ نے ارشاد فرمایا جس سے جو ہو سکے اس کار خیر میں حاضر کرو۔ چنانچہ لکھا ہے، اس دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا بس اس بار میں ابوبکر سے سبقت لے جاؤنگا حضرت عمر رضی اللہ نے اپنے مال کا دو حصہ مسجد نبوی میں حاضر کیا اور ایک حصہ اپنے بی بی کے بچوں کے لیے رکھ چھوڑا کیونکہ وہ بھی ضروری تھا۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عمر نے اپنے مال میں سے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لیے رکھا ہے اور باقی کو حاضر کیا اسی طرح دیگر صحابہ نے کہا۔ جب باری ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آئی تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں کہا۔ یارسول اللہ میں نے اپنے بی بی بچوں کے لیے خدا اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا اب ابوبکر سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

اس بحث سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ درحقیقت زیادہ نماز اور روزہ کی گنتی سے کوئی شخص بزرگ نہیں ہو سکتا، اصل دیکھنا ہے کہ وہ کس قدر شریعت کے احکام پر عامل ہے اور اس کے انجام دینے میں کس قدر کوشاں ہے۔

وہ شخص۔ مگر حضور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پھر ان کو کیوں فضیلت حاصل ہوئی۔

مولانا۔ میں نے آپ سے کہا نہ۔ پہلے آدمی کو چاہئے کہ جو لفظ بولے اس کے معنی پر غور کرے۔

ولی کے معنی چاہنے کے ہیں اور یہ لفظ مشتق ہے لفظ ولایت سے تو ولی اللہ کے معنی ہوئے اللہ کا چاہنے والا۔ انکی نمازوں کا کیا پوچھنا ہے۔ وہ اپنی نماز اس طریقہ سے پڑھتے ہیں کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں بس۔ اگر یہ کسی سے نہ ہو سکے تو وہ یہ تصور کرے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

وہ شخص۔ بس حضور۔ سمجھا ان میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔

مولانا۔ ہاں میرے بھائی۔ اتباع رسول اور اتباع خدا یہ اصل چیز ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء (سہ شنبہ)

اکرام علی۔ حضور مجھکو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دراصل صوفی کا مطلب کیا ہے۔

مولانا۔ صوفی کے معنی کھلے لفظوں میں یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ شخص شریعت پر عامل ہو اور ایک سنت بھی ایسی نہیں ہو جسکو وہ ترک کرتا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھنا چاہیئے کہ ایک آدمی ہے جو برسوں چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو اس مریض کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اس کی تلاش کرے کہ کہیں اس کو حکیم حاذق مل جائے اور بغیر حکیم کے اسکا کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد حکیم سے نسخہ لے مگر اب بھی وہ مریض نسخہ حاصل کرنے پر اچھا نہیں ہو گیا۔ اس لیے اس کو تیسری منزل طے کرنا پڑیگی اور وہ یہ ہے کہ اس نسخہ کے مطابق عمل کرے جو جو دوائیں اس میں لکھی ہیں اپنے حلق سے اتارے۔

جس طرح جسمانی تندرستی کے لیے تین مراتب طے کرنا پڑتے ہیں اسی طریقہ سے روحانی تندرستی کے لیے بھی تین منزلیں ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف حکیم مل گیا تو معاً حکیم کے ملنے سے بیماری دور نہیں ہو جاتی یا یہ کہ ایک نسخہ، خواہ جالینوس کا کیوں نہ ہو، حاصل ہو جائے اس سے ہرگز ہرگز بیماری دفع نہیں ہوتی جبتک اس کی دواؤں کو نہ پیئے۔ اسی طریقہ سے روحانی بیماری کے لیے سب سے پہلا کام ایک مریض کو چاہیئے کہ سمجھ لے کہ حکیم کی تلاش کے بغیر اس کو تندرستی نہیں ہو سکتی تو شریعت کی اصطلاح میں اس حکیم کا نام رسول ہے اور اس دنیا میں اب سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحیح علاج نہیں کر سکتا اس کے سوائے جتنے علاج ہیں سب ناقص ہیں۔

اس بنا پر جب آدمی کو حکیم مل گیا تو اس کے بعد نسخہ لکھا لینا چاہیئے۔ نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہے اس کو میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں مگر دقت یہ پیش آتی ہے کہ بیمار کو باوجود نسخہ مل جانے کے دوا نہیں پیتا اور بظاہر نسخہ لے لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نسخہ کے حرفوں اور لفظوں سے بیماری نہیں جا سکتی۔ اس کے لیے وہ بیمار جو مدتوں چارپائی پر لوٹ رہا ہے اور باوجود دوا آنے کے گھنٹوں پڑا۔ منہ بنا رہا ہے مگر دوا نہیں پیتا ہے اب صرف دوا بھی کچھ کام نہیں کرتی جبتک اس کو ایسا شخص نہ ملے کہ جب جب ضرورت ہو زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دے گھر پر ڈاکٹر پرہیز کرنے کے لیے بول گیا مگر جہاں آواز آئی گرم گرم چنے لیلو، فوراً منگوا کر کھا لیا کیا اس مریض کو یہ معلوم نہیں کہ چنا بیماری میں مضر ہے پھر وہ کیوں کھاتا چاہتا ہے درحقیقت اس کے اندر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کی دوا اور اسکا وجود بھی مریض کے لیے سودمند نہیں جبتک وہ اس کی تلاش نہ کرے کہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دیتا

اگرچہ وہ کتنا ہی منہ بنایا کرتا اور اس کی دوا کڑوی معلوم ہوتی۔ جب مریض کو اس بات کا احساس ہوجاتا ہے تو پھر وہ یہ کرتا ہے کہ وہ گھر سے اٹھ کر شفاخانہ میں جاتا ہے اب وہاں کی حالت دوسری ہے۔ گھر میں تو یہ حال تھا کہ جہاں برف کی آواز سنی فوراً برف کھالیا مگر جب یہاں پہنچا تو ایک ٹکڑا برف کا نصیب نہیں۔ ڈاکٹر آیا اور ایسی کڑی نظر ڈالی کہ مریض تھر تھرانے لگا اور دوا پینا پڑی۔ ڈاکٹر کہہ گیا اسکو بارلی دی جائے تو وہ اسی کو پی رہا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ مریض کی طبیعت گھبراتی ہوگی کہ کیوں اس بلا میں آگیا مگر جوں جوں بیماری ہٹتی جائیگی اور وہ تندرست ہوتا جائیگا خیال کریگا جس چیز سے میں بھاگ رہا تھا وہ عین تندرستی کا ذریعہ ہے اس کو صوفیا کرام کی بولی میں شیخ اور پیر کہتے ہیں۔

جب سے دنیا اور انسان قائم ہیں ہمیشہ نسخہ ایک چلا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دی اور جب نوح علیہ السلام کا ظہور ہوا تو اس نے اللہ واحد کو بتلایا۔ غرض یہ ہے کہ خدا کی شریعت ایک ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کیا دنیا میں کوئی ایک متنفس ملیگا جو یہ کہے جھوٹ بولنا ثواب ہے اور چوری کرنا اچھا ہرگز نہیں پھر کیوں وہ شخص باوجود علم ہونے کے اور نسخہ جاننے کے عمل نہیں کرتا ہے تو معلوم ہوا خواہ انسان کتنا ہی نسخہ لیکر چاٹتا رہے جب سوئے اپنے سرہانے رکھے۔ جاگے تو اسکا بوسہ دے چلے تو جیب میں رکھے غرض سب کچھ کرے سودمند نہیں ہوسکتا جب تک کوئی شخص نسخہ کی چیزوں کو اس کے حلق سے نہ اتار دے، تو دراصل جو پیر جو صوفی جو شیخ یہ کرسکتا ہے وہ ہمارا پیر ہے اور جس سے یہ کام نہیں ہوسکتا وہ ہمارا پیر نہیں ہے۔

پیر کی اطاعت اور اسکی پیروی ہر حالت میں مفید اور بہتر ہے بغیر اس کے صحت نہیں ہوسکتی۔ ایک مریض جب حکیم کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے۔ حکیم صاحب جو کچھ مجھکو پینے کے لیے دینگے میں فوراً آپ کی اطاعت کرونگا اور آپ کے حکم کو مانونگا اگر مجھکو تندرستی ملنی چاہئے تو کیا اس کا یہ کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر حکیم اس کو زہر دیدے تو وہ پی لیگا ہرگز نہیں، زہر تو اس کو اور مار ڈالیگا اس حالت میں وہ حکیم کی بات نہیں سنے گا اس لیے کہ وہ تندرست ہونے کے لیے آیا ہے مرنے کے لیے نہیں اسی طریقہ سے جن لوگوں نے پیر کی اطاعت اور اس کے قدم بقدم چلنے کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اگر خلاف حدیث اور قرآن کے پیر تعلیم دے تو اس کو بھی کرلینا چاہئے نہیں۔ بلکہ وہ تو آیا تھا اسلئے کہ قرآن اور حدیث کے مطالب کو سمجھے اور چونکہ وہ عمل نہیں کرسکتا ہے پیر اس پر اس کو عامل کرادے نہ اسلئے کہ اس کو زہر دیدے۔

پہلا مقام حقیقت کا پیرو سنت حکیم کی تلاش۔ دوسرا معرفت کا نسخہ تلاش کرنا اس کے بعد حقیقت۔ جب دوا پی لی تندرست ہوگئے۔ تینوں ایک ہی حقیقت کی متعدد کڑیاں ہیں ایک کے بغیر دوسرا نہیں ہوسکتا وہ

ہوتی جو شریعت پر عمل نہیں کرتا صوفی ہرگز نہیں کیونکہ بغیر شریعت کے کیونکر کوئی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

۱۹؍ دسمبر ۱۹۱۷ء (چہارشنبہ)

مولانا ابوالعلاء۔ مرزا غضنفر حسین و دیگر صاحبان قبل مغرب جامع مسجد میں جمع ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ (مرزا صاحب کے طرف مخاطب ہوکر) آپ غیر مقلدوں میں سے ہیں

مرزا صاحب۔ جی ہاں

مولانا ابوالعلاء۔ آپ آمین کیوں کہتے ہیں

مرزا صاحب۔ اسلئے کہ نبی صاحب نے آمین کہنے کا حکم دیا اور رسول اللہ کا خود اس پر عمل رہا اور جتنے صحابہ کرام گذرے ہیں سبھوں نے اسکو کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ میں نے سوال کیوں کیا

مرزا صاحب۔ آپ نے کیوں کہا میں نہیں سمجھتا۔ شاید آپ کے نزدیک میں نے کچھ گناہ کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ آمین پر تو میرا بھی عمل ہے۔

مرزا صاحب۔ آپ ہی بتلایئے کہ آپ آمین آہستہ کیوں کہتے ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل آمین کہنے میں آہستہ رہا اور آپ نے رفع یدین نہیں کیے۔

مولانا ابوالکلام۔ اجی یہ سب غیر ضروری مبحث ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ سب باتیں بھی بہت ضروری ہیں اور جس پر ہم عمل کر رہے ہیں اس کی میرے پاس دلیل موجود ہے مگر سارا دارومدار اس پر ٹھہر جاتا ہے کہ ایک کا کم نا فضیلت ہے اور دوسرے کا عدم فضیلت کچھ گناہ تو ہے نہیں اور جناب ان سب باتوں نے مسلمانوں کے اندر ایسا ضعف پیدا کر دیا ہے کہ وہی لوگ جانتے ہیں جنکو مسلمانوں کی آہ ان کے دل میں ہے۔ جو لوگ اس بات کو سمجھے ہوئے ہیں ان کو نیند نصیب نہیں ہوتی میں تو اس بات کی فکر میں رہتا ہوں کہ ان لوگوں کو ایسی باتوں کی مہلت کب ملتی ہے جب ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔ پچاس برس پیشتر کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے نزاع اور جھگڑے نے مسلمانوں کو کس قدر تباہ کر دیا ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مسجد سے نکال دیا پھر اس کا مقدمہ کفاروں کے پاس فیصلہ سے لیے گیا۔ قرآن اور حدیث کی توہین

کی جارہی ہے۔ لاکھوں روپئے برباد کر دیا صرف اتنی بات پر کہ ایک شخص آمین زور سے کہتا ہے دوسرا آہستہ سے مولوی صاحب رانچی کے مسلمانوں میں تو آج کل اس قدر اتحاد اور باہمی میل جول پیدا ہوگیا ہے کہ شاید کوئی گمان میں بھی نہیں لاسکتا۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے الگ تھا اور اب سب کوئی ملکر انجمن کے لیے کام کر رہے ہیں اب غیر مقلد بھی آتا ہے تو وہ بے باکی سے آمین زور سے کہتا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ خدا رانچی کے مسلمانوں کو نیک نیتی کا اجر دے۔

۲۰؍ دسمبر ۱۹۱۷ء (پنجشنبہ)

اسداللہ شاہ نے کہا حضور۔ ایک آدمی ہے وہ ایک عورت کو تقریباً ایک برس سے رکھے ہوئے ہے ایجاب قبول سے جب نکاح ہو جاتا ہے تو اس حالت میں جبکہ طرفین راضی ہیں مسئلہ کیا ہوگا۔

مولانا نے فرمایا۔ سب سے پہلے اس چیز کو سمجھ لینا چاہئے کہ شریعت جس چیز کو زنا کہتی ہے وہ کیا چیز ہے۔ دراصل شریعت کے کاموں میں سارا دارومدار نیت پر رکھا گیا ہے اور یہی ایک چیز ایسی ہے جسکو قرآن نے جابجا اشارہ کیا ہے۔ نیت اگر اچھی ہے تو انسان کا ہر قدم جو اس کام کے لیے اٹھیگا اچھا ہوگا اور اگر نیت خراب ہے تو یقینی اس کو اس کام میں ناکامیابی ہوگی۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھئے کہ آپ ایک مکان بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس میں ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ ایک مصمم ارادہ اپنے جی میں کر لیجئے کہ کس طرح کا مکان بنائینگے۔ جب آپ نے یہ ارادہ کر لیا تو پھر ایک کام آپ کا ہوگیا اور اگر کسی کے ارادہ میں ابھی شک ہے ابھی سوچتا ہے مکان بناؤں تو کہاں سے روپئے لاؤں اور اسی طرح کی باتیں غرض دن رات اسی وہم میں پیچاں رہتا ہے تو سمجھ لو ہرگز وہ مکان تیار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ میں نے ایک مثال دی۔ اب اسی طریقہ سے اور مثالوں کو لاؤ اور سمجھو کہ آیا اس کی نیت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہی ایک چیز بھی جسکو دنیا نے قبل ظہور شریعت گم کر دی تھی اور سوائے ناکامیابی اور بربادی کے کچھ اچھا نتیجہ نہیں نکلتا تھا مگر جب شریعت کا ظہور ہوا تو اس نے پھر اس بھولے ہوئے رہا کو یاد دلایا اور بتلایا کہ تمہارے یہ سب اسباب کام نہیں آئیں گے جبتک تم اپنے جی میں ارادہ کامل پیدا نہ کرلو۔ تم جانتے ہو کہ قرآن کریم نے ہمکو سورہ فاتحہ میں جو بتلایا کہ کہو ایاک نعبد وایاک نستعین۔ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ یعنی ایک مسلم کی کامیابی کا ذریعہ لوہے کے ہتھیاروں پر نہیں ہے، روپئے پیسوں سے کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی کامیابی کا ذریعہ اس کا ارادہ اور خدائے واحد پر بھروسہ کرنا ہے۔

[اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہوگیا]

۲۱ دسمبر ۱۷ء (جمعہ)

(خطبہ) اگلے جمعہ میں صفر کے مہینہ کے متعلق آگاہ کیا تھا کہ لوگ جو اس مہینہ کی نحوست اور بدشگونی اپنے ذہن میں خیال کیے ہوتے ہیں وہ محض غلط ہے اور اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جی میں آتا ہے کہ آج بھی اس پورے حدیث کے مطالب بیان کردوں اور یہ نہایت ضروری اور اہم مسئلہ ہے۔ صفر کے مہینہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاصفر .... صفر کی کوئی اصلیت نہیں پھر اس کے بعد فرمایا:

شگون کوئی چیز نہیں۔ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے کام شگون کی بنا پر کیے جائیں تو اچھا ہے مگر یہ شگون کوئی چیز نہیں صرف لوگوں کو جال اور مکر میں شگون کے ذریعہ پھنسانا چاہتے ہیں۔

نجوم کوئی چیز نہیں

مختلف جانوروں کی بولی میں کچھ دھرا ہوا نہیں ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں اگر کوّا اتنے مرتبہ آواز دیگا تو کام برآئیگا اور اگر اس رخ بیٹھے گا تو سفر میں خلل پہنچے گا خدائے تعالیٰ نے جانوروں کو اسلئے نہیں پیدا کیا کہ تمہارے کام برآویں بلکہ اس میں جو بھید ہے اس کی تمہیں کیا خبر۔

سایہ اور بھوت کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔ بلاشبہ جنوں کا وجود ہے اور ممکن ہے کسی جن کا اثر کسی آدمی پر ہو مگر بیماری کے لیے سایہ اور بھوت وجہ نہیں۔ [اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہوگیا]

[اس کے پہلے کا کاغذ ضائع ہوگیا]

مولانا کا بیان۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ گھر لوٹا جا رہا ہے اور ہمکو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایک خاندان ہو جس میں لوگ اپنے اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہوں ایک بھائی کہتا ہے میرا حق چھ آنا ہوتا ہے تم نے ساڑھے پانچ آنے کیوں دئے مگر سوال یہ ہے کہ اگر ان سب کو ایک جماعت ڈاکوؤں کی نظر آجائے اور دیکھیں کہ سب کے سب ان کے گھروں کو لوٹنے کیلئے آرہے ہیں تو پھر گھر والے کیا کرینگے۔ کیا آپس میں لڑتے رہیں گے یا دشمنوں سے بچنے کے لیے تلوار لیکر مقابلہ کرینگے اگر ان کا گھر لٹ گیا تو پھر ساڑھے پانچ آنے اور چھ آنے کا حق آئیگا کہاں سے۔ افسوس مسلمانوں پر آج انکا گھر لٹ رہا ہے، لڑکے اور بچوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا، پہننے کے لیے کپڑا نہیں، مگر پھر یہ غفلت، ایک مسلمان دوسرے سے اب بھی لڑنے کے لیے تیار ہے، تو عزیزان من جب مسلمانوں کی یہ حالت ہے اور وہ تلوار جو دشمنوں سے مقابلہ کے لیے دی گئی تھی اب چاہئے تھا کہ ان تلواروں سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے آج یہ حال ہے کہ وہی تلوار اپنے بھائی کی گردن پر چل رہی ہے۔

دشمن سے کیا وہ بچنے کی کوشش کرتے آج وہی ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو صرف کر رہے ہیں تو اے ماتم شعار! یہ کب ہو سکتا ہے کہ تم دشمنوں کی گرفت سے بچ سکو گے۔ ایسا سمجھنا حد درجہ کی غفلت ہے۔ دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور ایک دم میں مارنا چاہتے ہیں۔ اب بھی ہوشیار ہو جاؤ ورنہ یہ سب تمہارے آمین جہر اور بے جہر باقی نہیں رہیں گے جب اسلام ہی نہیں رہے گا تو تم کہاں ہو گے۔ دشمن تو آئیگا اور کہے گا ہر موحد کو قتل کر دیہ نہ پوچھیگا تم میں کون آمین پکار کر کہتا ہے اور کون آہستہ۔ بے شک یہ سب چیزیں بھی ہونی چاہئے مگر بعد کو۔ ابھی ضرورت حفاظت اسلام ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا چاہئے۔ جب یہی نہیں رہیگا تو ہم کہاں رہ سکتے ہیں۔ چھوڑ دو۔ جو آدمی زور سے آمین کہتا ہے کہنے دو اور جو آہستہ کہتا ہے وہ بھی آہستہ کہے۔

ایک شخص۔ اگر کوئی غیر مقلد نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟

مولانا۔ جب میرے یہاں فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے تو ان کے پیچھے کیوں نہیں۔ جب ایسا موقعہ ہو تو میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لونگا

••

اورنگ زیب

○ ہند عہد اورنگ زیب میں ح-۲

○ ——— مرزا سمیع اللہ بیگ

جسٹس حمید اللہ بیگ اور جسٹس نصر اللہ بیگ کے والد مرحوم جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۴ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے۔ اس کے واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزانِ وطن ہوں گے جن کے لیے اسے الگ سے ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو والے بھی اپنی میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے اردو اصل بھی!

حسن نظامی مرحوم نے جسٹس بیگ کا یہ کارنامہ "حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ" کے نام سے دوسری بار ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا اور اب تیسری بار یہ بیش قیمت تحریر آپ کی خدمت میں پہنچ رہی ہے۔ جسٹس سمیع اللہ بیگ حیدر آباد میں میر عادل (چیف جسٹس) تھے اور انھیں نواب مرزا یار جنگ بہادر کا خطاب ملا تھا

—— ادارہ

هند عہد اورنگ زیب میں-۲

مرزا سمیع اللہ بیگ

مسئلہ اتحاد پر ایک نظر

باب ہذا میں تین امور پر غور کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ ہندو برادران وطن کو عہد مغلیہ کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ دوّم یہ کہ مسلمانوں کو عہد کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ اور تیسرا یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی بہترین تدبیر میری رائے میں کیا ہے؟

حصۂ اوّل۔ اہل ہنود کا نقطۂ نظر

خلاصہ کی استدعا

قبل اسکے کہ میں اہل ہنود کے صحیح نقطۂ نظر کے متعلق زبان کھولوں مجھ کو ناظرین معاف فرمائیں گے۔ اگر اس خاتمہ کے باب میں مختصراً ان واقعات کا اعادہ کردوں جنکے ثابت کرنے کی کوشش پچھلے ابواب میں کیگئی ہے کیونکہ دراصل انہیں واقعات کی مدد سے اہل ہنود کے صحیح نقطۂ نظر کی بنا

رائے قایم کیجائیگی۔ پچھلے ابواب میں عہد اورنگ زیب کے ہندوستان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کیگئی ہے۔ اسکے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ عہد مغلیہ کے دور کا درحقیقت یہ آخری بادشاہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ کا یہ متعصب ترین مسلمان بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔

تعلیم

باب دوم میں دکھایا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں صرف ایک ہی شہر "ٹھٹہ" میں مسٹر ہملٹن انگریزی سیاح نے چارسو درسگاہیں دیکھیں اور وہ اس حیثیت کی تھیں اور وہ انکو ایسی شان کی نظر آئیں جن کو وہ کالج کہتے ہیں کیا دنیا کا کوئی دوسرا حصہ اشاعت تعلیم میں اس سے زیادہ اس وقت مصروف تھا۔؟

مذہبی رواداری

باب سوم میں یہ دکھایا جاچکا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی مذہبی رواداری و بے تعصبی کی یہ حالت تھی کہ ایک انگریز سیاح کو مذہب کے اعتبار سے ہندو مسلمانوں میں امتیاز دشوار ہوگیا تھا۔ آج بھی ہندوستان میں لاکھوں روپے کی ایسی جاگیریں موجود ہیں جو شاہان مغلیہ نے مندروں کی امداد کے لیے عطا کی تھیں خود اورنگ زیب کے متعلق جسکو بڑا متعصب کہا گیا ہے ابھی چند دن ہوئے ایک واقف حال مسلمان نے ہندو مسلمانوں کے بھرے مجمع میں یہ بیان کیا کہ صرف بنارس میرے ساتھ چلیے چلو تو میں وہاں کے پجاریوں سے انکی اسناد نکلوا کے دکھادونگا کہ ان میں سے قریب قریب سب اسی بادشاہ کی عطیہ ہیں عیسائیوں کو بھی گرجے بنانے کی اجازت دیگئی تھی۔ اب ذرا اس زمانہ کی یورپ کی تاریخ پڑھیے

اور وہاں کی مذہبی خونریزیوں سے ہند کی حالت کا مقابلہ کیجئے اُس وقت معلوم ہو گا کہ مذہبی رواداری کے معاملہ میں عہد مغلیہ نے اس ملک کو کہاں تک تیار کیا تھا۔

تجارت، تمول و فارغ البالی

باب چہارم میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص عبد الغفار کا سرمایۂ تجارت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا اور صرف احمد آباد و سورت کے تجارتی محصول کی آمدنی اسقدر تھی کہ اُس زمانہ کے انگریز سوداگر و سیاح کو بے اختیار رشک ہوا۔ اس زمانہ میں اشیائے مایحتاج کا نرخ بھی بتایا جا چکا ہے۔ تجارت، دولت اور فارغ البالی کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دنیا کے کسی ملک کا مقابلہ ہند سے کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ عہد مغلیہ میں تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل تھا۔

انصاف و امن و امان

باب پنجم میں انصاف و امن و امان کے ضمن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک انگریز کی جسنے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سفر کیا تھا اور وہاں کے حالات کو بغور کامل دیکھا بھالا تھا یہ رائے ہے کہ مسافر بغیر جان و مال کے کچھ خطرے کے تمام ہندوستان میں اسوقت بآسانی سفر کر سکتے تھے ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہند کے دور و دراز مقامات سے دہلی تک خط پہونچنے میں صرف آٹھ روز صرف ہوتے تھے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسا انتظام قائم رکھنے کے لئے نقل و حمل، سڑکوں اور راستوں کی حفاظت کے کیا کیا نہ انتظامات ہوں گے۔

صنعت وحرفت

اب صنعت وحرفت کے شعبہ کو دیکھئے۔ عہد مغلیہ نے ہند میں یہ حالت پیدا کردی تھی کہ صرف ایک شہر کے کارخانے میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ یہ قصے کہانی نہیں ہیں تاریخی واقعات ہیں۔ المختصر یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی عینی شہادت کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۲۴ء میں جو بڑی نمائش دولت برطانیہ کے تمام ممالک کی ہوئی ہے اسمیں ہندوستان کے سکشن یعنے حصہ میں مجھ کو ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی ایک بھی ایسی چیز نہ دکھائی دی جو عہد مغلیہ میں نہ بنتی ہو یا جسکا بنانا عہد مغلیہ کے بعد اس ملک نے گزشتہ صدی میں سیکھا ہو۔ ان تمام واقعات اور امور کے متعلق باب ششم ملاحظہ فرمائیے۔

یوروپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

اگر ناظرین کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ملک کی تجارت وتمول کے بڑھانے میں اور ایشیا و یورپ کو یکجا ملادینے میں عہد مغلیہ میں کیا کیا کوشش کیگئی ہیں تو ذرا عہد اورنگ زیب کے وہ حالات جن کی دستاویزی شہادت آج موجود ہے باب ہشتم میں ملاحظہ فرمائیں اسی باب میں انگریزی کمپنی کی اصلی خط وکتابت و اورنگ زیب کے اصلی فرمان کی نقل کی گئی ہے۔

یوروپین تجار کی کم ظرفی

اگر ناظرین کو ان مشکلات کا اندازہ کرنا ہے جنہیں عہد مغلیہ کا آخری دور پھنسا ہوا تھا اور اگر اپنے ملک کے عہدہ داران کے عادات واطوار کا مقابلہ ان لوگوں کے کیرکٹر سے کرنا منظور ہے جنکی ڈپلومیسی (حکمت عملی) اور تدبیر نے سلطنت مغلیہ کی بیخ کنی کی تو باب نہم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ خلاصہ ہے ان واقعات کا جن کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا

جاچکا ہے۔

کل ہند کو ایک امپائر سلطنت بنادیا

اب اِن تمام کوششوں کا مجموعی اثر ہندوستان پر کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ بالآخر کُل ہندوستان ایک ملک ہو جائے۔ اُس کا ایک تمدن ہو جائے اُس کے بڑے بڑے پہاڑ اور دریا اسکے باشندوں کو جُدا نہ کر سکیں تو اس کی بنیاد قادر مطلق نے شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں سے ڈلوائی تھی اور اسکے فخر کا سہرا اورنگ زیب ہی کے سر پر زیب دیتا ہے کہ اسی بادشاہ اورنگ زیب کے آخری عہد میں ہند نے ایک متحدہ سلطنت وامپائر کی صورت اختیار کر لی تھی مغربی ہند، مشرقی ہند سے اور شمالی ہند جنوبی ہند سے مل گیا تھا اُسکے باشندے بہت کچھ خلط ملط ہو چکے تھے۔ تمام ہند مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر ایک تخت دہلی سے اسطرح وابستہ ہو گیا تھا کہ گویا سارا ہندوستان ایک ہی ملک ہے۔ صوبوں کی قریب قریب اسی تقسیم ہند پر آجتک عمل ہو رہا ہے۔

قوانین بنائے

آج برٹش انڈیا میں جو قانون مال و وصول مالگزاری رائج ہے اُسکی نسبت کیا کسی کو انکار ہے کہ اسکا ڈھانچہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو سلطنت کے ڈیزائن (Design) و نمونہ کے بنانے کی زحمت ہی نہیں برداشت کرنی پڑی بلکہ اُن کو بنی بنائی تیار عمارت مل گئی۔ البتہ حسبِ ضرورت وہ اسمیں ترمیم و تغیر و تبدل کرتے رہے ہیں اور مرورِ زمانہ اور رعایا کے تبدیلی خیالات کیساتھ ترمیم کرنی رہنی پڑے گی جیسا کہ ہر سلطنت کو کرنا پڑتا ہے۔ سلطنت میں نصفت و عدالت

و قانون شہادت و دیگر علوم سائنس کے وہ اصول جن سے اسپین کے فاتح عربوں نے یورپ کو مستفیض کیا تھا ہندوستان میں اُن کے رائج کرنے والے عہد مغلیہ کے حکمران تھے۔

ہند کا قدیم تمدن

ہم کو اس ملک کے تمدن سے ایک خاص اُنس ہے۔ اُسنے نہ صرف روحانی تعلیم اور ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے تھے بلکہ فن حکمرانی میں بھی قدیم دنیا میں ایک خاص امتیازی رتبہ حاصل کیا تھا۔ ہماری رائے میں اس ملک کے لئے عرصہ تک وہی تمدن موزوں تھا مگر ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تمدن ہند کی معراج ترقی کا آخری زینہ تھا۔ انسانوں کو بلحاظ انکے پیشہ کے مختلف طبقات میں تقسیم کر دینا اور پھر اُن میں طرز معاشرت کی ایسی آہنی دیواریں بنانا کہ آپس میں شادی بیاہ کھانا پینا تو درکنار محض چھو جانا بھی بعض اوقات معصیت میں شمار ہو یا حصول علم کے حق کو انسانوں کے مخصوص طبقہ یعنے برہمنوں میں محدود کر دینا یا غیر مذاہب کے افراد سے امتیاز و مغایرت برتنا یا تجارت و تحصیل علم کے لئے ممالک غیر میں سفر کرنے سے احتراز کرنا۔ یا صرف یہی نہیں کہ چودہ پندرہ برس کی بیوہ کی شادی نہ کرنا بلکہ اُس کو ستی کر دینا اور اسی قسم کے تمام روایات و رواج جو ہند کے قدیم تمدن میں داخل ہوگئے تھے سوسائٹی (Society) کی اُس حالت کے اعتبار سے جب اہل ہنود بطور آریہ قوم کے ابتداءً اس ملک میں آئے تھے شاید ضروری و لازمی ہونگے لیکن آج یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ تمدن اپنی نوعیت میں ایسا تھا کہ ہندوستان کی روز افزوں ترقی کیساتھ دائماً قایم رہ سکتا تھا۔

قدیمی تمدن میں ضروری لوچ پیدا کر دیا

جس قدیم تمدن کا ذکر کیا جا رہا ہے ممکن ہے کہ وہ ویدانت کی تعلیم نہ ہو مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ تمدن ہند میں قایم ہو گیا تھا۔ میری رائے میں اس تمدن میں جو ضروری تبدیلیاں آج بہت سرعت کے ساتھ ہو رہی ہیں اُنکی ابتدا کرنے کا سہرا ابھی عہد مغلیہ کے سر پر بندھتا نظر آتا ہے جب مسلمان اس ملک میں آئے وہ بھی یہاں اسیطرح بس گئے جیسے آریہ زمانہ کے اہل ہنود آباد ہو گئے تھے لیکن یہ اپنے ساتھ ایک دوسرا تمدن لائے جسکا خمیر اُنہوں نے اہل ہنود کے قدیم تمدن میں شریک کر دیا جس تمدن کی رو سے کسی زمانہ میں ایک مسلمان کو ہندو کا چھونا تو درکنار ایک ہی ہندو مذہب کے بعض فرقے ایک دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے۔ اس میں مسلمانوں نے یہاں آکر تغیر پیدا کرنا شروع کیا۔ اور عہد مغلیہ میں بالآخر یہ عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی بنکر ایک ہی دیوار کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہند کے کل بچھڑوں کو ایک سطح پر لانے کی عملی ابتدا اسی عہد مغلیہ سے ہوئی تھی۔ اسی عہد مغلیہ میں تحصیل علم کے حق کا دائرہ وسیع کیا گیا اور کایستھوں کا شمار اہل قلم میں ہو گیا چھوت کے رواج کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر رہبران قوم کی تعلیم آج یہ ہے کہ وہ رواج اس ملک کی ترقی کے لئے زہر قاتل ہے۔ لیکن اس سبق کی الف۔ ب اہل ہند کو عہد مغلیہ ہی سے پڑھانا شروع کر دی گئی تھی ہر نئے رواج و رسم کی ابتدا کسی سوسائٹی کی چوٹی سے ہوا کرتی ہے لہذا اکبر بادشاہ نے ستی کے قدیم رواج کو زبردستی موقوف کر کے ہندو و مسلمانوں میں شادی کا رواج بھی قایم کرنا چاہا تھا اور اسکی ابتدا خود ہی کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ہند کے قدیم سخت تمدن میں جو لوچ

آج نظر آرہا ہے اور جسکی وجہ سے ہند جدید تمدن کی روز افزوں ترقی کا بار برداشت کرسکتا ہے وہ لوچ عہد مغلیہ ہی سے برابر پیدا کیا جارہا ہے تب کہیں یہ موجودہ حالت رونما ہوئی ہے۔ اس لوچ کے پیدا کرنے میں اب اُن موانع اور زحمتوں کا سامنا نہیں رہا جو ابتدا میں مسلمانوں کو اُس وقت پیش آئیں اور برداشت کرنی پڑیں جبکہ اُنہوں نے ہندوؤں کی دیوار سے اپنی دیوار ملا کر رہنا شروع کیا تھا۔

بڑے بڑے شہر بسائے

اِس عہد مغلیہ میں سرزمین ہند پر اتنے بڑے بڑے شہر آباد کیے گئے کہ جب لارڈ کلایو (Lord Clive) یا لارڈ وارن ہیسٹنگز (Lord Warren Hastings) (دونوں میں سے کوئی ایک جسکا پورا خیال مجھ کو اس وقت نہیں آتا) شہر ڈھاکہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی آبادی و تجارت کو دیکھا تو یہ کہا کہ لندن و ڈھاکہ میں صرف اسقدر فرق ہے کہ ڈھاکہ کی تجارت لندن کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے۔ اُن بڑے شہروں میں سے بعض بعض آج بہت ہی پست حالت میں ہیں مثلاً شہر ٹھٹھہ جو سندہ کا ایک زبردست شہر تھا جہاں چار سو درسگاہیں تھیں وہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ اب رہگیا ہے یا شہر شادی آباد مندو جسکے خوشنا کھنڈر علاقہ ریاست دھار میں آج اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا اظہار زبانِ حال سے کر رہے ہیں ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔

عمدہ عمارتیں بنائیں

سرسینک آرٹ Saracenic Art کی کیسی کیسی خوبصورت خوبصورت محرابدار سنگمرمری کی عمارتیں، وسیع سڑکیں۔

کاروانسرائیں، کیسے کیسے باغات، آبرسانی کے عجیب وغریب ذرائع اور تالاب بنا بنا کر سرزمین کو خوشنما و آراستہ کرنے کی کوشش اسی عہد مغلیہ میں کی گئی۔

دریا سے تجارت بڑھائی

ہند کے بڑے بڑے دریاؤں سے تجارت و آبپاشی کا کام لیا گیا۔ جو تجارتی جہاز ان دریاؤں میں دوڑا کرتے تھے انکا کچھ تذکرہ باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

پہاڑوں کو فردوس بریں بنایا
کشمیر کے حالات

زمین اور دریا کا ذکر ہو چکا اب اگر ناظرین کو اسکا اندازہ کرنا ہے کہ عہد مغلیہ نے بنی نوع انسان کی راحت و آرام میں اضافہ کرنے کے لئے پہاڑوں کو کس طرح زیر و زبر کیا اور ان جنگلوں کو جہاں شیر، چیتے، ریچھ، وغیرہ درندے رہا کرتے تھے۔ کاٹ کاٹ کر کیسی کیسی نئی بستیاں آباد کیں تو عالم تصور میں میرے ساتھ کشمیر کی جانب رخ کریں اور جموں سے لیکر سرینگر تک ڈیڑھ سو میل کی قدیم شاہی سڑک پر سفر کریں۔ راستے میں ویری ناگ۔ اچھل۔ اسلام آباد اور دوسرے آس پاس کے مقامات پر عہد مغلیہ کے تمدن کے آثار زیر زمین تو حماموں کی دبی ہوئی ٹوٹیوں میں اور بالائے زمین پرانے باغات ٹوٹے پھوٹے فواروں اور کہیں کہیں بڑے بڑے واٹر ورکس کی صورت میں دیکھتے چلیں۔ سرینگر پہونچنے سے قبل راستے میں اُس زعفران زار کی بھی سیر کر لیں جسکی جڑیں سرزمین ہند کو معطر کرنے کے لئے ایران سے لائی گئی تھیں اور جن کو دیکھنے کے لئے آج بھی دور دور سے سیاح جایا کرتے ہیں۔ سرینگر

پہونچکر پہلے اس نسیم باغ کو دیکھیں جہاں صدیوں کے پرانے چنار کے عظیم الشان وتناور درخت کھڑے ہوئے اپنے ایرانی النسل ہونے کا اظہار کر رہے ہیں یہ چنار کا درخت جسپر وادی کشمیر کو آج اس قدر فخر اور ناز ہے بلکہ وہ عزیز ہے کہ وہاں کے قانون کے بہ موجب اس کی شاخ کاٹنا بھی جرم ہے عہد مغلیہ ہی میں ایران سے لاکر یہاں لگایا گیا تھا۔

کشمیر کا قدیم کالج و دار الاقامہ

اس نسیم باغ میں مشرق رو کھڑے ہونے سے آپکی نظر بار بار دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر پڑیگی جس پر ایک عالیشان پختہ ویران عمارت دکھائی دے رہی ہے راستوں کے نشانات بھی نظر آئینگے۔ مگر وہاں کسی آدم زاد کی صورت نہ دکھائی دیگی۔ منظر دلفریب عمارت بہت بڑی لیکن ویران اور ہو کا عالم ہے۔ اسکے آس پاس بھی کوئی مکان نظر نہ آئیگا۔ ناظرین کا جی چاہیگا کہ ہم کو قریب سے ایک نظر دیکھیں۔ لیکن کشتی کا کشمیری مانجھی (ملاح) یہ مشورہ دیگا کہ وہاں نہ جائیے۔ وہاں جنات ہیں، بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہے ہر طاق و گوشہ میں پڑے سو رہے ہیں اور شیروں کا مسکن ہے ناظرین متحیر ہو کر دریافت کریں گے کہ آخر یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تھی۔ زیادہ دریافت سے معلوم ہوگا کہ یہ وہ کالج ہے جسمیں پڑھنے کے لئے عہد مغلیہ میں دور دراز کے سفر طے کر کے طلبا آیا کرتے تھے۔ اور جو محرابیں نیچے نظر آرہی ہیں وہ طلبا کا دار الاقامہ و بورڈنگ ہوس تھا۔ گھنا جنگل کاٹ کر وہ پہاڑ طلبا سے آباد کیا گیا تھا۔ ابھی تو اس سنسان عمارت کی خاموش دیواریں عہد مغلیہ

کی کوششوں اور تمدن کے نشانات کا کام دے رہی ہیں اور زبان حال سے اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا قصیدہ اور اپنی تباہی و بربادی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں مگر کچھ برسوں کے بعد وہ دیواریں بھی جب مسمار ہو جائینگی اسوقت میری اس کتاب کے پڑھنے والے شاید یہ کہیں گے کہ یہ شخص نہ معلوم کس عمارت کا ذکر کر گیا۔

چشمہ شاہی

جس پہاڑ پر یہ عمارت ہے اُسی کے نیچے سرینگر کا وہ مشہور و معروف چشمہ شاہی ہے جسکو شاہان مغلیہ نے ایک خوبصورت عمارت کی آغوش میں محفوظ کر کے ایک فوارے کی صورت میں مبدل کر دیا ہے۔ عہد مغلیہ میں کشمیر کے چشموں کی حفاظت اور قدر و منزلت کا یہ ایک نمونہ مشتے از خروارے ہے۔

نشاط باغ و شعلہ ماہ باغات

اس مقام سے دو تین میل کے فاصلہ پر عہد مغلیہ کے وہ باغات ہیں جن کو عوام الناس نشاط باغ و شالامار (دراصل شعلۂ ماہ، تھا) کہتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا مجھے سرینگر کے ڈائرکٹر (Director) صاحب زراعت نے جنکے چارج میں وہ باغات تھے یہ بیان کیا تھا کہ جب لارڈ منٹو وائسرائے ہند کشمیر تشریف لیگئے تھے تو انھوں نے عہد مغلیہ کے یہ باغات دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ اسوقت یہ باغات بہت ابتر حالت میں تھے اسٹیٹ نے کچھ روپیہ صرف کر کے انکی درستی کرائی پھر بھی جا بجا کیچڑ سے انکو گزرنا پڑا تھا اب تو میں نے انکو دیکھا کہ اچھی حالت میں ہیں مگر انکے پرانے در و دیوار فوارو اور درختوں سے انکے اصلی حسن کی صرف جھلک دکھائی دے رہی ہے کیونکہ اب

نیا جامہ پہنانے کی کوشش کیگئی ہے جن ڈائرکٹر صاحب زراعت کا میں نے ذکر کیا وہ ولایت کے تعلیم یافتہ اور فن زراعت کے ماہر تھے وہ فرماتے تھے کہ اب ایسے باغات کا بنانا تو درکنار انکا قائم رکھنا بھی دشوار ہے۔ ناظرین کے قیمتی وقت ضایع ہونے کا خوف میرے دل پر طاری ہے مگر میں عہد مغلیہ کے کشمیری باغات میں داخل ہو رہا ہوں اگر انکے بیان کرنے میں ذرا طوالت ہو جائے تو معاف فرمائیں۔ ناظرین کے ذہن میں اگر ایسے ایک باغ کی بھی صورت آجائے تو وہ حضرات جنہوں نے کشمیر نہیں دیکھا ہے اُن تمام باغات کا تصور کر سکتے ہیں جن سے عہد مغلیہ میں وادیٔ کشمیر اسطرح آراستہ و پیراستہ کیگئی تھی جیسے کسی دلہن کو کوئی کامل مشاطہ بناؤ سنگھار سے سنوارتی ہے۔ نشاط باغ و شالامار باغ میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے انکا پرانا پھاٹک، نقارخانہ زینہ اور دیواریں خاموشی سے اپنے تعمیر کرنیوالوں کی شان و شکوہ اور فراخ حوصلگی کی نسبت سرگوشی کرینگی مگر سامنے باغ کا نظارہ اتنا موقع نہ دیگا کہ اسطرف توجہ کیجائے اس منظر کا سماں یہ ہے کہ ایک پہاڑ کو چوٹی سے لیکر نیچے سڑک تک اسطرح تراشتے چلے آئے ہیں کہ اسمیں زینوں کی کیفیت و صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر زینہ نہایت وسیع اور بہت لمبا چوڑا ہے جس پر ایک خاص ڈھنگ سے چمن بندی کیگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ پر اسکی چوٹی سے دامن تک باغوں کے زینے بنا دئے ہیں۔ اِن زینہ نما باغات کے وسط میں اوپر سے نیچے تک چار پانچ گز چوڑی پانی کی چادر ماہی پشت تراشے ہوئے

پتھروں سے گزرتی ہوئی ہر زینے پر اسطرح گر رہی ہے گویا سبز مخمل کے فرش پر صاف و شفاف جالی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ہر زینے پر جہاں یہ چادر گرتی ہے ایک حوض ہے جو اس پانی کو پہلے اپنے آغوش میں لیتا ہے اور پھر گویا فرط نشاط سے اسکو گھماتا، نچاتا، اور اڑاتا ہوا بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا آسمان کی طرف اچھالتا ہے۔ یہی اس باغ کے فوارے ہیں۔ پھر یہ بہتا ہوا پانی دوسری چادر بناکر اس سے نیچے والے زینے کے حوض میں گرتا ہے اور اسی قسم کی اٹھکھیلیوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اوپر تھا۔ چونکہ پانی برابر رواں ہے اسلئے اوپر سے نیچے تک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تمام چادریں اور فوارے ایک ہی ساتھ اوپر سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آرہے ہیں اور بالآخر سب سے نیچے والے حوض سے گزر کر خدا حافظ کہتے ہوئے اس خوبصورت وسیع ڈل جھیل میں گر کر غائب ہو جاتے ہیں جو دامن کوہ میں انکو اپنی آغوش میں لینے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے کی سریلی آواز اور حوض کے فواروں کی گنگناہٹ کشمیر کے ان خوبصورت رنگ برنگ خوش الحان طیور کو راگ سُر کا کام دیتی ہے جو آس پاس کے خوشنما خوشبودار درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے چہچہاتے ہیں اور بعض تو من و عن واقعی گاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نشاط باغ و شالامار باغ کا یہ پہلا سماں دیکھکر یقین ہے کہ ناظرین کی زبان پر کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

بے اختیار آجائے اور وہ اسکی واقعیت کی صدق دل سے تصدیق کریں
اب ناظرین باغات میں ٹہلتے ہوئے زینہ بہ زینہ پہاڑ کی چوٹی تک قدم بڑہائیں
اگرچہ راہ مین ہر چمن اور اسکی ہر کیاری آنکھوں کو ایسی مرغوب ہوگی کہ ہر قدم
پر قدم بڑہنے کو جی نہ چاہیگا اور ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کی کیفیت ہوگی۔ مگر اس موقع پر ہم کو تو صرف عہد مغلیہ کا تمدن دکھانا مد نظر ہے
اسلیئے ہم نے پھولوں پر نظر بھی نہیں ڈالتے بلکہ جلدی سے چوٹی کے باغ
پر پہنچتے ہیں۔ یہاں پہلے اُس کُنجی کے انتظام کو دیکھیے جو تین سو برس قبل
اصلاح بنائی گئی تھی ایک جنبش سے باغ کے تمام فوارے اور چادریں آناً فاناً میں
بند ہوسکتی ہیں اور دوسری جنبش سے پھر رواں ہوسکتی ہیں یہ ایسی حکمت تھی جس سے
پہاڑ کی چوٹی پر پانی کے قدرتی چشمہ کو قابو میں کرلیا گیا تھا۔ اسکے بعد کچھ
اور سیرگاہوں کے نشانات وآثار پر نظر ڈالتے ہوئے پرانے سایہ دار چنار
چنار کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہوئے ان تیلی تیلی
سڑکوں پر (جو ایک بڑے حوض کو اقلیدس کی مستطیل و مربع شکلوں میں کاٹ کر
اسکے اندر بنائی گئی تھیں اور جنمیں شفاف پانی کے فوارے ہر جانب طرح طرح
کے رقص کا سماں دکھارہے ہیں) چہل قدمی کیجیے۔ بالآخر اُس چھوٹی سی

عمارت میں جو وسط حوض میں بنی ہوئی ہے اور جو اپنے محرابوں چھتوں اور مینا کاری کے کام سے سرسینک آرٹ (Saracenich Art) کا نمونہ ہے آرام فرما ہے۔ اب اس سنگ مرمر کے تخت پر جس پر نورجہاں جلوہ افروز ہو کر مناظر قدرت کا تماشا دیکھا کرتی تھیں مغرب کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جائیے۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ پہاڑ کی چوٹی ہے سامنے اُن باغات کے زینے ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے اُنکے بعد صرف ایک سڑک درمیان میں ہے پھر میلوں تک اس ڈل جھیل کا پانی سطح پر انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آئیگا جسکی شفافی کی یہ حالت ہے کہ تہ میں مچھلیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور پانی کے اندر جو درخت اور بیل پھول ہیں بعض مقامات پر انکی پتی پتی دکھائی دیتی ہے (شکارہ میں چلتے وقت اس شفاف پانی میں آس پاس کے پہاڑوں اور باغوں کا جو عکس پانی میں لہراتا نظر آتا ہے اکثر میں اپنی نظر اُس سے منٹوں تک نہ ہٹا سکا) خیر اس تخت شاہی سے نظر اور آگے بڑھائیے اور سامنے دور گلمرگ وغیرہ کے برفانی پہاڑوں کو دیکھئے جنکی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اگر یہ وقت طلوع آفتاب کا ہے تو تصور میں ہر چیز پر روپہلی افشاں چھڑکی ہوئی نظر آئیگی اور اگر غروب آفتاب کا وقت ہے تو آپ جہاں کھڑے ہیں۔ یہاں سے لیکر برفستان تک یہ معلوم ہوگا کہ سنہری کرنوں اور تمازت کا مینہ برستا ہے یہ مختصر بیان اس منظر کا ہے جو میں نے اکثر نشاط باغ و شالامار باغ جا کر دیکھا ہے۔

نورجہاں کے مذاق کا عکس

نشاط باغ و شالا مار جسکا بیان ابھی ہوا در اصل نورجہاں نے تیار کرائے تھے۔ جہاں جہاں شیریں چشمہ معلوم ہوا یا جہاں پر لطف منظر دکھائی دیا وہاں اس مغلیہ خاتون نورجہاں نے اپنے خیالات و مذاق کا عکس باغات کی صورت میں اسطرح چھوڑ دیا کہ آج تین سو برس بعد بھی ہم اُس سے لطف اٹھا رہے ہیں جب اس بڑھاپے میں ان باغات کے مناظر کا یہ عالم ہے تو جوانی میں دلفریبی کی کیا حالت ہوگی ہیں نے اس نمونہ کے باغات کے آثار ویری ناگ اور اچھبل وغیرہ مقامات پر بھی دیکھے ہیں۔ ان پہاڑوں سے کیا دلی تعلقات ہونگے جنہوں نے انکی یہ قدر و منزلت کرائی جسکا صرف خیال کرنے سے وجد آتا ہے غالباً ایسے ہی وجد کی حالت میں عرفی نے کشمیر دیکھکر وہ قصیدہ لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

جامع مسجد

ناظرین کو عہد مغلیہ کی قدیم عمارت میں لیجائے بغیر میں سرینگر کے حالات ختم نہیں کرسکتا۔ سرینگر میں آج بھی مسلمان اُس جامع مسجد میں خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو عہد شاہجہاں میں بنی تھی ایکا پھاٹک اسکا صحن اور اسکی چھت کے ستون آج تک اُسکے بنانے والوں کے پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ تمدن کا ثبوت ہیں ہر ستون دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلند دیو قامت درخت کا زبردست تنہ سالم کا سالم زمین میں نصب کر دیا گیا ہے

وہ کونسا جرثقیل تھا جو اُن ستونوں کو جنگل سے وہاں لایا۔ ہم گزشتہ تیس
چالیس برس سے ایسی عمارتوں میں لکڑی کے شہتیروں کے بجائے لوہے
کے گرڈر بلحاظ صفائی وسہولت استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن عمارت میں
ہم کو لوہے کی عمر ابھی پوری طرح معلوم نہیں ہوئی۔ تین سو برس کی پرانی
مسجد کے ان ستونوں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمارت میں
لکڑی کی عمر زیادہ نہ ثابت ہو۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے سرینگر کا دورہ کیا ہے تو وہاں کی رعایا
نے کچھ شکایتیں اُنکے حضور میں پیش کیں اُس پر ایک فرمان نافذ ہوا اور
یہ فرمان زبان فارسی میں اُس پتھر پر بجنسہ کندہ کر دیا گیا جو مسجد کے پھاٹک
پر آج بھی نصب ہے اس کتبے میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا
خلاصہ بدیں مضمون ہے کہ "ما بدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ
زعفران کی پتی چننے والوں کو اور شال پر سوئی کا کام بنانے والوں
کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں
کہ اس قسم کے کام کرنے والونکی آنکھوں پر کسقدر زور پڑتا ہے۔ امید ہے کہ
آیندہ ایسی شکایات ما بدولت کے کانوں تک نہ پہنچنگی" ناظرین خیال کر سکتے
ہیں کہ رعایا کی رسائی اس بادشاہ تک کیونکر ہوتی تھی اور اس بادشاہ
کے دل میں اپنی رعایا کے ساتھ کس درجہ ہمدردی تھی اور اس کی تحقیقات
اور معلومات کی کیا حد تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ان مزدوروں اور کاریگروں
کو کیسی کچھ مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور اسکا انکی صحت پر کیا مضر

اثر ہوتا ہے لہٰذا اس نے محض کاغذ پر حکم لکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رعایا کی تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظر تمام پر کندہ کرا دیا جو اسوقت تک اس کی بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمک رہا ہے۔

مینے ناظرین کا بہت وقت ضایع کیا جسکی معافی چاہتا ہوں لیکن میرا اصلی مقصد بغیر اس تفصیلی بیان کے شاید نہ حاصل ہوتا۔

کشمیر کا تمدن

اب ان تمام واقعات پر فلسفیانہ گہری نظر ڈالئے۔ سائنس یہ بتلا رہی ہے کہ ہزاروں میل کے لمبے چوڑے سمندر میں ایک کنکری چھوڑ دی جاتی ہے تو گو ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں مگر اس کنکری سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ اوسوقت تک ختم نہیں ہوتی جبتک اسکو سمندر کا کنارہ نہ ملے۔ اسیطرح اگر ہوا میں حرکت کے ذریعہ سے کسی مقام پر کوئی لہر پیدا کیجائے تو اُسکا اثر اس تمام کرۂ ہوا پر پڑتا ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ وائرلس (Wireless) یعنے بغیر تار کے خبر ہونچانے کا طریقہ سائنس کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ اِنسان کے دماغ میں بہت کم ایسے خیال آتے ہیں جو اپنا کچھ نہ کچھ اثر اُسکی روح پر نہیں چھوڑ جاتے اسیطرح کوئی تمدن بھی کسی ملک میں وہاں کے باشندوں پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کیا ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے بادشاہ کشمیر کو بہشت بنانے کی کوشش کریں اور اس سے وہاں کے لوگوں کا مذاق یا تمدن متاثر نہ ہو؟ میں جب کبھی نشاط باغ و شالامار کو جایا کرتا تہا تو مجھہ کو ایک بات ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تہی کہ جمعہ کے دن سینکڑوں کشمیری معہ بال بچوں کے کشتیوں اور شکاروں

پر سوار ہو کر ان باغوں کو آتے ہوئے اور پھر وہاں دن بھر گزار کر شام کو ڈل جھیل کے راستے میں واپس جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مذاق اسی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ ثبوت کی ضرورت ہو تو اسی کشمیر کے پہاڑوں کی دوسری جانب تبت کی طرف جا کر جہاں عہد مغلیہ کے تمدن کا زیادہ اثر نہ تھا وہاں صنعت پر لہاسا پیٹرن (Lhasa Pattern) کے بجھے کھو پر نماہیبت ناک جانوروں کی صورت لکڑی اور نمدوں پر بنی ہوئی دیکھئے اور پھر اسکا مقابلہ کشمیر پیٹرن Kashmere Pattern سے کریئے۔ لکڑی پر۔ پیپر مشی پر۔ شالوں پر قالینوں پر جا بجا جہاں اہل کشمیر نے صنعت پر اپنا پیٹرن و نمونہ دکھایا ہے وہاں خوبصورت خوبصورت چنار کی پتیاں اور نازک نازک پھول بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انکی دستکاریوں میں وہ جھاڑ فانوس دکھائی دیتے ہیں جو ایران کی صنعتوں میں ہوا کرتے ہیں انکی زبانوں کو ایرانی کھانوں کا مزا عہد مغلیہ میں پڑا۔ اب کچھ ہی حالت ہو مگر کشمیر کے عمدہ باورچی کا یہ دعوے رہا ہے کہ کسی دوسرے ملک کا باورچی اس سے بہتر و لذیذ کھانا نہیں پکا سکتا۔ ذرا غور کریئے کہ یہ ڈشز اور کھانے دراصل کس ملک کے ہیں۔ میری رائے میں کشمیری کھانے دراصل ایرانی کھانے ہیں۔ کشمیر کی عوت پلاؤ سے شروع ہوتی ہے۔ اب تو انگریزوں اور انکے مقلد انگریزی دانوں کے نئے مذاق نے کشمیری باورچیوں کو فن طباخی اسطرح بھلا دیا ہے جیسے یورپ کے مشین کے بنے ہوئے سستے جامہ واروں نے کشمیر کی سوئی کی نہیں دیر پا

اور خوشنما صنعت کو مٹی میں ملا دیا سرینگر ایک وہ سرینگر تھا جہاں سے ۱۸۵۰ء تک کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی شالیں یورپ کے بازاروں میں جاکر فروخت ہوا کرتی تھیں اور آج وہی سرینگر ہے جسکے سوداگر سوائے نمونوں کے عمدہ شالیں بنا کر بھی اسلیئے نہیں رکھتے کہ انکی مانگ نہیں ہے۔ نمونہ دیکھکر جب کوئی شخص خاص طور پر فرمایش کرتا ہے تب کہیں مہینوں میں ایک آدہ شال بناکر دیدیتے ہیں۔ اب تو کشمیر میں وہ پرانا کام نظر نہیں آتا۔ میرا اصلی پوئنٹ یہ تہا کہ عہد مغلیہ کے تمدن نے ہمالیہ کے پہاڑوں کو بہی بہت کچھہ فائدہ پہنچایا ہے اور کشمیریوں کی صنعت وحرفت، تجارت، دولت، پوشاک، غذا اور انکے کل مذاق وتمدن میں بہت کچھہ تبدیلیاں اسی دورِ مغلیہ میں ہوئی ہیں۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھکر عہد مغلیہ کا مقابلہ اُس زمانہ کی تمام دنیا کی سلطنتوں سے کرلیا جائے تو ہندوستان دنیا کے کسی حصہ سے ترقی وتہذیب میں کم نہ پایا جائیگا۔

ہند کو مسلمانوں کے وجود سے فائدہ

ابہی تک اُن ترقیات کا ذکر کیا گیا جو ہند کی زمین اور دریاؤں اور پہاڑوں اور تمدن میں عہد مغلیہ نے کردکھائیں اب ہم اس ملک میں مسلمانوں کے وجود پر ایک سیاسی نظر ڈالنا چاہتے ہیں کیا اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بالآخر مفید ثابت ہوگا؟ میری رائے یہ ہے کہ اگر ہند کی رگوں میں ترکستان۔ افغانستان وایران وعرب کا خون شامل ہوگیا ہے تو اس امتزاج سے ہند کی اصلی اندرونی قوت میں اضافہ ہوگیا اور ہوتا رہیگا۔ بڑی بات جو ہند کو مسلمانوں کی آبادی سے عہد مغلیہ

حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ چنگیز خاں۔ تیمور یا نادر شاہ کی طرح سیلاب کی صورت میں آکر پھر یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ مستقل طور سے یہیں بس گئے ہیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ انکی کوئی علیحدہ سول لائنس (Civil lines) اس طرح کی نہیں ہیں جیسے ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ہیں۔ وہ ہند کے گوشت پوست اور خون میں شامل ہو گئے۔ مجھ کو تو معلوم ہو رہا ہے کہ جو جو قوت انگلستان کی اصلی سیکسن (Saxon) کو اُن کی سرزمین پر یورپ کی مختلف اقوام کے بس جانے سے بالآخر حاصل ہوئی ہے وہی قوت اہل ہنود کو سرزمین ہند پر ایشیا کے مختلف مسلمان اقوام کے امتزاج سے بالآخر حاصل ہو گی۔ علی الخصوص جبکہ ان نئی آنے والی قوموں میں سے بعض ایسی ہیں جنکے آبا و اجداد وہی آریا تھے جنکی اولاد و اخلاف اور نسل میں ہونیکا فخر اہل ہنود کو ہے۔ انگلستان کے باشندے اندرونی معاملات میں چاہے کتنی ہی جنگ کریں لیکن جب جرمنی کا مقابلہ پڑ گیا تھا تو انگلستان کی کل آبادی ایک سر و یکجہتی تھی کیونکہ غیروں کے مقابلہ میں اغراض متحد تھے انسانی خلقت کا تقاضا یہی تھا۔ میری رائے میں ہند کی آخری حالت یہی ہونے والی ہے۔ آج ہر ملک کی قوت کا معیار اُس ملک کی آبادی اور وہاں کے باشندوں کی جسمانی و دماغی قوت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے جس اصول پر آج اسٹریلیا۔ کناڈا۔ و نیوزیلینڈ وغیرہ نو آبادیات والے۔ اپنی قوت بڑھانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کر رہے ہیں اور یورپ کے باشندوں کو

اپنے ممالک میں لیجا کر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں وہی مقصد ہند کو سینکڑوں برس ہوئے مسلمانوں کے آنے اور بس جانے سے حاصل ہو چکا ہے۔

پین اسلام ازم

لوگ بعض وقت پین اسلام ازم (Pan Islamism) کے خیال سے چوکنا ہو جاتے ہیں۔ ہم اس باب کے حصہ دوم میں دکھلا دینگے کہ پین اسلام ازم ایک خیالی چیز ہے جس سے خوف کھانا فضول ہے۔

مسلمان کیوں آئے؟ بے سود بحث

ایک اور بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ آیا مسلمانوں کو اس ملک میں آنا چاہیئے تھا یا نہیں اسیطرح فضول ہو گی جیسے اس ملک کے اُن اصلی باشندوں کا جو آریا قوم کے آنے سے قبل یہاں آباد تھے یہ اعتراض کرنا کہ اہل ہنود یہاں آ کر کیوں بسے اور قابض ہوئے یا یوں کہیئے کہ جیسے چھوٹے بھائی کے تولد ہو جانے کے بعد بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اعتراض کرنا فضول ہو گا۔ مسلمانوں کو قدرت لائی یا شمشیر لائی یا ضروریات زمانہ لائیں کسی نہ کسی طرح وہ آ گئے اور ہند کے گوشت و پوست میں شامل ہو گئے دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ آ گئے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے تمدن کو اُنکی ذات سے فائدہ پہنچا یا نقصان اور یہی دکھانے کی کوشش کیگئی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کا اثر ہند پر

میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مسلمان اس ملک سے نیست و نابود ہو گئے یا وہ اس قدر گر گئے کہ انہیں کوئی قوت باقی نہ رہی (گو کہ ایسا ہونا محال ہے) تو ہند میں بھی ایسا انحطاط پیدا ہو جائیگا

جیسے کسی شہ رگ کے ذریعے جسم کا خون نکل جانے سے ہوتا ہے دیکھہ لیجئے جب اسپین مسلمانوں سے خالی ہوگیا اور اسکی رگوں سے عرب کا خون ایک مرتبہ ملکر پھر نکل گیا تو جو انحطاط اسپین میں پیدا ہوگیا۔ اسکا علاج یورپ بھی آجتک نہ کرسکا۔ لیکن اگر مسلمان ہندوستان میں مثل اہل ہنود کے یہاں پھلتے پھولتے رہے تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین کے لئے یہ اپنا خون بہادینگے۔ اس پر غور کیجئے کہ جب ہند میں عہد مغلیہ کا دورہ تھا تو وہ ہندوستان کو ہر بیرونی قوت کی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رکھنے میں کوشاں رہے خواہ وہ بیرونی قوت افغانستان کی ہو یا ایران کی نادر شاہ کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی ہو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انکا اصل مفاد اسی میں ہے کہ ہند پر کسی غیر ہندی کا عمل دخل نہ ہو۔ مسلمانوں کے انحطاط سے اس ملک کی سپر کمزور ہوجائیگی۔

نقطہ نظر وسیع ہونا چاہئے

ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ عہد مغلیہ نے سرزمین ہند اور اسکے دریاؤں اور پہاڑوں میں کیسے کیسے بہترین تغیر پیدا کردئے۔ اسکی تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثر پڑا۔ یا اسی نقطہ نظر سے ہم یہ بھی بیان کرچکے کہ اس ملک کو مسلمانوں کے وجود سے کیا کیا فوائد نصیب ہوئے اور کیا کیا آئندہ ظہور پذیر ہوسکتے ہیں۔

اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہندو برادران وطن کے لئے عہد مغلیہ کے متعلق صحیح نقطہ نظر کیا ہوگا۔ کوہ ہمالیہ کے ایک غار میں بیٹھکر اگر ہم ایک چیونٹی کیطرح رینگنا شروع کریں تو ہر چیز

ہم کو تاریک و بدنما معلوم ہوگی لیکن اگر ہم کسی ہوائی جہاز میں بیٹھکر اُس عظیم الشان پہاڑ کی چوٹیاں، برفستان اور اسکا کل منظر مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو پھر اسکی چھوٹی چھوٹی بدنمائیوں پر نظر نہیں پڑتی اور وہ خوبصورت پہاڑ نہ صرف قدرت کا عجیب و غریب منظر معلوم ہوتا ہے بلکہ ہندوستان کی پشت و سپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسیطرح اگر ہم عہد مغلیہ کے ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں تو ممکن ہے کہ بہت سے ٹکڑے بدنما معلوم ہونگے لیکن اگر اس کل عہد کے کارنامے جمع کئے جائیں یا اس عہد کی ایک پوری تصویر کھینچی جائے تو عہد مغلیہ بھی تاریخ ہند میں قدرت کا عجیب و غریب دلکش نظارہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں عہد مغلیہ اسیطرح قابل فخر ہے جیسے عہد اشوک یا چندر گپت انکے زمانہ کی حالت کے اعتبار سے تھا۔ ویدوں کے زمانہ بلکہ اسکے بعد کی بھی مکمل صحیح تاریخ ہند مرتب کرنا تو دشوار ہے لیکن آج ہم عہد مغلیہ کے ہر کارنامہ کو پیش کر کے ہند کی تہذیب دولت، تجارت، مذہبی رواداری، انتظامات، عمارات، باغات، اور کل تمدن کا مقابلہ دنیا کے تمام ملکوں سے کرنے کو موجود ہیں۔ ہم اپنے موجودہ یورپ کے حکمرانوں کے سامنے اس عہد مغلیہ کے کارنامے اس امر کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کو پورا موقع دیا جائے تو ہم دکھا دینگے کہ گو آج ہم بے بس ہیں اور موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اصلی قابلیت ظاہر نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم صدیوں اس ملک کی حکومت کا انتظام اوس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کر چکے ہیں۔ میری

رائے میں اگر ہند کی کل تاریخ ایک مرصع زیور خیال کی جائے تو عہد مغلیہ
س کا وہ درخشاں اور شاندار گوہر نور ہیرا ہوگا۔ جسکے نکال ڈالنے
ے زیور کی خوبصورتی اور جگمگاہٹ ہی جاتی رہیگی۔ یا کم سے کم یہ ہے کہ
الکل مبہم پڑجائیگی۔

ل ہنود کا صحیح نقطۂ نظر

میرے پاس اسوقت مسٹر جسٹس مہادیو گووند رینڈے
کا وہ مضمون نہیں ہے جسمیں انہوں نے عہد مغلیہ کی نسبت
نا نقطۂ نظر بتایا تھا لیکن جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے ان کا خیال
ہے کہ ہند کو اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے بہت سی منزلیں
طے کرنی تھیں اس معراج ترقی میں عہد مغلیہ بھی ایک ضروری منزل اور
ینہ تھا جسکے طے کئے بغیر ہند اپنی موجودہ حالت پر نہیں پہونچ سکتا تھا۔
یں اس رائے سے بالکل متفق ہوں۔ عہد مغلیہ نے ہند کو اس کے نصب العین
رقی کے قریب پہنچانے میں مدد دی ہے اور کبھی اس میں ہرج نہیں ہوا
عہد مغلیہ ہند کا وہ شاندار زمانہ ہے۔ جس پر اہل ہند کو فخر کرنا چاہئے
اہل ہند کو چاہئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عہد مغلیہ کو اپنا عہد
تصور کریں۔ یہ عہد غیر ہندی عہد نہ تھا اس عہد کا یہ مقصود نہ تھا کہ
ہند کا مفاد کسی دوسرے ملک کے مفاد کا تابع ہو۔ عہد مغلیہ کی نسبت
ہندو برادران وطن کا صحیح نقطہ نظر یہی ہوگا۔

باب دہم۔ حصہ دوم

مسلمانوں کا نقطۂ نظر

تمہید

اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔

میری رائے میں فی الحقیقت اس کا فیصلہ تو اسی روز ہوگیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی سچی حب الوطنی کی نسبت شبہات کئے جاتے ہیں شبہات پیدا کرنے والا طرز عمل عموماً ان جذبات میں مضمر ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مسئلہ خلافت اور "پین اسلام ازم" "Pan Islamism" کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ ایا کسی کی عارضی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں کہ ہم مسلم پہلے ہیں ہندی بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمائشی جذبات ہیں جو بعض اوقات سیاسی مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطہ نظر پر جو ایک دوسرا مسئلہ ہے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم اول اسی قسم کے جذبات کی واقعیت اور قوت پر ایک نظر ڈالیں گے تاکہ اس امر پر رائے ظاہر کرنے میں کہ ہندوستان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر

کیا ہے بالآخر ہم کو مدد ملے اور اس کے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "سیاسی
خلافت" سے ہماری کیا مراد ہے۔

سیاسی خلافت سے مراد

"سیاسی خلافت" سے مراد ہماری ایسی خلافت ہے جو تمام دنیا کی مسلم آبادی کی (خواہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی ہو یا غیر اسلامی مملکت کی) مرکزی قوت بنکر اسکی متحدہ قوت کو کل مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مفاد کے لئے استعمال کرسکے اور اپنے قبض و اختیار میں رکھے جس شخص میں یہ مرکزی قوت موجود ہو وہی سیاسی خلیفہ ہوگا۔ مسلمان خلافت کیساتھ "سیاسی" کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن ہم نے صرف اسی سیاسی مرکزی قوت کے خیال و تصور کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ بار بار مطول عبارت نہ لکھنی پڑے۔ لہٰذا جہاں کہیں ہم "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کریں گے ہماری مراد اسی قسم کی قوت سے ہوگی۔

سیاسی خلافت محال ہے

منجملہ اُن جذبات کے جو ہندوستان کے تعلق سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ سیاسی خلافت کا جذبہ بھی ہے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر غیر مسلموں کے دلمیں اس کا خوف ہو کہ مسلم اندرونی طور پر کسی سیاسی خلافت کی حمایت میں اگر اپنے اصلی وطن کے ا سیاسی مفاد کو پس پشت ڈال دینگے یا اگر کوئی مسلمان کسی ایسی خلافت کا خیال بھی دل میں لاتا ہو تو ہماری رائے میں یہ خوف اور یہ خیال دونو ایک خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ عملی طور سے نہ کبھی ایسا ہوا

اور نہ ایسا ممکن ہے لوگ یہ کہیں گے کہ ابھی تک جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا رہا وہ دراصل ایک سلطنت کا حکمراں رہکر رات دن سیاسی سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ "سیاسی خلیفہ" یا "سیاسی خلافت" کا خیال نقش برآب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسا بادشاہ خلیفہ تو ضرور کہلایا گیا لیکن اُس میں سیاسی خلافت کی قوت یا خلافت کے اوصاف کبھی نہیں پائے گئے۔

تاریخ اسکی شاہد ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلفاء راشدین یکے بعد دیگرے ہوئے انکی نسبت تو کچھ شبہ نہیں کہ جو جذبات اُن کے دلمیں موجزن تھے وہ صرف اشاعت اسلام کے تھے۔ دنیوی بادشاہت یا یوں کہیے کہ محض بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا خیال انپر غالب نہ تھا۔ مگر اُن چار خلفاء کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ جونہی اسلامی سلطنتیں بیرون حدود عرب قایم ہونا شروع ہوگئیں اُنمیں وہی حالت پیدا ہوگئی جو فطرت کا تقاضا تھا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ یہی پیشین گوئی آنحضرت کی بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سلطنت کے اغراض و مفاد علیحدہ علیحدہ ہوگئے اور پھر یہ محال ہوگیا کہ کسی ایک اسلامی سلطنت کا حکمران سیاسی اُمور میں کسی دوسری اسلامی سلطنت کی رائے و مشورہ کا محکوم اور پابند ہو۔ ایک بادشاہ خلیفہ تو کہلاتا رہا مگر اُس میں سیاسی خلافت کی مرکزی قوت کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ خلافت کبھی کسی اسلامی سلطنت کو دوسری اسلامی یا غیر اسلامی قوتوں کی دست درازی سے محفوظ نہ کرسکی

ت کبھی یہ خیال تک ہوا کہ اُسکا زوال عین خلافت کا (جزو ہی سہی)
نقصان ہے۔ جب تاتاریوں نے بغداد کا پایۂ تخت الٹ دیا۔ مصر و
سپین تو کجا پڑوسی عرب تک امداد کو نہ پہونچے۔

جب شہزادہ فرڈینینڈ اور ملکہ آئیزبیلا کے عہد میں لاکھوں مسلمانوں
کے خون سے اسپین کے در و دیوار رنگین ہوئے اور اسلام کے لاکھوں
نام لیوا جلاوطن کئے گئے۔ لاکھوں کلمہ گویوں کو بالجبر عیسائی بھی بنایا
گیا اور بے شمار مسلمان آگ میں زندہ جلا دئے گئے اُس وقت کونسی
وہ مرکزی قوت تھی جو سپر بنی؟

جب ہندوستان کے تخت تیموریہ پر یورپ کے سوداگروں اور ایسٹ
انڈیا کمپنی نے دست درازی شروع کی تب کونسی ایسی مرکزی قوت نہ
پائی گئی جو اُن کو روک سکتی۔ جب یہ اسلامی قوت بھی نیست و نابود ہو گئی
تب سرزمین یورپ پر خلیفۃ المسلمین کا وجود اور انکی حکومت یورپ
کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی میدان صاف پاکر پہلے زار
(Czar) روس نے ابتداء کی۔ پچاس برس ہوئے جب قسطنطنیہ
کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا اور خلیفہ سلطان کو خواب غفلت سے بیدار کیا
اُس وقت ان کے پاس کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جس سے اُن کو
کچھ بھی مدد ملتی اور ان کو ایک حد تک یورپ سے قدم ہٹانا پڑے۔
پھر تو یورپ کی یہ مسلمہ پالیسی ہوگئی کہ "ترکی" کے قدم جس طرح جلد ہو سکے
بقیہ سرزمین یورپ سے اکھاڑ دئے جائیں جب اس پالیسی کو اس قدر

نشو و نما ہوا کہ اولاً اٹلی نے اور پھر بلقان کی پانچ متحدہ قوتوں نے یورپ کی اندرونی کمک و مدد سے خلیفۂ اسلام کے نشانِ ہلالی کو نیچا دکھانا شروع کیا تو انگلستان جیسے مدعی بے تعصبی کا وزیر اعظم بھی اپنے جوشِ مذہبی کو روک نہ سکا اور عام جلسہ میں اسنے اسپر اظہار مسرت کیا کہ آج اسلام مسیحی ممالک سے رخصت ہو رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کے مسلمان سوائے تماشہ دیکھنے کے نہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا اور سلطان میں کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی بالآخر خود یورپ کی قوتوں میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور خلیفہ نے جو یورپ کی پالیسی سے عاجز آگئے تھے اپنی آئندہ کی حفاظت اسمیں ہی سمجھی کہ کسی قوت کا ساتھ دیکر خود اس جنگ میں کود پڑیں اس وقت دنیا کے مسلمانوں کی حمیت دینی دیکھکر جو کچھ سیاسی خلافت یا مرکزی قوت کی رہی سہی نمائشی دھاک یورپ میں تھی اسکی بھی قلعی کھل گئی سب سے پہلا ملک جس نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا وہ عرب تھا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ سیاسی خلافت تو محال تھی ہی اور ترکوں نے اپنے سیاسی مفاد سے عربوں کو ہمیشہ دبایا بھی تھا۔ البتہ ہندوستان کے چند مسلمانوں نے غل پکار مچا کر معتد بہ رقم جمع کی مگر اس میں سے ایک جزو قلیل جنگ کے بعد ترکوں کو بھیجا اور باقی خود صرف کرلی جس میں لیپا پوتی کرنے کی کوشش کو دیکھکر اور بھی نفرت بڑھتی ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ وہ شخص جس پر سیاسی خلیفہ کے الفاظ کسی حد تک صادق آسکتے تھے اسکو خود ترکوں نے دار الخلافت سے خارج کردیا

اور اسکی وہ سلطنت جو یورپ و ایشیا کے براعظم کا معتد بہ حصہ گھیرے ہوئے تھی سمٹ سمٹا کر انگورہ گورنمنٹ کی صورت میں ظہور پذیر ہوگئی الحاصل اب اس دنیا میں آج کوئی ایسا شخص بھی نہیں دکھائی دیتا جو اُس معنی میں سیاسی خلیفہ کہا بھی جا سکے جسکی تعریف ہم کر چکے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو برس کی خلافت کی یہ مختصر حقیقت ہے اس کے ملاحظہ کے بعد کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ابتداء کے چار خلفاء راشدین کے زمانہ کے بعد ان تیرہ سو برس میں جس جس بادشاہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا دعوےٰ کیا اُنہیں واقعی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی مرکزی قوت موجود تھی جس کو وہ سب کے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا تھا یا اُس نے کبھی واقعی اُس قوت کو استعمال کیا اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام عالم اسلام کی قوت و تمدن سے مسخر ہو گیا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ قصور محض خلیفہ کا نہ تھا بلکہ یہ امر بھی محال تھا۔ کیونکہ ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور اغراض علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات باہم متضاد ہوتی ہیں اور اس حال میں ہر دنیوی بادشاہ کا ہمیشہ یہی فرض ہوگا کہ وہ اپنی رعایا اور ملک کے مفاد کو بمقابلہ دیگر ممالک کے مفاد کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہوں ترجیح دے۔ یہ تو خیر بادشاہ کا فرض ہے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر اگر کسی ملک کے مسلمان باشندے بھی اپنے سیاسی مفاد اور اغراض کسی ایسے خلیفہ بادشاہ سے وابستہ کرنا چاہیں جو اُن کے ملک کا بادشاہ نہیں ہے تو وہ مسلمان اگر

خود مختار سلطنت بھی رکھتے ہونگے تو بھی کچھ عرصہ کے بعد اُسی قسم کی حالت محکومی میں گرفتار ہوجائیں گے جیسا کہ اہل عرب عرصہ تک ترکوں کے ہاتھوں میں با دل ناخواستہ رہے اور اگر وہ مسلمان کوئی اسلامی خود مختار سلطنت نہیں رکھتے بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ اُس ملک میں آباد ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں تو ایسی صورت میں اُس ملک میں اُن کا بقاو قیام ویسا ہی دشوار و محال ہوجائیگا جیسا کہ اجتماع ضدین کیونکہ ایسی صورت میں مسلم و غیر مسلم آبادی کے اغراض و نصب العین میں بین مغائرت ہوگی ہماری رائے میں سیاسی خلافت نہ کبھی تھی اور نہ اُسکا قائم کرنا ممکن ہے اگر ہماری رائے صحیح ہے تو مسلمانوں کو سیاسی خلافت کا خیال دل سے نکال ڈالنا چاہئے اور ہندوستان کے متعلق نقطہ نظر قایم کرنے میں اس خیال کو کچھ بھی دخل نہ دینا چاہئے۔

خلافت بلا سیاست کا تصور

ہم یہاں کوئی ایسی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے جسکا تعلق اس کتاب کے اصل مضمون اور مقصد سے نہ ہو۔ اس لئے ہم یہ مسئلہ اُٹھانا نہیں چاہتے کہ بغیر کسی خلافت سے وابستہ ہونے کے کوئی مسلم آیا مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں نے کسی مذہبی خلیفہ کو کھڑا بھی کیا تو اُس کی وقعت اور حیثیت رفتہ رفتہ وہی ہوجائیگی جو مسیحی دنیا میں اب پوپ (Pope) کی ہے یا اگر وہ خلیفہ واقعی مقدس ہوا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اہل تشیع میں مجتہد العصر یا اہل تسنن میں کوئی پیر طریقت کہ جس سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیا جائے یا

اُن کے حلقے میں صفائی قلب کی توقع سے کچھ لمحے بیٹھا جائے۔ مگر میری رائے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ پہونچے گا۔ علاوہ بریں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ہمارے ذہن میں بڑی بڑی دشواریاں آرہی ہیں جن کے بیان کرنے میں ہم کو اندیشہ ہے کہ ایک ایسی طولانی بحث میں پڑ جائیں گے جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہوگا اور یہ بحث حقیقی شاہراہ سے بھٹکا کر پیچیدگیوں کے دلدل میں پھنسا دیگی بہر کیف اول تو کوئی ایسا خلیفہ ہوگا ہی نہیں اور ہوگا بھی تو بلا کسی سیاسی قوت کے ہوگا جس کے خیال کا بھی ہماری رائے میں مسائل ہند کی نسبت نقطۂ نظر قایم کرنے میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

خلافت کا عام تصور

اس وقت خلافت کا عام تصور ہمارے برادران اسلام میں یہ ہے کہ خلیفہ ایسا مسلم بادشاہ ہو جو جزیرہ نمائے عرب پر حکمران ہو اور اسکی حدود سلطنت میں حجاز و شام۔ بیت المقدس و فلسطین و عراق وغیرہ شامل ہوں اور وہ بادشاہ حج کے موقع پر یا کسی اور طریقہ سے تمام دنیا کی مسلم آبادی سے تعلقات قائم کرے اور اپنی مرکزی قوت کو اسلام اور تمام مسلمانوں کے مفاد کے واسطے استعمال کر سکے۔ اس عام تصور میں اور ہماری اُس سیاسی خلافت کے تصور میں جسکا ذکر ہو چکا ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یعنے صرف اسی قدر فرق ہے کہ اسمیں چند ممالک اسلامیہ کی بادشاہت جزو لانیفک ہے۔ ہماری تو یہی خواہش ہے کہ اُن تمام ممالک پر جو گہوارہ اسلام ہیں۔ جہاں کے

ذرے ذرے سے انوار اسلام منور اور جن کے در و دیوار سے اسلامی تمدن
کے آثار ہویدا ہیں اور جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات و عتبات عالیات
واقع ہیں وہاں پرچم اسلام لہرائے اور مسلمانوں کی حکومت قائم رہے
کیونکہ فی التحقیقت ان ممالک کی اصلی بہبودی کے خواہاں جس طرح قدرتاً
مسلمان ہوسکتے ہیں ویسے کسی غیر مذہب کے لوگ نہیں ہوسکتے ہمارا
یہ بھی خیال ہے کہ اسوقت انگلستان و فرانس نے ان ممالک میں اپنے
اثرات کی جو باہمی تقسیم کرلی ہے اسکا اصل مقصد اپنے اپنے ممالک کو
فائدہ پہنچانا ہے نہ کہ اُن ممالک کی رعایا کو باوجود اس تمنا و خواہش
کے ہماری رائے یہ ہے کہ اِن ممالک میں جو مسلم بادشاہ یا قوت ہوگی
اسمیں وہ مرکزی قوت پیدا ہونے کی امید نہ رکھنی چاہیے جس کا محال
ہونا سیاسی خلافت کے ضمن میں ہم دکھا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے
برادرانِ اسلام خلافت کے اس عام تصور کو کچھ نتیجہ بخش سمجھتے ہیں تو
جہاں تک ہندی مسلم متعلق ہیں وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں اُسی
وقت مدد دے سکتے ہیں جب خود اُن میں کوئی قوت ہو اور اُن میں
اُس وقت تک کوئی قوت نہ ہوگی جب تک وہ اپنے ملک ہندوستان
کی سیاسی حالت اُس بلند و رفیع پایہ پر نہ پہونچاویں کہ بحیثیت ہندی
ہونے کے اونکی کوئی قدر و منزلت ہونے لگے۔ لہذا مسئلہ خلافت کو
خواہ ہم کسی پہلو سے دیکھیں مگر اس ملک کی سیاسی ترقی میں ہمارا نقطہ نظر
وہی رہنا چاہیے جو یہاں کی غیر مسلم آبادی کا ہے۔

"پین اسلام ازم"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں پین اسلام ازم کی ایک خطرناک قوت اسوقت پھیل رہی ہے اس کی واقعیت کے معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ "پین اسلام ازم" Pan Islamism کس قوت کا نام ہے۔

اگر "پین اسلام ازم" سے یہ سمجھا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں کوئی ایسی باہمی قرارداد ہے کہ ایک مقام کے مسلمان دوسرے مقام کے مسلمانوں کو عملی مدد دیکر اس دنیا میں کوئی غلبہ حاصل کریں تو بہ حیثیت ایک مسلم کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ہماری رائے میں جن غیر مسلموں نے پین اسلام ازم کی مہیب صورت دنیا کے سامنے پیش کی ہے یا تو وہ غلطی میں ہیں یا اسمیں کوئی سیاسی غرض اس مقصد سے مضمر ہے کہ خواہ مخواہ دنیا کو اسلام سے برگشتہ اور چوکنا رکھکر دنیا کو اسلام کی مخالفت اور اسکی بیخ کنی پر تیار رکھا جائے۔ لیکن اگر "پین اسلام ازم" درحقیقت اس کشش کا نام ہے جو کسی ہم خیال یا ہم تمدن اشخاص کے درمیان عادتاً ہوا کرتی ہے تو پین اسلام ازم کا وجود ہے کیونکہ تمام مسلمان بعض اصولی باتوں میں ہم خیال بن جاتے ہیں اور ایک حد تک انمیں کشش محبت پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی موجودہ سوسائٹی مختلف قسم کی قدرتی کششوں کا نتیجہ ہے انسانی جماعتیں خواہ کلب، کنبے، یا کسی اور صورت میں ہوں وہ صرف مختلف

اقسام کی کششوں کی مثالیں ہیں۔ ہم مذہبی میں بھی ایک کشش ضرور ہے اور اس کشش کی قوت کا معیار اُن افراد کے مذہبی خیالات کی قوت پر منحصر ہوا کرتا ہے جو اُن سے متاثر ہوں۔ یہ عام اصول انسانی خلقت کے ہیں کچھ مسلمانوں ہی سے مختص نہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ یہودیوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہم مذہبی کی کشش موجود ہے۔ اسی طرح ہم ملک ہونے کی بھی ایک کشش ہے جسمیں مذہب کو دخل نہیں ہوتا اس کشش کا پورا احساس اُسوقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر جاکر اپنے کسی ملکی فرد سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے یورپ کا سفر کرتے وقت جہاز میں قدم رکھتے ہی ہم نے دیکھا ہے کہ اس پندرہ روزہ سفر میں جو چھوٹی سی دنیا بحر ذخار میں چلتی نظر آتی ہے اس میں جو سوسائٹیاں فوراً بنجاتی ہیں وہ اسی ملکی کشمکش کے نمونے ہوتی ہیں۔ اس کشش کی ایک دلچسپ مثال مجھہ کو یاد آگئی۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت لندن کی انڈر گراؤنڈ (زیرزمیں) ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک کنڈکٹر یعنے ریل چلانے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھنا شروع کیا جن لوگوں نے لندن کی انڈر گراونڈ ریلوں میں سفر کیا ہے وہی اسکا اندازہ کرسکتے ہیں کہ کنڈکٹر کسقدر عدیم الفرصت ہوا کرتا ہے اور ایک ایک دو دو منٹ کے بعد وہ کس طرح ہزاروں آدمیوں کی بہتی ہوئی زندہ دھار کے رُخ بدلتا اور موڑتا رہتا ہے لیکن ملکی کشش اُسپر اسقدر غالب تھی کہ اس عدیم الفرصتی میں بھی وہ میرے پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ

ہندوستانی ہیں جب اوس کو اس خیال کی تصدیق ہوگئی تو مسکرا کر کہنے لگا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ یہ کہکر پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس کے چہرے بشرے اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہورہا تھا کہ مجھے دیکھکر اسکو ایک خاص مسرت ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبہ کا علیحدہ کلب اسی کشش کے اصول پر مبنی ہے خیر یہ سب مختلف قسم کی قدرتی کششوں کی مثالیں ہیں اور یہ جذب مقناطیسی اسوقت تک باقی رہیگی جب تک انسان کی خلقت قائم ہے۔ دیکھنا صرف اسقدر ہے کہ جو کشش ہم مذہبی مجھوکی مسلمانوں میں ہے کیا وہ سیاسی نقطۂ نظر سے غیرمسلموں کے واسطے کچھ پرخطر ہے۔ یا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حبل المتین (مضبوط رسی) ہے جس کے بھروسہ پر وہ ہند کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پان اسلام ازم کی مذہبی کشش غیرمسلموں کے واسطے کچھ بھی پرخطر نہیں ہے۔ اور جو وجوہ ہم سیاسی خلافت کے محال ہونیکے ضمن میں بیان کرچکے ہیں انہیں وجوہ پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کشش ایسی نہیں ہے جس کے بھروسہ پر ہم اپنے وطن کی فلاح وبہبود کے نقطۂ نظر کو بدل دیں۔

مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ وہ بلالحاظ مذہب وملت اپنے کو تمام برادران وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا ہوا تصور کریں۔ اور وہ کشتی "ہندوستان" ہے۔

جو طوفان اہل ہنود کو ڈبانے کی قوت رکھتا ہے وہی انکو غرقاب کریگا۔ اور جو امن و سکون اہل ہنود کو ساحل مراد پر پہونچائیگا وہی مسلمانوں کو دنیاوی گرداب ہلاکت سے بچائیگا اگر کوتاہ نظری سے کام نہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کی ترقی و وقار کا عکس کسی نہ کسی حیثیت سے پلٹ کر دوسرے باشندوں پر بلا لحاظ مذہب و ملت پڑتا ہے ہم کو اس امر کا پورا احساس کہ ہندوستانی عزت و ذلت کا اثر ہماری ذاتی عزت و ذلت پر کہاں تک پڑتا ہے اُس وقت ہوا جب ہم نے ہندوستان کے باہر سفر کیا۔ ہم نے سنہ ۱۹۱۴ء میں ولایت سے واپسی کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ دکھایا تھا کہ حدود ہندوستان کے باہر ہماری تمام عزت و وقار کا معیار لفظ "ہندی" ہونے میں ہے ہر مقام اور ہر سوسائٹی میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ غیر ممالک میں پہلے لوگ اس کی جستجو کرتے ہیں کہ کون شخص کہاں کا باشندہ ہے اس کے بعد اُن کی نگاہوں میں اس کا وہی وقار ہوتا ہے جو اُس کے ملک کی سیاسی و تمدنی حالت کا ہے جہاں کا وہ مسافر اصلی باشندہ ہے اُسکی وقعت یا تو ایک دم اُنکی نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے یا وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ کوٹ، پتلون، ہیئت، صورت، وضع، قطع بلکہ ذاتی قابلیت بھی بالائے طاق ہو جاتی ہے سنہ ۱۹۲۴ء کے سفر میں بھی یورپ کے ہر مقام پر جہاں جہاں گئے ہم نے دیکھا کہ بہ لحاظ عزت ہم محض اپنے ہندی ہونے کی وجہ سے کہیں تو فائدے میں رہے ہیں اور

کہیں گھاٹے ہیں۔

یہ عزت و خفت ہندوستان کی نسبت ہر شخص کے خیال پر منحصر تھی۔ اس میں مذہب کا دخل نہیں تھا۔ مجھ کو خیال ہے کہ ولایت میں ایک انگریزی خاتون نے مجھ سے یہ کہا کہ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے ہندوستان سے لچھمی کی ایک مورت اس کو بھیجی اور یہ لکھا تھا کہ ہندیوں کے اعتقاد کے بموجب جس شخص کے پاس یہ مورت رہیگی اسکو دولت ملیگی۔ اس پر خاتون موصوفہ نے مذاقاً کہا کہ اُن کو ابھی تک کوئی دولت نہیں ملی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے مگر کسی طرح اُنکی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب میں بھی ہندی ہوں تو اس عقیدہ کا قائل کیوں نہیں ہوتا۔ سر رابندوناتھ ٹاگور نے دوسرے ممالک میں سفر کرکے جو نسکہ اپنی علمی لیاقت وانسانی وقار کا قائم کیا ہے اس کا فائدہ بلالحاظ مذہب ہر ہندی کو پہنچے گا۔ اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں ایک سوداگر نے اپنا قیمتی زیور بغیر فوری قیمت لئے ہوئے ہم کو اس اعتبار پر دیدیا کہ ہم ہندی تھے اور اُسی شہر کی دوسری دوکانوں پر ایک سوداگر نے یہ کہا کہ ایک ہندی مسافر نے جن زیور کے خریدنے کا وعدہ کیا اُسے چھ مہینے بعد لوٹتے وقت حسب وعدہ اس نے خریدا اور ہندیوں کی اسی ساکھ کی بناء پر اُسنے مجھ سے یہی کہا کہ اگر آپ بھی خرید کا وعدہ کرلیں تو زیور کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائیگا۔ یہ کچھ یورپ ہی کی کیفیت نہیں ہے

بلکہ عراق اور حجاز و عرب میں بھی جو ہندوستانی مسلمان زیارات اور حج کی غرض سے جاتے ہیں انکو تمام عراقی اور حجازی عموماً ہنود ہی کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست نجف اشرف میں جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ راستہ پر جارہے تھے کچھ عربوں نے اشارہ کرکے کہا "ھذا شیخ الہنود"

مہاتما گاندھی کی روحانیت کی شہرت سے غیر ممالک میں ہر ہندی بلا لحاظ مذہب فخر کرنے لگتا ہے۔ انگلستان میں آپ کتنا ہی اکڑئے لیکن انگریزونکو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ہندی ہیں تو بلا لحاظ مذہب آپ کا وہی وقار رہ جاتا ہے جو ایک رعایا اور محکوم کا ہونا چاہیے جنوبی افریقہ اور دوسری نوآبادیات میں آپ کتنا ہی سر پٹکیں لیکن وہاں آپ کا شمار بہ حیثیت انسان وہ اپنے مساوی درجہ کے لوگوں میں اُس وقت تک ہرگز نہ کریں گے جب تک کل ہندوستان کا سیاسی پایہ بلند نہ ہو امریکہ کے ہائیکورٹ میں اس امر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندی اون کے ملک کا کبھی سٹیزن Citizen نہیں بن سکتا یا مستقل باشندے کے حقوق نہیں حاصل کر سکتا اُس ہندی کے مذہب کا خیال بھی اُن کے ذہن میں نہ آیا ہوگا جس کا مقدمہ اُن کے روبرو پیش تھا۔ ہم کو اس وقت کسی مذہب کی صداقت و کذب سے بحث نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں اس ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں کہ بیرون حدود ہندوستان وہاں کے باشندوں سے ہمارا باہمی مذہب کا فرق اٹھ جاتا ہے اور غیر ہندی لوگوں کی نگاہ

"ہندی" محض "ہندی" ہی کی حیثیت سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے خواہ وہ کسی جامے میں ہو۔ ناظرین اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ ایک ہندی مسلمان اسلامی ممالک میں جاکر دائرہ ہندیت سے نکل جایا کرتا ہے۔ نہیں وہاں بھی "ہندی" ہی رہتا ہے۔ میری والدہ ہمشیرہ جب حج وزیارات سے واپس آئی تھیں تو فرمایا کرتی تھیں کہ انکے قافلہ میں جب کوئی ہندی کسی بدوی عرب کی کافی خاطر مدارات نہیں کرتا تھا یا کافی انعام نہیں دیتا تھا تو وہ "ہندی بطال" کے الفاظ بطور تکیہ کلام کے ہر ہندی کیلئے عام طور پر استعمال کرتا تھا اور اس ہندی کا مذہب اسلام اُس کو اذیت و تکلیف ہی سے بلکہ بعض اوقات قتل سے بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسی سال کا واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ کے راستے میں ہزاروں حاجیوں کا قافلہ بدوی عربوں نے روک لیا۔ اور جب انکو کافی رقم نہ پہونچی تو سارے قافلہ کو بغیر مدینہ منورہ کی زیارت کیے ہوئے واپس آنا پڑا۔ اور راہ میں ان مصائب کا سامنا ہوا کہ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بدویوں پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔

سال گزشتہ سلطنت حجاز عرب کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مصری ڈاکٹروں کا وفد حاجیوں کے علاج و معالجہ کے لیے حج کے زمانہ میں زمین عرب پر قدم بھی رکھے یا خیمہ نصب کرے کیونکہ سیاسی حیثیت سے اُن کی موجودگی اُنہوں نے اپنے لئے مضر خیال کی تھوڑا عرصہ ہوا جب ہند کے وفد خلافت نے اسلامی حجوبش میں آکر مشورہ دینے کی غرض سے

سلطنت انگورہ میں داخلہ کی اجازت چاہی تو ترکوں نے صاف انکار کر دیا جس سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہونگی تین برس کا عرصہ ہوا جب صوبہ پنجاب و صوبہ سرحدی کے ہزاروں مسلمانوں نے ترک وطن کا خیال اس بھروسہ پر کیا تھا کہ افغانستان بحیثیت ایک اسلامی سلطنت کے اُن کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کریگا اور اپنے ملک میں آباد کریگا۔ لیکن اُس ارادہ کو پورا کرنے میں جو جو نتائج پیدا ہوئے وہ ہر با خبر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ہمارے دوست خواجہ غلام الثقلین مرحوم کو ایک مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ ایران جاکر وہاں کے مسلمانوں کے خیالات درست کئے جائیں۔ اسلامی ہمدردی سے ایران پہنچے مرحوم میں ایثار نفس کا بہت مادہ تھا وہ فرماتے تھے کہ ایرانیوں کو ان پر یہ شبہ تھا کہ یہ شخص ہندوستان کی خفیہ پولیس کا کوئی رکن ہے اور ان کو پھانسنے کے لئے آیا ہے۔ انکی ہندیت نے ایران میں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غرض سخت مایوس ہوکر واپس آئے اگر ایران میں کوئی ہندی مسلمان اس طرح قتل کیا جاتا جیسے کہ ابھی چند دن ہوئے کہ ایک امریکن سفیر کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے کہ انکی تلافی مکافات اور اُس کے خون بہا کے لئے ایران صرف مذہب کی بنیاد پر اس حد تک تیار نہ ہوتا جیسا کہ امریکہ نے ایران کو مجبور کر کے آمادۂ تلافی کیا۔ یہ سب صرف امریکہ کی سیاسی قوت کا زور او راثر تھا۔ ان تمام مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی مسلمان ممالک اسلامیہ میں

بھی ہندی ہی رہتا ہے جس سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ معاملات دنیوی میں کسی ملک کی مجموعی سیاسی و تمدنی حالت کا جو اثر اُس ملک کے ہر باشندے پر پڑتا ہے اس کو مذہب نہیں روک سکتا ہند کے مسلمان ہرگز خیال نہ کریں کہ کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی سیاسی و تمدنی بہتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی حالت کو کسی اسلامی مقناطیسی اثر سے درست کر سکتی ہے۔ ایسا کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ قصہ کوتاہ سیاسی و تمدنی معاملات میں اہل ہنود و مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ہند کی سیاسی ترقی مجموعی حیثیت سے مسلمانان ہند کے وقار و عزت اور قوت کو اُسی طرح گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے غیر مسلم ہندیوں کی عظمت اور وقعت کو۔ پس ہمیں ہندوستان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور ہمارا یہی نقطۂ نظر صحیح ہوگا۔

باہمی مطالبات کی نوعیت

ہم کو اس رسالہ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر شخص کی نیت و غرض کا اثر اس کے افعال و معاملات پر کہاں تک پڑتا ہے۔ اس ملک میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مقابلہ میں بعض مطالبات پیش کر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مطالبات نہ کیے جائیں۔ باہمی صفائی اور سمجھوتا اسی وقت کر لینا ضروری ہے۔ ہم نے اس پر خوب غور کیا ہے۔ باہمی مطالبات کے متعلق آج جس بات کو ہم لڑائی سمجھ رہے ہیں وہی آئندہ ہماری صفائی اور صلح کا باعث ہوگی لیکن ہماری رائے میں اگر ہندو مسلمان

ایک دوسرے کو اُس نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں جس کے قایم کرنے کی کوشش اس باب کے حصۂ اول و دوم میں کیگئی ہے تو پھر باہمی مطالبات کا فیصلہ کرنے میں بہت کچھ سہولت پیدا ہوجائیگی اگر تمام اہل ہنود مسلمانوں کو اس نگاہ سے دیکھنے لگیں کہ انکے عہد حکومت میں ہندوستان کے تمدن کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے یہ اس ملک کے اب جزو لاینفک ہیں یہ ایک ایسا ذخیرہ دماغی و جسمانی قوت کا ہیں جو اس ملک کی بہتری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے (جیسا کہ حصۂ اول میں مفصل طور پر بتایا گیا ہے) اور اسی طرح اگر تمام ہندی مسلمان یہ خیال کرنے لگیں کہ اُن کا وقار و ذلت اِس مُلک کے وقار و ذلت کے ساتھ وابستہ ہی اہل ہنود اس مُلک کی صنعت و حرفت و دولت میں کوئی ایسی ترقی نہیں کرسکتے جس کا فائدہ صریحی یا معنوی طریقہ سے بواسطہ یا بلاواسطہ مسلمانوں کو بھی نہ پہنچیگا۔ خلافت و مین اسلام از ہم آہنگی آئندہ قسمت کا فیصلہ نہ کرسکیں گی اور اس کے جوش میں وہ کسی طرح اس ملک کی سیاسی ترقی میں سد راہ نہ ہونگے تو پھر ہماری نیتوں اور اغراض میں بہت کچھ یکسانیت پیدا ہوجائیگی ایک دوسرے کے مقابل سے شبہ کا بادل ہٹنا شروع ہوگا۔ باہمی تعلقات کا مطلع صاف ہوجائے گا اور ہم کو اپنے باہمی مطالبات کی نوعیت ایسی معلوم ہوگی گویا دو بھائی ہیں جو گھر کو بگاڑنا نہیں چاہتے بلکہ کچھ ایسا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں کہ عرصہ تک اپنی متحدہ قوت اُس گھر کے

بقا و قیام کے لئے صرف کریں اسکو سجائیں اور اُس کی آراستگی سے
دونوں بھائی منتفع ہوں ۔ ہمارا یہ گھر ہندوستان ہے ہم چاہتے
ہیں کہ اس ملک کے کُل باشندے اپنے اپنے مطالبات کی نوعیت
کو سمجھتے رہیں تاکہ اُن کا تصفیہ کرنے میں آسانی ہو۔ مطالبات
اس نیک نیتی سے کئے جائیں کہ ایک کو دوسرے پر کوئی بیجا غلبہ نہ
حاصل ہو دونوں کی بقا فیصلہ کی شرط رہے نہ ایک جانب ہندو
راج کا خیال غالب ہو نہ دوسری جانب سیاسی خلافت کی دُھن ہو
اگر طبیعتیں اس رُخ پر آجائیں تو بیڑا پار ہے ۔ جو ہوا عالم میں آج
چل رہی ہے اُسے دیکھ کر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں ملکی
قوت و جذبات تمام دوسری قوتوں اور جذبات پر غالب ہوجائینگے
اور اس سے کسی شخص کے اصلی اصول مذہب پر آنچ نہ آئے گی ۔ فروعات
کا کچھ ہی حشر ہو مثلاً یہ باجا بجانے کا مسئلہ یا کسی جانور کے ذبح کرنے کا
حق ۔ ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک وقت آجائے کہ ایسے
مطالبات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے ۔ بہرکیف آج تو صرف اسکی
ضرورت ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی نوعیت کو نہ بھولیں ۔

باب دہم - حصہ سوم

نفاق کے نتائج و باہمی اتحاد کی تدبیر

تمہید

اگر شروع کے نو ابواب باب دہم کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں تو باب دہم کے حصہ اول و دوم کو اس آخری حصہ سوم کی تمہید سمجھنا چاہیے۔ شروع کے نو ابواب میں صرف باب دہم لکھنے کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور باب دہم کے حصہ اول و دوم میں (جن میں ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے) اس آخری حصے کی بنیاد ڈالنا منظور تھا۔ اس میں اہل ملک کے سامنے باہمی اتحاد کی تدابیر پیش کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر اگر ناظرین میرے خیالات پوری طرح معلوم کرنا چاہیں تو حصہ اول و دوم کو پیش نظر رکھیں

عداوت و کینہ و نفرت کے جذبات کے نتائج

عداوت و کینہ اور نفرت انسانی خلقت کے بہت زبردست جذبات ہیں اور جب یہ کسی انسان میں سرایت کر جاتے ہیں تو ان کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ خلقت انسانی کے جزو یا طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی قومیں اور جماعتیں آخر افراد ہی سے بنتی ہیں۔ اسلئے جب کسی جماعت یا قوم میں کینہ و نفرت کا مادہ کسی دوسری جماعت اور قوم کے خلاف سرایت کر جاتا ہے

تو اُس کا دور کرنا بھی ویسا ہی سخت دشوار ہوتا ہے جیسا کہ کسی ایک فرد کے دِل سے ان جذبات رذیلہ و مقتضیات ذمیمہ کا نکالنا اور جب کسی دو قوموں میں یہ صفات رذیلہ انتہا کو پہونچ جاتی ہیں تو اُس وقت اُن دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کا فنا ہو جانا ہی اُس کا علاج ہوتا ہے اسمیں ذرا شک نہیں کہ کینہ اور نفرت کی قوت کشش ہم ملکی و ہم وطنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان و عیسائی (گو صدیوں تک ایک ہی ملک اسپین میں رہے سہے لیکن اُن دونوں میں) دوسرے کی طرف سے آتشِ نفرت بھڑکتی رہی۔ اسپین کے مسلمانوں کا فنا ہو جانا اُس کا علاج ثابت ہوا۔ اگرچہ ہر مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ اُنکے فنا ہو جانے سے جو کمزوری اسپین میں پیدا ہو گئی وہ آج تک دور نہ ہو سکی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے واقعہ کو گو دو ہزار برس گزر گئے مگر جو اشخاص اس اندوہناک و ناشدنی فعل کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی خاک کیا نام و نشان کا بھی پتہ نہ رہا ؎

پنداشت ستمگر کہ ستم بر ما کرد
بر گردن او بماند و بر ما بگزشت

لیکن آج بھی روس، جرمنی، آزاد انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کے دلوں میں گھس کر ذرا یہودیوں کی طرف سے اُن کے جذباتِ نفرت کا کوئی تماشہ دیکھیے اسی سال لندن کی ومبلی نمائش

میں ایک انگریزی عینک ساز نے ہمارے اعتبار سے بیجا فائدہ اٹھا کر ہم سے کچھ رقم وصول کر لی۔ جب ہم لندن کی ایک دوسری بڑی دوکان سے عینک خریدنے گئے تو اس دوکان کا مالک طیش میں آ کر کہنے لگا کہ افسوس ایک یہودی نے آپ کو ٹھگ لیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیشہ یہودی ایسا ہوتا ہے لیکن یہ صرف اسکی ایک مثال ہے کہ ایک غیر یہودی انگریز کا جذبہ ایک یہودی انگریز کے مقابل میں آج تک کیا ہے اور یہ کچھ عیسائیوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ سے یہود کے سلوک نامحمود کا ہی یہ بھی نتیجہ ہے اور اثر ہے کہ آج عراق میں مسلمان بھی یہودیوں کو ایسا ہی برا سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ یورپ میں عیسائی۔ ہم مذہب اشخاص میں بھی اس بغض و کینہ و نفرت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ خواہ یہ ہم مذہب عیسائی ہوں یا مسلمان۔ آخر جرمن و فرانس پڑوسی ہو کر بھی کیوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب و تمدن پر فخر ہے لیکن وہ تمام تمدن و تہذیب اس کینہ و بغض و نفرت کے جذبات سے دبکر فنا ہو جاتی ہے۔ آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن چار سو برس سے کینہ و بغض و نفرت کی جو آگ اسکے شمالی و جنوبی حصوں میں بھڑکی ہوئی ہے۔ اسکے بجھانے کی تدبیریں بڑے بڑے مدبرین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کی حالت بھی سب کو معلوم ہے قصہ کوتاہ ایک ہی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتوں میں ایک

دوسرے کے خلاف نفرت و کینہ کے جذبات کا پیدا ہو جانا اُس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوستان کی گزشتہ حالت اور آئندہ کے خدشات

عہد مغلیہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی جو حالت تھی اُسکی تصویر ہمنے باب سوم میں مذہبی رواداری کے سلسلۂ بیان میں صفحات (۷) لغایتہ (۱۹) کھینچی ہے اور ہم کو خود اپنی زندگی کے اُن واقعات کا ہوش ہے کہ ہم اپنے ہم محلہ مسن ہندو بزرگ کا نام لیکر نہیں پکار سکتے تھے بلکہ اپنے بزرگوں کی تربیت کے اثر سے بلحاظ تفاوت عمر کسی ایسے رشتے سے منسوب کرکے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ مثلاً چچا۔ دادا۔ بھائی وغیرہ۔ خیر یہ تو ہندوستان میں باہمی اتحاد کی گزشتہ حالت تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے خیال میں اسوقت تک جو لڑائی جھگڑے ہندو مسلمانوں میں ہوئے ہیں اُنکی بنا اور نوعیت کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے باب سوم کے آخری حصے میں ظاہر کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں ابھی تک فتنہ و فساد چند جاہل شریر النفس اشخاص کی ذات تک محدود ہے۔ ہم کو گلبرگہ دہلی یا امیٹھی میں ایسے جھگڑوں سے زیادہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ تو ہوا کے جھوکوں کیطرح آکر چلے جائینگے جس سرزمین پر کروروں بنی نوع انسان مختلف الاقوام والمذاہب ایک دوسرے کی دیوار کے زیر سایہ آباد ہیں وہاں کبھی کبھی ایسا ہو جانا چنداں بعید نہیں ہے لیکن اطمینان بخش اور امید افزا بات یہ ہے کہ یہ جھگڑے دیرپا اور

مستقل نہیں ہوتے بلکہ جہاں کہیں آندہی کے جھوکے کیطرح چلکر کچھ اختلافی
جذبات کو اُبھار کر مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں وہاں بہت جلد امن
وسکون قایم ہوجاتا ہے اور روزانہ کاروبار دنیوی بدستور چلنے
لگتا ہے۔ ایسے جھوکوں کی روک تھام تھوڑی سی انتظامی قابلیت سے
ممکن ہے اور یہ سب فروع ہیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے تو اسکا ہے کہ
کہیں یہ شعلہ بھڑک کر سوسائٹی کی تعلیم یافتہ اور بلند طبیعتوں کو مشتعل
نہ کردے۔ خوف ہے تو ایسے بیج کا ہے کہ وہ دلوں میں جم کر نشوونما
کرے اور اُسکی جڑیں اور شاخیں نہ معلوم کہاں تک پہنچیں۔ اگر تاریخی
غلط واقعات تعلیم یافتہ طبقے کے دلمیں جاگزیں ہوگئے اور اُن کے
دلوں میں اختلاف کی بارود بھر دیگئی تو پھر آگ کے بتانے کی بھی ضرورت
نہ ہوگی۔ خود خیالات کی کشمکش اور جوش طبیعت شعلہ وہ ہوگی آتش فساد
کو مشتعل کردیگی اور ہندوستان تباہ اور ہندوستانی جل بھنکر فنا ہو جائیں گے
اور یہ شعر صادق آئیگا۔

شعلے بھڑک کے اُٹھے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جو ڈھانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے پچاس برس کی محنت سے تیار کیا ہے وہ
اک دم گر جائیگا۔ ہندوستان میں اہل ہنود اور مسلمانوں کے اصلی تصادم
کی لہریں سمندر کے بڑے طوفان سے کم نہ ہونگی پھر یہ کہنا دشوار ہوگا کہ ہماری
کشتی اُس طوفان کے تھپیڑے والے کیونکر سہ سکیگی اور منزل مقصود ساحل مراد تک پہنچ سکیگی کیونکر

نصیب ہوگی ایک زمانہ میں تو یہ ممکن ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اسپین کو آٹھ سو برس کے بعد بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس زمانہ میں مسلمان اپنے وطن ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ لہذا ہندو مسلمان دونوں بھائیوں میں مسلسل تصادم کی حالت قائم ہوجانے سے ملک کی جو حالت ہوگی اُسکے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر دوراندیش ہندوستانی سمجھ رہا ہے کہ مہاتما گاندھی صلح قائم کرنیکی کوشش میں کیوں اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اس تصادم کے نتائج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ ہماری رائے میں اس وقت بھی کافی اتحاد موجود ہے اور جو کچھ بگڑے ہوئے تیور نظر آتے ہیں اُنکی اصلاح بھی ممکن ہے۔ مرض لاعلاج نہیں ہے پس ہم کو ابھی سے مؤثر تدابیر کو نہ صرف سوچنا بلکہ عمل میں لانا چاہئے اور ہم کو علاج واقعہ قبل از وقوع باید کرد۔ پر کاربند ہونا چاہئے۔

مستقل اتحاد کی اصلی تدبیر

ہماری رائے میں مضبوط بنیاد پر مستقل اتحاد قائم کرنے کی صرف ایک ہی یہ تدبیر ہے کہ ہندوستان کی صحیح تواریخ ہمارے ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں جن میں تعصب کو دخل ہو نہ غلط فہمی کا امکان اور وہی ہمارے نونہالان مدرسہ یعنے ہندو مسلمان بچوں کو پڑھائی جائیں اگر بیج اچھا ہوگا تو ثمر بھی اچھا ہوگا۔ خیالات کے جذب کرنے میں بچوں کے قلوب موم کی خاصیت رکھتے ہیں جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جائینگے۔ اور وہی شکل وصورت اختیار

کراین گے۔ پس اس موم کے دلوں کو فولاد بنانا چاہیے جو مضبوط ہو اور اُس پر جو نقش ہو نقش کالحجر ہو۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر بنیاد غلط پڑ گئی تو سارا مکان ٹیڑھا ہو جائیگا۔ ؎

خشتِ اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اگر ہندوستان کی بہبودی پیش نظر ہے تو آئندہ نسلوں کے خیالات کی درستی کا انتظام آج ہی سے کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی تاریخ میں غلط واقعات درج کئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ سچ سچ جو واقعہ ہو وہی لکھا جائے تاکہ تاریخ کی اصلی غرض اور گزشتہ امور سے جو بُرے بھلے نتائج برآمد ہوتے ہیں اُن سے اطلاع ہو۔ مورخ کا نقطہ نظر ذرا بدل جانے سے پڑھنے والے کے دل پر اُسی تحریر کا اثر بھی بدل جاتا ہے خاص کر بچوں کے دل پر۔ ہندوستان کی جو تاریخیں عموماً ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ہماری رائے میں غلط اصول پر مبنی ہیں۔ کہیں تعصب ہے اور کہیں خود ستائی اور دوسروں کی بھلائی کی بدنمائی اور اخفائے حقیقت۔ اُن میں عموماً وہ واقعات نہیں لکھے جاتے جن کا لکھنا ہمارے نقطہ نظر سے ضروری ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ اورنگ زیب کی انسانی کمزوریاں نہ بتائی جائیں لیکن اعتراض یہ ہے کہ اُس کے عہد کی جو نیکیاں بھی کیوں نہیں بیان کیجاتیں۔ اسکے علمی مذاق اور اُس کے زمانہ

کی اشاعت تعلیم کا مفصل ذکر کیوں نہیں کیا جاتا جس کے کچھ حالات باب دوم میں لکھے گئے ہیں صرف ایک کتاب فتاوائے عالمگیری ہی کو دیکھیے کہ کس طرح کس محنت اور کن مصارف سے تیار کرائی گئی تھی اگر اورنگ زیب کے تعصب کا ذکر کیا جاتا ہے تو مذہبی رواداری کے معاملہ میں ملک کی اس حالت کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا جس کی کیفیت باب سوم میں مفصل بیان کیگئی ہے۔ یہ بھی کیوں نہیں کہا جاتا کہ اُسکا ایک وزیر راجہ جے سنگھ اور فوج کا کمانڈر ان چیف راجہ رام سنگھ تھا اور اُس کا ایک فرزند شہزادہ اکبر ہندو رانی کے بطن سے تھا اورنگ زیب نے اس سرزمین کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت پیدا کر دی تھی اور جسکی شہادت باب چہارم میں پیش کیگئی ہے اس پر کیوں مٹی ڈالی جائے اور وہ ہمارے طلباء کو کیوں نہ پڑھائی جائے۔ انصاف و امن و اماں کے متعلق جو حالات ہم نے باب پنجم میں لکھے ہیں اور صنعت و حرفت کی نسبت جو مواد ہم نے باب ششم میں جمع کیا ہے اگر یہ سب واقعات سچ ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ اُن تاریخوں میں بھی لیے جائیں جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں تاکہ انکو معلوم ہو کہ عہد مغلیہ کی حکومت کیسی قابل قدر ہندوستانی حکومت تھی اُس حکومت کا مقصد ہندوستان کا فائدہ تھا اور اس سے واقعی ہندوستان کو فائدہ پہنچا۔ یہ کیا انصاف کا نمونہ ہوگا اگر اُس شریفانہ و شاہانہ برتاؤ کے ذکر کرنے کی بجائے جو اورنگ زیب نے ہمیشہ یورپ کے تجار کیساتھ

کیا اور جسکی تحریری شہادت کا حوالہ باب ہشتم میں دیا گیا ہے یہ کہا جائے
کہ اورنگ زیب نے غیر ممالک کے سوداگروں کو تجارت کرنا دشوار
کر دیا تھا۔ جیسا کہ رسالہ "زمانہ" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے اور
جس کا حوالہ باب اول میں دیا گیا ہے اور پھر یوروپین تجار کے ساتھ
اورنگ زیب کا برتاؤ دکھانے میں خود ان تجار کی اُس اخلاقی حالت
و پالیسی پر پردہ ڈالا جائے جس نے ہندوستانی بادشاہ کو ہندوستان
میں بادشاہت کرنا دشوار کر دیا تھا جس کی مفصل کیفیت باب نہم میں
دکھلائی گئی ہے۔ جو تاریخیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اُن میں اورنگ زیب
و شاہجہاں و داراشکوہ کے باہمی داؤ پیچوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے
حتیٰ کہ محلات کی اندرونی زندگی بھی دکھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن
اُس سادہ فقیرانہ زندگی اور خداپرستی کا ذکر بالکل ہی نہیں یا اس قدر
کم اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ عدم و وجود یکساں ہو۔ کیا جاتا ہے جس نے
شاہان مغلیہ کے درشن کا طریقہ موقوف کرایا۔ دربار میں رقص و سرود
و عیش کے مشاغل بند کرا دئیے۔ محکمہ احتساب قائم کرا دیا اور خود
اپنے جیب خاص کے مصارف کی رقم کو بھی کم کرا دیا۔ اورنگ زیب اور
مرہٹوں سے جو لڑائیاں ہوئیں اُن کا تو مفصل حال بیان کیا جاتا ہے
لیکن اس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی رعایا کے آرام
و فلاح و بہبودی و دلجوئی کے لئے کون کون ٹیکس موقوف کئے تھے اور
پہرہ داروں کی نذر اور ضبطیٔ مال کے قواعد میں کیا کیا ترمیم کی تھی

ٹھگی ڈکیتی کا ذکر اسطرح کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان ہمیشہ ٹھگی ڈکیتی کا جولانگاہ تھا لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ ٹھگی کن صورتوں میں اور کیونکر ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسکی اصل ذمہ داری کس پر ہے اور کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے پہلے بھی اِن ٹھگوں کا وجود تھا۔ ہر سلطنت میں خوبیاں اور برائیاں دونوں جیسی اور جو کچھ ہوں اگر کوئی مورخ بیان کردے تو شکایت نہیں لیکن اگر کوئی مورخ کسی سلطنت کے نقائص تو بڑے زور دار اور موثر الفاظ میں پیش کرے اور فوائد کا حوالہ دبی زبان سے دھیمے لفظوں میں دیکر یا اُن کو ترک کرکے آگے بڑھ جائے تو اس سلطنت کے نقائص ظاہر اور فوائد جیسا کچھ تاریخ سے جاننے ظاہر ہوں گے نتیجہ برعکس ہوگا۔ ہماری رائے میں جو تاریخیں نصاب تعلیم میں مقرر کیجاتی ہیں اُن سے بہت کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے اور ہر شخص ادنیٰ غور و فکر سے اس کو دریافت کر سکتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ اِن تاریخوں میں سب واقعات غلط لکھے ہیں لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ واقعات پورے پورے نہیں لکھے جاتے اور صحیح اسلوب میں بھی نہیں لکھے جاتے۔

جسطرح عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ ہندو بچوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمان بچوں کو بھی ہندو پریڈ (عہد ہنود) کی صحیح تاریخ اور صحیح واقعات سے آگاہ کرنا لازم ہے اگرچہ اُس زمانہ کے حالات کا

پورا مواد و ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جس قدر ہے وہ ایسا ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ہندی ہونے کے اُس پر فخر کر سکتا ہے۔ عہد ہنود کی دولت ثروت، تمدن، اخلاقی تعلیم و علمی ترقی وغیرہ کی نسبت صحیح تاریخی حالات ایسے پیرایہ میں لکھے جاسکتے ہیں کہ اُنکا اثر مسلمان بچوں کے دلوں پر خاص طریقے سے پڑے۔ مہابھارت۔ رامائن۔ بدھ اور اشوک کے زمانہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تاریخ ہند کے دس پانچ صفحے میں لکھکر ختم کردیے جائیں۔ ہمارے لڑکوں کا کیرکٹر بھی ہندوستان کے ایسے مشہور و معروف ارواح کے حالات سے بہت کچھ درست ہوسکتا ہے۔ جو کچھ ہمنے ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے متعلق حصہ اول و دوم میں لکھا ہے اگر ہماری وہ رائے صحیح ہے تو پھر جو تاریخیں ہمارے بچوں کے نصاب میں مقرر کیجائیں وہ اُسی نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہییں۔ بڑی بڑی فلسفیانہ و علمی تاریخیں سن رسیدہ اشخاص اور منتہی طلبا کے لیے خواہ کوئی مورخ کسی طرح لکھے سن تمیز و تنقید کو پہونچکر ہر شخص صحیح و غلط۔ واقعیت اور تصنع میں امتیاز کرلیگا مگر بچوں میں یہ قابلیت کہاں ہے اسلئیے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ہی گہوارہ محبت میں پرورش پائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہوگا جب اس ملک کی صحیح تاریخ بچوں کو پڑھائی جائے۔ اب صیغۂ تعلیم ہندوستانیوں کے سپرد ہوچکا ہے پس ہر ہندوستانی منسٹر یا وزیر کا فرض ہے کہ جو تاریخ اُس کے نصاب میں مقرر ہے اُس کو خود ملاحظہ فرمائے اور باخبر اصحاب

اور انعام میں و نکتہ رس اشخاص سے اُنکی جانچ کرائے اور اگر ذرا بھی
اُس میں تعصب کی بو موجود ہو تو اُن کو نا منظور کر دے بلکہ ہر صوبہ میں
ایک انعام دس ہزار روپے کا مقرر کیا جائے کہ سر رشتہ تعلیم کا
متعلق یا غیر متعلق جو شخص ہندوستانی لڑکوں کے پڑھنے کے لئے سب سے
اچھی تاریخ اُس نقطۂ نظر سے لکھیگا جس کو ہم اپنے ملک کی بہبودی کیلئے
اور آئندہ نسلوں کے واسطے مفید پائیں گے وہ اس انعام کا مستحق ہوگا
اور پھر چند سال تک یہی تاریخ ہمارے بچوں کو اسکول میں پڑھائی جائے
بہرکیف ہماری رائے میں مستقل اتحاد قایم کرنے کی بڑی تدبیر یہی ہے
کہ ہمارے ہندو و مسلمان بچوں کے واسطے صحیح تاریخ ہند نصاب تعلیم
میں داخل ہو۔

اتحاد کی دیگر تدابیر

ہندو و مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی اصل تدبیر
تو ہم بتا چکے۔ اب بہت سی چھوٹی چھوٹی فروعی
تدبیریں ہیں جن کے اختیار کرنے سے بھی اصلاح میں بہت کچھ مدد
مل سکتی ہے۔

اصلاح کی کانگریس کمیٹیوں پر بار ڈالنا

(۱) ہماری رائے میں اتحاد قائم رکھنے کی تدبیروں
کا کام ہندوستان کے ہر ضلع کی نیشنل کانگریس کی
کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے
کہ اغراض اتحاد کے لئے وہ حسب ضرورت مقامی و غیر مقامی اشخاص کو
اپنی کمیٹی کا ممبر بنائیں اتحاد کی عملی تدابیر کرنا نیشنل کانگریس کا ویسا ہی

اہم فرض و پروپیگنڈا ہونا چاہیئے جیسا کہ دوسرے سیاسی معاملات کے دستور العمل پر کاربند ہونا بغیر اتحاد کے سوراج کا حاصل کرنا محال ہے اور اگر وہ ملا بھی تو بیکار ہوگا۔ ہر ضلع کی یہ کانگریس کمیٹی اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اتحاد بڑھانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر ممکن ہو تو مقامی عہدہ داروں کو شر و فساد رفع کرنے میں بھی مدد دیگی۔

اتحادی لٹریچر کی بھرمار سے نقطۂ نظر کا بدلنا

(۲) افسوس ہے ابھی تک نیشنل کانگریس کا کوئی خاص اخبار نہیں ہے ورنہ اُس کا ایک کالم اس کے لئے وقف کیا جاتا۔ تاہم ملک میں اور بہت سے اردو و انگریزی اخبار ہیں۔ ان اخبارات اور رسالہ جات کے ایڈیٹر ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے بارہ میں ہماری رائے سے اگر متفق ہوں جس کا اظہار اس باب کے حصہ اول و دوم میں کیا گیا ہے تو وہ اسی عنوان پر مسلسل مضامین اسوقت تک شائع فرماتے رہیں جب تک کہ لوگوں کا نقطۂ نظر نہ بدل جائے اور اہل ملک کے خیالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ محض اتحاد اتحاد پکارنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ مقصد اُسوقت حاصل ہوگا جب ملک میں اس قسم کے مضامین کی بھرمار کر دیجائے۔

دہلی کی اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنا

(۳) ۱۹۲۴ء کی دہلی کی اتحادی کانفرنس نے بہت کچھ کام کیا ہے۔ جو عام اصول اس کانفرنس نے قایم کئے ہیں ہم اُن سے بالکل متفق ہیں۔ کسی کی مذہبی آزادی میں ذرا سا فرق نہ آنے پائے

ہر شخص کو اختیار رہے کہ خدا کی پرستش کے جذبات وہ جن حرکات جسمانی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے کرے ۔ خدا اس کانفرنس کی کوششوں کو کامیاب کرے مگر اسکے بعد کہیں پھر خواب غفلت نہ طاری ہوجائے عملی کام برابر جاری رہے ۔

رکنیت کانگریس کی شرط بنانا

(۴) مہاتما گاندہی نے کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط قرار دی تھی کہ ہر ممبر روزانہ تھوڑا سا سوت چرخے میں کاتا کرے ۔ مہاتما ممدوح غالباً اس ملک کے پالٹیکس میں روحانیت کے جزو کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کو ایثار کا سبق سکھا کر تن پوشی کے معاملہ میں دوسرے ممالک کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان خود اپنی سعی و کوشش سے اپنی ضرورتوں کو فراہم کرنے کا عادی ہو ۔ اور تن آسانی کی بجائے محنتی بنے لیکن ہندوستان میں اتحاد قائم رکھنے کی اہمیت اگر اس سے کم نہ خیال کیجائے تو ہم اس حد تک بھی کہنے کو تیار ہیں کہ کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط ہونی چاہیے کہ ہر ممبر اتحاد پر ایک مضمون لکھکر کسی اخبار میں شائع کرائے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے ۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس تحریک کو مذاق سمجھیں یا مخالفین کو تسلیم وجود نفاق کی بحث کا ایک شگوفہ ہاتھ آجائے لیکن مسئلہ کی اہمیت تو اسی کی متقاضی ہے کہ قبل اسکے کہ ایسی کانگریس میں جو انڈین اورنیشنل کہلاتی ہے شرکت کی کوئی جنا

درخواست پیش کریں وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور فرما کر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں اور کم از کم یہ ہو کہ ممبری کے فارم میں اتحاد کی کوشش کرنے کا اُن سے اقرار ہی لے لیا جائے۔

یکجا تعلیم دلانا

(۵) ہم کو ہندو مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول بھی ناپسند ہے۔ پہلے زمانہ میں دوستی محبت و الفت کی گرہ مکتب ہی میں دی جاتی تھی۔ ہم کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ اپنے ہم مکتب ہندو بچوں سے گٹ کرنے پھر کیسے خلد مل جایا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح یہ ہمارے بچے پھر ساتھ ساتھ پڑھیں۔ کیونکہ جو تعلقات اور روابط اس عمر میں قائم ہو جاتے ہیں اُن کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے مذہبی تعلقات سے یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ قائم کر لی ہیں۔ یہ تو مجبوری تھی۔ مذہب کے نام سے ایسے بڑے بڑے دار العلوم قائم کرنے کے لئے روپیہ لینا تھا اگرچہ جہاں تک ممکن ہو ہماری پالیسی یہ ہی رہی ہے کہ ہمارے ہندو و مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں نہ الہ آباد کا یتھ پاٹ شالہ کالج کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہو اور نہ لکھنؤ کے مسلم ہائی اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ممنوع ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس وقت کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ یہ عام اصول ہمارے ذہن نشین رہیں۔

سوشیل الفت و طرز معاشرت میں تبدیلی کرنا

(۶) ہمارے قدیم تمدن میں جو ملنے جلنے کے مواقع تھے وہ تو اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ محلے محلے میں شام کے وقت

اکھاڑوں کو جاتے ہوئے لڑکوں کے وہ جھرمٹ اب نظر نہیں آتے ہمارے وہ کم خرچ بالانشین سستے کھیل اور ورزشیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ تبدیلی ترقی کی شرط ہے۔ لیکن اب طب لائف میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملنے جلنے کے مواقع میں جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اجنبیت سے مغائرت بڑھتی جاتی ہے اُس کو متواتر ملنے سے محبت میں اضافہ ہونے کی غرض سے مٹانا چاہئے اگر خورد و نوش میں بھی شریک ہو جائے تو کیا کہنا تھا۔ خیر وہ وقت جلد آرہا ہے۔

جداگانہ انتخاب

(۷) اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق میں ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ یہ بھڑوں کا چھتہ ہے ۱۹۱۶ء کی کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں جو قرارداد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان قرار پائی تھی اس سے بہتر ہماری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی اس کے طے کرنے میں جو جو دشواریاں محسوس ہوئی تھیں وہ اس وقت بھی ہمارے دماغ میں تازہ ہیں۔ ہم کو اُس سال کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک سکرٹری ہونے کا فخر تھا اور کسی حد تک اندرونی کارروائیوں سے بھی ہم واقفیت رکھتے ہیں ہم کو پنجاب و بنگال کے مسلمان بھائیوں سے جنہوں نے اُس قرارداد کے خلاف کہیں کہیں آواز بلند کی ہے یہ بات کہنا ہے کہ جو اُصول اس وقت طے کئے گئے تھے وہ تمام ہندوستان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے تھے کوئی

خاص صوبہ ہمارے پیش نظر نہ تھا۔ اس فیصلہ کی عمر (۸) برس کی ہو چکی اور مرور زمانہ سے اسمیں اور پختگی پیدا ہوتی جائیگی اگر وہ کسی فیصلہ کو قطعی نہیں سمجھتے اور قدامت کی کوئی وقعت انکی نگاہ میں نہیں ہے تو ہماری رائے میں ہمارے مسلمان بھائی اپنے پانوں میں آپ کلہاڑی مار رہے ہیں ہر چیز جو آج وہ تیار کرینگے اگر وہ کل پلٹ دی جائیگی۔ تو قدیم روایات کا قایم رہنا دشوار ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو بعض ہندو برادران وطن سے بھی جو آجتک مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کچھہ کہنا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کی کامیاب حکومتوں پر نظر ڈالی جائے کہ کیونکر وہ کامیاب ہیں۔ بطور مثال ہم انگلستان ہی کو لیتے ہیں اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ برٹش پارلیمنٹ کی تعریف کرو تو ہم یہ کہیں گے کہ انسانی متضاد قوتوں اور کششوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو معتدل و درمیانی انسانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی برٹش پارلیمنٹ ہے اس کو ہی حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کچھہ لبرل (Liberals) اور کنزرویٹو (Conservative) اور کچھہ لیبر Labour ممبر میں جب لیبر گورنمنٹ ہو جاتی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر امر کا فیصلہ اپنی اصلی رائے کے مطابق کر سکے گی بلکہ لبرل اور کنزرویٹو ممبروں کی متضاد کششیں اوس کو درجہ اعتدال پر قایم رکھتی ہیں ہماری رائے میں متضاد کششوں کا قایم رہنا برٹش پارلیمنٹ کی روح رواں ہے

اگر ان قوتوں کو نکال ڈالئے تو برٹش پارلیمنٹ کا تصور ہی مفقود ہو جائیگا اور جو کامیابی آج اس انگریزی حکومت کو حاصل ہے وہ ہرگز نہ رہے گی۔ اب انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان پر نظر ڈالئے یہاں بھی متضاد کششیں اور قوتیں موجود ہیں البتہ انکی نوعیت بدلی ہوئی ہے ہماری رائے میں ہندوستان کی حکومت اُس وقت کامیاب ہوگی جب اہل ہند ان متضاد کششوں کے وجود کو تسلیم کر کے اپنا پارلیمنٹ بنائیں گے۔ اگر اس ملک نے اپنی اسمبلی (Assembly) یا پارلیمنٹ کی تنظیم ایسی کردی کہ مسلمانوں کے مخصوص جذبات اُس کو جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے کام نہ آسکے تو وہ حکومت ہماری رائے میں نقش بر آب کی مصداق ہوگی۔ یہ تضاد ایسا نہیں ہے کہ اُس سے مجموعی حیثیت سے ملک کا نقصان ہو۔ ہمارے ہندو بھائی یہ کبھی خیال نہ کریں کہ ہندی مسلمان اس ملک کے مفاد کو کسی دوسرے اسلامی ملک کے مفاد کے تابع کر دیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا اور یہ محال ہے۔ اس ملک کے مسلمان اپنے اصلی فائدہ کو سمجھتے جا رہے ہیں اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اسی باب کے حصۂ دوم میں ظاہر کر چکے ہیں البتہ ایک ہی ملک میں رہکر ہندی مسلمان اپنی ترقی کے سامان کر رہے ہیں اور دوڑ میں برابر رہنا چاہتے ہیں۔ اُنکی ترقی ملک کی ترقی ہے۔ اُن کا تنزل ملک کا تنزل ہے۔ میں تو اگر ہندو

ہوتا تو مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی نسبت یہی رائے دیتا کہ اس معتدل کرنے والی قوت کو قائم رکھئے۔ ہماری حکومت میں یہ عنصر فروگزاشت کے قابل نہیں ہے۔ اتحاد قائم رکھنے کی اور یہی چند دوسری تدابیر ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں آرہی ہیں۔

ہندو مسلمانوں میں سیاسی اتحاد ہو کر رہیگا

ہماری رائے میں ہندو مسلمان بڑے بڑے سیاسی مسائل میں ایک ہی نقطہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ گزشتہ (۳۰) برس سے جو حالات ہم خود دیکھ رہے ہیں اُن سے ہماری رائے قایم ہوئی ہے۔ ہم کو سنہ ۱۸۹۸ء کا ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ اُس سال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں تھا۔ ہم کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں ہماری شرکت سے مسلمانوں کو بڑا استعجاب ہوا۔ اُسی زمانہ میں ایک روز جب ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو چند بڑے معزز مسلمان احباب نے ہم کو دیکھکر ہماری شرکت پر مذاق اڑانا شروع کیا اور ہم سے طنزاً اس طرح مخاطب ہوئے۔

"آیئے جناب! ممبر کمیٹی استقبالی نیشنل کانگریس"

پندرہ برس کے بعد ہم نے دیکھا کہ انہی میں سے ایک حضرت کا شمار کانگریس کے بہت بڑے حامیوں اور لیڈروں میں ہو گیا اور اب یہ ایک عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ایک زمانہ سر سید احمد خاں مرحوم کا تھا جب کہ نہ صرف کانگریس بلکہ تمام سیاسی مجالس میں مسلمانوں کی شرکت

کفر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر مرحوم کی کوشش سے "مسلم لیگ" قائم ہوئی جسکی بابتہ لوگوں کو ابتدا میں یہ بدگمانی ہوئی کہ وہ کانگریس کی مخالف ہوگی لیکن رفتہ رفتہ وہ ان تحریکات کی آواز بازگشت کا کام کرنے لگی جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے منظور ہوتی تھیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ مسلمان کانگریس میں ضم ہو رہے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ ہماری رائے میں وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت انگریزی کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض مشترک ہیں۔ ہندوستان کو جس قدر حقوق عطا ہونگے اُن سے بالآخر سب ہندوستانیوں کا فائدہ ہوگا علاوہ بریں سچ کی آخری کامیابی قانون قدرت میں داخل ہے اگر یہ بات سچ ہے کہ بغیر سیاسی اتحاد کے ہندوستانیوں کو سیوراج نہیں مل سکتا اور بغیر سیوراج یا ہندوستانی حکومت کے اس ملک کے تمدن میں اصلی ترقی نہ ہوگی اور کوئی ہندی بحیثیت ہندوستانی کے بیرون ہندوستان کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر دکھلایا جاچکا ہے تو یہ سچ بات کبھی نہ کبھی روز ضرور سمجھ میں آئیگی۔ اگر انسان سچ بات کو خود نہیں سمجھتا تو دنیا کی مصیبتیں اسکو سکھا دیتی ہیں۔ دنیا کے تلخ تجربے سچائی کا سبق دیدیتے ہیں اگرچہ ایک دن سچ ضرور غالب ہوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے اور یہی وجہ ہمارے اس اعتقاد کی ہے کہ ہندو مسلمان میں

سیاسی اتحاد ہو کر رہے گا مسلم لیگ بھی رہے گی۔ کانگریس بھی ہیگی مگر ان دونوں جماعتوں کا سیاسی مرکز ایک ہی ہو جائیگا۔ اور جن باتوں میں فرق رہیگا ان کا تعلق صرف اندرونی باہمی معاملات سے ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان کی اب کیا حیثیت و پوزیشن ہے

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مستقل اتحاد قایم کرنے کے لیئے مدارس کے ابتدائی درجوں میں عہد ہنود و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جو ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو لڑکوں کو پڑھائی جانی چاہیئے

لیکن کوئی تاریخ ہند اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک گزشتہ دو سو برس کا حال بھی اسمیں نہ ہو یعنے جب سے عہد مغلیہ کا دور ختم ہوا اور دور جدید کی بنیاد پڑی ہم نے بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کی ثناء خوانی کی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں کو دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں اُن اثرات اور قوتوں پر اظہار رنج وافسوس کیا ہے جو ہماری صنعت۔ حرفت۔ دولت۔ تجارت ثروت۔ فارغ البالی۔ آزادی۔ خودداری کو اڑا لے گئیں۔ اور اس غرض سے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم رہے یہ بھی بتایا ہے کہ عہد مغلیہ کی نسبت اہل ہنود کا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہیئے اور مسلمان کس نظر سے اہل ہنود کو دیکھیں لیکن قبل ظلم

اُٹھانے کے ملک ہندوستان کے مورخ کو اس کا تصفیہ بھی کرنا ہوگا کہ
کہ اس کو موجودہ حکمرانوں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ صحیح واقعات
کا لکھ دینا ایک اور بات ہے اور ان واقعات کو ناظرین کے روبرو
پیش کرنے کا طریقہ امر دیگر ہے۔ کسی واقعہ کے پیش کرنے کا طریقہ ہی
وہ شئے ہے جس میں مورخ کے جذبات ناظرین کے دلوں پر اپنے گل
کھلایا کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت
اس بات کا خوف ضرور ہے کہ ہماری قومی آزادی و خودداری کے چھن
جانے سے اور صنعت و حرفت کے مٹنے سے جو جذبات و جوش پیدا
ہوں وہ کہیں صداقت کا خون نہ کردیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ صداقت
ہر چیز کی مضبوط بنیاد ہے۔ جو عمارت صداقت پر مبنی ہے وہ کبھی
منہدم نہ ہوگی یوں تو جوش اور جذبات کی لہریں سنگ صداقت
سے بہت کچھ ٹکرائیں گی مگر یہ پتھر ایسا گراں وزن ہوگا کہ اسکو بڑے
سے بڑا طوفان بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ یہ بڑا اخلاقی جرم ہوگا
کہ ہم ان نقصانات کا تو ذکر کریں جو موجودہ حکومت سے ہم کو پہنچے
ہیں اور ان فوائد کا اعتراف نہ کریں جس سے ہم مستفید ہو رہے ہیں
اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی اس جرم کے مرتکب ہونگے جسکی فرد قرارداد
جرم ہم ان مورخین پر لگا رہے ہیں جو عہد مغلیہ کے صحیح صحیح واقعات
درج نہیں کرتے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس کا پیش نظر رکھنا ہندوستان
کے مورخ کا فرض ہوگا۔

یوں تو ہر مورخ کے خیالات علیحدہ علیحدہ ہونگے لیکن موجودہ
انگریزی حکومت کی نسبت ہمارے جو خیالات ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں
ہم اپنے خیال کو اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر جسٹس رینڈے
کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور اب پھر مختصر
الفاظ میں اُس کے اعادہ کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان
ایک منزل مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا ہے جس کے بہت سے درمیانی
منازل ہیں جس طرح عہد ہنود کے بعد عہد مغلیہ اُس کی ایک ضروری
طے شدنی منزل تھی اسی طرح موجودہ انگریزی حکومت کی منزل کا
طے کرنا بھی قادر مطلق نے ضروری کیا تھا۔

ہم موجودہ حکومت کو اصلی ڈرامے کا ایک سین یا منظر سمجھتے رہے ہیں
عہد مغلیہ کے بادشاہ کی ذات و مذہب کا جو جذب مقناطیسی ہمارے دل پر
ہو تھوڑی دیر کے لئے اُس سے قطع نظر کر کے ہم دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں
انسانوں کے باہمی تعلقات میں کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے
انسان کا پایہ کیسا بلند ہوتا جا رہا ہے۔ جو شخص دوسرے کو چھو نہیں سکتا
تھا آج وہ دوسروں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے رہا ہے۔
ہر حکومت میں اب جو انتظامی شاخیں قائم ہو گئیں یا قائم ہوتی
جا رہی ہیں اُس کے ایک شعبہ کی نگرانی بھی ایک دماغ قابل اطمینان طریقے
سے نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل حکومت کا انتظام پھر نقل و حمل کے
ذرائع میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اُس سے اس دنیا کی کلی

تمام حکومتوں میں جو باہمی تعلقات منسلک ہوتے جارہے ہیں وہ ایک مہین باریک جال کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ہر تار پر نگاہ رکھنا ایک دماغ سے ممکن نہیں۔ ان واقعات کا جو اثر ہر ملک کی طرز حکومت پر پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں حکومت کی قوت انسانوں میں اس طرح تقسیم ہوگئی کہ بایدوشاید۔ کیا ایشیاء اس سے بچ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر اسمیں یہ تبدیلی کیونکر نہ ہوتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے قادر مطلق نے ہر ملک کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ ذرا امریکہ فرانس۔ روس۔ جرمنی۔ یونان۔ چین۔ ٹرکی۔ اور ایران کے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے حالات پر نظر ڈالئے۔ کہیں کشت وخون کی مدد سے کہیں اخلاقی قوتوں کے زور سے کہیں حکمت عملی سے حکومتوں کے تغیرات کا ایک ہی سین ومنظر اسٹیج دنیا کے تھیٹر میں ہم کو دکھایا جارہا ہے۔ ہم اسوقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک سچے مورخ کو ہندوستان میں انگلستان کی حکومت کس نقطۂ نظر سے دیکھنی چاہیئے۔ اور اسی وجہ سے یہ واقعات لکھے جارہے ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ جزئیات سے قطع نظر کرکے بلند پروازی کرے اور پھر قدرت کا سماں دیکھے۔

خدا کی زبان اس عالم کے واقعات ہیں اور ان واقعات میں کچھ ایسا تسلسل ہے کہ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے مڑکر

دیکھتے ہیں تو نتائج کا ایک نیا سماں نظر آتا ہے سنہ ۱۸ء تک جو واقعات گزرے اُن سے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ ظالم ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں کیوں آئی ایک صدی کے بعد سنہ ۱۹۰ء میں عالم اسباب کے عجیب و غریب ڈرامہ کا سلسلہ کچھ سمجھ میں آنے لگا اب گزشتہ چوبیس برس میں جو تغیرات دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے دنیا میں ہو گئے ان پر ہم غور کرتے ہیں۔ زار (Czar) روس کی نسل کا نام و نشان نہ رہا۔ قیصر جرمنی لکڑی کی تجارت کر رہا ہے۔ سلطان ٹرکی اپنی بسر اوقات میں دوسروں کا دست نگر ہے۔ شاہ ایران پیرس میں کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ یونان کا فرماں روا جلا وطن کیا گیا۔ چین کا بادشاہ تاش کے بادشاہ سے زیادہ قوت نہیں رکھتا یہ وہ عبرتناک واقعات ہیں جو چھبیس برس قبل ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے اب ان چھبیس برس کے واقعات کو اس کے قبل کے ڈیڑھ سو برس کے واقعات کیساتھ ملا کر دیکھیے۔ بالخصوص امریکہ و فرانس کے واقعات مورخ کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے مسلمہ یا مشتبہ واقعات سے نتیجہ اخذ کرے۔ قوموں کی حیات و ممات کے متعلق صحیح نتائج وہی ہونگے جن کی تطبیق ان واقعات عالم سے ہو جو قدرت خدا سے دراصل ظہور پذیر ہوئے۔ خدا اپنا ارادہ اسی عالم اسباب اور انہیں واقعات عالم کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔ جب ہم نتیجہ نکالنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں طریقۂ حکومت کا بدلنا قادرِ مطلق کی اسکیم اور پروگرام میں داخل تھا۔ پھر بھلا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ اس سے کس طرح مستثنےٰ کیجا سکتی تھی۔ ہماری رائے میں ہندوستان میں طریقۂ حکومت بدلنے کا مقصد حاصل کرنے کے لئے قادرِ مطلق نے انگلستان کو یہاں مسلط فرمایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان نے اس دورِ حکومت میں سیکھی وہ یہ ہے کہ حکومت کی قوت مختلف افراد میں تقسیم کر کے وہ حکومت زیادہ مستحکم کیونکر بنائی جا سکتی ہے انفرادی و اجتماعی حیثیت سے کام کرنے کے اصول بھی اس حکومت نے ہم کو سکھائے یورپ و امریکہ نے جسقدر سوسائیٹیاں اور جماعتیں معاملات دنیوی کو زیادہ مکمل طور سے انجام دینے کے لئے قائم کر رکھی ہیں اُنکی مثال دنیا کے قدیم تمدن میں نہیں ملتی۔ ہم یہ طریقے بھی انگلستان کے ذریعہ سے سیکھ رہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اُس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انگلستان دراصل اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہم پر مسلط کیا گیا ہے ابتدا میں کچھ ہی حالت رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تاریخ ہند میں انگلستان کی پوزیشن (Position) اور حیثیت ایک امین یا معلم کی سی ہوگئی ہے۔

ہندوستان میں انگلستان کے کارنامے کی [illegible]

ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین ہمارے اعلیٰ پوائنٹ (Point) اور مقصد کو پیش نظر رکھیں اس وقت ہم کو نہاتما گاندھی کے نان کوآپریشن Non Cooperation

یعنے ترک موالات سے تعلق ہے اور نہ پنڈت سرینواس شاستری کے کواپریشن (cooperation) یعنے موالات سے بحث ہے۔ اس حصے میں شروع سے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ ہندو زمانہ و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جس میں کچھہ چھپایا نہ گیا ہو لڑکوں کو پڑھائی جائے جسکی مفصل کیفیت بیان ہو چکی اسی کے سلسلہ میں ہم اپنا خیال اس امر کے متعلق بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دور موجودہ یعنے انگلستان کے کارنامے بھی ہمارے بچوں کے سامنے کیونکر پیش کئے جائیں ہم یہاں بھی بحیثیت مورخ منافقت سے متنفر ہیں۔ ہم صرف اصولی طور سے یہ بیان کر سکتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں پہلے سے کوئی زہر ڈالنا اور اس سے ان کو متاثر کرنا مناسب نہیں۔ مورخ کے فرائض بہت مقدس ہیں اسکی ذمہ داریاں اہم ہیں۔ اسکو صرف صداقت کے راستے پر چلنا چاہئیے اس راستے میں کہیں کہیں دشواری ضرور پیش آئیگی لیکن وہ ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ سچ ہے کہ انگلستان ہم کو نیا طرز حکومت سکھا رہا ہے۔ ہندوستان کے نقل و حمل کے ذرائع و تجارت میں روز افزوں ترقی ہے۔ بڑے بڑے جہاز ساحل ہندوستان پر مال و اسباب سے لدے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔ ریلیں اور موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑتے نظر آ رہے ہیں ہندوستان ہزاروں میل کے فاصلہ سے تار اور بے تار دونوں کے ذرائع سے اپنے معاملات دیگر ممالک سے چند منٹ کی گفت و شنید میں طے

کر رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس موجودہ دور کے قبل ہم اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور آپنے ہی پاؤں سے چلتے پھرتے تھے۔ اب نئی رفتار و طرز حکومت کے سکھائے جانے کے بعد آج ہیں ہم ابھی تک انگلی پکڑا کر چلائے جا رہے ہیں۔ جہازوں میں مال تو ہے مگر جب مال کا بنڈل اور صندوق کھول کر دیکھتے ہیں تو اُس میں ہماری دولت و صنعت و حرفت مقابلۃً بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ مال کسی اور کا ہے۔ ریلیں اور موٹریں تو ہیں مگر ہم انکے انجنیر نہیں ہیں بلکہ ابھی شوفر کا کام انجام دے رہے ہیں اور ہوائی جہازوں کا انجنیر ہونا تو درکنار اسکے شوفر بھی ہم نہیں ہیں۔ صرف دُور سے تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ تار اور بے تار کی خبروں کے معاملہ میں ہم ہمہ تن متحیر کھڑے ہیں۔ بنانا تو درکنار ابھی سمجھنے کی بھی قابلیت ہم کو نہیں۔ ان سچی باتوں کے نہ ظاہر کرنے میں اُسی قسم کی افراط و تفریط ہوگی جو بعض عہد مغلیہ کے مورخ اُن کے عیوب دکھا کر انکی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخ جادۂ اعتدال و صداقت پر رہیں اور ہم ابھی انگلستان سے ناامید بھی نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب ابھی مشرق کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ بعض اوقات دیکھا ہے کہ جن قومی اوصاف کو ہم اپنی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اُن پر مغرب انگشت نمائی کرتا ہے اور جن باتوں کو ہم عیوب میں داخل کرتے ہیں اُن کو اہل مغرب فیشن و

تہذیب کی علامات سمجھتے ہیں علاوہ ازیں ہمارے موجودہ حکمرانوں پر ابھی ضرب المثل صادق
آرہی ہے کہ "کے آمدی و کے پیر شدی" قوموں کی تاریخ اور زندگی میں سو ڈیڑھ سو برس
ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جیسے افراد کی زندگی میں ایک دو سال۔ انگلستان نے ہندوستان
سے ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر ایک ملکہ معظمہ کی زبان کے ذریعہ سے
کچھ وعدہ کیا تھا اور پھر ۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم کی مصیبت کے وقت
اُس وعدہ کی توثیق ایک دوسرے جلیل القدر شہنشاہ کی زبان سے کرائی
اس دور کے یہ سب سے بڑے کارنامے ہیں اگر انگلستان نے یہ وعدے خود
پورے کیے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچے اور ہماری نسلیں احسان و
شکر گزاری کے بار گراں سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکینگے دنیا کی تاریخ
میں اسکی مثال ملنا دشوار ہوگی۔ ہماری دولت۔ صنعت۔ حرفت۔ خودداری
وقعت اور کیرکٹر میں حالت محکومی سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی
و خانہ پُری ایفاء وعدہ سے جلد ہو جائیگی لیکن اگر بالآخر واقعات
وحادثات عالم کے زور نے وعدہ پورا کرایا تو اس میں شک نہیں کہ
تاریخ کا آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ انگلستان پر خود غرضی کی انسانی کمزوریاں
غالب آگئی تھیں وہ اپنے بار امانت کو برداشت نہ کرسکا۔ یوں تو
اس دنیا کی قدرتی قوتیں عمل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے بہتیرے دور
بنی نوع انسان بھی ایک نہ ایک دن ضرور ٹھکانے لگینگے۔ ہماری تاریخ
میں موجودہ دور اس طرح گزر جائیگا جیسے کسی لذیذ پلاؤ کے تیار کرنے
میں بیچ کا اُبال ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مقابلہ میں

انگلستان کی اہلیت وقابلیت کا آخری فیصلہ تاریخ اسی بنیاد پر کرے گی کہ اُس نے اپنے دور میں ہمارا پایہ بحیثیت انسان بلند کیا یا پست حق ہماری جانب ہے اور ہم کو امید ہے کہ انگلستان کا کیرکٹر بالآخر حق کا ساتھ دیگا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں کے سامنے انگلستان کے کارناموں کا کھاتہ بند کرنا نہیں چاہتے۔ دورِ مغلیہ کا کھاتہ تو بند ہو چکا ہے لیکن موجودہ دور کا کھاتہ رواں ہے۔ ہماری رائے میں ابھی ہندوستان کے مورخ کو آخری فیصلہ ابھی نہ نکالنی چاہیے۔ موجودہ دور کو ہم نہ شب تار سمجھتے ہیں اور نہ روزِ روشن۔ ہماری امیدیں ابھی انگلستان سے وابستہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے مورخ کے لیے یہی سچا اور صحیح راستہ ہوگا۔

خاتمہ

ممکن ہے کہ اس کتاب میں کوئی عبارت ایسی ہو جو ناظرین میں سے کسی کے خلاف مزاج ہو اگر ایسا ہو تو اُس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری غرض اس کتاب سے اتحاد پیدا کرنا ہے نہ کہ نفاق۔

گو اب سنہ ۱۹۱۸ء سے میں رعایائے حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی خدمت کرنے میں مصروف ہوں لیکن اسکے قبل کچھ عرصہ تک ہندوستان کے پالیٹکس (Politics) کے میدان میں کچھ بادیہ پیمائی اور خاک بیزی کر چکا ہوں۔ میں اس کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں کہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی کا سیاسی اثر ہم پر کیا ہوگا۔ یہی اندیشہ

اس کتاب کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں عشر عشیر بھی کامیابی ہوئی تو میں یہ خیال کرونگا کہ میری کُل محنت وصول ہو گئی۔ بالآخر ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم انسان تیرے بندے کمزور ہیں۔ بغیر تیری مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اے خدا مدد کر۔ اور اس ملک کے تمام باشندوں میں اتفاق پیدا کر تا کہ اُسکی تقویت سے ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں فقط

سمیع اللہ بیگ

؍؍ جمادی الاول سنہ ۱۳۴۵ھ ۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

ختم شد

قطعہ تاریخ طبع کتاب ہذا

از مولوی اسد اللہ حسینی صاحب اسدؔ صیغہ دار مجلس عالیہ عدالت ممالک سرکار عالی

مندر میں ہندو مطمئن مسجد میں مسلم مطمئن ——— تھے بے الم ہندو مسلماں عہد عالمگیر میں

۴۴ ۱۳ف

تاریخ لکھتے ہیں ”سلسل“ نواب مرزا یار جنگ ——— ہندو مسلماں ایک تھے یاں عہد عالمگیر میں

۴۳ ۱۲ھ

ہندو۔ ہنداسلامی عہدمیں

○ ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

○ ———— سید سلیمان ندوی

○

سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے 'معارف' میں بڑے
کام کی چیزیں شائع کیں۔ 'معارف' بابت مئی تا دسمبر
۱۹۱۸ء سے ان کا یہ ایک اہم مقالہ پیش خدمت ہے۔

——— ادارہ

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

سید سلیمان ندوی

۱

مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ قوم تھی جو ہر غیر قوم سے اسقدر شدید نفرت رکھتی تھی کہ اسکے سایہ تک سے گریز کرتی تھی، اور اس کو ملیچھ، ناپاک، اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اُس وقت مین کوئی یہ خیال کر سکتا تھا کہ کسی زمانہ مین ہندو قوم بھی اس قدر روادار اور وسیع الخیال ہو جائیگی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جلکر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی، اُسکے علوم و فنون پڑھے گی، اُسکے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اسکے ساتھ شاگردی و استادی کا رشتہ قائم کرے گی۔ لیکن سو دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات مین بڑا تغیر آگیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریان کرنے لگے، اور دربارون مین مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندؤن کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے۔

اگر مسلمانون کا درمیانی دور جنے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندؤن کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور دوسری قومون کے علوم و فنون سیکھنے کی اُن مین ترغیب پیدا کی، ہندوستان مین قائم نہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزون کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان میں

ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کے لیے، مدارس، مکاتب، پاٹ شالے اور کالج کھلجاتے، گوہر مقصود کی تلاش مین سمندرون مین بے محابا سفر کرتے، انکو سو دو سو برس تو صرف اپنی نفرت قومی اور تعصب مذہبی کے مٹانے مین صرف ہوتے، اور اس اثنا مین مسلمان کہین سے کہین جا نکلتے۔

ہندؤون پر مسلمانون کا دوسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانون سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق، تعلیم ہندؤون کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، حکم تھا کہ وید کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر کے کان مین پڑجائے تو اُس مین سیسہ پلا دیا جائے، برہمنون کے علاوہ ہندؤون کے دیگر طبقون مین یا علم مطلق نہ تھا، یا بہت ہی کم تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مذہباً انکو تعلیم کے حاصل کرنے کی مطلقاً اجازت نہ تھی، لیکن مسلمانون نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندؤون کے ہر طبقہ تک عام کردیا۔ برہمنون سے لیکر کھتری، کایستھ، بنیے، اور ان سے بھی نیچے درجون تک علم اتر آیا، آج ہندوستان مین برہمنون سے زیادہ نہین تو برہمنون کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہین، اور مسلمانون کے عہد حکومت مین بھی یہی حال تھا کہ برہمنون سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے۔

ہندؤون پر مسلمانون کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان مین تعلیمی علوم و فنون مین وسعت پیدا کی، قدیم ہندوستان کے شیشۂ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین جن علوم کی تعلیم رائج تھی، انکی فہرست نہایت مختصر تھی۔ نصاب تاریخ سے یہان کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہان برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان مین پہلے سے موجود تھے، لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگون کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم

کے متعلق دنیا کی دوسری قومون کی جو تحقیقات تھی، اس سے یہان سرتاپا ناواقفیت تھی، مسلمان علمانے انکے نصاب تعلیم کو ان فروگذاشتون سے پاک کیا،

مسلمانون مین ہندوستان کا سب سے پہلا علمی فاتح، بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے زمانہ مین ہندوستان آیا، یہ مسلمانون کی ہندوستان کی عملداری کا آغاز باب تھا اور ضرورت تھی کہ ہندؤن نے خلافت بغداد کو دوسری صدی ہجری مین جو علمی قرض دیا تھا، وہ مع سود کے واپس کردیا جائے، بیرونی کتاب الہند کے پہلے باب مین لکھتا ہے:

" اجنبی ہونے کے سبب سے مجکو ہندو علماے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی، لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زباندانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی، چونکہ ہیئت اور ریاضیات مین مجکو کامل مہارت حاصل تھی مین خود انکو تعلیم دینے لگا، پنڈتون کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی، تعجب سے پوچھتے تھے کہ تمنے یہ باتین کس پنڈت سے سیکھی ہین، انکو یقین نہین آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم وفنون مین انکا ہمسر ہوسکتا ہے، وہ مجکو جادوگر سمجھتے تھے اور "بحرالعلوم" کہتے تھے "

ہندو پنڈتون کی واقفیت کے لیے، اسنے عربی زبان سے حسب ذیل کتابین سنسکرت مین ترجمہ کین۔ رسالۂ اصطرلاب۔ مجسطی۔ اقلیدس کے مقالے، علاوہ ازین ہندو پنڈتون کے سوالات کے جواب مین بھی اُسنے کئی رسالے لکھے، ہندو ہیئت دانون نے ہیئت کے متعلق سوالات کیے تھے۔ ۱۲۰ صفحون مین اسنے انکے جوابات لکھے، ایک رسالہ اُس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے مدارج جو عربی زبان مین ہین وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہین[1]۔

[1] فہرست تصنیفات بیرونی در آثار باقیہ۔

مسلمانون کے فتوحات نے ہندوستان مین جب وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتون کو ان کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بھوجر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کیخدمت مین پہنچا، اور ان سے مسلمانون کے علوم کی تکمیل کی قاضی صاحب نے بھوجر سے سنسکرت سیکھی اور اسکی مدد سے انبرت کنڈ (حوض آبحیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی مین ترجمہ کیا[1]

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ مین تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا، اور جسکے آثار سلطنت پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادین کھڑی کی تھین، اُسنے ہندون کے لیے بہت سی عربی اور فارسی کتابون کے ترجمے ہندی مین کرائے، فرشتہ کی عبارت یہ ہے:

وفرمود تا اکثرے از کتب عربی وفارسی بزبان ہندی ترجمہ کردند[2]

سری بھٹ نام ایک بید کو طبابت کی تعلیم دلاکر اپنے دربار مین یہان تک ممتاز کیا کہ وہ سیاسی معاملات مین بھی دخیل ہوگیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

وسلطان بجہت طبابت سری بھٹ راکہ طبیبے حاذق بود تربیت کرد (صفحہ ۳۴۲)

ہندون کو مسلمانون سے جو نفرت قلبی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی ہندو مسلمان بادشاہون کے دربار مین نوکری تک قبول نہین کرتا تھا، رسوم و عادات کی یہ بندشین سب سے پہلے دکن مین ٹوٹین، مسلمان سلاطین نے ہندو فاضلون کی قدر افزائی شروع کی اور اس بہانہ سے وہ رفتہ رفتہ مسلمانون سے مانوس ہونے لگے۔

شہزادہ محمد تغلق کے دربار مین گنگو نام ایک برہمن حذمت منجمی پر ممتاز تھا حسن بہمنی جو

---

[1] جامع القصص العربیہ فی الاخبار الہندیہ صفحہ ۱۵ مطبوعہ فرانس۔ [2] جلد ۲ صفحہ ۳۴۲، نولکشور

دکن مین بہمنی حکومت کا بانی ہوا ہے، وہ اس منجم کا نہایت ممنون احسان تھا اس تقریب سے دکن کے برہمنون کو بہمنی حکومت کے ساتھ موانست پیدا ہوئی اور بالآخر تمام دفاتر سرکاری کے وہ مالک بن بیٹھے، فرشتہ مین ہے:

شہور ہست کہ پیش ازین برہمنان، پیرامونِ عہدہ و عملِ (نوکری) شہریارانِ اسلام نمی گردیدند و در قرایا (گاؤن) و زدایا و سواحل انہار بکسب انواع علوم خصوص علم نجوم اشتغال داشتہ۔ متوکلانہ زندگی میکردند و ملازمت اہل دنیا خصوص مسلمانان را مزیلِ حسنات دانستہ و شقاوت ابدی تصور کردہ پیرامون عہدہ و عمل نمی گردیدند اگر احیاناً بعضے از ایشان بوسیلۂ طبابت و نجوم و وعظ، و قصہ خوانی در صحبت ارباب جاہ می بودند بانعام و احسان ایشان مخصوص گشتہ، قلادۂ نوکری در گردن نمی انداز ند۔ اول کسیکہ از فرقہ براہمہ در دور سلاطینِ اسلام نوکری کرد گانگو پنڈت بود و تا حال کہ سنہ ۱۰۱۵ھ است بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہا (ن) دکن و نویسندگی ولایت ایشان بہ بہامنہ (برہمن) مرجوع است (جلد ۱ صفحہ ۲۷۰)

شاہی دفتر کی زبان عموماً فارسی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل کار فارسی زبان اب سیکھنے لگے تھے، ابراہیم عادل شاہ جو ۹۳۲ھ مین دکن کی عادل شاہی خاندان کا فرمانبردار رہوا تھا اُسنے فارسی زبان بھی دفتر سے برطرف کردی۔

و دفتر فارسی برطرف کردہ ہندوی کرد و بہامنہ (برہمن) را صاحب دخل گردانیدہ (فرشتہ صفحہ ۲۴ جلد ۲)

شمالی ہندوستان کی نسبت مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ مین، یہان ہندوؤن نے فارسی پڑھنی شروع کی، تاریخون کے پڑھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو رعایا کی تعلیم کے لیے اس سے پہلے کوئی خاص انتظام نہین کیا گیا تھا، بلکہ جو طریقۂ تعلیم، اور نصاب تعلیم ان مین مدتون متوارث چلا آتا تھا اُن مین کوئی دخل نہین دیا گیا۔ اپنے طور پر

درس تدریس کے جو انتظامات اُن مین جاری تھے انکو علی حالہا باقی رکھا گیا۔مسٹر لا اپنی تاریخ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا کے دیباچہ مین لکھتے ہین:

ابھی وہ دن دور تھا جب کہ ہم سلمان سلاطین کو ہندو اور سلمان دونون رعایا کی تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوے اور ایک ہی جوش کے ساتھ سلمانون کے علاوہ دوسری قومون کے علوم کو ترقی دیتے ہوے پائین۔سب سے پہلے سلمان فاتح کے ہندوستان مین قدم جمنے کے ایک صدی یا دو صدی بعد تک ہندؤون کی تعلیم اور اُنکے علوم اپنے (قدیم) راستہ پر اپنے حامیون کی اعانت سے چلتے رہے۔

مگر بعض قراین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ان مین اس سے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۷۵۲ھ مین تخت نشین ہوا تھا، کانگڑہ کی فتح کے موقع پر جوالا مکھی کی سیر مین اسکو ایک چھوٹا سا کتبخانہ ملا تھا، پنڈتون کو بلاکر چند کتابون کا فارسی مین ترجمہ کرایا۔سیر المتاخرین کی عبارت یہ ہے۔

سلطان علماے آن طائفہ را بحضور خویش طلب داشتہ مضامین آن را شنیدہ محظوظ گردید و فرمود بعضے ازان کتب را بہ فارسی ترجمہ کنند۔

بہرحال مورخین کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندؤون مین فارسی تعلیم کا رواج سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا۔سلطان لودی نے ہندؤون کے نہان کی جگھون مین مساجد، مدرسے اور بازار قائم کئے، سپاہیون کو تعلیم پر مجبور کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندؤون مین بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہوگئی۔فرشتہ شہادت دیتا ہے:

بعہد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء و ارکان و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آنزمان درمیان ایشان

معمول بود پرداخته،

اسکے بعد شیر شاہ کا زمانہ آتا ہے، اُسنے ہندؤن کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، بہت سے ہندؤون نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان مین بھی دفاتر سرکاری مین نوکریان حاصل کین، راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کے نورتن مین شامل ہے وہ شیر شاہ ہی کا تربیت کردہ تھا اور اسکی محکمہ مالگذاری کا دیوان تھا۔

تیموریون کے زمانہ مین ہندؤن کی تعلیمی ترقی درجۂ کمال تک پہنچ گئی، گو اسکی تفصیلات نہ ملین لیکن استقصاے جزئیات سے یہ نتیجہ واضح طور سے نمایان ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم ان کے زمانہ مین گھر گھر پھیل گئی۔

فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لیے ملک کے مشہور شہرون مین بڑی بڑی درسگاہین تھین، جہان دور دور سے طلبہ آکر شریک درس ہوتے تھے۔ یہ درسگاہین، ٹھٹھہ ملتان اور خصوصاً بنارس مین زیادہ تھین[۱]۔ سلاطین تیموری بھی ان علوم کی دستگیری مین کمی نہین کرتے تھے۔ درباروں مین انکو مسلمان فضلاے عہد کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری کے ہند و فضلا کے حسب ذیل نام لکھے ہین: مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، شیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، جدروپ، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر، مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، وآسو در بھٹ، باہن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، برم اندر، گوپی ناتھ، بجی سین سو، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی مین ترجمہ کیا،

[۱] مآثر عالمگیری صفحہ ۸۱۔

اکبری دربار مین فن مصوری ونقاشی کے جو ماہرین تھے، ان مین مسلمان اُستادون کو چھوڑکر، حسب ذیل ہندو اساتذہ تھے: دسونت کہار، وساون، کیشو، لال، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، ساونلا، ہری بنس، رام۔

جس طرح اس عہد مین سنسکرت سے فارسی مین کتابین ترجمہ کی گئین، بعض کتابون کا عربی وفارسی سے سنسکرت مین بھی ترجمہ کیا گیا۔ مرزا الغ بیگ کی زیج، علم ہیئت کی آخری اور مستند کتاب ہے، مسلمان اور ہندو فضلا کی ایک مشترک مجلس نے اس کا سنسکرت مین ترجمہ کیا، ہندو علماء مین سے کشن، جوتشی، گنگا دھر، مہیش اور مہانند اس مجلس کے ممبر تھے،

جہانگیر نے بھی ہندو فضلا کی قدردانی مین کمی نہین کی، اس کے عہد مین جدرُوپ گوشائین، نہایت مشہور بیدانت تھا، وہ پاپیادہ اسکے جھونپڑے تک جاتا اور گھنٹون اُسکے پاس بیٹھا رہتا، راستہ چلتے کسی سنیاسی کا نام سنتا تو اُسکے ملاقات کو اُتر پڑتا، ایک دفعہ وہ سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ ایک مقام پر اسکو بہت سے جوگی نظر آئے، تزک مین لکھتا ہے:

درہمین منزل شب شیورات واقع شد جوگی بسیار جمع آمدہ بودند..... بادانایان این طائفہ صحبتہا داشتہ شد،

رائے منوہر لال ولد رائے لون کرن لڑکپن سے جہانگیر کے زیر سایہ عاطفت تعلیم پاکر جوان ہوا تھا۔ فارسی زبان کی شاعری اور خوشخطی مین سلیقہ خاص پیدا کیا[۱]۔ راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار مین پیش کیا۔ جہانگیر اسکے چند ہندی اشعار سنکر نہایت محظوظ ہوا۔ اور ایک ہاتھی اسکو عطا کیا[۲]، اسکے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا جسکو جہانگیر نے ایران بھیجا تھا[۳]

دارا شکوہ کا دربار ہندو فضلا اور شعراء سے بھرا رہتا تھا، وہ خود بھی ہندوؤن کے

[۱] تذکرہ خوشنویسان [۲] تزک جہانگیری، [۳] تزک جہانگیری صفحہ ۲۰۵

علوم وفنون مین مہارت رکھتا تھا، اسلیے ہندو علما کو عزیز رکھتا تھا، اسکے دربار کا گویا ملک الشعرا ایک برہمن چندربھان نامی تھا۔ اس کا تخلص برہمن تھا۔ فارسی مین دلپسند شعر کہتا تھا، اس کا دیوان فارسی اب تک موجود ہے، داراشکوہ کے قتل کے بعد بنارس مین آکر سکونت اختیار کرلی تھی جہان اسنے ۱۰۷۳ھ مین وفات پائی،

اس مضمون مین بدنصیب عالمگیر کا نام، کسی دوستانہ حیثیت سے تو بار نہین پاسکتا لیکن دشمنانہ انداز مین بھی کیا کسی رسم محبت کا سراغ لگ سکتا ہے؟ مآثر عالمگیری مین ہے،

بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ وملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان در مدارس مقرر بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند در اغبان و طالبان از ہنود ومسلمانان مسافتہاے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت گمراہ می آیند، احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس ومعابد بے دینان دستخوش انہدام سازند وبہ تاکید اکید طور درس وتدریس ورسم شیوع مذہب کفرانیان براندازند (صفحہ ۸۱)

اس عبارت سے جہان عالمگیر کی تنگدلی ظاہر ہوتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبون مین انکے مدارس قائم تھے، غالباً ان مدارس کے توڑنے کے احکام اسی اصول پر مبنی ہونگے جسکی مثال ہمکو اس روشن عہد حکومت کی تعلیمی پالیسی مین نظر آتی ہے۔

محمد شاہ کے زمانہ مین راجہ جی سنگھ والی جے پور نے، دلی، بنارس اور اوجین مین رصدخانے قائم کرائے، ملا خیراللہ مہندس رصدخانۂ دلی کے منتظم خاص تھے، بنارس کا رصدخانہ اب تک موجود ہے، اور ہندوؤن کے تہوارون مین اور شادی بیاہ کی

تاریخون مین اس سے اب تک مدد لی جاتی ہے۔

جی سنگھ نے سلمان علما کو جمع کر کے عربی زبان کی چند مشہور ہیئت کی کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا[1]۔

اس تمام عہد مین ہندوؤن کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق، علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوشنویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اس عہد مین یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا، یہ تو ہم نہین کہتے کہ سلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان مین کتابون کے جمع کرنے اور کتبخانون کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا۔ کانگڑہ کی فتح مین سلمانون کو جو کتبخانہ ملا تھا اُسکا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ لیکن اس عہد مین سلمانون کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا مین کتبخانون کے قائم کرنیکا شوق پیدا ہو گیا۔ تاریخی حوالون کو چھوڑ کر آج ہندوؤن کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہین وہان عربی اور فارسی کتابون کے چند فرسودہ جلدین کسمپرسی مین پڑی ہوئی ملین گی۔ بڑے بڑے ہندو امراء کے ایوانون مین دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتبخانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا، لاہور، دلی، لکھنو، پٹنہ، اور ڈھاکہ مین ایسے بکثرت گھرانے ملین گے، پٹنہ مین اسوقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہین جنکے ہان عربی کتابون کے نوادر نسخے ابتک موجود ہین اور انکو اسقدر عزیز ہین کہ وہ انکو جدا نہین کر سکتے، راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان مین اس قسم کا ایک نادر کتبخانہ موروثی چلا آتا ہے۔

---

[1] سبحۃ المرجان آزاد۔

(۲)

گذشتہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا وہ جنوبی اور شمالی ہندوستان اور کشمیر کے متعلق تھا، ان اوراق میں اس خطۂ ہند کے متعلق ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہین جو آج ہندوستان کا سرتاج اور مایۂ فخر وناز ہے، یعنی **بنگال** !

بنگالی زبان آج اپنی ثروت اور تمول کے لحاظ سے تمام ہندوستان کی زبانون مین سب سے زیادہ دولتمند ہے، لیکن یہ سنکر تعجب ہو گا کہ اسکی ترقی کا آغاز بنگال مین سلمانونکی ابتداے حکومت سے ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ زبان کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی، بنگالی زبان کی سرسبزی اور شادابی کی آج دہوم ہے، لیکن مسلمانون سے پہلے اس زمین مین ایک تخم بھی بویا نہ گیا تھا،

اس دعوی کے ثبوت مین ہم اپنی تحقیقات کے بجاے، ایک فاضل بنگالی مورخ کی تاریخ "ترقی علوم در ہندوستان" کے چند اقتباسات پیش کرتے ہین،

"سلاطین بنگال کی کوششین صرف سلمانون کی تعلیم کی ترقی تک محدود نہین ہین، کیونکہ انھون نے اپنی دیرینہ بیدار مغزی کو ایک نئے راستہ پر علوم کو ترقی دینے مین جسکے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگون کو خاص طور سے دلچسپی ہونا چاہیے، متوجہ کیا، ان لوگون کو یہ بات

بے جوڑ معلوم ہوگی کہ انکی زبان اپنے علمی سطح تک پہنچنے مین خود انکی نہین بلکہ ان مسلمانونکی ممنون ہے جنکی ابتدائی توجہ اسکی طرف صرف اسکی ندرت کی بناپر اور اس بنا پر تھی کہ اسکو اُس سنسکرت زبان سے تعلق ہے جو اس وسیع ہندو آبادی کا محبوب خزانہ ہی جسکے ساتھ انکو بہت زیادہ تعلق ہے،،

"سب سے پہلے مہابھارت اور رامائن کی رزمیہ نظمون نے بنگال کے مسلمان سلاطین کو اپنی طرف متوجہ کیا، جنکے اشارہ سے انکا بنگالی یعنی ملکی زبان مین ترجمہ ہوا، مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ، والیٔ بنگال (سنہ ۱۲۹۲ء - سنہ ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا، جو صوبہ کی دیسی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، اور جسکو شاعر اعظم وِدیا پتی نے اپنی نذر دیکر زندۂ جاوید بنادیا (اپنی ایک نظم مین) سلطان غیاث الدین کلبھی ذکر کیا ہی جس سے غالباً غیاث الدین ثانی والی بنگال (سنہ ۱۳۶۷ء سنہ ۱۳۷۳ء) مراد ہے،،

"..... یہ مشکوک ہی کہ بنگال کے کسی مسلمان بادشاہ، یا ہندو راجہ[1] کانس نرائن نے کرتی باس کو بنگالی مین رامائن ترجمہ کرنیکا حکم دیا، اگر پچھلی روایت صحیح ہے تو اسمین شک نہین کیا جاسکتا کہ مسلمانون ہی کے نظیرون نے اس کارنامہ کے انجام پر اسکو آمادہ کیا،،

"سلطان حسین شاہ، بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، مالادھر باسو کو اسی نے بھاگوت پوران کے بنگالی ترجمہ پر مقرر کیا، حسین شاہ کا ایک سپہ سالار پرگل خان نامی پرگل خان اور اسکے بیٹے نے اپنے نام کو اس بنا پر بقاے دوام بخشدیا ہی کہ انھون نے مہابھارت کا ٹکڑا بنگالی مین ترجمہ کرایا،،

پرگل خان روزانہ شام کو اپنے محل پر گلپور واقع فینی مین اپنے اہل دربار کو جمع

[1] معارف: مسلمانون کے عہد مین چند سال کیلئے یہ بنگال کا راجہ بن بیٹھا تھا، اسکا بیٹا تخت نشین ہوکر مسلمان ہوگیا تھا

کرتا تھا تاکہ مہابھارت کے بنگالی ترجمہ کو سترجم یعنی کوندر اپرمیشور کی زبان سے سین،

پرگل خان کے زیر اہتمام اس رزمیہ نظم کا ترجمہ "استری پرو" تک پورا ہوا، اسکے بعد چھوٹے خان

جو اسکا چاٹگام کی گورنری پر جانشین ہوا، اس نے سریکرن نانڈی شاعر کو مقرر کر کے

اس کام کو جاری رکھا، اور "آشمویدھ پرو" کا ترجمہ کرایا۔"

مسلمان امرار کے اشارہ سے بنگالی مین سنسکرت اور فارسی کتابون کے ترجمہ کرینکی

مثالین شاذ نہین ہین، انھون نے سنسکرت کے عشاق برہمن اور ہندو راجاؤن کے

اس مغرور جذبہ کو جس سے وہ بنگالی زبان کو دیکھتے تھے، بدل دیا، مسلمان امرا کی تقلید مین

بنگالی مصنفین کی ہمت افزائی، اور درباروں مین بنگالی شعرا کے رکھنے کا ہندو راجاؤن مین

عام رواج ہوگیا، اس زمانہ سے کتنے ممتاز بنگالی شعرا، اور مصنفین نے ہندو راجاؤن کے

دربارون کو آراستہ کر دیا، جسکے سبب سے بنگالی مقبولیت عام مین بلند سطح تک ترقی کر گئی، اور ان

زبانون کی جو اپنے پاؤن اس صوبہ مین گاڑ رہی تھین حریف بنگئی۔[۱]"

الغرض رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم بنگالی شرفار کا طغرائے امتیاز بن گئی

خصوصاً ان خاندانون کے لئے جنکو حکمرانون کی نیابت اور سرکاری عہدون پر سرافرازی کا

موروثی حق ہوگیا تھا، مہاراجہ سورج کنت اچارجی ٹاگی، مہاراجہ جتندر موہن ٹاگور، اور مہاراجہ

ناوا کرشنا کے خاندان بنگال مین عربی اور فارسی علوم و ادبیات کے مربی تھے، اور انکے

فرزند ان علوم مین عالمانہ مہارت رکھتے تھے، راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج، اور

راجہ کشب چندر سین جنھون نے آخر زمانہ مین بنگالی قوم مین مصلحین اعظم کا درجہ پایا ہے، علوم

اسلامیہ کے واقفین مین انکا شمار ہے، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی ندوہ کے اجلاس

---

[۱] صفحہ ۱۰۷-۱۱۱، پروموشن آف لرننگ ان انڈیا،

مدراس (۱۹۱۷ء) کی تقریر مین فرماتے ہین :-

"بنگال کے جدید دورِ ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھون سے رکہا گیا، یہ واقعہ ہے کہ اُنھون نے پٹنہ مین عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، گذشتہ موسم سرما مین کلکتہ کے ایک نامور بنگالی بابو نے مجھسے کہا کہ اُنکے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بکثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے، چنانچہ انکے چچا نے پندرہ برس مین علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی،

گریش چندر گھوش نے قرآن مجید، تذکرۃ الانبیا اور مشکوٰۃ کا بنگالی مین ترجمہ کیا، انہین اسباب کا اثر ہے کہ بنگالی زبان مین عربی اور فارسی کے الفاظ خصوصاً، آداب سلطنت اور کاروائی ہاے مقدمہ کے الفاظ بکثرت ہین، اور اب رفتہ رفتہ انکی جگہ انگریزی لے رہی ہے، تاہم بنگال کی ڈیڑھ دو سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی ان الفاظ کا اب تک بنگالی مین رواج پذیر رہنا، اسکے یہ معنی ہین کہ اس زبان مین اِن مفاہیم کے لئے سرے سے الفاظ ہی نہ تھے،

بنگال کے بعض ممتاز خاندانون کا سرنام اب تک فارسی ہے، مثلاً ملک، عہدہ دار، سرکار، موزمدار، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انکو اپنے حاکم وقت کی زبان سے کسدرجہ محبت تھی،

مہاراشٹر کی مرہٹی زبان جو کہنا چاہیئے کہ یہ ہندوستان کی اس قوم کی زبان ہے جسکا اگر بس چلتا تو مسلمانون کی ہستی کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ ڈالتی، تم اس سے قیاس کر سکتے ہو کہ مسلمانون کے علوم و فنون اور زبان سے اسکو کسدرجہ نفرت ہوگی، لیکن یہ معلوم کر کے تعجب کی انتہا نہ رہیگی کہ مرہٹی زبان کے بنانے مین مسلمانون کے زبان و قلم نے سب سے زیادہ کام کیا ہے، دیہقانی اور صحرائی مرہٹون کو طرز و آداب شاہی سیکھنے کے لئے اپنے انہین

دشمنون کا دست نگر ہونا پڑا، ابتدائً مرہٹی زبان ایک وسیع ملک کی جہانداری کی وقت نہین رکھتی تھی، اسلئے ناچار اہنین سلمانون اور برہمنون کا اسکو ممنون ہونا پڑا، جنھون نے فارسی زبان پڑہی اور سیکھی تھی، مرہٹہ راجاؤن کے فرامین آج بھی تم پڑہ لو تو آدہے سے زیادہ اسمین اصلی یا بگڑے ہوے فارسی وعربی الفاظ کی آمیزش پاؤگے، تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ مرہٹہ آج قدیم مرہٹی زبان کے لٹریچر کے سمجھنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے،

آداب وقواعد سلطنت، کاغذات سرکاری صنعت وحرفت، خانگی زندگی ہر ایک چیز مین اسکی زبان کا اصلی راس المال عربی وفارسی زبان کے الفاظ ہین، ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب ایم، اے پروفیسر الفنسٹن کالج بمبی جو مرہٹی کی زباندانا نہ لیاقت رکھتے ہین وہ مرہٹی زبان کی ایک ڈکشنری لکھنے والے تھے، جس سے بیک دفعہ یہ نظر آجاتا کہ عدالت، کتبخانہ، مدرسہ، بازار، کارخانہ، ہرجگہ مرہٹی کے آلات تخاطب عربی وفارسی الفاظ ہین، حلوائی کی دوکان سے بڑھئی اور لوہار کے مکان تک چلے جاؤ، آلات کے نام اور تہذیب وتمدن کے الفاظ کا ماخذ مسلمانون ہی کے زبان کو پاؤگے، تاریخ کے لئے لفظ مرہٹی مین نہ تہا، اب اسکو باکھر کہتے ہین، اس زبان کے محققین کا بیان ہے کہ یہ کھبر کی تحریف ہے "کھبر" سمجھے؟ خبر!

بیسیون ہندو خاندان وہان آباد ہین، جنکا سرمایۂ امتیاز یہ ہے کہ عہد قدیم مین اُنکا خاندان فارسی کا خدمتگذار رہتا، اور اب تک اُن کا خاندانی سرنام وہی فارسی زبان کا لفظ ہے شلاً "پھرنیس" یعنی فردنویس، "چٹ نیس" یعنی چھٹی نویس، "گلہ دار" یعنی قلعہ دار، "پوت دار" یعنی پوتھی دار، ایک قسم کے مرہٹہ سپاہی کا نام "سلہ دار" تہا، اسکی اصل سمجھے "سلحدار" انگائی تم جانتے ہو؟ تم جسکو تعادی بولتے ہو، آجکل دکن مین مرہٹون اور برہمنون کی زبانون حسب ذیل

عہدون کے نام عام طورسے جاری ہین،

مقدّم	چودہری،	فوجدار	سب انسپکٹر
معاملہ دار،	تحصیلدار	ناجر	ناظر
کارکن،	محرّر	سرستہ دار	سررشتہ دار
دیوان،	سکرٹری	. . .	. . .

ملک دکن اور مہاراشٹر کی تقریب سے ہم نے حیدرآباد کا ذکر نہین کیا، سبب یہ ہی کہ اس مجسمۂ عدل وانصاف ریاست نے اپنی ہندو رعایا کی تعلیمی وعلمی ترقی مین جوکارنامے انجام دیئے ہین وہ ایک مضمون کی ضمن مین نہین بلکہ ایک کتاب کے سیکڑون صفحات مین انکا تذکرہ ہونا چاہیئے، صرف ایک حیدرآباد کی اسلامی ریاست نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جوکچھ کیا اور کررہی ہے، تمام ہندوستان کی ہندو ریاستون نے ملکربھی اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ اتنا نہین کیا، اسوقت موضوع سخن صرف علمی اور تعلیمی حالات ہین، اسلیئے صرف اسی زاویہ نگاہ سے اگردیکھا جاے تومعلوم ہوگا کہ علاوہ عام تعلیم کے جسکی بدولت ریاست کے تمام دفاتر پرہندو اہل کار قابض رہے ہین، اعلےٰ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہرعصر مین یہان ہندو اہل قلم مصنفین اور شعرا موجود رہے ہین، اس بیان کی تصدیق کتبخانہ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کی دو جلدون مین ملیگی، منشی لچھمی نرائن شفیق مصنف بساط الغنائم وتاریخ دکن، لالہ گردہاری لال مصنف تاریخ دکن، راے منالال مصنف تاریخ دکن، لالہ لچھمی نرائن مصنف چمنستان شعرا، راجہ گردہاری پرشاد، باقی، صاحب دیوان ومثنوی، مہاراجہ چندو لال شاداں، صاحب کلیات، نندرام مصنف سیاق نامہ، جگناتھ نجومی مصنف تقویم التواریخ حکیم راے بچولال تمکین، صاحب دیوان ومصنف مجربات، رتن لال مصنف تخطیط البلاد

وغیرہ کے سیکڑون نام گنائے جا سکتے ہین، اور عجب ہنین کہ کوئی حیدرآبادی قلم ان سے بھی بہتر اشخاص کے نام پیش کر سکے،

بہار، اودہ، صوبہ آگرہ اور دلی کے متعلق بیخطر کہنا چاہیئے کہ یہان ہندوون کی تعلیم سلمانون کے برابر برابر تھی، ان ممالک کے بیشمار ہندو فضلا کے نام تذکرون مین محفوظ ہین۔ فقط ایک لکھنؤ مین ہندو شعرا کی تعداد سیکڑون سے متجاوز ہوئی ہو گی، لکھنؤ کے کشمیری ہندوؤن مین فارسی تعلیم کا رواج انتہائی عروج پر تھا لکھنؤ مین راجہ الفت رائے الفت، کالی پرشاد اخلاص، لالچند انس، راجہ گنگا پرشاد بدر، منشی خیالی رام خیالی، بجنا ورسنگھ راقم، بیکولال الفت، رام سہائے رونق، میڈولال زار، راجہ جیا لال گلشن، راجہ کالکا پرشاد موجد، منشی لما لک راجہ جوالا پرشاد وقار، دیگر اضلاع اودہ واله آباد مین ننن لال آفرین، الہ آبادی، رائے امر سنگھ خوشدل مانکپوری، گوکل چند ہندو فرخ آبادی، راجہ مدن سنگھ موزون اٹاوی، رائے گلاب رائے گلشن سندیلوی، سکھن لال موجد بدایونی لالہ بجناتھ مشتاق بریلوی، لالہ رام بخش مطیع قنوجی، لالہ بالمکند شہود مانکپوری، منشی الیشری داس آرام فرخ آبادی، اندرمن اورنگ آبادی (علی گڈھ) آگرہ مین چندر بہان برہمن، شیورام حیا رائے منوہر ولد رائے لون کرن عظیم آباد پٹنہ مین، لالہ اوجاگر الفت، راجہ پیارے لال الفتی، راجہ بہادر راجہ، راجہ رام نرائن موزون، بینی پرشاد دل وغیرہ فارسی زبان کے مشہور شاعر سخن فہم، انشاپرداز اور فاضل گذرے ہین،

الہ اباد کے مشہور ہندو لیڈر مالوی جی اگر اسکو یاد رکہین تو اچہا ہے کہ ممالک متحدہ کے ہندوون کا سب سے پہلا لیڈر جو اسی شہر الہ آباد مین آپکے ہم پیشہ تھے اور جنکی کوشش سے آپ "پالیٹکس" کے لفظ سے گوش آشنا ہوئے ہین وہ عربی اور فارسی علوم کے ایک بہت بڑے

ہمہ دان فاضل تھے، یعنی پنڈت اجودھیا ناتھ! وہ ایک طرف کانگریس کے پلیٹ فارم پر
لکچر دیتے تھے تو دوسری طرف اپنے گھر مین بیٹھکر متنبی اور عرفی کا درس دیتے تھے،

پنجاب بھی سلمانون کے تعلیمی اثر سے خالی نہین، مل سیالکوٹی، متخلص بہ وارستہ
جو فارسی کے مشہور لغت مصطلحات الشعرا کا مصنف ہی، واتق کھتری شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی،
منشی لچھمی نرائن دبیر گنجاوی لاہوری پنجاب کے نامور ہندو فضلا ہین، لچھمی نرائن کو معقولات
مین بھی بہت بڑی مہارت حاصل تھی، مصطلحات فارسی کی تحقیق مین وارستہ نے ۳۰ برس
ایران مین گذارے تھے،

دلی مین منشی مادھورام منشی، رائے منوہر لال منوہر، مرزا راجہ کدار ناتھ نسیم، مرزا کودرا
دیکھیگا! راجہ گوپال ناتھ غلام، پوران لال رنگین، بہادر سنگھ دلخوش، لالہ چنی داس ذرہ،
شیو سنگھ بیجان، لالہ نرائن داس بیخود، سکھراج سبقت، منشی گوہر لال تفتہ وغیرہ سیکڑون
فضلا، گذرے ہین [۱]،

دیہاتون مین تعلیم کا طریقہ وہی تہا جو مدت دراز سے ہندوستان مین جاری ہے،
گروجی دیہات کے زمیندار کے ہان نوکر ہوتے تھے، یا تمام گاؤن کی طرف سے انکو تنخواہ
ملتی تھی، لڑکے کسی کچے مکان کے برآمدہ مین یا سایہ دار درخت کے نیچے لیپی ہوئی زمین پر
بیٹھ جاتے تھے، ہاتھ مین لکڑی کا سیاہ رنگا ہوا تختہ ہوتا تہا، اسپر کھریا کی سفید روشنائی سے
لکھتے تھے، یا کھریا مٹی کے ڈھیلے سے زمین پر لکھتے تھے، ہندی لکھنا پڑھنا، اور پہاڑا اور
حساب انکو سکھایا جاتا تہا، یہ گویا پرائمری تعلیم تھی،
عام تعلیم تو یہین ختم ہو جاتی تھی، جو لڑکے آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ یا سنسکرت یا سکے بعد

---

[۱] یہ تمام نام مختلف فارسی تذکرون سے التقاط کئے گئے ہین،

سیکھتے تھے، اور پنڈت بنتے تھے، اور یا سرکاری زبان فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے، قصبون مین فارسی کے مکتب ہوتے تھے، ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میان جی" پڑہاتے تھے، فارسی کی ابتدائی تعلیم مین بول چال. خط وکتابت اور اخلاقی حکایات کی کتابین داخل ہوئی تہین، ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول اور یکجہتی کے ساتھ پڑہتے تھے، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، انشاے خلیفہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ کتابین داخل درس تہین، خوشخطی اور فارسی نویسی سکھائی جاتی تھی فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خطِ شکستہ کے پڑھنے کی عادت دلانیکے لئے پورانے لمبے خطوط کا ایک طومار "میان جی" اپنے پاس رکھتے تھے جسمین سو دو سو خط لمبے جُڑے ہوتے تھے، مکتب کے طالب العلم انکو پڑہتے تھے اسکو اسکول کی تعلیم سمجہنا چاہیئے،

اسکے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے تھے اور یا تکمیل کے لئے مشہور اساتذہ کی خدمت مین بڑے بڑے شہرون مین چلے جاتے تھے، انسے فارسی کی اعلے تعلیم، شاعری، علوم، اور کچھ عربی کی کتابین پڑہتے تھے، بعض بعض طلبہ تمام علوم مروجہ کی تکمیل کرتے تھے،

ابو الفضل نے آئین اکبری مین اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم بتایا ہے، اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبعیات، الٰہیات، اور تاریخ، ہندوؤن کو ان علوم کے علاوہ ویاکرن (سنسکرت صرف و نحو) ویدانت (ہندو تصوف و اخلاق)، پاتن جلی (ہندو فلسفہ) بھی پڑھنی پڑتی تھی، ابو الفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کی بدولت تمام سلطنت آراستہ و مرصع ہو گئی تھی، اسکو اس عہد کے کالج کی تعلیم سمجھنی چاہیئے،

سطور بالا مین تحصیل کمال اور طلب علم کے لئے جا بجا اساتذہ کی خدمت مین سفر کا جو

نقشہ ہین نے کہینچا ہی، فارسی تذکرون کے پڑہنے سے یہ خود بخود سمجھ مین آجاتا ہی، ذیل مین منشی لچھمی نرائن دبیر کے حالات تعلیم کی چند سطرین ایک فارسی تذکرہ سے نقل کرتے ہین،

"جد و پدرش در دہلی بوکالت امراے عالمگیری و محمد شاہی عز امتیاز داشت، و بیر در طفلی از مولوی شیخ محمد گرفت، در سن دوازدہ سالگی بشوق نظم و نثر در مجلس استفادہ سراج الدین علیخان آرزو جا گرفت، و براے تحصیل صرف و نحو نزد لالہ ٹیک چند بہار می رفت، بعدہ رشد، خدمت علماے اعلام را التزام نمود و مشغول اکتساب علم طب و دیگر علوم عقلیہ بود در ۱۲۰۵ھ مرد"

ہندو اور مسلمان طلبہ ان اساتذہ کی خدمت مین جس محبت و یکجہتی کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے تھے، اور "استاد بہائی" بنکر جو رشتہ اتحاد باہم قائم کر لیتے تھے، وہ آجکل کے شاندار ایوانون کے تاریخی زمانہ مین مفقود ہے، محمد حفیظ خان المتوفی ۱۱۹۴ھ ایک نامور استاد تھے، انکے شاگردان با اخلاص کے نام سنئے، میر ابو الحسن، منشی لچھمن سنگھ، میر کلن، قادر بخش، پنڈت لچھمی رام، محمد اسماعیل، لالہ سکھ رام، منشی کشن سنگھ، محمد تقی، منشی مجبوب راے، دیکہنا! "منشی مجبوب راے"، کتنا پیارا نام ہے، کیا یہ ہندو مسلمانون کے اتحاد باہمی کی عملی دلیل نہین ؟

لالہ چنی داس ذرہ دلی کے ایک مشہور معلم تھے، جنکے مکتب مین ہندو مسلمان لڑکے پڑہتے تھے ہندوستان کے خاتمۃ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی، منشی سوہن لال تھے، اور مولانا ے مرحوم کے تلامذہ مین بجے بہاری لال کایستھ تھے، مولانا کے ایک تلمیذ رشید گواہی دیتے ہین کہ مین نے خود دیکہا ہے کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ انکے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے[۱]"

---

[۱] خطبۂ صدارت ندوہ مدراس ۱۹۱۷ء از مولانا ے شروانی،

(۳)

تمدن ہند کا مصنف موسیو لیبان اپنی کتاب کے تیسرے باب مین ہندوؤن کے علوم و فنون پر حسب ذیل تنقید کرتا ہے :-

"ہم نے تمدن عرب مین جتنے باب علوم و فنون پر لکھے ہین، انکی توقع اس کتاب مین نہین ہوسکتی، چونکہ عربون نے یونان و روم کے قدیم علمی ذخیرہ کو خود بہت ترقی دی، اور اسکے بعد اسکو یورپ کے دارالعلومون تک پہنچایا، اسلئے ہمین انکے زمانہ حکومت کی علمی ترقیون مین ایک خاص دلچسپی تھی، اور اس وجہ سے ان ترقیون کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے علوم کی یہ حالت نہین ہی، برخلاف اسکے انکے علوم کے متعلق جو قدیم رائے تھی اسمین بہت کچھ ترمیم ہوگئی ہے اور ہمین معلوم ہوگیا ہے کہ انکے علمی خیالات ان اقوام سے لئے گئے ہین جنکے ساتھ انکو تعلق پیدا ہوا اور خود ہندوؤن نے اسمین کچھ اضافہ نہین کیا، پس کسی خاص زمانہ کے ہندی علوم کی تحقیقات کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ ہم ان اقوام کے علوم کی تحقیق کرین جنکا تعلق اسوقت ہند سے تھا اور یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہماری کتاب کے مقاصد سے خارج ہے، جو کچھ ہم ہندوؤن کے دماغی حالت کے متعلق لکھ چکے ہین، اس سے بآسانی سمجھ مین آئیگا کہ انھون نے کیون ان علوم مین جو انہین باہر سے حاصل ہوے کوئی ترقی نہین کی، ہندو دماغ جو فلسفہ مین نکتہ رس اور فنون مین

تیز فہم ہے اس خاصیت سے جسکا نام مادہ تحقیق ہی اور جسکے اوپر علوم کا دارومدار ہے بالکل عاری ہے ہمیشہ سے ہندوؤن مین اصلی علوم کی کمی رہی ہے، ان مین دوسرون کی تحقیقات کو حاصل کر لینے کا تو پورا مادہ ہی، لیکن اس درجے سے یہ کبھی آگے نہ بڑھ سکے، وہ دو قومین جن سے ہندوؤن نے اپنے علوم اخذ کئے، یونانی اور عرب معلوم ہوتے ہین، یہ نہین معلوم ہے کہ یونانی علوم ہند مین کیونکر پہنچے، لیکن شمال و غربی ہند کی عمارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تعلقات بیکٹیریا کے ساتھ مدت دراز تک قائم رہے، بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اسی ذریعہ سے یونانی علوم ہند مین آئے "وراہ مہر" جو نہایت قدیم ہندو مہندس ہے اور جو اجین مین چھٹی صدی عیسوی مین تھا، اپنی ہیئت کی کتاب مین یونانی اصطلاحین استعمال کرتا ہے، اور یونانیون کی طرف اشارہ کرتا ہے، عربون کا علم کس طرح ہند مین آیا اسکا سمجھنا زیادہ آسان ہے، سنہ مسیحی سے بہت پہلے عربون کے تجارتی تعلقات ہندوستان سے قائم تھے، اور عرب ہی مشرق اور مغرب کے باہم ملنے کے ذریعہ تھے، اسکے بعد جب مسلمانون نے تمام قدیم دنیا کو فتح کر لیا تو یہ تعلقات مثل سابق کے قائم رہے، اور ہمین عربی مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاے بغداد کے دربار مین متعدد ہندو علما موجود تھے، اس سے بھی مابعد زمانہ مین جب مسلمانون نے ہندوستان پر حکومت حاصل کی تو علماے اسلام علوم کو برابر ملک مین پھیلاتے رہے، مثلاً گیارہوین صدی عیسوی مین البیرونی نے جسکا زمانہ محمود غزنوی اول فاتح ہندوستان کا ہے، تمام ملک مین سفر کیا، اور علوم عربی کو جو اسوقت بہت وسیع ہو گئے تھے، کیونکہ ان مین نہ صرف قدیم دنیا کے علوم موجود تھے بلکہ خود عربون کی تحقیقات شامل ہو گئی تھی، ہندوستان مین پھیلایا، گیارہوین صدی عیسوی کے بعد سے کہنا چاہیئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، پس ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی ابتدا ریاضیات سے ہوئی اور پھر ساتوین صدی مین ابتدار پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بہٹ کی ریاضیات سے ہوئی اور پھر ساتوین صدی مین

برہم گپت نے اسپر اضافہ کیا، اس زمانے سے لیکر آج تک انہین مسائل سے بحث کرتے ہین جو ہندہین ان دو ذریعون سے آئے، اسوقت ہمارے پاس ہندو علوم کی مشہور تصانیف موجود ہین اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤن نے خود ان علوم مین زیادہ ترقی نہین کی، کسی زمانہ مین خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوؤن کا علم ہیئت بہت کچھ کامل ہے، اور قدیم ہے، لیکن اب یہ خیالات قائم نہین رہے، اور ان پر بحث کرنا بے فائدہ ہوگا، اگر ان تصانیف مین کوئی نیا مسئلہ بیان کیا گیا ہے تو محض اشارتًا اور بلا دلیل، مثلاً آریہ بھٹ چند سطرون مین زمین کی محوری حرکت روزانہ کا ذکر کرتا ہے لیکن کسی قسم کا ثبوت نہین دیتا، اسی طرح بارھوین صدی عیسوی مین بھاسکر چاریہ نے اس طریقہ حساب کی طرف جسکو کیل کولس کہتے ہین اشارہ کیا ہے، لیکن اس سے آگے نہ بڑھا،

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوون نے علوم مین کسی قسم کی جدت نہین پیدا کی، جب انکی ذاتی تحقیقات کچھ نہین ہین تو پھر انکے علوم سے بحث کرنا اور محض ایسے مسائل پر ذکر کرنا جو عربون اور یونانیون کی تحقیقات سے لیے گئے ہین محض لاحاصل ہے، اگرچہ ہندو علوم مین کم ہین لیکن عملی طور پر انھون نے بہت بڑی ترقی کی،،

عبارت بالا مین عربون سے مانسیو موصوف کی مراد "مسلمان" ہین، یہ غلط اصطلاح دوسرے یوروپین مصنفون کی زبان وقلم پر بھی چڑھی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ قدیم عرب تعلقات کا جو ذکر مصنف نے کیا ہے اس سے اسکا اشارہ اُس زمانۂ قبل اسلام کی طرف ہے جب مشرق ومغرب یا ہندوستان وچین اور روم و یونان کے درمیان عرب تاجر سفیر اور متوسط کی خدمت انجام دیتے تھے، یورپ کا مال وہی ہندوستان وچین لیجاتے تھے، اور وہی ہندوستان کی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھون مین دیتے تھے، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ قدیم ہندوستان، قدیم عرب کے تمدن سے کسیقدر متاثر ہوا ہو اس تاثر کے آثار وعلامات ہندوستان کے سنگی کتبات اور تحریری اوراق دونون مین ملتے ہین

ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اسوقت وہ خطوط اور کتبے (انسکرپشن) ہین جو مگدھ (بہار) کے
موریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۳ قم) کے مذہبی فرامین کی صورت مین ہندوستان کے پورے
طول وعرض مین پشاور سے گجرات ودکن تک پہاڑون پر اور لاٹون پر کندہ ملتے ہین، محققین فن خط
(کیرکٹر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے، لیکن
خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی،

تمام آرین تحریرین بائین سے داہنی طرف لکھی اور پڑہی جاتی ہین، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ
کتبے، سامی تحریرون کی طرح داہنے سے بائین طرف لکھے ہوئے ہین، اور اسی طرح سے پڑہے جاتے ہین
یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایۂ تحریری اپنے وجود وبقا مین عربون کا ممنون کرم ہے[۱]

ہمارے دعوی کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر وہ دستاویز ہے جو مہابہارت
کی عدالت عالیہ سے ہمکو مل سکی ہے، ستیارتھ پرکاش کے گیارہوین سمولاس مین سوامی دیانند لکھتے ہین کہ
مہابہارت مین جب کورون نے لاکھہ کا گھر بنا کر پانڈون کو اسکے اندر پھونک دینا چاہا تو بدرجی بدھشٹر کو
عربی زبان مین بتایا، اور بدھشٹر نے اسی عربی زبان مین انکو جواب دیا، سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے تو
ہمکو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملیچھون کی زبان کسی زمانہ مین اسقدر مقدس بھی تھی کہ دیوتاؤن کے بڑے بڑے
اوتار اسکو بولتے تھے، اور اسمین ایک دوسرے سے راز کی باتین کہتے تھے،

بہرحال یہ قصے تو تاریخ کی یاد سے پہلے کے ہین، خدا جانے انکی بدگمان دنیا ان کہانیون کو سچ بھی
مانیگی یا نہین، اسلئے ہمکو وہ داستان چھیڑنی چاہئے جو تاریخ کے ہوش کی باتین ہین، مسلمانون کے آفتاب
دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہوکر ملک مین جو روشنی پھیلائی ہم چاہتے ہین کہ تاریخ کے منشوری شیشہ کے
ذریعہ سے اسکی تحلیل کردین تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ واقعہ کیا ہے، مسلمانون نے ہندوستان آکر

---

[۱] تاریخ الادب جلد اصفحہ ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (ایجپشین یونیورسٹی) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۵ طبع ۱۱،
[۲] پہلا پرپ، ادھیاے ۱۴۷،

جن علوم کو پھیلایا اور جس تعلیم کو رائج کیا، ترتیب وار ہم اسکی تشریح کرنی چاہتے ہین، اسکی بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس عہد کے ہندو مصنفین کا جائزہ لیا جاے اور دکھایا جاے کہ مسلمانون کے عہد حکومت مین انکی کیا تعداد تھی، کیا حیثیت تھی، کیا نوعیت تھی، اور کسی پچھلے زمانہ کی تعلیمی حالت کی تشریح کیلیے اسکے سوا کوئی اور تدبیر نہین،

ہمکو اس سے انکار نہین کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین مصنفین موجود تھے اور انکی خاصی تعداد ہے، انکی ابتدا بودھ مت کے زمانہ عروج سے ہوتی ہے، قدیم ہندوستان مین کہین کہین جو مدارس قائم تھے جنکا ذکر چینی سیاحون نے کیا ہے وہ اسی مذہب کے درگاہ تھے، شنکر اچار نے بدھ اور جین مت کو مٹا کر جب ویدک دہرم کا دوبارہ پرچار کیا، اور سنسکرت زبان نے بدھ والون کی پالی کو ہٹا کر خود اسکی جگہ لینی شروع کی تو اس جوش و ہیجان نے طبیعتون کو تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا، اور سنسکرت زبان جو پہلے صرف دعاؤن بھجون اور منترون پر مشتمل تھی وہ علوم و فنون پر بھی حکمران ہوئی، تاہم مذہبی کتابون سے قطع نظر کر کے اسکا خالص سرمایۂ تحریری اتنا بھی نہین جو چند الماریون کی زینت ہو سکے، ہر علم پر میتھالوجی اور افسانون مین ملی جلی دو دو تین تین کتابین تھی، اس دعوی کی دلیل سنسکرت دان علماے اسلام[۱] اور مستشرقین یورپ[۲] کے بیانات ہین، اور سنسکرت کی سرزمین کی موجودہ پیمائش علمی ہے[۳]،

مسلمانون نے انکو بتایا کہ افسانہ اور کہانی سے الگ کر کے علوم و فنون پر خالص علمی کتابین بھی لکھی جاسکتی ہین، اکثر قدیم تصنیفات صرف برہمنون کی ملکیت تھی، وسعت تعلیم نے برہمنون سے نکلکر ہندوستان کے دوسرے طبقون کو بھی یہ علمی آزادی بخشی گئی، اولاً جیسا کہ ہر نئی چیز کا قاعدہ ہے مسلمانون کی زبان سیکھنا برہمنون نے ناجائز قرار دیا تھا، اشلوک بناے گئے کہ مسلمانون کی زبان سیکھنا، اور جینیون کے مندر مین جانا

---

[۱] بیرونی کی کتاب الہند اور ابوالفضل کی آئین اکبری کا دفتر سوم، [۲] تمدن ہند، انسائیکلوپیڈیا انڈیا، [۳] دکن کالج پونہ مین سنسکرت کی مطبوعہ اور قلمی کتابون کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، مذہبی کتابون اور مکرر نسخون کو ... کتابون کی تعداد ہے،

مست ہاتھی کے آگے پڑنے سے زیادہ خطرناک[1] ہے، تاہم جیسا کہ پہلے نمبر مین ہم نے بہ تفصیل بیان کیا ہی کہ رفتہ رفتہ یہ تعصب ہندوؤن سے کیونکر دور ہوا، اور سیکڑون برس کے بعد سکندر لودی کے زمانہ سے فارسی تعلیم نے ان مین عام اشاعت پائی،

اسلامی علوم مین سب سے پہلے تاریخ کا ذکر کرتے ہین:

تاریخ

تاریخ وہ فن ہی جسکی طرف قدیم ہندو دماغ نے کبھی توجہ ہی نہین کی، لیبان تو کہتا ہی کہ اسکے لئے ہندوؤن کا دماغ ناموزون معلوم ہوتا ہے[2]، آریہ ورت انسانیت کا ——— نہایت قدیم گہوارہ ہے اگر یہان انسانون کے پچھلے تاریخی کارنامون کو محفوظ رکھنے کی لیاقت ہوتی تو بہت سے قدیم عقدے آج ہمارے لئے پیچیدہ نہوتے، ہندوستان کی پرانی داستان سننے کے لئے ہمکو یونان اور چین کے سیاحوں کے پاس جانا پڑتا ہے، خود ہمارے گھر مین اپنی دنیا کی پہلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ نہین ہے ویدوں کے کہنہ اوراق، منو شاستر کے قانونی دفعات، مہابھارت کے رنگین صفحات، راماین کی پُردرد کہانیان، اور اپنشد کی پیاری پیاری باتین، ان مین سے کوئی چیز قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ہمکو پتہ نہین دیتی،

آغاز عالم سے زمانۂ اسلام تک ہندوستان مین جو سیاسی انقلابات ہوئے، ملک کے صوبہ صوبہ پر جو حکمران فرمانروائی کر رہے تھے، بڑے بڑے عالم، فاضل اور پنڈت پیدا ہوئے انکے تاریخی حالات کا آج پتہ لگانا چاہو، صحیح تاریخ ولادت، وفات اور سوانح حیات جاننا چاہو تو قیاس کے سوا کوئی روشنی تمہاری رہنمائی نہ کر سکیگی، پرانون سے صرف رشیون اور منیون کے کچھ کچھ حالات معلوم ہوتے ہین لیکن وہ تاریخ نہین،

لیکن اسی غیر تاریخی ملک مین جب مسلمانون کا قدم آتا ہے تو یہان کا آسمان و زمین بدلجاتی ہے،

---

[1] ستیارتھ پرکاش، سمولاس ۱۱، [2] تمدن ہند صفحہ ۳۳۹،

آریہ ورت کا ذرہ ذرہ چمک اٹھتا ہے، مسلمان سلاطین، امرا، علما، شعرا اور دوسرے اکابر رجال کو چھوڑکر مسلمان مورخون اور تذکرہ نویسون نے خود ہندو راجاؤن، پنڈتون، شاعرون اور امیرون کے حالات اسقدر لکھے ہین کہ یہ بآسانی دعوی کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانون کی آمد سے پہلے ہزار ہا سال جو ہندو قوم پر گذرے، اس زمانہ کے (میتھالوجیکل) تمام ہندو علما اور امرا کی فہرست جتنی طویل بنائی جاسکتی ہے، مسلمانون کی آمد کے بعد صرف آخری ۵۰۰ برس کے عرصہ مین اس سے دوچند بلکہ سہ چند بڑی فہرست مع احوال تاریخی پیش کیجا سکتی ہے، صرف تیموریون کے زمانہ مین جو ہندو امرا، اور علماء گذرے ہین انکے حالات و بیانات دو تین جلدون مین سما سکتے ہین، ہندو فارسی شعرار کے نام و سوانح با این ہمہ قومی بیگانگی ہمارے فارسی تذکرے جو خاص مسلمانون کے قلم سے نکلے ہین اسقدر سنا سکتے ہین کہ آپ سنتے سنتے گھبرا اٹھین گے،

آج یورپ کے دعوی آزادی و مساوات کے شور و ہنگامہ نے دنیا کو چھالیا ہے، ممالک مفتوحہ مین اشاعت تعلیم کی یہ کثرت انکا بیان ہی کہ صرف ہمارے دور حکومت کی خصوصیت ہے، ہم کہتے ہین بجا ہے، اور درست ہے، جاؤ اور انگریزی قلم کے تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، انکی انسائیکلوپیڈیا مین اُلٹ ڈالو انکی تاریخ اور تذکرون کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش، اور اس محنت کے بعد ہمکو بتاؤ کہ معزز انگریزی قلم کے آبحیات نے تمہارے کتنے علمار، فضلار، اور شعرار کے نام زندہ کیے ہین، اور کتنے اس قابل سمجھے گئے ہین کہ حکمران قوم اپنی شاہی زبان مین اور اس بریس کے عہد مین انکے تذکرے لکھے، پھر کیا ظالم، بت شکن، اور ملیچھ مسلمانون کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائیگی کہ انھون نے مسلمانون اور ہندوؤن دونون قوم کے فضلار کو ایک نظر سے دیکھا اور اس حکمران قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی دربارون مین دونون کو پہلو بہ پہلو جگہ دی، علاوہ ازین مسلمانون کے تاریخی ذوق نے ہندوؤن مین اس فن کی تعلیم و ترقی کا وہ جوش پیدا کیا کہ آج بھی اگر یورپ اور ہندوستان کے کتبخانون کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا گران قیمت سرمایہ فراہم ہوسکتا ہے،

لہ گذشتہ تاریخ سے بحث نہیں، بلکہ زمانۂ رواں کا سوال ہے۔

ہمارے سامنے تو اسوقت یورپ اور ہندوستان کے مادی کتبخانے نہین، صرف حیدرآباد، بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اور لندن کے کتبخانون کی فہرستون کے معلومات ہین، تاہم انھون نے ہندو زبان کے فارسی مصنفین کے (جو عہد اسلامی کے علمی و تعلیمی کوششون کے نتائج علمی ہین) حالات بہم پہنچائے ہین وہ کسقدر حیرت افزا ہین، سب سے پہلے ہمکو اس عہد کے ہندو مورخین کا تذکرہ کرنا ہے،

راج ترنگنی پیش نظر مواد جہانتک ہماری اعانت کرتے ہین، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخ جو کسی ہندی قلم نے لکھی وہ کشمیر کی تاریخ **راج ترنگنی** ہے، یہ کتاب ہندی ہین سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ مین لکھی گئی تھی،[1] (سلطان سنہ ۸۲۶ھ مین تخت نشین ہوا تھا) مصنف کا نام کلہانا ہے، **اکبر** جب کشمیر گیا ہے تو یہ کتاب اسکے دربار مین پیش کیگئی، اور اسکے حکم سے اسکا فارسی مین ترجمہ ہوا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اسمین کشمیر کے متعلق پانچ ہزار برس کا حال لکھا ہے، والیان کشمیر کے درباروں مین تاریخ نویسی کا خاص عہدہ تھا اور یہ کتاب اسی کوشش کا ثمرۂ نورس تھی،[2]

اصل متن کتاب فرانس اور ہندوستان مین چھپ گئی ہے[3] اور فارسی نسخہ بھی مطبوع ہے،

لال جی داس بابا لال گرو، شاہجہان کے زمانہ مین ایک عارف جوگی تھے شہزادۂ داراشکوہ انہین کا مرید تھا، لال جی داس، بابا لال گرو کا چیلا تھا، بابا کا سنہ پیدائش سنہ ۱۰۱۴ھ ہے، سنہ ۱۰۵۹ھ تک وہ زندہ تھے، لال جی داس نے سنہ ۱۱۵۸ مین گرو کے حالات و ملفوظات کو فارسی مین جمع کیا، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری مین اسکا ایک نسخہ سنہ ۱۴ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا موجود ہے،

بنوالی داس ولی شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی تھا، بعضون نے اسکا نام بھوانی داس لکھا ہے، کتبخانہ آصفیہ کے فہرست نویس نے ولی رام گوسائین (داراشکوہی) نام بتایا ہے، بنوالی اور بھوانی تو کتابت کی تصحیف ہے، ولی اسکا تخلص نام مین داخل ہوگیا ہے، اس نے شاہان دہلی کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا نام راجاولی ہے،

---

[1] تاریخ فرشتہ، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۳۴۴، [2] آئین اکبری، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۱۸۱، [3] دکن کالج لائبریری کیٹلاگ، صفحہ ۱۹۹،

کتاب مستند ہے، اور بہت سی معتبر کتابون مین اسکے حوالے ہین، اسکے قلمی نسخے اکثر کتبخانون مین موجود ہین،

رائے بندرابن رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے ۲۰ سنہ جلوس شاہجہانی مین حسن خدمات کے صلہ مین رائے کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا تھا، اسکے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت کیا اور رائے کا خطاب بخشا، بندرابن نے لُبّ التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسرداس قوم ناگر، پٹن کا باشندہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ بچپن سے ۳۰ سال کی عمر تک وہ قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب المتوفی ۱۰۹۶ سنہ ھ کی خدمت مین حاضر ہوکر تحصیل علم کرتا رہا ہے، امراء اور اعیان دولت جو قاضی صاحب کی خدمت مین آیا کرتے تھے انکے مباحثات اور گفتگوؤن کو بغور سُنتا تھا، اور انسے فوائد حاصل کرتا تھا، تکمیل علم کے بعد ایسرداس، شجاعت خان حاکم گجرات کی وساطت سے جودھپور کا امین مقرر ہوا، وہ ہاتھ جو ۳۰ برس تک صرف قلم سے مانوس رہا تھا، تلوار کے قبضہ پر بھی مضبوط تھا، اس نے میدان جنگ مین کامیابی حاصل کی، بادشاہ کی طرف سے میرٹھ مین اسکو جاگیر عنایت ہوئی، اور دولت دہم صدی افسر مقرر رہا، عہد عالمگیری کے ان لالان مین ہمارا فوجی افسر وہی ۳۰ سال کا نوجوان طالب العلم نظر آتا ہے اور فتوحات عالمگیری نام ایک بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑتا ہے

بھیم سین کایستھ رگھونندن داس اسکے باپ کا نام تھا، ۲۳ سنہ جلوس شاہجہانی (۱۰۵۹ سنہ ھ) برہانپور دکن مین پیدا ہوا تھا، اسکا ایک عزیز بھگنداس عالمگیر کے دربار مین دیوان تھا، اور دیانت رائے کے خطاب سے ممتاز تھا، بھیم سین نے بندیلہ کے حاکم راؤ دلپت کی سرکار مین نوکری کی، راؤ دلپت دکن کی لڑائیون مین نہایت کارآمد سردار ثابت ہوا تھا، عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنا دیا،

بھیم سین گو کایستھ تھا لیکن قلعہ نالدرگ کی قلعہ داری اُس نے نہایت خوبی سے کی، ۱۱۲۰ سنہ ھ مین نوکری سے مستعفی ہوکر اپنے وطن مین گوشہ نشین ہوگیا، اور اب موقع آیا کہ تلوار کی بجائے قلم کا حق ادا کرے، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ لکھی جو اب تک موجود ہے،

نرائن کول عاجز باشندۂ کشمیر اپنی تصنیف کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ ایک مدت سے شرفائے کشمیر کا تقاضا تھا کہ

انکے وطن کی ایک تاریخ لکھدون، بالآخر بزرگان وطن کے اصرار سے مجبور ہوکر مین نے یہ بار امانت اٹھالیا اسی
زمانہ مین عارف خان کشمیر کے دیوان اور نائب صوبہ دار کے حکم سے ملک حیدر نے سنسکرت سے کچھ مواد فراہم کیا تھا
وہ میرے حوالہ کیا گیا، مین نے اسکو دیکھا تو قابل اصلاح نظر آیا، بالآخر اصل سنسکرت سے مقابلہ کرکے اسکو بھی اپنی
کتاب مین شامل کرلیا، سنہ ۱۱۳۲ھ مین تاریخ کشمیر تکمیل کو پہنچی،

منشی ہیرامن گردہر داس معتمد خان کے منشی تھے، معتمد خان نے بھائیون کی لڑائی مین عالمگیر کا ساتھ دیا تھا اس
دامان کے بعد سنہ ۱۰۷۱ھ مین وہ گوالیار کا حاکم مقرر ہوا، منشی ہیرامن نے اس تقریب سے اسی زمانہ مین گوالیار نامہ
کتاب لکھی، جسمین راجہ بکرماجیت کے ۳۳۲ برس بعد سے لیکر معتمد خان کی حکومت کی زمانہ تک گوالیار کی تاریخ
مرتب کی،

جسونت رائے ولد بھگونت رائے، ولد سندر داس منشی لاہوری فارسی زبان کا فاضل اور شاعر تھا پہلے بیدل خان کے
یہان نوکر تھا، سنہ ۱۱۱۹ھ مین کرناٹک گیا اور نواب سعادت اللہ خان کے دربار مین رسائی پیدا کی اور ایک
مدحیہ قصیدہ پیش کیا، نواب نے قدردانی کی اور جسونت رائے نے وہین سکونت اختیار کرلی، اور سعید نامہ کے
نام سے نواب سعادت اللہ خان اور اُنکے خاندان کی تاریخ لکھی،

منشی ٹھاکر لال ولد بھوج داس کایستھ، ماتر ضلع برہان پور کا رہنے والا تھا، سنہ ۱۱۳۹ھ مین اس نے ایک کتاب
لکھی جسکا نام "دستور العمل شاہنشاہی" رکھا، اسمین اس نے ہندوستان اور دکن کے واقعات بطور فہرست
ترتیب دیئے ہین،

منشی سوجان رائے کھتری یہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ مین تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت ضخیم اور
مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی، اور اس کوشش اور محنت سے
لکھی کہ وہ مستند کتابون کی فہرست مین داخل ہے، منشی موصوف اپنے کو پٹیالہ کا رہنے والا بتاتا ہے، اس
کتاب کا قلمی نسخہ حیدرآباد اور لندن کے کتبخانہ مشرقی مین موجود ہے، سنہ ۱۱۰۷ھ مین وفات پائی،

بندرابن داس | بندرابن داس بہادر شاہی، بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین مین تھا، سنہ ۳۸ جلوس عالمگیری مطابق سنہ ۱۱۰۵ھ مین اس نے **خلاصۃ التواریخ** نام کتاب لکھی، اسمین ہندوستان کی تاریخ آریون کے قدیم زمانہ سے لیکر عہد عالمگیری تک ترتیب دی ہے، عربی آمیز فارسی عبارت اس خوبی سے لکھی ہی کہ ایرانی قلم کا اسپر دہوکا ہوتا ہے، مقدمہ مین اپنے ماخذ گنائے ہین، واقعات کا نہایت استقصا کیا ہے، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ سنہ ۱۲۳۹ھ کا لکھا ہوا **دیسنہ** (بہار) کی **الاصلاح لائبریری** مین موجود ہے،

جگجیون داس | ولد منہر داس، باشندۂ گجرات، محمد معظم شاہ کی سرکار مین ڈاک کا مہتمم تھا، چونکہ خفیہ سرکاری کاغذات اسکی نظر سے گذرتے تھے اسلئے اسکو واقعات کے جمع کرنیکا شوق پیدا ہوا، سنہ ۱۱۱۹ھ مین بہادر شاہ اول نے لاہور کے دربار مین باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر اسکو مامور کیا، سنہ ۱۱۲۰ھ مین اس نے اپنی محنتون کا ثمرہ **منتخب التواریخ** کے نام سے لکھکر پیش کیا اسکے صلہ مین دربار شاہی سے خطاب و خلعت و انعام حاصل ہوا،

کامراج | ولد نین سنگھ، بھپھوند ضلع اٹاوہ اسکا وطن تھا، شہزادہ محمد اعظم کی سرکار مین مالوہ مین اسکو حاضری کا موقع ملا، **اعظم الحرب** کے نام سے اس نے شہزادہ کی لڑائیون کے حالات لکھے، کامراج دیباچہ مین لکھتا ہے کہ بہت سے واقعات خود شاہی وقائع نگار نے اسکے لئے بہم پہنچائے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدتمندی کے ساتھ اپنے کو تیموری دربار کا تین پشت سے نمکخوار بتاتا ہے،

کشن چند اخلاص کھتری | شاہجہان آبادی، شاگرد مرزا عبدالغنی قبول کشمیری، اسکا باپ اچل داس فارسی کا شاعر تھا، کشن چند نے **ہمیشہ بہار** کے نام سے سنہ ۱۱۳۶ھ مین تذکرۂ شعراء لکھا، اسمین اکبر سے لیکر محمد شاہ کے عہد تک کے فارسی شعراء کے حالات و سوانح ہین یہ تذکرہ اسقدر مستند ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ کی تالیف مین اسکو اپنا ماخذ قرار دیتے ہین اور علانیہ اس سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہین، اس کتاب کے نسخے بانکی پور اور حیدرآباد کے کتبخانون مین ہین،

لال رام | باپ کا نام دولہ رام اور دادا کا نام رائے گنجن، رائے گنجن عالمگیر کے عہد حکومت مین کسی عہدہ پر ممتاز اور رائے کے خطاب سے مشرف تھا، دولہ رام بھی رائے کے خطاب سے مخاطب اور عہدہ داران شاہی مین داخل تھا، خود لال رام محمد شاہ کی سرکار مین نوکر تھا، ۱۱۴۹ھ مین تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر دربار شاہی مین تحفہ پیش کی،

خوشحال چند | کسی زمانہ مین شاہ عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، ۱۱۶۴ھ اسکی تاریخ وفات ہے، اسکی وفات کے بعد اسکی جگہ اسکے بیٹے کو ملی، تاریخ نادر الزمانی خوشحال چند کی بہترین تصنیف ہے،

ہیرا لال خوشدل | یہ غالباً دکن کا باشندہ ہوگا، قطب شاہیہ دکن کی اس نے منظوم تاریخ لکھی ہے، زمانۂ وجود معلوم نہین، دسوین صدی ہجری کے آخر مین یا گیارہوین صدی کے اول مین اسکو ہونا چاہیئے، قطب شاہیہ کا زمانۂ حکومت بھی ہے، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ہے،

مہاراجہ کلیان سنگھ | کلیان سنگھ کا دادا رائے ہمت سنگھ دہلی کا ایک کایستھ، امیر الامراء صمصام الدولہ کی سرکار مین دیوان تھا، اسکے بیٹے شتاب رائے نے بڑا عروج حاصل کیا، دربار شاہی سے ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے نام سے مخاطب تھا، اور سلطنت کی طرف سے صوبہ بہار کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، خود بھی فاضل تھا اور فضلاء وقت کا قدردان بھی تھا، ۱۱۸۵ھ مین اس نے وفات پائی، اسکا بیٹا انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ کے نام سے صوبہ کی نظامت (گورنری) پر مامور ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا، خلاصۃ التواریخ اسکی تصنیف ہے، جسمین امیر تیمور سے لیکر اپنے زمانہ تک کے حالات اس نے لکھے ہین، اسکی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے جو نظامت بنگالہ کی تاریخ ہے،

شیو داس لکھنوی | شیو داس نے شاہنامۂ منور کلام کے نام سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ) اور محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے زمانہ تک کے حالات لکھے ہین، دربار شاہی مین بہت دنون تک یہ منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر ممتاز رہا،

روپ نرائن | ولد ہری رام کھتری، متوطن سیالکوٹ، اس نے ۱۱۲۹ھ مین ہندوؤن کے مقدس مقامات کے

حالات وکیفیات لکھے، کتاب کا اصلی نام "بنج مہاتم" اور تاریخی نام مخزن العرفان ہے،

رائے چترمن | قوم کایستھ سکسینہ، اس نے وزیر الممالک غازی الدین خان کی فرمائش سے ہندوستان کی تاریخ لکھی، اور اسکا نام چار گلشن رکھا، یہ کتاب چار گلشنون پر منقسم ہے، گلشن اول بادشاہان ہند کے حال مین، گلشن دوم صوبون کے حال مین، گلشن سوم دہلی سے چارون طرف بڑے بڑے شہرون تک جو سڑکین گئی ہین، انکی پیمائش اور ایک ایک منزل کا حال، (یہ باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے) گلشن چہارم مین ہندو فقیرون اور جوگیون کے حالات اور سلسلے، ۱۱۶۳ھ مین یہ کتاب اتمام کو پہنچی،

درگا داس | باپ کا نام شیو شنکر داس، سفینۂ عشرت ایک فارسی تذکرہ کا مصنف ہے، ۱۱۷۰ھ مین تذکرہ تالیف پایا، عجب نہین کہ یہ حزین کا شاگرد ہو،

انند روپ | ضلع نارنول (مدراس) کا ایک برہمن تھا، کھاوجی بھونسلا کے دربار مین کچھ دنون نوکر رہا تھا، نصیر الملک نصیر جنگ کے معاملہ مین ناگپور سے الہ آباد آیا، یہان اس نے ۱۱۹۲ھ مین میزان دانش لکھی جو "جگ" کے اعتبار سے چار حصون مین منقسم ہے،

بنالال | ولد بہادر سنگھ، اس نے شاہ عالم کے دور حکومت کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا آغاز ۱۱۹۴ھ سے ہوتا ہے، جب شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رخ کیا ہے،

رائے کیول رام | ولد رگھناتھ داس اگروال، اطراف دلی مین قصبہ کسنا اسکا وطن تھا، ۱۱۹۴ھ مین اس نے تذکرۃ الامرا نام ایک کتاب لکھی، دیباچہ مین بیان کیا ہی کہ یہ کتاب شاہی روزنامچون اور تاریخ نامون سے مرتب کیگئی ہے،

دلپت رائے | مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ، اسکا مولد احمد آباد گجرات ہے، اسکا باپ گلاب رائے یہان متصدی تھا، دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا زبانون مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، ۲۵ برس کی عمر مین جے نگر (جی پور) آیا اور مہاراجہ مادہو سنگھ کے حکم سے ملاحت مقال لکھنی شروع کی، اور ۱۱۸۱ھ مین مہاراجہ کے مرنے کے بعد اسکو تمام کیا،

۴

گذشتہ اوراق مین ان ۲۷ ہندو فضلاء کے نام گناے گئے ہین جو تاریخ کے فن مین ممتاز ہوے ہین، باوجود اسکے کہ تمام معلومات سامنے نہ تھے، یہ داستان اتنی پھیلی کہ عدد سابق مین پوری نہو سکی، جہان سے یہ کہانی چھوٹی تھی وہین سے اب پھر شروع ہوتی ہے،

بندرابن خوشگو قوم دیش، باشندۂ متھرا، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذۂ فن کا شرف تلمذ حاصل تھا، سراج الدین علیخان آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد افضل سرخوش اور شیخ سعداللہ گلشن کی صحبتین اٹھائی تھین، نظم ونثر دونون مین کمال حاصل تھا، سفینۂ خوشگو اور تذکرة المعاصرین، دو تذکرے لکھکر نواب عمدة الملک امیر خان کی سرکار مین پیش کئے، نواب نے قدردانی کی اور دو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا، نواب کی وفات کے بعد ترک دنیا کر کے عظیم آباد پٹنہ مین اقامت اختیار کی، سنہ ۱۱۷۰ھ مین وفات پائی، کتبخانہ بانکی پور مین اس تذکرہ کا جو نسخہ ہے وہ علامہ آزاد بلگرامی کا مملوکہ ہے، اور انہین کی فرمائش سے سنہ ۱۱۸۳ھ مین نقل کیا گیا ہے، گل رعنا کے مولف نے اس تذکرہ سے فائدہ اٹھایا ہے،

پنڈت کرشنانند پنڈت انند گھن کا بیٹا تھا، اس نے تاریخ شاہان ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی، اسکا تعین زمانہ نہین معلوم، لیکن سنہ ۱۸۰۳ء یعنی تقریباً سنہ ۱۱۷۳ھ مین موجود تھا،

بدھ سنگھ قوم کھتری، اس نے سکھ فرقہ کی تاریخ سنہ ۱۱۷۰ھ سے اپنے زمانہ تک لکھی ہی، اسکو اس کتاب کی تالیف مین لالہ عجائب سنگھ سے بہت مدد ملی، کتاب کا نام رسالہ نانک شاہ ہے، سنہ تالیف معلوم نہین،

رگھوناتھ | غالبًا مرہٹہ ہے اس نے سنہ ۱۷۷۴ء مین حالات مرہٹہ کے نام سے انکی تاریخ لکھی،

شیو پرشاد | نواب فیض اللہ خان روہیلہ کی سرکار مین نوکر تھا، سنہ ۱۱۹۰ھ مین اس نے تاریخ فیض بخش کے نام سے روہیلہ پٹھانون کی تاریخ لکھی،

مکند رائے | اس نے راجہ ہولکر کے سیاسی خطوط کا فارسی مین ترجمہ کیا، ایک نسخہ کتبخانہ آصفیہ مین ہے، خط ہولکر نام ہے، سنہ ۱۱۹۰ھ سنہ تالیف ہے،

موہن لعل انیس | ولد رائے تولارام قانونگو، قوم کایستھ، باشندۂ لکھنؤ، فارسی شاعری مین مرزا فاخر مکین کا شاگرد تھا، انیس الاخبار کے نام سے سنہ ۱۱۹۳ھ مین اس نے مرزا مکین اور انکے تلامذہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا، اس تذکرہ مین مرزا مکین کے چھ ہندو شاگردون کے بھی حالات ہین۔

ہرنام سنگھ | ولد کوردا سنگھ، ملانوہ نواح لکھنؤ کا باشندہ سرسوتی برہمن تھا، بچپن سے عین الدین خان حاکم بریلی کے زیر سایہ رہا، تاریخ سعادت جاوید اسکی بہترین یادگار ہے، (عین الدین خان کا زمانۂ حکومت بریلی سنہ ۱۱۹۵ھ سے سنہ ۱۱۹۹ھ تک ہے،

رنچھور جی | ولد امرجی دیوان، رنچھور جی نے سنہ ۱۸۲۳ء مطابق سنہ ۱۱۹۶ھ مین تاریخ سورت لکھی، اسمین جوناگڑھ اور ناگر قوم کے حالات درج کیے ہین،

لچھمی نراین شفیق | لاہور وطن تھا، اسکا دادا عالمگیر کے ساتھ مہم دکن مین گیا، اور اورنگ آباد دکن مین سکونت اختیار کرلی، اسکا باپ رائے منسارام نواب آصفجاہ کا دیوان تھا، لچھمی نراین شفیق ان ہندو فضلا مین سے ہے جنکی قابلیت اور علم پر زمانہ فخر کرسکتا ہے، علامہ آزاد بلگرامی کا شاگرد اور عالیجاہ بہادر کے سلک ملازمین مین داخل تھا، تاریخ کا ذوق استاد آزاد سے وراثت مین پایا تھا، چنانچہ اس فن مین اسکی متعدد تالیفات ہین، گل رعنا اور شام غریبان دو شعرا کے تذکرے ہین، سنہ ۱۲۰۱ھ مین حقیقتہاے ہندوستان لکھی، خلاصۃ الہند بھی اسی کی تصنیف ہے، تواریخ آصفی اسکی پانچین تالیف ہے، لیکن سب سے بہتر اور عمدہ تر تصنیف بساط الغنائم ہے

جسمین اس نے مرہٹون کی تاریخ قلمبند کی ہے،

ہرسکھ رائے | جیون داس کا بیٹا، اور بسنت رائے کا پوتا، قوم کھتری، وطن لاہور، اس نے اپنے ماموں سری نارائن کے مشورہ سے ۱۲۱۴ھ مین مجمع الاخبار لکھنی شروع کی، اور ۱۲۲۰ھ مین اسکو اختتام کو پہنچایا، اس سے چند سال پیشتر ۱۲۱۱ھ مین زبدۃ القوانین نام ایک نہایت کارآمد اور پر معلومات کتاب لکھ چکا تھا اسکا ذکر آگے آئیگا

منشی منا لال | ولد منشی بہادر سنگھ، دفتر خالصہ شاہی کے منشی تھے، شاہ عالم کے روزنامچہ لکھنے پر مامور تھے، یہ روزنامچۂ شاہی، کتبخانہ بانکی پور مین موجود ہے، اس سے منشی موصوف کی لیاقت تحریر اور قوت مشاہدہ ثابت ہوتی ہے روزنامچہ کا آخری ورق شاہ عالم کے صحیفۂ حیات کے اختتام پر (۱۲۲۱ھ) تمام ہوا ہے،

رائے امر سنگھ خوشدل | ولد جیون رام کایستھ، اصلی وطن کڑہ مانکپور رہتا، نواب شجاع الدولہ کے عہد مین سرکار غازیپور کا ناظم (حاکم اعلی) تھا، امر سنگھ نہایت لائق اور فاضل تھا، تعلیم سے فارغ ہوکر مہاراجہ اجیت سنگھ راجۂ بنارس کی سرکار مین نوکر ہوا، اور آخر سرکار کمپنی کی طرف سے علی گڈھ کا ناظم مقرر ہوا، اس نے تاریخ فرمانروایان ہنود لکھی ہے جو آغاز سے لیکر سلطان علاؤالدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوئی ہے، اسکی دوسری تاریخی تصنیف بزم خیال ہے جسمین خاص مشاہدات اور احوال موجودہ کی بنا پر اپنے ملک کے حالات لکھے ہین، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ۱۲۱۰ھ تک ساتھ ساتھ انگریزون کے حالات بھی لکھتا گیا ہے، ۱۲۲۵ھ مین وفات پائی،

دولت رائے | منشی دولت رائے کایستھ، بہادل خان المتوفی ۱۲۲۴ھ بانی ریاست بہاولپور کے مصاحب خاص تھے بہاولپور کا خاندان عباسی ہے، اس مناسبت سے مرآۃ دولت عباسیہ کے نام سے بہاولپور کی تاریخ لکھی، ۱۸۵۱ء مین یہ کتاب چھاپی گئی تھی،

رائے بھگوان داس | کایستھ، تخلص بہ ہندی، ولد دلپت داس، ساکن کالپی، تعلیم و تربیت لکھنؤ مین ہوئی، مولوی سید یوسف سہارنپوری سے تحصیل علم کی، نواب آصف الدولہ کی سرکار مین معزز عہدہ پر ممتاز ہوے، پھر معتمد الدولہ مہاراجہ تکیت رائے نائب دیوانِ شاہ اودھ کی مصاحبون مین داخل ہو گئے، دو تذکرے انکی علمی زندگی کی یادگار ہین

حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی، حدیقہ مین گذشتہ شعرا، اور سفینہ مین معاصرین کے حالات ہین، اسکی تالیف کا زمانہ سنہ ۱۲۱۹ھ ہے،

سوہن سنگھ | سوہن رائے ہلکر کی سرکار مین ملازم تھا، عربی وفارسی علوم مین بہرۂ وافر رکھتا تھا، آقا کی فرمائش سے وقایع ہلکر کے نام سے ملہر راو ہلکر (ریاست اندور) کے حالات لکھے، سنہ ۱۲۲۲ھ مین یہ کتاب ختم ہوئی،

منشی چھتر مل | ولد رائے پران چند، اسکی سب سے نادر تصنیف تو دیوان پسند ہے، جسمین مالیات ہند پر اس نے بحث کی ہے لیکن اسکی تاریخی تصنیف عمارات الاکبر ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر آباد کی عمارتون کا حال ہوگا، اسکی پہلی تصنیف سنہ ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس سے زمانہ معلوم ہو سکتا ہے،

بساون لال شادان | بلگرام کا باشندہ، امیر الدولہ محمد امیر خان کے دربار مین نائب میر منشی تھا، اور اسی کے حکم سے سنہ ۱۲۴۰ھ مین امیر نامہ لکھی، یہ درحقیقت امیر خان کی سوانح عمری ہے:

سندر لال کول | ولد نوبت رائے، متھرا کا باشندہ دفتر خالصہ مین میر منشی تھا، سنہ ۱۲۱۴ھ مین اس نے گلِ بیخزان لکھی جو چار ابواب پر منقسم ہے، تین پہلے ابواب مین دہلی، متھرا اور بندرابن کے حالات ہین، اور چوتھے مین افسانہ ہے،

منشی سدا سکھ لال | تخلص بہ نیاز، نجف خان کے زمانہ مین یہ آگرہ کے سررشتہ دار تھے، سنہ ۱۲۳۲ھ مین ۶۵ برس کی عمر مین دلی چھوڑ کر الٰہ آباد آگئے تھے، مرزا قتیل، میر تقی وخواجہ میر درد وغیرہ کے معاصرین مین تھے، الٰہ آباد مین منتخب التواریخ نام ایک کتاب لکھی، سر ہنری الیٹ اپنی تاریخ مین اسکا حوالہ دیتا ہے،

بہادر سنگھ | ہزاری مل کا بیٹا اور لچھمی چند کا پوتا تھا، اصل وطن گو شاہجہان آباد تھا، لیکن الٰہ آباد مین سکونت اختیار کر لی تھی، یہان عربی فارسی اور ہندی کی تاریخی کتابون سے مواد فراہم کرکے یادگارِ بہادری کے نام سے تمام دنیا کی تاریخ لکھی، اسکا سال اختتام سنہ ۱۲۴۹ھ ہے،

رتن سنگھ | منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنؤ، قوم کا یستھ، اسکا خاندان تین پشت سے دربار اودھ مین معزز عہدون پر ممتاز رہا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا، اسکے اصلی

کمالات فلسفہ کے زیر عنوان ظاہر ہونگے، اسکا دادا راجہ بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی مین اتالیق تعلیم اور عہد حکومت مین دیوان تھا، رتن سنگھ نے منجملہ اور تصنیفات کے **سلطان التواریخ** نام کتاب شاہان اودھ کی تاریخ مین لکھی، ۱۲۵۹ھ مین ساٹھ برس کی عمر مین یہ کتاب اس نے ختم کی،

رام سیتا سنگھ | متخلص بہ فکرت، اس نے منشی ستیل سنگھ بیخود کے حالات مین حقیقتہاے بیخود کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۲۹۸ھ مین چھپکر شایع ہوئی،

پنڈت بشن نراین | مولف **نظارۃ السند** فی تاریخ مین ہے، زمانہ نہین معلوم، لیکن ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکا جو نسخہ ہے وہ ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے،

لالہ سیتل چند | آگرہ مین رہتے تھے، غدر سے بہت پہلے مدرسۂ آگرہ مین مدرس تھے، انھون نے **تعریف العمارات** کے نام سے نہایت محنت اکاوش اور تحقیق سے اکبرآباد آگرہ کی ایک ایک عمارت کا حال لکھا، اور اسکے نقشے شامل کیے، یہ کتاب نہایت مفید اور پرازمعلومات ہے، لالہ صاحب غدر سے بہت پہلے مدرسۂ آگرہ مین مدرس تھے،

منشی مہتاب سنگھ | قوم کایستھ، متوطن کانپور، مولف **تاریخ ہزارہ**، اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مین ہے،

گردہاری لال | مولف **تاریخ ظفر دکن**، اسکا قلمی نسخہ کتبخانہ آصفیہ مین ہی، حال و سنہ نہین معلوم فلسفی کے لقب سے مشہور تھے

راجہ کندن لال | اپنے زمانہ کے مشہور فاضل تھے، فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، دہلی وطن تھا، ۱۲۳۰ھ مین قرطاس لکھی، انکی ایک تاریخی تصنیف **تنقیح الاخبار** ہے، جسمین زیادہ تر خود اپنے حالات لکھے ہین،

تین اور چار دو نمبرون مین، ۷۰ ہندو مورخون کا تذکرہ ہوا، انکے زمانون پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہی کہ یہ صرف ڈہائی سو برس کی مدت کے اندر پیدا ہوئے ہین، یہ تعداد ابھی بہت کچھ بڑھ سکتی ہے، کیونکہ ہندوستان کے سینکڑون ہزارون ذاتی کتبخانون کے معلومات حاصل کرنیکے ذرایع ہمارے پاس نہین ہین، بہت سی ایسی کتابین ہین جو جاہل خاندانون کی غفلت کی نذر ہو گئی ہین، تاہم اتنی مختصر تعداد سے بھی ہمکو تسلی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ اس اسکولون اور کالجون کے عہد مین سوا سو برس کے اندر انگریزی کے ہندو مورخین اتنے بھی پیدا نہو سکے،

پھر اس نکتہ کو بھی فراموش نکرنا چاہیے، آج انگریزی تاریخ کی کچھ کتابین جو بنگالی یا دکنی برہمن مصنفون کے قلم سے نکلی ہین، وہ صرف یونیورسٹیون کے سہارے پر لکھی گئی ہین، کہ وہ کورس مین داخل ہو سکین، اور اُنسے کچھ تاجرانہ منافع حاصل ہو، لیکن گذشتہ شاہی زمانہ کے مصنفون کی یہ حالت نہ تھی، انکا محرک یا محض شوق علمی تھا یا سلاطین اور امرائے ملک کی قدر شناسی،

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ باینہمہ آجکل تاریخ کی جو کتابین ہندوستانیون نے لکھی ہین یا لکھی جارہی ہین وہ زیادہ تر کتابون کی ورق گردانی اور اگلے مصنفون کی دانائی کے ساتھ نقل صورت ہے، وہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کے بعد نہین، بلکہ محض کتبخانون کی الماریون کی تلاش کے بعد لکھے گئے ہین، وہ دنیا کی وسیع فضا مین چل پھر کر نہین بلکہ بلند ایوان لائبریریون کے قیدخانون مین بیٹھکر ترتیب پائی ہین، اپنی آنکھون سے مشاہدۂ حقائق اور استنباط نتائج کی بنا پر نہین لکھی گئی ہین بلکہ صرف اپنی دماغی محنت وکاوش اور کتابی تلاش وتفحص کی مدد سے لیکن جن اگلے ہندو مورخون کا ہمنے تذکرہ کیا ہے انکی تصنیفات زیادہ تر مشاہدۂ فطرت، معائنۂ حقیقت، اور مطالعۂ واقعات کے نتیجے ہین،

ان مصنفین کے حالات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان مین زیادہ تر ایسے تھے جو شاہی دفاتر کے ذمہ دار افسر تھے، ان مین بہت سے دفتر شاہی کے منشی، وقائع نویس اور دیوان تھے، انکی نگاہ سے سلطنت کا کوئی راز چھپا نہ تھا، سیاسی، انتظامی، اور مالی ایک ایک جزئی واقعہ پر انکو عبور رہتا تھا، اسلئے وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے، اور یہی سبب ہے کہ انکو اپنے تاریخی اوراق کے مرتب کرنیکا سب سے بہتر موقع ملتا تھا،

(۵)

ہندو فارسی شعراء

محکوم قوموں کو حاکم قوم کی زبان سے کسی طرح استغنا نہین ہو سکتا، مسلمانون کے عہد حکومت مین فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، اور اب انگریزی ہے، اس زمانہ کے طرز حکومت کے لحاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے محکوم قوم کو کبھی مجبور نہین کیا گیا، اور آج جس معاش کی مجبوری سے ہمکو انگریزی پڑھنی پڑتی ہے کل بھی یہی حالت تھی، بہرحال کسی سبب سے بھی ہو سکندر لودہی کے زمانہ سے ہندوؤن کو فارسی کی جانب توجہ ہوئی اور اسمین اسدرجہ اُنھون نے ترقی کی کہ ایک انگریز موٴرخ کے بقول "ہندوؤن اور مسلمانون مین فارسی زبندانی مین کوئی فرق نہین رہا[1]"

آج بھی انگریزی تعلیم اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے جہانتک گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بااین ہمہ نظم و اہتمام، جد و جہد، سعی و کوشش، اور زرپاشی و اسراف جدید تعلیم کا وہ نتیجہ نہین پیدا ہوا، جو پہلے پیدا ہوا، یہ ممکن ہو کہ کتب اور تعداد کے لحاظ سے آجکل کی سرکاری زبان کے جاننے والے زیادہ ہون، لیکن کیفیت اور اثر کے لحاظ سے گذشتہ تعلیم زیادہ مفید، کارآمد اور موثر تھی، اسکے اسباب میرے خیال مین حسب ذیل ہین،

(۱) تعلیم مفت تھی، صرف طلب نہ تھی،

[1] "ہندوستان مین علوم کی ترقی مسلمانون کے زمانہ مین" مسٹر لانے یہ قول نقل کیا ہے،

(۲) اساتذہ شفیق باپ اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے، آجکل کی طرح "اجرت گیر اور پیشہ ور معلمین" نہ تھے،

(۳) زبان تعلیم سے نہیں بلکہ اہل زبان کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتی ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت، صحبت اور سوسائٹی مین کوئی امتیاز نہ تھا، روز و شب کی صحبتین رہتی تھین، مجلسین تھین، ایک سوسائٹی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انکو فارسی زبان باتوں باتوں مین آجاتی تھی، اسی کا یہ اثر ہے کہ ابتک اسکولوں اور کالجوں مین ہندو طلبہ فارسی کو سہل و آسان سمجھکر اختیار کرتے ہین، اور سنسکرت کے مقابلہ مین اسکو ترجیح دیتے ہین اگر رفتہ رفتہ قومی تعصب کا رنگ اب تعلیمی تفریق و امتیاز بھی پیدا کرتا جاتا ہے،

بہرحال یہ واقعہ ہے جسکی کوئی تکذیب کی جرأت نہین کرسکتا کہ ادبی حیثیت سے فارسی تعلیم نے ہندوؤں پر جو اثر ڈالا وہ انگریزی تعلیم با این ہمہ گیری نہ ڈال سکی، سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ مین کتنے ایسے انگریزی کے باکمال شاعر گذرے ہین جنکا نام تاریخ کے صفحات مین زندگی حاصل کرسکا ہے یا کریگا، جو نام کے سامنے ہین انکی تعداد ۲ یا ۳ سے زیادہ نہین، اور یہ بھی زیادہ ہے، لیکن دیکھو صرف تیموریون کے آخر زمانہ مین صرف دو ڈھائی سو برس کے اندر فارسی زبان کے کتنے ایسے ہندو شعرا گذرے جنکے نام ابتک ہمارے تاریخی تذکروں کے فخر و مباہات کے باعث ہین جنکے اشعار کو سُن سُن کر اہل زبان سر دھنتے تھے اور مزے لیتے تھے، آج انگریزی کے دو تین ہندوستانی شاعر جنکی اہل زبان نے کچھ تعریفین کردی ہین یا انکو کوئی انعام ملگیا ہے، فرنگی مدح وستائش کے گیت گاتے گاتے ہماری زبانین خشک ہوگئی ہین، لیکن ذرا اپنے اسلاف کو دیکھو کہ انکے کیا کارنامے تھے؟ ہم نے چند فارسی تذکروں کو سامنے رکھکر حسب ذیل اشخاص کا انتخاب کیا ہے، انکی ترتیب زمانہ اور دور پر نہین بلکہ حروف تہجی پر ہے، ان مین سے ہر ایک نے سلاطین زمانہ اور ابناے عصر سے اپنی زبان آوری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی،

اس احتیاط کی بنا پر کہ تذکرہ نویسون کے اصلی الفاظ محفوظ رہین، اور زیادت و نقص اور کمی و بیشی کا شبہہ نہو اصل عبارت فارسی ہی اس مقام پر نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

آرام	منشی الیشری داس قوم کایستھ در زمرۂ منشیان سرکار امیر الامرا نواب غضنفر جنگ رئیس فرخ آباد انسلاک داشت

نظم و نثر فارسی بفصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نثرش جنس وقایع و سوانح بنظر گذشته حق آنست که بکمال لطف و خوبی می نگاشت، در مدح نواب عماد الملک نیر نظام الملک آصفجاه باستیصال سورج مل جاٹ گفته،

بفر کوکبهٔ بخشی ممالک ہند — سزد که باج ز خوارزم و ز ختن گیرند
شہان ز صولت آن جم وقار آصفجاه — رکاب توسن شاہنشہ زمن گیرند
جوان و صاحب بخت جوان نظام الملک — که باد ہمت از و مردم دکن گیرند
بر بدگرون بتُوے فتنه ساز نحست — چنانکه صبح سر شمع در لگن گیرند

آفرین — تین لال قوم کایستھ، ساکن الهٰ آباد، در رنگینی و مضمون آفرینی سحرکاری می نمود،

مبارکباد مرغان چمن را — نواسنجان رنگین انجمن را
که عید نوبہار آمد طرب جوش — نوی گل کرد دوران کہن را

اخلاص کالی پرشاد قوم کایستھ متوطن حوالی لکھنؤ، مشق نظم و نثر فارسی از مولوی احسان الله ممتاز نامی می نمود، بعد مرگش کلام منظوم و منثور او پریشان گردید، قصیده در مدح محمد علی شاه اوده برشته نظم کشیده، که بصنعت توشیح از ہشت جا محمد علی شاه بادشاه زمان خلد الله ملکه برآورده و از خزانه شاہی ہزار روپیه بجائزه برده،

الفت — راجه الفت رائے بخشی ممالک اوده، دستگاہش بر اصناف نظم و قصیده و غزل و رباعی و مثنوی قوی بسکه موزون طبع بود،

نیست اہل آسمان را بر درت بے اذن بار — می کند گردون طواف رفعت لیل و نہار
ہرچه ناممکن بود آید ز تو بر روئے کار — از غبار درگہ عرش احتراست آشکار

الفت — لاله اجاگر قوم کایستھ عظیم آبادی است، برائے اصلاح سخن بخدمت میر محمد علیم سمرقندی می رسید،

در آمد شام غم در سینه حسرت نام مہمانی — نه داغ دل کشیدم بے تکلف پیش او خوانی

الفتی راجه پیارے لال قوم کایته از موزونان عظیم آباد است، مثنوی نیرنگ تقدیر و دیوان اشعارش مطبوع طباع میر منشی بادشاه اکبر ثانی بود، و با ارباب کمال طریقهٔ الفت وخلق مرعی می نمود،

چون غنچه جز سکوت نباشد بیان ما
پیچیده شد زبان سخن در دهان ما

اندیشهٔ مال نیاید ز ما درست
در دست دیگریست چو سود و زیان ما

در دشت پر بلاے جنون غیبت الفتی
جز موج ریگ و اشک روان کاروان ما

امانت لاله امانت رام از شاگردان مرزا بیدل دهلوی است از سخن سنجی بهنجار استاد خود مائل

می گردد بلند از خاک هم باد مزار ما
که بنشیند مبادا بر دلِ خوبان غبارِ ما

شکر لله نقش پاے مه جبینے یافتم
آرزوے سجده می کردم زمینے یافتم

اندرمن پسر کنول رام مولدش قصبهٔ اورنگ آباد از اعمال علی گذه، استفادهٔ علم فارسی از شیخ نظام الدین سکندرآبادی کرده و در موزونی طبع و سخن سنجی نام بر آورده، هرچند در عین جوانی نابینا شد مگر قوت حافظه اش چندان افزود که سائر نظم و نثر خودش نوک زبان بود،

صد جلوه در کرشمهٔ آن ماه پاره است
این ماهِ نو ز ابروے او یک اشاره است

انس لال چند کایته، لکهنوی، از و دیوانے مختصر یادگار، ۱۲۶۹ھ،

شوخ جمشید برد رشک به بے نوشی ما
که لب یار بود مایهٔ بیهوشی ما

جاے رحم است خدا را نتوان کرد دریغ
هست وابستهٔ تیغ تو سبکدوشی ما

انیس سوهن لال شاگرد مرزا فاخر مکین، نام پدرش راے تولارام کایته، صاحب دیوان فارسی، پدر راے گنگاپرشاد بهادر از زمرهٔ کایتهان نجیبه و سنجیده شهر لکهنو است. بحضور واجد علیشاه عمدهٔ سررشته دار در علم سیاق و سباق سر بری آرد،

می کنم سجدهٔ بتے که کند
هر نفس دعوے خدائیها

از فهم طرهٔ اش معاذالله　　　من و اندیشهٔ رها یها

برہمن | چندربهان آگره، در سرکار داراشکوه منشی داشت، بعد قتل وے ترک نوکری نموده بشهر بنارس رفت، سنه ۱۰۷۳ه مرد،

کنم ز ساده دلی بندیه مژگان داشت　　　گذشت خس نتوان بست راه طوفان ما

بہار | ٹیک چند کلامش دل پسند، متتبع زبان فارسی بدرجهٔ قصوی رسانیده، کتاب بهار عجم (لغت) و جواهر الحروف ازوست، انار شند تلامذهٔ سراج الدین علیخان آرزو،

جانب او دل بحالِ اضطرابم می پرد　　　ذره ام بیطاقتی تا آفتابم می پرد

بہجت | لچهمن لال صاحب دیوان بهجت،

تفتہ | منشی گوهر لال تفته، برهمن، خیلے پرگوست، کلام منظومش بسیار، پنج دیوان شعر دارد، ابیات هر یکے ازان قریب سیزده هزار، کل ۵۲ هزار،

چند گوئی کز نشان نیست ز خونین کفنان　　　مگر این لاله که بینی ز شهیدان تو نیست

تمنا | لچهمن لال کایسته از شکوه آباد است، دیوان و مثنویش همگی ۱۵ هزار بیت است،

ثاقب | مهاراجه شیوپردهان جی گوپال سنگه بهادر، از کایتهان سری باسپت است، پدرش منشی بینی پرشاد سرشته دار دیوان عام سلطانی اوده بود، شیوپردهان کاروبار دیوانی شهزادهٔ صاحب جنرل فریدون قدر مرزا اهز بر علی اوده بود، تاریخ اوده که نام تاریخی او دفتر ثاقب و نسخهٔ تاریخ دهلی که نام تاریخش حقیقت تیموریه تالیف آن سخندان و مجموعه نادرات الثاقب و مثنوی مجز همت از منظومات آن است،

حیا | شیو رام اکبرآبادی کایسته، پدرش بهگوتی مل از متصدیان سرکار نواب اسد خان وزیر عالمگیر بادشاه مشق شعر و سخن از مرزا بیدل می نمود، نسخهٔ گلگشت بهار ارم بطرز چهار عنصر مرزا بیدل بستعدی تمام نگاشته، سنه ۱۱۴۲ه وفات یافت،

بیاد چشم تو داریم مے پرستیہا　　رسانده ایم بگردون دماغ ستیہا

خوشدل | رائے امر سنگھ ولد جیون رام کایستھ از کترہ مانکپور، جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ، در زمان نواب شجاع الدولہ، بہ نظامت سرکار غازی پور مامور گردید، رائے امر سنگھ بعد تحصیل علم و فنون اولاً در سرکار مہاراجہ اجیت سنگھ راجۂ بنارس تا آخر در سرکار انگریزی بدیوان جلیلہ کامران گشت، در سنہ ۱۲۲۶ھ در گذشت، بہار دانش نظم، و نسخہ تاریخ فرمانروایان ہنود، تا سلطان علاؤالدین غوری از وے یادگار است، اشعار دیوانش تخمیناً پنج ہزار است،

گرم است بسکہ نالہ آتش فشان ما　　سوزد بہ رنگ شمع زبان در دہان ما

خیالی | منشی خیالی رام لکھنوی، در نظم و نثر فارسی قدرتش علی وجہ الکمال، و تالیفاتش کہ شاید از یکصد و از انجملہ شرح اعجاز خسروی او در سنہ ۱۲۹۹ بگذشت، قصیدہ در مدح واجد علیشاہ بصفت نو منزل نوشتہ کہ از حروف اوائل مصاریع اولی سنہ ہجری، و از حروف اوائل الفاظ آخر سنہ فصلی و از مصاریع ثانیہ سنہ عیسوی و سمت ہندی،

خاموش | رام صاحب المتوفی سنہ ۱۲۲۹ھ اسکے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

راقم | بختاور سنگھ لکھنوی، بشیرین گفتاری از متانان گروہ ہندو، پسرش جواہر سنگھ جوہر از پدر خود خوشگو،

رحمتی | کنور سکھراج سنگھ بہادر، خلف کنور ہیرالال ضمیر، پسر راجہ پیارے لال الفتی،

گو بہجرش دل سوداز دہ غمناک شود　　جائے صبر ز بیتابی من چاک شود

رفعت | سیکولال لکھنوی، طبعش بشعر و سخن مائل و مشق این فن از مولوی نذیر احمد می نمود،

رفیق | وتا رام، طبعش باموزون توام ولب ولہجہ اش با خوش بیانی ہمدم،

نگارمن بخ خویش چون نقاب گرفت　　فتاد شور کہ امروز آفتاب گرفت

رونق | منشی رام سہائے لکھنوی نظم نثر فارسی بلطافت می نوشت، سنہ ۱۲۹۰ وفات، دیوان شعر و مثنویات از وے یادگار، غزلے نوشتہ در چار بحر

زرہ منشی مینڈو لال در شہر لکھنؤ، در نظم و نثر فارسی شاگردانش بسیار، دیوان فارسی و رسائل عروض معنی و بحر العلوم و ہفت صحیفہ بطرز پنج رقعہ، و نادر بازار بر تتبع مینا بازار و جاوید بہار،

سبقت سکھراج پدرش بملازمت عمدۃ الملک بہادر وزیر بادشاہ عالمگیر معزز است، از مستعدان روزگار بود و در علوم ادبیہ و حکمیہ و حساب و طب و تصوف از اقران گوے سبقت برد، بر انواع نظم و معما و تاریخ قدرت داشت شاگرد بیدل، در سرکار سید حسین علیخان کار دیوانی و میر سامانی سرانجام دادہ بمنصب پانصدی رسیدہ جنگ نامہ حسین علیخان قریب ہفت صد اشعار ازوے یادگار،

سروری رائے منشی دہر فواسنہ بخشی الممالک راجہ لال جی بہادر نظم و نثر فارسی را چیتی ہو بوی احسان اللہ منشی ملیح نمید

نامم بمعنی بسمنی امروز سروری ست
مداح آل سرور و شیدائے سرورم

شادان مہاراجہ چندو لال دیوان دولت آصفیہ حیدر آباد ابر دستش مجمع اہل کمال مطلع ارباب سخن در ہر شب مجلس شعر و سخن برپا می ساخت، در فن شعر پایۂ بلند داشت، فارسی دیوان چھپ گیا ہے، یہ مہاراجہ کشن پرشاد کے پردادا تھے، ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی۔

شفیق منشی لچھمی نرائن کھتری اورنگ آبادی شاگرد مرزا آزاد، دو تذکرۂ شعرا دارد گل رعنا و شام غریبان، صافگو خوش بندش است، اصلش از لاہور است، پدرش بھوانی داس ہمراہ عالمگیر وارد دکن گردید و در اورنگ آباد سکونت گزید، شفیق در سلک ملازمان عالیجاہ، خلف نواب نظام علیخان منظم گردید، در ۱۲۲۰ھ مُرد،

شوق منشی دولت رائے نبیرۂ راجہ بھولا ناتھ، از زمرۂ منشیان بیت الانشار شاہی اودھ ممتاز قصیدۂ بلیغہ گفتہ، در صنعت عکس و سجع دردی گفت، بہمراہی شاہ واجد علی مع اہل و عیال کلکتہ بیامد، ۱۲۷۰ھ مرد،

ازحسن فروغ از در حسن توجہان را
داغ تو چراغ است دل پیر و جوان را

بشیر لالہ بالمکند ماتکیہ ری در ۱۲۵۰ھ بگذشت، طبع نکتہ سنجی و نظم گوے داشتہ،

کمن اشک مرا بیقدر ای مژگان تر رحمے
برین طفل غذا پروردۂ خون جگر رحمے

صاحب رام سخن سنج فارسی درتاریگگوی ملکہ داشت ، درعہد سلطنت شاہ غازی الدین حیدر علم شہرت می افراشت ، ودر تاریخ وفات غازی الدین حیدر بادشاہ کہ در مقام نجف شہر لکھنؤ مدفون است می گوید

چون رفت شہ زمن ز دنیا	ماتم دل خاص وعام بگرفت
از روے بکا و آہ گفتم	حیدر بہ نجف مقام بگرفت

ضیائی | راجہ گوبند بخش ضیائی ، المتوفی ۱۲۴۵ھ ، انکا نہایت عمدہ فارسی دیوان کتبخانہ آصفیہ مین ہے ،

عشرت | جی کشن از براہمہ کشمیر در سخن طرازی سلیقہ اش نیکو ، مدتے بملازمت نواب نجم الدولہ امیر خان ، دیوان خالصہ شریفہ بقانون گوی تمام خطہ کشمیر سرافراز ،

وشت از لالہ بسکہ رنگین است	پاے دیوانہ دست گلچین است

گلشن | راجہ جیالال بہادر ، خوش فکر صاحب دیوان ، بدیوان انشار ابوالفتح محمد علی شاہ اودھ سرد فتر منشیان ،

گلشن | راے گلاب راے سندیلوی ، شاگرد قتیل ، در ریاست اودھ متعہد عہدہ ہاے جلیلہ ، در استعداد علمی بیعدیل در فنون سپہگری فائق الشان ، تذکرۂ شعرا ضخیم و دیوانے حجیم یادگار ،

ہرکس کہ از زبان تو حرف جفا شنید	گویا پیام خضر ز آب بقا شنید

مشتاق | لالہ بیجناتھ بریلوی ،

ملیح | لالہ رام بخش قنوجی

ممتاز | لالہ سیتل داس درنازک خیالی ممتاز ، بلب ولہجہ اہل زبان بہرہ ازبود ،

منشی | منشی مادہورام شاہجہان آبادی ، در سرکار نواب لطف اللہ خان بن سعد اللہ خان شاہجہانی بعہدہ انشا امتیاز داشت ، رفتہ رفتہ امیر الانشار معزالدین جاندار بن بہادر شاہ شرف ،

نمی رسد بمیان صنم ز باریکی	ہزار بار بدقت شگافتم مو را

منشی | لالہ فتح چند برہانپوری ، کایستھ ، ملیح نظم دارد وخوشگو است ،

نیست آسائش بمنزل جان از خود رستہ را | ہر قدم دام است نقش پا شکار جستہ را
بسکہ از شرم تو در پیرواز رنگ گلشن است | رشتۂ نظارہ بندہ در ہوا گلدستہ را

منوہر | رائے منوہر لال از امرائے سلطنت اکبر بادشاہ است، طبع متین و رائے رزین داشت، رباعی

روزیکہ سموم حشر افزون گردد | در آتش غم چو چہرہ گلگون گردد
مادر دو زخ چنان بندستے سوزم | کز رشک دل بہشتیان خون گردد

موجد | سکھن لال بدایونی،

چہ شکیبم چہ کنم چون نزنم سر بر سنگ | مدتے شد کہ ز جانان خبرے پیدا نیست

موجد | لالہ کالکا پرشاد لکھنوی بموزونی طبع و رسائی ذہن امتیاز داشت و خط نستعلیق خوش و شیرین می نگاشت باصطلاحات و محاورات زبان فارسی بخوبی ماہر،

رسائی نیست تا سر منزل او کفر و ایمان را | کہ دیر و کعبہ، سنگ رہ بود گبر و مسلمان را

موجی | لالہ موجی رام،

موزون | راجہ رام نرائن عظیم آبادی، پدرش بدیوانی سرکار نواب مہابت جنگ عزت داشت، بعدہ باین عہدۂ موروثی رسید، و در جنگ پا مردی نہاد، دیوان اشعارش، شاگرد شیخ محمد علی حزین، سنہ ۱۱۷۰ھ،

موزون | راجہ مدن سنگھ اٹاوی، پدرش راجہ جگت سنگھ دست توسل بدامن دولت نواب غازی الدین خان آویخت، و بمنصب سہ ہزاری و بخطاب راجگی، و بعدہٗ دیوانی نواب ممدوح، مدن سنگھ در سرکار نواب آصفجاہ دکن متوسل الممالک بود و در عہد ناصر جنگ بمنصب دو ہزاری و علم و نقارہ و خطاب راجگی یافت و معمور بحراست قلعہ مصطفیٰ نگر گردید، تا آنکہ افواج انگریزی محاصرہ اورش بران قلعہ نمود راجہ تا توانست پاے برجا ماند، بصدمہ تفنگ بعمر ۵ سال سنہ ۱۱۶۹ھ جان داد، در نظم و نثر فارسی استعدادے نیکو داشت،

کرد گلشن جلوۂ رنگین یار آئینہ را | می رسد عرض قدمبوس از بہار آئینہ را

نقاد پنڈت جی گوپال کشمیری از آشنایان قاضی محمد صادق اختر بوده، شاگرد قتیل،

واثق کھتری بود به برکت صحبت مولوی عبداللہ بن مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی مشرف باسلام شده به محمد اخلاص خان مخاطب گردید، و بملازمت اورنگ زیب رسید و بوکالت بعضے از امرا رمی شناخت، نظم و نثر فارسی چنان خوبتر می نوشت که اورنگ زیب زبان باحسنت و آفرین می کشود، درجوانی میل بشعر و شاعری داشت بعد ازان بافادۂ علوم و فنون طبیعت گماشت، سنہ ۱۱۳۳ه مرد،

محتسب مے کشی از دست تو مشکل شده است
شیشۂ مے به بغل آبلۂ دل شده است

وفا پنڈت دیاناتھ ولد مت رام کشمیری، شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی می بود،

وقار امیرالدوله منشی الملک راجه جوالا پرشاد بهادر محکم جنگ، امیرالانشار امجد علی و واجد علی شاہان اوده باوجود چندین اقتدار حرف در رشتے نسبت کے نگفته، در نظم و نثر فارسی صاحب استعداد است، دیوانش مطبوع،

هندو شیو سنگھ لکھنوی،

هندو گوکل چند قوم کھتری فرخ آبادی،

---

(٦)

ہندو ادبائے فارسی

ہندو ادبائے فارسی اس کثرت سے گذرے ہین کہ انکا شمار بھی حیطۂ امکان سے باہر ہے' ان مین بہت سے اچھے لکھنے والے انشا پرداز تھے، اور ایسے بھی تھے جو محض دفتری ضرورت کے مطابق اس زبان مین نوشت وخواند کر سکتے تھے، ہندوؤن کے دوسرے فرقون کی بہ نسبت کایستھ ذات نے فارسی زبان کی تحصیل مین کثرت تعداد کے لحاظ سے زیادہ ناموری حاصل کی، لیکن اصل زباندانی اور جوہر سخن کے لحاظ سے برہمنون نے زیادہ کمال پیدا کیا، خصوصاً آخر زمانہ مین کشمیری برہمنون نے جسطرح آجکل بنگالیون کی انگریزی زبان کو "بابو انگریزی" کہتے ہین' اسی طرح مسلمانون کے عہد حکومت مین کایستھون کی فارسی" اور "لالاؤن کی فارسی" مشہور تھی،

دفاتر مین زیادہ تر ہندو ہوتے تھے، محکمۂ انشار (سکریٹریٹ) اور مال کے صیغے تمامتر ہندوون کے ہاتھ مین تھے، آخر زمانہ مین انشار کے اعلےٰ افسر بھی ہندو ہونے لگے تھے، جنکو عموماً میر منشی اور راندرے خطاب منشی الممالک کہتے تھے، ان عہدون پر جو ہندو سرفراز ہوتے تھے وہ فارسی زبان کے لائق ادیب ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے احکام وفرامین انہین کی زبان وقلم سے ادا ہوتے تھے وقایع نویسی کی خدمت پر بھی زیادہ تر مامور ہوتے تھے،

ہندو ادبا کے یہ فرامین، منشآت اور رقعات جب زیادہ جمع ہوجاتے تھے اور انکی مقبولیت عام ہوجاتی تھی تو وہ بطور کتاب کے یکجا جمع کردئے جاتے تھے، ان مین سے بعض مجموعے اسدرجہ مقبول و ہردلعزیز ہوتے تھے کہ وہ طالبعلمون کے نصاب تعلیم مین داخل کرلئے جاتے تھے، چنانچہ منشآت برہمن، انشائے مادہو رام، منشآت جواہر مل خطاط، خیالات نادر، دستور الصبیان وغیرہ اسی قسم کی کتابین ہین،

اس واقعہ کا تکرار کئی دفعہ گذر ہوچکا ہے، کہ ہندوؤن نے فارسی تعلیم لودہیون کے زمانہ سے شروع کی چنانچہ فارسی کا سب سے پہلا ہندو ادیب بھی اسی زمانہ مین ہمکو ملتا ہے،

پنڈت ڈونگرمل ایک بزرگ لکھتے ہین کہ پنڈت ڈونگرمل سکندر لودہی کے زمانہ مین تھے، انکی فارسی زباندانی پر مسلمان بھی تعجب کرتے تھے، کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ انکا یہ ایک شعر ارباب تذکرہ نقل کرتے ہین،

دل خون نشدے چشم تو خنجر نشدے گر	رہ گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر

ٹوڈرمل کھتری تھا، شیرشاہ کے عہد مین فارسی تعلیم حاصل کی، اور دربار تک رسائی پائی، شیرشاہی کاروبار کے انقلاب کے بعد اکبری نورتن مین شامل ہوا، جہان مال کا صیغہ اسکے ہاتھ آیا، ٹوڈرمل فارسی کا خوشخط کاتب بھی تھا، تذکرۂ خوش نویسان مین ہے،

"نویسندۂ چابکدست و خطوط را بخوشخطی دلکشی می نوشت"

اس عہد کے دیگر ادبا کا تذکرہ اسلئے قلم انداز کرتے ہین کہ انکا ذکر دوسرے سلسلون مین آچکا ہے،

رائے منوہر لال رائے لون کرن کا خلف الرشید تھا، شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے آغوش تربیت مین پلکر جوان ہوا اور فارسی زبان مین یہ سلیقہ پیدا کیا کہ اہل تذکرہ اسکی تعریف و توصیف مین رطب اللسان ہین،

چندربھان برہمن اسکا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، یہ پنجابی برہمن تھا لاہور مین پیدا ہوا تھا، ملا عبدالکریم کی شاگردی مین آکے فضل و کمال نے نشو و نما حاصل کیا تھا، فارسی زبان کا

شاعر تھا، اور برہمن تخلص کرتا تھا، اسکا فارسی دیوان اتبک کتبخانون مین موجود ہے، فارسی ادب مین بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، افضل خان امیرالامراے شاہجہانی نے اسکی لیاقت وقابلیت کو دیکھکر اسکو اپنا منشی خاص (پرایئوٹ سکریٹری) بنایا، ۱۰۴۸ھ مین افضل خان نے وفات پائی تو وہ دربار شاہی کے سلک ملازمین مین داخل ہوا، اور دربار شاہجہان کا وقایع نویس یعنی شاہی تاریخ و روزنامچہ کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدہ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہوکر ہر روز کے مرتبہ واقعات وحالات سناتا تھا، ۱۰۵۵ھ مین چندربھان نے چہار چمن برہمن لکھکر نوروز کے موقع پر سرہند مین دربار شاہجہانی مین نذر گذرانی، اسکی لیاقت وادب دانی کو دیکھکر شہزادہ داراشکوہ نے جو خاص طور پر ہندوؤن کے جوہر کمال کا قدردان تھا اسکو اپنے اعیان دربار مین داخل کرلیا، اور اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کیا، داراشکوہ کی تباہی کے بعد حوادث زمانہ سے تنگ آکر بنارس مین گوشہ گزین ہوگیا، اور یہین ۱۰۷۳ھ مین راہی عدم ہوا، تذکرۂ عمل صالح کا مصنف اسکو اپنے زمانہ کے فضلاے ادب مین شمار کرتا ہے اس نے اپنے رقعات ومنشآت کا مجموعہ بھی فراہم کیا، اسکا نام منشآت برہمن ہے، خوشخطی مین آقا عبدالرشید کا شاگرد تھا،

ہرکرن داس	ولد متھراداس، قوم کنبوہ، باشندۂ ملتان، ۱۰۳۱ھ مین زندہ تھا، فارسی علم ادب مین دستگاہ

اس نے حاصل کی تھی اسکی شہادت یہ ہے کہ وہ امراے جہانگیری مین سے اعتبار خان صوبہ دار اکبرآباد کا میر منشی تھا، انشاے ہرکرن کے نام سے اس نے فارسی ادب کی ایک کتاب لکھی تھی جو اتبک بعض کتبخانون مین موجود ہے،

داس کھتری	امراے عالمگیری مین سے ایک کا وکیل (ایجنٹ) تھا، اسکے نظم ونثر ادب فارسی کی یہ

دھوم تھی کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا احسنت وآفرین کہتا تھا،

شیورام کایتھ	اکبرآباد کا باشندہ تھا، اسکا باپ نواب اسد خان وزیر عالمگیر کا متصدی تھا، مرزا بیدل کا

شاگرد تھا، مرزا کی چہار عنصر کا جواب گلگشتِ بہار ارم کے نام سے اس نے لکھا تھا، ۱۱۳۲ھ مین وفات پائی

کنور پریم کشور راجہ جگل کشور کا پوتا، شاعر، لطیفہ گو، سخن فہم، خوش نویس تھا، چند مثنویوں کا مصنف ہے،

منشی لچھمن سنگھ قوم کے بقال تھے، نہایت ہوشمند، عاقل، اور عربی و فارسی کے ادیب تھے، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں، اور مشہور ایرانی انشاپردازوں کے طرز پر لکھتے تھے، صاحب تذکرۂ خوشنویسان لکھتا ہے،

مرد دانا قابل، در علم و ہنر فارسی و عربی و عبارت پردازی خیلے مہارت داشت، و در صحبت مرنایان ایران بسیار ماندہ دل و دماغ دیگر پیدا کردہ، و طور انشاء بردیۂ طاہر وحید و طاہر دکھنی و جلالا اختیار کردہ،

خوشخطی میں محمد حفیظ خان کے، شعر میں مرزا آغا کے، شاعری میں میر شمس الدین فقیر (المتوفی ۱۱۸۰ھ) کے شاگرد تھے، شعلۂ آہ وغیرہ انکی تصنیفات ہیں، ظہوری کے اشعار انکی نوک زبان رہتے تھے،

پنڈت لالہ لچھمی رام ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان (المتوفی ۱۱۹۶ھ) جو شاہ عالم کا وزیر تھا اسکی سرکار میں یہ ملازم تھا، تذکرۂ مذکور کا مصنف انکی نسبت لکھتا ہے،

منشی بےنظیر بود، در علم عربی و فارسی و انشاپردازی و مصوری نصیب وافر داشت، ۔۔۔۔ این چنین انسان باسلیقہ و صاحب کمال کم پیدا می شود،

خوشوقت رائے شاداب کھتری، یہ ایک مشہور اور معزز خاندان کا فرزند تھا، بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، آخر اسدرجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے کبار علما میں سمجھا جانے لگا، تذکرۂ مذکور میں ہے،

از ابتداے عمر طبع را بہ تحصیل علم و ہنر راغب و مائل داشت و در اندک زمان در جمیع علم و ہنر آراستہ شد، در خصائل نیکو از ہمچشمان خود سبقت بردہ، در خوشنویسی کمال داشت، این چنین شخص در این قوم صاحب استعداد و فیاض و قدرشناس کم شدہ باشد،

راے پریم ناتھ اسکا خاندان ایک مدت سے شاہی دفتر کا عہدہ دار چلا آتا تھا، یہ خود شاہ عالم کے سرکاری دفتر کا مالک اکل تھا، خوشخطی و ادب دانی میں اپنے زمانہ کا استاد یگانہ تھا، شاگردوں کا بڑا مجمع اس نے

یادگار چھوڑا،

سکھ رام داس ولد نیل کنٹھ، زمانہ متعین نہین، آمدنامۂ بدیع اسکی ایک تصنیف ہے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اطراف لکھنؤ کا باشندہ تھا، اور عہد شاہی مین قانون گوئی کے عہدہ پر مامور تھا،

بینہ نرائن ولد جیبن رائے، قوم کھتری، عرف سودہی، پنجاب کا رہنے والا تھا، فرخ سیر کے عہد مین محکم سنگھ اسکو منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر سرفراز کرکے اپنے ساتھ مارواڑ لیگیا، اثنائے سفر مین اسکو محمد طاہر کشمیری کی کتاب "ہوش افزا" ملی، اس نے اسکو بغور پڑہا اور اسکی بناپر اسکو قدیم ہندو عہد کے عجائبات اور مذہبی معجزانہ قصص کو فارسی زبان مین لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ رامائن، مہابھارت، بھاگوت، ہری بنس وغیرہ سے انتخاب کرکے ۱۱۲۵ھ سے گلشنِ اسرار ربانی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جو ۱۱۳۲ھ مین اختتام کو پہنچی،

منشی سوہن لال منعم اکبر ثانی کے عہد مین تھے، انکی تین مثنویان، مثنویات منعم کے نام سے فارسی مین موجود ہین، بہ ترتیب انکا نام بہار عشق، شاہ رُخ، اور دلبر جہان ہے، اور غالبًا یہ تینون افسانے ہین، شاہ رخ اور دلبر جہان کو اس نے اکبر ثانی کے نذر کیا تھا،

کشن سنگھ ولد رائے پران ناتھ کھتری قوم منکل ساکن سیالکوٹ، یہ فارسی زبان کا ایک چابکدست انشا پرداز تھا، پنجکروشنی اور غریب الانشا، وغیرہ کتابون کا مصنف ہی غریب الانشا ۱۱۵۶ھ مین اُس نے لکھی،

بنوالی داس ولی تم اس سے ہندو مورخین کی بزم مین مل چکے ہو، اُسکا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ بھاشا زبان سے ایک "ناٹک" پربودھ چندر ودیا کا فارسی زبان مین ترجمہ کرکے شراب شیراز کے متوالون کو ہندوستان کی "رام رنگی" کا مستانہ بنایا، ۱۰۷۳ھ مین یہ موجود تھا،

دونی چند ۱۱۳۷ھ مین گیگوہر نامہ کے نام سے فارسی زبان مین ایک افسانہ لکھا، دیوان غلام محمد خان

جو بہادر شاہ اول کے عہد مین ایک امیر تہا اسکا مربی اور محسن تہا،

شنبھو ول | یہ مہاراجہ چیت سنگھ والی بنارس کا منشی (سکریٹری) تہا، ۱۱۹۷ھ مین اس نے مفتاح خزائن نام کتاب لکہی، جو بہت سے خطوط کا مجموعہ ہے، جنمین سے بعض نہایت اہم ہین،

منشی ہتوری مل تمکین | بارہوین صدی ہجری کے اوائل مین فارسی کا یہ ایک مشہور ادیب تہا، اسکے پوتے پران چند سرشار ولد بخت مل نے اپنے دادا کے فارسی خطوط ورقعات کو گلدستۂ فیض کے نام سے ایک رسالہ کی صورت مین مرتب کیا، یہ خطوط ۱۱۳۹ھ کے زمانہ کے لکہے ہوئے ہین،

منشی بھجن رائے پوری | شجاع الدولہ کے عہد مین ۱۱۶۷ھ مین راجہ رائے پور کے دربار مین نوکر تہے، منشی تخلص تہا اور قلم کے بہی منشی تہے، فن انشا پر انہون نے ایک کتاب لکہی ہے، انشاے نیاز نامہ نام رکہا ہے، کتاب کے تین ٹکڑے کئے ہین، (۱) عرائض، (۲) رقائم (۳) ثمرہاے متفرق،

منشی جسونت رائے | عالمگیر ثانی کے عہد مین تہے، **گلشن بہار** کے نام سے انہون نے ایک چمن ادب کہلایا ہے، مختلف لوگون کے خطوط اسمین جمع کئے ہین جنمین بکثرت سیاسی اور جنگی معلومات ہین، شاعر بہی تہے منشی تخلص کرتے تہے، اور اسی نام سے ایک دیوان فارسی بہی چہوڑا ہے، ۱۲۰۰ھ مین تہے،

منسا رام | منشی تخلص تہا، سرزمین پنجاب کے مجنون ولیلےٰ، ہیرا ور رانجہا کا افسانہ حسن وعشق نظم کرکے اہل فارس کو سنایا، ۱۱۵۰ھ مین یہ نغمہ سراے محبت سراے فانی سے کوچ کر گیا،

عوض رائے | مسرت تخلص، قصیدۂ مسرت کہکر شاہ عالم کے دربار مین پیش کیا، اسمین کمال یہ کیا ہے کہ ہر شعر مین بادشاہ کو نئے طور سے خطاب کیا ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکا قلمی نسخہ ہے،

نہال چند لاہوری | یہ ایک افسانہ کا جسکا نام مذہب عشق ہے مصنف ہے، مذہب عشق مین نام ونشان ننگ ہے، اسلئے اس ادیب کے حالات نامعلوم ہین،

لالہ ہوپت رائے | فن بلاغت کی ایک کتاب دستور شگرف کا مصنف، تصنیف تو حیدر آباد اور بنگال

ایشیاٹک سوسائٹی مین قلمی موجود ہے، لیکن صاحب تصنیف کا تذکرہ مفقود ہے، حیدرآباد کا نسخہ سنہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے،

لالہ بھچک رائے | فیض آباد کا باشندہ تہا، اُس نے سعدی کی گلستان مین پھول کھلائے، یعنی اسکی شرح لکھی جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین موجود ہے،

منشی ایشری داس | کایستھ، امیرالامرا نواب غضنفر جنگ والی فرخ آباد کے منشی تھے، ایک فارسی تذکرہ کا مصنف انکی نسبت لکھتا ہے،

نظم و نثر فارسی بہ فصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدایع بفعلی دمنوی می نگاشت،

ازنظرش بعض دقایع و سوانح بنظر گذشتہ، حق آنست کہ بکمال لطف وخوبی می نگاشت،

منشی ٹیک چند بہار | انکا تذکرہ آگے آئیگا، یہان صرف اس حیثیت سے انکو جگہ ملتی ہے کہ یہ بوستان سعدی کے شارح اور بہار بوستان کے مصنف ہین،

اننت رام | زمانۂ متاخر کا ایک فارسی ادیب ہے، سنہ ۱۱۵۹ھ کے قریب مین اس دنیا سے چل بسا، لیکن اسکے چمنستان کی بہار ابتک باقی ہے، یہ ایک فارسی افسانہ ہے، سنہ ۱۲۹۱ھ مین یہ کتاب چھپ چکی ہے،

ماتا پرشاد | صحیفۃ الشوق نام ایک فارسی افسانہ کا مصنف ہے انکا قلمی نسخہ سنہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا کتبخانۂ آصفیہ مین ہے،

دین دیال | عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت ایک افسانہ فارسی زبان مین اس نے لکھا ہے، سنہ ۱۲۹۶ھ مین یہ کتاب طبع ہوئی ہے،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے فارسی مین پاربتی، مہادیو، رام چندر جی اور راجہ دسرت کے تصون کو نظم کرگیا،

سیالکوٹی مل | انکا ذکر آگے آتا ہے، یہ زمانۂ متاخر کا بہت بڑا ادیب تہا، صفات کائنات کے

نام سے فارسی علم بلاغت مین اسکی ایک کتاب ہے جو ۱۲۹۵ھ مین چھپ گئی ہے، اسکی دوسری کتاب رجم الشیاطین ہے جو سراج آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے، یہ دونون کتابین دہلی مطارحات پر مشتمل ہین،

لچھمی نرائن باپ کا نام مانی رام، سراج الدین آرزو کا شاگرد تھا، لاہور اپنا وطن چھوڑ کر دلّی مین آکر ڈیرے ڈالے، درانی کے حملون نے دلّی سے نکال کر بریلی اور اورنگ باد کی سیر کراتے ہوے لکھنؤ پہنچایا، یہ فارسی کا نامور انشاپرداز تھا، اسکے فارسی رقعے بہت مشہور ہین، ۱۲۰۵ھ مین اس نے ان رقعون کو ترتیب دیکر رقعات لچھمی نرائن نام رکھا،

لچھمی نرائن یہ حاجی پور (بہار) کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد مین شہزادہ بیدار بخت کی سرکار مین پیشکاری کے عہدہ پر تھا اور سہ صدی منصب رکھتا تھا، ۱۱۴۰ھ مین اس نے شاہنامہ کا انتخاب کیا اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے،

شکر و سپاس و نعمت و منت خداے را
پروردگار خلق و خداوند کبریا

راجہ رام نرائن لچھمی نرائن کا بیٹا، عظیم آباد پٹنہ مین اُس نے بڑا سیاسی عروج حاصل کیا تھا اور مدت تک اسکا خاندان معزز رہا، شیخ حزین کا شرف تلمذ اسکو حاصل تھا، خود صاحب ادب اور ادباے زمانہ کا مربی تھا نواب قاسم کی معرکہ آرائی کا نشانہ بنا، نہایت وسیع النظر اور کتب بینی کا شائق تھا،

کیول رام شاہ عالم کے عہد مین تھا، اور اودھ کے بیت الانشا مین منشی تھا، ۱۱۹۷ھ مین منشی کیول رام نے پچپاس جز مین فن انشا پر ایک کتاب لکھی اور طلسمات خیال اسکا نام رکھا،

پنڈت کرپادھان پنڈت جی کا جنم پتر معلوم نہین، مثنوی دلپسند کے مصنف ہین، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین ۱۲۴۳ھ کا لکھا ہوا اسکا قلمی نسخہ موجود ہے،

منشی خیالی رام لکھنؤ وطن، خیالی تخلص، نظم و نثر فارسی کے استاد، واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق تھا انکی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے، یہ خسرو کی سب سے مشکل کتاب اعجاز خسروی کی شرح لکھی،

منشی مادھو رام | دلّی کے رہنے والے تھے اور فارسی زبان کے استاد تھے، انشاے مادھو رام انکا نتیجۂ فکر ہے جسمین بادشاہون، شہزادون اور امرا کے نام خطوط ہین، یہ پہلے نصاب فارسی مین داخل تھا،

ذیل کی سطرون مین چند منشآت کے نام نقل کرتے ہین اُنکے مزید حالات سے واقفیت نہوئی،

کامتا پرشاد | انشاے بے نقط کا مصنف،

منشی کالی راے | انشاے تمیز کا مصنف، اس انشا مین ایک خاص صنعت بدیع (ترک حرف مسلسل) ملحوظ ہے

دولت رام | کتاب کا نام انشاے دولت رام،

منشی جے سنگھ راے | انشاے راحت جان کا مصنف ہے، اس کتاب مین سخاوت و عدالت وغیرہ مختلف عنوانات پر مضامین ہین،

ہر سہاے | انشاے ہر سہاے اسکی کتاب کا نام ہے، اسمین منشی گری کے قوانین نظم و نثر فارسی مین بیان ہوئے ہین،

منشی ہر نرائن | دہلی کے باشندہ تھے، خیالات نادر انکے فارسی رقعات کا مجموعہ ہے،

لالہ نوند راے | دستور الصبیان کے نام سے فارسی مکتوبات کے جامع ہین،

لچھمی داس | بن نرائن داس، رقعات نظامیہ اسکا سرمایۂ کمال ہے، چھپ گئی ہے،

خوشحال راے | دستور الامتیاز کے نام قوانین انشا کا مدوّن ہے، نسخہ موجودہ کتبخانۂ آصفیہ ۱۲۰۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے،

نند رام | باپ کا نام سیرانند، قانونچۂ انشا اسکی تالیف ہے، موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے

رام سنگھ | گلشن عجائب، انشا مین انکی کتاب ہے نسخۂ موجودہ آصفیہ ۱۲۲۳ھ کا چھپا ہوا ہے،

کشناجی پنڈت | شاید یہ دکھنی ہون، انکی نادر الانشا قلمی آصفیہ مین ہے،

رنجھور داس | جونپور کا رہنے والا تھا، دقائق الانشا کا مولف ہے،

۲- ہندو لغت نویس

کسی زبان کے جاننے کے صرف یہ معنی نہین ہین کہ وہ اس زبان کی عبارت کو بخوبی سمجھ سکتا ہی اور اسمین لکھ پڑھ سکتا ہے، یہ تو نہایت ادنی درجہ ہے، اصلی زباندانی یہ ہے کہ وہ اہل زبان کی طرح اس زبان پر قابو رکھتا ہو، اور اسکے ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ و اشتقاق کا علم اور غلط و صحیح کی تمیز، اور خواص کے طرز ادا، ترکیب الفاظ، ادائے مطلب، اور محاورات پر اسکو دسترس ہو، ہندوستان مین جو ہندو ادبائے فارسی گذرے ہین غور کرنا چاہیئے کہ کیا انکی واقفیت زبان، ہماری آجکل کی بیرونی زبان کی واقفیت کے معیار سے کچھ بلند ترتھی یا نہین،

اکبر کے زمانہ تک فارسی زبان کے چھوٹے بڑے ۴۴ سے زیادہ لغت موجود تھے، لیکن یہ تمامتر قدما اور اہل زبان کے لکھے ہوئے تھے، جو اہل ہند کے ضروریات کے مطابق نہ تھے، بہت سی چیزین ایسی ہین جنکو ایک صاحب زبان لغت نویس مشکل اور قابل حل نہین سمجھتا، حالانکہ غیر زباندان کے نزدیک وہ سخت مشکل اور قابل حل ہین، لغات سے زیادہ محاورات کا معاملہ سخت ہے، اہل زبان انکے ایک ایک نکتہ کو جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا انکو اسی طرح سمجھ لیگی، حالانکہ دوسری قومون کو جنکی وہ زبان نہین یہی مرحلہ دشوار نظر آتا ہے، غرض یہی اسباب تھے کہ جنکی بنا پر ہندو ادبائے فارسی کو فارسی زبان کے لغات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

| ٹیک چند بہار |

قوم کا کھتری، سراج الدین علیخان آرزو اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ مین تھا فارسی زبان کی گرہ و بند پر اسے کامل عبور تھا، اہل زبان کی مدت تک صحبتین اٹھائی تھین، اس نے فارسی زبان کے کئی لغت لکھے بہار عجم، نوادر المصادر، جواہر الحروف، زیادہ مشہور بہار عجم ہے، اسکے مقدمہ مین وہ لکھتا ہے کہ بدو طفولیت سے ۴۳ سال کی عمر تک فارسی زبان کی تحقیق و کاوش مین بسر ہوا، ۲۰ برس تک متصل اس نے اس لغت کی تالیف و ترتیب مین بسر کئے، اور سات دفعہ خود اپنے ہاتھ سے سودہ کاٹ چھانٹ کر

صاف کیا، یہ عمر کی آخری کمائی تھی، اور اُسی پر جان دی، بہار کے شاگرد منشی اندرمن نے آٹھوین دفعہ مرتب کیا، اور خطبہ اور خاتمہ لکھکر شاہ عالم کے زمانہ مین ۱۲۰۳ھ مین ختم کیا، بہار عجم اسقدر مقبول ہوئی کہ تمام ارباب علم مین متداول ہوگئی، اور لوگ اسکی سندین پیش کرتے ہین، ہر فارسی دان اُسکے نام سے واقف ہے، محاورہ کے لئے اس نے اہل زبان کے شعر سند مین پیش کئے ہین،

سیالکوٹی مل وارستہ | نام سے زیادہ یہ اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہے، شیخ حزین پر سراج آرزو نے جو اعتراضات کئے تھے اسکے جواب مین رجم الشیاطین اُس نے لکھی تھی، سمجھ لو کہ اہل زبان اور اساتذۂ فن کے مناظرات اور رد وکد مین جو صاحب نظر حملہ آورانہ اور خصوصاً مدافعانہ حصہ لے وہ کسقدر اس زبان پر عبور کامل اور وقوف تام رکھتا ہوگا، وارستہ نے اسی فارسی زبان کے عشق مین ایران تک کی خاک چھانی، اور کامل ۳۰ برس اس ملک مین بسر کئے، اس سفر کے نتائج علمی مصطلحات الشعراء اور صفات کائنات ہین، مصطلحات الشعراء گو صرف ۴۰۰ صفحہ کی ضخامت کا لغت ہے، لیکن پندرہ برس کی محنتون کا صلہ ہے، وارستہ دیباچہ مین لکھتا ہے،

> اکثر محاورات غریبۂ فارسی زبانان در اشعار فصاحت بار دیدم بہ تحقیق آن کمر سعی محکم بربستم ہرچند گرد کتب لغات گردیدم لغوی حل معانی بعضے ازان نشنیدم ناچار رجوع بزباندانان ایران دیار آوردم و پانزدہ سال درین تلاش بسر بردم، آنچہ از زبان آن جماعت شنیدم برسے انتفاع جمہور سخن پردازان خواستم در حیز کتابت آوردم،

پنڈت گنگا بشن | حال نہین معلوم، اُس نے فرہنگ شیر و شکر کے نام سے عربی و فارسی الفاظ کا لغت لکھا ہے،

کاشی راج کھتری | لغت پنجابی کے نام سے فارسی زبان مین لغت لکھا ہے اسکا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین ہے،

گردھاری لال | دکن کا باشندہ، ۱۲۴۱ھ مین گنج اللغات فارسی لکھی، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

فرہنگ آنند راج | اس فرہنگ کا ذکر اس سلسلہ مین مناسب نہ تھا کہ اولاً تو ایک مسلمان کی تصنیف ہے اور

ثانیاً اسلئے کہ مسلمانون کے عہد حکومت کے بعد لکھی گئی ہے، لیکن صرف اسلئے اسکا تذکرہ مقصود ہے کہ اس سے اوا ے احسان کا موقع پیدا ہو، فرہنگ انند راج چالیس پچاس برس ہوئے کہ مدراس کے ایک ہندو راجہ انندرام کی فرمائش سے ترتیب پائی، یہ فارسی زبان کا سب سے ضخیم اور مطول لغت ہے جو کئی جلدون مین اور چند ہزار لمبی تقطیع کے صفحات مین تمام ہوئی ہے، اسمین صرف خالص فارسی الفاظ ہنین ہین جیساکہ دیگر لغت نویسون نے کیا ہے بلکہ ان عربی الفاظ کو بھی لیلیا ہے جو فارسی مین مستعمل ہین، مصنف کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ نے اسپر ہزارون روپے صرف کئے ہین، اسکے لئے دور دور سے کتابین منگوا این کتبخانہ ترتیب دیا، مصنف کا وظیفہ مقرر کیا اور خود چھپوا کر شایع کیا،

اس موقع پر ایک نکتہ کی بات ہم کہنا چاہتے ہین، اگرچہ ہندوستانیون نے انگریزی پڑھکر مرہٹی بنگالی اور اردو مین انگریزی ڈکشنریان آج بھی لکھی ہین لیکن درحقیقت انھون نے اسمین صرف مترجمی کی خدمت انجام دی ہے، یعنی کسی مستند انگریزی ڈکشنری کو سامنے رکھکر اسکے مقابل کے معنی اپنی زبان مین لکھکر خانہ پری کردی ہے، لیکن جو خدمت کہ ٹیک چند بہار اور وارستہ نے اپنے زمانہ کی سرکاری زبان کی ادا کی اور مثل ایک اہل زبان کے بذات خاص تحقیق و کاوش سے شعرا کے کلام پڑھکر، ایرانیون کی صحبتین اٹھاکر خود اہل زبان سے مطارحات اور چھیڑ چھاڑ کرکے انجام دی اسکی نظیر اتبک تو پرانے "منشی" کے نوجوان "مسٹر" نہ دکھا سکے،

| منشی کاشی پرشاد | نادان تخلص، وطن دکن ہوگا، انھون نے فارسی قواعد کی کتاب "ہفت گل" لکھی، آصفیہ مین اسکا نسخہ ہے،

| مینڈو لال | زار تخلص، بہار علوم کے نام سے فارسی قواعد کی کتاب تصنیف کی، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

مترجمین

دو مختلف قومون کے متضاد عناصر کو متحد کرنیکے لئے بہترین کیمیادی مسالہ دونون قومون کے

لٹریچر کو متحد کردیتا ہے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے صبح امید کے پہلے نمبر مین اس مقصد پر بڑا زور دیا ہے، ہم کہتے ہین کہ ہان اس جدید زمانہ مین سرنو کوشش کی ضرورت ہے، لیکن پرانے عہد کے بزرگون نے اپنے دور عمل مین اس خیال کو پیش نظر رکھا اور کامیابی ہوئی، اسوقت ہیہ سلسلۂ مضمون یہ نہین ہے کہ مسلمانون نے کیا کیا، بلکہ یہ ہی کہ اس عہد کے ہندوؤن نے کیا کیا،

اس خیال کی اصلی کامیابی ملک کے مترجم طبقہ کے ہاتھ مین ہے، جو ایک قوم کے خیالات کو دوسری قوم کے سامنے پیش کرتا رہے، اور بتاتا رہے کہ ان دونون مین کچھ بیر نہین، بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہین، اگرچہ ترجمہ کا سلسلہ مسلمانون کے آغاز عہد سے قائم تہا لیکن وہ صرف علمی ذوق کا نتیجہ تہا قومون کی باہمی بیگانگی اور اجنبیت کا دور کرنا اسکا مقصد نہ تہا،

اکبری عہد مین حکومت کی خواہش کے مطابق مسلمان علما اور ہندو پنڈتون نے ملکر رامائن مہابھارت سنگھاسن بتیسی، لیلاوتی، نلدمن، تاجک، ہری بنس، اتھربن وید وغیرہ کتابون کا ترجمہ کیا، وہ پنڈت جو ان مین سے بعض کتابون کے ترجمہ مین شریک غالب رہے، یہ تھے، گنگا دہر، مہیش، مہانند، کشن جوتشی مہادن، افسوس ہی کہ ان نامورون کے حالات نہین معلوم،

اب وہ زمانہ بھی آیا جبکہ بادشاہون کی خوشی کے لئے نہین بلکہ اپنی خوشی کے لئے فارسی دان ہندو پنڈتون نے اس کام کو ازخود انجام دینا شروع کیا،

گردہر داس قوم کایستھ، متوطن دہلی، شہنشاہ جہانگیر کے عہد مین تہا، ۱۰۳۶ھ مین اس نے رامائن کا ترجمہ فارسی نظم مین کیا، یہ کتاب برٹش میوزیم لندن مین موجود ہے،

بنوالی داس ولی تخلص، شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی، (چیف سکریٹری) تہا، ۱۰۶۳ھ مین اس نے بہاکا کے پربودھ چندرودیا نام ایک افسانہ کا فارسی مین ترجمہ کیا،

پنڈت لچھمی نرائن انھون نے شنکر اچاری کی پوتھی اپدکہا بوتی کا ترجمہ حدائق المعرفت کے نام سے فارسی مین کیا

منشی لکھن لال جہان ظفر کے نام سے رامائن کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا،

امر سنگھ رامائن امر پرکاش کے نام سے پاربتی، مہادیو، رامچندر، راجہ دسرت کے حالات زباندانانِ فارس کو سنا ہئے،

پنڈت امرناتھ شیدا تخلص، چاروید دن کے مطابق دنیا کے جو احوال تھے وہ فارسی مین خیالاتِ شیدا کے نام سے بیان کر گئے، یہ کتاب کتبخانہ آصفیہ مین ہین،

رام پرشاد اودھ کا باشندہ تھا، نواب ناظم محمد ارباب خان کا خزانچی تھا، اس نے سنہ ۱۲۲۶ء مین نواب مذکور کی فرمائش سے امت چرتر کا فارسی نظم مین ترجمہ کیا، اور مخزن العرفان اسکا نام رکھا،

گوپال خلف سری گوبند، اس نے سری بھاگوت دادھیا تھما رامائن کا ترجمہ فارسی مین کیا سنہ ۱۱۸۱ء کا لکھا ہوا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین ہے،

اننگھن گوشائین متخلص بہ خوش اس نے پوتھی کاشی کھنڈ اس کو فارسی زبان مین منتقل کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین جو نسخہ ہے وہ سنہ ۱۲۰۵ء کا لکھا ہوا ہے،

اننت کنوار حالات نہین معلوم، پوتھی موجہ دہرم گیان ساگر کا قلمی نسخہ جو اس نے فارسی مین ترجمہ کیا تھا، سوسائٹی مذکور کے کتبخانہ مین ہے،

زور آور سنگھ اس نے پوتھی بہادار نبہہ کو فارسی زبان مین منتقل کیا،

مرلی دھر پوتھی سری بھاگوت کا فارسی مین مترجم قلمی نسخہ سوسائٹی مین ہے،

راؤ دلیپ سنگھ اہل تاریخ کے سلسلہ مین اسکا حال گذر چکا ہے، مہاراجہ جگت سنگھ والی اودے پور کی سرکار مین نوکری کے زمانہ مین اس نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا، بادۂ شیراز کو سفالِ ہندی مین بھر کر ملک کے سامنے پیش کیا، یعنی دیوان حافظ کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا،

۷

ہندو علماے علوم عقلیہ

علوم عقلیہ سے میری مراد، طبعیات، الہیات، ریاضی، ہیئت، طب وغیرہ جملہ علوم حکمت ہین اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہندوستان بھی ان ممالک مین سے ایک ہے جسکو علوم عقلیہ کا جنم بھوم کہنا چاہیئے، یہ بحث دوسری ہے کہ یہ علوم براہ راست یہین پیدا ہوے جیسا کہ اہل ہند کا دعویٰ ہے یا سکندر کے بعد یونانیون کے ذریعہ سے یہ علوم یہان منتقل ہوئے جیسا کہ اہل یورپ کا بیان ہے تاہم یہ ماننا پڑیگا کہ اہل ہند نے ان علوم مین کافی دستگاہ حاصل کرلی تھی، اور ریاضیات وہیئت مین ایک حد تک وہ استادی کے رتبہ کو پہنچ گئے تھے،

ہندون کے دماغ کو ریاضیات سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی ہے مسلمانون کے عہد حکومت مین علوم عقلی کے جو ہندو نامور یہان پیدا ہوے، ان مین مہندسین اور علماے ریاضیات کی تعداد زیادہ ہے،

بیرونی کے ذریعہ سے جن برہمنون نے عربون کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا افسوس کہ انکے حالات ہمکو نہین معلوم، اور بعد کی صدیون مین جن ہندو بزرگون نے ادہر توجہ کی انکے نام سے بھی ہم واقف نہین، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سنسکرت مین عربون کی تحقیقات عقلی کی کافی آمیزش موجود ہے، چنانچہ تمدن ہند کا فرنچ مصنف شہادت دیتا ہے کہ گیارہوین صدی عیسوی کے

بعد سے کہنا چاہیے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، پس ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی ابتدا پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بھٹ کے ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتوین صدی مین برہم گپت نے ان پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک انہین مسائل سے بحث کرتے ہین جو ہند مین (یونانی اور مسلمان) ان دو ذریعون سے آئے"؟

عہد اکبری کے ہندو علمائے معقولات ابو الفضل تنہا مورخ ہے، جس نے اپنے بادشاہ کے عہد کے جزئی سے جزئی واقعہ کو قلم انداز نہین کیا، آئین ہین دانش آموزان دولت کے عنوان سے ہر فن کے ۱۴۲ علما کے نام لکھے ہین، اس کاغذی دربار مین بلاتفریق ہندو اور مسلمان دونون قومون کے اکابر علم اور اساطین فلسفہ دوش بدوش بٹھائے گئے ہین، شناسائے عقلی کلام کے عنوان ہین ابو الفضل نے اپنے زمانہ کے حسب ذیل اشخاص کے نام لکھے ہین، نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر، باہن بھٹ، بدیا نواس، گوری ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹاچارج، بھاگیرت، کاشی ناتھ بھٹاچارج،

جن ہندو پنڈتون نے مرزا الغ بیگ کی زیچ جدید جو مسلمان علمائے ہیئت کی تحقیقات اخیر کا مجموعہ ہے، مسلمان علما کی زیر نگرانی فارسی سے ہندی مین ترجمہ کیا تھا، انکے نام یہ ہین، کشن جوتشی گنگا دھر، مہیس، مہانند،[۵]

جے سنگھ کے رصدخانے مسلمان سلاطین نے دنیا کے ہر گوشہ مین جہان انکے تمدن نے فروغ پایا، تحقیقات فلکیہ کی تکمیل کے لئے رصدخانے قائم کئے، سنہ ۱۹۰۹ء کے الندوہ مین ہم نے متعدد نمبرون مین ان رصدخانون کے حالات وتحقیقات کی تفصیل لکھی ہے، اسوقت سلسلۂ سخن کے طور پر یہ کہنا ہے کہ ہندوستان مین متعدد مسلمان سلاطین نے رصدخانے قائم کرنا چاہے،

---

[۵] آئین اکبری، آئین تصویر خانہ،

فیروز شاہ بہمنی اور شاہجہان نے کام کو شروع کرایا لیکن مختلف وجوہ سے ناتمام چھوڑنا پڑا، یہ مہم درحقیقت محمد شاہ کے عہد حکومت کے لئے اُٹھ رہی تھی،

راجہ جی سنگہ سوائی کچھواہا، امبیر کا راجہ تہا، اورنگ زیب عالمگیر اور اسکے جانشینون کے ایام سلطنت مین ایک فوجی افسر کی حیثیت سے نمایان عزت حاصل کی، محمد شاہ کے عہد مین وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے اپنی ریاست کا نیا مرکز جے پور کے نام سے آباد کیا اور اب اسی نام سے یہ ریاست معروف ہے، جی سنگھ ایک نہایت علم دوست اور عالم راجہ تہا، عربی علوم وفنون مین وہ اچھی دستگاہ رکہتا تہا اور علم ہیئت سے اسکو ایک خاص ذوق تہا۔

راجہ جی سنگھ نے الغ بیگ کی زیج جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات، اور ملا فرید شاہجہانی کی زیج شاہجہانی کے اصول پر زیج محمد شاہی ترتیب دی، اور بادشاہ کے حضور مین پیش کی، یہ وہ زمانہ تہا جب اہل یورپ کے فضل وکمال کی طرف اہل ہند کی نگاہین اٹھ رہی تہین، بادشاہ کے حکم سے مسلمان، برہمن، اور فرنگی علماے ہیئت جمع کئے گئے، اور دلی مین ایک جدید رصدخانہ کی تعمیر کا کام ۱۱۳۷ھ مین شروع ہوا، مرزا امیر اللہ مہندس اس کے مہتمم تھے، اس رصدخانہ مین بعض آلات ایسے تھے جو سمرقند کے الغ بیگی رصدخانہ مین استعمال پاچکے تھے، اور بعض بالکل نئے تھے اور خود راجہ کے ایجاد کردہ تھے،

راجہ نے اس غرض سے تاکہ رصدخانہ کی تمام تحقیقات پوری اُترین اور انکی تصدیق ہوتی جائے رصدخانۂ دہلی کے نمونہ پر جی پور، متھرا، بنارس، اور اُجین مین بھی رصدخانے بنواے، دلی اور بنارس کے رصدخانون کی ٹوٹی پھوٹی یادگارین تو اب تک باقی ہین، اور مین نے دیکھی ہین، باقی شہرون کا حال نہین معلوم،

بہرحال ان رصدخانون مین ہندو، مسلمان، اور فرنگی علماے ہیئت نے سات برس تک

کام کیا اور اسکے بعد کچھ لوگ پادری بنویل کی ماتحتی مین یورپ بھیجے گئے، وہان سے یہ علمی جماعت جو معلومات لیکر آئی انکا اپنے اصول کے مطابق یہان مقابلہ کیا گیا، یہ مشرق کا پہلا رصد خانہ ہے جس نے مغربی تحقیقات کی موافقت کی، اس رصد خانہ کی تحقیقات فلکی سے زیچ محمد شاہی تیار کیگئی جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت[لہ]،

راجہ نے اس راہ مین ایک اور اہم خدمت انجام دی، عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا، اور اسپر ہزارون روپے صرف کیے[ٹہ]،

بہادر خان والی ٹکاری

احتشام الدولہ مبارز الملک راجہ خان بہادر نصرت جنگ، ہمارے اس عہد کے ہندو دوست سمجھتے ہونگے کہ یہ کسی مسلمان امیر کا نام ہوگا، لیکن انکو سننا چاہیے کہ یہ مہاراجہ متر جیت سنگھ راجہ ٹکاری (صوبہ بہار) کے فرزند ارجمند کا نام ہے، یہ راجہ غدر سے ۳۰ برس پہلے تھا، راجہ مذکور تمام علوم و فنون عربی و فارسی مین ماہر تھا، اسکا دربار مسلمان اور ہندو فضلاے عہد سے بھرا ہوا تھا اس زمانہ مین مولانا غلام حسین جونپوری ایک نامور ریاضی دان تھے، وہ بھی اس راجہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، مولانا راجہ کے فضل و کمال کا ذکر ان الفاظ مین فرماتے ہین،

"چنانچہ فنے از فنون متداولہ و علمے از علوم متداولہ مطروح نشدہ کہ در ذات شریف آن یگانہ جمع نیامدہ باشد،

راجہ نے ایک دن اپنی بزم علم مین تذکرہ کیا کہ روز بروز علم کا نقصان ہو رہا ہے، اور اسکے متعدد وجوہ ہین جنمین سے ایک یہ ہے کہ علوم و فنون کی زیادہ تر کتابین عربی زبان مین ہین جن سے فارسی خوان فائدہ نہین اٹھا سکتے، اسلئے مناسب ہے کہ فارسی مین ایک ایسی

[لہ] مقدمۂ زیچ محمد شاہی [ٹہ] سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی،

جامع کتاب لکھی جائے جو ہر قسم کے اصول و فروع پر مشتمل ہو، تین سو برس ہوے کہ علامۂ عبدالعلی برجندی کے زمانہ سے اسوقت تک کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی، اس تقریر کے بعد راجہ نے مولانا غلام حسین کو حکم دیا کہ اس مجوزہ تصنیف کا کام شروع کرین،

مولانائے موصوف نے جامع بہادرخانی کے نام سے ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ریاضیات پر فارسی مین لکھی جس سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب شاید عربی مین بھی نہوگی، اسکو علوم ریاضیہ کی انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ موزون ہوگا، علم ہندسہ، علم الابصار، علم المناظر، علم حساب، جبر و مقابلہ، جومیٹری، علم ہیئت، علم آلات رصد و قواعد رصد وغیرہ اصولی ابواب کے تحت مین بیسیون فروعی مباحث اور فصول ہین، پوری کتاب لمبی اور چوڑی تقطیع کے ۱۴۱۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور ہر صفحہ مین ۵۲ لمبی اور باریک سطرین ہین سنہ ۱۲۴۹ھ مین شروع ہوئی اور سنہ ۱۲۴۵ھ مین تمام ہوئی، اکبر ثانی کا یہ زمانہ تھا، کتاب مین جہان کہین ستارون کے طلوع و غروب کا وقت دیا گیا ہے، قلعہ نگاری کے مطالع و مغارب کے حساب سے دیا ہے، مصنف جابجا قدیم تحقیقات کو یورپ کے جدید معلومات سے موازنہ بھی کرتا گیا ہے

راجہ رتن سنگھ زخمی قوم کا یستھ سکسینہ، سنہ ۱۱۹۷ھ مین لکھنؤ مین پیدا ہوا، اسکا خاندان تین پشتون سے دربار اودھ کے معزز عہدون پر ممتاز چلا آتا تھا، لکھنؤ کی درسگاہون کے آغوش مین اُس کے فضل و کمال نے نشو و نما پایا، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، اور کسی قدر انگریزی زبان سے واقفیت تھی، علم ہیئت مین اسکو استادی کا رتبہ حاصل تھا، فارسی شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتا تھا، کچھ دنون ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی، اسکے بعد اودھ مین اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا محمد علی شاہ کے زمانہ مین دیوان شاہی مقرر ہوا، اور فخرالدولہ دبیرالملک ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا،

سنہ ۱۲۵۳ھ مین محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت مین حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب لکھی جو ۶ جز مین جاکر ختم ہوئی ہے جدید مغربی تحقیقات کو پرانے عربی معلومات سے اس نے پیوند دیا ہے، یہ کتاب اپنے باب مین نہایت مستند اور معرکۃ الآرا سمجھی جاتی ہے اور اب علماے اسلام مین ہیئت کی اعلیٰ کتابون مین اسکا شمار ہوتا ہے،

روپا نرائن سنہ ۱۱۲۹ھ مین وفات پائی، علم ہندسہ مین **ششش جہات** نام ایک کتاب لکھی جو ارباب فن مین نہایت وقیع خیال کیجاتی ہے، قلمی نسخہ موجود ہے،

اندرمن منشی ٹیکچند بہار کا شاگرد تھا، اصل وطن حصار تھا، لیکن توطن شاہجہان آباد مین اختیار کر لیا تھا، بہار عجم کو اسی نے آخر مین مرتب کیا تھا، ریاضیات مین اسکو ید طولیٰ حاصل تھا، عربی و فارسی کا عالم تھا، سنہ ۱۱۶۰ھ مین **دستور الحساب** نام کتاب، علم الحساب (میتھمیٹکس) میں تالیف کی، کتبخانۂ بانکی پور مین اسکا قلمی نسخہ ہے، کتاب ۷ اجزا مین تمام ہوئی ہے،

بیعونی مل قوم کایستھ، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت مین تھا، علوم عقلیہ کا واقف کار تھا سنہ ۱۱۰۱ھ مین **بدائع الفنون** کے نام سے ریاضیات مین ایک عمدہ کتاب لکھی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور کتبخانۂ آصفیہ مین اسکے قلمی نسخے موجود ہین،

رام پرشاد عظیم آباد پٹنہ وطن تھا، علم ہندسہ مین **مفتاح الناظرین** اسکی تالیف ہے، سنہ ۱۲۵۰ھ مین اسکی یہ کتاب کلکتہ مین چھپی تھی،

دیوان کالجی یہ بھی عظیم آباد پٹنہ کے باشندہ تھے، ریاضیات و ہندسہ مین خزانۃ العلم انکی کتاب ہے سنہ ۱۲۵۳ھ مین یہ کتاب کلکتہ کے چھاپہ خانہ مین طبع ہوئی تھی،

ماسے سندر لال فلسفی علوم حکمت اور فلسفہ مین ممتاز و معروف تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی تھے، اور فلسفی بننے کے مدعی تھے، اسلئے فلسفی تخلص کرتے تھے، انکے بیٹے کندن لال نے اپنی

ایک تصنیف مین اپنے خاندان کا حال لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا علم وکمال کا مطلع تھا شاہجہان کے زمانہ سے اس خاندان مین علم ودولت ساتھ ساتھ تھا، سندیلہ کے برہمن تھے، راے منون لال کی نسبت لکھا ہے،

"پدر فقیر راے منون لال فلسفی تخلص کہ در علوم حکمیہ یادگار حکماے سلف بودند و صاحب تصانیف کثیرہ"

راے منون لال پہلے نواب فیض اللہ خان کی سرکار مین تھے، اسکے بعد نواب آصف الدولہ کے دربار مین گئے، اور یہان سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی مین آئے، اور غالبًا یہین کسیقدر انگریزی حاصل کی، ۱۲۴۹ھ مین وفات پائی، اور گیارہ کتابین مختلف علوم وفنون مین اپنی یادگار چھوڑین گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار، تنقیح الاخبار، جغرافیہ، یہ کتابین ادب وتاریخ مین ہین، خالص فلسفہ کی تصنیفات حسب ذیل ہین، سدید الاستخراج، کتاب احکام عجائب در علم حساب، ہیئت، حکمت انگریزی، مفردات طب،

کندن لال اشکی، یہ اسی نامور باپ کا فرزند تھا، باپ اور چچا کے زیر عاطفت عربی اور فارسی علوم کی تحصیل کی، ۲۲ سال کی عمر تک بریلی، رامپور، دہلی اور بنارس کی درسگاہون مین عمر گذاری سنسکرت مین سری کب اندر جہا کے شاگرد تھے، کچھ سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت مین بسر کئے اور آخر نواب منتظم الدولہ ناظم الملک مہدی علیخان کی وساطت سے محمد علی شاہ اودھ کے دربار مین پہنچے، چارصدی منصب پایا، دفتر انشا مین کسی عہدہ پر ممتاز ہوے، منتظم الدولہ کی وفات کے بعد خدمت سلطانی سے مستعفی ہوکر بنارس مین گوشہ نشینی اختیار کی،

کندن لال عربی اور نیز اسلامی علوم مین استادی کا درجہ رکھتے تھے. حدیث وفقہ پر بھی اُنکی نظر تھی، فلسفہ اور ریاضیات سے اُنکو خاص ذوق تھا، ہیئت مین اُنھون نے زیج اشکی ترتیب دی، فلسفہ مین حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت، اور قسطاس تین کتابین فارسی زبان مین

لکھین، اخیر کتاب درحقیقت تمام علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا ہے، کندن لال نے اسکو چار حصون پر منقسم کیا ہے، پہلے حصہ مین ہندوؤن کا فلسفہ ہے، دوسرے مین یونانیون کا، تیسرے مین عربون کے علوم، اور چوتھے مین یورپ کا جدید سائنس، کہین سے یہ نہین معلوم ہوتا کہ وہ کسی علم وفن سے بیگانہ ہے، کتاب ۱۳۲۵ھ مین مطبع محمدیہ لکھنؤ مین چھپی،

انتظاماتِ مالی

اس فن پر ہندو مصنفین کی تین کتابین ملی ہین، جنکا ذکر بہ ترتیب آتا ہے، اس فن پر انکی توجہ اسلئے مبذول ہوئی کہ زیادہ تر یہ عہدے انہین کے زیر اقتدار رہتے تھے،

چھترمل ولد رائے پران چند، اس نے اس فن مین ایک نادر کتاب یادگار چھوڑی ہے جسکا نام **دیوان پسند** ہے، دیوان زراعت، محاصل و زراعت کے اعلیٰ عہدہ دار کو کہتے تھے، دیوان پسند یعنی وہ کتاب جو ہر دیوان کے لئے اسکے ادائے فرائض مین معین ہے، مصنف نے باب کے لئے اسمین دستور کا لفظ پسند کیا ہے، دیوان پسند چار دستورون پر منقسم ہے (۱) در بیان درستی زمین ہائے کاشتکاری و تعین جمع سرکار و بعضے حساب در پیداواری اجناس" (۲) سیاق و شمار در بعضے انتظام مہمات (۳) مزروعہ در بعضی دست (۴) مالی و ملکی آدینات معاملہ،

دیباچہ مین مصنف اپنی معاملہ فہمی اور انتظامی مہارت پر بے انتہا فخر کرتا ہے، زمانۂ وجود نہین معلوم، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے،

جگپت رائے حالات و زمانۂ وجود نہین معلوم سیاق یعنی کاغذات و حسابات مالی کے قواعد ترتیب مین سیاق فارسی اسکی تصنیف ہے،

من مل مجموعۂ سیاق (فارسی) کا مصنف، یہ دونون رسالے قلمی کتبخانہ آصفیہ مین ہین،

نند رام سیاق نامہ (فارسی) کا مصنف، کتبخانہ آصفیہ مین ۱۸۱۹ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے،

نجوم

بیربل	یہ نہین معلوم کہ یہ کون بیربل ہے، رسالۂ نجوم فارسی مین اسکی تصنیف ہے،
خوشوقت راے	ولد بھوپت راے، خاص النجوم کا مصنف،
سداسکھ کول	باپ کا نام کیول رام کول، کاشف الدقائق، نجوم مین اُسکی تصنیف ہے،
جواہر سنگھ	جواہر افلاک و جواہر ادراک کا مصنف،

یہ تمام قلمی رسالے کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

طب

ہندوؤن کے ہان مسلمانون کی آمد سے پہلے طب مین دو کتابین مشہور ہین، چرکا اور شُشرت کی کتابین، مسلمانون کا علم طب عرب، یونان، ایران اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ تھا اور خود انھون نے بہت کچھ اُسپر اضافہ کیا تھا، اِسلئے یہ نیا علم طب ہندوستان کے قدیم طب پر امتیاز خاص رکھتا تھا، ہندوستان کے علم طب مین مسلمانون کی آمد کے بعد جو ترقیان رُونما ہوئین وہ حسب ذیل ہین،

(۱) حاکم قوم اپنے علوم وفنون کو محکوم قوم کے علوم وفنون سے بہت بالادست سمجھتی ہے، اور اس سے استغنا برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکھئے کہ گذشتہ کونسل مین جب بعض ممبرون نے دیسی طب کی سرکاری حمایت اور اُسکو مستند تسلیم کرنیکا رزولیوشن پیش کیا تو نا اتفاقی کے ساتھ رد کر دیا گیا، لیکن مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین ایسا نہین کیا، ہندی علم طب کی بیسیون کتابین اُنھون نے اپنی زبان مین منتقل کین اور اپنا علم طب ہندوستان مین پھیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کرکے خود اُنہین کے علم طب کو فارسی مین منتقل کیا اور شاہی حیثیت سے اسکو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک

درباری امیر نے عرض کی کہ جہان پناہ! یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہین ہے
حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی مین منتقل کیا جاے، چنانچہ میان بہوہ بن خواص خان
اس کام کو انجام دیا اور کتاب کا نام معدن الشفا، سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے
اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان مین
اسوقت فارسی مین جو علم طب ہے اور خصوصاً خاندانی اطبار کے سفینون مین اور مجربات نامون
مین سیکڑون نسخے اور دوائین ہندوستان زا ہین، اسی طریقہ سے بیدون نے مسلمانون کے
سیکڑون نسخے، دوائین اور اصول علاج اپنے ہان لے لیے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا
طرز علاج رائج ہوا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تہا،

(۲) پہلے بیدون مین وہ دوائین متداول نہتین جو ہندوستان مین پیدا ہوتی ہتین، طب اسلامی نے
تمام دنیا کے ملکون مین جو دوائین اور جڑی بوٹیان زیر تجربہ آچکی ہتین انکو ہندوستان مین
رواج دیا، انکے فواید و منافع لوگون نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بیحد بڑہا دیا،

(۳) دواؤن کی ترکیب مین عرق، معجون، قیروطی، سفوف وغیرہ مختلف طریقون کو پہیلایا،

(۴) چیچک وغیرہ متعدد بیماریان جنکو بیان وہم پرستی سے دیوتاؤن، دیبیون اور بہوت
پریت کا اثر سمجہا جاتا تہا اور اسلیے انکا طبی علاج نہین کیا جاتا تہا، انکو لائق علاج بتایا، چیچک
کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربون ہی نے لکہی،

(۸)

طب اور دیگر علوم متفرقہ

یہ سلسلہ اسقدر پھیلا کہ ارباب بزم گو زبان سے تو نہین کہتے لیکن بتور سے پہچانتا ہون کہ وہ گھبرا اٹھے ہونگے لیکن بات یہ ہے کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب اسکے بعد تکلیف نہ دیجائیگی،

پچھلی داستان مین ہم طب تک پہنچے تھے، اب ہماری کہانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور عہد اسلامی کے بعض ہندو طبیبون کا حال سناتے ہین۔

دربار شاہی مین مسلمان اطبار کے ساتھ ہندو طبیبون کا رہنا بھی ضروری تھا، چنانچہ ہندو علمار کے مختلف طبقون مین سے سب سے پہلا طبقہ جو شاہان اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا وہ بھی ہندو طبیب[۱] تھے، ہندو اطبار مین سے زمانۂ اسلام مین سب سے پہلے ہم جسکو جانتے ہین وہ سری بھٹ ہے،

سری بھٹ — یہ حکیم سلطان زین العابدین (۸۲۳ھ) والی کشمیر کے دربار مین تھا، بادشاہ نے اسکی خود تربیت کی تھی، فرشتہ مین ہے،

---

[۱] فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ،

"سلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیبے حاذق بود تربیت کرد"

اطبائے عہد اکبری | اکبر کے عہد حکومت کے نامور ہندو اطبا کے چند نام ابوالفضل نے آئین میں[1] لکھے ہین، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی، افسوس کہ انکے حالات ہمکو نہین معلوم،

سکھراج | اسکا باپ اسد خان وزیر عالمگیر کی سرکار مین تھا، سکھراج علاوہ دیگر علوم عقلیہ کے فن طب مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، سید علی حسین خان کی سرکار مین پانصدی منصب پر ممتاز تھا،

منشی لچھمی نرائن گنجاوی | انکا ذکر زمرۂ شعرا مین بھی گذر چکا ہے، یہ بھی سلمان طبیبون کی درسگاہ سے فن طب کے ماہر بنکر نکلے تھے، انکا خاندان عالمگیری و محمد شاہی دربار دار، کے متوسلین مین تھا،

منشی رام پرشاد عظیم آبادی | خلف گنگا پرشاد، گو یہ طبیب تھے، لیکن طبابت کا پیشہ نہین کرتے تھے، کمپنی کے زمانہ مین پٹنہ کی صدرامینی قبول کر لی تھی، پنڈت داتا رام کی فرمائش سے ۱۲۴۳ھ مین **معیار الامراض** نام ایک کتاب فن طب مین تالیف کی، جسمین سر کے بال سے پاؤن کے ناخنون تک کی کل بیماریون کے قوانین کلیہ لکھے ہین، یہ کتاب اسی زمانہ مین چھپ بھی گئی تھی،

رائے سنولال فلسفی | المتوفی ۱۲۳۸ھ، دیگر علوم عقلیہ کے ساتھ طب کا بھی ماہر تھا، مفردات طب مین اسکی ایک تصنیف ہے،

لالہ سوہن لال | سندیلوی، رائے سنولال کا بھائی تھا، فارسی کا ادیب اور طب مین یگانہ عہد تھا اسکا بھتیجا کندن لال، قسطاس کے خاتمہ مین لکھتا ہے:

"عمویم لالہ سوہن لال کہ طبیب حاذق وادیب کامل بودند،"

بھولا لال تمکین | حیدرآبادی، اُس نے اپنے طبی تجربات دو جلدون مین لکھے ہین، یہ دونون

[1] صفحہ ۱۶۷، نولکشور،

جلد بن قلمی کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

پنڈت لالہ چند | اسکی ایک تصنیف کحل الابصار کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مخصوص آنکھ کی بیماریون کے علاج مین ہے،

دیاناتھ | اس نے وید ک سے پاکا ہومی کالی کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے

منشی مہتاب نرائن | ضروری الطب کا مصنف ہی، اسکا موضوع ادویہ کے خواص ہین،

یہ ان طبیب مصنفون کی مختصر فہرست ہے، جنھون نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیون مصنفین اسکے علاوہ ہین، جنھون نے اسلامی طب کو ہندی، مرہٹی، بنگالی اور تلنگی مین منتقل کیا، تلنگی کی بعض طبی کتابون کے نام کتبخانۂ آصفیہ کی فہرست مین موجود ہین،

یہ اسی وسعت کا اثر تھا کہ شہرون کو چھوڑ کر دیہات اور قصبون تک کے ہندو بنئے، طبی دواؤن کے بڑے بڑے عطار بنگئے، اور عرب وایران وترکستان کی دوائین انکی دوکانون پر بکنے لگین، اور زمانہ کی شدید مخالفتون کے باوجود انکے آثار ابتک باقی ہین،

اخلاق و تصوف

اس مضمون پر مفصل بحث تو ایک مستقل عنوان "اسلام کا اثر ہند و مذاہب" مین ہوگی، یہان علمی حیثیت سے صرف چند ہندو مصنفین کا تذکرہ مقصود ہے، جنھون نے ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے،

بابا نانک | جو سکھ فرقہ کے بانی ہین، وہ فارسی مین بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، انکے گرنتھ مین فارسی کے سینکڑون اشعار اور الفاظ ہین، اور مولوی رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے تو وہ دلدادہ تھے، فارسی مین انکی دو کتابین تصوف مین ہین، الٓہی نامہ اور دل طلب ایک اور مناجات بحر طویل مین انکی ہے، یہ تینون رسالے آصفیہ مین ہین،

داس ستی داس عالمگیر ثانی کے عہد مین تھے، محیطِ معرفت تصوف مین اُنکی کتاب ہے، سنہ ۱۸۶۵ مین چھپ بھی گئی ہے،

لال جی داس بابالال گرو، (دارا شکوہ کا مرشد) کا چیلا تھا، بابالال کے ملفوظات سنہ ۱۱۸۵ مین اس نے فارسی مین جمع کئے ہین، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری مین سنہ ۱۲ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے،

بھیرومل رسالہ علم جوگ فارسی کا مصنف،

بشن سنگھ شیو پران، فارسی مین اسکی تصوف پر تصنیف ہی، یہ دونون نسخے قلمی آصفیہ مین ہین،

رائے لکھمن لال اخلاق نامہ فارسی منظوم کا مصنف، اسکا قلمی نسخہ موجودہ آصفیہ سنہ ۱۱۹۳ کا لکھا ہوا ہے،

سوامی بیاس شارق المعرفت کے نام سے جوگ بششٹ کا فارسی ترجمہ کیا، حال و زمانہ نہین معلوم،

ان کے علاوہ اکبری دور کے ان خداپرستون کے نام بھی ملاو جنکو ابوالفضل نے خدیو نشناسان، خداوند باطن اور خوانا سے نقلی مقال کی فہرست مین جگہ دی ہے، یعنی مادہو سرستی، مدہو سودن، بابا بلاس، نارائن آسرم، بابا کپور، بھان چند، ہرجی سور، دامودر بٹ، رام تیرتھ، نرسنگ، پرم اندر، آدت، رام بھدر، بھگی بین سور، اور جہانگیری دور مین جدروپ گوسائین، اور دوسرے ہندو صوفیا تھے جنکا ذکر تزک مین اُس نے متعدد مقامات پر کیا ہے،

موسیقی

فن موسیقی کے جاننے والے اس کثرت سے اس عہد مین پیدا ہوئے ہین کہ استقصا بھی مشکل ہے، شاہان ہند کی فیاضیون نے اس فن کو کہان سے کہان پہنچا دیا، ہندوستان مین یہ فن نہایت قدیم زمانہ سے ہے، اور اسمین اسکی استادی مسلم ہے، لیکن مسلمانون کی آمد کے بعد ایران و توران کی موسیقی نے ملکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، پٹھانون کی عہد حکومت مین بھی

اس فن کے جاننے والے ہندو موجود تھے، اور سلاطین دہلی کا دست کرم انکو دار الحکومت کی طرف ہمیشہ کھینچتا رہتا تھا، جہاں خسرو کے سے ہمہ دان سے انکو مقابلہ کرنا پڑتا تھا جنمین سے سب سے مشہور نایک گوپال تھا، اسکے ۱۲۰۰ فن موسیقی مین شاگرد تھے جو اسکے جلو مین ساتھ ساتھ چلتے تھے، گوپال اسی شان سے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار مین آیا تھا،[1]

کشمیر ایک مدت سے فن موسیقی کا گہوارہ ہے، لیکن ہمین علم ہی کہ یہان کس دایۂ کرم نے اسکی پرورش کی، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر (۸۷۷ھ) نے، وہ خود اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اور موسیقی دانون کا مربی تھا، ایران اور ہندوستان کے موسیقی دان اسکے دربار مین کھچے چلے آتے تھے، فرشتہ کہتا ہے:

آوازۂ جود او چون انتشار یافت، سازندہا و گویندہا کہ در علم موسیقی یگانۂ زمان بودند از اطراف و نواحی روے بکشمیر نہادند، چنانکہ کشمیر از کثرت ہندیان این فن رشک ملک زنگ شد، (۳۴۴ جلد دوم)

بودی بت (شاید صحیح دیوی پت ہو) وہ ایک طرف فارسی کا ادیب تھا، تمام شاہنامہ اسکو برزبان یاد تھا، دوسری طرف موسیقی مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، بادشاہ کے نام کی مناسبت سے زین نام اُس نے اس فن مین ایک کتاب لکھکر دربار مین پیش کی، بادشاہ نے اُسکو نہایت پسند کیا، اور اُسکے حال پر نوازش فرمائی،

ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی نسبت مین نے کہا ہے کہ وہ تنہا ہندوستان زادہ نہین ہے بلکہ مسلمان بادشاہوں کی خوش مذاقی نے ایران و توران و ہندوستان کو ملاکر ایک کردیا تھا، علاوہ قیاس کے ابوالفضل کی اس عبارت سے بھی یہ اشارہ سمجھنا چاہیے،

[1] شعر العجم مین راگ ورین کے حوالہ سے امیر خسرو و گوپال کا حال پڑھو، جلد دوم صفحہ ۱۳۵،

نادرہ کاران ہندی وایرانی وتورانی وکشمیری از مرد و زن عشرت افزاے بزم ہمایون (آئین ۱۸۲)

دربار اکبری مین مسلمان اساتذۂ فن کے ساتھ حسب ذیل ہندو مشاہیر کے نام بھی ہم دوش بدوش پاتے ہین، بابارام، سورداس، اور رنگ سین، میان تان سین اور میان چند کو جو چاہے سمجھیے[۱]، میان تان سین کی نسبت ابو الفضل نے لکھا ہے کہ ایک ہزار برس مین کوئی اسکے برابر کا پیدا نہین ہوا،

مسلمانون نے تو ہندوؤن کی موسیقی پر راگ درپن، اوچندر کا اور مدھنایک سنگار وغیرہ کئی کتابین لکھی ہین، مگر بھوپت راے کے علاوہ جس نے ۱۹ سنہ جلوس محمد شاہی مین رسالہ علم موسیقی لکھا اس فن کے دوسرے ہندو مصنف کا نام ہمکو نہین معلوم،

ذیل مین چند نام اخیر زمانہ کے استادوں کے آثار شعراے ہنود سے اضافہ کرتے ہین،

پنڈت اجودھیا پرشاد — کشمیری لکھنوی، حیرت تخلص، استاد جرأت کے شاگرد تھے، کئی دیوان اور مثنویان اُنسے یادگار رہین، فن موسیقی مین اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے، ۵۰ برس کی عمر مین سنہ ۱۲۳۲ھ مین وفات پائی،

موہن لال — دہلوی، ولد بخشی سلطان سنگھ کایستھ، فارسی و سنسکرت و طبابت و شاعری کے علاوہ موسیقی کے ماہر تھے، ایک خاص ساز کے موجد ہین،

روشن لال — شوق تخلص، موسیقی کے استاد تھے،

لچھمی داس — دہلوی، صمیم تخلص، سنسکرت کے عالم تھے اور فارسی سے واقف تھے فقیرانہ بسر اوقات کرتے تھے، طبابت کے علاوہ فن موسیقی کے استاد یگانہ تھے، دلّی کے شہزادہ مرزا قادر بخش طاہر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن مین لکھتے ہین،

"زبان فارسی سے بقدر ضرورت آگاہ، اور کتب ہنود علی الخصوص فن موسیقی کی پوتھیوں سے

[۱] یہ لفظ میان نو مسلم ہونیکی علامت کو ظاہر کرتا ہو۔

صاحب انتباہ، ستار بجانے مین ہوش سر سے اور جان تن سے نکال بتیا تہا، مین نے
اسکے نغمہ دلنواز کو اپنے کانون سے سُنا ہے اور اس کیفیت سے حظ دلخواہ اوٹہایا ہے
گاہ گاہ ریختہ کی طرف التفات کرتا تہا،

موسیقی ہندوستان کی چیز تھی، لیکن مسلمانون نے اپنا سرمایہ ملاکر اسکو اپنا کر دیا ہندو
موسیقی دان بھی اُنکا تلمذ خوشی سے قبول کرتے تھے، اس اخیر عہد مین استاذنا المرحوم مولانا
محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے بڑے بہائی مولانا **عنایت رسول** صاحب چریاکوٹی
جو اپنے وقت کے ہمہ دان فاضل تھے بلکہ بعض حیثیات سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی
خاک نے انکی نظیر نہین پیدا کی، وہ علاوہ دیگر علوم کے فن موسیقی کے بھی ماہر یگانہ تھے اور
علمی حیثیت کے علاوہ عملاً بھی اسکو جانتے تھے، اُنکے کئی ہندو شاگرد اس فن مین اب تک موجود
ہین، اور انکے نام کی عظمت کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہین،

مصوری

ہندوستان مین سنگ تراشی تو یقیناً قدیم زمانہ سے موجود تھی اور اسکی بہترین زندہ
مثالین، بودھون اور جینیون کی عمارتون اور معبدون مین مل سکتی ہین، ایلورا اور اجنتا وغیرہ کے
غار اب تک دنیا کے لئے تماشاے حیرت ہین، لیکن شبیہ کشی، طراحی اور رنگ آمیزی مصوری
کی نسبت نہین کہا جا سکتا کہ ہندوستان قدیم نے اس فن کو کہانتک سیکہا تہا اور نہ کسی
ہندی مصور کا نام معلوم ہے، جس نے اس فن مین کمال حاصل کیا ہو،

مسلمانون کی آمد کے بعد دیگر فنون لطیفہ کی طرح اس فن مین بھی ہندوؤن نے کمال
پیدا کرنا شروع کیا، اور چند روز مین یہ حال ہو گیا کہ بقول ابو الفضل ہندوستان کے صفحہ خیال
مین بھی جس نقش کمال کا تصور نہوا ہوگا وہ واقعاً ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر

جیسے ہندپرست کے عجائب خانہ مین قدیم ہندوستان کی صنعت مصوری کی کوئی یادگار نہ تھی ابوالفضل کی عبارت یہ ہے،

ہندرا چہ گویم کہ تصویر این معنی (مصوری مین کمال) بر صفحۂ خیال نکردہ بود، جہانا از اقالیم جہان کمتر نشان دہند، (صفحہ ،،)

یعنی جس ہندوستان کو اس فن کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا، اب دنیا مین بہت کم اس فن مین کوئی اسکا حریف نکلیگا، دربار اکبری کے مشہور ہندو مصورین کے نام یہ ہین بکیسو، لعل، مکند، مادہو، جگن، مہیش، کھیمکرن، تارا، سانولہ، ہربنس اور رام، بساون ایک ہندو مصور کی نسبت ابوالفضل لکھتا ہے،

بساون در طراحی و چہرہ کشائی و رنگ آمیزی و مانند نگاری و دیگر کارہاے این فن یگانۂ زمانہ شد، (صفحہ ،،)

دسونتھ ایک کہار بچہ تھا اسکو اس فن سے فطری مناسبت تھی، وہ محل شاہی کی دیوارون پر ادہر اودہر بچپن سے لکیرین کھینچا کرتا تھا، ایک دن اکبر کی نظر اسپر پڑگئی بجوہر قابل پاکر خواجہ عبدالصمد شیرین قلم کے سپرد کیا، تہوڑے ہی زمانہ کی تعلیم مین وہ اس فن کا بےنظیر استاد بنگیا،

جہانگیر تمام شاہان تیموریہ مین اس فن کا سب سے بڑا مربی اور قدردان تھا، بشن داس اسکے دربار کا مشہور مصور تھا، خود بادشاہ تزک مین اسکی تعریف مین لکھتا ہے۔

بشن داس مصورے کہ در شبیہ کشی از یکتایان روزگار است"

سنہ جلوس مین جہانگیر نے خان عالم کو عراق بھیجا تھا، بشن داس کو بھی اسکے ساتھ بھیجا کہ شاہ عباس صفوی اور اسکے دربار کی تصویرین کھینچکر لائے، یہ تصویرین اسقدر عمدہ کھینچی گئی تہین کہ جن لوگون نے ان اشخاص کو دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ اصل سے سرمو فرق نہین خود بادشاہ بھی

بشن داس کے اس کارنامہ کو تزک مین فخریہ لکھتا ہے اور مصور کے قلم کو داد دیتا ہے،

عبدالرحیم خانخانان کا کتبخانہ ایک عجائب خانہ تہا، اس عجائب خانہ کی سب سے حیرت انگیز چیز ایک ہندو مصور مادہو تہا (شاید یہ وہی ہو جسکا نام ایک دفعہ اوپر بھی آیا ہے) جسکی نسبت مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے کہ تصویر، طراحی، مصوری اور شبیہ سازی مین نادرہ روزگار تہا، اور اس کتبخانہ کی اکثر باتصویر کتابین اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیتن،

محمد شاہ کے زمانہ مین گوردہن دلّی مین ایک مصور رہتا تھا، انند رام مصنف مرآۃ الاصطلاح[۱] اسکی نسبت لکھتا ہے کہ "نرگس کی ایک پتی پر پورے شہر کی تصویر وہ کھینچتا تہا"

افسوس کہ ان استادون کو تاریخ کی زندگی نصیب نہین ہو سکتی تھی، اسلیے بجز ان لوگون کے جو سلاطین اور امرار کے دامن سے لپٹے رہتے تھے، اوروں کے نام تک بھی تاریکی کے پردہ مین گم ہین، ورنہ سینکڑون اساتذۂ وقت ہونگے جنکو قسمت نارسا ملی ہوگی لیکن دست و دماغ کی نارسائی کے وہ شاکی نہونگے،

اخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب

پورن سنگھ قوم کا یستھ، دہلی وطن، سعادت یار خان رنگین کے شاگرد تھے اور پورن تخلص کرتے تھے، علم سنسکرت اور طبابت ہندی مین مہارت کامل رکھتے تھے، مگر بدمزاجی اور وارستگی کے سبب بیمارون کی طرف کم التفات کرتے تھے، فارسی مین بھی دخل تہا،

لالہ کہیم نرائن کھتری مہاراجہ تکیت راے لکھنوی کے رفقا مین تھے، اخیر عمر مین نوابی کے بعد کلکتہ جاکر رہ گئے تھے، فارسی کے شاعر تھے طب مین بہت اچھا دخل رکھتے تھے مولوی حفیظ الدین تہید کے شاگردون مین تھے،

[۱] قلمی نسخہ پٹنہ کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، نہایت نادر کتاب ہے،

سُمن لال | قوم کایستھ سکسینہ، ولد بخشی سلطان سنگھ دہلوی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے
ایک لغت کے مصنف ہین، طبابت ہین شہرت رکھتے تھے،

تُلسی داس | سادہو تھے، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، دلّی وطن تھا، قلعہ کے شہزادون سے
ارتباط رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، صمیم تخلص تھا، طب ہندی مین امام تھے،
اور مجربات بیدک سے اکثر امراض مزمنہ کا علاج کرتے تھے، کشتون کے استعمال مین اور
جذام اور درج مفاصل وغیرہ کے علاج مین مہارت تامہ رکھتے تھے، موسیقی مین کمال
پیدا کیا تھا، فارسی زبان سے واقف تھے،

سکھانند | قوم کایستھ، دلی وطن، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد، شاعری کے علاوہ فنِ
طبابت میں "وحید العصر" تھے،

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

○ مسجد شہید گنج

○ ——— ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو ○ تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اس کی ایک مثال غدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں بھی ملتی ہے جب اجودھیا کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اس وقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اس وقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بیراگیوں / جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سالہ قبضہ کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ قبلۂ مسجد تھی اس لیے پھر ان کے حوالہ کی جائے، نامناسب ہے۔ بوٹا سنگھ کی گفت و شنید ہفتوں بلکہ مہینوں چلتی رہی ــــــ اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضہ کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے، ادھر مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا۔ لیکن واقعتہً مندر توڑنے کے احکام لے جانے والے دراصل توپ خانے سے لیس، امیر المجاہدین، اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق سے حملہ آور ہونے جا رہے تھے۔ ادھر توپ خانہ نصب کر دیا گیا، ادھر مجاہدین آراستہ ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی، سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہی، آج بھی مندر ہے ــــــ بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

اس کی دوسری مثال مسجد شہید گنج ہے، جو ۱۹۳۸ء کے فیصلے کے بموجب مسجد نہیں ٹھہرائی گئی، تو پاکستان بننے کے بعد آج بھی ۱۹۹۱ء میں بھی وہ مسجد نہیں ہے۔ اگرچہ آج کی اسلامی دنیا اسے مسجد شہید گنج کے نام سے ہی جانتی ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و امتیاز کا نشان ہے!

لیکن ــــــ کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!! بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو!! ایسا کر کبھی کبھی تو دل پھٹنے لگتا ہے!

لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!

بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیے۔

لیکن

پھر

چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینی چاہیے۔

یہ حصہ ہم نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی آپ بیتی اردو میں ہے رخشِ عمر سے لیا ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۸۶ء میں چھپی ہے، ــــــ مصنف ۳۶۔۱۹۳۵ء کی تحریک میں بطور طالب علم لیڈر پورے زور و شور سے شریک تھے اس لیے یہ چند صفحات دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔

ــــــــــــ ادارہ

ایک مہینہ بعد تحریکِ مسجد شہید گنج اُٹھی۔ اور اس شدت سے اٹھی۔ کہ مجلسِ احرارِ اسلام کی ساری ہر دلعزیزی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ اس سے پہلے، کہ احرار کی رسوائی اور بدنامی کی داستان قلمبند کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسئلے کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب لنڈا بازار میں دو سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی، جو مسجد عبداللہ خان کے نام سے مشہور ہوئی۔ کیونکہ اِسے لاہور کے کوتوال عبداللہ خان نے بنایا تھا۔ جس زمانے میں سکھوں کی شورش عروج پر تھی۔ پنجاب کے مغل گورنر معین الدولہ نے اُن کی سرکوبی شروع کی۔ اور مسجد کے قریب کوتوالی میں، کہ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی عہد میں سکھوں کا ایک رہنما بھائی تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔ جب سکھوں کے راج کا آغاز ہوا۔ تو انہوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنالی۔ جون ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے فیصلہ کیا، کہ مسجد عبداللہ خان (جو اب مسجد شہید گنج کے نام سے یاد کی جاتی تھی) کو مسمار کر کے گوردوارہ تعمیر کیا جائے۔ اس پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد گورنر سے ملا۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ اور برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد گرا دی۔ اس پر مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلوس اندرونِ شہر سے دہلی دروازے کے باہر پہنچا۔ تاکہ مسجد شہید گنج کی حفاظت کے لیے آگے بڑھے۔ پولیس نے صف بندی کی۔ لیکن جلوس صف بندی توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اور اس طرح پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا ایک خونیں تصادم شروع ہوا۔ جو اڑتالیس گھنٹے تک جاری رہا۔ مسلمانوں کی سرفروشی اور جانسپاری ملاحظہ ہو، کہ جب گولی چلی۔ انہوں نے سینے پر کھائی۔ دو دنوں میں دس دفعہ گولی چلی، تیرہ نوجوان شہید ہوئے۔ اور سینکڑوں زخمی۔ اس سے پہلے مولانا ظفر علی خان کی قیادت میں مجلسِ اتحادِ ملت کے نام سے ایک جماعت بن چکی تھی۔ جس میں ملک لال دین قیصر، ملک لال خان، میاں فیروز الدین احمد، سید حبیب اور دوسرے بزرگ شامل تھے۔ اس جماعت کا واحد مقصد یہ تھا، کہ مسجد شہید گنج واگذار کرائی جائے۔ جب مسجد منہدم ہوئی، تو یہ سب رہنما نظر بند کر دیئے گئے۔ اس دوران میں مجلس احرارِ اسلام خاموش رہی۔ اور اُس نے اِسے "پُر وقار سکوت" سے تعبیر کیا۔ لیکن اس سے اُس کا وقار مٹی میں مل گیا۔ اس خاموشی کی وجہ یہ تھی۔ کہ احرار آنے والے عام انتخابات میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور انہوں نے سوچا، کہ اگر ہم گرفتار ہو گئے۔ تو یہ سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ حکومت نے مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگذار کر دیا۔ جو پون صدی سے انگریزوں کے قبضے میں چلی آتی

تھی۔ لیکن یہ اشک شوئی شہید گنج کا داغ نہ مٹا سکی۔ مجلسِ اتحادِ ملت کے نیلی پوش رضاکاروں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اور ہزارہا رضاکار جیلوں میں چلے گئے۔ جب لیڈر قید تھے۔ کوئی ذمہ دار رہنما باقی نہ رہا۔ تو پہلے ایک نوجوان ابوسعید انور نے بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر کچھ دن سول نافرمانی چلائی پھر دو اور نوجوان ابھرے۔ ایک مولا بخش، دوسرا لیعسوب الحسن۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ حکام کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ احرار کو بڑی دیر کے بعد ہوش آئی۔ انہوں نے مسجد وزیر خان کو اڈا بنایا۔ اور سول نافرمانی کی تحریک چلا دی۔ اس کے پہلے جلسۂ عام میں میں بھی شریک تھا۔ وہاں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا۔ لیکن احرار کے موقف کا دلچسپ پہلو یہ تھا۔ کہ وہ بار بار اعلان کرتے کہ مسجد سول نافرمانی کے ذریعے سے نہیں مل سکتی۔ لیکن عوام کہتے ہیں۔ کہ مل سکتی ہے۔ اس لیے ہم سول نافرمانی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی احرار کے سُرخ پوشوں اور اتحادِ ملت کے نیلی پوشوں کے درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہوا۔ دہلی دروازے کے باہر سُرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جو شخص گذرتا۔ احرار اس کی قمیض اتار کر رنگ دیتے۔ موچی دروازے کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں تیار رہتی تھیں۔ لوگ دھڑا دھڑ آتے۔ اپنے کُرتے نیلے رنگ میں رنگتے اور سُکھا کر پہن لیتے۔ اُس زمانے میں بازاروں میں سُرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آتے تھے۔ اور "نظرا پالیٹکس" میں یہی موضوعِ عام تھا۔ ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظمؒ لاہور آئے۔ حکومت کے ساتھ گفت و شنید کی اس پر رہنما رہا کر دیئے گئے۔ اور سول نافرمانی بند کر دی گئی۔

اس دوران میں لاہور کے وکلاء نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے ایک مقدمہ بھی دائر کر رکھا تھا۔ لیکن یہ دعوےٰ خارج ہو گیا۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ۲۶ جنوری ۳۸ء کو یہ اپیل بھی خارج ہو گئی۔ لیکن اتفاقِ رائے سے نہیں، کثرتِ رائے سے، کیونکہ چیف جسٹس ینگ اور مسٹر جسٹس بھڈے نے یہ فیصلہ دیا۔ کہ جہاں تک قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے، وہ مستقل قانونی صورت لے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ مسجد شہید گنج میں نماز ادا کریں۔ تیسرے جج مسٹر جسٹس دین محمد نے اس فیصلے کے خلاف اختلافی نوٹ قلمبند کیا۔ اور اس رائے کا اظہار کیا کہ مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور وہ عام غیر منقول املاک سے مختلف نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔

مسجد شہید گنج کی تحریک میں عام نوجوانوں نے تو بہت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ لیکن جہاں تک طلبہ کا تعلق تھا۔ انہوں نے جماعتی حیثیت میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ بہرحال جس دن ہائی کورٹ نے فیصلہ صادر کیا۔ اُس سے اگلے دن اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ اور ہم نے پہلے اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں احتجاجی جلسہ کیا۔ اور اس کے بعد جلوس نکالا۔ بندۂ عاجز نے جلوس کی رہنمائی

کا فرض ادا کیا۔ کیونکہ میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اُس دن نمازِ ظہر کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسۂ عام ہونے والا تھا۔ اور شہر کے مختلف حصّوں سے جلوس نکل رہے تھے۔ اور سب کی منزل بادشاہی مسجد ہی تھی۔ ہمارا جلوس برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ نیلے کُرتے میں ملبوس مولانا ظفر علی خان بیس پچیس نیلی پوش رضا کاروں کے ہمراہ مل گئے۔ ہم نے اُنہی کو جلوس کا قائد بنا لیا۔ اس جلوس میں جہاں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، مسجد شہید گنج زندہ باد اور مولانا ظفر علی خان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ وہاں ایک نعرہ انگریزی زبان میں بھی لگتا تھا کہ WHAT DO YOU WANT?

SHAHEED GUNJ MOSQUE. یہ جلوس دہلی دروازے میں داخل ہوا۔ کشمیری بازار، ڈبی بازار، بزاز ہٹہ اور دوسرے بازاروں سے گذرتے گذرتے جب بادشاہی مسجد پہنچا۔ تو عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ اور ابھی دُوسرے جلوس آ رہے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر علی خان کو جلسے کی صدارت کرنی تھی۔ اور ہمارے جلوس کے وہی قائد تھے۔ اس لیے ہم لوگ اُن کے ساتھ ساتھ مسجد کے منبر تک پہنچ گئے۔ اور اُن کے اردگرد بیٹھ گئے۔ تلاوت قرآنِ حکیم کے بعد مولانا ظفر علی خان منبر پر کھڑے ہوئے۔ اور کہنے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہارے لیے ایک بشارت لایا ہوں"۔ ابھی اتنا کہا تھا کہ چاروں طرف اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کیا۔ اور فرمانے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہیں بشارت دیتا ہوں" کہ مسجد شہید گنج زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ لوگوں نے یہ تاثر لیا، کہ شاید واقعی حکومت نے مسجد واگذار کر دی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا۔ جانتے ہو! میں ایسا کیوں کہتا ہوں؟ آج میری آنکھوں نے ایک روح پرور نظارہ دیکھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ ہزاروں طلبہ ننگے سر دیوانہ وار آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے۔ WHAT DO YOU WANT? اور سب جواب دیتے ہیں۔ SHAHEED GUNJ MOSQUE تو اے لوگو! جب کسی قوم کے نوجوان کوئی فیصلہ کر لیں۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُن کی کامیابی میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میرا ایمان ہے۔ کہ مسجد شہید گنج مل کر رہے گی۔ وہ جانے عبرت ملاحظہ ہو کہ پاکستان بن گیا۔ لیکن مسجد شہید گنج واگذار نہ ہو سکی۔ وہی مسجد جسے دو سو سال پہلے انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ جہاں مدتوں بندگانِ خدا سجدہ ریز ہوتے رہے۔ جہاں اذان دینے کے لیے بیتالیس سال پہلے بہت سے مسلمان انگریزی کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ اور جس کی واگذاری کے لیے ہمارے رہنماؤں نے قید وبند کی

پروفیسر ظلّ الرحمن خاں (علی گڑھ) کا گرامی نامہ (۹۰/۷/۳۱)

محترمی بیدار صاحب السلام علیکم

...مسجد شہید گنج کا قصہ مجھے قصے ہی کی طرح معلوم ہے۔ اگر کسی کو سنجیدگی سے دلچسپی ہو تو اسے پھر قانونی کتابوں میں دیکھنا چاہیے۔ والد مرحوم نے "قصے" کی طرح سنایا تھا۔ آپ کو بھی اسی طرح سنائے دیتا ہوں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب کی بات ہے لیکن غالباً Twenties or Thirties کی بات ہوگی۔ القصہ مختصر یہ پہلے مسجد تھی جسے سکھوں نے زبردستی قبضہ کر کے گردوارہ بنالیا۔ کسی Stage پر مسلمانوں کے اسلامی جذبے نے زور مارا اور انھوں نے سب ثبوت فراہم کرلیے جس سے یہ ظاہر تھا کہ یہ مسجد تھی مگر یہ بہت برسوں سے گردوارہ ہو چکی تھی۔ عام چیزوں کے لیے تو قانون یہ ہے کہ اگر کسی کا قبضہ مخالفانہ (Adverse possession) ۱۲ سال سے زیادہ رہا ہے تو اسے ملکیت کے پورے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ سکھوں کا معاملہ یہ تھا کہ اگر اسے پہلے مسجد بھی مانا جائے تو قبضۂ مخالفانہ ہونے کی بنا پر اُسے گردوارہ باقی رہنا چاہیے۔

مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ مسجد چونکہ خدا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خدا کے خلاف قبضۂ مخالفانہ کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لیے وہ مسجد ہی رہی اور ان کو واپس ہونا چاہیے۔

مقدمہ تین ججوں کے ایک بنچ نے سنا جس میں ایک جج ہندو تھے جن کا نام Bhide تھا۔ یہ مہاراشٹرین تھے اور غالباً بلگام کے رہنے والے تھے۔ ایک مسلمان جج تھے جن کا نام غالباً کچھ بخش پر تھا، شاید اللہ بخش، خدا بخش یا کچھ ایسا۔ اور ایک انگریز جج تھا۔ مسلمان جج نے مسلمانوں کی رائے سے اتفاق کیا، ہندو جج نے شاید کچھ اس طرح لکھا کہ بحث کچھ بھی ہو، اگر اسے مانا گیا تو سارے ہندستان میں آگ لگ جائے گی اور یہ گڑے مردے کہاں تک اکھاڑے جائیں گے۔ انگریز جج نے جسٹس بھڈے سے اتفاق کیا اور اس طرح معاملہ سکھوں کے حق میں فیصل ہوا۔

والد مرحوم فرماتے تھے کہ اس وقت مسلمان اپنی بے وقوفی پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن دراصل یہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ یہ تھی کہانی جو میں نے سنی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کا ذکر اس زمانے میں نہیں آیا۔ آپ خدا کے واسطے لوگوں کو بھی بتائیں

••

اے گرفتار ابوبکر و علی

○ مناقب عمر بزبان علی — مناقب علی بزبان عمر

○ مصنف: علامہ زمخشری
ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی

پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس وہی صورت شیعہ سُنی مسئلہ کی ہے۔ عام شیعہ عام سُنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتے ہیں علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیروں کے درمیان ہے اور وہ اسلیے ہے کہ مفادات بنالیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو مفادات پر تو ضرب لگے گی ہی۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے، انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔

چنانچہ زمخشری احتشام کاندھلوی (دونوں ــ بڑے بھائی!) نے پہل کی، اس کی ہمیں خوشی ہے۔

ـــــــ ادارہ

○

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجہیز و تدفین سے فارغ ہو کر صحابہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت عمرؓ پہلے جمعہ کو صوف کا موٹا کرتا پہنے ہوئے جس میں ران پر اور مونڈھوں کے درمیان چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے اور ایک چادر مونڈھوں پر ڈالے ہوئے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور منبر نبوی پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اول حق تعالیٰ کی خوب حمد و ثنا کی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے لئے رحمت کی دعا مانگی اور بے اختیار رونے لگے حاضرین پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ حضرت عمرؓ روتے روتے غش کھا کر منبر پر گر پڑے اور چہرے پر خراش آئی لوگ غشی کی حالت میں آپ کو اُٹھا کر آپ کے گھر لے گئے چند روز آپ باہر نہ نکل سکے جب کچھ افاقہ ہوا تو گھر سے باہر جلوہ افروز ہوتے۔

حضرت عمر فاروقؓ دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے لوگوں کی خبر گیری کے لئے بازاروں اور گلیوں اور راستوں میں پھرا کرتے تھے۔ خدا کی قسم اُن کا دُرّہ تمہارے ان کوڑوں سے زیادہ ہیبت ناک اور خوف ناک تھا۔

حضرت عمرؓ یتیموں اور بیواؤں اور مسکینوں کی خبر رکھتے تھے، اُن کے پاس بیٹھتے اور ان کے ساتھ چلتے اور بوڑھوں اور بچوں پر کھڑے ہو کر پرسش احوال کرتے تھے۔ اور غلام کا حق آزاد سے، کمزور کا حق زور دار سے، مسکین کا حق زبردست سے، چھوٹے گروہ کا حق بڑے گروہ سے دلواتے اور جو کچھ کرتے اجر و ثواب کی خاطر، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتے تھے۔ اور دینی معاملہ میں کسی کی ملامت کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔

زہد و تقویٰ کے باعث اپنے لئے جو کی تین روٹیاں روزانہ مقرر کر رکھی تھیں جن کو کبھی

چربی سے تناول فرماتے تھے اور کبھی کبھی صرف نمک کی ڈلی سے کھاتے تھے جب اس تنگی کا مزاز رخشکی کا اثر زیادہ بڑھ گیا تو زیتون اور کھجور کا استعمال بھی شروع کر دیا چند مرتبہ تھوڑا سا گھی بھی کھایا اور دودھ بھی نوش فرمایا بھیس آپ کو زیادہ پسند تھا اور اونٹ کی گردن کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں جب حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات دیں اور مالِ غنیمت کی فراوانی ہوئی تو حضرت عمرؓ ہر جمعہ کو کچھ اونٹ ذبح کرلتے اور اچھا اچھا تمام گوشت مساکین، مہاجرین اور ضعفاء انصار میں تقسیم فرما دیتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے گردن کا گوشت رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے سے کہا کرتے تھے کہ بھوکا رہنا اس جہنم کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے جہاں ہمیشہ رہنا پڑے گا نہ وہاں موت ہے اور نہ وہاں سے چھٹکارا۔ اس میں راحت وخوشی کا نام نہیں اور وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں اور دوزخیوں کے لئے فرحت وخوشی کا کوئی موقع نہیں۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حقانیت چمک اُٹھی اور صداقت سر بلند ہو گئی نفاق کی آگ بجھ گئی اور کفر کی مشتعل چنگاریاں دھیمی پڑ گئیں۔ باطل مغلوب ہو گیا اور حق غالب آگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کا طریقہ عام طور پر پسندیدگی اور شوق ورغبت کے ساتھ رواج پکڑ گیا اور شیطان ناکام ونامراد ہو گیا۔

چنانچہ حضرت حسان فرماتے ہیں ؎

"یا کارھا عمر الفاروق مت کمداً"
"قد قام خیر عباد اللہ فی العرب،

حضرت عمر فاروقؓ کے ابتدا خلافت میں قحط پڑا اور ہر شے گراں ہو گئی جس کے باعث لوگ پریشان حال ہو گئے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے مویشی مرنے لگے۔ اس وقت حضرت عمر کو جو بھی غلہ میسر آتا تھا سب میں حصہ رسد برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ نہ اپنے حصہ میں کبھی زیادتی کرتے اور نہ کبھی اپنے کو ترجیح دیتے جو ناقدرگی اور تنگ حالی عام مسلمانوں کو لاحق تھی اسی میں آپ اپنے کو بھی مبتلا رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایک روز اپنا دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے مدینہ منورہ کے راستوں اور گلیوں

میں گھوم رہے تھے کسی کا کوئی کام ہوتا تو اس کو خود انجام دیتے تھے۔ کسی دوسرے کے حوالے نہ کرتے تھے۔ اسی دوران میں ایک انصاری بچہ پر گذر ہوا جو رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا "الٰہی عمر کے مقابلہ میں میری مدد فرما تو بھی اس پر ظلم کر"۔

حضرت عمرؓ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے اور دُرّہ لے کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت عمرؓ نے انا للہ پڑھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کی تکلیف کے باعث رونے لگے اور فرمایا کم بخت عمر

قَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا

تو نے ایک پاکیزہ جان کو بلا قصاص کے ہلاک کیا۔ بلاشک تجھ سے بہت برا کام سرزد ہو گیا۔

کل کو بارگاہِ خداوندی میں کیا عذر پیش کرے گا؟

پھر بچہ کے سر کو زمین سے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ لیا اور روتے رہے آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر بچہ کے چہرے پر گر رہے تھے۔ اتنے میں اور لوگ جمع ہو گئے اور حضرت عمرؓ کو اس حال میں حواس باختہ پریشان دیکھ کر رونے لگے پھر دریافت کیا امیرالمومنین کیا بات ہے؟ کیا ماجرا ہے؟ اور یہ کیا حادثہ پیش آیا؟۔

حضرت عمرؓ نے بچہ کا سارا قصہ بیان کیا اور اس کو مسجد میں لے جانے کا حکم فرمایا۔

پھر جب وہ بچہ ٹھیک ہو گیا تو آپ نے اس سے فرمایا میرے پیارے بچے کیا بات ہے جو تو عمرؓ کے مقابلہ میں خدا سے مدد مانگ رہا ہے؟ کیا عمرؓ نے تجھ پر کوئی ظلم کیا ہے؟ یا تیرا مال غصب کیا ہے؟ یا تجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچائی ہے؟ یا تجھے کسی خیر سے محروم رکھا ہے؟

بچہ نے جواب دیا خدا کی قسم ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی بات یہ ہے کہ میں ایک انصاری بچہ ہوں میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شہید ہوئے اور میرے چچا یوم حدیبیہ میں شہید ہوئے اور یہ جاں باز ہو کر جنگ میں شہید ہوئے بھاگتے ہوئے نہیں مارے گئے۔ اب آپ کی خلافت میں میں اور میری والدہ اور دو بہنوں نے آج تین شب و روز سے کچھ نہیں کھایا بھوک اور بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔

امیرالمومنین جو کچھ میری زبان سے نکلا اس کا باعث یہ تنگی اور سختی ہے جس کو میں نے بیان کیا۔

یہ حال سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے حاضرین بھی رونے لگے حتیٰ کہ عورتیں بھی گھروں میں رونے لگیں پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگو یہ دنیا دنیا والوں کا نہ اصلی گھر ہے نہ حقیقی قیام گاہ ہے اور آخرت اصلی ٹھکانہ ہے اور محل جزا اور سزا ہے جن صحابہ کا حافظہ قوی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے پاس نہ کوئی زائد کپڑا تھا اور نہ کوئی غیر مستعمل برتن تھا اور نہ کوئی دروازہ پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میدے اور گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور آخر تک کبھی آپ کے دسترخوان پر دو سالن نہیں کھائے گئے باوجودیکہ آپ کو حق تعالیٰ نے تمام مخفی خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی تھیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ نہ کبھی نیا کپڑا پہنا اور نہ کبھی عمدہ نفیس کپڑا استعمال فرمایا اور نہ مال و دولت ہی جمع کیا جس سے اہل و عیال گزر بسر کرتے اور نہ کبھی کوئی خادم و غلام رکھا اور دنیا سے اپنا دامن بچا کر صحیح و سالم تشریف لے گئے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور خود آپ سے سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے، جب فقر و تنگی کو آتے دیکھو تو کہو صالحین کی مرغوب پسندیدہ خصلت آرہی ہے۔ اور جب تونگری اور فراخی کو آتے دیکھو تو سمجھ لو کہ کوئی خطا سرزد ہوئی جس کی پاداش میں جلدی کی گئی ہے۔

غور سے سن لو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اس شخص میں اخوت اسلامی نہیں جو خود پیٹ بھر کر رات بسر کرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی ملک میں چالیس درہم سال بھر تک رکھے رہیں نہ کبھی ان کو راہِ مولیٰ میں خرچ کرے اور نہ کسی کارِ خیر میں صرف کرے اور کسی ضرورت مند محتاج سے بھی واقف ہو تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جبارین کی صف میں کھڑا کریں گے اور ان دراہم سے اس کو داغا جائے گا

لوگو خبردار ہو جاؤ تمہارا یہ مال و متاع قیامت کے دن تمہارے لیے باعث ننگ و عار ہوگا اور تمہیں دوزخ میں لے جائے گا۔

خوب سمجھ لو جو شخص اپنی ذات کے لئے مال جمع کرتا ہے اس کے اس مال ہی سے اس کی پیشانی اور پشت داغی جائے گی۔ مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔ البتہ جو شخص اپنے مال سے حقوق خداوندی ادا کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو سچ اور حق سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور خدا

کے خوف سے ڈرتا رہے اور اسی پر بھروسہ رکھے تو مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم سے بچ نکلے گا اور آگ اس کے حق میں مشتعل نہ ہوگی اور میں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب بھی اس کی نجات محض فضلِ رحمانی اور کرم ربانی سے ہوگی۔ تمھیں چاہئے کہ خیر کی طرف سبقت کرو امور خیر میں سبقت ہی باعثِ رشک سمجھو۔ ہمیں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے وہ غلط نہیں ہوسکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے قریب ہی قیصر و کسریٰ کے خزانے تمھارے ہاتھ آئیں گے ان کی اولاد تمھاری غلام ہوگی اور ان کی زمینوں اور گھروں اور شہروں اور مال و دولت کے تم وارث ہوگے اس وقت تم اپنے اعمال اور کردار پر قایم رہنا، مجھے امید ہے کہ یہ زمانہ قریب ہی آنے والا ہے انشاء اللہ پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اُٹھایا اور کہا

اَللّٰھُمَّ مِنْکَ الرَّجَاءُ — الٰہی تجھی سے امیدیں وابستہ ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دریافت کیا امیرالمومنین آپ نے جو کچھ بیان کیا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہاں"

حضرت عثمان رضی یہ سن کر روتے ہوئے مسجد سے باہر آئے اور کہتے جاتے، ابنِ عفان قیامت کے روز تجھے تیرے مال سے داغا جائے گا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اونٹ، بکری، سونا چاندی، غلہ کھجور لے کر پہنچے اور فرمایا، اللہ کی راہ میں یہ میرا ایک تہائی مال حاضر ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی اسی طرح اپنا تہائی مال لائے، پھر اور صحابہ نے مال لانا شروع کیا حتیٰ کہ تمام مسجد اور اس کے ارد گرد کی جگہ بھر گئی۔

امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رض نے اس مال کو لوگوں میں تقسیم کرا دیا اور اس بچہ کو بہت سا مال عطا فرمایا اور فرمایا عمر کے گھر والوں کو بھی حصہ رسد دوسروں کے برابر دینا۔ چنانچہ اس میں سے اونٹ کی گردن کا گوشت چند مٹھی کھجور اور تھوڑا سا آٹا امیرالمومنین کے حصہ میں آیا اور آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ اس کو جلد تیار کر کے خبر دیں۔

امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رض گھر والوں کے بلانے کے منتظر تھے کہ اتنے میں ایک بدوی آیا امیرالمومنین کو سلام کیا اور سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

امیرالمومنین نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ ارشاد فرمایا کہ بدویوں میں غلظت اور قساوت ہوتی ہے اس لئے کہ وہ نہ کتاب اللہ کو سیکھتے ہیں اور نہ ان کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے۔

بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سچ اور برحق ہے آپ صادق و مصدوق ہیں لیکن میں بدوی کیوں کر ہو گیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کی اور آپ کے سامنے جہاد کیا اور اکثر قرآن کا حافظ ہوں اور دینی امور میں کسی کا محتاج نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہماری اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے مجھے اس کا علم نہ تھا۔

پھر آپ اس بدوی اور دیگر حاضرین کو ساتھ لےکر گھر تشریف لے گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ستونوں پر چھت پڑی ہوئی تھی اور دسترخوان کی جگہ کھجور کے پتے بچھے ہوئے تھے سب بیٹھ گئے اور کھانا لایا گیا سب نے داہنے ہاتھ سے کھایا اور بدوی نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا یہ دیکھ کر امیرالمومنین کو طیش آگیا اور فرمایا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا ہے۔ تمھیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے شیطان اس کے کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔

بدوی نے کہا، آپ نے سچ فرمایا بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی لیکن اگر کسی شخص کے داہنا ہاتھ نہ ہو تو پھر وہ کس سے کھائے؟ اور اپنا داہنا ہاتھ نکال کر دکھایا جو کٹا ہوا تھا۔

امیرالمومنین نے شرمندہ ہو کر دریافت فرمایا یہ ہاتھ کو کیا ہوا؟ بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں کٹ گیا۔

پھر بدوی نے اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ میں اپنے اونٹوں میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے پاس اترنے کی درخواست کی آپ نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور میرے یہاں اتر گئے میں نے کھانا حاضر خدمت کیا آپ نے کھانا تناول فرمانے سے انکار فرمایا میں نے انکار کی وجہ دریافت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چونکہ تم مشرک ہو اس لئے میں تمھارے یہاں کا کھانا نہیں کھا سکتا میں نے عرض کیا اشهد ان لا الٰہ الا اللہ وانک رسول اللہ

اس کے بعد میں چند بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوا میں نے اس بارے میں چند اشعار بھی کہے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سنایا ہے۔

ع الا ان کفی فی رضا اللہ نالھا

"ضراب العدی فی اللہ من دون احمد"

وحلیت عن دین النبی الذی لہ

علی دلیل طار فی کل مشہد

فما انقطعت حتی رایت مکانھا

وفلقت ھامات العدی بالمھند

فان قطعت کفی فیا رب مشہد

شہدت بھا والسیف یقطر فی یدی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے پھر دریافت فرمایا تمہاری معاش کا کیا ذریعہ ہے؟

بدری نے کہا میرے پاس ایک لادو اونٹ ہے اس پر لکڑیاں لاد کر مدینہ لاتا ہوں اور ان کو فروخت کر کے اپنے کیثر اہل وعیال پر خرچ کرتا ہوں۔

امیرالمومنین نے دریافت فرمایا تمہارا داہنا ہاتھ تو ہے نہیں پھر لکڑیاں کس طرح اٹھاتے ہو؟

بدری نے کہا کسی مسلمان سے مدد لے لیتا ہوں داہنا ہاتھ وہ لگا دیتا ہے اور بایاں ہاتھ میرا اپنا ہوتا ہے۔ امیرالمومنین خدا کی قسم پہلے میں بہت قوی تھا لیکن اب بہت کمزور ہو گیا میری ہڈیاں نرم پڑ گئیں اور جسم کا گوشت سوکھ گیا۔

ع مطلب یہ کہ میرے ہاتھ کو جو کچھ دشمن کی طرف سے پہنچا اللہ کی رضا کے لئے اللہ کی راہ میں احمد مجتبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں پہنچا میں نے نبی برحق کے دین کی حمایت کی جس کی حقانیت ہر جگہ مجھ پر واضح ہو گئی۔ میرا ہاتھ اس وقت کٹا جب میں نے اس کا مقام علی دیکھ لیا اور دشمنوں کی کھوپریوں کو ہندی تلوار سے اڑا دیا۔ اگر میرا ہاتھ جاتا رہا تو کوئی حرج نہیں میں بہت معرکوں میں شریک ہو چکا جن میں میری تلوار میری ہاتھ میں تھی اور اس سے خون کے قطرے گر رہے تھے۔

امیرالمومنین نے اس کی امداد فرمائی اور اس کو ایک لاد نے اونٹ پر سوار کرایا اور کھانے اور کھجور کا توشہ ساتھ کیا۔

پھر ایک روز امیرالمومنین نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر بارش کی دعا کی اور جس تنگی میں مسلمان مبتلا تھے اس سے خلاصی کی التجا کی۔ دعا قبول ہوئی اور صبح ہونے سے پیشتر حق تعالیٰ نے بادل بھیجے کئی دن بارش کا سلسلہ جاری رہا اور تمام سرزمین سرسبز و شاداب ہو گئی

حضرت مثنیٰ ابن حارثہ نے جنگ فارس کی اجازت طلب کی۔ امیرالمومنین نے اس کے لئے ایک لشکر روانہ فرمایا اور حق تعالیٰ نے قادسیہ کو فتح کرا دیا۔ پھر متواتر فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مال و دولت کی انتہائی فراوانی ہو گئی اور مسلمان خوشحال فارغ البال ہو گئے۔ رجسٹر مرتب کئے گئے اور سب کے وظائف مقرر کئے گئے۔ پھر جب حق تعالیٰ شانہ نے امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں صحابہ کرام کے ہاتھوں ملک شام ملک عراق ملک مصر فتح کرا دیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے منتخب اور چیدہ صحابہ عظام کو امرا متعین فرما کر اطراف ممالک میں انتظام کے لئے روانہ فرمایا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وصال کا وقت قریب آگیا تو آپ نے مجھے بلایا اور اپنے سر کے قریب بٹھا کر فرمایا جب میں مر جاؤں تو تم مجھے اپنے ان ہاتھوں سے غسل دینا جن سے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا تھا۔ پھر کفن پہنا کر حجرۂ اطہر وانور پر لے جانا اگر دروازہ خود بخود کھل جائے تو مجھے جوار نبی میں دفن کر دینا ورنہ وہاں سے لوٹا کر عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ پھر جو بھی حق تعالیٰ فیصلہ فرما دیں۔

وہ احادیث جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کا تذکرہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سامنے سے آتے نظر آئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

علیؓ یہ دونوں انبیاء و مرسلین کے بعد تمام اگلے پچھلے ادھیڑ عمر اہل جنت کے سردار ہیں۔

لیکن علی تم ان کو اس کی اطلاع نہ کرنا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آیت وجبرئیل وصالح المومنین الخ میں صالح مومنین علی بن ابی طالب اور ابوبکرؓ اور عمرؓ مراد ہیں۔ حضرت ابو عطاردی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ دونوں نے بیان کیا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا میرے بعد میری امت میں سب سے افضل ابو بکرؓ ہیں ان کے بعد پھر عمرؓ سب سے افضل ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی پر سہارا دیے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علی ان سے محبت رکھنے والا جنت میں جائے گا"۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر کسی کو بھیجنا چاہتے تھے اس وقت آپ کے دائیں اور بائیں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ ان میں سے ایک کو بھیج دیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میں ان کو کس طرح بھیج سکتا ہوں۔ یہ دونوں تو دین کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں"۔

یعنی ان دونوں حضرات کا وجود دین کے لئے خاص اہمیت اور شان رکھتا ہے جس کے فقدان سے دین میں نمایاں کمی اور خرابی محسوس ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے کچھ خصوصی معاون و مددگار رفیق کار ہوتے ہیں اور مجھے حق تعالیٰ نے چودہ معاون و مددگار، رفقاء کار عطا فرمائے جن میں سات قریشی ہیں۔ علیؓ۔ حسنؓ۔ حسینؓ۔ حمزہؓ۔ جعفرؓ۔ ابو بکرؓ۔ عمرؓ۔

اور سات انصاری ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سلمانؓ۔ ابو ذرؓ۔ مقدادؓ۔ حذیفہؓ۔ عمارؓ۔ بلالؓ۔ رضی اللہ عنہم۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا اگر تم ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو ان کو دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا مشتاق پاؤ گے۔ اور اگر عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو ان کو زور دار امانت دار پاؤ گے۔ اور اگر علیؓ کو خلیفہ مقرر کرو گے تو وہ تمھیں سیدھی راہ پر قائم رکھے گا اور حق پر چلائے گا۔

(ف) ارشادِ نبوی سے خلفاء راشدین کی ترتیب خلافت اور ذاتی خصوصیات اور ان کی اہم دینی خدمات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے ان کے دورِ خلافت میں صحابہ ہی صحابہ کا ہر سو جلوہ ہوگا اور یہ نجوم شریعت ہر طرف رونق افروز ہوں گے، اس وقت ان کی رہنمائی اور رہبری کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کی ضرورت ہوگی جو زہد و تقویٰ کا مجسم ہوں گے اور آخرت کے سراپا مشتاق و منتظر اور بے قرار تاکہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرام کا اصلی رنگ قائم رہے۔

پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوں گے اسلام اور مسلمین کو عروج و فروغ ہوگا۔ فتوحاتِ اسلامی میں افزونی اور مال و دولت کی فراوانی ہوگی اس وقت ان کو قابو اور اعتدال میں رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ کی ضرورت ہوگی جو اپنی سخت گیری اور امانت داری سے خود بھی متاعِ دنیوی سے محفوظ اور مامون رہیں گے اور دوسروں کو بھی محفوظ اور مامون رکھیں گے اور دنیا کی بہتات کے باوجود دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق قائم رہے گا۔

پھر فتنوں کا آغاز ہوگا اکثریت غیر صحابہ کی ہوگی اور انھیں کو غلبہ اور قوت ہوگی جس پر قابو پانا اور حق پر قائم رہنا دشوار ہوگا۔ یہ خدمت حضرت علیؓ انجام دیں گے اور استقلال کے ساتھ خود بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے اور دوسروں کو بھی قائم رکھیں گے۔ ارشادِ نبوی میں دورِ عثمانی کا تذکرہ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ کلمات طیبات ارشاد فرمائے کہ تم علیؓ کو عمر کے بعد خلیفہ نہ بناؤ گے پھر جب خلیفہ بناؤ گے تو ان کی یہ خصوصیات سامنے آئیں گی۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں حضرت علیؓ کے اقوال

ایک قریشی حضرت علیؓ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ "امیر المومنین آپ ابھی منبر پر فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اَصلحنی بما اصلحت بہ الخلفاء الراشدین المھدیین۔

وہ خلفاء راشدین کون ہیں؟

حضرت علیؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے اور فرمایا تیرے حبیب اور چچا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں امام ہدیٰ اور شیخ الاسلام اور قریشی تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقتدیٰ بنے۔ جس نے ان کی اقتدا کی محفوظ ہو گیا۔ اور جس نے ان کا اتباع کیا صراطِ مستقیم تک پہنچ گیا اور جس نے ان کا پلہ پکڑ لیا وہ حق تعالیٰ کی جماعت میں داخل

ہو گیا حزب اللہ ھم المفلحون حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا واللہ تم ایک واقف کے پاس آتے ہو۔ دونوں امام ہدیٰ تھے۔ اور راہِ راست اور صراط مستقیم پر چلانے والے مصلح قوم اور فایز المرام تھے۔ یہ دونوں حضرات فارغ البال صحیح وسالم دُنیا سے تشریف لے گئے۔

عبدِ خیر سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قیامت تک جس قدر حکام و سلاطین آئیں گے حق تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اُن کے لئے راہبر اور حجت بنا کر بھیجا ہے۔ یہ حضرات بہت پہلے تشریف لے گئے اور اپنے پسماندگان کو خوب تھکا دیا۔ ان کا تذکرہ امت کے لئے موجب رنج و غم ہے اور سلاطین کے لئے باعث طعنہ۔

حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں حضرات ان ستر آدمیوں میں سے ہیں جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوئے تھے۔

عبد الرحمن بن ابزیٰ کے صاحبزادہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازہ کے ساتھ تھے حضرت علیؓ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جنازہ کے آگے تھے۔ حضرت علیؓ فرمانے لگے یہ دونوں حضرات جانتے ہیں کہ جنازہ کے پیچھے چلنے والے کی فضیلت آگے چلنے والے پر ایسی ہے جیسے جماعت سے نماز پڑھنے والے کی تنہا نماز پڑھنے والے پر لیکن ان کے مزاج میں سہولت ہے لوگوں کے لئے سہولت پسند کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ بہت آہ کرنے والے اور رقیق القلب تھا اور حضرت عمرؓ خالص اعتقاد رکھتے تھے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ خلوص کا معاملہ کیا۔

حضرت علیؓ نے منبر پر فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبقت کی حضورؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ تھے وہ بھی تشریف لے گئے تیسرے درجہ پر حضرت عمرؓ تھے وہ بھی رخصت ہوئے ان کے بعد اب فتنوں سے سابقہ پڑ گیا۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص بتاؤں۔ حاضرین نے عرض کیا ہاں بتلایئے آپ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔

عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا سب انبیاء علیہم السلام میں بہتر طریق پر رسول اللہ صلعم کا وصال ہوا حضور کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا اور آپ کی سنت پر چلے اور باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر ان کی وفات ہوئی۔ اور آپ حضور کے بعد اس امت میں سب سے افضل تھے ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کیا اور ان کی سنت پر چلے باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر وفات پائی اور حضرت عمرؓ اس امت میں حضور اور حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ سب سے افضل ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا امت محمدیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے افضل ہیں۔ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ تیسرے درجہ میں حضرت عثمانؓ ہیں۔

حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؒ نے پھر کہا اے باپ تیسرے درجہ میں آپ ہیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اے بیٹے تمھارا باپ تو عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہے جو کچھ اُن کے لئے ہے وہی اس کے لئے ہے اور جو مواخذہ ان سے ہوگا وہی مواخذہ اس سے ہوگا۔

حضرت علیؓ کا اُن لوگوں کی تردید کرنا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بُرا کہتے ہیں یا حضرت علیؓ کو ان پر فوقیت دیتے ہیں

حضرت علقمہؒ نے کوفہ کے منبر پر ہاتھ مار کر کہا کہ حضرت علیؓ اس منبر پر وعظ فرما رہے تھے۔ اثناءِ تقریر میں فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اشخاص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر مجھے فوقیت دیتے ہیں اگر میں پہلے ممانعت کر دیتا تو ضرور اس کی سزا دیتا لیکن میں اعلان سے قبل سزا دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شخص نے آیندہ یہ خیالات ظاہر کئے اور میرے روبرو پیش کیا گیا تو چونکہ یہ شخص مفتری ہے لہذا اس کو مفتری کی سزا دی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، پھر عمرؓ، پھر واللہ اعلم کون ہے۔ اس لئے کہ ان کے بعد ہم نے نئی نئی باتیں گھڑی کر دیں جن میں حق تعالیٰ جو چاہے فیصلہ فرمائے۔

محبت اور عداوت میں حد سے نہ بڑھنا چاہیئے ممکن ہے کہ دوست دشمن ہو جائے اور

دشمن دوست ہو جاتے۔ (اور تمھیں اس کے باعث ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے)
حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن سبا ان کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر فوقیت دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا میں نے اس کے قتل کا ارادہ کر لیا ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ ایسا شخص جو آپ سے محبت رکھتا ہے اور آپ کو افضل سمجھتا ہے آپ اس کو قتل کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا واللہ جس شہر میں میں ہوں یہ وہاں نہیں رہ سکتا اور اس کو شہر بدر کر دیا۔
حضرت علیؓ ایک دن کوفہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ ایک شخص نے عرض کیا اے خیر الناس میرے معاملہ میں غور کیجئے واللہ میں نے آپ سے بہتر آدمی نہیں دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس شخص کو سامنے پیش کرو۔ وہ سامنے حاضر ہوا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے اس نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو دیکھا ہے اس شخص نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیکھا ہے تو صرف تنبیہ و تہدید کرتا لیکن جب ایسا نہیں تو جو چاہے کہتا پھر۔

سوید بن علقمہ سے مروی ہے کہ میں ایک مجمع پر سے گذرا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تنقیص کر رہے تھے۔ میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ بعض شیعہ کے پاس سے گزر ہوا جو شیخین کا ذکر کر رہے تھے۔ اور ان کی تنقیص کر رہے تھے۔ اگر وہ یہ نہ سمجھتے کہ آپ ان کے ہم خیال ہیں اور اس خیال کو پوشیدہ رکھتے ہیں تو ہرگز ایسی جرأت نہ کرتے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا خدا کی پناہ میں اور ان کی نسبت خوبی اور بھلائی کے سوا کچھ بھی دل میں رکھوں۔ اُس شخص پر خدا کی لعنت جو ان کے متعلق خوبی اور بھلائی کے علاوہ کوئی خیال پوشیدہ رکھے یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور وزیر تھے۔ پھر آپ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر سے نکلے اور منبر پر چڑھے۔ آپ کے آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور ڈاڑھی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور اس کو دیکھ رہے تھے (اور ڈاڑھی سفید ہو گئی تھی) جب لوگ جمع ہو گئے آپ کھڑے ہوئے اور ایک بلیغ مختصر خطبہ پڑھا اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو سرداران قریش کو جو مسلمانوں کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہو جن سے میں بری

ہوں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور ان کے اس قول کی سزا دینے والا ہوں ۔ اس ذات پاک کی قسم جس نے دانہ کو شق کیا اور ہر ذی روح کو پیدا کیا ۔ مومن پرہیزگار ہی ان سے محبت کرتا ہے اور فاجر و بدکار ہی ان سے کینہ رکھتا ہے ۔ ان دونوں حضرات نے صدق و وفا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا ۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور سزائیں دیتے تھے ۔ اور جو کچھ کرتے تھے اُس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے ہرگز تجاوز نہ ہوتا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کی رائے کی برابر کسی کی رائے نہ سمجھتے تھے ۔ اور ان جیسی محبت بھی کسی سے نہ فرماتے تھے ۔ حضورؐ ان سے خوش تشریف لے گئے ۔ اور مسلمان بھی ان سے خوش رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نائب بنایا ۔ جب حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو بلا لیا تو مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور زکوٰۃ ان کے حوالہ کی اس لئے کہ زکوٰۃ اور نماز کا اسلام میں ایک درجہ ہے ۔ (جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے اپنا قائم مقام بنایا تو زکوٰۃ لینے میں بھی آپ کے قائم مقام ہوں گے) بنو عبدالمطلب میں میں پہلا شخص تھا جس نے ان کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں ۔ بعض لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بعض کا زکوٰۃ دینا بھی کافی ہے خدا کی قسم آپ مابقی لوگوں میں سب سے افضل اور نرم دل اور رحیم اور متقی اور متقدم الاسلام تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نرمی اور رحم دلی میں حضرت میکائیل علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور عفو و وقار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت ابوبکر آخر وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلتے رہے ۔ اور اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا ۔ اس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ کیا کچھ لوگ حضرت عمرؓ کی خلافت سے ناخوش تھے اور میں ان لوگوں میں تھا جو خوش تھے ۔ واللہ حضرت عمرؓ اس وقت تک دنیا سے تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ ناپسند کرنے والے بھی ان کو پسند نہ کرنے لگے ۔ حضرت عمرؓ نے ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کا اتباع کیا اور ان کے آثار پر اس طرح چلے جیسے بچہ اپنی ماں کے نشاناتِ قدم پر چلتا ہے ۔ واللہ حضرت عمرؓ ماقی لوگوں میں سب سے بہتر اور نرم دل اور رحیم اور ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کرنے والے تھے حق تعالیٰ نے ان کی زبان پر حق بات جاری کر رکھی تھی ۔ جب بولتے تو ہم سمجھتے ایک فرشتہ ہے جو عمرؓ کی زبان سے بول رہا ہے ۔ حق تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے اسلام کی وجہ سے اسلام کو عزت

دی اور ان کی ہجرت کو دین کی مضبوطی کا باعث بنایا۔ اور مومنوں کے قلوب میں ان کی محبت اور کافروں اور منافقوں کے دلوں میں ان کی ہیبت پیدا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن پر سختی اور بدخلقی میں ان کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور اور غیظ و غضب میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ۔ کیا تمھارے پاس ان جیسا کوئی ہے؟ کوئی شخص بغیر ان سے محبت کئے اور بغیر اُن کا اتباع کئے اُن کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے اور میں اس سے بری ہوں۔ اگر میں پہلے اس کی ممانعت کر دیتا تو اس وقت سخت سزا دیتا۔ البتہ آئندہ جو شخص اس خیال کا میرے پاس لایا جائے گا اس کو وہ سزا ملے گی جو مفتری کو ملنی چاہیئے۔

کوفہ میں ایک شخص حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو شیخین کو بُرا کہتا تھا حضرت علیؓ نے اپنے غلام سے فرمایا اے قنبر اس کی گردن اڑا دو۔ اس شخص نے عرض کیا آپ میری گردن کیوں اڑواتے ہیں۔ میں تو آپ کی ہی وجہ سے ان پر غصہ ہو رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ کیوں کر؟ اس شخص نے عرض کیا میں ایک غریب آدمی ہوں جس کو رسول اللہ صلعم کی صحبت میسر نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رتبہ حضور کے یہاں کیا تھا۔ اور تمھارے یہاں اُن کی کتنی عظمت ہے۔ البتہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا جو اکثر آپ کے پاس آتے جاتے ہیں وہ آپ کو ان دونوں سے افضل بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے ظلماً آپ کی حق تلفی کی اور پہلے خود خلیفہ بن گئے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا، کیا تو ان لوگوں کو جانتا ہے، اس شخص نے جواب دیا نام نہیں جانتا مگر ہاں صورت دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا واللہ خدا و رسول کے حکم سے یہ دونوں مجھ سے پہلے خلیفہ بنے اور مجھ پر ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا۔ اور اگر تو اپنی غربت اور شیخین کی نسبت اپنی کم علمی کا اعتراف نہ کرتا تو میں اس وقت تیری گردن اڑا دیتا۔ پھر غلام سے فرمایا اے قنبر نماز کے لئے منادی کر دو۔ اور ظہر کا وقت تھا لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے اول نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی کما حقہ حمد و ثنا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسا چاہیئے تھا درود و سلام بھیجا۔ اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔ حق عزوجل نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے وقت بھیجا جب کہ اسلام پرانا ہو گیا اور دین کی رونق جاتی رہی تھی اور کفر کی وجہ سے ظلمت

پھیل گئی تھی اور لوگ زمانہ جاہلیت کی گمراہیوں میں پڑے ہوئے بتوں کی عبادت اور مورتیوں کی تعظیم کرتے تھے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کا انکار کرتے تھے۔ ایسے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک اللہ ذات پاک کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لوگوں نے حضور کو جھٹلایا اور کہا اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی تصدیق کی اور میں اُس وقت بچہ ہی تھا اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتا تھا اور رسول اللہ صلعم کی پرورش اور آپ کے گھر میں رہتا تھا۔ اس حالت میں حضرت ابوبکرؓ ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ رہے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہے اور ان کو ڈراتے دھمکاتے لیکن خود ان کے ڈرائے سے نہ ڈرتے تھے۔ اور امورِ دین کو کھلم کھلا کرتے۔ اور اپنے ایمان کو نہ چھپاتے۔ حتیٰ کہ قریش کہنے لگے کہ ابن ابی قحافہ تو مجنوں ہو گیا۔ اسلام کے لئے ابوبکرؓ ہی احق اور اولیٰ تھے۔ رسول اللہ صلعم کو ان سے زائد کسی سے محبت نہ تھی۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حضورؐ کے بعد ان سے زائد صاحب اکرام کوئی نہیں اور نہ کوئی شخص دُنیا و آخرت میں ابوبکرؓ سے بہتر اور افضل ہے۔ بعض لوگ مجھے شیخینؓ سے افضل کہتے ہیں ان کے قلوب میں بقیہ نفاق ہے اور اس سے ان کا مقصود مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا اور امتِ محمدیہ میں اختلاف پیدا کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حال پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا اور ان کے قتل کا حکم فرما دیا تھا۔ اور قریب ہی آخر زمانہ میں ان کی حکومت ہو گی جس میں خسران و نامرادی کی آفت بڑھ جائے گی۔ اور شریر روافض کی تبلیغ کو عروج ہو گا۔ اور ان کے مخالف ذلیل ہوں گے۔ حق مٹ جائے گا۔ اور رفض و بدعت اور گناہ و بدکاری کھلم کھلا ہو گی۔ اور دولت سب ان کے پاس منتقل ہو جائے گی۔ عزت ان کو حاصل ہو گی اور ان کی سوء حالی نرم پوشاک اور عمدہ لباس سے بدل جائے گی۔ اس وقت جو لوگ علانیہ بھائی بھائی ہوں گے وہ باطن میں دشمن ہوں گے۔ کذب ان کے نزدیک خوبی ہو گا اور بدکاریاں ان سے ظاہر ہوں گی۔ اور باوجود مغلظ قسموں کے عہد و پیماں کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور نقضِ عہد کریں گے۔ قرآن کو بغیر سوچے و سمجھے پڑھیں گے۔ اور معارف و علوم کو لغویات سے بدل لیں گے۔ مصاحف کو معطل اور بے کار کر دیں گے۔ اور پے در پے معاصی کریں گے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب و شتم ان کی بُرائی ان لوگوں کا مذاق ہو گا اور صحابہ کے اُن واقعات کا اتباع کریں گے جن کو حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے۔ اس سے مقصود صحابہ

کی تضحیک اور توہین ہوگا، یہ باتیں چھوٹا بڑے سے سیکھے گا اور انہی خیالات میں نشوونما ہوگا۔ پس سنت مٹ جائے گی اور بدعت کا احیاء ہوگا اس زمانہ میں جو شخص متبعِ سُنت ہوگا۔ وہ افضل الشہداء اور افضل العباد اور افضل المجاہدین ہے۔ ان کے لئے بشارت ہے۔ ان کی مصیبت کس قدر بڑی ہوگی۔ اس زمانہ میں بچہ سے زائد بڑا بلا میں مبتلا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے ان کے ایمان کو کم کر دیا اور ان کے اعمال برے کر دیئے جس سے خدا کی زمین ان پر غضب ناک ہوگی اور آسمان بادلِ ناخواستہ ان کو سایہ کرے گا۔ اور تختہ زمین پر کوئی شخص عند اللہ ان سے زائد مبغوض نہ ہوگا۔ ان کی علامات بہت ہیں۔ جن سے یہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ جماعت کا چھوڑنا اور سلفِ صالحین میں گفتگو کرنا۔ اور نماز میں تاخیر کرنا اور سنت کی تردید کرنا۔ اور آثارِ صحابہ کو نہ ماننا۔ اور کفار سے یگانگت۔ اس وقت ان کے سلاطین کا لباس حریر و دیباج ہوگا۔ اور مغنیات کو رکھیں گے حکمتوں کی خرید و فروخت کرنا اور دین کا ضائع کرنا اور زنا کو حلال سمجھنا اور سود کھانا اور آزاد کی خرید و فروخت اور دین اور متبع سنت کا مذاق اڑانا۔ اور مرگ مفاجات۔ اور بازاروں میں عورتوں کی خرید و فروخت اور راستوں کا بند ہونا۔ اور ذمیوں کا حاکم ہونا۔ اور اہل مذہب کی ذلت اور کمینوں کا سوار ہونا اور غریب کا قتل اور غلاموں کا دولت مند ہونا۔ اور مخنثوں کی کثرت اور عورتوں کا سوار ہونا۔ اور بلند و پختہ عمارتیں بنانا اور اہل ہوی اور اہل بدعت کی طرف طبیعتوں کا مائل ہونا اور صاحب ثروت کی تعظیم کرنا۔ اس زمانہ کے علماء آسمان کے نیچے رہنے والوں میں سب سے زائد شریر ہوں گے۔ انہی سے فتنہ و فساد نکلے گا اور ان کی طرف لوٹ جائے گا عالم ملکوت میں ان کا نام ارجاس (   ) والماس (   ) ہوگا۔ جب اصحاب رسول اللہ صلعم کو محفلوں اور مجلسوں اور مسجدوں میں لعنت کی جائے گی اور لوگ اس کو اپنا شعلہ بنائیں گے تو حکمت سینوں سے نکل جائے گی اور ایک سبز و سرخ ہوا نازل ہوگی جس سے حق تعالیٰ ان کو بندر اور سور کی شکلوں میں مسخ کر دیں گے۔

لوگوں نے عرض کیا اے امیرالمومنین اگر ہم اس زمانہ کو پائیں تو کیا کریں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا ایسے رہنا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے رفقاء رہے اور صبر کرنا۔ اور جس راستہ پر ہم ہیں اس پر استقامت سے قائم رہنا اور حق تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

اور صحابہ کی محبت کا حکم فرمایا ہے۔ تم اس پر جمے رہنا۔ اور روافض کے پاس اُٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا، ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا کہ جنگلوں میں چلے گئے اور مشقتوں کو برداشت کیا۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ حق اور سنت پر مرنا بدعت اور عصیان کی حیات سے بدرجہا بہتر ہے۔ خوب سمجھ لو کہ نبی صلعم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ پھر عثمانؓ ذوالنورین اور پھر میں ہوں۔ میں نے تمہارے روبرو اور تمہاری پیٹھ پیچھے یہ صاف صاف کہہ دیا اب تمہیں مجھ پر حجت کی گنجائش نہیں۔ اور میں اللہ بالا و برتر سے اپنے اور تمہارے اور تمام مسلمان بھائیوں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

وہ احادیث جو حضرت علیؓ کے فضائل میں

حضرت عمرؓ سے مروی ہیں

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جنگ خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کل ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ اور رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ شخص حملہ آور ہے۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ حق تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح دیں گے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کے دائیں جانب اور حضرت میکائیل علیہ السلام اس کے بائیں جانب ہوں گے۔ یہ شب ہر مسلمان نے اس خواہش میں گذاری کہ وہ شخص میں ہوں۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا علی بن ابی طالب کہاں ہیں نظر نہیں آتے۔ لوگوں نے عرض کیا وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت علیؓ خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا مجھ سے قریب ہو۔ وہ قریب ہو گئے۔ پھر حضورؐ نے ان کی آنکھوں میں تھوکا اور آنکھوں کو اپنے دست مبارک سے ملا اور حضرت علیؓ حضورؐ کے سامنے سے ایسے اُٹھے کہ گویا آنکھ دُکھنے ہی نہ آئی تھی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تین فضیلت ہیں اگر ان میں سے ایک بھی میرے لئے ہو تو مجھے سُرخ اونٹوں (ہر نعمت) سے زائد محبوب ہے۔ حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے

نکاح - اور حضرت علیؓ کا رسول اللہ کے ہمراہ مسجد میں رہنا۔ کہ مسجد سے حالت جنابت میں گزرنا جیسا حضورؐ کے لئے جائز تھا، حضرت علیؓ کے لئے بھی جائز تھا۔ اور جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کو جھنڈا دینا۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حضرت علیؓ کو گالی دیتے ہوئے سنا تو فرمایا۔ میرے خیال میں تو منافق ہے۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم میرے ایسے قائم مقام ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے۔ لیکن چوں کہ میرے بعد نبوت ختم ہو گئی لہذا تم نبی نہ ہو گے۔

جب حضورؐ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ کو عورتوں اور ضعفار کی خبر گیری کے لئے مدینہ چھوڑ دیا۔ منافقین نے طعنہ دیا کہ حضور نے بزدلی کے باعث ان کو چھوڑا۔ جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو تلوار وغیرہ لے کر چلائے اور مقام حرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے اور عرض کیا کہ منافقین کا خیال ہے۔ حضورؐ نے اس کی تردید کی اور فرمایا تم بمنزلہ ہارون علیہ السلام کے ہو۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام میقات کو جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا گئے تھے ایسا ہی میں تمہیں اپنا نائب بنا کر لڑائی کے لئے جا رہا ہوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں نبی تھے۔ اب چوں کہ نبوت ختم ہو چکی لہذا تم میری عدم موجودگی میں نبی نہ ہو گے بلکہ صرف میرے قائم مقام ہو گے۔ اور حضرت علیؓ کو واپس کر دیا۔ اس حدیث سے حضرت علیؓ کا مستحق خلافت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال سے چالیس سال قبل ان کا وصال ہو گیا تھا۔ البتہ حضرت علیؓ کے خلیفہ نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسا حضرت ہارون علیہ السلام میقات کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ ہوئے ایسا ہی تم بھی زمانہ سفر میں میرے خلیفہ ہو۔ اور جیسا ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے ایسا ہی تم بھی میرے بعد میرے خلیفہ نہ ہو گے۔

جب وفد ثقیف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان سے فرمایا تم اسلام لے آؤ۔ ورنہ حق تعالیٰ میری طرف سے ایسا شخص بھیجے گا جو تمہاری گردنیں اڑا دے گا اور تمہارے بچوں کو قید کرے گا اور تمہارے مال و دولت کو چھینے گا۔
حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے اس روز کے علاوہ کبھی امارت کی تمنا نہیں کی اور میں اپنا سینہ باہر نکال کر بار بار سامنے آتا تھا کہ شاید حضورؐ یہ ارشاد فرما دیں کہ وہ شخص یہ ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "وہ شخص یہ ہے وہ شخص یہ ہے"

وہ شخص حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور پوچھا باندی کی طلاق کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کچھ لوگ حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے اُن میں ایک شخص تھا جس کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہ تھے۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس گئے اور پوچھا مملوکہ کی طلاق میں تمہارا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا "دو طلاق ہوں گی"۔ ان میں سے ایک شخص بولا آپ امیر المومنین ہیں اس لئے ہم آپ کے پاس آئے اور طلاقِ مملوکہ کا مسئلہ پوچھا اور آپ نے ایک دوسرے شخص سے پوچھ کر جواب دیا۔ اور اس شخص نے آپ سے بات بھی نہ کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کم بخت جانتا بھی ہے یہ کون ہیں۔ یہ علیؓ بن ابی طالب ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر آسمان و زمین ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور علیؓ کے ایمان کے ہم وزن بوجھ دوسرے میں تو علی کا ایمان جھکا رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے حضورؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق ارشاد فرمایا جس کا میں آقا ہوں اُس کا علی بھی آقا ہے۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ جب غدیر خم (نام جگہ) پر پہونچے تو حضور نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر حاضرین سے فرمایا "کیا میں مومنوں کو اُن کی اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں؟" لوگوں نے عرض کیا "ہاں" پھر فرمایا یہ میرا مولی ہے اور ہر اس شخص کا سردار ہے جس کا میں سردار ہوں۔ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَن وَالَاہُ وَعَادِ مَن عَادَاہُ (اے اللہ جو علیؓ سے دوستی رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو شخص علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس کو دوست نہ رکھ)

حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے ملے اور کہا مبارک ہو آج تم ہر مومن مرد و عورت کے دوست بن گئے۔ (حضرت اسامہ نے کسی بات پر حضرت علیؓ سے کہہ دیا تھا "تم میرے آقا نہیں بلکہ میرے آقا رسول اللہ صلعم ہیں"۔ اس پر حضورؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا اور مقصود حضرت اسامہ کو تنبیہہ کرنا تھا۔)

وہ احادیث جو حضرت عمرؓ کے فضائل میں

حضرت علیؓ سے مروی ہیں

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب (اے خدا اسلام کو عمر بن الخطاب کی وجہ سے قوت اور نصرت دے)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شہر مداین کو حق تعالیٰ نے فتح کرایا تو حضرت عمرؓ نے دسترخوان کے لئے حکم فرمایا اور دسترخوان مسجد میں بچھائے گئے۔ سب سے اول حضرت حسن لپک کر آئے اور کہا اے امیرالمومنین مالِ غنیمت سے میرا حق دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فراخی اور بزرگی کی دعا دی اور ان کے لئے ایک ہزار کا حکم دیا۔ حضرت حسنؓ لوٹ گئے اور حضرت حسینؓ آئے اور کہا اے امیرالمومنین مالِ غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے بھی ایک ہزار کا حکم فرمایا۔ یہ بھی لوٹ گئے۔ اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ آئے اور کہا اے امیرالمومنین مال غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے پانچ سو کا حکم فرمایا۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا اے امیرالمومنین میں ایک طاقتور آدمی ہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تلوار چلائی جب کہ حسنؓ و حسینؓ بچے ہی تھے اور مدینہ کی گلیوں میں گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو ایک ایک ہزار دیئے اور مجھ کو پانچ سو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہاں دیئے، تو بھی جا کر ان جیسے ماں و باپ ان جیسے نانا و نانی ان جیسے چچا و پھوپی، ان جیسے ماموں و خالہ لا، تو تجھے بھی ایک ہزار مل جائیں گے" اور تو ہرگز نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ ان کے باپ ہیں اور حضرت

فاطمہؓ ان کی ماں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نانا ہیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ ان کی نانی ہیں حضرت جعفر ان کے چچا تھے اور حضرت اُم ہانی ان کی پھوپھی اور حضور کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم ان کے ماموں تھے۔ اور حضورؐ کی صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ان کی خالہ۔ حضرت علیؓ نے جب یہ سُنا تو کہنے لگے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے عمر بن الخطاب اہل جنت کے لئے چراغ ہیں۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ہوئی تو کچھ صحابہ کو لے کر حضرت علیؓ کے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت علیؓ گھر سے نکلے حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ عمر بن الخطاب اہل جنت کا چراغ ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "ہاں" حضرت عمرؓ نے کہا "مجھے ایک رقعہ لکھ دو"۔ حضرت علیؓ نے یہ لکھ کر آپ کو دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما ضمن علی بن ابی طالب لعمر بن الخطاب عن رسول اللہ صلعم عن جبرئیل عن اللہ عزوجل ان عمر بن الخطاب سراج اھل الجنۃ فی الجنۃ (یہ وہ معاہدہ ہے جو علیؓ بن ابی طالب نے عمر بن الخطاب سے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بواسطہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے رب العزت والجلال کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ عمر بن الخطاب اہلِ جنت کا چراغ ہے۔)

حضرت عمرؓ نے اس پرچہ کو لیا اور اپنے کسی صاحبزادہ کو دے کر فرمایا میرے مرنے کے بعد جب غسل و کفن وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ تو اس کو میرے ساتھ کفن میں لپیٹ دینا۔ تاکہ میں اپنے پروردگار کے سامنے اس کو لے کر حاضر ہوں۔ جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا اور تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو وہ پرچہ آپ کے کفن میں لپیٹ دیا اور آپ کو دفن کر دیا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمر بن الخطاب کے غصہ سے بچا کرو جب عمرؓ غصہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے حق تعالیٰ غضب نازل فرماتا ہے

حضرت عمرؓ کے اقوال حضرت علیؓ کے مناقب میں اور بعض مسائل میں حضرت علیؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اثنار خطبہ میں فرمایا کہ علی بن ابی

طالب ہم سے زیادہ خوبی کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں اور ابی بن کعب قرآن سب سے اچھا پڑھتے ہیں۔

ایک مجنونہ عورت نے زنا کیا اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر کی گئی حضرت عمرؓ نے اس کو رجم کرانا چاہا تو حضرت علیؓ نے کہا اے امیرالمومنین کیا آپ نے نہیں سنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے تین شخص مرفوع القلم ہیں۔ مجنون، ہوش میں آنے تک۔ اور بچہ بالغ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس مجنونہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک حاملہ عورت پیش کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر اس نے بدکاری کا اقرار کیا جس پر حضرت عمر نے اس کے رجم کا حکم فرمایا۔ راستہ میں حضرت علیؓ نے اس عورت کو دیکھ کر پوچھا اس کا کیا معاملہ ہے لوگوں نے عرض کیا کہ امیرالمومنین نے اس کے لئے سنگساری کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو واپس کر دیا۔ اور جا کر حضرت عمر سے پوچھا کیا آپ نے اس کو رجم کا حکم کیا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں۔ اس نے میرے سامنے بدکاری کا اقرار کیا۔ حضرت علی نے کہا آپ کی یہ دلیل اس عورت پر چل سکتی ہے اور اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے آپ اس کو کس دلیل سے قتل کرتے ہیں اور شاید آپ نے اس کو ڈرایا دھمکایا ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں یہ تو ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص مصیبت اور بلا کے بعد اقرار کرے اس پر حد نہیں اور مقید اور محبوس اور مکرہ کا اقرار معتبر نہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور فرمایا عورتیں علی بن ابی طالب جیسا جننے سے عاجز ہیں۔ اگر آج علی نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش کی گئی جو پیاس سے بے تاب ہو کر ایک چرواہے کے پاس گئی اور اس سے پانی مانگا۔ چرواہے نے جب تک کہ اپنے پر اس کو قدرت نہ دی پانی پلانے سے انکار کیا۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کے رجم کے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا میرے خیال میں یہ مضطرہ ہے لہذا اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت حاضر کی گئی جس نے عدت میں نکاح کر لیا تھا حضرت عمرؓ نے ان میں تفریق کرا دی اور مہر بیت المال میں داخل کر دیا۔ اور فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نکاح کو رد کر دوں اور اس کا مہر جائز رکھوں۔ اور فرمایا کہ آئندہ کبھی یہ دونوں

نکاح نہ کریں۔ جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا اگرچہ لوگ سنت سے ناواقف ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ عورت کو حلال سمجھا ہے اس لئے مہر دینا ہوگا اور ان دونوں میں تفریق کردی جائے گی۔ بعد انقضاء عدت دوسروں کی طرح یہ بھی پیغام دے سکتا ہے حضرت عمرؓ نے وعظ کہا اور فرمایا امور جاہلیت کو سنت کے مطابق کرنا چاہیئے۔ اور حضرت علیؓ کے قول کی طرف رجوع کیا۔

حضرت عمر نے لوگوں سے پوچھا کہ مملوک کس قدر نکاح کرسکتا ہے؟ اور حضرت علیؓ سے کہا اے یمنی چادر والے تمھارے ہی سے سوال کرنا مقصود ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "دو نکاح کرسکتا ہے"۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک لڑکے کے جنازہ پر تھے۔ حضرت علیؓ نے اس لڑکے کے باپ سے کہا اس کی ماں سے ابھی جماع نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیوں اس کی کیا وجہ۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا، تاکہ حمل نہ ٹھیر جائے پھر وہ بچہ اپنے بھائی کی میراث کا دعوی کرے حالاں کہ وہ اس کا وارث نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے خدا جس پیچیدہ مسئلہ میں حضرت علیؓ کی رہنمائی نہ ہو میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

ایک شخص نے حضرت علیؓ کے ظلم کی چارہ جوئی کی اس وقت حضرت علی حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا اے ابوالحسن یہاں سے اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت علیؓ اٹھ کر اپنے حریف کے پاس بیٹھ گئے۔ جب بحث ختم ہوئی اور وہ شخص چلا گیا تو حضرت علیؓ پھر اپنی جگہ آبیٹھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار دیکھ کر پوچھا اے ابوالحسن کیا بات ہے تمھارا چہرہ متغیر دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ بات تمہیں بری معلوم ہوئی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا ہاں، امیرالمومنین۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیوں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا اس لئے کہ آپ نے میرے حریف کے سامنے مجھے کنیت سے پکارا آپ کو میرا نام لے کر کہنا چاہیئے تھا کہ اے علیؓ اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کا سر پکڑا اور پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ لے کر فرمایا میرے باپ تم پر قربان تمھارے سبب سے حق تعالی نے ہمیں ہدایت دی اور تمھارے ہی سبب سے ظلمات سے نکال کر روشنی میں پہنچایا۔

حضرت عمرؓ نے اثنار وعظ میں فرمایا اگر ہم تم سے نیک کاموں کو چھڑا کر منکرات

کرائیں تو بتاؤ تم کیا کرو گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ تین مرتبہ کہا۔ پھر حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور کہا اے امیرالمومنین اس وقت ہم آپ سے توبہ کرائیں گے، اگر آپ نے توبہ کرلی تو ہم اس کو قبول کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اگر توبہ نہ کی تو کیا کرو گے، حضرت علیؓ نے جواب دیا "اس وقت ہم آپ کو قتل کردیں گے"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا الحمدللہ ابھی اس امت میں ایسے شخص موجود ہیں کہ اگر ہم کجروی اختیار کریں تو وہ راہ راست پر لے آویں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا اے ابوالحسن مجھے کوئی نصیحت کرو۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنے یقین کو شک مت بناؤ اور اپنے علم کو جہل نہ بناؤ۔ اور اپنے گمان کو حق نہ سمجھو لو کہ دنیا میں سے تمہارا حصہ وہ بھی ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں دے کر چلتا کر دیا اور تقسیم کرکے برابر کردیا اور پہن کر پرانا کردیا۔ حضرت عمر نے فرمایا اے ابوالحسن تم نے بالکل سچ کہا" حضرت عمرؓ نے اثنائے وعظ میں فرمایا، زیادہ ڈر مجھے اس امر کا ہے کہ ایک بے گناہ مسلمان کو پکڑ کر اس کا گوشت اس طرح جلایا جائے گا جیسے اونٹوں کا گوشت بھونا جاتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ شخص مجرم ہے۔ لیکن وہ بالکل بے قصور ہوگا۔ حضرت علیؓ منبر کے پاس بیٹھے تھے اٹھے اور کہا اے امیرالمومنین یہ کب ہوگا۔ پھر خود ہی بولے۔ یہ اس وقت ہوگا جب آفتیں کھڑی ہوجائیں گی اور نخوت پیدا ہوجائے گی اور فتن اس طرح پیسا کریں گے جیسے چکی دانہ کو پیستی ہے اور جیسے آگ لکڑیوں کو خاک کر دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے علیؓ یہ کب ہوگا"۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ اس وقت ہوگا جب لوگ دنیا کی خاطر تجربے کریں گے اور علم سیکھیں گے لیکن عمل کی نیت نہ ہوگی۔ اور دنیا کو آخرت کے ذریعہ سے کمادیں گے۔

سب نے سفید کپڑوں میں احرام باندھا اور حضرت عقیل بن ابی طالب نے گلابی چادروں میں احرام باندھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تمہیں بھی خلاف کرنے کی حرص ہے۔ لوگ سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو آپ نے سرخ پہنے۔ حضرت علیؓ نے کہا، کوئی ہمیں سنت کا اتباع بتانے والا نہیں رہا۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "سچ کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو"

حضرت عمرؓ حج کر رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آیا جس کی آنکھ کسی نے پھوڑ دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تیری آنکھ کس نے پھوڑی اس شخص نے جواب دیا

"حضرت علیؓ نے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خیر تیری آنکھ اللہ کے واسطے جاتی رہی"۔ اس کے سوا نہ اُس سے واقعہ پوچھا اور نہ وجہ دریافت کی۔ یہ شخص ابھی وہیں تھا کہ حضرت علیؓ آ گئے اور کہنے لگے یہ شخص اثنائے طواف میں بیت اللہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس لئے میں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے علیؓ تم نے ناحق خدا کے نور کو ضائع کیا۔

قریش کے کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس جمع ہوئے ان میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ اور شرف و بزرگی کا ذکر تھا اور حضرت علیؓ خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے ابوالحسن تم کو کیا ہوا خاموش کیوں ہو؟ حضرت علیؓ اس وقت بولنا نہ چاہتے تھے۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں ضرور بولنا پڑے گا۔ تو حضرت علیؓ نے کہا

فی کل معترک تزیل سیوفنا ‏ فیھا الجماجم عن فراخ الھام
اللہ اکرمنا بنصر نبیہ ‏ وقیام عز شرائع الاسلام
ویزورنا جبرئیل فی ابیاتنا ‏ بفرائض الاسلام والاحکام
فنکون اول مستحل حلہ ‏ ومحرم للہ کل حرام

جب حضرت علیؓ کا کلام ختم ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے کہا اے میرے بھتیجو کیا تم اس کی گواہی دو گے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اور اپنے باپ (حضرت علیؓ) کی طرف دیکھنے لگے حضرت علیؓ نے فرمایا "گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

اہلِ نجران اپنی کتاب سُرخ چمڑے میں رکھے ہوئے حضرت علیؓ کے پاس لائے اور عرض کیا کہ ہم آپ کو اس مکتوب کی قسم دیتے ہیں جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس سفارش کی قسم دیتے ہیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ کہ ہم کو ہماری اراضی واپس کردی جائیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "حضرت عمرؓ زیادہ واقف اور تجربہ کار ہیں"۔

عاصم بن جعد کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اگر حضرت عمرؓ کو کبھی کسی بات پر طعنہ دیتے تو آج دیتے۔

(ف) اہلِ نجران حضرت علیؓ کی سفارش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جزیرہ عرب میں رہتے تھے اور ان سے ایک معاہدہ لکھا گیا تھا جس کو حضرت علیؓ نے لکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو جزیرہ عرب سے خارج کر دیا۔ اس وقت

اہلِ نجران حضرت علیؓ کے پاس وہ پرانا معاہدہ لے کر آئے اور چاہتے تھے کہ پھر وہیں واپس ہو جائیں مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔

شعبی سے مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں آئے تو فرمایا، جس گرہ کو حضرت عمرؓ نے باندھا ہو میں اُس کو نہیں کھول سکتا۔

حضرت علیؓ اونی چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلے اور کہنے لگے یہ کپڑا میرے بھائی اور میرے دوست اور میرے ہمراز اور میرے مخلص امیر المومنین نے مجھے پہنایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو دیکھا جو قریب البلوغ تھا اور اس کے زلفیں بھی تھیں اور سر پر بال بھی۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس وقت شک میں تھا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ پھر اُس سے کبھی زائد خوب صورت لڑکے پر گذر ہوا جو حضرت علیؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے ان سے کہا خدا تمھیں اس لڑکے سے محفوظ رکھے جو تمھارے پاس بیٹھا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ میرا لڑکا عثمانؓ ہے۔ میں نے اس کا نام حضرت عثمانؓ کے نام پر رکھا ہے اور میں نے اپنے بعض بچوں کے نام حضرت عمرؓ اور حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے نام پر بھی رکھے ہیں۔ بلکہ آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر بھی نام رکھا ہے۔ اور حسنؓ و حسینؓ اور محسن کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے۔ اور حضور ہی نے ان کا عقیقہ کرایا اور ان کے سر کے بال اُتروا کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کرائی۔ اور حضورؐ کے فرمان کے بموجب اُن کی ناف کاٹی گئی۔ اور ختنہ کرائی گئیں۔

حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی نے ایک شخص کو قتل کیا پھر اقرار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق فیصلہ کیا اور اس کے اقرار کی وجہ سے عاقلہ (کنبہ) سے دیت دلانے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا اے امیر المومنین جب یہ تسلیم کر رہا ہے تو اس کو سچا سمجھنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کا اس وقت اقرار اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا امیر المومنین (وفقک اللہ) آپ ہم سے ہر خبر میں سبقت لے جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کہ مالک کے انتقال کے بعد ام ولد (وہ

باندی جس سے مالک کی اولاد ہو) آزاد ہو جاتی ہے۔ میری اور حضرت عمرؓ کی ایک رائے تھی لیکن اب میرے نزدیک وہ مملوکہ ہی رہے گی۔ جبیدہ سلمانی نے کہا۔ اختلاف کی صورت میں ایک کی رائے سے آپ کی متفقہ رائے اولیٰ ہے۔

عبداللہ بن عمیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت عمرؓ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی جب نماز ختم ہو گئی تو داہنی طرف کے لوگ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ نے کوڑہ سے اشارہ کر کے ان کو بٹھایا۔ جب حضرت علیؓ کے پاس پہنچے (وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے) تو اُن سے کہا اے علیؓ واللہ مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز سے منع فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ کا اپنی صاحبزادی اُمِ کلثوم کا حضرت عمرؓ سے نکاح کرنا

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے حضرت ام کلثوم سے نکاح کے متعلق کہا تو حضرت علیؓ نے جواب دیا میرا اسے بنی جعفر کو دینے کا خیال ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا مجھ سے نکاح کردو۔ واللہ اس کی ددھیال میں کوئی میری برابر اس کا خیال نہ رکھے گا۔ پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا۔ حضرت عمرؓ مسجد میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا مجھے نکاح کے لئے آراستہ کرو انھوں نے عرض کیا "کس سے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ حضرت علیؓ کی صاجزادی اور حضورؐ کی نواسی ام کلثوم سے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ بجز میرے تعلق اور نسب کے ہر تعلق اور نسب ختم ہو جائے گا۔ پس میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی تعلق ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا تاکہ تم اس کی صغرسنی کو دیکھ لو۔ اور حضرت ام کلثوم کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت ام کلثوم نے کہا میرے باپ (حضرت علیؓ تم سے کہتے ہیں۔ کیا تمھیں یہ لباس پسند ہے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں پسند ہے" پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے چالیس ہزار درہم مہر میں دیئے۔

(ف) حدیث میں لفظ حلہ (چادر) ہے اور چادر لباس میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے عورتوں کو ہی لباس کہا ہے۔ لہٰذا اس مناسبت سے یہاں چادر سے مراد عورت ہوئی۔

مروی ہے کہ جب حضرت ام کلثوم حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور حضرت عمرؓ نے ان کا نقاب اٹھانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے چھوڑ۔ اگر تو امیر نہ ہوتا تو ضرور چپت مارتی

مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے عذر کیا کہ ام کلثوم چھوٹی بچی ہے حضرت عمرؓ نے کہا اگر زندہ رہی تو بڑی ہو جائے گی۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے علاوہ اس کے دو بڑے اور بھی ہیں مجھے ان سے بھی مشورہ لینا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ منتظر رہے اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور تنہائی میں لیجا کر حمد و ثنا کے بعد ان سے کہا حضرت عمر تمہاری بہن کے لئے پیغام دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے سوا اس کے دو بڑے اور ہیں اور میں نے بغیر تم سے مشورہ کئے نکاح کرنا مناسب نہ سمجھا حضرت حسینؓ خاموش رہے اور حضرت حسنؓ بولے اور حمد و ثنا کے بعد کہا اے باپ حضرت عمرؓ جیسا کون ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش تشریف لے گئے۔ پھر خلیفہ ہوتے تو عدل و انصاف کیا۔

حضرت علیؓ نے کہا تم سچ کہتے ہو لیکن میں نے تمھارے بغیر بات پکی کرنا مناسب نہ سمجھا پھر فرمایا۔ ام کلثوم کو بلاؤ ام کلثوم بلائی گئی۔ تو ایک بچی ایک کرتہ پہنے ہوئے آئی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ بیٹی میں عمر بن الخطاب کے پاس تھا انھوں نے مجھ سے ایک چیز مانگی اب تم ان کے پاس جاؤ۔ سلام کہنا۔ اور کہنا مجھ کو میرے باپ نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کی حاجت پوری کردی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ان کا کرتہ اتاریں لیکن انھوں نے کرتہ چھڑا لیا اور واپس ہو گئیں اور والد ماجد سے جا کر کہا تمھارا پیغام حضرت عمرؓ کو پہنچا دیا۔ تم نے مجھے اس لئے بھیجا تھا تاکہ حضرت عمرؓ مجھے خرید لیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ تمھارے لئے زیادہ مناسب ہیں۔ حضرت ام کلثوم نے کہا، آپ نے مجھ سے اجازت کیوں نہیں لی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اگر تم بڑی ہوتیں تو تم سے اجازت لیتا۔ لیکن آج تمھارا معاملہ میرے اختیار میں ہے۔

مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے حضرت ام کلثوم سے ایک بچہ ہوا جس کا نام زید رکھا عبدالملک سے کسی نے کہا یہ شخص حضرت عمرؓ کا بھی صاحبزادہ ہے اور حضرت علیؓ کی

بھی اولاد ہے۔ عبد الملک کو اپنی سلطنت کا خوف ہوا اور اُس نے ان کو زہر دے دیا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد جب ان پر چادر ڈال دی گئی تو حضرت علیؓ نے کہا حق تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں کہ میری خواہش ہو کہ اس جیسے اعمال لے کر خدائے تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو آپ کے دوستوں (حضور اور حضرت ابوبکر) سے ضرور ملائے گا۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے "میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ تھے" "میں ابوبکرؓ اور عمرؓ (فلاں جگہ گئے)"۔

اے عمرؓ بن الخطاب (رحمک اللہ) تم آیات اللہ کے عالم تھے۔ تمہارے سینہ میں حق کی عظمت تھی تم صرف خدا سے ڈرتے تھے اور دین میں 'لومۃ لائم' کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ تم حق کے لئے سخی تھے اور باطل کے لئے بخیل اور دنیا سے بھوکے اور آخرت سے سیر۔

مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ کی وفات کا حال معلوم ہوا تو غسل کر کے گھر سے نکلے سلام کیا اور سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھایا اور فرمایا، حضرت عمرؓ پر نوحہ کرنے والی نے کیا خوب کہا ہے "آہ عمرؓ ٹیڑھے کو سیدھا کیا اور بیمار کو شفا دی۔ (یعنی سیاست خوب کی) آہ عمر پاک وصاف کم گناہوں کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے۔ آہ عمرؓ سنت کو ساتھ لے گئے۔ اور فتنہ وفساد چھوڑ گئے۔ اس کو کیا معلوم محض الفاظ ہیں جو اس کی زبان سے نکل گئے۔ واللہ حضرت عمرؓ خیر کی طرف تشریف لے گئے اور شر وفساد سے دور ہو گئے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے فضائل میں

احادیث اور حضرت عمرؓ کا ارشاد

حضرت علیؓ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھ کر پہچان لی اور اس سے کہا یہ زرہ میری ہے فلاں دن گر گئی تھی۔ یہودی نے جواب دیا نہ معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ زرہ میری

ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔ چلو ہمارا تمھارا فیصلہ قاضی مسلمین کریں گے اور دونوں شریح تابعی کے پاس گئے۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کو دیکھا تو اپنی جگہ ان کے لئے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ اور شریح کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اگر میرا حریف مسلمان ہوتا تو میں اس کے ساتھ تمھارے سامنے بیٹھتا لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہود کو اپنی برابر مت بٹھاؤ۔ اور نہ ان کے مریضوں کی عیادت کرو اور نہ ان کے جنائز کے ساتھ جاؤ۔ اگر تمھیں کہیں یہ مل جائیں تو ان پر راستہ تنگ کر دو۔ اگر یہ گالی دیں تو ان کو مارو۔ اور اگر یہ ماریں تو ان کو قتل کر دو۔ پھر فرمایا میں نے اپنی زرہ اس یہودی کے پاس دیکھی اور پہچان لی حضرت شریح نے یہودی سے کہا۔ "تو کیا کہتا ہے" یہودی نے جواب دیا "میری زرہ ہے اور میرے قبضہ میں ہے"۔ حضرت شریح نے کہا "امیرالمومنین آپ سچے ہیں واللہ جیسا آپ فرماتے ہیں یہ زرہ آپ ہی کی ہے لیکن پھر بھی دو گواہ کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے غلام قنبر کو بلایا۔ اس نے شہادت دی۔ پھر اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ کو بلایا۔ انھوں نے شہادت دی۔ حضرت شریح نے عرض کیا میرے نزدیک بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہ کرنی چاہئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے حضرت عمرؓ سے یہ حدیث سنی ہے کہ حسن و حسین جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔ شریح نے جواب دیا "ہاں سنی ہے"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کیا تم اہل جنت کے سردار کی شہادت قبول نہیں کرتے اس کی سزا میں چالیس دن تک تمھارا بانقیا کا تبادلہ کرتا ہوں۔ اور زرہ یہودی کے حوالہ کر دی، یہودی نے دل میں سوچا امیرالمومنین میرے ساتھ قاضی کے یہاں آئے اور قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ کیا اور وہ اس پر رضامند ہو گئے۔ اور کہا بے شک یہ زرہ آپ کی ہے فلاں دن آپ کے خاکی رنگ کے اونٹ سے گر گئی تھی اور میں نے اٹھالی تھی۔ اور کہا "اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ" حضرت علیؓ نے فرمایا یہ زرہ بھی تمھاری ہے اور یہ گھوڑا بھی تمھارا اور اس کے لئے سات سو درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر یہ شخص ہمیشہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہا۔ اور جنگ صفین میں مقتول ہو گیا۔

حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور کہا میرے باپ کے منبر سے اتر جاؤ۔ اُنھوں نے فرمایا خدا کی قسم یہ منبر تمھارے باپ کا

عہ کوفہ کے قریب کوئی جگہ ہے۔

ہے میرے باپ کا نہیں۔ پھر پوچھا تمہیں یہ کس نے سکھایا میں نے جواب دیا " کسی نے نہیں " اس کے بعد فرمایا۔ تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرو۔ میں ایک دن اُن کے پاس گیا تو وہ معاویہ سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابن عمرؓ دروازہ پر تھے یہ دیکھ کر واپس چلا آیا۔ پھر ایک دن حضرت عمرؓ ملے تو فرمایا ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے سے ملتے رہا کرو۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے پاس حاضر ہوا لیکن آپ معاویہ سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابن عمرؓ دربان تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم ابن عمر جیسے ہو۔ کیا حق تعالیٰ کے سوا کسی اور نے ہمارے سروں پر بال اگائے۔ جب تم آؤ تمہیں اوروں کی طرح اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

ایک مرتبہ لوگ چادریں اوڑھے ہوئے پھر رہے تھے اور حضرت عمرؓ مسجد میں حجرہ شریف اور منبر کے درمیان بیٹھے تھے۔ لوگ آکر ان کو سلام کر رہے تھے۔ اور دعائیں دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے گھر سے نکلے۔ (حضرت فاطمہؓ کا گھر وسط مسجد میں تھا) دونوں حضرت عمرؓ کے سامنے تھے اور ان کے پاس ان چادروں میں کی چادر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ خدا کرے یہ کپڑے تقسیم کرنا مجھے مبارک ہو۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین کیوں۔ آپ نے تو اپنی رعیت کو بہت عمدہ پوشاک پہنائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس لئے کہ یہ دو لڑکے جو ابھی پھلانگتے ہوئے آئے۔ اُن کے پاس ان میں سے چادر نہیں یہ بچے ہیں اور چادریں ان سے بڑی ہیں۔ پھر داہنی طرف جو شخص بیٹھا تھا اس سے جھک کر فرمایا۔ (حضرت) حسنؓ و حسینؓ کے لئے دو چادر بھیج دو۔ اس نے دو چادریں بھیج دیں اور آپ نے حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کو پہنا دیں۔

جب حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کئے تو لوگوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا اور پوچھا کہ ابتدا کس سے کروں لوگوں نے عرض کیا۔ امیر المومنین اپنے سے شروع کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے خوب یاد دلایا۔ بنو ہاشم سے ابتدا کی اور حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کے لئے پانچ پانچ سو دینار وظیفہ مقرر کئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت زبیر سے کہا کہ (حضرت) حسن بیمار ہیں کیا ان کی عیادت کرو گے حضرت زبیر بہانہ کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا معلوم بھی ہے بنو ہاشم کی عیادت فرض ہے۔ اور ان کی ملاقات سنت ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا تمہارے باپؐ کے بعد مجھے تم سے زاید کوئی عزیز نہیں۔

حضرت عمرؓ کی شہادت اور مجلس شوریٰ کا انعقاد

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابو لؤلوہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا (یہ روم کا باشندہ اور نصرانی تھا) اور کہا امیر المومنین مغیرہ سے کہہ دیجئے کہ جو روپیہ مجھ سے لیتا ہے اُس میں کچھ کم کر دے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم سے کیا لیتا ہے" اُس نے جواب دیا۔ "چار درہم" حضرت عمرؓ نے پوچھا "تمھارا کیا پیشہ ہے" اُس نے جواب دیا۔ "چکی چلانا" حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا سے ڈرا اور اپنے آقا سے خلوص کے ساتھ پیش آ۔ ابو لؤلوہ حضرت عمرؓ کے پاس سے غصے میں بھرا ہوا نکلا اور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا "احمق ہے" حضرت عمرؓ نے (حضرت) مغیرہ کو بلایا اور فرمایا خدا سے ڈرو اور جس کو خدا نے تمھارا دست نگر کیا ہے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

اس غلام نے ایک چھری تیار کی جس کی دو نوک تھیں اور موٹھ درمیان میں تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ اس وقت صبح کی نماز کے لئے صفوں کو سیدھا کرا رہے تھے۔ اور فرما رہے تھے تمھارے مونڈھے آگے پیچھے نہ ہوں کبھی تمھارے قلوب میں بھی تفرقہ پڑ جائے۔ اور آپ پر نو وار کئے اور آپ کے ساتھ تیرہ[۱۳] آدمیوں کو زخمی کیا۔ جن میں چھ وہیں مسجد میں شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کتے کو پکڑو۔ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ سورج نکلنے کے قریب تھا اور ابھی لوگوں نے صبح کی نماز نہ پڑھی تھی۔ اس لئے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے پیچھے اقتدا کی انھوں نے سورج نکلنے کے خوف سے قل ہو اللہ اور اذا جاء نصر اللہ پڑھی۔

حضرت عمرؓ کے پاس سب سے پہلے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ پہنچے حضرت ابن عباسؓ نے کہا "امیر المومنین جنت کی بشارت ہو" حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم اس کی گواہی دو گے (گویا آپ خرید و فروخت کر رہے تھے) حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے مونڈھا مار کر کہا تو بھی گواہ بن اور میں بھی گواہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا "یہ کیوں کر" حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس لئے کہ آپ کا اسلام باعث عزت

تھا اور آپ کی امارت انصاف تھی اور آپ کی موت شہادت سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ واللہ اس کی وجہ سے تم مجھ کو عزیز نہ سمجھو اگر حق تعالیٰ نے اپنا رحم نہ فرمایا تو عمرؓ ہلاک ہو جائے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا سر میری گود میں رکھا تھا آپ نے فرمایا میرے سر کو زمین پر رکھ دو۔ میں نے عرض کیا آپ کا سر نیچے رکھنا مجھ پر شاق ہے۔ آپ نے فرمایا تجھے تیری ماں رووے رکھ دے۔ پھر فرمایا لوگوں کے پاس جاؤ اور ان سے سلام کے بعد پوچھو کہ کیا یہ کام تمھارے مشورہ سے ہوا ہے؟ (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں) میں باہر گیا۔ اور لوگوں کو یہ پیغام سُنایا۔ اُنھوں نے جواب دیا ہماری خواہش ہے کہ آپ کے بدلہ میں ہمارے ماں باپ چلے جائیں۔ رسول اللہ صلعم کے وصال کے بعد آج جیسا سخت دن ہم پر نہیں گزرا۔ میں حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور اُن تک یہ فقرے پہنچا دیے۔ آپ نے فرمایا دیکھو کیا میرے قاتل کا پتہ لگایا ہے۔ میں نے عرض کیا ہاں مغیرہ بن شعبہ کا غلام ہے۔ آپ نے فرمایا الحمدللہ کوئی مسلمان میرے ظلم کا شاکی نہیں ایک مشرک ہے جس کے آقا کو میں اس پر احسان کرنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ لوگ اندر چلے گئے اور حضرت عمرؓ نے نبیذ مانگی آپ کو نبیذ پلائی جو خون میں مل کر زخم سے نکل گئی۔ حرث بن کلدہ ثقفی ایک طبیب تھا وہ آیا اور کہا دودھ پلاؤ آپ کو دودھ پلایا وہ بھی خون آلود نکلا۔ حرث نے کہا جو کچھ کہنا ہو یا عہد وغیرہ لینا ہو وہ کہہ لیجئے۔ پھر لوگوں نے عرض کیا کہ خلیفہ مقرر کر دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں زندگی اور موت دونوں حالت میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے عرض کیا مسلمان عبداللہ بن عمرؓ سے راضی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر آلِ عمرؓ میں سے کوئی خلافت کے قریب گیا تو تباہ ہو جائیں گے اور میں ان کے لئے کیسے بدفالی لے سکتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا آپ ہمیں مشورہ کیوں نہیں دیتے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مشورہ دینے میں کچھ حرج نہیں۔ قریش کے سردار جن کے جنتی ہونے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے سات ہیں (حضرت) عثمانؓ بن عفان۔ (حضرت) علیؓ بن ابی طالب۔ (حضرت) طلحہؓ۔ (حضرت) زبیرؓ۔ (حضرت) سعدؓ بن ابی وقاص (حضرت) عبدالرحمنؓ بن عوف۔ (حضرت) سعد بن زید (رضی اللہ عنہم اجمعین)

لوگوں نے عرض کیا "امیرالمومنین ان میں سے اپنی رائے متعین کیجئے" حضرت عمرؓ نے فرمایا (حضرت) عثمانؓ سے تو اس لیے رکتا ہوں کہ وہ اپنے کنبہ کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور (حضرت) علیؓ کی طبیعت میں مذاق ہے۔ اور (حضرت) زبیرؓ مومن الرضا اور کافر الغضب ہیں۔ اور طلحہؓ میں نخوۃ ہے۔ اور (حضرت) سعدؓ میں بدخلقی اور سختی ہے۔ اور عبدالرحمن بن عوف مالدار بہت ہیں گویا اس امت کے قارون ہیں۔ یہ سب ایک گھر میں تین روز تک مشورہ کریں۔ ان ایام میں صہیب نماز پڑھائے۔ اور عبداللہ بن عمرؓ وزیر و مشیر رہے۔ اُس کے ذمہ اور کوئی کام نہ ہو اور کثرت الرائے پر عمل کرلیا جائے۔ اگر پانچ کی رائے متحد ہو جائے اور ایک خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دینا۔ اور اگر چار کی رائے متحد ہو اور دو مخالف تب بھی ان دونوں کو چھوڑ دینا۔ اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو عبداللہ بن عمرؓ کو حکم بنا لینا اور جس فریق کے موافق طے ہو جائے دوسرے فریق کی رائے کو چھوڑ دینا۔ پھر حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ سلام کہنا اور کہنا کہ جو جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان آپ نے اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے عمرؓ اس کی آپ سے درخواست کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں۔ میں حضرت عائشہؓ کے گھر گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا عبداللہ بن عمرؓ ہے۔ پھر پوچھا کیوں آئے ہو؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت عمرؓ کو خون آلود چھوڑ کر آیا ہوں وہ آپ سے اُس جگہ کی درخواست کرتے ہیں جو آپ نے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا حضرت عمرؓ کو کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا۔ مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا واللہ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان میرے سوا کوئی اور مدفون ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے مجھ سے خواہش کی ہے تو بہت اچھا۔ میں واپس چلا آیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا کہ اُنھوں نے اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا حق تعالیٰ جزائے خیر دے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد پھر پوچھ لینا اگر اس وقت بھی اجازت دے دیں تو فبہا ورنہ عام مسلمانوں کے قبرستان بقیع میں دفن کر دینا۔

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد ہم جنازہ کو لے گئے اور حضرت عائشہؓ کے دروازہ

پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے پوچھا کون ہے؟ ہم نے جواب دیا "کہ حضرت عمرؓ کا جنازہ ہے"۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ وفات کے بعد پھر آپ سے پوچھ لیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا واللہ جو جگہ میں ان کو دے چکی اب اس کو واپس نہ لوں گی۔ پھر اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ اور کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اے (حضرت) ابوبکرؓ تمہارا دوست عمرؓ تمہارے پاس زیارت کے لئے آیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت ایسا زلزلہ آیا کہ ہمیں آبادی کے منہدم ہونے کا خطرہ ہو گیا جب تیسرے دن عصر کا وقت ہوا تو صہیب ہمارے پاس آئے اور پوچھا تم نے کیا کیا۔ ہم نے جواب دیا ابھی کچھ نہیں کیا۔ صہیب نے کہا اس ذات پاک کی قسم جس نے عمرؓ کی روح کو قبض کیا آج مغرب سے زیادہ اس معاملہ میں دیر نہ ہو گی۔ اس کے بعد اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ جب لوگ تلواریں سنبھال لیں گے تو تم کیا کر سکو گے جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اصحاب شوریٰ سے کہا تم مجھے اجازت دو کہ میں خلافت سے دست بردار ہو جاؤں اور تم میں سے ایک کو اللہ اور رسول کے لئے چھانٹ لوں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ اگر اور ساتھی راضی ہو جائیں۔ تو میں سب سے پہلے منظور کرتا ہوں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے متعلق فرمایا ہے کہ تم زمین و آسمان میں امین ہو۔ دیگر حضرات بھی اس پر راضی ہو گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن نے کہا۔ سعدؓ تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں اور تم اس کے اہل نہیں۔ اور طلحہؓ اور زبیرؓ تم بھی اس کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی آپ حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑتے اور کبھی حضرت علیؓ کا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ سے بیعت کر لی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اصحاب شوریٰ سے فرمایا کہ اگر تم نے گنجےؓ کو حاکم بنایا تو اگرچہ وہ تلوار گردن میں ڈالے رکھے پھر تمہیں راہ راست پر نہیں چلا سکتا۔ میں نے عرض کیا۔ وہ خود بھی جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو حاکم نہ بنایئے۔ پھر فرمایا۔ اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر (حضرت ابوبکرؓ) نے خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور اگر میں ایسے ہی چھوڑ دوں تو مجھ سے بہتر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا ہے یعنی میرے لئے دونوں امر کی گنجائش ہے۔

ؓ اس سے مراد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو انھوں نے چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ منعقد کی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو ان میں کلام ہے تو فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں مقاماتِ قیامت میں جس جگہ ہوں گا میرا ہاتھ علیؓ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور مجھ سے فرمایا۔ اے عمرؓ جب عثمانؓ بن عفان رات کو سوتے ہیں تو آسمان کے تمام فرشتے ان کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ صرف عثمانؓ کے لئے ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس لئے کہ وہ گناہ اور خطا کرنے میں ربّ العالمین سے حیا کرتا ہے۔ اور طلحہؓ بن عبداللہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے اور رات ٹھنڈی تھی کہ حضورؐ کا کجاوہ گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے اللہ جو شخص اپنی سواری سے اتر کر میری سواری کو درست کرے تو اُس سے ایسا راضی ہو جس کے بعد کبھی غصہ نہ ہو۔ میں نے دیکھا کہ طلحہؓ اُسی وقت اترے اور حضورؐ کے کجاوہ کو درست کر کے واپس کر دیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے طلحہؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طلحہؓ سے کہہ دیجئے اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی قیامت کی ہر مصیبت میں میں تمھارے ساتھ رہوں گا اور زبیر بن العوام ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے اور چہرۂ مبارک پر مکھیاں گر رہی تھیں۔ جب تک حضورؐ بیدار ہوئے حضرت زبیر برابر مکھیوں کو ہٹاتے رہے۔ حضورؐ نے بیدار ہو کر فرمایا اے زبیرؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی میں قیامت کے دن تمھارے چہرے سے دوزخ کی لپٹ کو دور رکھوں گا۔

عبدالرحمٰن بن عوف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر تھے۔ کہ حضرت فاطمہؓ مع حضرت حسنؓ و حسینؓ کے حاضر ہوئیں۔ اور یہ تینوں رو رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے بچے کیوں رو رہے ہیں۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا "بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں" حضورؐ نے دریافت کیا "اور تم کیوں رو رہی ہو" حضرت فاطمہؓ نے کہا "ان بچوں پر ترس کھا کر" حضورؐ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ مجھے اور میرے بچوں اور میری لڑکی فاطمہؓ کو جنت کا کھانا کھلا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ حضورؐ نے دروازہ کھولا تو حضرت عبدالرحمن بن عوف تھے اور اُن کے ہاتھ میں حلوے کا پیالہ اور دو روٹیاں تھیں جن کے درمیان زیتون تھا۔ حضرت عبدالرحمن نے ان کو پیش کیا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ یہ ہدیہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نے اس کو پیٹ بھر کر کھایا۔ اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے عبدالرحمنؓ جنت تو تمھاری طرف سبقت کر رہی ہے لیکن حق تعالیٰ تمھاری دنیا میں بھی برکت عطا فرمائے

اور سعدؓ بن وقاص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی لڑائی میں تیرہ دنعہ ان کو تیر ٹھیک کر کے دیا۔ پھر فرمایا، تیر پھینک تجھ پر میرے ماں و باپ فدا ہوں جو شخص ان کو بھی برا کہے وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا تو ان کی تجہیز و تکفین کے بعد حضرت ضحاک بن قیسؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ کے یہاں اہل شوریٰ کا اجتماع ہوا (حضرت فاطمہؓ بہت نیک عورت تھیں۔ لوگ اکثر ان کے یہاں جمع ہوتے تھے)۔ حضرت عبدالرحمن سب میں بڑے تھے۔ اول انھوں نے گفتگو شروع کی اور مناسب حمد و ثنا کے بعد فرمایا اے جماعت حاضرین میری ایک رائے ہے تم بھی اس پر غور کر لو۔ اول خاموشی سے سن لو۔ تاکہ معلوم ہو جائے اور سمجھ میں آ جائے۔ ضعیف جو سیدھی راہ چلے اُس قوی سے بہتر ہے جو کجرو ہو۔ اور ایک گھونٹ پانی جو ضرورت کے وقت پیاس بجھائے اس شیریں کثیر پانی سے بہتر ہے جس سے سیری ہو جائے۔ تم علما رہو۔ قوم کے مقتدا اور ملجا رہو۔ اختلاف میں پڑ کر اپنی چھری کو ٹھنڈا مت کرو۔ اور اپنی تلواروں کو دشمن سے نہ روکو جس سے وہ تم پر سرکش ہو جائیں اور تمھارے اعمال میں نقصان آئے۔ ہر گھر کے لئے ایک امیر ہوتا ہے جس کے کہے پر سب چلیں۔ اور اُس کی مخالفت سے ڈریں۔ اپنے میں سے کسی کو اپنا کام حوالہ کر دو اور جس پر بھروسہ ہو اپنا بوجھ لاد دو۔ نرمی سے چلو تاکہ مطلوب تک پہنچ جاؤ۔ تمھاری نیات تمھارے علم سے تجاوز نہ کریں اور تمھارے اعمال تمھاری نیات سے متجاوز نہ ہوں۔ مختصر بات زیادہ بکواس سے بہتر ہے۔ دشمن اور بدبخت کی اگرچہ وہ قریب ہو اطاعت نہ کرو۔ اور یہ بار (خلافت) ایسے شخص کو پہناؤ جو مصائب کے وقت قوی رہے۔ اور کبید میں امانت دار ہو۔ وہ تم سے راضی ہو اور تم اس سے راضی ہو اور تم میں سے مختار اور پسندیدہ ہو اور تم مقتدا ناصح کی اطاعت نہ کرو۔ اور مرشد معاون کی مخالفت نہ کرو۔ میں

اس پر بات ختم کرتا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔

پھر حضرت عثمانؓ بولے فرمایا۔ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا اور اُن کے لئے اپنے وعدہ کو پورا کیا اور ہر قریب و بعید پر اُن کی مدد کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کو نور بنا کر بھیجا اور ہمیں خواہشات کے تموج اور دشمنوں کے اختلاف کے وقت حضورؐ کے اتباع کی توفیق دی اور ہمیں اپنے فضل سے ائمہ بنایا اور اپنی اطاعت کے لئے امیر بنایا۔ یہ معاملہ ہم سے متجاوز نہ ہوا اور بجز ہمارے کوئی شریک نہ ہو۔ مگر جو شخص حق سے انجان ہوا اور راستہ سے بھٹک گیا ہو۔ اگر تمہاری مخالفت کی گئی۔ اور تمہاری بات رد نہ ہوگئی تو میں سب سے پہلے تمہاری بات پر ہاں کروں گا۔ اور اس کو قبول کروں گا۔ میں اپنے اس قول پر کفیل اور ضامن ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اور تمہاری مخالفت سے پناہ مانگتا ہوں۔

پھر حضرت زبیر بولے اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ حق تعالیٰ کے لئے پکارنے والا جاہل نہیں ہوتا اور اس پر ہاں کرنے والا نامراد نہیں ہوتا۔ خواہشات کے بڑھنے کے وقت جانوں کا محافظ اُس کا بیان ہے۔ اگر حدود شرعیہ متعین نہ ہوتیں اور فرائض خداوندی متعین نہ ہوتے۔ راحت و حیات ہوتی اور موت نہ ہوتی تو امارت اور حکومت سے بھاگنا اور بچنا باعث نجات اور عصمت ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے ہم پر اجابۃ حق اور افشاء سنت کو واجب کر دیا ہے تاکہ ہم گمراہی میں نہ پڑیں۔ اور زمانہ جاہلیت کی طرح پھر گمراہ نہ ہوں۔ جو کچھ تم کہو گے میں اُس کو قبول کروں گا اور تمہارے حکم کا اتباع کروں گا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

پھر حضرت سعد بن ابی وقاص بولے کہ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں اس ذات پاک کی اس لئے حمد کرتا ہوں کہ اُس نے مجھ کو گمراہی سے نجات دی اور گمراہی پر متنبہ کیا جو شخص محفوظ رہا اُس نے ہدایتِ خداوندی کے باعث فلاح پائی۔ اور جس کی نجات ہوگئی وہ خدا کے رحم و فضل سے کامیاب ہو گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے راستے منور اور درست ہو گئے۔ اور حق واضح ہو گیا اور باطل تمام مٹ گیا۔ اے حاضرین تم اہل کذب کی باتوں اور متکبرین کی تمناؤں سے بچو۔ ان تمناؤں نے تم سے پہلے ایک قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ جس امر کے تم وارث ہوتے اور جو چیز تم کو ملی وہ بھی اُس کے وارث ہوئے تھے اور اُن کو بھی یہ ملی تھی۔ پھر

حق تعالیٰ نے ان کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اور اُن پر لعنت فرمائی۔

"لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد و عیسی ابن مریم۔ ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون"

اور میں اپنے تیردان کو خالی کرتا ہوں اور اپنا حصہ چھوڑتا ہوں اور حضرت طلحہؓ کی نسبت میں ان کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کیا۔ اور جو کچھ اُن کی طرف سے ہوا اس پر میں کفیل اور ضامن ہوں۔ اے ابن عوف یہ معاملہ تمھارے سپرد ہے بشرطیکہ سچائی اور کوشش بلیغ سے کام لو۔ وعلی اللہ قصد السبیل والیہ الرجوع۔

حضرت علیؓ سب سے چھوٹے تھے اس لئے سب کے بعد ان کا نمبر آیا۔ فرمایا تمام حمد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے ہم میں سے محمد صلعم کو نبی اور اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا۔ ہم نبوت کا گھرانا اور حکمت کی کان اور اہل زمین کے لئے امان اور طالب کے لئے نجات ہیں۔ ہمارا ایک حق ہے اگر وہ دیا گیا تو ہم لے لیں گے اور اگر اُس سے روکا گیا تو ہم اونٹوں کی پشت پر سوار ہوں گے اگرچہ طویل سفر کرنا پڑے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی عہد فرما لیتے تو ہم تاحیات اُس پر جہاد کرتے اور اگر حضور ہم سے کچھ فرما جاتے تو ہم اس کو ضرور پورا کرتے۔ اگرچہ ہمارا گمان ہی ہو لیکن مجھ سے پہلے کوئی شخص دعوتِ حق اور صلہ رحمی کی طرف نہیں بڑھا۔ میری بات سنو اور یہ منظر نہ دکھاؤ کہ اس مجمع کے منتشر ہونے کے بعد اس معاملہ میں تلواریں چلیں اور بدعہدیاں ہوں۔ حتیٰ کہ ایک فریق تم لوگ ہو اور یا تم میں سے بعض گمراہ لوگوں کے مقتدا ہوں یا جہال کے تابع ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

حضرت منصور کہتے ہیں کہ پھر یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمن میرے ماموں تھے۔ صبح کو وہ اپنی رائے ظاہر کرنے والے تھے۔ یہ رات میں نے انہی کے یہاں گزاری۔ جب کچھ حصہ رات گزری تو مجھ سے فرمایا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے پاس جاکر ان کو بلا لاؤ۔ میں نے پوچھا "پہلے کن کو بلاؤں" حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "جس کو دل چاہے" میں نے پوچھا "دونوں کو ساتھ بلاؤں یا علیحدہ علیحدہ۔ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "ساتھ لانا"، چوں کہ مجھے حضرت علیؓ سے زیادہ محبت تھی اس لئے پہلے اُن

کے پاس گیا وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا "چلئے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے"
حضرت علیؓ نے پوچھا "میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے"۔ میں نے کہا "ہاں" حضرت
علیؓ نے پوچھا "کس کو" میں نے جواب دیا "حضرت عثمانؓ کو"۔ حضرت علیؓ نے کہا۔
"پہلے کس کو بلایا ہے"۔ میں نے کہا کہ میں نے حضرت عبدالرحمن سے پوچھا تھا کہ پہلے کس
کو بلاؤں انھوں نے جواب دیا جس کو دل چاہے۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ دونوں
کو ساتھ لاؤں یا یکے بعد دیگرے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ دونوں کو ساتھ لانا۔ ہم وہاں
سے چلے اور حضرت عثمانؓ کے گھر پر پہنچے۔ حضرت علیؓ باہر ٹھیر گئے اور میں حضرت عثمانؓ کے
پاس گیا اور ان سے کہا چلئے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا
میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے۔ میں نے جواب دیا "ہاں"، حضرت عثمانؓ نے پوچھا
"کس کو۔ میں نے جواب دیا حضرت علیؓ کو"۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "پہلے کس کو
بلایا ہے"" میں نے کہا کہ اس کے متعلق حضرت عبدالرحمن سے پوچھا تھا۔ انھوں نے
فرمایا۔ جس سے دل چاہے شروع کرنا اور دونوں کو ساتھ لانا اور حضرت علیؓ دروازہ
پر موجود ہیں۔ ہم وہاں سے چلے اور پھر دونوں حضرت عبدالرحمن کے پاس جا کر ان کے
سامنے بیٹھ گئے۔

حضرت عبدالرحمن نے بہت دیر تک کچھ باتیں کیں پھر فرمایا تمھارے معاملہ کو میں
نے الٹ پھیر کیا اور اب میں تم سے پوچھتا ہوں تم مجھے مشورہ دو اور میری اعانت کرو۔
اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد و پیمان کے ساتھ کتاب و سنت پر مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت
علیؓ نے کہا "اپنی طاقت کے بقدر" اور حضرت عثمان نے کہا "اے ابو محمد (کنیت حضرت
عبدالرحمن) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیمان کے ساتھ تم سے بیعت کرتا ہوں
حضرت عبدالرحمن نے کچھ اور باتیں کیں۔ پھر کہا میں نے تمھارے معاملہ کو واضح کیا اور تم
سے بحث کی تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علی کیا تم حضورؐ کے عہد و پیمان کے
ساتھ مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنی طاقت کے بقدر اور حضرت عثمانؓ
نے جواب دیا کہ اے ابو محمد میں اللہ و رسول کے عہد و پیمان کے ساتھ کتاب و سنت پر تم سے
بیعت کرتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمن نے پھر کچھ اور باتیں کیں اور کہا میں نے تمھارے معاملہ
میں غور کیا اور تم سے پوچھا تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علی کیا تم حضورؐ کے عہد

و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اپنی طاقت کے بقدر، اور حضرت عثمانؓ نے کہا "میں حضورؐ کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر تم سے بیعت کرتا ہوں حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے دونوں ہاتھ جھوڑ کر فرمایا "جو تم چاہو" اور یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ چلے جاؤ۔ یہ دونوں حضرات کھڑے ہو گئے اور تشریف لے گئے۔ جب صبح کی نماز کا وقت ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن نے اپنا عمامہ منگا کر باندھا اور تلوار گردن میں ڈالی پھر منبر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب حضرت صہیبؓ نے نماز ختم کی تو حضرت عبدالرحمٰن منبر کے قریب کھڑے ہوئے۔ اور حمد و ثنا کے بعد کہا۔ لوگو! تمھیں وہ کام معلوم ہے جو تم نے میرے حوالہ کیا ہے اور جس میں تم نے میری اطاعت کا عہد کیا ہے۔ چاہے میں اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر خود اپنے ہی سے بیعت کر لوں۔ پھر فرمایا "اے عثمانؓ کھڑے ہو"، حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے۔ اور حضرت عبدالرحمٰن نے پھر دیگر لوگوں نے بیعت کی۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ ٹھیر گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا، "اے علیؓ تم دھوکے میں آ گئے"۔ حضرت علیؓ نے کہا "کیسا دھوکا"۔ (فاطمہ بنت قیس نے یہ سن لیا) حضرت ابن عباسؓ نے کہا "حضرت عبدالرحمٰن اپنے لئے اعتماد اور پختگی چاہتے تھے"۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اعتماد ظاہر کر دیا۔ پس حضرت عبدالرحمٰن نے جس کو محکم اور مضبوط پایا قبول کر لیا۔ اور ایک ہی بات کو تین مرتبہ تین طریق سے بیان کی۔

حضرت ابو وایل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ تم نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ سے کیوں بیعت کی۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ میرا کیا قصور میں نے حضرت علیؓ سے ابتدا کی اور ان سے کہا کہ میں تم سے کتاب و سنت اور سیرتِ شیخین پر بیعت کرتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا جس قدر مجھ میں طاقت ہے۔ پھر میں نے حضرت عثمانؓ کے سامنے اس کو پیش کیا انھوں نے منظور کر لیا۔

حضرت ابوذر سے مروی ہے جب بیعت عثمانؓ کا پہلا دن ہوا اور مہاجرین و انصار مسجد میں جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن کو دیکھا ایک چادر کا عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اور لوگوں میں اختلاف ہو رہا تھا کہ حضرت ابوالحسن (میرے ماں باپ ان پر قربان) تشریف لائے جب مجمع نساں کو دیکھا تو سب خوش ہو گئے اور حضرت علیؓ فرمانے لگے، وہ کلام جس سے لوگ ابتدا کرتے ہیں۔ وہ بات جس کو لوگ بولتے ہیں۔ وہ گفتگو جو لوگ کرتے ہیں۔ سب سے بہتر

حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور حضورؐ اور آپ کی آل و اولاد پر درود بھیجنا ہے۔

جمیع محامد اس ذات پاک کے لئے جو یکتا ہے۔ صرف اسی کے لئے دوام و بقا ہے۔ ملک کا وہ تنہا مالک ہے۔ فخر و بزرگی اور ثنا صرف اُسی کے لئے ہے۔ اُس کے جلال کے باعث سب (نام نہاد) معبود اُس کے زیر ہیں۔ اور اس کے خوف سے قلوب لرزاں۔ نہ کوئی اس کا مثل ہے اور نہ کوئی اس کا شریک۔ کوئی مخلوق میں اس کا مشابہ نہیں ہم اُس بات کی گواہی دیتے ہیں جس کی خود اُس نے اور اُس کی مسلم مخلوق نے گواہی دی۔ لا الٰہ الا اللہ نہ اُس کی کسی صفت کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تعریف ہو سکتی ہے جس سے اُس کو سمجھایا جا سکے اُس نے بادلوں کی نمی کو دریاؤں میں بہایا اور بادلوں کو تھوڑی بارش اور زیادہ بارش کے ساتھ بھیجا۔ جس سے میدانوں اور ٹیلوں پر گھاس کا فرش بچھایا۔ اور پھولوں اور مختلف قسم کی گھاسوں کو اگایا۔ اور سخت پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے جاری کئے جو صاف جگہ سے بہتے ہیں جن سے پرندوں اور درندوں اور حشرات الارض اور تمام چوپائے اور انسان کی حیات ہے۔ ہم ان لوگوں میں ہیں جو اُس کے دین پر چلتے ہیں کسی دوسرے دین پر نہیں چلتے۔ پاک ہے وہ ذات جس کی صفت کی نہ نعت ہے اور نہ حد۔ اور گواہی دیتے ہیں ہم کہ محمد صلعم اُن کے پسندیدہ بندے اور برگزیدہ نبی اور رسول تھے۔ ان کو ہمارے پاس ایسے وقت بھیجا جب لوگ بت پرست اور گمراہی کا مرکز تھا اور خون بہاتے تھے اور اولاد کو قتل کرتے تھے اور راہ گیروں کو ڈراتے تھے۔ ان کا عیش ظلم تھا اور ان کا امن خوف تھا اور ان کی عزت ذلت تھی۔ حماقت اور ضلالت اور نخوۃ مزید براں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ہمیں گمراہی سے بچایا۔ اور جہالت سے ہدایت دی۔ اور ہلاکت سے بچایا۔

ہم اہل عرب سب سے زائد تنگ معاش کریہ المنظر اور بدحال تھے۔ ہمارا اچھے سے اچھا کھانا پیاز اور ہمارا عمدہ لباس بالوں کے بنے ہوئے کپڑے اور کھال تھی اور بتوں اور آگ کی پرستش مزید براں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے طفیل ہمیں بہتر دین کی ہدایت دی اور مورتوں کی پرستش سے بچایا۔ حق تعالیٰ نے ان کو شعلہ نور سے بنایا اور ان کے سبب سے مشرق و مغرب کو منور کیا۔ پھر حضورؐ کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یکس قدر بڑی آفت اور مصیبت تھی۔ سب مسلمان اس مصیبت میں شریک ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے۔

اے مہاجرین واللہ جب لوگ مرتد ہونے لگے میں نے اس وقت حضرت ابو بکرؓ سے اچھا تلوار پکڑنے والا نہیں دیکھا۔ حضرت ابو بکرؓ ایک ایسی بات پر جم گئے جس کے باعث حق تعالیٰ نے سنت رسول کو جو مٹ رہی تھی پھر زندہ کردیا۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا۔ واللہ اگر ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تب بھی میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے حضرت ابو بکرؓ کے حکم کو سنا اور ان کی اطاعت کی اور میں سمجھتا تھا کہ میرے لئے یہی بہتر ہے۔ وہ دنیا سے اس لئے فارغ تشریف لے گئے اور میں ان کے متعلق یہ خیالات کیسے نہ ظاہر کروں وہ ثانی اثنین تھے اور ان کی صاحبزادی ذات النطاقین نے اپنی چادر کا ٹپکا بنلیا تھا اور دو روٹیاں حضورؐ کی خدمت میں لے جایا کرتی تھیں۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے سات شخصوں کو آزاد کیا جن میں تین عورتیں اور چار مرد تھے سب کو اللہ اور رسول کی وجہ سے تکلیف دی جارہی تھی۔ اور انھیں میں سے حضرت بلالؓ ہیں۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ صلعم کو سامانِ سفر دیا اُن کے پاس اُس وقت چالیس ہزار درہم تھے جن کو انھوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کردیا اور ان کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔

پھر حضرت عمرؓ فاروق اُن کے قائم مقام ہوئے وہ مستجاب تھے اور اللہ کے کام میں لومۃ لائم کا خیال نہ کرتے تھے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ گویا سکینہ اور وقار ان کی زبان پر بول رہا ہے۔ میں کیسے ان کے متعلق یہ نہ کہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ پر سہارا لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے "ہم اسی طرح ساتھ زندہ رہیں گے اور اسی طرح مرنے کے بعد ساتھ رہیں گے۔ اور اسی طرح قبور سے اٹھیں گے۔ اور اسی طرح جنت میں جائیں گے۔ اور شیطان اُن کی آہٹ سے بھاگتا تھا۔ اور دنیا سے شہید ہوکر تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب اے مہاجرین وانصار میں تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر فرمایا۔ اے مہاجرین تم میں جو ایک شخص ابو عبد اللہ حضرت عثمانؓ بن عفان ہیں کیا رسول اللہ صلعم نے ان سے اپنی صاحبزادی کا نکاح نہیں کیا۔ پھر حضورؐ کے پاس جبرئیلؑ آئے اس وقت حضورؐ مقبرہ میں تھے اور کہا اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ اس کی بہن کا حضرت عثمانؓ سے نکاح کر دو۔ اور حضرت عثمانؓ نے جیش عسرۃ کو سامانِ سفر دیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ایک روز حضورؐ کے لئے دلیا تیار کیا اور ایک پیالہ میں لے کر حاضر ہوئے۔ وہ پیالہ بھرا ہوا تھا اور حضورؐ کے سامنے رکھدیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کناروں سے کھاؤ اور چوٹی کو نہ توڑو اس لئے کہ برکت اوپر سے اترتی ہے اور حضورؐ نے گرم کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گھی اور شہد اور گیہوں کے آٹے کے ساتھ تناول فرما چکے تو مخلوق کے پیدا کرنے والے کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا۔ اے عثمانؓ حق تعالیٰ نے تمھارے اگلے پچھلے ظاہر و باطن سب گناہ بخش دئے۔ اے اللہ عثمانؓ کا یہ دن نہ بھولنا۔

پھر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمھیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ لا سیف الا ذوالفقار لا فتی الا علی (تلوار صرف ذوالفقار ہے (نام تلوار) اور جوان صرف علیؓ ہے) لوگوں نے جواب دیا "ہاں" حضرت علیؓ نے فرمایا میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمھیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم علیؓ سے محبت رکھو اور اس شخص سے محبت رکھو جو علیؓ سے محبت کرتا ہو اس لئے کہ حق تعالیٰ بھی علی اور ان کے محب سے محبت کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا "ہاں"

حضرت علیؓ نے کہا میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمھیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب مجھے ساتویں آسمان پر لے گئے تو میں نور کے پردوں اور حجاب میں گیا۔

جب حضورؐ وہاں سے لوٹے تو ہاتف نے پردہ کے پیچھے سے کہا آپ کے باپ (حضرت ابراہیمؑ) اور آپ کے بھائی علی کس قدر اچھے ہیں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ ایسا ہوا۔ حضرت ابو محمد (کنیت حضرت عبدالرحمن بن عوف) نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اور اگر نہ سنا ہو تو میرے دونوں کان گونگے ہو جائیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میرے سوا حالت جنابت میں کوئی مسجد سے گزرتا ہو۔ لوگوں نے جواب دیا "نہیں" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا نہیں معلوم کہ

سوائے میرے دروازہ کے اور سب دروازے مسجد کے بند کر دیے گئے تھے۔ لوگوں نے جواب دیا "ہاں" فرمایا۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ جب میں حضورؐ کی داہنی جانب قتال کرتا تھا تو ملائکہ اُن کی بائیں جانب قتال کرتے تھے۔ پھر فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا تمھارا رتبہ میرے یہاں ایسا ہے جیسا حضرت ہارونؑ کا رتبہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے یہاں تھا۔ لیکن میرے بعد نبوۃ ختم ہوگئی۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین کو پکڑا اور فرمانے لگے "کھیر حسن کھیر" حضرت فاطمہؓ نے کہا یا رسول اللہ حسین اس سے چھوٹا ہے اور ضعیف بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ میں "حسن کھیر" کہوں تو حضرت جبرئیلؑ "حسین کھیر د" کہیں۔ کیا تم میں سے کسی کا ایسا رتبہ ہے ہم صابر ہیں تاکہ حق تعالیٰ اس بیعت میں شدنی امر کا حکم فرمادیں۔ وصلی اللہ علی محمد وسلم

حضرت عمرؓ نے منبر پر فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین دفعہ چونچ ماری۔ میرا خیال ہے کہ کوئی عجمی شخص میرا قاتل ہے۔ اور میں نے خلافت کا معاملہ اُن چھ آدمیوں کے حوالہ کر دیا جن سے حضورؐ خوش تشریف لے گئے۔ جس کو یہ خلیفہ بنا دیں وہی خلیفہ ہوگا۔

مشرق وسطیٰ کے سفرنامے

○ سفرنامہ حجاز

○ ——— ظفر الملک علوی

ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر) کا یہ سفرنامہ "الناظر" کے ستمبر ۱۹۲۳ء تا ستمبر ۱۹۲۶ء کے مختلف شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ ہم اسے اب یکجا پیش کر رہے ہیں۔

○ ادارہ

سفرنامہ حجاز

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کے نامور سپوتوں میں ایک نام ظفر الملک کا بھی ہے۔ آپ کا نام اسحاق علی علوی تھا، مگر دنیائے ادب و صحافت میں ظفر الملک کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام منشی حمایت علی علوی تھا جو کاکوری کے مخدوم زادگان کے اسلاف میں سے ایک ہیں۔ ظفر الملک ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۱ھ قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اردو، عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، اسکے بعد لکھنؤ کے جوبلی اسکول میں انگریزی تعلیم کے لیے داخل کر دیے گئے۔ آپ نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کی طرف توجہ کی۔ محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کی حتی کہ بیرون ملک ہانگ کانگ تک کا سفر کیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی شغل انھیں پسند نہ آیا اور وہ وطن واپس آ گئے۔

گھر پر کچھ دنوں قیام کے بعد حیدر آباد چلے گئے، جہاں عبد الحلیم شرر، علامہ عمادی، ظفر علی خاں اور زبیر محفوظ علی خاں بدایونی کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ یہیں آپ کی ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ حیدر آباد سے پٹنہ آئے۔ یہاں ایک اخبار کی ادارت سنبھالی۔ پھر لکھنؤ آ کر ۱۹۰۹ء میں رسالہ "الناظر" جاری کیا۔ الناظر پریس کھولا جس میں "الناظر" کے علاوہ مختلف انواع کی کتب وغیرہ شائع ہوتی تھیں۔ صحافتی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ظفر الملک جلد ہی ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا تو انھوں نے لیگ کاؤنسل کے رکن کی حیثیت سے اس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی نے علی برادران کے تعاون سے عدم تعاون تحریک چلائی تو ظفر الملک لکھنؤ کے پہلے شخص تھے جنھیں اس سلسلہ میں گرفتار کیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان چھوڑو تحریک بڑے پیمانے پر شروع ہوئی تو ظفر الملک نے جے پرکاش نرائن اور ارونا آصف علی کے ساتھ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۴۶ء میں ظفر الملک جمیعۃ العلما ہند کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سلطان پور گئے تھے جہاں ان کا باسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور اپنے آبائی قبرستان کاکوری میں دفن ہوئے۔

"ظفر الملک کی صحافتی اور ادبی خدمات" از ڈاکٹر اخلاق حسین عارف
کاکوری لکھنؤ۔ تاریخ ۲ جون ۱۹۹۰ء ــــ ملخص

ظفر الملک علوی

پہلی منزل

دوشنبہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء کو رات کے دس بجے جب چارباغ اسٹیشن (لکھنؤ) پر اعزا واقربا سے رخصت ہوا تو تیسرے درجہ کے ایک ڈبہ مین بیٹھنے بھر کی جگہ ملی۔ دن بھر لوگون سے ملنے اور رختِ سفر باندھنے مین مصروف رہا تھا اور مسلسل حرکت کے باعث خستگی وماندگی سے بدن چور چور ہوگیا تھا۔ اِس بنا پر قدرتاً جی چاہتا تھا کہ پاؤن پھیلا کر لیٹون اور سو جاؤن مگر درجہ مین مسافرون کی کثرت نے اِس کا موقع نہ دیا اور ناچار گھٹنون پر سر ٹیک کر جسقدر سونیکی کوشش ممکن تھی کی گئی۔ کانپور کے اسٹیشن پر کچھ مجمع چھٹا تو مین نے فراغت کے ساتھ لیٹنے کی امید باندھی لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد نئے رنگروٹون کی بھرتی ہونے لگی جسکے بعد پھیلے ہوے پاؤن پھر سکڑ گئے اور اسی عالم مین رات تمام ہونے کے بعد علی الصباح نمازِ فجر کے وقت جھانسی پہونچا۔ سامان گاڑی پر سے اتر کر اُس چبوترہ پر پہونچا جہان بمبئی کی گاڑی آکر ٹھہرتی تھی اور مین نے قریب کے نل سے پانی لیکر وضو کیا اور نمازِ فجر ادا کی۔ طلوعِ آفتاب کے بعد چائے کی تلاش مین اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجلس خلافت جھانسی کے ایک کارکن ملے جو ریلوے مین ملازم ہین اور جن سے فتح گڈھ جیل مین ایک بار نیاز حاصل ہوا تھا جبکہ وہ میرے رفیق مجلس مکرمی سید محمد ہادی صاحب سکریٹری مجلس خلافت جھانسی سے ملاقات کرنے آئے تھے اور اُنھون نے مجھے پہچان کر ازراہ کرم چائے کی ضیافت فرمائی اور کچھ دیر تک اسٹیشن پر میرے ساتھ ٹہلتے اور مقامی حالات سناتے رہے۔ جب وہ اپنے کام پر چلے گئے تو مجھکو تلاوت کلام مجید کا موقع ملا۔ اِس سے فارغ ہوتے ہی بمبئی جانے والا اکسپرس آگیا اور ایک نہایت ہی محفوظ اور کم مسافرون والے ڈبہ مین قلی نے میرا سامان پہونچا دیا۔ قلیون اور یکہ گاڑی والون کی جماعت سے ہمیشہ مسافرون کو شکایت رہتی ہے اور جھانسی اسٹیشن پر اس سے قبل متعدد دفعہ مجھے کافی پریشانی اُٹھانا پڑی تھی مگر اب کی بار مین گھر سے تہیّہ کر کے چلا تھا کہ ہر مقام پر مُنھ مانگی اُجرت ادا کردونگا تاکہ اِس سفر مین کسی سے جھک جھک نہو۔ چنانچہ جھانسی مین اِسی طرزِ عمل کی بدولت بہت فراغت سے رہا اور

اچھی جگہ بھی ملگئی، جس ڈبہ مین مین جھانسی سے سوار ہوا یہ تیسرے درجہ کی عام گاڑیون کے مانند تھا
بلکہ اس کی ساخت قریب قریب اُس قسم کی تھی جیسے ڈاک گاڑیون مین اول و دوم درجہ کے متصل ڈبے
ہوتے ہین جنھین شاید ریلوے اصطلاح مین "بوگی کیریج" کہتے ہین۔ ایک طویل گاڑی مین پانچ کمرے
بنے ہوئے تھے جن کے ایک جانب آمد و رفت کے لیے برآمدہ چھوٹا ہوا تھا اور بیرونی جانب چورون
سے محفوظ رکھنے کے لیے پائدان نہین لگائے گئے تھے۔ ایک طرف کے کنارے کا کمرہ ذرا چھوٹا رکھا
گیا تھا اور جو گنجائش اس طور سے نکلی تھی اس مین پاخانہ تھا جسکا دروازہ سب کمرون کے دروازون
کی طرح برآمدہ مین تھا۔ ڈبہ مین داخلہ کے لیے کنارہ کی طرف دونون جانب دروازے لگے تھے۔ رات بھر
آرام سے سونے نہ پایا تھا اس لیے ریل چلی تو تھوڑی ہی دیر مین غافل ہو کر سو گیا، کئی گھنٹہ کے بعد
آنکھ کھلی تو پاس والے کمرے مین ایک صاحب نہایت فصیح انگریزی مین اور کسی قدر بلند آواز سے
سیاست حاضرہ پر گفتگو کر رہے اور اپنے کم عمر مخاطب کے سامنے اہل ہند کی بدبختی۔ تحریک ترک موالات
کی عدم کامیابی اور حکومت دفتری کی چیرہ دستی پر نوحہ خوان ہو رہے تھے۔ مین دیر تک استفادتاً
اُن کی گفتگو کو توجہ سے سنتا رہا تا آنکہ مجھے خطرہ ہوا کہ میرا یہ فعل کہین اُن کی ناگواری کا باعث نہو اور وہ
یہ شبہہ نہ کرنے لگین کہ مین کوئی جاسوس ہون۔ لہذا مین نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے سلسلہ مکالمت
شروع کر دیا۔ یہ صاحب اگرچہ سرکاری ملازم تھے مگر خیالات آزادانہ اور فکر بلند رکھتے تھے اس لیے
حکومت کی کمزوریون اور بدعنوانیون کے اعتراف مین دراز دریغ نہ تھا۔ مہاتما گاندھی کی دل سے عظمت
کرتے۔ تحریک ترک موالات کے اصولون کو بغایت پسندیدہ نگاہون سے دیکھتے اور اُسکی ناکامیابیون کے
اسباب و علل کا نہایت صحیح اندازہ رکھتے تھے۔ ان سے ملکر بہت جی خوش ہوا اور دن مین متعدد بار مختلف
مباحث پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ ۲ بجے دن کو بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو ایک عزیز بھائی سے
ملاقات ہوئی، جن کو روانگی سے قبل تار دیدیا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ سے ریاست مین ایک ممتاز عہدہ پر مامور
تھے مگر اب بد دل ہو کر مستعفی ہو گئے ہین اور عنقریب اپنے وطن واپس جلنے والے تھے۔ تقریباً بیس منٹ
تک اُن سے بات چیت ہوتی رہی۔ اسکے بعد ریل کے انجن نے سیٹی دی اور مین اُن سے رخصت ہو کر
اپنے ڈبہ مین آبیٹھا۔ میرے کمرے مین دو صاحب الہ آباد کے رہنے والے جھانسی سے سوار ہوئے تھے
اور بمبئی تک برابر ساتھ رہے۔ اُن کے ہمراہ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھی تھا جسکو دیکھکر مجھے بار بار اپنے

بچون اور خصوصاً داؤد سلمہ کی یاد آجاتی تھی۔ بچون کے ساتھ مجھے طبعاً ایک خاص دلبستگی ہے اس وجہ سے جو بچہ بھی مجھکو ملجاتا ہے میرے لیے سامان تفریح اور موجب راحت قلب بنجاتا ہے۔ رات کو خوب اطمینان سے سونے کا موقع ملا اور صبح کو نماز و تلاوت سے فارغ ہوتے ہی منزل پر پہونچنے کا انتظار شروع ہوگیا۔ وہ الہ آبادی لڑکا اب چونکہ مجھسے کسی قدر مانوس ہوگیا تھا اس لیے اُسکی بیچین طبیعت کو زیادہ آزادی ملی اور جب تک ریل وکٹوریہ ٹرمینس پر نہین ٹھہری وہ برابر اپنی شوخیون اور اضطراری حرکتون سے میرے اور اپنے ہمراہیون کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بنا رہا۔ ۹ بجے کے قریب گاڑی بمبئی پہونچی اور ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوے۔ قلی نے سامان اُتار کر چبوترہ پر رکھا تو مین اُس صندوق کو حاصل کرنے کی غرض سے آگے بڑھا جو بریک وان مین رکھا ہوا تھا۔ چند قدم چلا ہون گا کہ ایک پولیس کانسٹبل سے مڈبھیڑ ہوئی جس نے فوراً ہی سوالات کی بوچھار کردی۔ آپ حاجی ہین؟ کہان سے آئے ہین؟ کہان ٹھہریے گا؟ ان سوالات کے مختصر جوابات دیتا ہوا مین بریک وان تک پہونچا۔ جہان معلوم ہوا کہ میرا صندوق پچھلے بریک وان مین ہے۔ واپس ہونا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کانسٹبل صاحب سر پر آدھمکے اور وہی سوالات اُنھون نے بھی شروع کردیے۔ مین اس ملک کی پولیس کے کارنامون سے بخوبی واقف ہون۔ اس لیے یہ خیال کرکے کہ مجھے اجنبی جانکر ستانا مقصود ہے مین نے کہا کہ آپ میری فکر نہ کرین اپنی راہ لین۔ اور جب دیکھا کہ یہ بلا اس طور پر نہین ٹلی تو انگریزی مین کسی قدر ترش ہوکر اُس سے کہا کہ مین بمبئی سے خوب واقف ہون۔ اور کسی کی رہنمائی کا محتاج نہین۔ انگریزی دانی کے اظہار کی یہان صرف یہ ضرورت تھی کہ کانسٹبل صاحب کے یہ ذہن نشین ہوجائے کہ کسی سادہ لوح ملا سے سابقہ نہین ہے جسے وہ لوٹ سکے گا۔ جیسا کہ میرے لباس اور چہرے بشرے سے غالباً اس نے سمجھا ہوگا۔ چنانچہ یہ نسخہ فوراً کارگر ہوا۔ اور وہ کانسٹبل کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور جب ایک تیسرے کانسٹبل صاحب نے میرے حال پر توجہ فرمانی چاہی تو اُس نے اُس کو بھی روک دیا۔ خدا خدا کرکے پچھلے بریک وان پر پہونچکر بابو کو بلٹی حوالہ کی اور اپنا صندوق لے کے قلی پر لدوایا اور گاڑی پر سامان رکھکے سوار ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ گاڑی روانہ ہونے والی تھی ایک اور صاحب نازل ہوے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا سامان ہے۔ کہا گیا کہ بستر کپڑے ناشتہ اور دیگر اشیاے خوردنی۔ حکم ملا کہ کھولکر دکھاؤ۔ مین نے پوچھا کہ کیون آپ کون ہین جو میرا سامان دیکھین گے۔ مین متعدد بار بمبئی گیا تھا۔ اور کبھی کسی نے میرا سامان نہ دیکھا۔

اب کی دفعہ یہ نیا انداز دیکھکر خیال پیدا ہوا کہ
کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری مین

دریافت کرنے پر اُس شخص نے اپنے کوٹ کا دامن اُٹھا کر اپنی پیٹی دکھائی جس سے ظاہر ہوا کہ محکمۂ چنگی کا سپاہی ہے۔ مین جانتا تھا کہ ممبئی مین اُترنے والے مسافرون پر یہ پابندی کبھی عائد نہ تھی اور میرے لیے آسان بھی نہ تھا کہ اپنے وزنی صندوق کو جو رسی کے جال سے کسا ہوا تھا تنہا اُلٹ پلٹ کر کھولتا۔ اس لیے مین نے کہا کہ بستر اور کپڑون کا بورہ کھلا ہوا ہے۔ آپ شوق سے اس کا معائنہ کیجیے۔ اور ازاربند سے کنجی کھول کر پیش کی کہ بکس بھی کھولکر دیکھ لیجیے مگر اُس کو اصرار تھا کہ مین گاڑی پر سے نیچے اترون اور سب چیزون کو اپنے ہاتھ سے کھولکر دکھاؤن۔ مین نے کہا کہ جس وقت سامان اسٹیشن کے چبوترہ پر تھا اور قلی موجود تھا تم کو سامان دیکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو یہ میرے مان کی بات نہین کہ اتنا بھاری صندوق گاڑی سے نیچے اتارون اور اُسے کھولون۔ اگر تم کو دیکھنا منظور ہے تو ہرچند کہ یہ امر خلاف دستور ہے مگر چونکہ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میرے سامان مین کوئی چیز لائق گرفت نہین اس لیے بخوشی اجازت دیتا ہون کہ تم سامان دیکھ لو۔ مگر وہ کسی طرح اس پر راضی نہوا۔ اور جب گاڑی والا گھوڑا بڑھانا چاہتا تھا تو وہ اُسی ڈانٹ کر روک دیتا تھا۔ تب مین نے کہا کہ تم اپنے افسر کے پاس گاڑی لے چلو مین اُس سے بات چیت کر لون گا مگر اُسے اصرار تھا کہ یہ کوئی قاعدہ نہین ہے سامان یہین دکھانا ہوگا۔ مجبور ہو کر مین نے کہا کہ تم جو کہتے ہو اُس کی تعمیل سے مین قاصر ہون۔ اب جو تمھارا جی چاہے کرو۔ اِس پر وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ یہ گاندھی کی بات ٹھیک نہین ہے۔ تم سامان دکھاؤ۔ ورنہ بہت پریشان ہوگے۔ مین نے پھر کہا کہ خیر جو کچھ ہو۔ سامان دکھلانے مین مجھے عذر نہین مگر یہ بکس میرے کھولے نہین کھُل سکتا۔ اِس لیے مین مجبور ہون۔ تمھارا جی چاہے کنجی لیکر کھولو اور دیکھ لو ورنہ جو تمھارے اختیار مین ہو کرو۔ وہ دیر تک اُلجھتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ کوئی دھمکی کارگر نہین ہوتی تو ذرا سیدھا ہوا اور پوچھنے لگا کہ کوئی نشے کی چیز تو نہین ہے۔ مین نے کہا نہین تب اُس نے پیچھا چھوڑا اور مین سیدھا ابوصدیق کے مسافرخانے پہونچا جو اسٹیشن سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ مسافرخانہ مین عبدالقادر سکندر معلم حجاج مقیم لکھنؤ کے بیٹے حسن سکندر پہلے سے جس کمرہ مین ٹھہرے ہوے تھے، اُسی کمرہ مین مجھکو بھی ٹھہرنے کی جگہ دی گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جہاز اکبر و زیانی دو دو بیشتر روانہ ہو چکے ہین۔ اب ۲۱ کو ہمایون، جانے والا ہے جسکے ٹکٹ برابر فروخت ہو رہے ہین۔ لہذا مین

تھوڑی دیر ٹھہر کر بازار ہوتا ہوا جناب مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج کی خدمت مین حاضر ہوا۔ وہ میرے دیرینہ کرمفرما ہین۔ اِس وجہ سے بڑے تپاک سے ملے اور فوراً ہی پاسپورٹ بنوا دیا۔ اور مغل کمپنی کے ایک ملازم (مادلال) کو جو دفتر مین موجود تھا بلا کر میرے ساتھ بھیجا کہ ٹکٹ خریدنے مین میری رہنمائی کرے چنانچہ کمپنی کے دفتر مین جا کر ایک سو روپیہ کا ٹکٹ خرید لیا گیا۔

مین ۱۸-اپریل کی صبح کو بمبئی پہونچا تھا اور چونکہ پہونچنے کے دو ہی گھنٹہ کے اندر حصولِ پاسپورٹ اور خریداری ٹکٹ کے مراحل سے فراغت مل گئی تھی اِس لیے دو ڈھائی دن ضروری سامان کی خریداری اور دوستون سے ملاقات کے لیے مل گئے اور جب اتفاق سے ۲۱ کے بجائے ۲۳ اپریل کو جہاز کی روانگی ہوئی تو دو دن فرصت کے اور ہاتھ لگے۔ چار پانچ دن کی اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر مین نے ضروری سامان بھی خریدا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور اخبار خلافت کے دفترون مین بھی حاضری دی۔ اور اس مجلس ملی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق معلومات بھی فراہم کی۔ اور ضمناً بمبئی کی تھوڑی سی سیر بھی ہو گئی۔ گو سابق کی طرح حقیقتاً اس کا کم موقع ملا۔ بمبئی اتنا بڑا شہر ہے کہ اُسکی سیر کرنے کے لیے ہفتون بلکہ شاید مہینون کی اقامت درکار ہے۔ پھر آئے دن کے تغیرات کی وجہ سے ایک ایسے شخص کو جو برسون کے بعد بمبئی آتا ہو ہمیشہ اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی رفیق و رہنما سیر کے وقت ساتھ ہو۔ میرے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ کوئی ایسا راہبر۔ اِس لیے بمبئی کی شہری زندگی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع نہین۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہون کہ بمبئی کی سابقہ چہل پہل مین کوئی کمی محسوس نہین ہوئی۔ اور جدید عمارتون کو دیکھکر تو یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ شہر جو ہندوستان کا عروس البلاد کہا جاتا ہے برابر ترقی کر رہا ہے۔

خلافت کمیٹی کے دفتر مین جب حاضری کا اتفاق ہوا تو دوپہر کا وقت تھا اور کوئی صاحب دفتر مین موجود نہ تھے۔ البتہ دفتر کے متعلقہ مہمانخانہ مین محترمہ بی اماں صاحبہ کے تشریف رکھنے کی خبر ملی چنانچہ مین نے اپنی حاضری کی اطلاع کر کے محترمہ موصوفہ کی قدمبوسی اور رخصتی دعائین حاصل کین۔ اور وہان سے بعجلت چودھری عبدالغنی صاحب ایڈیٹر روزنامہ خلافت اُن کے دفتر چلا گیا۔ وہان کئی گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ کیونکہ اتفاق سے مکرمی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی تشریف لے آئے اور چونکہ وہ ایک سال سے زائد عرصہ تک عراق مین سفر کرنے کے بعد واپس آئے تھے اس لیے دیر تک عراق کے تمدنی و سیاسی حالات اُن سے سنتا رہا اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا کہ عراق کے عربون علی الخصوص علما و مجتہدین نے کمال ہمت

واستقامت سے برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا ہے اور نام نہاد شاہ عراق امیر فیصل کو ناکون چنے چبوا دیے ہین۔ ساتھ ہی یہ دریافت کرکے بہت صدمہ ہوا کہ جیسا اندیشہ تھا انگریزی قبضہ کی بدولت عراق کی مقدس زمین پر وہ تمام شیطنین مسلط ہو گئی ہین جو گویا تہذیب جدید کے لوازم مین داخل ہین اور جنھین قرآن کریم نے مسلمانون پر مطلقاً حرام کیا ہے۔ برطانوی مدبرین و وزرا از راہ تبختر کہا کرتے ہین کہ خدا نے دنیا مین تہذیب پھیلانے کی خدمت ان کے سپرد کی ہے لیکن معلمین تہذیب کے چند سالہ اثر نے عراق نے اس ملک مین بداخلاقیون کی جو فراوانی کردی ہے اُس کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج شخص یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ

اے خدا تُو مجھے میرے دوستون سے بچا

یہ بالکل جداگانہ امر ہے کہ آجکل خود حق وانصاف کے معنی و مفہوم مین ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا ہے اور جن باتون کو ہم مسلمان بداخلاقی سمجھتے ہین دانایان فرنگ کے لیے وہ روزمرہ کی معمولی باتین ہین جنپر حرف گیری کرنے والون کو وہ بڑی خوشی سے بیوقوفون اور جاہلون کی فہرست مین داخل کردینے کے لیے تیار رہتے ہین۔

۱۸ اپریل کو جب مین بمبئی پہونچکر مسافر خانہ مین ٹھہرا تو میرے کمرہ مین حسن سکندر رادر کا معظیہ کے ایک دوسرے مطوف کے بھتیجے سید احمد جعفری پہلے سے ٹھہرے ہوے تھے۔ سامان رکھکر مین ٹکٹ لینے گیا اور وہان سے دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ تو اپنے بستر کے قریب ہی ایک اور صاحب کا سامان رکھا ہوا دیکھا اُس شخص کی صورت اور وضع اور اُسکے لباس اور مختصر ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ ۱۹۱۹ء مین مہاتما گاندھی کی تحریک ستیا گرہ کی شرکت کے بعد سے برابر خفیہ پولیس چونکہ میرے حرکات و سکنات کی نگران رہی تھی اس لیے خیال ہوا کہ اس سفر مین بھی میری معیت کے لیے ایک فرشتہ معین کیا گیا ہے اور اگرچہ اس بات کا بجاے خود مجھکو اطمینان کامل تھا کہ مین کوئی مجرمانہ ارادہ نہین رکھتا تاہم کوئی وجہ نہ تھی کہ مین ایسے شخص کے مقابلہ مین کسی قدر احتیاط نہ برتتا۔ چنانچہ مبلغی کے قیام مین جب کبھی رحمت شاہ نے مجھسے گفتگو کرنا چاہی یا ضروری سامان کی خریداری مین شرکت کا خیال ظاہر کیا تو مین نے ہمیشہ ٹالدیا۔ اور حتی الامکان اس کی موجودگی مین اپنے دوسرے ساتھیون سے بھی زیادہ بات چیت نہ کی۔

۲۰ اپریل کو جبرٹی کر دوسرے روز دوپہر کے بعد جہاز پر سب مسافرون کو سامان پہونچانا ہوگا

اِس سے پیشتر جتنی دفعہ بحری سفر کا موقع ملا کبھی ایسا نہین ہوا تھا اِس لیے پہلے کسی قدر تذبذب ہوا
مگر جب معتبر ذرایع سے اُس کی تصدیق ہوگئی اور اسکی ضرورت بھی سمجھ مین آگئی تو دوسرے روز مین بھی
سامان باندھنے لگا۔ چونکہ حسن سکندر رحمت شاہ کے بھی معلم قرار پا گئے تھے اِس لیے اُنھون نے میرے
اور اُن کے سامان کے لیے ایک ہی بیل گاڑی والے سے طے کیا۔ جب سامان بالائی منزل سے نیچے
آیا اور مین اپنے صندوق کو رسیون سے باندھنے لگا تو رحمت شاہ ازراہ ہمدردی اِس محنت کے کام
مین میرے معین بن گئے اسکے بعد حسن سکندر ہی کے مشورہ کی بنا پر رحمت شاہ تو بیل گاڑی
پر سامان کے ہمراہ آئے اور مین اُن کے ساتھ ٹریم کار مین بیٹھکر گودی (ڈاک یارڈ) پہونچا۔ گودی بعینہ
جہاز کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو اسٹیشن کا مال گودام ریل سے تعلق رکھتا ہے۔ گودی کی وسیع عمارت
کے سامنے سمندر کی طرف چبوترہ تھا۔ ہمارا جہاز اُس سے چند گز کے فاصلہ پر لنگر انداز تھا اور اگلے
پچھلے دونون حصون مین زینے لگے ہوئے تھے جن سے مسافر جہاز پر جا سکتے تھے، چاہیے یہ تھا کہ جیسے جیسے
حجاج آتے جاتے اپنا اپنا سامان جہاز پر پہونچاتے جاتے لیکن ایسا نہین ہوا بلکہ پہلے تو جملہ حجاج اُس
کھلے چبوترہ پر جمع ہوکر اپریل کی تیز دھوپ مین تقریباً دو گھنٹہ کامل تک سکھلائے گئے اسکے بعد جب
مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج تشریف لائے تو ایک ڈاکٹر صاحب بغرض معائنہ طلب کیے گئے۔
پھر جب مولوی صاحب موصوف نے کمپنی کے کارکن سے دریافت کیا کہ حجاج کو ٹھہرانے کے لیے گودی کیون
نہین کھلوا دی جو اُن کو دھوپ کی تپش سے نجات ملتی۔ تو معلوم ہوا کہ اتوار کا دن ہونیکی وجہ سے گودی
نہین کھولی گئی اور خود کمپنی والون نے محض اس اعتماد پر کہ جب حجاج سامان پہونچانے جاتے ہین تو گودی
کھلی رہتی ہے۔ کوئی خاص تحریک نہ کی۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا لیکن آئندہ کے لیے مجھے امید ہے کہ کمپنی
کے کارکن ایسی غفلت نہ کرین گے۔ کچھ توقف کے بعد ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اگرچہ انھون
نے کسی کا معائنہ نہین کیا لیکن اُن کا آنا حاجیون کے لیے موجب نجات ہوگیا اس لیے کہ فوراً ہی
جہاز پر جانے کی اجازت مل گئی۔ اجازت پاتے ہی دفعتاً تمام حاجی دوڑ پڑے اور ہر شخص کوشش کرنے لگا
کہ سب سے پہلے وہی جہاز پر پہونچکر اپنے لیے بہترین جگہ انتخاب کرے اور اس غرض سے کہ انتخاب کرتے ہی
اُس جگہ پر فوراً قبضہ بھی ہو جائے لوگ اپنے ہاتھون مین چٹائیاں، کمبل، دریان اور طرح طرح کے بچھونے
لیے ہوئے تھے۔ بعض لوگ جو اپنا سامان کسی معتبر شخص کے پاس نہین چھوڑ سکتے تھے پورا سامان لیکر

چڑھ رہے تھے، غرضکہ اس وقت کا یہ ہنگامہ اچھا خاصہ تماشہ بن گیا تھا۔

مین اُس وقت تک نیچے ہی کھڑا رہا جبتک زینہ پر چڑھنے والون کا ریلا رہا۔ جب بھیڑ چھٹ گئی تو مین بھی چٹائیان لیکر اوپر پہونچا۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب نے اپنے ایک ماتحت کو اس ہدایت کے ساتھ میرے ہمراہ بھیجدیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر دین مگر جو جگہ اُنھون نے تجویز کی وہ مجھے پسند نہ آئی اور مین نے خود اپنی رائے سے ڈیک کے بالائی حصہ پر ایک جگہ منتخب کی۔ اور وہین اپنی چٹائی بچھا دی۔ تھوڑی دیر بعد جب سامان اوپر آیا تو رحمت شاہ نے بھی میرے پاس ہی اپنی چٹائی بچھالی۔ یہ امر اگرچہ میری مصلحت کے خلاف تھا لیکن پے در پے اتفاقات نے رحمت شاہ کو میرا ساتھی بنا دیا اس لیے مجھے چار و ناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جہاز پر سامان کی حفاظت کا انتظام بمبئی کی پولیس کے سپرد تھا جو ان معاملات مین محافظ حجاج صاحب کے تحت مین کام کرتی ہے اور جب سب حجاج کا سامان بھی آ چکا تو حجاج اپنے اپنے جائے قیام پر واپس آ گئے۔

دوسرے دن معائنہ طبی کا مرحلہ تھا جسکے لیے سویرے ہی سے حجاج روانہ ہونا شروع ہوے۔ مین رات کو ایک دوست کے یہان مدعو تھا اور کھانے کے بعد دیر تک اُن سے بات چیت کرتا رہا۔ جسکی وجہ سے صبح کو سویرے نہ اُٹھ سکا، کچھ تو دیر مین اُٹھنے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ مجھ کو پھلوں کی خرید کرنا باقی تھی مین سب سے آخر مین روانہ ہوا۔ پھر بھی جب مین بھپارے کی جگہ پہونچا تو معائنہ طبی ختم نہ ہوا تھا۔ پہلے جب ہندوستان مین طاعون کسی قدر اجنبی تھا تو عموماً معائنہ طبی کے موقع پر حجاج کے کپڑون کو بھپارہ بھی دیا جاتا تھا مگر اب کہ یہ مرض مثل بخار اور دوسرے ہندوستان کے عام امراض کی فہرست مین شامل ہو چکا ہے۔ بھپارہ دینے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی۔ بھپارہ کا مکان ایک گودام کے مانند بنایا گیا ہے۔ مگر اس کی ساخت مین چونکہ اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اندر بند کیے جانے والے ذی روح مال کو باہر کی کافی ہوا پہونچتی رہے۔ اس لیے باہر سے کھڑے ہو کر اندر کی کارروائیون کا تماشا دیکھنا آسانی سے ممکن ہے چنانچہ پیش آنے والے معائنہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مین نے بھی کچھ دیر تک اس تماشہ کی سیر کی اور جب حجاج کی آخری جمعیت اندر جانے لگی تو مین بھی اُسی گودام مین داخل ہو گیا۔ اس مقام پر حجاج کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا جاتا ہے جو گنتی کے وقت عموماً جیلخانون کی بارکون مین ہوتا ہے۔ پہلے تو جملہ حجاج کو ایک قطار مین بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر

کہا گیا کہ سب لوگ اپنے اپنے پیٹ کھولکر کھڑے ہون۔ اُسکے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اُنھون نے ہر شخص کی جانگھ ٹٹول کر دیکھی کہ کسی کے گلٹی تو نہین ہر۔ پھر حکم ملا کہ سب لوگ اپنے ٹکٹ اپنے سینون پر کھولکر رکھین۔ اور ایک شخص نے آکر ان ٹکٹون اور حجاج کے ہاتھون پر مہرین لگائین جسکے بعد گنتی شروع ہوئی۔ اور متعدد آدمیون نے کئی کئی دفعہ شمار کیا۔ شمار ختم ہونے کے بعد ہدایت ہوئی کہ سیدھے جہاز پر چلے جاؤ۔ اُسی گودام کے ایک گوشہ مین عورتون کے لیے ایک بند کمرہ ہے جسمین ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ معائنہ کرتی ہین اور مجھے اپنی ایک عزیزہ سے معلوم ہوا کہ اُنھون نے اُن کو دھمکی دیکر کچھ رقم بطور نذرانہ وصول کر لی۔

مین نے بعض لوگون کو لکھدیا تھا کہ بمبئی کے قیام مین اگر وہ کوئی خط وغیرہ میرے نام بھیجنا چاہین تو جنرل پوسٹ آفس بمبئی کے پتہ پر بھیجین۔ مگر سامان کی فراہمی اور لوگون سے ملاقات مین ایسا منہمک رہا کہ چار پانچ دن مین ایک دفعہ بھی ڈاک خانہ تک نہ جا سکا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاز کی روانگی مین کسی قدر دیر ہی معائنہ طبی سے فارغ ہوتے ہی مین ٹریم کار پر بیٹھکر ڈاک خانہ گیا اور وہان سے تقریباً نصف گھنٹہ کے اندر اندر واپس آکر جہاز پر سوار ہوا۔

دوسری منزل

جہاز پر دس بجے تک کل حجاج جن کی تعداد تقریباً پانچسو تھی سوار ہو چکے تھے لیکن بندرگاہ کے کنارے پر پانی اتنا نہ تھا کہ جہاز روانہ ہو سکتا۔ دو ڈھائی گھنٹہ کے بعد جب جوار بھاٹا آیا اور پانی چڑھا تو ایک بجے جہاز روانہ ہوا۔ اور جب تک بندرگاہ کا ارکاٹی جو جہاز کی رہنمائی کر رہا تھا جہاز کو بندرگاہ کے باہر پہونچا کر اُتر نہیں گیا۔ جہاز کی رفتار سُست رہی اور اکثر حجاج صحن جہاز پر سے بمبئی کی عمارتون اور بندرگاہ کے جہازون کو دیکھتے رہے۔ مین نے اپنے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ صحن کے پچھلے حصہ مین اُس مقام پر تھی جہان سامان اُٹھانے کے کرین Crane یا آلات جر ثقیل لگے ہوتے ہین چونکہ یہ حصہ بالکل کھلا ہوا تھا اور روانگی کے بعد فوراً ہی پردے بھی ہمین ڈالے گئے، اس لیے سوار ہونے کے وقت سے عصر کے بعد تک آفتاب کی تپش میرے اور اُس مقام پر دوسرے بیٹھنے والون کے لیے حد درجہ صبر آزما تھی۔ یہ مختصر جگہ قدرتی طور پر دو حصون مین تقسیم ہو گئی تھی۔ عین وسط مین دونون جانب کے کرین تقریباً سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر آویزان تھے۔ ایک جانب میرا اور رحمت شاہ کا بستر تھا اور دوسری جانب لاہور کے ایک ٹھیکہ دار صاحب معہ اپنی اہلیہ صاحبزادی اور ایک کمسن بھتیجے کے مقیم تھے یہ کل رقبہ چارون طرف سے محاط تھا۔ ایک سمت مین کرین کو حرکت دینے اور کرین کے رسون کو لپیٹنے والی کلین اس طریقہ سے لگی ہوئی تھین کہ اُن کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گز مربع آہنی حوض چھوٹا ہوا تھا اور ان کلون کے نیچے کے تختے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلسل چلے گئے تھے جہان جہان کھلے ہوے تھے ہمارے لیے سامان رکھنے کی جگہ فراہم کرتے تھے۔ دوسری سمت مین وہ آہنی پشتہ تھا جس پر کرین رکھے ہوے تھے ان پشتون کے نیچے کی جگہ خالی تھی اس لیے ہمین اپنا پانی اور سامان خوردنی رکھنے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی اس پشتہ کے عقب مین لکڑی کی ایک بڑی جعفری بنی ہوئی تھی جسمین بھیڑین بند تھین تیسری سمت مین ایک طویل نل لگا ہوا تھا جسکے اندر وہ زنجیر تھی جو جہاز چلانے والے عقبی پنکھون کو مسلسل حرکت

مین رکھتی ہے اور چوتھی سمت کی حدبندی بھی اسی قسم کی زنجیر سے تھی۔ بس فرق اس قدر تھا کہ جس جانب کو مین نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اُدھر اُس نل کے اوپر ایک فٹ چوڑا آہنی پٹرا لگا ہوا تھا جسکے وسط مین ہم لوگون نے اپنے صندوق اور بورے ایسے طور پر رکھدیے تھے کہ دونون کنارے آمد و رفت کے لیے دروازون کے مانند کھلے رہتے۔ اور دوسری جانب جدھر ہمارے لاہوری ساتھی تھے زنجیر کے اوپر کوئی پٹرا نہ تھا۔ جب تک صحن مین دھوپ رہی (طوطق) طبقۂ اندرونی کے حجاج اپنی اپنی جگہ پر رہے یا جس رُخ دُھوپ نہ تھی وہان اپنے اپنے چولھے جلا کر کھانا پکاتے رہے مگر جیسے جیسے دُھوپ کم ہوتی گئی لوگ نیچے سے اوپر آتے گئے تاآنکہ شام تک صحن کے کسی کونے مین آمد و رفت کا راستہ چھوڑ کر جتہ بھر جگہ نہ باقی رہی جہان کسی نے بستر نہ لگا لیا ہو۔ ہم لوگ چونکہ ایک محاط جگہ مین تھے جہان ہماری چٹائیون کے بچھ جانے کے بعد صرف ذرا سی جگہ آمد و رفت کے لیے بچی تھی اس لیے ہمارے یہان کسی نے مداخلت پسند نہ کی اور ہم جتنی مدت جہاز پر رہے اس حیثیت سے نہایت امن مین رہے۔ دن بھر تمازت آفتاب سے جو تکلیف اُٹھائی تھی شام ہوتے ہی نہایت ٹھنڈی ہوا نے اس کی تلافی کر دی اور رات بڑے آرام سے بسر ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو پہلے صحن دُھویا گیا، اسکے بعد پردے باندھ دیے گئے تو پھر دھوپ کی کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ صحن جہاز ہر روز دھویا جاتا ہے، اور اُس وقت عموماً مسافرون کو تھوڑی سی دقت ہوتی ہے۔ بعض لوگون کا سامان ذرا سی غفلت مین بھیگ جاتا ہے۔ میرے قریب دو جانب چونکہ سطح صحن سے تقریباً ۹ انچہ بلند پٹرے تھے اس لیے کل سامان بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا اور سوا بچھونے اور متفرق چھوٹی چھوٹی اشیا کے کسی چیز کو اُٹھانے کی حاجت نہوتی تھی، دو منٹ کے اندر بچھونے لپیٹ کر کرین چلانے والی کل کے اوپر رکھ دیے جاتے تھے اور متفرق چیزین اسی کی خالی جگہ مین، اور دُھلائی کے وقت مین خود کبھی تو اونچے پٹرے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی جہاز کے دوسرے کسی حصہ کی گشت لگانے چلا جاتا۔ سید احمد جعفری نے جو مسافرخانہ مین میرے ساتھ تھے اور اسی جہاز پر مکہ معظمہ جا رہے تھے اپنے مقام پر گنجایش کم دیکھکر اپنی کریچ کی آرام کرسیان میرے یہان لا کر رکھدی تھین جنمین سے ایک تو وہ دوسرے دن لے گئے اور دوسری پر اُن سے اجازت لیکر ہم لوگ بیٹھتے رہے۔ اس ذریعہ سے مجھ کو مدد بھی راحت ملی۔

حجاج کے ٹکٹ بالعموم بغیر خوراک کے ہوتے ہین اور انھین کھانا پکانے کے لیے جہاز پر جگہ بھی دی جاتی ہے۔ اور لکڑی بھی ملتی ہے۔ ہمارا یون چھوٹا سا جہاز ہے اور اس سبب سے اس کے باورچی خانے بھی چھوٹے ہین لیکن اسی نقص کو رفع کرنے کے لیے صحن کے مختلف حصون مین کنارے کے رخ پر تین چار انچہ کے بلند چبوترے بنا دیے گئے ہین جہان لوہے کی انگیٹھیان رکھکر کھانا پکا لیا جاتا ہے پہلے روز تو لوگ عموماً بمبئی سے روٹیان اور دیگر سامان خوردنی ساتھ لائے تھے مگر دوسرے روز سے ہر طرف چولھے جلنا شروع ہوئے اور صبح سے لیکر شام تک باری باری سے لوگ کھانا پکایا کرتے تھے۔ میری جگہ باورچی خانہ کے عین مقابل تھی اور اگر برابر اسی مین کھانا پکتا رہتا تو دھوئین سے کافی تکلیف ہوتی۔ مگر اول تو وہان گنجائش کم تھی دوسرے دھوئین سے خود پکانے والون کا دم گھٹتا تھا اس بنا پر باورچی خانہ کے اندر پکانے کے بجائے لوگ زیادہ تر باہر کی چبوتریون پر پکانا پسند کرتے تھے اور ایک دو روز کے بعد تو باورچی خانہ بالکل ہی خالی رہنے لگا۔

مین گھر سے تنہا چلا تھا اور بمبئی سے اگرچہ رحمت اللہ شاہ کا ساتھ ہو گیا تھا مگر مین نے اُن کے ساتھ کھانے پکانے کا انتظام گوارا نہ کیا۔ اِسکے علاوہ چلتے وقت اعزا نے اس قدر ناشتہ ساتھ کر دیا تھا کہ اسکے اور معقول رقم محصول ریل کی مد مین مجھے صرف کرنا پڑی جسکے بعد سوائے اسکے کوئی صورت نہ رہی کہ مین اس رقم کی وصولی اور اس ناشتہ کے انبار کو ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز پر تازہ کھانے کے انتظام سے قطع نظر کرون چنانچہ جتنے دنون مین جہاز پر رہا یہ ناشتہ ہی کھاتا رہا۔ اور اُسکی مقدار اتنی تھی کہ اسکے بعد بھی ایک معقول حصہ بچ گیا جو واپسی تک کام آتا رہا بلکہ بعض چیزین ساتھ واپس آئین۔

جہاز پر مسافرون کو کھانے کی فکر کے سوائے کوئی اشغلہ نہین ہے۔ عام جہازون پر لوگ عموماً اپنا وقت گذارنے کے لیے تاش وغیرہ کھیلا کرتے ہین۔ مگر حجاج کی جماعت مین اس کا رواج عام طور پر نہ تھا۔ جو لوگ خواندہ تھے وہ عموماً فرصت کے اوقات کتب بینی مین صرف کرتے تھے۔ ورنہ باہم بات چیت کر کے یا لیٹے لیٹے وقت گذرتا تھا۔ کچھ عابد و زاہد لوگ بھی تھے جو زیادہ تر تسبیح و مصلی سے کام رکھتے تھے پانچون وقت اذانین ہوتی تھین اور متعدد چھوٹی بڑی جماعتون مین لوگ نمازین پڑھتے تھے۔

پینے اور کھانا پکانے کے لیے میٹھا پانی دن مین ایک بار ملا کرتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا اپنا

برتن لیکر پانی بھروانے جانا پڑتا تھا۔ اور لکڑی بھی کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے دن ملتی تھی۔ جسکے لیے بھی لوگون کو جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ پانی اور لکڑی حاصل کرنے کے وقت اچھا خاصا ہنگامہ ہوجاتا تھا کیونکہ ہر شخص چاہتا کہ پہلے وہی حاصل کرلے۔ دینے والا ایک اور لینے والے بہت سے اور وہ بھی بےصبر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض اوقات جہاز کا منشی جو پانی اور لکڑی تقسیم کرتا تھا گھبراکر بھاگ جاتا۔ اور تقسیم رُک جانے کی وجہ سے لوگون کو تکلیف ہوتی۔

مجھے کھانا پکانے کی تو کوئی فکر نہ تھی۔ اور پانی بھی بمبئی سے اتنا لے لیا تھا کہ کئی دن تک چلتا رہا۔ لیکن میرے ساتھی رحمت شاہ کو کھانا پکانے کی وجہ سے دونون چیزون کی ضرورت پڑتی تھی لہذا پانی اور لکڑی کے جو ٹکٹ ہر مسافر کو دیے گئے تھے وہ مین نے رحمت شاہ کے حوالے کردیے اور جب انھین ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اور میرے ٹکٹ کو دکھاکر لکڑی اور پانی لاتے رہتے۔ مین چاے کا عرصہ سے عادی ہون اور جہاز پر تو ہر شخص کے لیے چاے کا استعمال ضروری ہو۔ اس کے لیے مین نے اُسی جہاز کے بھنڈاری سے انتظام کرلیا تھا اور وہ جسوقت ضرورت ہوتی۔ کیتلی بھر پانی گرم کردیتا تھا بھنڈار خانہ چونکہ جہاز کی پچھلی چھت کے بالائی حصہ پر تھا اس لیے مجھ کو چاے کا پانی گرم کرانے کے لیے دن مین کئی بار وہان جانا پڑتا تھا مگر دو ہی تین دن کے بعد سے رحمت شاہ نے مجھے اس سے بے نیاز کردیا۔ اب میرے پاس سوا اس کے کوئی کام نہ تھا کہ دن بھر نوشت وخواند مین مصروف رہون یا جہاز کے ملاقاتیون سے بات چیت کرتا رہون۔

جہاز پر جتنے حجاج بمبئی سے سوار ہوئے تھے اُن مین بڑی تعداد تو بنگالیون کی تھی اور باقی مختلف صوبجات کے لوگ تھے۔ مگر ان مین یہ دیکھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانون کی نہایت قلت تھی۔ انگریزی دان طبقہ کا نمائندہ تو میرے سوا کوئی دوسرا تھا ہی نہین لیکن عربی فارسی جاننے والے بھی انگلیون پر شمار ہوسکتے تھے۔ البتہ جاہل اور ناخواندہ لوگون کی کثرت تھی۔ انگریزی خوان جماعت کے لیے جہان مسجد کی حاضری اور پنجوقتہ نماز معاف ہو۔ وہین معلوم ہوتا ہو کہ حج کا فریضہ بھی اُن کے ذمہ عائد نہین کیا گیا۔ گویا قرآن شریف صرف جاہل مسلمانون ہی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تعلیمیافتہ اور خصوصاً انگریزی خوان مسلمانون کو اس کی حاجت ہی نہین۔ اس بے نیازی کا کیا ٹھکانا ہو! مذاق کے مطابق جہان ملنے والے نہ میسّر آئین وہان خلاف مذاق لوگون ہی مین انتخاب کرنا پڑتا ہو اور اگرچہ میری نوشت وخواند کی مصروفیتین کچھ کم نہ تھین۔ تاہم چند گھنٹے روزانہ نئے احباب کے نذر کرنا

پڑتے تھے۔ رحمت شاہ اب چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اس لیے مجھکو اُن کے بشرے اور حرکات و سکنات پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا اور جب مین نے خود ان کے بیان کردہ حالات سنے اور ایک حد تک اُنکی تصدیق اُن کاغذات سے بھی ہو گئی جو اُن کے پاس موجود تھے اور جو مین نے ایک مناسب موقع پر ان سے مانگ کر دیکھے تو میری بدگمانی جاتی رہی۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی غربت مزاج اور نیک نفسی کے باعث مجھکو اُن سے ایک طرح کا اُنس ہو گیا۔ اور اُس غریب نے حتی المقدور میری خدمت بھی کی۔

ہمارے پڑوسی نظام دین صاحب جو لاہور مین ٹھیکہ داری کا کام کرتے ہین نیکدل اور خوش خلاق آدمی تھے اور اُن کا کمسن بھتیجا غلام حسین اپنی بھولی باتون اور بچپن کی شوخیون سے ہم سب کا دل بہلایا کرتا تھا۔ اِن لوگون کا تو خیر ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا۔ مگر اِن کے علاوہ اور بھی متعدد حجاج ہماری صحبت مین شریک ہو جایا کرتے تھے جنمین ضلع پرتابگڈھ کے ایک صاحب سردار خان سے خاص ربط ہو گیا تھا۔

۱۲ر اپریل کو رات مین جہاز کراچی پہونچکر بندرگاہ مین لنگر انداز ہو گیا۔ صبح سویرے جہاز کی دھلائی سے فارغ ہو کر خلاصیون نے پردے کھول دیے اور کرین اوپر کو اُٹھا دیے اور دن بھر بھوسی اور آٹے کے بورے جو کشتیون پر لاد کر لائے گئے تھے۔ جہاز کے اندرونی تہخانے مین بھرے گئے اِس سے اندر کے مسافرون کو بھی کسی قدر تکلیف ہوئی اور جو لوگ صحن مین فروکش تھے وہ تو دھوپ کی گرمی سے بلبلا اُٹھے لیکن چونکہ کھانے پینے کی مختلف چیزین بیچنے والے جہاز سے متصل بہت سی کشتیون پر سوار تھے اور اُن مین سے بعض بعض آدمی جہاز کے اوپر بھی پہونچ گئے تھے اس لیے مسافرون کو ایک اچھا شغلہ ہاتھ آ گیا تھا اور ہر شخص خریداری مین یا اُس کا تماشا دیکھنے مین مصروف نظر آتا تھا۔ شام تک سب سامان بھی لاد دیا گیا اور کشتیان بھی مال بیچکر چلی گئین۔ دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد جہاز گودی کے کنارے پہونچا دیا گیا اور کراچی کے مسافر سوار ہونے لگے۔ مین نے جلدی جلدی چند خطوط لکھے اور ایک صاحب کی معرفت پولیس سارجنٹ کے حوالے کیے جس نے یقین ہے کہ ڈاک خانہ مین ڈالدیے ہون گے۔

صحن کی چھت پر چونکہ اب تک پردے نہین پڑے تھے اِس لیے آج بھی کافی تکلیف رہی اگرچہ نئے حجاج کی دیکھبھال سامان کی خریداور خطوط نویسی وغیرہ مشاغل کی وجہ سے کم محسوس ہوئی۔ ظہر کے بعد جہاز روانہ ہوا اور عصر کے وقت تک کراچی کا کوئی پتہ نشان باقی نہ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح کو پردے پڑ گئے اور جب تک جہاز پر قیام رہا پھر اس زحمت کا سامنا نہین ہوا۔

جہاز کراچی سے روانہ ہوا تو دوسرے دن مین نے الناظر کے لیے مضمون لکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے جہاز کے ڈاکٹر صاحب اس وقت میرے پاس سے ہو کر گذرے اور مجھے مصروف تحریر دیکھ کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اور جب انھین یہ معلوم ہوا کہ مین ایک ناچیز قومی خادم ہون تو دیر تک مختلف معاملات قومی و ملکی پر گفتگو کرتے رہے اُس وقت سے وہ میرے حال پر خاص کرم فرمانے لگے اور روزانہ ملاقاتین ہونے لگین۔ اُنھون نے کراچی اور عدن مین انگریزی اخبارات خریدے اور مجھے بھی پڑھنے کو دیے۔ کراچی سے سندھ پنجاب اور بلوچستان کے تقریباً ساڑھے چارسو حجاج سوار ہوے اور اگرچہ ان مین بعض بڑے بڑے معزز لوگ بھی تھے۔ مگر تعلیمیافتہ لوگون کی ویسی ہی قلت تھی۔ صرف ایک صاحب انگریزی دان تھے جو پنجاب کے رہنے والے تھے اور بلوچستان کی ریاست لس بیلہ مین ملازم تھے۔ ان صاحب سے ڈاکٹر واکدے کے یہان ملاقات ہوئی اور پھر ان کے ذریعہ سے اکثر بلوچی سردارون سے نیاز حاصل ہوا۔

کراچی سے عدن تک چھ دن کا راستہ تھا۔ جہاز ہمایون چھوٹا تھا اس کی رفتار بھی کم تھی۔ تیز جہاز چوتھے پانچوین ہی دن پہونچ جاتے ہون گے۔ مجھے اس اثنا مین اپنا مضمون بھی ختم کرنا تھا اور بہت سے خطوط بھی لکھنا تھے۔ اس وجہ سے مین روزانہ کئی گھنٹے لکھنے مین مصروف رہتا تھا۔ فرصت کے اوقات مین کبھی دوسرے مسافر میرے یہان آکر جمع ہو جاتے اور کبھی مین ڈاکٹر صاحب کے یہان یا مسٹر فضل الدین کے یہان چلا جاتا اور بلوچی سردارون سے اُن کے حالات سنتا رہتا تھا۔

سندھ کی ریاست میرپور خاص کے سابق رئیس کے چھوٹے بیٹے بھی کراچی سے سوار ہوے تھے ان کو عدن پہونچنے سے قبل ایک تار بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ سید احمد جعفری نے چونکہ اُن سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ پہونچکر ان کے چچا سید امین عاصم کو اپنا معلم بنائین گے اس لیے سید احمد نے ان کی خدمت گذاری یہین سے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اور وہی میرے پاس آکر تار کا مسودہ لکھوا لیگئے۔ جہاز پر بارکونی کمپنی کا وائرلس اپریٹس (بے تار کے تار بھیجنے والا آلہ) لگا رہتا ہو اور اسی کے ذریعہ یہ تار بھیجنا مقصود تھا۔ چونکہ تار بابو انگریز تھا جو ہندوستانی زبان سے بہت تھوڑی واقفیت رکھتا تھا اس لیے سید احمد صاحب کو ایک ترجمان کی حاجت ہوئی۔ اور وہ مجھے اس خدمت کے لیے پکڑ لے گئے اسکے بعد جو کچھ اس انگریز سے گفتگو ہوئی تھی اُنھون نے خواہش کی کہ مین خود چل کر میر صاحب کو سمجھا دون میر نبی بخش صاحب ہندوستانی بھی سمجھتے تھے مگر فارسی مین گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ

تار کے متعلق ضروری بات چیت ختم ہو جانے کے بعد اُن سے دیگر امور پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اور جب ان کو اثنائے گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں تو پھر وہ واجد علی شاہ اور اُن کی اولاد کے حالات اور لکھنؤ کی بعض عمارتوں خصوصاً قیصر باغ کے بارہ میں مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ لکھنؤ کے ساتھ اُن کو اِس قدر دلچسپی تھی کہ پھر جب کبھی اُن سے ملاقات ہوتی تو وہ لکھنؤ ہی کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

جیسے جیسے جہاز کراچی سے دور اور عدن سے قریب ہوتا جاتا تھا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ ۲۸ مئی کو رات کے دس بجے جہاز بندرگاہ عدن میں لنگر انداز ہوا۔ تو دیر تک مسافر دور سے شہر کی روشنیوں کا نظارہ کرتے رہے۔ صبح سویرے ہی کشتیوں پر سامان بیچنے والے آ گئے اور ہر شخص شغل خرید میں منہمک ہو گیا۔ میں نے بھی کچھ پھل اور آلو خریدے۔ چونکہ رحمت شاہ سے اب ربط ہو گیا تھا اکثر کھانے میں بھی شرکت ہونے لگی تھی اِس لیے ترکاری پکوا لینا آسان تھا۔ عدن میں مچھلی بہت خریدی گئی میاں نظام دین اور رحمت شاہ دونوں نے مچھلی خریدی اور اپنے اپنے طور پر پکا کر مجھے بھی کھلائی۔ دس بجے دن کو جہاز روانہ ہو کر دوسرے دن اُسی وقت جزیرۂ کامران کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہاں قرنطینہ ہر اِس لیے ایک رات کے لیے جہاز چھوڑنا پڑا۔ جملہ مسافر ضروری بچھونے اور کھانے کا سامان لئے ہوئے کشتیوں پر سوار ہو کر جزیرہ کے ساحل پر اُتر گئے۔ ساحل سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر قرنطینہ کا کمپ ہر۔ نمازی کمپنی کا ایک جہاز اُسی وقت جاوا کے حجاج کو لیے ہوئے پہونچا تھا۔ پہلے ہماریوں کے مسافر اُتارے گئے پھر دوسرے جہاز کی باری آئی۔ اور دونوں جہازوں کے مسافر جداگانہ کیمپوں میں ٹھہرائے گئے۔ کیمپ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایک مکان میں بلائے گئے جہاں ہر شخص سے کہا گیا کہ اپنے کپڑے اُتار کر وہ لنگی باندھے جو قرنطینہ ہی کی ملک تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لوگ مکان کے اندر جاتے۔ کپڑے اُتارتے۔ لنگیاں باندھتے اور پھر ایک مقام پر لیجا کر اُن کا شمار ہوتا اسکے بعد وہ ایک ایسے کمرہ میں بھیجدیے جاتے جہاں چھت میں فوارہ دار نل لگے ہوئے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے نل کھولدیے جاتے۔ بعض لوگ تو نلوں کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کر لیتے تھے بعض پر تھوڑا ہی سا پانی پڑ جاتا تھا اور بعض جو اِدھر اُدھر کناروں سے لگ کر کھڑے ہوتے بالکل نہیں بھیگتے تھے۔ اتارے ہوئے کپڑے اور بستر ہر شخص سے لے لیے جاتے تھے اور ایک بڑے آہنی ظرف میں رکھکر اُنھیں بھپارہ دیا جاتا تھا غسل خانہ سے نکل کر ہم لوگ اسی بھپارہ والے کمرے میں پہونچے جہاں ہمارے کپڑے اور بستر

ہمارے حوالہ کیے گئے۔ عجلت مین بعض لوگون کے کپڑے اور بچھونے گڈمڈ ہو گئے۔ چنانچہ میان نظام دین کی ایک صدری اسی مین تلف ہو گئی۔ اشیاے خوردنی اور دیگر سامان جو ہم اُس کمرہ مین چھوڑ آئے تھے جہان کپڑے اُتارے گئے تھے وہان سے ملازمین قرنطینہ نے اُٹھا کر باہر رکھ دیا اور جب ہم لوگ اپنے کپڑے پہن کر باہر آئے تو ہر شخص نے اپنی اپنی چیز پہچان کر اُٹھا لی۔ اس موقع پر بعض لوگون کو شکایت رہی کہ انکی چیزین اُنھین نہین ملین۔ مجھے یہان ایک خاص واقعہ پیش آیا۔ میرے دونون بازوؤن مین تعویذ کے طور پر سو سو روپیہ کے نوٹ بندھے ہوے تھے جس وقت مین نے کپڑے اُتارے تو دونون تعویذ کھول کر ہینڈ بیگ مین رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد سردار خان صاحب نے اپنا روپیہ میرے سپرد کیا تو مین نے بیگ کھول کر اُس کو بھی رکھدیا۔ جب غسل خانہ کی طرف جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ عینک اور خلال تر ہو جائے گی۔ لہذا پھر بیگ کھولا اور یہ دونون چیزین بھی رکھدین۔ اسکے بعد جب مین نہا چکا اور اپنے کپڑے پہن کر اپنا سامان اُٹھا رہا تھا تو دفعتاً سردار خان صاحب ایک طرف سے آئے اور ایک تعویذ دکھا کر مجھے پوچھنے لگے کہ کیا یہ آپکا ہی۔ مین نے دیکھا تو کہا ہان یہ میرا ہی ہی۔ اُنھون نے کہا کہ مین نے کھدر کا دیکھ کر خیال کیا کہ آپ ہی کا ہوگا۔ اُسمین پانچ سو روپیہ کے نوٹ تھے۔ خدا معلوم یہ کس وقت میرے بیگ سے نکل کر سردار خان صاحب کے کپڑون مین جا گرا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ورنہ غربت مین اتنی بڑی رقم ضایع ہو جاے گی اور یہ میرے لیے کافی دقتون کا سامنا ہوتا۔ غسل سے فارغ ہو کر سب لوگ کمپ مین پہونچ گئے۔

کمپ کے چارون طرف آہنی جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہی۔ اور وسط مین فوجی بارکون کی طرح چھپرا ور ٹٹیون کی متعدد بارکین بنی ہوئی ہین۔ جن کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑا گیا ہی اور اُن کے دونون جانب ڈھلکے ہوے برآمدے بنائے گئے ہین۔ اِن بارکون مین تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑی بڑی کھڑکیان ہین جنمین دروازے نہین لگائے گئے تاکہ ہوا کی کسی وقت روک نہ ہو سکے۔ بارکون کے درمیان جو راستے بنائے گئے ہین ان کے وسط مین جہان چوراہے ہین گیس کی بتیان لگی ہوئی ہین جن سے میدان اور قریب کی بارکون کے برآمدون مین روشنی رہتی ہی۔ اور بارکون کے اندر لالٹینین روشن کی جاتی ہین۔ احاطہ کے دو جانب آہنی جالی سے متصل پختہ پاخانے غسل خانے اور وضو خانہ بنا ہوا ہی جسمین پانی کے نل لگے ہوے ہین۔ مغربی سمت مین ایک وسیع بارک نماز کے لیے بنی ہوئی ہی جسمین چٹائیان بھی بچھی ہین بارکون

مین کسی قسم کا فرش نہین ہی، جنوبی جالی کے قریب ایک پختہ بارک کسی قدر بلند کرسی کی بنی ہوئی ہی جسمین اول درجہ کے مسافر ٹھہرائے جاتے ہین۔ اور اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک کمرہ مین میٹھے پانی کا ذخیرہ ہی۔ جالی کے جنوبی مشرقی کونہ پر لکڑی کا ذخیرہ رکھا گیا ہی۔ ان دونون کے درمیان مختصر سا بازار ہی جہان ضروری اشیاے خوردنی فروخت ہوتی ہین۔ دوکانون کے باہر ایک تختی پر چیزون کا مقررہ نرخ لکھا ہوا ہے۔ روٹی۔ پراٹھے۔ چاے۔ شربت۔ لمنیڈ۔ برف۔ کھجور۔ شکر۔ سگریٹ۔ تمباکو۔ دیاسلائی وغیرہ مناسب قیمتون پر فروخت ہوتی ہین۔ بکری۔ مرغیان۔ مچھلی اور انڈے بھی ملتے ہین اور ان چیزون کی قیمتین عموماً کم ہین۔

سہ پہر کو ظہر کے وقت ہم لوگ کیمپ مین داخل ہوے۔ اگرچہ آفتاب کی تپش ناقابل برداشت تھی لیکن سمندر کی تازی ہوا کے باعث گرمی کی تکلیف بہت کم محسوس ہوئی۔ اور رات کے وقت اس سہانی فضا مین سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے جو لطف دیا اُس سے تو ہر شخص نہایت ہی شادان و فرحان تھا میرے کرمفرما سردار خان صاحب تو جہاز کی قید اور گرمی سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اگر ان کو کچھ عرصہ تک اس قرنطینہ مین رہنے کا موقع دیا جاتا تو وہ اسے بہت خوشی سے منظور کر لیتے۔ اگرچہ فی الجملہ یہان بھی یہ قید لگی ہوئی تھی کہ تار دن کی چار دیواری کے باہر کوئی حاجی نہین جا سکتا تھا حتی کہ دوسرے جہاز کے حجاج سے بھی ملاقات نہین ہو سکی۔ مگر یہ مقام ایسا صاف اور ستھرا اور ہوادار تھا کہ ہر شخص نے اُس کو پسند کیا۔ یہ قرنطینہ ترکی عہد کی یادگار ہی اور جنگ کے زمانہ سے انگریزی قبضہ مین آ گیا ہی۔ قرنطینہ کی بارکون سے کچھ فاصلہ پر انگریزون کی مختصر فوج کا پڑاؤ ہی۔ اور اُسکے آگے تقریباً ایک میل پر عربون کی بستی ہی۔ جسکا انتظام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ سے متعلق ہی۔ یہ صاحب شام کو ہمارے کیمپ مین بھی تشریف لائے اور اتفاق سے مجھے مل گئے تو دیر تک قرنطینہ کے انتظامات اور دیگر امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ صبح سویرے ہی سے لوگون نے جہاز پر واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دیر مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ چنانچہ مختلف بارکون کے لوگ بارکون سے باہر میدان مین جمع کر کے قطار در قطار بٹھائے گئے اور جب تک کل حجاج کا معائنہ نہو لیا کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پایا۔ گنتی اور معائنہ ختم ہوتے ہی سب لوگ اپنا اپنا سامان لیکر کنارہ کی طرف روانہ ہوے۔ اور وہان جو بڑی بڑی کشتیان کھڑی ہوئی تھین اُن پر سوار ہو کر تقریباً دس بجے تک جہاز پر واپس پہونچ گئے۔ کامران جانے کے لیے جہاز سے جس وقت حجاج کشتیون پر سوار ہوے تھے تو جہاز کے کرانی (کلرک) صاحب نے زینہ کے اوپر کھڑے ہو کر کل حاجیون سے ٹکٹ لیے۔ اور اُس وقت پہلی دفعہ جہاز والون کو معلوم ہوا کہ ۸ آدمی بے ٹکٹ کے سفر کر رہے ہین۔ یہ

سب مدراس کے رہنے والے نوجوان تھے جنھون نے خدا معلوم کیسے بمبئی مین روانگی سے قبل جہاز کے اندر اپنے تئین چھپا دیا تھا۔ بعض لوگون کا خیال تھا کہ جہاز کے ملازمین مین سے کسی کی شرکت سے یہ کارروائی کی گئی۔ بہرحال جب حال کھلا تو جہاز کے عمال چکرائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی غفلت کو ظشت ازبام کرنا اُنھین منظور نہ تھا۔ اس لیے اُنھون نے ان لوگون سے کچھ تعرض نہ کیا۔ جہاز پر بہت سے ایسے مسافر تھے جو اپنی غربت و مسکینی کا اظہار کر کے دوسرے حجاج سے کھانا اور خیرات حاصل کرتے تھے، یہ لوگ بھی اُنھین مین شریک رہتے تھے اور کسی کو گمان بھی نہوا کہ یہ بغیر ٹکٹ سوار ہوے ہین۔ حج کا فریضہ صرف اُنھین لوگون پر عائد ہوتا ہی جن کو خدا نے اتنی استطاعت دی ہو کہ وہ ضروری مصارف برداشت کر سکین۔ لیکن ہندوستان سے ہر سال کثیر تعداد مین ایسے لوگ بھی حج کے لیے ضرور جاتے ہین جن کے پاس صرف جہاز کا کرایہ ہوتا ہی۔ اکثر لوگون کو تو بمبئی اور کراچی کے صاحبان خیر ٹکٹ دلا دیتے ہین اگر وہ اُن ذلتون اور حقارتون کا احساس کر سکتے جو ان مساکین کی بدولت دنیا بھر کے مسلمان حجاج کی نظرون مین عموماً اور ارض حجاز کے باشندون کی نگاہون مین خصوصاً ہندوستانی مسلمانون کی ہوتی ہی اور ان دشوارئیون کا اندازہ کر سکتے جو اُن کی واپسی کے انتظام مین درپیش آتی ہین تو مجھے یقین ہی کہ یہ اصحاب اس تھوڑے سے ثواب کو حاصل کرنا ضروری نہ خیال فرماتے اور محض جانے کا ٹکٹ دلا کر اپنی ذمہ داریون کو ختم نہو جانے دیتے۔

مین ان مفلس و نادار لوگون کو الزام نہین دے سکتا جو فرض نہونے کے باوجود اپنے مذہبی جوش اور مخلصانہ شوق سے مجبور ہو کر سفر حجاز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہین۔ بلکہ حقیقتاً ان کی مذہبی دلدادگی نہایت درجہ قابل قدر ہی۔ لیکن جن لوگون نے اس سفر کو ایک قسم کی تجارت بنا لیا ہی اور جن کی تعداد کچھ کم نہین ہوتی وہ یقیناً حد درجہ قابل ملامت ہین۔ تاجران بمبئی و کراچی اور دوسرے مقامات کے جو صاحب خیر لوگون کو حج کرانے کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہین اُنھین چاہیے کہ آمد و رفت کے کرایے اور زاد راہ و دیگر مصارف ضروریہ کی کفالت اپنے ذمہ لین تاکہ ان غریبون کو بھی ارض مقدسہ مین جا کر ہر قسم کی مصیبتون سے نجات ملے اور ہم مسلمانان ہند بھی تحقیر و رسوائی سے محفوظ رہین۔ مین اس مسئلہ پر اخبار مین علٰحدہ لکھون گا مگر یہان بھی یہ عرض کیے بغیر نہین رہ سکتا کہ اس بارہ مین سب سے زیادہ علماے مذہب کو توجہ کرنا چاہیے۔

۲۰ مئی کو جب جہاز کامران سے روانہ ہوا تو اکثر حجاج نے احرام باندھنا شروع کر دیے۔ ہم لوگون نے

اس وقت تک انتظار کرنا مناسب سمجھا جب تک یلملم کی پہاڑی نہ آجائے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز اور دیگر مستند علمائے ہندوستان کی ہدایات کا یہی منشا ہے جہاز کے کپتان سے جا کر دریافت کر لیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ، رٹی کو شام کے ۴ بجے یلملم کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں گی اور اسی وقت جہاز سیٹی دیگا۔ اسکی اطلاع اپنے ساتھیوں اور دوسرے ملاقاتیوں کو کر دی تھی اور وہ سب لوگ ظہر کے بعد سے سیٹی کے لیے ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے مگر جب عصر کا وقت تنگ ہونے لگا اور سیٹی نہ بجی تو انتظار سے تنگ آکر پھر کپتان کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے مخالف باد تند جو چل رہی ہے اسکے بدولت جہاز کی رفتار کم ہو گئی ہے اور اب نصف شب میں یلملم پہونچنے کی سیٹی دی جائیگی چنانچہ سب لوگوں نے اطمینان سے مغرب کے بعد غسل سے فراغت حاصل کی۔ اور کپڑے اُتار کر احرام کی لنگیاں باندھ لیں۔ صرف سُنّت الاحرام پڑھ کر نیت کر لینا باقی رہ گیا چنانچہ ٹھیک گیارہ بجکے پچاس منٹ پر جہاز نے ایک طولانی سیٹی بجائی اور ہم لوگوں نے سوتے سے اٹھکر جلدی جلدی وضو کیا اور دو رکعت سنت ادا کر کے احرام کی نیت کر لی۔

ایک دن قبل سے جو ہوائے تند چل رہی تھی وہ شام ہوتے ہوتے بہت تیز ہو گئی تھی اور جہاز کو بہت حرکت دے رہی تھی۔ رات کو تو اس کا اثر چنداں نہیں محسوس ہوا مگر رٹی کی صبح کو جہاز کی جنبش زیادہ ہو گئی تو ہر طرف لوگ متاثر ہونے لگے۔ جس کو دیکھو دوران سر میں مبتلا اور بیٹھے بیٹھے اچھے خاصے بیمار کی صورت بنا لیتا ہے۔ بعض لوگوں کو متلی اور قے بھی ہو رہی تھی حتیٰ کہ اکثر جہاز کے ملازمین بھی جو عموماً بحری سفر کے عادی ہوتے ہیں پریشان نظر آتے تھے۔ چونکہ آج جہاز جدہ پہونچنے والا تھا اس لیے میں نے صبح ہی کو اٹھ کر سامان درست کر لیا تھا صرف بستر نہیں باندھا تھا۔ یہ دن ایسا تھا کہ منزل پر پہونچنے کی خوشی میں سارے جہاز پر چہل پہل ہونا چاہیے تھی۔ مگر جہاز کی جنبش کے باعث سب لوگ پڑ گئے تھے اس وجہ سے چہل پہل کی جگہ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میری طبیعت بفضلہ اچھی رہی گو سر کسی قدر بھاری معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال خدا خدا کر کے دو پہر کو ۱۲ بجے جہاز بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوا تو لوگوں کے دم میں دم آئے۔ نمازی کمپنی مبئی کا وہ جہاز جس پر جاوی حجاج سوار تھے اور جو کامران سے ہمارے جہاز کے بعد روانہ ہوا تھا ہم لوگوں سے پیشتر بندرگاہ میں پہونچ گیا تھا اسلیے پہلے اُسی کے مسافر اُتار کر نکلنے پہونچائے گئے۔ توقع تھی کہ شام تک ہم لوگ بھی جہاز سے اتر جائیں گے

مگر معلوم ہوا کہ جدہ مین کشتیان زائد نہین ہین اس لیے صرف ایک جہاز کے مسافر اُتارے جائین گے اور ہمین ایک شب اور جہاز پر رہنا ہوگا۔ جن لوگون کی طبیعتین جہاز کی جنبش سے زیادہ خراب ہوئی تھی اُنھین تو خواہش سکون مین یہ تعطل چندان گران نہین گذرا لیکن مجھے کافی افسوس ہوا۔ بہر حال رضینا بالقضا کہکر رات کو سو رہے۔ ابھی صبح نہوئی تھی کہ کسی نے بیدار کر دیا۔ آنکھ کھولکر دیکھا تو ایک شخص سر پر مسلط تھا۔ مین نے سفر بحری کے اثنا مین عربی کے ضروری اور کار آمد جملہ یاد کر لیے تھے مگر ان کے استعمال کا ابتک کوئی موقع نہین ملا تھا اس لیے مجھے قدرتاً اس شخص سے گفتگو کرنے مین قدرے دقت محسوس ہوئی۔ بہر حال وہ میری ٹوٹی پھوٹی عربی سے خواہ کچھ نہ سمجھا ہو مگر مین نے اُس کی گفتگو کا یہ مطلب سمجھ لیا کہ وہ کشتی والا ہے اور ہم لوگون کو اپنی کشتی پر سوار کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مین نے اُس سے کہا کہ بعد نماز فجر ہم لوگ سوار ہو سکین گے۔ اُس نے اپنا نام محمد بتا کر مجھسے کہا کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جانا تو مجھے پکار لینا۔ اس قدر بات چیت ہو جانے کے بعد مین نے اپنے دوسرے ساتھیون کو جگایا۔ ہم سب لوگون نے ساتھ وضو کر کے اول وقت نماز فجر ادا کی۔ اور محمد کو بلا کر سامان کشتی پر پہونچانا شروع کیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزین ہم نے خود رکھدین اور وزنی اشیا محمد نے اپنے ایک ساتھی کی معیت مین اُٹھائین اور مین معہ اپنے پڑوسیون اور اُن کے ساتھیون کے کشتی پر سوار ہو گیا۔ ہم سب دس آدمی تھے" یہ امر ہمکو جہاز ہی پر معلوم ہو چکا تھا کہ کشتی والے کو کرایہ ساحل پر پہونچکر اُس شرح سے دیا جائے گا جو حکومت کی طرف سے معین ہو۔ اور نیز اس امر کی بھی اطلاع ملگئی تھی کہ کشتی قرنطینہ مین ہم لوگون کو اُتار کر ہمارے سامان سمیت وہین کھڑی رہے گی۔ لہذا قرنطینہ مین ایک رات بسر کرنے کے لیے تقریباً اُسی قدر ضروری اشیا ہمین سے علحدہ کر لی تھین جو کامران مین ساتھ گئی تھین۔ کشتی پر سوار ہو جانے کے بعد اب فکر ہوئی کہ کشتی جلد روانہ ہو تاکہ دھوپ کے تیز ہونے سے پہلے ہم لوگ قرنطینہ پہونچ جائین۔ مگر ہمارا کشتی بان دوسرے مسافرون کی فکر مین جہاز پر جا کر غائب ہو گیا تھا۔ انتظار سے تنگ آکر مین پھر اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک کشتی پر کم سے کم چبیس آدمی ہون تب کشتی روانہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال کچھ مزید وقفہ گذرنے کے بعد محمد تقریباً ڈیڑھ درجن حاجیون کو لیکر آیا اور اُن کو سوار کر کے کشتی روانہ ہوئی۔

جدہ کا قرنطینہ دو مختصر جزیرون مین ہے جو شہر سے تقریباً چار اور پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہین۔ دور والے جزیرہ مین پہلے دن کے جاوی حجاج اُتارے جا چکے تھے۔ اس لیے ہم لوگ قریب کے جزیرہ مین

اُتارے گئے کشتی کا سفر ایک گھنٹہ کے اندر طے ہو گیا۔ جزیرہ مین داخل ہوے تو وہان کوئی سرکاری میزبان نہ نظر آیا۔ ایک ضعیف العمر شخص نے ہم لوگون کو پانی کے ٹکٹ دئے جسکی ظاہری صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تکیہ کا مجاور ہے۔ آگے بڑھے تو متعدد پختہ بارکین دکھائی دین جن کے گرد تارون کی بلند دیوارین تھین مگر امتداد زمانہ سے یہ تار زنگ آلود ہو کر بالکل کمزور ہو گئے اور جالیان جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھین۔ ہم سے پہلے جو کشتیان پہونچ گئی تھین اُن کے مسافر اتر چکے تھے اور اُنھین کی مدد اور رہنمائی سے ایک بارک پر ہم لوگون نے بھی قبضہ کیا۔ تھوڑی دیر مین اور لوگ بھی پہونچ گئے اور ساری بارکین بھر گئین۔ ہم لوگ چونکہ پہلے آئے تھے اس لیے ایک کونہ مین جہان تین طرف سے ہوا آتی تھی کافی جگہ پر ہمارا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور اپنا سامان وغیرہ رکھکر پہلا کام جو مین نے کیا وہ یہ تھا کہ سارے قرنطینہ کا ایک چکر لگایا۔ جزیرہ اتنا چھوٹا ہے کہ شاید پندرہ منٹ کے اندر کل احاطہ اور تعمیرات کا سرسری ملاحظہ ہو گیا۔ کامران کی طرح یہان بھی ایک بھپارہ کی جگہ بنی ہوئی تھی مگر اس جگہ کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ برسون سے یہان انسان کا گذر نہین ہوا۔

کل چار بارکین مسافرون کے قیام کے لیے تھین اور ہم لوگون کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ لہذا بارکون مین خوب ٹھساٹھس بھر چکنے کے بعد جو لوگ بچے اُن کو اپنے لیے خود جگہ پیدا کرنا پڑی۔ بارکون کے شمول مین ایک کمرہ اسپتال کا تھا۔ جو بند پایا گیا اسکے سامنے کے برآمدہ اور پاس کے خالی کمرہ مین جو لاشین چیرنے کی جگہ تھی کچھ لوگون نے قبضہ کیا۔ کچھ بھپارہ گھر کے سامنے والے مسقف برآمدہ مین ٹھہرے اور کچھ اشخاص خود بھپارہ گھر کی عمارت مین داخل ہو گئے۔ غرض جسکو جہان جگہ ملی اپنا اپنا بستر جما دیا۔ ایک طرف ایک دوکان تھی۔ جو پہلے تو بند تھی مگر جب تھوڑی دیر بعد کھلی تو معلوم ہوا کہ روٹی، کھجور، شکر، تمباکو، تربوز، خربزہ وغیرہ یہان نسبتاً گران قیمت پر مل سکتے ہین۔ اور پکے ہوے چاول اور گوشت اور مچھلی بھی ملتی تھی مگر اِن کی صورت ہی دیکھکر انسان کی بھوک بھاگ جاتی جو لوگ جنس ساتھ لائے تھے اُنھون نے تو خیر کھانا پکا لیا۔ باقی جو لوگ بے سروسامان تھے اُن کو اسی دوکان سے کام نکالنا پڑا۔ ہم لوگ اپنے ہمراہ ضروری اشیا خوردنی لائے تھے تاہم کچھ روٹیان اور کھجور یہان بھی خریدی۔ جہاز سے روانہ ہوتے وقت میرا احرام نجس ہو گیا تھا اس لیے کہ جہان کشتی کھڑی تھی وہین جہاز کی نالی کا پانی گر رہا تھا اور اسکی چھینٹون سے سارے کپڑے تربتر ہو گئے تھے۔ مین نے اوڑھنے کی لنگی کو تو اسی وقت سمندر مین دھو کر کشتی کے اندر سکھا لیا تھا مگر پھر بھی طہارت کی طرف سے اطمینان نہ ہوا اس لیے جزیرہ مین پہونچکر باری باری دونون لنگیان پاک کین۔ یہان ہوا اور دھوپ دونون کے درمیان سخت مقابلہ تھا ہوا اس قدر تند و تیز چلتی تھی کہ آدمی اُڑا جاتا تھا اور

کسی دوسری جگہ ایسی ہوا چلے تو لوگ سردی کے مارے کانپ جائیں، اگر یہ جگہ شہنشاہ شمس کے دار السلطنت (خط استوا) سے قریب ہے اس لیے ہوا کی کچھ نہ چلی اور تمازت سے ریت کے ذرات گرم لوہے کے مانند تپنے لگے۔ اور جب کبھی ہوا کے جھونکے سے ریت اُڑ کر کسی شخص پر پڑ جاتی تھی تو وہ بیتاب ہو جاتا تھا جو لوگ بارکوں کے اندر تھے اُنھیں تو خیر ہوا اور دھوپ کی اس جنگ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر جو لوگ برآمدوں میں پڑے ہوئے تھے اُنھیں کافی پریشانی ہوئی۔ خدا خدا کر کے دن گذرا اور شام ہوئی تو تپش آفتاب سے نجات ملی۔ رات کے لیے سارے کیمپ کے وسط میں ایک گیس کی بتی تھی اور بارکوں کے اندر ایک ایک لالٹین جس سے اگرچہ ساری بارک میں روشنی نہیں پہونچتی تھی تاہم بہت کچھ سہارا رہا۔ شدت ہوا کے باعث رات ٹھنڈی تھی اس لیے بارکوں کے اندر بھی کھڑکیاں بند کر کے سونا پڑا صبح کو نماز فجر سے فراغت پاتے ہی کشتیوں کی طرف اپنا اپنا سامان لیکر حجاج دوڑے اور مسافروں کے بیٹھتے ہی کشتیاں روانہ ہو گئیں ہماری کشتی کسی قدر دیر میں چلی اس لیے کہ میاں نظام دین صاحب کے ہمراہ مستورات تھیں جن کو سوار کرانے میں تھوڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ لیکن ہمارا کشتیبان بہت ہوشیار تھا ساحل کے قریب پہونچے تو ہم ان متعدد کشتیوں سے آگے تھے جو ہم سے پہلے روانہ ہوئیں تھیں۔ جدہ پہونچنے سے پہلے محمد نے ہم لوگوں سے بخشش طلب کی تو ہر شخص نے خوشی خوشی اُس کو انعام دیا۔

جدہ کا بندرگاہ عام بندرگاہوں کی طرح نہیں ہے عموماً ہر جگہ ساحل کے کنارے سمندر کی گہرائی بہت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن بندرگاہ بنانے والے جہازوں کو ساحل کے متصل لانے کی غرض سے کہ مسافروں اور مال کے اُتارنے چڑھانے میں بڑی آسانی ہو جائے، کناروں کی ریت کو ہٹا ہٹا کر اتنا عمیق کر لیتے ہیں کہ اگر ہر وقت نہیں تو کم سے کم جوار بھاٹا آنے کے وقت تو جہاز ساحل تک پہونچ سکے۔ جدہ کے ترکی حاکموں نے شاید اس سبب سے کہ حفاظت ساحل کے لیے اُن کے پاس کافی قوت موجود نہ تھی اس بندرگاہ کے کناروں کو عمیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف کشتیوں کی آمد و رفت بھر کا ایک راستہ بنا لیا ہے جسکی نشاندہی کے لیے جگہ جگہ ستون نصب ہیں۔ چونکہ یہ راستہ بہت کشادہ نہیں ہے اس وجہ سے اکثر اوقات کشتیاں بھی ریت میں پھنس جاتی ہیں۔ چنانچہ چند کشتیوں کے سوا عموماً ہر کشتی ریت میں پھنسی تھی۔ اور بلیوں کی مدد سے نکالی جاتی تھی۔ محمد کی ہوشیاری کی بدولت خود ہماری کشتی اس زحمت سے محفوظ رہی۔ ورنہ ساحل تک پہونچنے میں بہت دیر ہو جاتی۔ بہرحال ۱ مئی کو ۹ بجے کے قریب ہماری کشتی جدہ کے کنارہ پہونچ گئی الحمد للہ علی احسانہ

منزل پر پہونچنے کے بعد ہر شخص چاہتا ہے کہ جلد سے جلد معہ سامان کے اُتر جائے۔ عورتوں کی معیت کے باعث ہماری مختصر جماعت کو یہاں بھی تعجیل مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سامان ابھی کشتی ہی پر رہے گا اور مسافروں کو اُتر جانا چاہیے تو پھر دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی اُتر گئے۔ اور عمال حکومت نے ہر شخص سے عہ فی کس کے حساب سے کشتی کا کرایہ وصول کرکے ہمیں اپنا سامان لینے کے واسطے محصول خانے کی طرف جانے کی ہدایت کی۔

تیسری منزل

کشتی کا کرایہ دے کر ہم لوگ اپنا اپنا سامان اُتروانے کی غرض سے محصول خانہ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ کہ دروازہ کے باہر ہی معلمین کے نمائندون کی پلٹن نظر آئی۔ اور جب مین نے اور میرے ساتھیون نے اپنے اپنے معلمون کے نام بتائے تو ایک صاحب نے جو اتفاق سے دونون معلمون کے وکیل تھے ہم لوگون کو علیحدہ کھڑا کر دیا اور جب تک اُن کو یقین نہین ہو گیا کہ ہم لوگون کے سوا اس جہاز پر اُن کے حاجی اور نہین ہین ہم لوگ وہین کھڑے رکھے گئے۔ جہاز اور قرنطینون کی اسیری کے بعد یہ گرفتاری زیادہ ناگوار نہین ہوئی مگر ہر شخص کو اپنے سامان کی فکر تھی اور شہر مین پہونچنے کی جلدی۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد جب ہم محصول خانہ کے کنارے پہونچے تو کشتیون پر سے سامان اُترنے لگا ہمارے وکیل صاحب کے ایک ملازم نے ہم لوگون کا سامان اتروا کر محصول خانہ مین رکھوا دیا اور یہان سرکاری عمال نے جانچ شروع کی۔ اس وقت محصول خانہ مین جو ہنگامہ مچا ہوا تھا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ہر مسافر چاہتا تھا کہ اپنا سامان دکھا کر جلدی سے باہر نکل جائے۔ جن لوگون کے پاس سامان کم تھا وہ اپنے کندھون پر رکھے ہوئے تھے اور زیادہ عجلت وہی کرتے تھے۔ ہم لوگون نے چھوٹی چھوٹی اشیا عورتون کے پاس چھوڑ دی تھین اور ایسی چیزین جن کو محصول خانہ مین دکھانا ضروری تھا حمالون کے ذریعہ سے محصول خانہ پہونچا دی گئین۔ جب حبشی نژاد مفتش کو جس کے سیاہ لباس کی چمک رنگت کی آب و تاب دوبالا کر رہی تھی اور ون سے فراغت ہوئی تو وہ میرے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے سامان مین ایک بچھونا تھا۔ ایک کپڑون کا بورا اور ایک اشیاء خوردنی کا صندوق۔ بستر اور بورے پر تو اُس نے کچھ توجہ نہین کی البتہ جب بکس کھولا گیا تو اوپر ہی دودھ کے چند ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک ڈبہ فوراً اُٹھا لیا اور جا کر قریب کے ایک گودام مین رکھ آیا اور واپس آ کر اُس بکس پر اور میرے دیگر سامان پر کھریا سے ایک نشان بنا دیا۔ یہ کل کارروائی شاید ایک منٹ کے

اندر ہو گئی اور اُس کے بعد وہ تو دوسرے اشخاص کا سامان دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور وکیل صاحب کے ملازم نے مجھسے کہا کہ چلئے سامان باندھیے اور باہر نکلیے۔ مین حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے جب ڈبہ نکالا گیا ہے تو نہ مجھے اپنی سادہ لوحی سے یہ خیال گذرا کہ کسی دوسرے افسر کو دکھایا جاے گا۔ لہٰذا جب سامان باندھ کر باہر نکلنے کے لیے مجھسے کہا گیا تو مین متامل ہوا اور مین نے کہا کہ میرا ڈبہ تو واپس ملجائے۔ جس پر وکیل صاحب کے ملازم نے کسی قدر نفرت و حقارت کے لہجہ مین مجھسے کہا کہ آپ خواہ مخواہ دیر کر رہے ہین آپ تو بہت سستے چھوٹ گئے اور جلد ہی جلد ہی میرے سامان کو خود باندھنے لگا۔ اُس وقت ہجوم اتنا تھا کہ کسی جگہ اطمینان سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لوگ سیل دریا کے مانند دوڑتے ہوے چلے آرہے تھے اور ذراسی غفلت مین دھکہ کھاکر گرنے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا مین بھی خاموش ہو رہا اور سامان اُٹھواکر باہر آیا۔ باہر نہایت تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس لیے کہ تقریباً دس بج گئے تھے۔ مین نے چاہا کہ چھتری کھولکر لگاؤن تو معلوم ہوا کہ محصول خانہ مین چھتری کسی کے پانون سے دب کر ٹوٹ گئی ہے۔ اب مجھے اپنے ساتھیون کا انتظار تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر محصول خانہ مین داخل ہونا چاہا تو ہجوم کی وجہ سے راہ نملی۔ بڑی مشکل سے جب اندر گیا تو دیکھا کہ مستری نظام الدین صاحب ایک کونہ مین کھڑے ہین اور لٹھے کے ایک تھان کے لیے مفتش صاحب اُن سے للعہ محصول مانگ رہے ہین۔ وکیل صاحب کے ملازم نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ مفتش صاحب کو کچھ نذرانہ دیکر اپنی جان چھڑالیے مگر اسے اُنھون نے گوارا نہین کیا لہٰذا جنس کے بورے اور گھی کے پیپے تو مفتش صاحب نے رکھوالیے اور کہا کہ شام کو آکر ان کا محصول دیکر لیجائیے گا۔ اور تھان کا محصول اسی وقت لے لیا۔ مین نے مستری صاحب سے کہا کہ جو سامان آپ سے لیا جاتا ہے اُس کی رسید لے لیجیے تو اب کوئی رسید نہین دیتا۔ اور وکیل صاحب کے ملازم کا حکم تھا کہ گھبرانے کی بات نہین ہے۔ مین خود آپ کے ساتھ آکر سامان لیجلون گا۔ بڑی دقت و دشواری کے بعد ایک صاحب نے رسید لکھ کر دی تو مین اُن کو اور بقیہ سامان اور عورتون کو ساتھ لیکر باہر آیا۔ یہان کل سامان ایک چوپہیہ ٹھیلے پر جسمین خچر جتا ہوا تھا بار کیا گیا اور ہم لوگ سامان کے ساتھ پیدل روانہ ہوے۔ وکیل صاحب کا مکان محصول خانہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہم لوگ اُن کے مکان مین فروکش ہو گئے۔ اِس گاڑی کا کوئی کرایہ نہین دینا پڑا۔ اور وکیل صاحب سے یہ دریافت کرکے خوشی ہوئی کہ حکومت ہاشمیہ کی ہدایت کے بموجب عمال جدہ نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ حجاج کو جہاز پر سے

قرنطینہ لیجانے اور وہان سے ساحل تک پہونچانے کا جو کرایہ عہ/ فی کس کے حساب سے کشتی والے کا مقرر ہو اسی مین جمرک سے جائے قیام تک باربرداری کا صرف بھی شامل ہو۔ اس طریقہ سے حجاج کو بہت آسانی رہی ورنہ اجنبی مقام پر کشتی اور ٹھیلہ والے حاجیون کو دق بھی کرتے اور اُن سے من مانی اُجرتین بھی وصول کرتے۔

یہان بطور جُملہ معترضہ یہ بیان کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ جاپان کے مختصر قیام مین موجی Moji سے ناگاسکی Nagasaki جاتے ہوے ریلوے اسٹیشن پر بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا تھا اور معلوم ہوا کہ وہان ریلوے کی طرف سے سامان اُٹھانے والے قلی ملازم ہین جن کی اُجرتین مسافرون کے ٹکٹ کی قیمت سے دی جاتی ہین اور مسافرون سے سامان ریل پر رکھنے کے لیے کچھ نہین ملتا ہندوستان کے بڑے بڑے اسٹیشنون پر بھی اسی قسم کا انتظام کر دیا جاے تو اجنبی مسافرون کو بہت آسانی وراحت ہو۔

وکیل صاحب کے جس مکان مین ہم ٹھہرائے گئے اُس کی تین منزلین تھین بالائی منزل پر تو وکیل صاحب مع اہل وعیال کے خود مقیم تھے۔ نیچے کی منزل مین دو کمرے تھے جسمین سے ایک کو وکیل صاحب نے اپنا دفتر بنایا تھا اور دوسرا کمرہ حاجیون کے لیے تھا۔ ابتداءً اسی کمرہ مین اُنھون نے ہم لوگون کو ٹھہرایا مگر یہ دیکھ کر کہ اس چھوٹے سے کمرہ مین ہم سب لوگ مع سامان کے اگر رہے تو بہت دقت اور کشمکش رہے گی اُنھون نے مجھے اور میرے ساتھی رحمت شاہ کو وسطی منزل کے ایک کمرہ مین ٹھہرایا
جدہ کے مکانات عموماً ایک ہی نمونے کے بنے ہوے ہین۔ مربع یا مستطیل قطعات زمین پر تین یا چار منزلون کی عمارتین اس اہتمام کے ساتھ بنائی گئی ہین کہ ہر منزل مین تقریباً برابر وسعت کے کمرے نکل آئے ہین اور زینہ کے لیے جگہ چھوٹ گئی ہو۔ کل منزلون کے پاخانے تلے اوپر ہین مکان کے نیچے جو سنڈاس بنائی جاتی ہو سب فضلہ اُسمین جمع ہوتا رہتا ہو اور سال مین ایک بار باہر سے زمین کھود کر نکالا جاتا ہو۔ ہر منزل مین گنجائش کے لحاظ سے دو تین یا چار کمرہ ہوتے ہین جنمین سے کونے والے کمرون مین دو سمت سے ہوا آتی ہو اور اوپر کی منزل مین تین سمت سے۔ مغرب کی جانب چونکہ سمندر واقع ہو اس لیے ٹھنڈی ہوا اُس رُخ سے آتی ہو۔ ۱۰ مئی کو جدہ پہونچا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا روزے بمبئی ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ اور جہاز مین اکثر لوگون نے رکھے مگر مجھے خلوے معدہ کی حالت مین

چونکہ جہاز پر متلی ہونے لگتی ہے اس لیے مین نے قضا کیے تھے۔ صبح سویرے ہی کھانا کھانے کا عادی ہون اور جہاز پر بھی یہ انتظام قایم رکھا گیا تھا۔ چنانچہ کشتی سے اُترنے کے بعد جب سامان اتارا جا رہا تھا تو مین نے وہین ایک خوانچہ والے سے کچھ خرید کر ناشتہ کر لیا اور مکان پر آتے ہی سب سے پہلی فکر پیٹ کی ہوئی۔ وکیل صاحب کے ایک ملازم چھوکرے کو ساتھ لیکر بازار گیا۔ روٹیان گرم و سرد دونون با فراط موجود تھین مگر کھانے کی سب دوکانین خالی نظر آئین۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رمضان مین یہان دن کو کھانا نہین فروخت ہوتا۔ اگرچہ مسافرون کو اس سے تکلیف ضرور ہی مگر رمضان کا یہ احترام نہایت قابل قدر ہی خداوند کریم سب مسلمانون کو اس کی تقلید کی توفیق عطا فرمائین بجے ہوے دہی کے پیالے خونچون مین بک رہے تھے اسی پر قناعت کی گئی۔ خمیری روٹیان یہان کئی قسم کی بنتی ہین اور سب ذائقہ کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہین۔ بلکہ ہندوستان مین جہان جہان بازار کی روٹیان کھانے کا اتفاق ہوا کہین ایسی خوش ذائقہ نہین بنتین رنگون مین جو روغنی روٹی پکتی ہی وہ بھی اچھی ہوتی ہی مگر یہان کی روغنی جسپر تھوڑی سونف بھی چپان ہوتی ہی اُس سے بھی زیادہ مزہ دار ہی اور آبی تو بہت ہی افضل ہی۔ اور قیمت کچھ زیادہ نہین۔ معمولی روٹی کی قیمت پانچ پیسے جو اتنی وزنی ہوتی ہی کہ میرے لیے ایک اور خوش خوراک لوگون کے لیے دو کافی ہین۔ کھانے کے ساتھ ہی پانی کی فکر ہوئی۔ پانی مول لیا تو مٹی کے تیل کا ایک ٹین چار آنے مین ملا۔ اور یہ پانی بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہان میٹھے پانی کے کنوئین نہین ہین اور نہ کوئی چشمہ ہی بلکہ حکومت ترکی کے زمانہ سے سمندر کا کھاری پانی کل کے ذریعہ سے پینے کے قابل بنایا جاتا ہی۔ مگر بسبب اس کے کہ حکومت ہاشمیہ نے یہان کا ایک انجن مکہ معظمہ منتقل کر دیا ہی اب کم مقدار مین پانی بنتا ہی اور عموماً شہر کے مستقل باشندون کو یا جو لوگ خاص اہتمام کر کے اُس کے خزانہ سے حاصل کرین۔ نصیب ہوتا ہی۔ شہر کے عامۃ الناس اور مسافرون کے لیے پانی کے ذخیرے شہر سے باہر ہین۔ یہ بڑے بڑے تہ خانون کی صورت مین ہین جنمین برسات کا پانی جمع کر لیا جاتا ہی اور وہان سے سوڈانی مزدور اور غریب بدو اونٹون یا گدھون پر اور اور بہت ہی غریب لوگ اپنے سرون پر لاد کر لاتے ہین۔ یہ پانی کل کے پانی سے گندلا ہوتا ہی۔ شہر مین جابجا کنوئین ہین جن کا پانی بالکل سمندر کے پانی کی طرح کھاری ہی۔ اور بعض اوقات پانی لانے والے دونون کو مخلوط کر دیتے ہین جس کے باعث نہایت بدمزہ پانی پینا پڑتا ہی

کھانے اور پانی کی خریدکے لیے ضرورت پڑی کر مقامی سکے بدل کر لیے جائین۔ کیونکہ اگرچہ ہندوستان کی چاندی کی ریزگاری بھی چل جاتی ہر مگر جہاز ہی پر مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اس مین خسارہ رہتا ہر۔ جدہ مین اُس وقت روپیہ کے پندرہ ہگل کے قرش ملے۔ چنانچہ حسب ضرورت قرش اور ہلیلے لے لیے گئے۔ ایک قرش کے چار ہلیلے ہوتے ہین۔

کھانے سے فارغ ہوکر مین نے وکیل صاحب سے دیر تک گفتگو کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ جدہ سے براہ راست ینبوع جانے کی قطعاً اجازت نہین تو مین نے مکہ معظمہ حاضر ہونے کا تہیہ کیا۔ وکیل صاحب کے بیان کے مطابق قافلہ سینچر کو روانہ ہونے والا تھا اس وجہ سے مین نے خیال کیا کہ اور ذرائع سے بھی ینبوع جانے کے لیے کوشش کرون۔ روانگی کے وقت ایک دیرینہ کرمفرما کی عنایت سے بمبئی کے ایک عرب تاجر نے جدہ کے ایک معزز تاجر کے نام تعارفی خط لکھدیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ وقت ضرورت ہر قسم کی امداد ملجائے گی۔ اُن کا پتہ دریافت کیا تو وکیل صاحب سے معلوم ہوا کہ رمضان مین عموماً مغرب بلکہ عشا و تراویح کے بعد یہان کے معززین سے ملاقات کا وقت ہر۔ سہ پہر کو مین نے بازار کا ایک گشت لگایا۔ ضرورت بھی تھی۔ چلتے وقت لکھنؤ یا بمبئی سے سامان تحریر تو ساتھ رکھ لیا تھا اور خطوط کے کاغذ بھی مگر مضامین لکھنے کے واسطے کاغذ موجود نہ تھا۔ جہاز پر ضرورت پڑی تو خیر خط کے کاغذ سے کام چلالیا گیا۔ اس کے علاوہ شکستہ چھتری اور ٹوٹے ہوے جُوتے کی بھی مرمت کرانا تھی۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہر۔ چارون طرف شہر پناہ کی دیوارین ہین جسمین چار دروازہ چارون جانب ہین ساحل سے آنے والون کو مغربی دروازہ سے آنا پڑتا ہر دروازہ ہی پر جانب راست ڈاک خانہ اور تارگھر ہر اور جانب چپ محصولخانہ کا دفتر۔ اسی سڑک سے چل کر شرقی دروازہ (باب المکہ) پر پہونچتے ہین جہان سے قوافل مکہ معظمہ یا دیگر حصص ملک کی طرف جاتے ہین۔ سڑک کے دونون طرف بازار ہے جسمین تین چار بڑی دوکانون کے سوا سب چھوٹے چھوٹے متفرق چیزون کے دوکان دار ہین۔ قہوہ خانے تو پھاٹک مین داخل ہوتے ہی ملتے ہین اُس کے بعد کھانے کی چند دوکانین ہین اور پھر متفرق اشیا کی۔ دروازہ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر چوراہہ ہر جہان سے شمال وجنوب کے بازارون کا نظارہ ہوجاتا ہر شمالی بازار زیادہ بارونق ہر کیونکہ تقریباً تمام تھوک فروش اور بڑے بڑے تاجرون کی دوکانین اسی بازار مین ہین۔ جنوبی بازار مین صرافہ اور کھانے کی دوکانین ہین ان بازارون کے اطراف مین شہر

بسا ہوا ہے۔ شمالی بازار کے خاتمہ پر جو بڑے بڑے مکانات ہین اُسے گویا یہان کی سول لائنس سمجھنا چاہیے۔ فصیل کی شمالی سمت مین ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الجدید ظاہر کرتا ہے کہ وہ حال ہی مین بنا ہے یہان سے ایک کشادہ سڑک نکلی ہے جو فصیل کے نیچے نیچے نصف مغربی سمت کو طے کرکے شمالی بازار کی سڑک سے جاکر ملجاتی ہے۔ اسی کے کنارے تمام قنصل خانہ ہین۔ دروازہ کے باہر سمندر کے کنارہ ایک وسیع میدان ہے جہان لوگ شام کو بغرض ہوا خوری جاتے ہین۔ اور اسی میدان مین ایک جانب شریف مکہ کے ہوائی جہازون اور مختصر فوج کی بارکین بنی ہوئی ہین۔ یہ ہوائی جہاز مشق اور ممکن ہے کہ مرعوب کرنے کے لیے بھی روزانہ صبح کو اُڑائے جاتے ہین اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک نو وارد مسافرون اور شہر کے عجائب پسند لوگون کو تماشا دکھا کر اپنی جگہ واپس جاتے ہین۔ اس عمارت کے مشرق جانب تھوڑے فاصلہ پر حضرت حوا علیہا السلام کا مزار ہے جس کی زیارت کے لیے ہر حاجی باب المکہ کی راہ سے جاتا ہے۔

بازار مین جاکر پہلے چھتری کی مرمت کرائی۔ پھر متعدد دوکانون پر کاغذ کی تلاش کی۔ اول تو مرضی کے مطابق کاغذ کسی دوکان پر نہ ملا۔ اور جب دو ایک کاغذ پسند کیے تو دام بہت مانگے گئے بازار مین عام طور پر اشیائے خوردنی کو چھوڑ کر کل مال یورپ کا ساختہ نظر آیا۔ شبہ ہوتا تھا کہ بمبئی کے کسی چھوٹے سے بازار مین کھڑے ہین۔ چند انگریز بھی دکھائی دیے جو یقیناً قنصلات سے تعلق رکھتے ہون گے۔ جوتے کی مرمت ایک بخاری سے کرائی۔ اُس کی دوکان پر عمدہ قالین بچھا ہوا تھا۔ اور وہ خود گھڑی سازون کا سا ایک میز سامنے رکھے اور ایک تپائی پر بیٹھا ہوا جوتہ بنا رہا تھا۔ اُسنے نہایت خوش اخلاقی سے بٹھایا اور فارسی مین دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ شام کو بازار مین ہم لوگون نے کھانا کھایا۔ اتفاق سے مالک دوکان ایک ایسا عرب تھا جو کئی بار ہندوستان ہو آیا تھا اور اس لیے اُردو صاف بولتا تھا۔ اُس دوکان پر اور نیز دیگر دوکانون پر کئی قسم کا گوشت، سبزی، اور دال موجود تھی۔ کھانا ہمارے مذاق کے مطابق تو نہ تھا اس لیے کہ نہ اس مین کافی روغن تھا۔ نہ مصالح اور نہ مرچ۔ تاہم پیٹ پالنے کے لیے غنیمت تھا۔ اور کچھ زیادہ گران بھی نہین اس لیے کہ دونون آدمیون نے کئی قسم کے کھانے سے ۱۲ ار مین پیٹ بھر لیا اور آخر مین سابودانہ کی کھیر سے مُنھ بھی میٹھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد قہوہ خانے مین بیٹھ کر چائے پی۔ چائے قہوہ اور تمباکو کا رواج یہان بہت ہے۔ قہوہ خانون مین کافی مجمع تھا۔ اور اکثر

لوگ حقے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ یہاں کے حقے دیکھنے میں بہت شاندار ہیں کیونکہ پیچوان کا عام طور پر رواج ہی مگر خشک تمباکو پیا جاتا ہی اس لیے اہل ہند کو اس میں مزہ نہیں مل سکتا۔

یہاں کے بازار میں تقریباً وہ تمام اجناس اور ترکاریاں ملتی ہیں جو ہندوستان میں عام طور پر مستعمل ہیں لہذا جو لوگ اپنا کھانا خود پکانا چاہتے ہیں اُن کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ نرخ نسبتاً گران ضرور ہی مگر اس ملک کے موقع پر نظر کرکے مجھ کو زیادہ گران نہیں معلوم ہوا۔ روپیہ کا تقریباً تین سیر گیہوں کا آٹا ملجاتا ہی خربوزے اور تربوز کے سوا بازار میں میوہ کوئی نہ تھا مگر کاغذی لیموں اور سبز پودینہ بافراط ملتا ہی۔ تربوز بعینہ اسی قسم کا ہوتا ہی جیسا فرخ آباد وکانپور میں ملتا ہی اور بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہی۔

میرے دوست مستری نظام الدین صاحب مجھ سے جُدا ہوکر اپنے اور ہمراہیوں کے خورد و نوش کا انتظام کرنے کے بعد جمرک (محصول خانہ) گئے کہ جو سامان صبح کو رکھ لیا گیا تھا اُس کو محصول ادا کرکے لے آئیں۔ واپسی میں بازار میں ملے تو اُنھوں نے بیان کیا کہ چالیس روپیہ کے قریب اُن کو محصول دینا پڑا۔ اجناس اور گھی کے علاوہ اُن کے پاس تقریباً پانچ سیر تمباکوے کشیدنی بھی تھی جس کی قیمت ہندوستان میں غالباً ایک روپیہ ہوگی اُس پر آٹھ روپیہ محصول کے دینے پڑے۔ اسی طرح معمولی لٹھے کے ایک تھان پر جس کی اصلی قیمت دس گیارہ روپیہ سے زائد نہوگی چار روپیہ محصول کے لیے گئے۔ اس حساب سے میں نے خیال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ڈبہ دودھ کا لیکر مجھے بہت سستا چھوڑ دیا ورنہ کم سے کم تیس چالیس روپیہ مجھکو بھی دینا پڑتے۔

رات کو عشا کے بعد اُن عرب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جن کے نام خط لایا تھا۔ وہ خود تو نہیں ملے مگر اُن کے بڑے صاحبزادہ اور ایک معتمد ملازم سے ملاقات ہوئی۔ وہ دونوں بہت اخلاق سے پیش آئے اور ہر امکانی امداد و اعانت کا وعدہ کیا مگر ینبوع کے راستہ سے مدینہ منورہ جانے کے معاملہ میں صاف اپنی معذوری ظاہر کی۔ جس کے بعد مجھ کو بالآخر یہ طے کرنا پڑا کہ سیدھا مکہ معظمہ حاضر ہوں چونکہ ماہ صیام قریب الاختتام تھا اس لیے مجھے فکر ہوئی کہ اب جلد سے جلد مکہ معظمہ پہنچ جاؤں تاکہ جسقدر دن باقی رہے ہیں یہ وہیں بسر ہوں۔

دوسرے دن علی الصباح نماز فجر سے فارغ ہوکر حضرت حواؑ کے مزار کی زیارت کے لیے گئے۔ یہ مزار ایک وسیع ریتیلے میدان میں ہی۔ مزار کے چاروں طرف چار دیواری ہی۔ حضرت حواؑ جس زمانہ میں تھیں روایات مشہور کے مطابق اُس وقت انسان کے ارتقاء عقلی نے موجودہ جسمانی انحطاط کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔

اِس لیے اُس عہد کے انسانون کی عمرین دراز اور جسامت طویل وعریض ہوتی تھی۔ اجودھیا (فیض آباد) مین ایک بڑی بھاری قبر کے متعلق کہا جاتا ہی کہ یہ حضرت شیث علیہ السلام ابن حضرت آدم علیہ السلام کی ہے۔ مین اس کی زیارت کر چکا تھا اس وجہ سے حضرت حوأ کی طولانی قبر کو دیکھ کر متعجب ہوا۔ حضرت حوأ کا مزار ہندوستان کی قبور کے مطابق نہین ہی بلکہ بیشتر عرض کی وجہ سے صرف قبر کے دونون جانب بطور نشان دیوارین بنا دی گئی ہین جن کے درمیان مین حوض سا بن گیا ہی۔ پائین مزار مین ایک قبہ بنا ہوا ہی اور بیان کیا جاتا ہی کہ حضرت حوأ کا فرق مبارک یہان مدفون ہی۔ باب المکہ سے نکلتے ہی بھکاری بچون عورتون اور مردون کا جم غفیر نظر پڑتا ہی۔ جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے یا بیٹھے رہتے ہین۔ اور زائرین کو دیکھتے ہی دعائین دے دے کر اور اشعار دعائیہ و آیات قرآنیہ پڑھ پڑھ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہین۔ اور جو لوگ اپنی جیب کی وسعت محدود پر نظر کر کے یا کسی اور سبب سے اُن کو بھیک دینے مین پہلوتہی کرتے ہین اُن کے ساتھ دور تک لگے رہتے ہین حتیٰ کہ بعض بیباک نیچے تو دامن پکڑ لیتے ہین۔ اندھے اور معذور فقیر الگ رستہ مین بیٹھے ہوے صدائین لگاتے رہتے ہین اور ان کی حالت یقیناً قابل رحم ہی۔ مزار کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی جو پہلی جگہ فاتحہ خوانی کے لیے معین ہی وہان مجاورین کی معقول تعداد موجود تھی جنھون نے صدر مین ایک جانب چادر بچھا دی تھی کہ زائرین اُسی پر اپنے نذرانے رکھدین یہان پر وکیل صاحب کے خوردسال پوتے نے جو ہم لوگون کو زیارت کرانے لائے تھے مقررہ الفاظ مین سلام پڑھوایا اور اس کے بعد جب قبہ کے اندر جانے لگے تو باہر چند غریب بدوی عورتین جوتے رکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی ملین جن کے پاس جوتے امانت رکھ کے قبہ مین داخل ہوے۔ یہان ہجوم زائد تھا خصوصاً عورتون کی تعداد کثیر دیکھکر افسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجمع چھٹا تو ہم لوگ اندر حاضر ہوے۔ یہان ایک تابوت رکھا ہوا ہی جس کے ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی لگا دی گئی ہی اور اسی مین سے شائقین کو زیارت کرائی جاتی ہی۔ مین نے باہر سے فاتحہ خوانی پر قناعت کی اور مجاورون کو کچھ دے دلا کر رخصت ہوا۔

زیارت سے واپس آنے کے بعد ہی مین نے وکیل صاحب کے بیٹے سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ مین آج ہی جانا چاہتا ہون اور چونکہ ہندوستان ہی مین ایک عزیز کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان فاصلہ کم ہی اور گدھے پر سوار ہو کر جلد پہونچنا ممکن ہی اور ایک دن قبل بازار مین ایک صاحب سے شرح کرایہ وغیرہ بھی دریافت کر لی تھی اس لیے مین نے اُن سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک گدھا

اور سامان کے لیے ایک اونٹ مہیا کر دین۔ اور مین نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ آپ انتظام نہ کر سکین تو مجھ سے کہدیجیے مین خود انتظام کر لون۔ یہ اس لیے کہ ایک صاحب نے بازار مین انتظام کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اُنھون نے وعدہ کیا اور دوپہر کو آکر تاکید کی کہ اپنا سامان تیار رکھون۔ سامان باندھ رہا تھا کہ پھر تاکیدی پیام پہونچا کہ اونٹ آتا ہی ہو سامان تیار رکھیے۔ جمعہ کا دن تھا مگر مجھے اُس روز روانگی کے انتظامات مین نماز بھی نہ مل سکی۔ اور میری حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب عصر کے قریب وکیل صاحب کے دوسرے بیٹے نے آکر یہ اطلاع دی کہ اونٹ نہیں ملا۔ مین اسی حالت مین خود باہر نکلا اور باب المکہ تک گیا جہان سے قوافل روانہ ہوتے ہین۔ معلوم ہوا کہ قافلہ جا چکا اور اب کوئی اونٹ نہیں ہے۔ پھر گدھے والے کے پاس گیا تو اُس نے دیر تک فضول بحث و گفتگو مین وقت ضایع کیا۔ پہلے تو سرے سے انکار ہی تھا کہ بغیر وکیل کی وساطت کے گدھا نہیں مل سکتا۔ مگر بعد کو وہ راضی ہو گیا تو اب کرایہ بہت مانگنے لگا۔ مین ہار کر گھر چلا آیا اور یہان وکیل صاحب کے بیٹے کو بہت ملامت کی۔ میرے رنج و غصہ سے وہ متاثر ہو کر اپنے باپ کو بلا لائے جو بہت چالاک آدمی ہین اُنھون نے مجھے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور یہ طے پایا کہ مین اسی وقت گدھے پر روانہ ہو جاؤن اور سامان میرے ساتھیون کے ہمراہ دوسرے دن بھیجدیا جائے۔ اب مجھے یکسوئی خاطر نصیب ہوئی۔ تو اپنی اس غلطی پر بہت انفعال ہوا کہ وکیل صاحب کے بیٹے کو غصہ مین بہت سخت سُست کہہ ڈالا تھا اور مین نے اُن سے اور اُن کے والد صاحب سے بمنت تمام معذرت کی جس کے بعد قرارداد کے بموجب مین نماز عصر سے فارغ ہو کر اُن کے صاحبزادہ کے ساتھ گدھے والے کے یہان گیا۔ اُنھون نے چودہ روپیے کرایہ طے کیا تھا اور اگرچہ میرے اندازے سے یہ بھی زائد تھا۔ مگر مین نے مجبوراً منظور کر لیا اور مختصر سامان جو ساتھ لیجانے کی غرض سے لایا تھا دونون جانب خرجیون مین بھر کر ساتھیون اور وکیل صاحب کے صاحبزادہ سے رخصت ہوا۔ اونٹ کا کرایہ چودہ روپیہ آٹھ آنے بتائے گئے تھے لہذا اپنے ساتھی مستری نظام الدین صاحب کو پندرہ روپیے دیدیے کہ جب آنے لگین تو میرے سامان کے اونٹ کا کرایہ دیدین۔ گدھے پر عمر بھر مین کبھی سوار ہونے کا اتفاق نہوا تھا اس بنا پر وکیل صاحب اور ساتھی دونون منع کرتے تھے مگر مین نے مکہ معظمہ جلد پہونچنے کے خیال سے ان کے مشورون کو رد کر دیا۔ اور اب جو سوار ہوا تو محسوس ہوا کہ واقعی ٹیڑھی کھیر ہے۔ باب المکہ پر ایک عامل حکومت نے روک کر دریافت کیا کہ تمھارے پاس گنیان تو نہیں ہین۔ اور میرے انکار کے باوجود اُس نے میری کمر اور گردن وغیرہ ٹٹول کر دیکھی۔ اُس سے نجات ملی تو

گدھا لیکر تیزی سے بھاگا۔ سڑک یہان کی کسی قدر ڈھلوان تھی اور راستہ مین جگہ جگہ پتھر پڑے ہوے تھے پہلے تو مین ڈرا کہ کہین گر نہ جاؤن پھر ہمت کر کے اور جسم کو سادھ کر بیٹھا تو تھوڑی دیر کے بعد اندیشہ جاتا رہا۔ میرے ساتھ ایک شخص بطور رہنما کے تھا۔ تھوڑی دور آگے چلکر دو ایرانی زائرین بھی مِل گئے وہ بھی اسی قافلہ کے رُکن تھے مگر ذرا پہلے روانہ ہو گئے تھے۔ اب چارون گدھون نے ساتھ چلنا شروع کیا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین مین نے محسوس کیا کہ مجھ کو اب کسی قسم کا خطرہ نہین ہے البتہ راستہ مین پتھرون اور اونٹ کی ہڈیون سے جب وہ ٹھوکر لیتا تھا تو مجھے خیال ہوتا کہ کہین گر نہ جائے۔ مغرب کا وقت آیا تو ہم لوگون نے ایک مقام پر جہان قہوہ خانہ بنا ہوا تھا ٹھہر کر نماز ادا کی۔ ابتدا مین تو ہم سب لوگ لبیک پڑھنے مین زیادہ مشغول رہے اور معمولی تعارف کے سوا کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ نماز مغرب کے بعد کچھ کچھ بات چیت ہونے لگی۔

دونون ایرانی قالین کے تاجر اور ایران کے اُس حصۂ ملک کے باشندے تھے جو دراصل عراق عرب کا کبھی ایک جزو تھا اور اس وجہ سے فارسی عربی دونون زبانین بولتے تھے۔ ان کے ملک مین ریل اور پختہ سڑکین نہین ہین اس لیے گدھے اور اونٹ کا وہان بھی رواج ہے اور یہ لوگ گدھے کی سواری کے عادی تھے۔ رات اندھیری تھی اس لیے مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد سے راستہ دکھائی دینا موقوف ہو گیا اور اب مین تمامتر گدھے کے رحم و کرم پر تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے تجربہ سے ظاہر ہو گیا کہ یہ گدھے اس راستے پر چلنے کے عادی ہین اور کوئی اندیشے کی بات نہین میرے ساتھیون کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھون نے کرایہ کچھ زائد ہی دیا ہے مگر میرا گدھا نسبۃً تیز تھا اور عموماً آگے ہی رہتا تھا۔ بائیسکل پر چڑھنے والے کو گدھے کی سواری آسان ہوگی کیونکہ اسمین بھی جسم کا توازن قایم رہنا چاہیے

جدہ اور مکہ کے درمیان اگرچہ پختہ سڑک نہین ہے مگر کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ریت پس کر ہموار ہو گئی ہے اور سوائے اسکے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر یا اونٹون کی ہڈیان پڑی ہوئی ہین۔ راستہ کی صورت بالکل سڑک ہی کی سی ہو گئی ہے۔ راستہ کے دونون جانب تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے بدوؤن کے جھونپڑے ملتے ہین۔ جہان قہوہ چائے اور پانی ملجاتا ہے اور راستہ اتنا پُرامن ہے کہ ایک دو آدمیون کو بھی کسی قسم کا خوف نہین ہو سکتا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم پھر رُکے۔ میرے ساتھیون نے تو عشا کی نماز بھی پڑھ لی مگر مین صرف چاء اور تمباکو نوشی مین مصروف رہا۔ راستہ مین میرے ساتھی تو دو ایک بار گر بھی

مگر مین بچا رہا۔ چونکہ وہ گدھے کی سواری کے عادی تھے اس لیے گرے تو چوٹ ذرا بھی نہ لگی۔ تقریباً دس بجے رات کو بحرے پہونچے رات کا وقت تھا اس لیے اس مقام کو مین دیکھ نہین سکا۔ صرف بازار سا نظر آیا۔ ایک قہوہ خانے مین ہم لوگ اُترے۔ خرجیون سے سامان اُتار کر ایک کوچ پر رکھدیا گیا اور مین وضو کر کے نماز مین مصروف ہوا۔ میرے ساتھیون نے فوراً حقہ بھروایا اور کھانا لانے کی ہدایت کی۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم تینون آدمی کھانا کھانے بیٹھے تو تازہ تازہ خمیری روٹیان اور تلے ہوے انڈے کھانے مین آئے۔ اُس کے بعد خربوزہ اور تربوز۔ مین اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ہندوستان مین بھی تربوز بہت کم کھاتا ہون۔ اور کھانے کے بعد تو تمام عمر نہین کھایا تھا۔ مگر ان صاحبون کے اصرار سے مجبور ہو گیا اور غالباً یہ یہان کی آب و ہوا کی برکت ہو کہ کچھ تکلیف نہین ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنے اپنے کوچ پر سو رہے۔ سو رہے تھے کہ گدھے والے نے آکر جگایا اور جلدی جلدی سامان خرجیون مین رکھ کر اور قہوہ والے کا حساب چکا کر ہم لوگ رُخصت ہوے قہوہ والے کا حساب تو میرے دوستون نے طے کیا۔ مجھے ۲۵ قرش (تقریباً ۱عہ) دینا پڑے۔ اس وقت ٹھنڈک تھی اور چونکہ جسم پر احرام کے سوا کچھ نہ تھا اور سر بھی برہنہ تھا اس لیے مجھے اتنی سردی معلوم ہوئی کہ مین کانپ رہا تھا۔ مین نے روزہ کی نیت کر لی تھی اس لیے تمباکو کے ذریعہ بھی جسم کو گرمانا ممکن نہ تھا۔ گدھا اتنی دیر آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو گیا تھا اور تیزی سے بھاگ رہا تھا اندھیرے مین ٹھیک طور پر کچھ معلوم نہین ہو سکا۔ لیکن غالباً تھوڑی ہی دیر مین کسی قدر اُتار پڑا اور ایک سمت کو راستہ مُڑا۔ گدھا تیزی سے جو مُڑا تو مین جھٹکا کھا کر گر پڑا اور گرا تو ایسی جگہ جہان کچھ پتھر پڑے ہوے تھے۔ کُہنی چھل گئی اور پاؤن مین خفیف سی چوٹ آئی۔ سب لوگ رُک گئے اور مین گدھے والے کی امداد سے پھر اپنا بستر وغیرہ گدھے پر رکھ کر سوار ہوا۔ چوٹ تو کافی آئی مگر اس واقعہ کی بدولت سردی کا اثر بھی زائل ہو گیا۔ جدہ سے چلے تو ہم صرف چار آدمی تھے مگر بحرے سے ایک شخص اور ساتھ ہو لیا۔ یہان پہونچ کر وہ گدھا چھوڑ کر چلا گیا اور کوتل گدھا آگے آگے چلنے لگا۔ چونکہ اُس پر بوجھ نہ تھا اس لیے وہ سب سے تیزی کے ساتھ چلتا تھا اور اُسی کے پیچھے پیچھے ہمارے گدھے چلتے تھے۔ گویا وہ ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گدھے والے نے کہا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہین جس کے بعد تلاش راہ مین بہت وقت ضایع ہوا۔ کیونکہ اس صورت سے رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ خود پیادہ پا چلنے لگا۔ تھوڑی دیر ایک طرف جاتا تھا پھر زمین پر چوپایون کی طرح لیٹ کر زمین سونگھتا اور اس طرح گویا راہ کا پتہ

چلاتا تھا۔ بہت دیر کے بعد راستہ ملا۔ اس تلاش نے وقت بھی بہت لیا۔ اور گدھوں کو بھی بہت تھکا دیا۔ گدھے والے کے قبضہ میں اب دو گدھے تھے کبھی وہ ایک پر سوار ہوتا اور کبھی دوسرے پر اور جب ہمارے گدھے ذرا رُکتے تو اپنے لمبے بیت سے اُن کو مارتا چلتا۔ فجر کے وقت ایک قہوہ خانے میں قیام کیا یہ ذرا بڑی جگہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ کئی جھوپڑے بنے ہوے تھے اور ایک جانب چھوٹی سی مسجد بھی نظر آئی۔ قضاے حاجت کے بعد نماز ادا کی اور پھر سوار ہوے۔ رفتہ رفتہ آفتاب بھی نکل آیا بلکہ دھوپ کی تمازت اب تکلیف دینے لگی۔ اور خستگی وماندگی کا جو عالم تھا وہ تو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال خدا خدا کرکے مکہ معظمہ کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ مکہ معظمہ کے قریب راستہ پہاڑیوں میں سے بل کھاتا ہوا گذرا ہے جا بجا اونچے ٹیلوں پر توپیں لگانے کے دُھس بنے ہوے ہیں جو حکومت ترکی نے اس غرض سے بنا دیے تھے کہ اگر کوئی حملہ آور ہو تو مدافعت میں آسانی ہو اور اس میں ذرا شک نہیں کہ چند صد یا زیادہ سے زیادہ ایک ہزار سپاہی اس راستے سے گذرنے والی بڑی سی بڑی فوج کو بخوبی روک سکیں گے۔ اگر اُن کے پاس ساز و سامان جنگ وافر ہو۔ یہ پہاڑیاں گویا بلد الامین کی قدرتی محافظ ہیں۔ جدہ سے مکہ معظمہ تک جو ٹیلیفون لگا ہوا ہے اُس کے کھمبے اب بار بار سامنے آتے تھے اور اس سبب سے ہر موڑ پر خیال ہوتا تھا کہ شاید اب منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ بالآخر کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں۔ گدھے والے نے بتایا کہ ترکی زمانہ میں یہاں کچھ فوج رہتی تھی۔ اب تو عمارت بھی بہت کچھ منہدم ہو گئی ہے۔ اس مقام سے کچھ پہلے ہی سے بدوی لڑکے حج قبول کہہ کر بھیک مانگتے ملے تھے جو اس بات کی علامت تھی کہ اب مکہ معظمہ زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔ صبح کو راستہ میں ایک عورت ایک سمت سے دوڑتی ہوئی ہم لوگوں کی طرف آئی اور منت کہنے لگی کہ میرے گھر میں آگ جلانے کا کوئی بند و بست نہیں دیا سلائی ہو تو دیدو۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خالی ڈبیا تھی جس میں کوئی دیا سلائی نہ تھی اپنے ایرانی ساتھی کے بتانے پر میں نے اُس کو اپنی دیا سلائی کی ڈبیہ پھینک کر دیدی تھی اُس وقت بھی یہ خیال گذرا تھا کہ منزل قریب آ گئی ہے۔ اُس کے بعد مسلسل کئی گھنٹہ تک چلنا پڑا۔ اس بنا پر بدوی لڑکوں کو دیکھکر اور گدھے والے کے بوثوق کہنے پر پوری طرح یقین نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر اور چلنے کے بعد ایک بڑی عمارت نظر پڑی معلوم ہوا کہ یہ بھی ترکی فوجوں کی قیام گاہ ہے اور اب عساکر حکومت ہاشمیہ اسی میں رہتے ہیں۔ یہیں سے مکہ معظمہ کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ آٹھ بجے کے قریب وقت ہو گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ کم سے کم میرا تو بھیجا پگھلا جاتا تھا۔ اس لیے یہ معلوم کرکے کہ اب چند ہی منٹ کے اندر ہم مکہ معظمہ پہونچ جائیں گے

بہت مسرت ہوئی۔ چنانچہ کچھ دور آگے بڑھے تو داہنے جانب ایک سلسلہ عمارتون اور جھوپڑیون کا نظر آیا۔ جن مین متعدد قہوہ خانے بھی تھے۔ اور پندرہ منٹ کے اندر ہم شہر کے حدود مین داخل ہوگئے۔ اب دورویہ عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بازار نظر آنے لگا۔ مین نے تمازت آفتاب سے بچنے کی غرض سے شرقی جانب کی عمارات کے سایہ مین چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد ایرانی ساتھیون کے جدا ہونیکا وقت آیا کیونکہ ان کے معلم کا مکان دوسرے محلہ مین تھا۔ چنانچہ گدھے والا ہم لوگون کو روک کر ایک گلی مین چلا گیا اور وہان سے ایک اور شخص کو بلا لایا جس کی رہبری مین جلد ملاقات ہونے کی امید ظاہر کرکے ایک شب کی رفاقت پر اظہار مسرت کرتے ہوئے وہ لوگ ایک راستہ کی طرف چلے گئے اور گدھے والے کی معیت مین مین آگے بڑھا تا آنکہ حرم شریف کے پاس پہونچ گیا اور دور ہی سے حرم محترم کے در و دیوار صحن و عمارات کو کمال عظمت و اشتیاق سے دیکھتا اور دل ہی دل مین دعائین مانگتا ہوا محلہ بیاد پہونچ گیا جہان ہمارے خاندان کے مطوف عبدالقادر سکندر کا مکان ہے۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ

•

چوتھی منزل

عبدالقادر سکندر ہمارے معلّم لکھنؤ ہی مین مقیم ہین۔ ان کے بڑے بیٹے حسن سکندر بمبئی مین رہ گئے تھے کہ شوال مین حجاج کے ساتھ جائین گے۔ مکہ مکرمہ مین اُن کی اہلیہ اور اعزائے خسرالی موجود تھے اور اُنھون نے اپنے سالے یوسف کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیدیا تھا گدہے والا پہلے عبدالقادر سکندر کے مکان پر گیا۔ وہان سے حسن کے مکان کا پتہ دیا گیا اور وہین لاکر مجھے اُتارا۔ یوسف موجود نہ تھے اس لیے خرجی کا سامان اُن کے پڑوس مین رہنے والی ایک ہندوستانی بڑھیا کے یہان رکھ دیا اور اپنی بخشش لیکر وہ تو روانہ ہوگیا۔ مین کچھ دیر اُسی بڑھیا کے یہان بیٹھا رہا۔ اُس کے بعد معلّم صاحب کا ایک ملازم آگیا جس نے مجھکو حسن کے مکان مین سامان سمیت پہونچا دیا۔ میرے جیل کے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوجی مجھسے پہلے روانہ ہوے تھے اور حسن کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ وہی اُن کے بھی معلم ہین۔ چنانچہ ذرا دیر کے بعد جب اُن کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ خود مجھسے ملنے تشریف لائے۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ یوسف آگئے۔ گدہے کی سواری سے اگرچہ خستگی بہت ہوگئی تھی اور پہلا روزہ بھی تھا مگر شوق زیارت نے ہمت نہ ہاری اور مین معمولی صاحب سلامت کے بعد معلّم صاحب کے ایک کارکن کے ہمراہ زیارت و طواف کعبۃ اللہ شریف کے لیے روانہ ہوا۔ اگرچہ ضروری دعائین جہاز ہی پر یاد کرلی تھین مگر اپنے حافظہ کی خرابی پر مطلع ہونے کی وجہ سے وثوق نہ تھا کہ ہر موقع کی دعا پوری صحت ت اور مقررہ وقت پر پڑھ سکون گا اس لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کی کتاب زبدۃ المناسک جس سے مین نے دعائین یاد کی تھین چلتے وقت ہاتھ مین لے لی۔ اور اسی کی ہدایت کے بموجب اپنے رہبر سے درخواست کی کہ باب السلام سے لے چلین۔ محلہ جیاد سے تقریباً ۳ سو گز کے فاصلہ پر حرم محترم اور باب السلام کچھ زیادہ دور نہین۔ چنانچہ ہم لوگ مختلف گلیون اور بازار کو طے کرتے ہوے باب السلام پر پہونچے مین دروازہ پر داخلہ کی دعا پڑھتا ہوا حرم شریف مین حاضر ہوا۔ سامنے ہی بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس وقت جو حالت دل تھی اُس کا بیان دشوار ہے۔ بیت اللہ شریف کی

زیارت کی ایک مدت سے تمنا تھی مگر سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے سیہ کار و بدبخت کو جس کی عمر کا بیشتر حصہ لہو و لعب اور عصیان و طغیان مین بسر ہوا ہو یہ دولت کیسے نصیب ہو گی اور اب جو وا قعتاً بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوا تو اللہ تعالے کے کمال فضل و احسان اور غایت لطف و کرم کے احساس نے دل کی عجیب کیفیت کر دی۔ اس وقت مین دیر تک دعا مانگتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر دلی امتنان ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر میرے رہنما نے جلدی سے ہدایت کی کہ آگے بڑھو اور ساتھ ہی کچھ دعا پڑھوانا شروع کی۔ مین گویا مسحور ہو رہا تھا اور جو حالت ایک عامل کے معمول کی ہوتی ہے بعینہ یہی کیفیت میری اپنے رہنما کے ساتھ رہی۔ وہ مجھ کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھا اور باب ابراہیم سے گذرتا ہوا حجر اسود سے کچھ فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہان نیت طواف کرائی گئی۔ پھر حجر اسود کی طرف چلکر گیا۔ استلام کیا اور اپنے رہنما کے ساتھ یکے بعد دیگرے سات بار کعبۃ اللہ شریف کا طواف کیا اور اس اثنا مین جو کچھ وہ باواز بلند پڑھتا رہا مین اُس کی تکرار کرتا رہا۔ طواف کی حالت مین جو ادعیہ ماثورہ ہین وہ مجھے یاد تھین اور اندر سے دل یہ چاہتا تھا کہ بالکل تنہائی ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی دوسرا طواف کرنے والا بھی نہوتا اور خوب دل کھولکر اور پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کی جاتی مگر ایک بے بسی کے عالم مین مین اپنے رہنما کے دوش بدوش انھین الفاظ کو دھراتا رہا جن کا بیشتر حصہ عربی ہے، ناواقفیت کی بنا پر میری سمجھ سے باہر تھا، لہذا اختتام طواف پر جب ملتزم شریف سے لپٹ کر دعا کرنے کا موقع ملا تو مین نے بہت کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اور جب تک رہنما صاحب نے کئی بار نہ پکارا مین وہان سے نہ ہٹا، باوجودیکہ تمازت آفتاب کی وجہ سے مطاف کی تابش ترقی پذیر تھی ملتزم شریف سے ہٹ کر مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبۃ اللہ کے درمیان چھوڑ کر دو رکعت سنتِ طواف ادا کین۔ یہان بھی رہنما نے بہت کچھ عجلت کرنا چاہی مگر مین نے نماز کے بعد دیر تک دعا کی۔ پھر رہنما نے ایک اور دعا پڑھوائی اور چاہ زمزم شریف پر لائے۔ درِ زمزم پر دعا پڑھ کر دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آبِ زمزم پیا اور ہاتھون چہرہ اور جسم کے دیگر حصون مین ملا۔ وہان سے نکل کر حرم شریف کے باہر جانے کا قصد کیا۔ باب الصفا پر ہو کر دعا کے لیے ٹھہرا۔ کچھ لڑکے چاہ زمزم سے نکلتے ہی ساتھ ہو لیے تھے۔ اب رہنما صاحب نے ہدایت کی کہ خیراتِ طواف دو۔ ان لڑکون کو کچھ دیا گیا۔ اُس کے بعد رہنما صاحب نے کچھ اور لوگون کے نام لیے کہ اُن کا حق دو۔ چنانچہ ہیلون کی ایک گڈی اُن کے نذر کی اور جتنی دیر مین مین نے

دعا مانگی اُنھون نے اس کی تقسیم خیالی سے فراغت کر لی اور مجھے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرانے
کے لیے لیچلے۔ کوہ صفا کے دامن مین جو ایک بے چھت کی محراب دار عمارت ہی اُسکے زینہ اولین
پر کھڑے ہوگے اور کعبۃ اللہ شریف کی طرف منھ کرکے دعا پڑھی اور رہنما کے ساتھ سعی کرنے کے لیے
روانہ ہوا۔ طواف کی طرح سعی کے ساتون چکرون مین بھی رہنما صاحب بآواز بلند دعائین پڑھواتے
رہے اور جب ساتوان چکر مروہ پر تمام ہوا تو وہان جو متعدد حجام بیٹھے ہوے تھے اُن مین سے ایک سے
اپنے کاکلون کی ایک جانب کی لٹین کترواکر اور اُس کی اُجرت دیکر باب السلام کی طرف سے پھر حرم شریف
مین حاضر ہوا اور حطیم مین جاکر دو رکعت نفل ادا کین۔ اب گھر جانے کا ارادہ ہوا تو رہنما صاحب نے
باب الزیادہ پر لیجاکر ٹھہرایا اور کہا کہ آپ کے جاے قیام سے حرم شریف آنے جانے کے لیے یہی دروازہ
قریب پڑے گا اور ساتھ ہی صحن حرم مین ایک موقع دکھاکر بتایا کہ بعد عصر یہین عبدالقادر سکندر کے
حجاج جمع ہوکر روزہ کھولتے ہین اور تم بھی یہین آکر بیٹھنا اور طواف کرنا چاہو گے تو مین ساتھ چل کر
طواف کرادونگا۔ دوپہر کے قریب مین گھر واپس پہونچا اور خستگی رفع کرنے کے خیال سے فوراً لیٹ کر
سوگیا۔ کئی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ حرم شریف مین نماز ظہر ہو چکی ہوگی۔ لہذا وضو کرکے
نماز ادا کی۔ اور میر عبدالعزیز صاحب کی معیت مین عصر کے وقت حرم شریف مین حاضر ہوکر نماز پڑھی
اور صحن حرم کے اُس کونہ مین جو باب الوداع سے قریب ہے حسین اکبر زمزمی کی جا نمازون پر اپنے
معلّم کے دوسرے حاجیون کے ساتھ جا بیٹھا۔ حسین اکبر صاحب اور بعض دیگر حجاج سے بھی ملاقات
ہوئی۔ افطار و نماز مغرب سے فارغ ہوکر میر صاحب کے ہمراہ گھر واپس آیا۔ اُنھون نے ازراہ محبت
میرے لیے کھانے کا انتظام کر لیا تھا لہذا کھانا کھاکر اور حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرکے پھر
حرم شریف گیا اور نماز عشا کے بعد واپس آیا۔ دوسرے دن عمرہ لینے کے لیے جانا تھا اس لیے
میر صاحب نے اپنے ساتھی ظہور کو رہنمائی کی غرض سے میرے ساتھ جانے کی ہدایت کر دی تھی چنانچہ
سحری کھاکر مین ظہور کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اندھیرا تھا اور مین برہنہ پا۔ راستہ مین بکثرت چھوٹے چھوٹے پتھر
پڑے ہوے تھے۔ جابجا ٹھوکرین کھاتا ہوا نماز فجر کے وقت مسجد تنعیم کے قریب پہونچا۔ یہان جگہ جگہ وضو
کرانے والے اور قہوہ خانے نظر پڑے۔ ایک ہلیہ مین پانی کی ایک صراحی ملتی تھی چنانچہ استنجا کرکے
وضو کیا اور مسجد مین جاکر پہلے نماز فجر ادا کی۔ پھر دو رکعت نفل پڑھکر اور تلبیہ کہکے عمرہ کی نیت کی اور

اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس ہوا۔ حرم شریف مین حاضر ہوکر طواف کیا اور پھر وہان سے ملکل کر سعی کی اور فارغ ہوکر گھر واپس آیا۔ مسجد تنعیم تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہے اور راستہ ریتلا اس لیے آمد ورفت ہی مین تقریباً تین چار گھنٹے صرف ہوے اور چونکہ اس قدر پیدل چلنے کی عادت نہین کافی خستگی بھی معلوم ہوئی۔ اور رات کو سونے کا وقت بھی کم ملا تھا اس لیے آتے ہی سو رہا۔ ظہر سے قبل اُٹھا نماز حرم شریف مین ادا کی اور واپس آکر میر عبدالعزیز صاحب سے ملا اور عصر کے وقت اُنھین کی معیت مین حرم شریف مین نماز پڑھی اور پھر اُن کے ساتھ بازار چلا گیا۔ اور مغرب و عشا بدستور حرم مین ادا کی۔

رمضان المبارک مین حرم محترم کا نظارہ عجیب و غریب ہوتا ہے۔ یونتو ایام حج مین حرم شریف کے اندر ہر وقت کافی مجمع رہتا ہے اور خصوصاً نمازون کے اوقات مین ہجوم بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر ماہ صیام کے اجتماع کی جو خصوصیات ہین وہ جُداگانہ امتیاز رکھتی ہین۔ عصر کے بعد ہی سے جدھر دیکھیے حرم شریف مین لوگ جمع ہین۔ کوئی قرآن شریف پڑھتا ہے کوئی دلائل الخیرات وغیرہ ورد کر رہا ہے۔ کوئی طواف مین مصروف ہے۔ کعبۃ اللہ شریف کا طواف یون تو تقریباً شب و روز مین ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ دن کو تو کبھی اوقات جماعت کے سوا کسی وقت مطاف خالی نہین نظر آتا۔ رات مین شاید کوئی وقت خالی گذرتا ہو۔ لیکن گرمیون مین ہجوم عموماً صبح اور شام ہی کو رہتا ہے۔ رمضان المبارک کے عمرون کی جو فضیلت ہے اُسکے باعث ماہِ صیام مین عمرہ لانے والون کی تعداد کثیر کے لیے طواف لازم ہے اور جو لوگ دن مین تمازت آفتاب کی وجہ سے یا عمرہ لاکر خستہ ہوجانے کے باعث طواف نہین کرتے وہ عموماً سہ پہر ہی کو طواف کرتے ہین۔ عصر کے بعد جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے مطاف مین اور مصلون پر ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ حجاج اور اہل شہر سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق افطار کا سامان کرتے ہین۔ صاحبان خیر، ارباب ثروت اور اکثر حجاج کی طرف سے سامان افطار کی تقسیم بھی ہوتی رہتی ہے۔ کہین خرمے بٹ رہے ہین۔ کہین مٹھائیان۔ کہین تربوز کی پھانکین۔ توپ دغتے ہی لوگ باہم ملکر یا الگ الگ افطار کرتے اور نماز مغرب ادا کرتے ہین۔ نماز کے بعد کچھ لوگ کھانا کھانے گھر چلے جاتے ہین اور وہ جو عشا کے بعد کھاتے ہین رہ جاتے ہین۔ مغرب و عشا کے درمیان گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا فصل ہوتا ہے۔ مغرب کے وقت ہی حرم شریف مین برقی روشنی ہو جاتی ہے۔ لیکن عشا کے وقت تک برقی روشنی کے علاوہ سارے صحن مین جگہ جگہ گیس کے لیمپ اور رنگ برنگ کی لالٹینین پہونچ جاتی ہین۔ کیونکہ نماز عشا کے بعد

حرم شریف مین جا بجا تراویح پڑھی جاتی ہے۔ مغرب کے سوا کل نمازون کے اوقات مین بالالتزام جماعتین ائمۂ اربعہ کے نام سے موسوم مصلون پر ہوتی ہین اور انھین مین اپنے اپنے مسلک یا موقع کے لحاظ سے سب لوگ شریک ہو جاتے ہین اور مغرب کے وقت صرف دو جماعتین حنفی اور شافعی مصلون پر پڑھائی جاتی ہین۔ مگر تراویح کے وقت کثیر التعداد جماعتین کھڑی ہوتی ہین۔ صحن کے اکثر حصون مین آگے پیچھے کئی کئی جگہ تراویح ہوتی ہے۔ اور ہر جماعت کے لیے علحدہ روشنی کا اہتمام ہوتا ہے۔ ہم چونکہ آخری تاریخون مین پہونچا تھا اس لیے اکثر جگہ قرآن شریف کا ختم تھا۔ ختم کے لیے خاص اہتمام ہر جماعت کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ مقام جماعت سے قریب قالین یا دری کا فرش بچھایا جاتا ہے اور اس کے گرد گیس کے فانوس اور خوشنما لالٹینین روشن کی جاتی ہین وسط مین سنگ مرمر کی میزون پر خوشنما گلدان وغیرہ رکھے ہوتے ہین۔ نماز تراویح سے فارغ ہو کر لوگ اس مقام پر جمع ہوتے ہین اور شرکاء جماعت کے علاوہ منتظمین کے دوست واحباب اور عام حاضرین حرم شریف مین سے بھی کچھ لوگ شریک ہوتے ہین۔ پھر قاری صاحبان اور قرات کے طلبا ختم پڑھتے اور تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ مجھے کئی ختم دیکھنے کا موقع ملا مگر مین آخر وقت تک نہ ٹھہر سکا۔ حرم محترم مین معمولاً بھی کچھ کم روشنی نہین ہوتی۔ گو رقبہ کی وسعت یا سابقہ انتظامات کے لحاظ سے کم ہے کیونکہ سوائے مطاف کے جسکے گرد برقی روشنی کا مالا جگمگا تا رہتا ہے صحن اور دالانون مین ذرا فاصلہ سے روشنی ہوتی ہے۔ لیکن ماہ صیام مین مغرب کے بعد سے ختم تراویح تک تو صحن حرم بقعۂ نور معلوم ہوتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے دالانون مین دن کے سوا بہت کم کوئی اٹھتا ہے اس لیے وہان روشنی کا بھی کوئی خاص اہتمام نہین کیا جاتا۔

رات کو حرم شریف مین ختم قرآن مین شرکت کی وجہ سے کافی دیر ہو گئی تھی نیز اُسی صبح کو رحمت شاہ سامان کے ساتھ آنے والے تھے اس لیے مین عمرہ لینے نہ جا سکا۔ رحمت شاہ طلوع آفتاب سے پہلے ہی پہونچ گئے۔ سامان نہ آنے کی وجہ سے ابتک احرام نہین کھول سکا تھا۔ کیونکہ جدہ سے روانگی کے وقت کپڑے ساتھ رکھنے کا خیال ہی نہین آیا تھا۔ حسن کے مکان مین جہان مین ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم لوگون کی بسر نہین ہو سکتی تھی اور چونکہ میر عبدالعزیز صاحب سے گفتگو کے بعد یہ امر طے پا گیا تھا کہ مین اور وہ ساتھ ہی رہین اس لیے جمعیت بھی کافی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ پانچ اور آدمی تھے جنمین دو عورتین بھی تھین۔ سامان آنے کے بعد مکان بدلنے کی زیادہ فکر لاحق ہوئی۔ یوسف نے کئی مکان دکھلائے اور بالآخر

اُن کے مکان سے قریب ہی ایک مکان تین گنی پر ٹھہر گیا۔ مکان چھوٹا سا تھا مگر یک منزلہ ہونے کی وجہ سے اُس کی کھلی چھت پر رات کو آرام لیٹ سکتے تھے اِس لیے غنیمت جانا۔ دو چھوٹے چھوٹے درجے تھے جن مین سے بڑی کوٹھری مین ہم لوگ رہے اور چھوٹی کوٹھری عورتون کو دیدی گئی۔ میر صاحب کا باورچی خانہ بھی اُسی جانب رہا۔ مین عموماً اُسی دوکان ہی مین کھانا کھاتا تھا مگر جب کبھی رحمت شاہ کا جی چاہتا تو وہ ہماری کوٹھری کی صحن مین لوہے کے چولھے پر کھانا پکا لیتے۔ میر صاحب نے ازراہِ شفقت بہت اصرار کیا کہ مین اس سفر مین برابر اُنھین کا مہمان رہون اور چونکہ وہ ہندوستان سے کثیر مقدار مین جنس ساتھ لائے تھے اِس لیے اُن کا خیال تھا کہ میرے کھانے کے لیے اُن کو نئی جنس خریدنا نہ ہوگی۔ اور جو جنس وہ ساتھ لائے تھے ظاہر ہے کہ اُس کو واپس لیجانا اُن کو منظور نہ تھا لیکن مین نے اسے قبول نہ کیا۔ دوسرے دن مین پھر عمرہ لینے گیا۔ اتفاق سے پاؤن مین موچ آگئی جس کی وجہ سے طواف و سعی کے بعد سو کر اُٹھا تو کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ اُس پر طرہ یہ کہ نئے مکان مین سامان بھی منتقل کرنا تھا۔ خدا بھلا کرے رحمت شاہ کا کہ اُن کی وجہ سے سامان کے منتقل کرنے مین مجکو بہت کم محنت پڑی۔ بھاری اشیا تو حمال نے پہونچا دین اور چھوٹی چھوٹی چیزین رحمت شاہ نے اور مین نے مل کر رکھوائین۔ درد کی تکلیف بڑھ رہی تھی اِس لیے مین شفاخانہ چلا گیا جو حرم شریف اور ہمارے جائے قیام کے درمیان راستہ ہی مین پڑتا تھا۔ تین بار شفاخانے گیا مگر دوا نہ لگی۔ اس لیے کہ دو بار تو ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے اور تیسری دفعہ ملے تو فرمایا کہ اپنے ظروف کے ساتھ آؤ۔ رمضان المبارک کا صرف ایک دن اور باقی تھا لہٰذا عمرہ کے لیے جانا ضروری تھا۔ لیکن جب سحری کے وقت اُٹھا تو پاؤن کے درد کی وجہ سے پیدل جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ نماز فجر کے وقت ایک گدھا قرش مین کرایہ پر لیا اور اُس پر سوار ہو کر عمرہ لینے گیا واپس آ کر طواف و سعی کر کے اپنے جہاز کے ساتھی میان نظام الدین کے مکان پر چلا گیا۔ اور اُنھین کے یہان سو رہا۔ رمضان کی وجہ سے اِس کا موقع کم ملتا تھا کہ اِن لوگون سے ملتا۔ تاہم ایک بار پہلے بھی اُن کے یہان گیا تھا۔ اہلِ شہر مین ابتک کسی سے ملنے کی نوبت نہین آئی۔ صرف مشہور دہلی کے تاجر حاجی علی جان کی کوٹھی تک جو حرم شریف سے بالکل متصل ہے جا سکا۔ وہ بھی اِس ضرورت سے کہ میرے اور میرے ساتھیون کے پاس جو زرِ نقد تھا اُسے اُن کے یہان بطور امانت جمع کرانا تھا۔ یہ لوگ بڑے صاحب خیر اور بہ خلیق ہین۔ حجاج کو اِن کی ذات سے بہت آرام ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن کو جزائے خیر دین۔ دوسرے دن عید ہونیوالی تھی

اس وجہ سے شام کو بعد عصر تین گولے عام اطلاع کی غرض سے چھوٹے۔ رات کو چونکہ تراویح اور سحری کی فکر نہ تھی اس لیے مغرب اور عشا دونوں نمازوں کے بعد بازار کی سیر کی۔ ایک خونچہ والے کے پاس بالائی بالکل ہندوستان جیسی جمی ہوئی دیکھکر فوراً طبیعت راغب ہوئی۔ اور باوجودیکہ کھانا کھا چکا تھا اور صرف قہوہ خانے میں چائے پی رہا تھا لیکن ایک پیالہ لیکر چٹ کر گیا۔ مگر کھانے کے بعد جب اسمیں ترشی محسوس ہوئی تو بہت پچھتایا معلوم ہوا کہ دہی پر سے بالائی اُتار کر جمع کی گئی تھی۔

عید کی نماز کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ سویرے ہی ہو جاتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ مجمع زائد ہوگا اس لیے نماز فجر سے پہلے ہی کپڑے بدل لیے گئے اور حرم شریف میں پہونچا تو اس وقت بھی کافی ہجوم تھا۔ بہرحال مجھے بغیر کسی دقت کے مقام ابراہیم کے سامنے ممبر سے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ آفتاب نکلنے کے بعد ہی خوشنما گنگا جمنی علم جسمیں زرکار پھریرے لگے ہوے تھے لاکر ممبر کے دونوں جانب لگا دیے گئے۔ ممبر تقریباً ۴، ۵ گز لمبا ہے اور نشست کے مقام پر ایک بُرجی بنی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے بنانے میں ایسی صنعت کی گئی ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو کبھی خطیب کے چہرہ پر دھوپ نہیں پڑتی۔ بُرجی سے نیچے زینا ہے جسپر پوشش پڑی ہوئی تھی۔ ممبر کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے صرف جمعہ کے دن یا عید کے موقع پر کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب ہی چند خوجے کھڑے ہوے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجمع میں کسی قدر حرکت پیدا ہوئی۔ اور بعض لوگ کھڑے ہو گئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ شریف مکہ اپنے مصاحبین و مقربین خاص کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نماز ہوئی۔ اور نماز کے ختم ہوتے ہی چاروں مصلوں کے امام ممبر پر گئے اور حنفی خطیب نے خطبہ پڑھا۔ خطیب صاحب کی آواز اگرچہ بہت بلند نہیں تھی لیکن اُن کا انداز تقریر ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ سنائی دیتا تھا۔ کم سے کم اُن لوگوں کو جو بہت دور نہ ہوں۔ خطبۂ اولی کے بعد جب خطبۂ ثانی پڑھا جا رہا تھا تو حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نام نامی لینے کے بعد خطیب صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شریف صاحب کا نام لیا اور اس موقع پر سب حاضرین کھڑے ہو گئے۔ غالباً شریف کے اشارہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ ورنہ تعظیم کے زیادہ مستحق اُن اصحاب کے اسمائے گرامی تھے جو شریف کے نام سے پہلے لیے گئے تھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا غنیمت ہے کسی نے مجھے ٹوکا نہیں خطیب صاحب کے خطبہ کا پورا اثر تو عربی داں اشخاص ہی پر پڑ سکتا ہے مگر عربی زبان کی دلکشی اور خطیب صاحب کا موثر

انداز ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ضرور رہتا ہوگا۔ نماز کے بعد ہندوستان کی طرح عام طور پر بغلگیر ہونے کا دستور نہیں ہے البتہ اکثر لوگ باہم معانقہ کرتے ہین اور خطیبون کی دست بوسی کے لیے بھی بہت لوگ منتظر رہتے ہین۔ میرے قریب چونکہ شناساؤن مین سے کوئی نہ تھا اس لیے مین جلدی سے اُس دروازہ کی طرف گیا جدھر شریف کی نشست گاہ ہے مگر میرے وہان تک پہونچنے مین اتنی دیر لگی کہ شریف کی واپسی ہو چکی تھی۔ البتہ سڑک پر شرطون (پولس) کی جمعیت صف آرا تھی، جو تھوڑی دیر کے بعد ضابطہ فوجی کے مطابق منتشر ہو گئی۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بازار بند ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ تین روز تک عموماً بازار بند رہیں گے صرف کہین کہین اشیاے خوردنی فروخت ہو رہی تھین۔ مین تھوڑی دیر پولیس کی جمعیت کے قریب کھڑا رہا اور اُن کی قواعد دیکھتا رہا۔ اور صفون کے منتشر ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ ساتھیون سے تبادلۂ تہنیت کے بعد رحمت شاہ کے ساتھ اس جستجو مین روانہ ہوا کہ کہین کچھ کھانا میسر آئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اور کیلون۔ پکوڑیون اور چٹنی پر قناعت کرنا پڑی۔ ایک شخص سے تھوڑی آئس کریم لیکر کھائی تو اگرچہ آئس کریم خود کچھ زیادہ مزے دار نہ تھی لیکن تشنگی کے عالم اور گرمی کے موسم مین بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پہلے مجھے کسی قدر حیرت ہوئی کہ یہان جب برف نہین ہے تو آئس کریم کیسے تیار ہوتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چند مشینین یہان ہین جن مین شورے وغیرہ کی امداد سے آئس کریم تیار ہوتی ہے۔ شام کو ایک مرشد زادہ سے جو مکہ معظمہ مین مقیم ہین اور طبابت کرتے ہین ملا۔ بڑے اخلاق و محبت سے ملے اور ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ میرے پاؤن کا درد ابھی تک نہین گیا تھا۔ اُنھون نے حال سنکر دوسرے روز دوا دینے کا وعدہ کیا۔

ایک روز عصر کے بعد حرم شریف مین ایک جگہ کچھ حضرات جمع تھے۔ اتفاق سے میرے ایک ہموطن تاجر بھی وہان بیٹھے تھے۔ مین اُدھر سے گذرا تو اُنھون نے یہ کہہ کر کہ تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا مجھے اُن اصحاب سے ملایا۔ جناب مولوی محب الدین صاحب خلیفہ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بھی وہان تشریف فرما تھے۔ بڑی عنایت و محبت سے پیش آے اور اپنے مصلے پر بٹھا کر دیر تک مزاج پرسی فرماتے رہے اور رخصت ہوتے وقت بہت کچھ دعائین دین۔ ایک صاحب جو وہین کے مدرسہ مین مدرس ہین اور اتفاق سے میرے ہمنام ہین بہت اخلاص سے ملے اور میرے ساتھ ہی اُٹھے اور فرمانے لگے کہ حضرت شاہ ابو سعید صاحب مجددی کے صاحبزادون کے یہان جا رہا ہون مین بھی چونکہ اسی سلسلہ کا غلام ہون اس لیے حضرت اُن کے ہمراہ چلا گیا اور

صاحبزادگان سے قدمبوسی حاصل کرکے بہت محظوظ ہوا۔ اُن کے یہان اُس وقت قرآن خوانی ہورہی تھی ایسمین بھی شرکت کا موقع ملا اور صاحبزادہ صاحب سے پھر قدمبوسی حاصل کرنے کے بعد دعاء کرکے واپس آیا۔

عید کے دوسرے دن مرشدزادہ سے ملکر پاؤن مین لگانے کی دوا لی تو اُنھون نے کہا کہ زیادہ چلنا پھرنا نہ چاہیے۔ اگرچہ اس کی پابندی مشکل تھی اس لیے کہ مدینہ منورہ کا قافلہ ۸ شوال کو جانے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے پہلے تمام ضروری انتظامات سفر کرنا تھے تاہم عید کی وجہ سے چونکہ بازار بند تھے اس لیے کسی قدر سکون کا موقع ملا۔ ظہر کے بعد اتفاق سے میرے ہمنام صاحب پھر حرم شریف مین مل گئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے مدرسہ کے مدرس اعلےٰ کے یہان حاضر ہوا۔ وہان بھی قرآن خوانی ہورہی تھی۔ قرآت سے لذت اندوز ہونے کا چونکہ مجھے اپنے پیرومرشد کے طفیل مین یہان اکثر موقع ملتا ہے اس وجہ سے مین ایسے مواقع کا مشتاق رہتا ہون اور عربون کی قرآت تو ہی بھی حد درجہ وجد آور۔ حرم محترم مین متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بعض نابینا قاری قرآت سنایا کرتے ہین اور اگرچہ یہ امر مجھے پسندیدہ نہین معلوم ہوا کہ وہ قرآت سنانے کو حصول خیرات کا ذریعہ بنائے ہوے ہین تاہم مین اکثر اُن کی قرآت سنا کرتا تھا۔

عید کے دنون مین چونکہ تین دن تک برابر لوگ اپنے احباب واعزہ سے ملتے رہتے ہین اس وجہ سے اپنے ہمنام کے ساتھ جن مدرس صاحب کے یہان گیا تھا اُن کے یہان بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی اور یہین پہلی بار یہ بات دیکھنے مین آئی کہ میہمانون کے سامنے علاوہ چلے کے ایک خوشنما شیشے کے ظرف مین انگریزی مٹھائی پیش کی گئی جسمین سے ہر شخص نے ایک دو ڈلیان لے لین۔ یہ مٹھائی چونکہ ابتدا شام کی طرف سے آتی تھی اور غالباً وہان بنتی بھی ہوگی اس لیے شامی مٹھائی کہی جاتی تھی حالانکہ اب عام طور پر یورپ سے آتی ہے اور مارٹن کے مشہور انگریزی کارخانہ کی بنی ہوتی ہے۔

اُسی روز اُن کرم فرما سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی جن کے پتہ پر مین نے اپنی ڈاک منگائی تھی اور اپنے خطوط وغیرہ پاکر بہت خوش ہوا۔ یہین ضیاء الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی جو علی گڈھ کالج کے تعلیمیافتہ ضلع مظفر نگر کے رئیس اور خلافت کمیٹی کے ممتاز عہدہ دار ہین اور دونون صاحبون سے ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے روز صبح کو بازار کی طرف گیا تو اگرچہ بازار بند تھا مگر صفا اور مروہ کے درمیان جہان سعی کرتے ہین ایک جگہ جلسہ کا ساز وسامان دیکھ کر کچھ دیر اس خیال مین ٹھہلتا رہا کہ جلسہ کی کاروائی کچھ سکون

لیکن زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے پاؤن مین درد محسوس ہوا اس لیے چلا آیا۔

عید کے ایام مسرت ختم ہو گئے اور بازار کھل گئے تو سامان سفر کی خریداری پر متوجہ ہوا چونکہ مین یہ سُن چکا تھا کہ مدینہ منورہ مین قافلہ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہی حتیٰ کہ چالیس نمازین بھی حرم نبوی مین نہین پڑھنے کا موقع ملتا اور مین تو آستانۂ رسالت پناہی پر زیادہ دنون تک جبہہ سائی کا آرزومند تھا اور متمنی تھا کہ حتی الامکان پورے چالیس روز کی حاضری کا موقع ملے اس لیے مین نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ مین جاؤن گا پہلے قافلہ کے ساتھ اور واپس آؤن گا سب سے آخری قافلہ کے ہمراہ لہذا اس امر کی کوشش کی گئی کہ یک طرفہ اونٹ کا انتظام ہو جائے۔ مگر جتنے اصحاب سے دریافت کیا سب نے مایوس کن جواب دیا۔ اور ہمارے مطوف صاحب کے کارکن یوسف نے وعدہ بھی کیا تو بالآخر اس کا ایفا نہ کر سکے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ اونٹ والا اس شرط سے راضی تھا کہ نصف کرایہ سے ایک اشرفی زائد دی جائے۔ مگر جب شیخ المطوفین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اُنھون نے اجازت نہ دی، بہر حال مین مجبور ہو گیا۔

اب دشواری پیش آئی کہ مین تنہا تھا۔ ساتھیون مین سے کسی کے اونٹ پر جگہ نہ تھی اور رحمت شاہ خرچ کی قلت کے باعث مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ یہین مکہ معظمہ مین نوکری کر کے رہ پڑین گے۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر ہی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے نوکری سے مایوس ہو گئے۔ اس لیے اُن کا خیال ہوا تھا کہ حج کر کے ہندوستان واپس جائین گے۔ ہمارے جہاز کے ساتھی میان نظام دین کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھون نے ازراہ فیاضی اُن سے کہا کہ جو زر تمھارے پاس ہو اُس سے مدینہ منورہ کی زیارت تو کر آؤ۔ واپسی کے مصارف کا انتظام وہ کر دین گے۔ پس رحمت شاہ اس سفر مین بھی میرے ہمراہ رہے۔ اور ہم دونون کے لیے ایک اونٹ کر لیا گیا۔

اگرچہ اس ملک کا عام سکہ چاندی کی مجیدی (ترکی روپیہ) اور رانگہ کے قرش ہین لیکن حکومت کی طرف سے اونٹون کا کرایہ ۱۴ گنی ۲ مجیدی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ عہ ۱۲ کے حساب سے گنیان اور عہ مین مجیدی لیکر مین نے کرایہ ادا کیا اور اس رقم کے علاوہ ۱۱ فی کس شغدف کا کرایہ للعہ فی کس حق ترجمانی اور عہ منازل مین مشعل جلانے کی اجرت یعنی مجموعہ مامعہ ۱۰ دینا پڑے۔ رحمت شاہ نے چونکہ گنیان بعد مین لین اس وجہ سے اُنھین معہ کے حساب سے لین۔ مگر اتفاق سے حق ترجمانی اور اجرت مشعل کی رقم سے وہ بچ گئے۔ ترجمان کی اُجرت کی یہ بنا ہی کہ ہر معلم کی طرف سے ایک شخص حاجیون کے ساتھ جاتا ہی جو مسند

مین حجاج اور بدوؤن کے درمیان ترجمانی بھی کرتا ہی اور عام طور پر حجاج کی راحت رسانی کا معین رہتا ہی۔

ہم لوگون نے اپنا کل روپیہ علی جان کی کوٹھی مین جمع کرا دیا تھا۔ چلنے سے قبل اُن کے یہان سے ایک ایک حوالہ مدینہ منورہ مین اُن کے نمائندے کے نام لے لیا اور راستہ کے مصارف کے لیے کافی روپیہ مجیدیان اور قرش سب طرح کے سکے رکھ لیے۔ سامان سفر کچھ بہت زیادہ درکار نہ تھا اس لیے کہ ہم مین سے ہر شخص مسافر ہی تھا۔ مگر اپنا کل سامان ساتھ لے جانا منظور نہ تھا۔ دوسرے شغدف کے لیے بعض اشیا کی ضرورت تھی اور مدینہ منورہ تک کے لیے جنس بھی ساتھ لینا تھی۔ شفقی میر عبدالعزیز صاحب تو ہندوستان ہی سے جنس ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگون کو جنس خریدنا پڑی۔ جو چند روپیہ مین فراہم ہوگئی۔ خیال تھا کہ اشیاے خوردنی بہت گران ملین گی اور اگرچہ اکثر چیزون کا نرخ ہندوستان کے مقابلہ مین دگنا تھا تاہم جب اس امر پر نظر کی جاے کہ یہ اجناس بالعموم ہندوستان، مصر، عراق جیسے دور دراز مقامات سے آتی ہین تو ہرگز گران نہ معلوم ہونگی۔ اجناس کی خریداری مین ایک صاحب کی وجہ سے بہت آسانی ہوئی جو دفتر الناظر کے ایک کارکن مولوی جعفر علی صاحب کے دور کے رشتہ دار ہین اور جن کے والدین عرصہ ہوا ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہین۔ شغدف کے لیے ہمین اشیاء ذیل درکار تھین صراحیان، چٹائیان، زنبیل اور شکیزے۔ ان چیزون کے لیے مرشدزادہ صاحب سے عرض کیا کہ کسی واقف کار شخص سے منگوا دین اُنھون نے ازراہ محبت انتظام تو کر دیا مگر جو شخص چیزین خرید کر لایا اُس نے شرارت سے یا ممکن ہی کہ نادانی سے تقریباً دوگنے دام صرف کرا دیے۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت بعض اصحاب نے کچھ رقوم خیرات میرے حوالے کر دی تھین۔ جو رقوم مخصوص لوگون کے لیے تھین اُن کے متعلق تو مجھے صرف اسی قدر اہتمام کرنا پڑا کہ جلد سے جلد اُن لوگون سے مل کر دیدون البتہ جو رقوم یہ کہکر دی گئی تھین کہ مستحق لوگون مین تقسیم کر دی جائین۔ اُن کو مستحق لوگون تک پہونچانے مین بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ مکہ معظمہ مین جتنا روپیہ تقسیم کرنے کی تھی اُس کا بڑا حصہ مرشدزادہ کے ساتھ ایک ایک گھر پر جا کر دیا گیا اور بقیہ حصہ ایک دوسرے بزرگ کی معرفت اُسی طریقہ پر صرف کیا گیا۔ مرشدزادہ ہی کی معیت مین جناب شیخ حسام الدین بخاری کی خدمت مین حاضر ہوا آپ کا عرف شیخ سینی ہی۔ اور طریقہ نقشبندیہ کے بزرگ ہین۔ آپ کا دولت خانہ حرم محترم سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہی اور جتنے لوگون سے ذکر آیا سب نے بالاتفاق آپ کی بزرگی و عظمت کا اقرار کیا۔ آپ کی عمر

بہت زیادہ ہی۔ اندازاً سو برس سے اوپر۔ مگر ضعیفی کے باوجود روزانہ نماز فجر اول وقت جماعت شافعی کے ساتھ حرم شریف مین ادا کرتے اور اُس وقت سے لیکر طلوع آفتاب تک وہین حلقہ فرماتے ہین۔

اہل عرب کی مہمان نوازی اس قدر مشہور ہی کہ یہان اس کا تذکرہ فضول ہوگا۔ مکہ معظمہ مین کسی کے یہان جائیے تو چائے کی ضیافت ضروری ہی حقہ سگریٹ بھی اکثر لوگ پلاتے ہین۔ اور سوکھے پانون کی گلوریان بھی کہین کہین ملتی ہین۔ شیخ کے یہان بھی جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوتا تو کمتر ایسا ہوتا کہ چائے یا فواکہات یا کھانے کے بغیر وہ رخصت ہونے دیتے۔ ناوقت اوقات مین بھی وہ اکثر اصرار فرماتے اور مجھے مجبور ہونا پڑتا۔

حرم شریف مین توجسقدر ممکن ہوتا ہی آب زمزم پیا جاتا ہی۔ چاہ زمزم پر ہر وقت سقے موجود رہتے ہین جو صبح سے لیکر عشا کے وقت تک پانی پلاتے رہتے ہین۔ اس کے علاوہ صحن حرم مین جابجا لوگ صراحیان لیے ہوے پھرتے اور پانی پلاتے رہتے ہین اور بہت سے حجرون مین مختلف سبیلون کے منتظمین کی طرف سے پانی جمع رہتا ہی اور حجاج کے زمزمیون کی طرف سے بھی حرم شریف مین شام کے وقت پانی پلایا جاتا ہی اور گھرون پر بھی آب زمزم کی صراحیان بھیجی جاتی ہین۔ آب زمزم اگرچہ ذائقہ کے لحاظ سے شیرین نہین اور عموماً ٹھنڈا پینے کو نہین ملتا لیکن اس مین عجیب عجیب برکتین ہین اس لیے جسقدر ملتا پیا جاتا۔ شہر مین نہر زبیدہ کا پانی عام طور سے ملتا ہی جو نہایت شیرین اور لطیف ہی۔ عام صرف کیلیے اکثر لوگ کنوئین کا کھاری پانی بھی لیتے ہین۔ مین پانی عادتاً زیادہ نہین پیتا۔ اگر مکہ معظمہ مین کچھ تو موسمی حرارت وخشکی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ چلنا زیادہ پڑتا تھا، بکثرت پانی پینا پڑتا تھا اور بجاے اسکے کہ نقصان پہونچتا صحت کے لیے وہان کے پانی سے زیادہ کوئی چیز مفید معلوم نہین ہوئی۔ کیونکہ جسقدر غذا نا موافق ملتی تھی اُسی قدر قوت ہاضمہ اُس سے کم متاثر تھی۔ بلکہ سچ یہ ہی کہ ایسی ناموافق غذا یہان رہ کر ہضم ہی نہین ہوسکتی۔

مرشد زادہ کی معیت مین جنت المعلیٰ کی حاضری بھی دے آیا۔ پیر عبدالعزیز صاحب تو دیگر زیارتگاہون پر بھی ایک صاحب کے ساتھ حاضری دے آئے تھے۔ مگر مین نے مدینہ منورہ سے واپسی پر زیارتگاہون پر حاضری ملتوی رکھی۔

۹ رشوال ۰۵ ۲۰ مئی ۱ ہماری روانگی کا دن متعین تھا۔ مگر جب عصر کے وقت تک اونٹ نہ آے تو ہم لوگ مطمئن ہو گئے کہ آج روانگی نہ ہوسکے گی۔ شام کے قریب دفعتاً اونٹون کے آجانے کی اطلاع ملی اور جلدی جلدی شغدفون پر سامان رکھا گیا۔ سامان رکھکر ہم لوگ حرم شریف چلے گئے یہان نماز مغرب کے بعد

طواف وداع کیا اور باب الوداع کی طرف سے رخصت ہوے۔ ہمارے اونٹ حرم شریف کے باہر ہی کھڑے تھے اِس لیے فوراً سوار ہو کر ایک گھنٹہ مین شہدا پہونچ گئے۔ یہ مقام مکہ معظمہ کے نواح مین تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر مسجد تنعیم سے قریب ہی۔ شہر سے تمام قوافل یہان آکر جمع ہوتے ہین اور ایک دو دن کے بعد جب قافلہ پورا یکجا ہو جاتا ہی تو روانہ ہوتا ہی۔ قوافل کا یہ اجتماع "تبریز" کی اصطلاح سے موسوم ہی۔ شغدف پر پہلی بار سوار ہونے کا اتفاق ہوا تھا، اِس لیے یہ مختصر سفر بجائے تکلیف دہ ہونے کے بہت فرحت کا موجب ہوا۔ میرے شریک شغدف رحمت شاہ ماشاء اللہ بہت تندرست و توانا تھے لہذا شغدف کا وزن برابر کرنے کے لیے جنس کا بڑا حصہ میرے شغدف پر رکھ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے مجھے جنبش تک کا موقع نہ تھا۔ شہدا پہونچ کر سب سے پہلے پانی کی فکر ہوئی۔ تلاش سے ایک کنوان ملا جہان پانی بھر کر وضو کیا گیا اور نماز کے بعد شغدف کے سامنے زمین پر بچھونا بچھا کر پڑ رہے۔ صبح کو مین اور دو ساتھی مکہ معظمہ واپس آئے۔ بعض ضروری چیزین رہ گئین تھین اُن کو خرید کر اور بازار سے لیکر ساتھیون کو تو مین نے دوپہر ہی کو رخصت کر دیا اور مین نماز کے بعد اپنے مہتمم ڈاک کی خدمت مین حاضر ہوا۔ اتفاق سے گھر کے خطوط اور اخبارات آگئے تھے۔ عجلت مین خطوط کے جواب تو لکھدیے مگر اخبارات لینا بھول گیا اور ایک گدھا کر کے سہ پہر تک قافلہ مین آکر ملگیا۔ یہان میدان مین دھوپ کی تمازت سے لوگ بدحواس ہو رہے تھے اور پانی کی قلت مزید ستم ڈھا رہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا اور وضو کے لیے ساتھیون کے پاس ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔ قریب ہی اگرچہ بازار لبا ہوا تھا۔ جہان ضروری اشیاے خوردنی ملتی تھین مگر پانی کہین بھی نہین ملتا تھا۔ البتہ کنوئین پر سقے بھر رہے تھے مگر وہ بات بھی نہین سنتے تھے۔ آخر بعد تلاش بسیار ایک کنوان ملا جہان کوئی سقہ نہ تھا اور مین نے اور رحمت شاہ نے مل کر پانی بھرا۔ وضو کیے اور ایک ایک ٹین بھر کر اپنے مقام تک لائے۔ اس قسم کی جسمانی محنت کا مین بالکل نا اہل ہون اس وجہ سے پانی کا ٹین لانا گویا ایک عظیم الشان مہم تھی۔ اور اگرچہ بالآخر مین اس مہم کو سر کر سکا مگر پانی کا ایک معقول حصہ ضایع ہو گیا اور میرے کپڑے شرابور ہو گئے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اگرچہ فی الجملہ اس کی کوئی تکلیف نہین ہوئی لیکن بہت پست ہو گیا۔ نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ عین اُسی وقت دیکھا کہ شریف کی سواری آ رہی ہی۔ سبزہ گھوڑے پر شریف سوار تھے اور ان کے پیچھے ایک دو آدمی اور گھوڑون پر سوار اور جلو مین مختصر سی جماعت خدام اور محافظین کی تھی۔ شریف ایک پہاڑی کے دامن مین

گھوڑے سے اُترے۔ پہاڑی کے ایک حصہ پر جو زیادہ بلند نہ تھا ایک جگہ کسی قدر ہموار تھی۔ یہاں چند اونی دریاں بچھا دی گئیں اور شریف معہ دو ایک ساتھیوں کے وہین جا کر بیٹھ گئے اور بقیہ ہمراہیوں میں سے کچھ تو نیچے گھوڑوں کے پاس کھڑے رہے یا بیٹھ گئے اور کچھ شریف کے عقب میں پتھروں کی آڑ میں ہو گئے۔ ایک کرسی شریف کے قریب شاید اُن کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی مگر وہ دری پر بیٹھے۔ ایک دوربین اُن کے پاس تھی، اُس کے ذریعے کبھی وہ قافلہ کا نظارہ کرتے اور کبھی اُس کو کرسی پر رکھ کر ساتھیوں سے بات چیت کرتے۔ میں نے اس سے قبل شریف کو نہیں دیکھا تھا اس لیے میں غور سے دیکھتا رہا اور اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا اور میری نگاہ بھی کمزور ہے تاہم میں ان کی حرکات و سکنات کو بخوبی دیکھ سکا۔ اب قافلہ روانہ ہونے لگا اور مختلف جوانب میں شغدف اونٹوں پر کسے جانے لگے جس کی وجہ سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ادھر ہمارے بدوؤں نے آکر شغدفوں پر سامان رکھنے کا تقاضا کیا۔ ہمارے ترجمان صاحب ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ عصر کے قریب ہمارے مطوف کے وکیل عبدالرحمٰن پشناس کے ساتھ آئے۔ یہ صاحب تنہا ہمارے قافلہ کے ترجمان نہ تھے بلکہ ایک اور مختصر قافلہ دوسرے مطوف کے حاجیوں کا بھی ان کے تحت میں تھا۔ وکیل صاحب نے ہر اونٹ کے کرایہ میں سے دو دو گنیاں ہمارے پاس اس غرض سے جمع کیں کہ یہ رقم مدینہ منورہ پہونچ کر اپنے بدوؤں کو دے دیں۔ یہ کل رقم میر عبدالعزیز صاحب کے پاس جمع کرا دی گئی کہ ہمارے مختصر قافلہ کے سردار وہی تھے۔ دوسرے شغدفوں کے مقابلہ میں میرے یہاں سامان زیادہ تھا، اِس پر ہمارا بدو عبدالرحمٰن بہت جز بز ہوا۔ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ راستہ میں ناقص جنس خریدنا مجھے منظور نہیں اس لیے میں نے مدینہ منورہ تک کے لیے سامان یہیں سے ساتھ لے لیا ہے۔ البتہ اگر بدو اس پر رضامند ہو کہ اُس کو راہ میں کھانا نہ دیا جائے تو مجھے کچھ عذر نہ ہوگا اگر نصف جنس یہیں چھوڑ دی جائے۔ بدو پہلے تو بہت ناراض ہوتا رہا اور جیسا کہ غصہ ور لوگوں کا قاعدہ ہے بہت قسمیں بھی کھاتا رہا۔ لیکن بالآخر وکیل صاحب نے جب یہ تصفیہ کر دیا کہ میں ایک روپیہ اُس کو ریدوں تو وہ راضی ہو گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر جب ہم اونٹوں پر سوار ہوئے اور ہمارا قافلہ چلا تو عبدالرحمٰن کے بجائے ایک دوسرا بدو میرے اونٹ کے ساتھ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ عبدالرحمٰن کا بھائی ہے اور اُس کا نام عمار ہے۔ دکہ معظمہ کے حالات میں اس وجہ سے بہت اختصار کرنا پڑا ہے کہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد زیادہ دنوں وہاں حاضر رہنے کا موقع ملا اور اُس کا مفصل ذکر انشاءاللہ آئندہ کیا جائے گا۔

پانچوین منزل

شہداسے نکلکر مسجد تنعیم کے آگے اونٹ رُک گئے۔ یہان ایک جانب حکومت کے کارکن خیمہ ڈالے پڑے تھے اور گیس کی تیز روشنی مین اونٹون کا شمار کر رہے تھے۔

ہمارے معلم کے کارکن یوسف نے اپنے سب اونٹ شمار کرا دیے اور ضروری مراسم تحریر ادا ہو گئے تو وہان سے رخصت ہو کر آہستہ آہستہ قافلہ روانہ ہوا۔ اور دن بھر کی ماندگی کے اثر سے فوراً نیند آگئی۔ مگر شغدف پر مسلسل سونا اور وہ بھی پہلی رات، قطعاً ناممکن تھا اس لئے کہ جمال (شتربان) بار بار "میزان میزان" کے آوازے لگا کر مسافرون کو اپنے اپنے شغدفون کا توازن برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے تھے اور چونکہ اونٹون کی دو تین قطارین پاس پاس چلتی تھین اس وجہ سے کبھی آگے پیچھے کے شغدف ٹکرا جاتے تھے اور کبھی برابر برابر چلنے والے شغدف باہم الجھ جاتے تھے۔ نصف شب کے بعد دور سے روشنی دکھائی دی تو ہم نے سمجھا کہ منزل قریب آگئی ہے۔ چنانچہ تقریباً ۲ بجے رات کو

۲۰ مئی روز یکشنبہ

پڑاؤ پر پہونچے۔ جمالون نے فوراً ہی "انزل انزل" کہکر اوترنے کا تقاضا شروع کیا۔ جلدی جلدی آنکھ ملتے ہوے اوترے۔ شغدفون کو اُنھون نے ہم لوگون کی مدد سے بعجلت تمام اوتار پھینکا اور اونٹون کو لیکر چلتے بنے۔ ہمنے امداد باہمی سے اپنے اپنے شغدفون کا سامان اوتارا۔ زمین پر چٹائیان اور بچھونے بچھائے کہ اتنے مین آواز آئی "حطب"۔ فوراً تھوڑی سی لکڑی خریدی گئی اور پھر جب "مویا مویا" کی صدا لگاتے ہوے مرد عورتین اور بچے مشکیزون اور مٹی کے کنسٹرون مین پانی لائے تو ضرورت کے مطابق پانی لیا گیا وقت اتنا نہ تھا کہ سوتے لہذا تھوڑی دیر باتون مین گذار کر نماز فجر ادا کی۔ مین نے اپنے ساتھیون سے طے کر لیا تھا کہ لکڑی اور پانی کی فراہمی اور بازار کے دوسرے کام میرے متعلق رہین گے۔ کھانا پکانا یا پکوانا اور جائے قیام پر دوسرے امور کی نگرانی

ده کرین گے - لکڑی اور پانی چونکہ بآسانی فراہم ہو گئے تھے اور دونون چیزون کے
بیچنے والے مسلسل آتے رہتے تھے اس لئے نماز فجر کے بعد ہی مین نے پڑاو کا گشت لگایا
اور بازار کا پتہ چلایا - ہمارا قافلہ ایک بلندی کے دامن مین تھا اور دور تک شغدف ہی
شغدفون نظر آتے تھے - ہر معلم کے حجاج کی الگ الگ ٹولی تھی اور عموماً اُن کے شغدف
پاس پاس ایسے طریقہ پر رکھے گئے تھے کہ دائرہ یا نصف دائرہ کی صورت بن جائے
درمیانی میدان مین لوگ اپنے بچھونے بچھاتے اور چولھے چڑھاتے - جن لوگون کے ساتھ
راوٹیان یا نمگیرے تھے اُنھون نے شغدفون سے کچھ فاصلہ پر ڈیرے جمائے تھے - یہ سلسلہ
بلندی کے اوپر تک چلا گیا تھا مین گھومتا ہوا ادھر پہونچا تو دیکھا کہ بلندی کے اُس
جانب نہر رواں ہے - جس کے کنارے بکثرت اونٹ اور آدمی جمع ہین - یہ نہر وہی ہے
جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پانی مکۂ معظمہ مین پیا جاتا ہے - اِس کا
اکثر حصہ پٹا ہوا بیان کیا جاتا ہے - مگر یہان دور تک کھلی ہوئی ہے - نہر کا عرض بہت
ہی کم ہے کسی جگہ تین چار فٹ ہی ورنہ عموماً دو فٹ سے زیادہ نہین - بڑے بڑے المونیم
کے تسلے اونٹون کے سامنے رکھے ہوے تھے اور جمال چمڑے کے ڈولون سے پانی
بھر بھر کر پلا رہے تھے - پاس ہی سیکڑون آدمی غسل کر رہے تھے جس مین مرد و عورت
کی کچھ تمیز نہ تھی - یہ لوگ عموماً ملک جاوہ کے رہنے والے تھے - ان لوگون مین بظاہر حیا و
غیرت کا نام نہین ہے - جس طرح ہندوستان مین دریاؤن کے گھاٹون پر ہندو
مرد و زن ملکر اشنان کرتے ہین، بعینہٖ یہی حالت جاویون کی تھی - بعض لوگ نہر کے
اندر نہا رہے تھے - اور چونکہ نہر کا عمق بھی بہت کم ہے اسوجہ سے مرد و زن سب برہنہ
یا نیم برہنہ نظر آتے تھے - نہر کے کنارہ دور تک کھیتی اور نخلستان دکھائی دیتے تھے
کنارہ سے ذرا ہٹکر ایک سمت کو بازار بسا ہوا تھا - یہان اونٹ گائے، بکری اور
دنبہ کا گوشت، انڈے، روٹیان، سبزی، خربزے، تربوز، جبنس، تیل، چائے، شکر
اور تمباکو وغیرہ ضرورت کی سب چیزین بک رہی تھین - بازار جھونپڑیون کا بنا ہوا تھا
اور بیلون سے منڈھے ہونے کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتا تھا کھانے کی دکانین

اور قہوہ خانے متعدد تھے - مین چونکہ گھومتا ہوا پہونچا تھا اس وجہ سے ذرا دیر مین پہونچا ورنہ ہمارے مقام سے ایک فرلانگ سے زائد فاصلہ نہ ہوگا - واپس آکر ساتھیون کو حال سنائے اور کھانا کھانے کی فکر ہوئی - آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا - تمازت بڑھ رہی تھی اور ہوا کی حدت ترقی پر تھی - دن اسی بے پناہ میدان مین بسر کرنا تھا لہذا لیٹنے - بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ بنانا ضروری تھی - مگر ناواقفیت اور پہلے سے اس کا خیال نہ آنے کی وجہ سے ہمارے شغدوف بہت ناموزون رکھے گئے تھے - بہر حال موقع کے لحاظ سے پانی بھرنے کی تھیلیون اور چادر و رضائی کی مدد سے ایک جگہ ایسی بنائی گئی جہان سایہ رہ سکے اور کھانا کھا کر سو رہا - ظہر کے قریب اٹھا تو ایک شخص خرمے بیچنے لایا - یہ خرمے بہت ہی خوش ذائقہ تھے -

صبح ہی کو ہمارے شغدوف سے قریب عراقیون کی جو جماعت خیمہ زن تھی اسمین سامان غسل وکفن ہو رہا تھا - شام کو ہمارے سامنے کے قافلہ مین ایک حاجی نے انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون - عصر کے وقت مین ضیاء الاسلام صاحب کے یہان بیٹھا تھا کہ دفعتہً آندھی چلنے لگی ! دن بھر کی تپش اور لو کے بعد اگرچہ اس سے بہت کچھ فرحت ہوئی مگر اس خیال سے کہ کہین بارش نہ ہو جائے بعجلت اپنے مقام پر واپس آیا - آندھی دیر تک رہی - کچھ ترشح بھی ہوا باقی غنیمت ہے کہ بارش کی نوبت نہین آئی -

ہمارے قافلہ نے یہان ایک دن مقام کیا - دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بہت سے جمالون کے گھر قریب ہین اس لئے وہ اپنے گھر والون سے ملنے گئے ہین شام کو ہم بعد مغرب کھانا کھا رہے تھے کہ میرا جمال عبد الرحمن آگیا - اور میری دعوت پر وہ بھی کھانے مین شریک ہوگیا اور کھانے سے فارغ ہو کر بخشش کا روپیہ جو عمار کو احتیاطاً نہین دیا گیا تھا لیکر پھر کہین چلا گیا -

۲۸ - مئی روز دوشنبہ — دوسرے دن چاشت کے وقت بھاگتا ہوا آیا اور مجھسے کہا کہ ایک بورے مین تمام جنس اور بھاری سامان باندھکر مجھے دو میرے پاس کوئی فاضل بورا نہ تھا لہذا اُس کے ساتھ جاکر بازار سے خرید کیا اور واپس آکر بھاری اور غیر ضروری سامان بورے مین رکھکر اُس کے حوالہ کیا - ہمارے ساتھیون نے بھی اپنا زائد سامان اپنے جمالون کو

دیدیا - ہمارے پانچ اونٹ تھے - جس میں سے تین میرصاحب کے - ایک میرا اور ایک ہمارے اُن پنجابی ساتھی کا جو میرصاحب کی اجازت سے مکہ معظمہ میں ہمارے مکان کے بیرونی حصہ میں رہتے تھے - یہ تین آدمی تھے، دو بہنیں اور ایک بھائی - ایک بہن جو پہلے ایک بار حج کر چکی تھی غربت کی وجہ سے شغدف کا کرایہ نہ دے سکتی تھی - لہذا وہ شہداسے وادی فاطمہ تک چھپکر پیادہ پا چلی آئی اور یہاں ہمارے قافلہ کے سردار سے گفتگو کر کے ۳ گنی میں آمد و رفت کا کرایہ طے کرلیا - باقی دونوں نے ایک اونٹ مع شغدف کرلیا تھا - ان پانچوں اونٹوں میں سے چار کے جمال ہم قبیلہ تھے - مگر عبدالرحمن کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا - عبدالرحمن کے پاس چار اونٹ تھے جنمیں ایک میری سواری میں تھا اور دو جاویوں کی سواری میں تھے - چوتھا جو کوتل چلتا تھا جاویوں ہی کے قافلہ کے ساتھ رہتا تھا - اسی پر زائد سامان جاکر باندھ دیا گیا -

چاشت ہی کے وقت قافلہ میں ہر طرف حَیَّ حَیَّ کی صدا بلند تھی اور مختلف ڈولیاں شغدف رکھو رکھو کر روانہ ہونے لگی تھیں - دوپہر کے قریب ہمارے جمال اونٹ لائے اور آتے ہی یہاں بھی حَیَّ حَیَّ کہکر شغدف لادنے کی جلدی مچانا شروع کی - ہم لوگ بھی تیار بیٹھے تھے - لہذا ظہر سے قبل ہی روانہ ہوگئے - راہ میں جا بجا کہیں شربت کہیں تربوز کہیں چاے بکتی جاتی تھی - بدوی دوڑ دوڑ کر شغدف سواروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے - ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے اونٹ سے اترا تو میدان میں ایسی تپش تھی کہ الامان والحفیظ - نماز پڑھنے سے قبل اپنے شغدف سے کچھ آگے نکل گیا تھا - جتنی دیر میں نماز پڑھی اونٹ نے وہ راستہ طے کیا اور کچھ آگے بڑھ گیا اور مجھے اُس تک پہونچنے کے لئے ذرا تیز چلنا پڑا - زمین کی ریت جو چلنے میں جوتہ کے اندر بھر گئی تھی اسقدر گرم تھی کہ اُسکی وجہ سے پاؤں جھلسے جاتے تھے - ہوائے گرم و تند کے طمانچوں سے چہرہ بدحواس تھا اور آنکھوں سے گویا شعلے نکل رہے تھے - شغدف میں پہونچکر جان میں جان آئی اور کئی گھنٹہ تک دم لینے کے بعد جب عصر کے وقت قدرے ٹھنڈا ہوا تو پھر نماز کے لئے اوترنا چاہا - رحمت شاہ پہلے اوترنا چاہتے تھے - اوترنے میں اُن کا تہمد شغدف میں اولجھہ گیا

اور اُن کے بوجھ سے اُن کا شغدف زمین سے جا لگا۔ اونٹ برابر چل رہے تھے۔ اس لئے جبتک جمال کو اطلاع ہو وہ دوڑکر آئے اور اُونٹ کو کھولے ہمارا ایک شغدف زمین بوسی کی حالت مین اور مین دونون شغدفون کے درمیان معلق رہا۔ یہ چند منٹ اس قدر خطرہ کی حالت مین گذرے کہ عبدالرحمٰن نے دوڑکر شغدف کو اُبھار کے درست کردیا۔ مگر پھر بھی طبیعت کی بدمزگی اور افسردگی زائل نہ ہوئی۔ جب مغرب کے وقت قافلہ چند منٹ کے لئے رکا تو شغدفون کو اتروا کر از سرنو اونٹ پر کسوایا۔ پھر بھی آرام سے نیند نہ آئی۔ عبدالرحمٰن و عمار کو اس بات پر غصہ مین آکر بہت ڈانٹا کہ وہ ہمارے اونٹ کو چھوڑکر جاویون کے اونٹون سے جا ملے تھے۔ دونون مین سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ عبدالعزیز ہمارے ترجمان نے سمجھا بجھا کر اطمینان دلایا کہ آئندہ شغدف بہت مضبوطی سے کسے جائینگے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ منزل طولانی تھی اور پھر یہ حادثہ۔ مشکیزے جو مکہ معظمہ سے ساتھ لائے تھے اُن مین وادی فاطمہ مین پانی بھرا گیا تو معلوم ہوا کہ سب ٹپکتے ہین۔ صرف دو صراحیان دونون شغدفون پر تھین۔ لہذا پانی چک گیا۔ رات مین سوتے سے آنکھ جو کھلی تو خشکی سے منھ مین کانٹے پڑے ہوے تھے۔ کسی نے مویا مویا کی صدا لگائی تو ایک قرش دے کر ایک گلاس پانی لیا اور جلدی مین غٹ غٹ چڑھا گیا۔ بمشکل دو حصہ پانی ہوگا باقی ریت ہی ریت تھی۔ خدا خدا کرکے صبح کو ۳ بجے قافلہ منزل پر پہونچا۔

۲۹ مئی روز شنبہ پڑاو کی زمین کسی قدر ناہموار تھی۔ بہرحال جلدی جلدی شغدف اوتارے گئے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اونٹ پر سے پھینکدیے گئے اور شغدفون کے سامنے بچھونے بچھا کر ذرا دیر لیٹے ہوئے۔ نماز فجر کے بعد مین وظیفہ پڑھتا ہوا بازار کی طرف گیا۔ طغان کا بازار اچھا خاصہ ہے۔ یہان غلہ بہت فروخت ہوتا ہے۔ دوکانین عموماً پٹی ہوئی ہین۔ تربوز۔ خربزے۔ بیگن۔ ککڑی لیمون وغیرہ بکثرت ملتے ہین۔ کھانے اور چائے کی دوکانین بھی ہین۔ مگر پکی ہوئی روٹی نہین نظر آئی۔ متعدد کنوین قریب ہی تھے۔ جن مین سے دو جو باولیون کی وضع کے پختہ بنے ہوے تھے بہت بڑے

اور کسی قدر بلندی پر تھے کہ اُن پر سے چڑھ کر سارے پڑاؤ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر پانی وادی فاطمہ جیسا شیرین و سبک نہ تھا اور نسبتاً گران بھی ملا۔ جمالون نے شغدف اُتار پھینکنے کے وقت تو میری ہدایت پر چندان توجہ نہ کی تھی لیکن وادی فاطمہ پر شغدفون کے الگ الگ رکھے ہونیکی وجہ سے جو تکلیف ساتھیون کو ہو چکی تھی اُس کی بنا پر سب لوگون نے بالاتفاق طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے شغدف بالمقابل رکھے جائین۔ چنانچہ ہم لوگون نے خود اپنے اپنے شغدف اٹھا کے مقابل مین کر لئے تھے اور بازار سے آکر جیسے ہی آفتاب بلند ہوا اور تمازت نا قابل تحمل ہو گئی، رضائیان نکال کر شغدفون کے درمیان باندھ دی گئین جسکے سایہ مین کھانا بھی پکا لیا گیا اور آرام سے لیٹ بیٹھ بھی سکے۔ وادی فاطمہ مین ٹھہرنا زیادہ پڑا تھا اور یہان قیام مختصر تھا اس وجہ سے کھچڑی کھائی گئی اور شام کے لئے روٹی پکا لی گئی* ظہر کے قریب قافلہ روانہ ہوا۔ منزل چھوٹی تھی۔ راہ مین شربت چائے تربوز بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ ایک روز قبل کے تجربہ کی بنا پر مین نے طے کر لیا تھا کہ اب عصر سے قبل شغدف سے نہ اُترون گا۔ کیونکہ ہوائے گرم و تند اور آفتاب کی جھلس دینے والی تپش کے مقابلہ مین یہ مین بہت نحیف و زار تھا۔ ہمارے اونٹون کا رُخ اگرچہ مغرب جانب ہونے کی وجہ سے آفتاب پشت کی جانب تھا لیکن ہوائے گرم کے لوکے شغدف کے اندر بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اس لئے سامنے کے رُخ پر رضائی کا پردہ باندھا گیا اور پشت پر باوجودیکہ شغدف مین چٹائی کسی ہوئی تھی لیکن دونون شغدفون کے درمیان جو حصہ کھلا رہتا تھا اُس سے دھوپ اور ہوا کے گذر کو بند کرنے کے لئے بھی ایک مختصر پردہ باندھنا پڑا۔ پھر بھی ہوا کی تیزی اور اونٹ کی بے ڈھنگی چال کے باعث جب کسی جانب کا پردہ کھل جاتا تو ہوا کا وہ تھپیڑ لگتا کہ معلوم ہوتا کسی نے آگ سے داغ دیا ہے۔ شغدف مین پردون کے باندھ دینے کی وجہ سے جہان ہوا کے تھپیڑون سے نجات مل گئی تھی وہان حبس بھی ہو گیا تھا جسکی وجہ سے دم گھٹنے لگتا پیاس کی شدت تھی۔ جو صراحیان سامنے کی طرف تھین اُن کا پانی پیتے رہے اس لئے کہ پشت کی طرف جو صراحیان تھین اُن کا پانی تمازت آفتاب سے پک گیا تھا۔ عصر کے وقت

---

* اتنے میں کچھ لوگ آئے جو گرد و پیش کے عرب قبائل کی طرف سے چوکیداری وصول کرتے تھے۔ دو قرش فی شغدف کے حساب سے چوکیداری ادا کی گئی

جبکہ آفتاب بالکل شغدف کے اُس جانب آگیا جدہر چٹائی کسی ہوئی تھی اور ہوا کی تیزی دگرمی میں بھی کمی ہوئی تو پشت کا پردہ کھولا گیا۔ شام کو روٹی اور کھجور اور وطن کا پکوان کھایا۔ اور یہی یدؔ کو دیدیا۔ عشا پڑھکر کچھ دیر سوئے نصف شب کو منزل پر پہونچے۔ چونکہ پورا قافلہ آگے پیچھے روانہ ہوتا۔ چلتا اور منزل پر پہونچتا ہے اس لئے جو لوگ پہلے پہونچ کر آباد ہو چکتے ہیں اُن کے پڑاؤ کی مشعلوں کا نظارہ دور سے شغدف میں بیٹھکر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے پڑاؤ پر پہونچنے سے پہلے جتنی مسافت قافلہ کے گرد طے کی جاتی ہے اُس میں میلہ کی سیر کا لطف آتا اور چونکہ پانی اور لکڑی فروخت کرنے والوں کی کثیر تعداد "مویا۔ مویا" اور "حطب حطب" کے آوازے لگایا کرتی اس لئے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ شغدف سے اُترتے ہی فوراً پانی خریدا گیا۔ اور چند منٹ کے اندر بستر بچھا کے سو رہے۔

۳۰ مئی روز چہارشنبہ

رات کو کسی قدر شبنم پڑی جس سے سارا بستر تر ہوگیا، اور صبح کو خفیف سی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ سویرے حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا۔ دُفت کا بازار مختصر ہے۔ گو سفری ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ پچھلی منزلوں میں گرمی سے پیاس کی شدت رہی تھی اس لیے آج تربوز لیکر کھایا۔ میں معدہ و جگر کے ضعف کی وجہ سے وطن میں رہکر تربوز شاذ و نادر کھاتا ہوں مگر یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا میں تربوز کا کھانا مفید ہے۔ کوئیں یہاں زیادہ اور بڑے نہیں۔ پانی کسی قدر کھاری تھا اور گراں ملا۔ وادیٔ فاطمہ میں دو سے لیکر چار قرش فی ٹین پانی کی قیمت دی گئی۔ اطفان میں چھ سے آٹھ قرش تک اور یہاں آٹھ سے بارہ قرش تک۔ اس قافلے میں کم و بیش چھ ہزار اونٹ تھے، جو دو ٹکڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی نصف قافلہ جب ایک پڑاؤ سے گذر جاتا تو بقیہ نصف قافلہ دوسرے روز وہاں پہونچتا۔ ہم لوگ دوسرے قافلے میں تھے۔ ہر ٹکڑی میں کچھ کوتل اونٹ بھی ہوتے تھے لیکن زائرین کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اور جمالوں: اُن کے سرداروں اور دیگر ہمراہیان کو ملا کر یہ سارا قافلہ تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے قافلے کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باوجود بھی جب ایک حصہ پڑاؤ پر مقیم ہوتا تو وہاں

ایک اچھے خاصے قصبے کے برابر آبادی ہو جاتی۔ اس سارے مجمع کو سیراب کرنے کے لیے ایک دو کنوئیں کیا کافی ہو سکتے تھے۔ کنووں سے متصل بڑے بڑے حوض یا تغالے بنائے جاتے تھے تاکہ اونٹوں کو پانی پینے میں آسانی رہے۔ ہر وقت متعدد گراریوں پر بڑے بڑے چرمی ڈولوں میں پانی کھینچا جاتا تھا اور سقوں، پانی بیچنے والوں، اور غریب زائرین کا جو اپنے مقام پر پانی نہیں خرید سکتے تھے ان کنووں کے گرد ایک ہجوم رہتا تھا۔ سقے جو عموماً سوڈانی عرب ہوتے تھے صرف ڈول کھینچتے رہتے تھے۔ پانی بیچنے والے مرد، عورتیں اور بچے انھیں سے اپنی مشکیں، مشکیزے، اور ٹین بھرواتے اور دوڑ دوڑ کر پڑاؤ والوں کے ہاتھ جا کر فروخت کرتے۔ جو لوگ اپنے مقام پر پانی کی گراں قیمت نہیں دے سکتے تھے وہ اپنے اپنے ٹین یا مشکیزے لاکر انھیں سقوں سے براہِ راست بھروا لیتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرانی اور اُسکے حصول کی دشواریاں سب بجائے خود اگرچہ ہمت شکن ہوتیں مگر جب اُس ملک کے قدرتی حالات پر نظر کیجاتی تو شکوہ و شکایت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا۔ اور جب اُس نعمت عظمیٰ کی لذت کا دھیان آتا جسکے حصول کی تمنا کشاں کشاں اس انبوہ کثیر کو لیے جا رہی تھی تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

چوکیداری کی فیس دو قرش ادا کیے گئے اور ٹھیک دوپہر کو قافلہ روانہ ہوا۔ گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہ تھی مگر تربوز کی بدولت پیاس کم معلوم ہوئی۔ وقت میں تھوڑے لیموں خرید لیے تھے۔ شام کو شغدف پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا شربت بنا کے پی لیا۔ جس سے مزید تسکین ہوئی اور راستہ بخیرو خوبی کٹ گیا۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد پہونچ گئے۔ اور نماز عشا پڑھ کے سو گئے۔

۳۱۔ مئی روز پنجشنبہ — خذمیہ یا خذیفیہ کا بازار جو ذرا بلندی پر واقع ہے، پختہ ہے اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ اسکے ایک جانب بہت سے کچے کنوئیں بنے ہوئے تھے۔

ان کا پانی میٹھا ہوتا تو قافلے والوں کو بہت آسانی ہوتی۔ مگر میٹھے پانی کے پختہ کنوئیں ذرا فاصلے پر تھے۔ ہمارا پڑاؤ دوسری جانب تھا۔ اور نہایت مسطح زمین پر تھا۔ اور چونکہ دوسرے مقامات کی طرح دور تک کسی قسم کی بلندی، ٹیلہ یا پہاڑی نہ تھی اس لیے جگہ بہت کھلی ہوئی اور پر فضا معلوم ہوتی تھی۔ حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا تو دیکھا کہ بازاروں میں کھانے کی دوکانیں بھی ہیں جہاں مچھلی کا گوشت بکثرت بک رہا تھا معلوم ہوا کہ سمندر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تازی مچھلیاں

بھی بکثرت نظر آئیں۔ آفتاب بلند ہو جانے کے بعد میں قافلے سے ذرا دُور رفع حاجت کے لیے گیا تو ایک طرف ایسا نظر آیا کہ سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اور دُھندلے سے نشانات کشتیوں کے بھی دکھائی دیے۔ یہ خیال کر کے کہ ساحل قریب ہے اور ابھی قافلے کی روانگی میں بہت دیر ہے، میں نے چاہا کہ ساحل کی سیر کر آؤں۔ پڑاؤ پر آکر ڈنڈا اُٹھایا اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ ساحل قریب ہے میں ذرا سیر کر کے ابھی آتا ہوں، نکل کھڑا ہوا۔ اور جس طرف سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں اُسی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے جب سامنے نظر کرتا تو جھلکتا ہوا پانی دکھائی دیتا۔ اور میں سمجھا کہ ساحل کے قریب پہونچ رہا ہوں۔ اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جاتا اور روشنی تیز ہوتی جاتی کشتیاں قریب ہوتی نظر آتیں۔ دیر تک چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قافلے سے بہت دور نکل آیا ہوں اور ساحل جتنے فاصلے پر پہلے تھا اب بھی اُسی قدر دُور ہے۔ میدان میں کوئی شخص ایسا نہ نظر آیا جس سے پوچھ سکتا۔ کہیں کہیں کوئی بدو عورت بکریاں یا اونٹ چراتی ہوئی نظر آجاتی اور اُس سے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دریافت کرتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ تا آنکہ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اور قافلے سے اتنی دوری ہو گئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی بدو تنہا دیکھ کر حملہ آور نہ ہو۔ ناچار واپس ہوا۔ مگر مڑ مڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا اور عجیب بات تھی کہ جس جگہ پہلے سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں وہاں اب پہاڑی دکھائی دیتی تھی۔ اپنے مقام پر پہونچ کر لوگوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ساحل یہاں سے اتنا قریب نہیں کہ دکھائی دے اور جو پانی کی سی چمک دکھائی دیتی تھی وہ دراصل ریت کے ذرے تھے جو آفتاب کی کرنوں سے چمک اُٹھے تھے۔ اور کشتیاں جو نظر آتی تھیں وہ دراصل کشتیاں نہ تھیں بلکہ بگولے تھے کہ ہوا پر اُڑ رہے تھے۔

بگولہ اور سراب کی ماہیت سے تو واقفیت تھی مگر اُنکے نظارے کا کبھی موقع نہ آیا تھا۔ پہلی دفعہ قدرت کے یہ کرشمے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ منزل طولانی تھی لہذا چاشت ہی کے وقت روانگی ہو گئی۔ راستے میں ابر محیط رہا۔ سمندر کے کنارے کنارے قافلہ چل رہا تھا اس لیے برابر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔

اس منزل میں چوروں کی کثرت ہے۔ اس کی اطلاع روانگی سے پہلے ہی کر دی گئی تھی اور شام کے قریب پھر عبد العزیز ترجمان اور ہمارے بدوؤں نے آکر کہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا۔

شام ہوتے ہی جمالوں نے حرامی - حرامی (چور - چور) پکار کر غل مچانا شروع کیا - ہر ایک اپنے اپنے اونٹ کے ساتھ چلتا تھا اور ذرا ذرا دیر کے بعد پکارتا جاتا تھا - ہم لوگوں سے بھی تاکید کی گئی تھی کہ سوئیں نہیں اور اپنے سامان سے خبردار رہیں کہ مبادا پیچھے سے کوئی چور کچھ اُڑا نہ لیجائے - چونکہ سب ساتھیوں کی رقوم میرے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی تھیں اس لئے مجھے احتیاط و ہوشیاری کی تاکید مزید کی گئی تھی - یہ بیگ ڈبل ٹین کا تھا اور اگرچہ بمبئی سے اُسکو ساتھ لے لینے کی وجہ سے مجھے بہت کچھ آرام ملا تھا مگر وزنی ہونے کی وجہ سے شغدف میں اس کا رکھنا سخت دشوار تھا، شروع میں تو ایک دو دن تک بہت ہی زحمت رہی - کبھی اونٹ کی پیٹھ پر ڈوری سے کسا جاتا تھا، کبھی شغدف کے کسی کونے میں باندھا جاتا تھا - کئی بار اُس سے چوٹ بھی کھائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ چمڑے کا بیگ کیوں نہ لیا - اس منزل میں گرمی کی تکلیف نہیں ہوئی - اگرچہ رات کو عموماً یہ تکلیف جاتی رہتی تھی - لیکن یہاں ساحلی ہوا کی وجہ سے زیادہ ٹھنڈک ملی اور باوجود جمالوں کے شور اور چوری کے خطرے کے میں گہری نیند سویا - اگرچہ روانگی سویرے ہوئی تھی مگر منزل اتنی طولانی تھی کہ صبح کو جب آفتاب کافی بلند ہوگیا تب کہیں جا کر رابق پہونچے -

یکم جون روز جمعہ

رابغ یا رابق قربِ ساحل کی وجہ سے تجارتی منڈی بنگیا ہے - جدہ سے کشتیوں پر سامانِ تجارت یہاں آتا ہے اور وسطِ حجاز کے بدو قبائل میں تقسیم ہوتا ہے - یہاں کا بازار وسیع اور پٹا ہوا ہے جس میں عام ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے - مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد اب تک جہاں جہاں قافلہ ٹھہرا تھا وہاں کسی مستقل آبادی کے نشان نہ تھے - مگر یہاں بازار کے علاوہ مختصر سی مستقل آبادی بھی ہے جسکے خام مکانات دونوں جانب اور نیز کچھ فاصلہ سے ایک ٹیلہ پر بنے ہوئے ہیں - ایک جانب ایک سنگی مگر شکستہ قلعہ ترکی عہد حکومت کی یادگار ہے - بازار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک مسجد ملتی ہے جس میں اگرچہ بلحاظ تعمیر مسجد کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی لیکن اوقات نماز میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور نمازیوں کا اچھا خاصہ مجمع ہو جاتا ہے - قافلے کے لوگوں کو عام طور پر مسجد کا پتہ نہیں چلا لیکن جن لوگوں کو سراغ مل گیا وہ مسجد تک پہونچ گئے - بازار کے ایک سرے پر قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے اجناس کے علاوہ پکا ہوا کھانا اور روٹی وغیرہ بھی یہاں مل سکتی ہے - قربِ ساحل کی بدولت تازہ مچھلی بھی ملجاتی ہے اور شلجم، مولی، لیموں وغیرہ بھی نظر آئے - دو دکانوں پر

زیادہ تر تو اجناس ہی فروخت ہوتی ہیں اس لیے کہ بدوی زندگی کی سادگی نے ضروریات زندگی کی تعداد کو اس قدر محدود بنا دیا ہے کہ دوسری عام اشیا کی مانگ بہت کم ہے، تاہم کپڑے، بساط خانہ اور دواؤں کی دوکانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کو بدہضمی ہو گئی تھی لیکن راستے میں کسی مقام پر کوئی دوا نہ مل سکی۔ یہاں اسپغول خریدا گیا تو ایک روپے میں غالباً دو تین تولہ سے زائد نہیں ملا۔ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا کہ مل تو گیا۔

بدوؤں کا لباس بہت سادہ ہے۔ ایک لمبا کرتہ ستر پوشی کے لیے۔ ایک رومال کمر میں اور ایک سر پر۔ اور بعضوں کے پاس ایک اُون کی عبا بھی ہوتی ہے جو کبھی کُرتے کے اوپر زیب بدن کی جاتی ہے اور کبھی اونٹ کی پیٹھ پر بستر کا کام دیتی ہے۔ پائجامہ پہننا یا تہہ باندھنا بدوی معاشرت میں ایک شدید بدعت ہے۔ اگرچہ شہروں میں آمد و رفت کی وجہ سے بعض ایسے بدو جن کو مسلسل اونٹ یا گھوڑے پر سوار رہنا پڑتا ہے کُرتے کے نیچے جانگھیا پہن لیتے ہیں۔ اسی سبب سے کپڑے کی دوکانیں زیادہ بارونق نہیں ہیں۔

بساط خانہ کا بھی یہی حال ہے کہ صابون، تمباکو، دیا سلائی وغیرہ چند اشیاء کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ہر بدو مسلح رہتا ہے۔ کم سے کم ایک تیز چھُری ہر شخص کی کمر میں کھُنسی رہتی ہے، ورنہ تلوار یا بندوق یا دونوں ہوتی ہیں۔ بازار میں ایک شخص دو بندوقیں اور ایک سات نل کا طپنچہ فروخت کر رہا تھا۔ قیمت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت کم قیمت پر بک رہی ہیں۔ ایک بندوق کی قیمت تقریباً بیس روپے دینا پڑتے۔

بازار کے عین وسط میں ایک بہت بڑا پختہ کنواں بنا ہوا ہے جس کا پانی اگرچہ دیکھنے میں بہت صاف و شفاف ہے مگر ذائقے میں بالکل تلخ۔ اس لیے قافلے والوں کے پینے کے لیے اُن چھوٹے چھوٹے کچے کنوؤں کا پانی آتا ہے جو بازار کے ایک سمت قبرستان سے قریب بنے ہوئے ہیں۔ ان کا پانی عموماً گدلا تھا اور کسی کسی کا میٹھا نکلتا ورنہ کچھ نہ کچھ کھاری پن موجود ہوتا جس کی وجہ سے کھانا پکانے میں سخت دقت واقع ہوئی۔ چونکہ رابغ میں ایک شبانہ روز کا قیام تھا اس لئے خیال تھا کہ کھانا اہتمام سے تیار ہوگا۔ مگر پانی کی خرابی نے سارا انتظام برباد کر دیا۔ دن بھر نہایت تیز ہوا چلتی رہی۔ اگرچہ ہوا میں تپش کم تھی مگر گرد اس قدر اُڑتی تھی کہ الامان۔ شام کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں

سے ڈاک جا سکتی ہے، اس لیے رات کو دیر تک خطوط لکھتا رہا۔ بمبئی سے جو بنڈل کے بنڈل موم بتیوں کے ساتھ لایا تھا انکی اب تک تو کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ رات کو خط لکھنے کے واسطے روشنی کی ضرورت ہوئی تو موم بتیاں کام آئیں۔ اب چونکہ مٹی کا تیل ہر پڑاؤ پر ملتا ہے اس وجہ سے حجاج کو چاہیے کہ موم بتیوں کے بجائے ایک لالٹین ساتھ رکھیں۔ اور اس خیال سے کہ شتر کی حرکت یا ٹکرسے ٹوٹ نہ جائے چمنی کے گرد تاروں کا جال بندھوالیں۔ جن جاویوں یا ہندوستانیوں کے پاس لالٹین تھی اُن کو بہت آرام ملا۔

ڈاک کا اہتمام یہاں یہ ہے کہ ایک دوکان پر تمام خطوط جمع کردیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو وہیں کاغذ، لفافہ مول لیجئے۔ محصول ڈاک نقد جمع کرنا ہوتا ہے۔ اُس دوکان کا مالک گویا ڈاک کے مہتمم صاحب کا ایجنٹ ہے جن کا مستقر مکہ میں بتایا گیا لیکن تلاش کے باوجود انکی صورت نہ دکھائی دی۔ ظاہر ہے کہ ڈاک کا یہ انتظام کچھ قابل اطمینان نہیں مگر اس خیال سے دل کو کسی قدر تسلی ہوگئی کہ خط بھیجنے کی ذمہ داری سے سبکدوشی تو حاصل ہوئی۔ مکتوب الیہ تک نہ پہونچے تو اسکے ذمہ دار کارکنان قضا و قدر ہیں۔

رات کو کافی ٹھنڈک رہی اس لیے خوب نیند آئی۔ مگر وسط شب میں دفعۃً چور چور کا غل ہوا۔ ہمارے ساتھ کے قافلے کی ایک عورت کا زیور، رابغ کی منزل میں، راستے سے اُڑ گیا تھا جسکی وجہ سے مترجم، جمالوں، اور اُس قافلے کے حجاج کے درمیان مسلسل تکرار، وبحث ہوتی رہی۔ اس رات میں ہمارے ایک ساتھی کی بھی ایک گٹھری غائب ہوگئی۔ راستے میں نگہبانی کے ذمہ دار تو جمال ہیں لیکن پڑاؤ پر نگہبانی کا فریضہ اُس جماعت پر عائد ہوتا ہے جو چوکیداری وصول کرتی ہے۔ اور ہمارے مترجم صاحب نے اطمینان دلایا کہ یہ لوگ مال تلاش کرکے یا تو واپسی پر آپ کو مال دیں گے ورنہ اُسکی قیمت ادا کریں گے۔ سب جانتے تھے کہ یہ باتیں محض دفع الوقتی کی ہیں۔ مگر کرتے کیا۔ دنیا بامید قائم۔ غریب تھوجس کا یہ سامان تھا صبر کرکے بیٹھ رہا۔

میرا نیا جوتہ چند ہی روز میں جواب دے گیا۔ پُرانا پہلی ہی منزل میں رخصت ہوگیا تھا۔ اس لیے اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک موچی بھی ہے۔ مگر باوجود کوشش بلیغ اُس سے ملاقات نہ ہوئی۔ بالآخر بدوؤں کے پہننے کا ایک چپل خرید اگیا۔ بدو اس چپل کو پہن کر کس آسانی سے رتیلی اور پتھریلی زمین پر چلتا ہے۔ مجھے تو اسکو پہنکر چار قدم بھی چلنا مشکل ہوتا تھا۔ تاہم ضرورت نے اسی کو

قناعت کرنے کے لیے مجبور بنا دیا۔

۲- جون - روز شنبہ | رابغ میں عادت کے خلاف دونوں وقت گوشت کھایا تھا اس لیے صبح اٹھتے ہی سوءہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ غذا ہضم کرنے کے خیال سے دیر تک ٹہلتا رہا۔ چاشت کے وقت کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر روانہ ہوے۔ رابغ سے نکلے تو دُور تک نخلستان میں اونٹ چلتے رہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے ساحل سے بہت دُور ہو گئے تو دھوپ، اور لُوہ کے تھپیڑوں سے سامنا رہا۔ رات کو عشا کے وقت مستورہ پہونچے۔ شغدف سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ساتھیوں کے اونٹ نہیں ہیں۔ خیال ہوا کہ پیچھے آ رہے ہونگے۔ جمال تو شغدف پھینک کر الگ ہو گیا۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ساتھیوں کے اونٹ نہ آئے اس لیے سخت پریشان ہوا۔ ادھر اُدھر ڈھونڈھنا چاہا مگر رات کا وقت، اور چاروں طرف قطار در قطار شغدف رکھے ہوے۔ پتہ چلانا مشکل ہوا۔ بدشواری تمام تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک پھرنے کے بعد میر صاحب وغیرہ ملے۔ مترجم اور مقوم پر بہت کچھ اظہار غیظ و غضب کر کے میں نے چاہا کہ اپنے شغدف کو یہیں اُٹھوا لاؤں لیکن اب اپنا شغدف تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ مترجم صاحب جو ہمراہ تھے آخر زچ آ کر واپس چلے گئے۔ میں نے تنہا گھوم پھر کر اپنا شغدف تلاش کیا اور اپنے ساتھی رحمت شاہ کو لیکر پھر اُسی جگہ آیا جہاں میر صاحب تھے۔ شغدف مع کل سامان کے جمال کے پاس چھوڑا صرف بیگ ساتھ لے لیا کہ اُس میں اپنا اور سب ساتھیوں کا زر نقد تھا۔

۳- جون روز یکشنبہ | صبح سویرے اپنا شغدف بھی اُٹھوا لیا۔ مگر جمال کی اس حرکت کی وجہ سے رات کو جس قدر زحمت ہوئی تھی اُس کا غصہ ہنوز باقی تھا۔ اور اس غرض سے کہ جمال آئندہ ایسی کارروائی نہ کرے میں نے اُسکی مقررہ بخشش کے دینے میں تامل کیا۔ بالآخر مترجم نے درمیان میں پڑ کر صفائی کرائی اور جمال سے پختہ وعدہ لیا گیا کہ اب کبھی میرا اونٹ ساتھیوں کے اونٹوں سے الگ نہ کریگا۔ مستورہ میں ایک بڑی پختہ باؤلی بنی ہوئی ہے مگر اس کا پانی گندلا اور کھاری ہے۔ کہیں فاصلے سے میٹھا پانی بھی آتا ہے مگر ہم لوگوں کو باوجود کوشش دستیاب نہ ہوا مجبوراً اسی پانی پر قناعت کی گئی لیکن دال کچی رہ گئی جسکی وجہ سے غریب رحمت شاہ کو پیچش شروع ہو گئی۔

مستورہ میں بازار بھی بہت مختصر تھا۔ اگرچہ مدینۂ منورہ کے کھجور تازہ اور عمدہ ملے۔ میں رات کو ساتھیوں کی تلاش میں بہت خستہ ہو گیا تھا اس لیے خلاف عادت بازار میں زیادہ نہ ٹھہرا اور تھوڑی

کھجوریں لیکر واپس آیا - تمازت آفتاب بھی مستورہ میں زیادہ محسوس ہوئی اور دوپہر نہ ہونے پائی تھی کہ نہایت تیز لُوہ چلنے لگی - جسکی وجہ سے میر صاحب کی طبیعت بدمزہ ہوگئی - خدا خدا کرکے ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے -

۴ - جون روز دوشنبہ مستورہ سے چلے تو گرمی اور ہوا کی تیزی سے پریشان تھے - راستہ میں اگرچہ تپش کا وہی عالم رہا مگر ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اس لیے لوہ سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی - پانی کی خرابی کا یہ علاج کیا کہ ہر دفعہ پیاس کے وقت شربت گھولا جاتا - نماز فجر کے وقت بیر شیخ پہونچے - یہاں کا بازار بھی مستورہ کی طرح مختصر ہے - اور کنواں بھی صرف ایک ہے مگر اُس کا پانی شیریں اور صاف ہے اگرچہ ۸ - نی ٹین کے حساب سے دام کسی قدر گراں دینا پڑے - بیر کنوئیں کو کہتے ہیں - دن کو یہاں بھی تپش اور لُوہ سے سامنا رہا - مگر خوش ذائقہ پانی نے گرمی کی تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہونے دی عصر پڑھکر روانہ ہوئے - راستے میں خبر ملی کہ جو قافلہ ہم سے آگے روانہ ہوا تھا اُسے اگلے پڑاؤ پر بدوؤں نے روک لیا ہے - نصف شب کو ہمارا قافلہ بھی بیر حسانی پہونچ گیا -

۵ - جون سہ شنبہ صبح کو بعد نماز فجر حسب معمول بازار کی طرف گیا تو دیکھا کہ واقعی قافلے کا وہ حصہ جو ہم سے آگے تھا یہاں پڑاؤ کیے ہوئے ہے - اب گویا پورا قافلہ ایک جگہ ہوگیا - یہاں کا بازار بہت فراخ و وسیع ہے - کچھ حصہ پٹا ہوا ہے اور کچھ ابتدائی پڑاؤ ونکے مانند جھونپڑوں کی شکل میں ہے - ترکاری کے سوا اور سب چیزیں ضرورت کی ملتی ہیں - کنوئیں متعدد ہیں اس لیے پانی بہت ارزاں ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے - وادی فاطمہ کے بعد سے جو لوگ نہیں ملے تھے اُن میں سے بعضوں سے اب ملاقات ہوئی - جن بدوؤں نے قافلے کو روکا تھا اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جمالوں کے سردار گئے ہوئے تھے - دوپہر کو مترجم نے اطلاع دی کہ دو مجیدی فی شندف دینا طے پایا ہے - کل قافلہ روانہ ہوگا - ہمارے قافلے کے ایک افغانی کا یہاں انتقال ہوگیا - انا للہ وانا الیہ راجعون - یوں تو ہر منزل پر کچھ نہ کچھ لوگ مرتے تھے مگر ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا کیا انتظام ہوتا ہے - افغانی ساتھی کے متعلق سارے انتظامات آنکھوں کے سامنے ہوئے تو معلوم ہوا کہ قبر کھودنے کے لیے وہی تکروری جو مشکیں بھر بھر کر پانی بیچتے ہیں بلالئے جاتے ہیں اور چند روپیوں کے خرچ سے سب کام نکل جاتا ہے - مکہ معظمہ میں سنا تھا کہ امیر کابل کے پیر صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں - مجھے اُنکی زیارت کا شوق تھا مگر وہاں کہیں

پتہ نہ چلا - اور انتظامات سفر سے فرصت ہی کب ملی - وادی فاطمہ پر اُن کا خیمہ دکھائی دیا تھا مگر قبل اسکے کہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوں وہ روانہ ہو گئے - یہاں اُن کا خیمہ نظر پڑا تو مغرب کے قریب میں بھی حاضر خدمت ہوا - آپ کا اسم گرامی حضرت شمس المشائخ بتایا گیا - جوان آدمی ہیں اور صورت سے عابد و مرتاض معلوم ہوتے ہیں - نقشبندی ہیں - کچھ دیر اُن سے گفتگو رہی - معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے بدوؤں سے طے کر لیا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس روز قیام کریں گے . . . .

. . . . اُنکے ہمراہ سترہ اٹھارہ اونٹ تھے اور ولایتیوں کی ایک جماعت ہر وقت اُنکو گھیرے رہتی تھی - ایک سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور خیمے میں دریوں اور قالین کا فرش تھا - جسکو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ حالتِ سفر میں ہیں - مغرب کے وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھی - امامت ایک دوسرے صاحب نے کی جو مقرب خاص معلوم ہوتے تھے - جب ہمارے افغانی ساتھی کے دفن کا وقت آیا تو اُنکو اطلاع دی گئی - اُنکی جماعت کے اکثر لوگ آکر نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور اپنے افغانی بھائی کو آخیر منزل تک پہونچا آئے -

٦ - جون روز چہارشنبہ | ہمارے قافلہ کا کچھ حصہ بیر شیخ میں یہ سنکر ٹھہر گیا تھا کہ بیر حسانی میں قافلہ رکا گیا ہے - آج وہ بھی اُس قافلہ سے آملا - میر صاحب کا جو سامان اُنکے جمال کے کوتل اونٹ پر بندھا رہتا تھا اُس میں ایک ٹین گھی کا بھی تھا - یہ کسی صورت سے ٹوٹ گیا اور سارا گھی بہ گیا - بیر حسانی میں جب اس سے آگاہی ہوئی تو میر صاحب بہت پریشان اور اپنے جمال سے ناخوش ہوئے - مگر کرتے کیا - بازار میں بہت تلاش کیا کہیں گھی نہ ملا - ۲ مجیدی فی شغدف کے حساب سے بدوؤں کی نذر کرکے بیر حسانی سے بعد ظہر روانہ ہوئے - قافلہ میں بعض لوگ اس زائد خرچ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے شغدف یہیں چھوڑ دیے اور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوئے - خالی اونٹوں سے جن پر شغدف یا شبری نہ ہو بدو کچھ نہیں لیتے - نصف شب کے بعد ایک تنگ وادی میں جسکے دونوں جانب بلند پہاڑیاں ہیں قافلہ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آج بھی میرا اونٹ ساتھیوں سے الگ ہو گیا ہے - جمال پر غصہ تو بہت آیا مگر میدان کی تنگی اور راستے کی ناہمواری کی وجہ سے ستورہ کی طرح یہاں اس کا موقع نہ تھا کہ ساتھیوں کو تلاش کرتا اس لیے مجبور ہو کر رات وہیں بسر کی - اس مقام کا نام شفاعیہ یا شفیعہ بتایا گیا -

٧ - جون روز پنجشنبہ | صبح کو مترجم نے کہا کہ میر صاحب کے جمالوں کا مکان یہاں سے قریباً ایک

دوسری سمت میں ہے اور وہیں وہ چلے گئے ہوں گے۔ اس لیے تلاش بے سود سمجھی گئی۔ یہاں کوئی بازار بھی نہ نظر آیا اس وجہ سے کھچڑی پر قناعت کی۔ مگر کھانا کھا کر جب میں نکلا تو قریب ہی میر صاحب کے شندف مل گئے۔ راستہ ایسا تنگ تھا کہ شندف وہاں نہ لایا جا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور جمال کو بخشش دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ عصر کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو ایک بلند پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جب پہاڑی طے کر کے سطح میدان میں تھوڑی دیر چلے ہونگے تو یہ اطلاع ملی کہ آگے بدو راستہ روکے پڑے ہیں۔ ناچار کچھ دیر رُکے رہنے کے بعد قافلہ پھر اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اب سب ساتھی پھر یکجا ہو گئے۔ اور رات وہیں بسر ہوئی۔ مترجم نے بہت کچھ گفت و شنید کے بعد کچھ روپے مجھ سے قرض لیکر بدو کو دیدیے۔

۸۔ جون روز جمعہ | آج معلوم ہوا کہ عوفیوں کے قبیلہ نے ساڑھے پانچ مجیدی فی شندف طلب کیے ہیں۔ دن میں اور قافلہ والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصاً حیدر آباد کے قافلہ میں ہمارے لکھنؤ کے ایک کرم فرما تھے اُن سے ملا۔ حیدر آباد کے قافلہ سالار ایک تونسی عرب تھے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ چائے پلائی۔ اور بہ اصرار کہا کہ جس قسم کی ضرورت ہو بے تکلف کہیے۔ رقم مطلوبہ ادا کر کے بعد نماز ظہر روانہ ہوے۔ پہاڑی طے کر کے جب سطح میدان میں آ گئے تو میرے جمال نے پھر اونٹ کو ساتھیوں کے اونٹ سے جدا کر کے اُن جاویوں کے اونٹوں سے جا ملایا جو اُسکے دوسرے اونٹوں پر سوار تھے۔ مجھے یہ امر بہت ناگوار گذرا کہ مستورہ میں اور پھر شفعیہ میں پختہ عہد و پیمان ہو جانے کے باوجود جمال نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے مجھ کو فوراً خبر ہو گئی۔ اب میں نے اپنے جمال کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے ساتھی رحمت شاہ کو چونکہ برابر پیچش ہو رہی تھی اس لیے اُنھیں تو میں نے اُترنے کا مشورہ نہیں دیا مگر میں خود اونٹ سے اُتر پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کے اونٹوں کے پاس پہونچ گیا۔ مترجم اور جمال دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ مجھ کو پیدل چلنا گوارا ہے مگر اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بالآخر جمال کو اپنی ضد چھوڑ کر اونٹ وہیں لانا پڑا اور میں پھر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر اونٹ کو جدا کر دیا۔ میں پہلی دفعہ پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد عصر کی نماز کے لیے اونٹ سے اُترا اور نماز پڑھکر جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا اونٹ ذرا رُکا جس سے آگے والے اونٹ کو بھی جس پر جاوی سوار تھے رُکنا پڑا۔ وہ اونٹ بدمزاج تھا، اس لیے بگڑ گیا۔ اونٹ ایسا بگڑا

کہ باوجود جمال اور اُسکے بھائیوں کی کوشش کے قابو میں نہ آیا اور قافلہ سے الگ ہو کر اُس نے شغدف کو گرا دیا جس سے اُن جاویوں کے سخت چوٹ آئی جو اُس پر سوار تھے۔ اس پر جمال اور اُسکے بھائی مجھ سے بہت بگڑے اور غصہ میں بہت کچھ سخت و سُست کہا۔ اور ایک نے تو تلوار نیام سے ذرا باہر کر کے مجھے دھمکایا۔ جاویوں کے جو مترجم صاحب تھے وہ بھی طیش میں آ کر میری طرف دوڑ کے آئے اور لگے سخت کلامی کرنے۔ تو میں نے اُن کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈانٹا۔ اور کہا کہ آپ اپنی راہ لیں مجھ سے کچھ آپ کا تعلق نہیں ہے۔ آخر اُنکے ہوش درست ہو گئے تو وہ جمالوں پر خفا ہوئے اور انھیں مجبور کیا کہ میرے اونٹ کو کھول کر میرے ساتھیوں کے اونٹوں کے ساتھ ملا دیں۔

مغرب کے بعد قافلہ پھر رکا۔ میر صاحب کا اونٹ ذرا آگے تھا اُنھوں نے مجھے بُلوایا اور مقوم کا یہ پیام سنایا کہ دو مجیدی فی شغدف یہاں راستے میں بدوؤں کا امیر قبیلہ طلب کر رہا ہے۔ میں اسکو مقومین کی شرارت سمجھتا تھا، کیونکہ مانگنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اسلیے میں نے رقم دینے میں عذر کیا۔ جس پر مقوم صاحب آئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو رقم نہ دے گا اُس کا شغدف یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ میرا شغدف یہیں چھوڑ دیجیے۔ مگر میرے پاس مجیدیاں نہیں ہیں اور یہ واقعہ تھا کہ شقفیہ میں مجیدیاں دیدینے کے بعد اب میرے پاس کوئی مجیدی باقی نہیں رہی تھی۔ بہر حال میر صاحب نے ہم سبھوں کی طرف سے مجیدیاں دیدیں۔ عشاء کے اول وقت کچھ فاصلہ پر روشنی دکھائی دی تو ہم سمجھے کہ منزل آ گئی۔ مگر کہیں دو تین گھنٹے کے بعد ترام یا تراہ پہونچے۔ معلوم ہوا کہ ہم بلندی پر تھے اور تراہ نشیب میں تھا اس لیے روشنی دور سے دکھائی دینے لگی تھی۔

۹۔ جون روز شنبہ | صبح کو حسب معمول بازار کی طرف رُخ کیا۔ یہاں کوئی باقاعدہ بازار اگرچہ نہیں ہے تاہم ایک جانب بلندی پر بہت سی دوکانیں نظر پڑیں۔ کنواں یہاں ایک ہی ہے اس لیے پانی گراں ملا۔ رحمت شاہ کو پیچش کی شکایت تو کئی روز سے تھی لیکن یہاں پہونچکر تکلیف بڑھ گئی۔

دن بھر خوب گرمی رہی اور لو بھی چلی۔ کچھ قافلہ بیر عباس میں ٹھہرا ہے جو تراہ سے شاید کوس بھر کے فاصلہ پر ہوگا۔ ہمارا جمال عبد الرحمن کل سے جو بگڑا ہے تو اُس نے نہ شام کو معمول کے مطابق کھانا لیا اور نہ آج دوپہر کو آیا۔ کھانا نکال کر اُسکے لیے رکھ دیا گیا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بھیجا مگر جب اُس سے کہا گیا کہ عبد الرحمن کو بھیجو یا اپنے برتن لاؤ تو وہ بھی جا کر بیٹھ رہا۔ مجھے تنباکو پینے اور کھانے کی عادت دیرینہ ہے۔ حقہ یا چرٹ کا استعمال کیے بغیر قبض ہو جاتا ہے۔ اس واسطے برسوں کا معمول ہے

کہ صبح کو لازماً تمبا کو پیتا ہوں - البتہ جیل میں یہ تجربہ ہوا کہ دماغی محنت نہ کرنا ہو یا کم پڑے اور مشی یا ورزش کرنے کا موقع ملے تو پھر تمباکو کی حاجت نہیں - چنانچہ فتح گڈھ جیل میں باوجود سرکاری اجازت اور سامان کی موجودگی کے میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک حقہ نہیں پیا - بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے کئی بکس چرٹ کے لے لیے تھے - جو جہاز پر اور مکہ معظمہ میں برابر استعمال کرتا رہا - جب مدینہ منورہ کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس سفر میں چرٹ یا سگریٹ کا استعمال نہ کروں گا - مگر عبد کو اس خیال سے کہ بدو سگریٹ کے راوی اور شائق ہیں میں نے اپنے بدو کے لیے ایک پاؤنڈ تمباکو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ لیکر رکھ لیا - راستہ میں برابر عبدالرحمن اور اُسکے بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا دیتا رہا - یہاں عبدالرحمن تو نہیں مگر اُسکا بھائی عبدالبصیر تمباکو مانگنے آیا تو میں نے کہا کہ کل تو تم لوگ مجھے گالیاں دے رہے تھے آج تمباکو مانگنے آئے ہو؟ اس پر وہ مایوس ہو کر چلا گیا - شام کو کچھ قافلہ اور آکر اُترا اور یہ خبر معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کو بڑی حسانی سے اس وقت تک کل ۸ مجیدیاں فی شقدف دینا پڑیں - جن میں سے تین ابھی مقوموں کے پاس جمع ہیں جو یہاں دی جائیں گی - حالانکہ ہم ۴½ مجیدیاں فی شقدف دے چکے تھے - یہ بھی سننے میں آیا کہ دو جاویوں کو راہ میں مجیدیاں نہ دینے کی بنا پر بندوق سے مار دیا -

۱۰ - جون روز یکشنبہ | آج صبح کو ضیاءالاسلام صاحب کو تلاش کیا - اُنھوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس دواؤں کا کافی ذخیرہ ہے اور کچھ طبابت میں بھی اُنکو دخل ہے - جب وہ نہ ملے تو حیدرآبادی قافلہ میں جا کر حکیم غلام احمد مدنی کو جو اُس قافلہ کے طبیب تھے لایا اور رحمت شاہ کو دکھایا - ضیاءالاسلام صاحب کی تلاش میں مختلف پڑاوں پر جانا پڑا - کل جو نیا قافلہ آیا تھا اُس میں بعض میرے جہاز کے بنگالی ہمراہی بھی تھے جن سے اب ملاقات ہوئی - وہ بیحد پریشان و مضطرب نظر آئے بہت سمجھایا بجھایا تب اُنکی تسلی ہوئی - حکیم صاحب نے صبح کو ایک دوا دی تھی مگر کچھ نفع نہ ہوا - شام کو دوسری دوا دی - مگر رات بھر غریب کو دست آتے رہے اور سخت اُلجھن رہی -

۱۱ - جون روز دوشنبہ | آج حکیم صاحب نے رحمت شاہ کو پھر دیکھا - اب اُنکو بخار تھا - مگر حکیم صاحب نے غسل تجویز کیا - اور دوا بدل دی - غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی -

بدو کا مزاج خدا خدا کر کے اب درست ہوا - تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے کھانے کی قیمت دی جائے - مگر یہ خلافِ انصاف تھا اس لیے اُس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا - اور دونوں

وقت کا کھانا لیکر راضی ہوگیا۔ جسکے بعد پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہوگئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قبیلۂ ظواہر کے لوگ ایک مجیدی فی شغدف پر راضی ہوگئے ہیں مگر احمدی قبیلہ سے ابھی تک کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس لیے ابھی قیام رہے گا۔ وادی فاطمہ اور بیر حسانی پر ایک ایک روز زیادہ ٹھہرنا ہی کچھ کم ناگوار نہ گذرا تھا کہ نہ صرف منزل مقصود پر پہونچنے میں دیر ہو رہی تھی بلکہ میری تمنا یہ تھی کہ آستانۂ رسالت پناہیؐ پر ایک ماہ تک حاضر رہوں۔ اور جتنی دیر راہ میں ہوتی تھی اُسی قدر میری حاضری کے دنوں میں کمی ہونے کا احتمال تھا۔ اس وجہ سے مجھ پر یہ تاخیر بہت شاق تھی۔ مگر بے بس تھا قافلہ میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے بدوؤں میں عجیب شور وغوغا رہا۔ کنوئیں پر جو تکروری (حبشی) پانی بھرتے تھے اُن سے اور ایک جمال سے کسی بات پر تکرار بڑھی۔ زبانی تو تو میں میں کے بعد مارپیٹ کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ ایک بدو کی تلوار نے اُس تکروری کو واصل بحق کردیا بہت سے بااثر بدوؤں اور مقوموں کے درمیان میں پڑنے سے اُسوقت تو قضیہ یہیں ختم ہوگیا مگر رفتہ رفتہ یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ تکروریوں کی جماعت کثیر انتقام لینے کے منصوبے کر رہی ہے۔ اب جہاں دیکھیے کچھ لوگ بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جمالوں کی ٹولیاں الگ اسی مبحث پر بحث وگفتگو میں مصروف ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جذباتِ انتقام زیادہ اُبھرنے نہ پائے اور پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

اتفاق سے آج میری طبیعت بھی کسی قدر بدمزہ رہی۔ کھچڑی ذرا کچی رہ گئی تھی۔ شام کو حیدرآبادی قافلہ میں اپنے لکھنؤ کے کرم فرما فقیر محمد خاں صاحب کے پاس گیا تو اُنکے ایک دوست نے فروٹ سالٹ اور ست لیموں کا شربت پلا دیا۔ جس سے طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

۱۲۔جون روز سہ شنبہ | آج اطلاع ملی کہ پندرہ مجیدی فی شغدف یہاں دینا ہونگے جن میں سے ایک مجیدی قبیلۂ ظواہر کی جس کی خبر کل ملی تھی، ۱۳ مجیدیاں احمدیوں کے لیے اور ایک امانتاً مقوم کے پاس رہے گی کہ راستے میں بیر درویش اور مدینۂ منورہ کے درمیان کے بدوؤں کو دی جائے۔ ہم لوگوں کے پاس نہ اب مجیدیاں باقی تھیں نہ روپے۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار عبداللطیف تونسی نے شغفیہ میں چونکہ یہ کہا تھا کہ روپیہ کی حاجت ہو تو ہم قرض دیدیں گے۔ اس لیے اُن سے صورت حال بیان کی مگر اُنکے پاس صرف دو اشرفیاں نکلیں، جن سے ہمارا کام نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً جمالوں کی جو اشرفیاں مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ہمارے معلم کے وکیل عبدالرحمٰن بشناس نے امانتاً میر صاحب کے پاس

رکھا دی تھیں اور جو انھیں مدینہ منورہ پہونچکر دینا تھیں انکو بھنا کر دس مجیدی فی گنی کے حساب سے لیں اور معتوم کے حوالہ کیں۔ ہمیں تبادلہ کے اس نرخ سے بہت نقصان پہونچا مگر کیا کرتے سوا اسکے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جتنے ملنے والے تھے وہ اس قافلہ میں نہ تھے۔ رحمت شاہ دوپہر تک اچھے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ الجھن بڑھنے لگی اور شام تک بدحواسی بہت بڑھ گئی حتی کہ نصف شب کے بعد اچھی خاصی سرسامی حالت ہوگئی اور بیہوشی کے عالم میں وہیں بستر پر دست آتے رہے۔ اُن کی اس حالت کی وجہ سے رات بھر ہم لوگ سخت پریشان رہے اور میں تو بالکل نہ سو سکا۔

۱۳۔ جون روز چہارشنبہ | آج سورت کے ایک حکیم صاحب کو بلا کر لایا۔ اور حضرت شمس المشائخ سے جا کر اس پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھوں نے ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ حکیم صاحب نے ازراہِ لطف دوا بھی عنایت کی۔ صبح کو غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت ذرا ٹھہری ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے دھوپ بڑھتی گئی طبیعت بگڑتی گئی۔ بعد ظہر جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو وہ شغدف سے باہر نکلے اور بیدم ہوکر زمین پر لیٹ گئے۔ منہ میں پانی ٹپکانے سے کچھ طبیعت اُبھری تو کئی آدمیوں نے مل کر انکو بمشکل شغدف پر سوار کیا۔ قافلہ روانہ ہوا اور عصر کے وقت بیر عباس پہونچ کر رک گیا۔ اب جو شغدف سے رحمت شاہ کو اُتارنا چاہا تو اُنکی حالت متغیر نظر آئی۔ لہذا اونٹ کو بٹھا کر شغدف وہیں کھولدیا گیا۔ اور میں ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں دوڑا گیا۔ وہ ملے تو بہت متاسف ہوئے۔ مگر اب اُنکے پاس دواؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اس لیے کہ سولہ سترہ دن میں بکثرت لوگ بیمار ہوئے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن تک پہونچا برابر دوا دیتے رہے تھے۔ بہر حال اُنھوں نے تھوڑا سا جواہر مہرہ دیا کہ اسکو پلانے سے طبیعت اُبھر آئے تو پھر علاج کی فکر کی جائے۔ لیکن بمشکل چند قطرے حلق سے اُترے ہونگے کہ روح نے قالب خاکی سے جدائی اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے لیے یہ تمام دن کلفت و پریشانی کے تھے۔ لیکن جب تک امیدِ حیات باقی تھی باوجود اپنے ضعف و بے سروسامانی کے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ مگر خدا کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ ہمارے مختصر قافلہ میں متعدد ایسی ضعیف، ناتوان اور مریض عورتیں تھیں جنکو حرکت کرنا مشکل تھی اور معمولی حاجات ضروریہ کے رفع کرنے کے لئے دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مگر موسم کی سختی اور سفر کے صعوبات سب کچھ جھیل گئیں۔ اور یہ نوجوان جو اپنی جسامت اور توانائی کے لحاظ سے ایسا نمایاں تھا کہ جہاز پر اور نیز اس سفر میں ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑتی تھی آٹھ روز کے اندر ختم ہوگیا۔ العظمۃ للہ۔ میری ہمت نے اگرچہ

فی الواقع اب جواب دیدیا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے رفیق کی لاش کو ساتھیوں کے سر چھوڑ کر میں مٹھیر رہتا۔ لہذا پھر ہمت باندھکر تجہیز و تکفین کے لیے اُٹھا۔ ضیاء الاسلام صاحب جس قافلہ میں تھے اُسی میں ہمارے اودھر کے کچھ لوگ تھے جن میں دو ایک حجام بھی تھے۔ اُنکو بلا کر غسل دلوایا۔ ایک تکروری نے قریب ہی قبر کھودی۔ ساتھیوں میں سے مبین خان نے کفن عنایت کیا۔ اور بالآخر عشا کے بعد غریب رحمت شاہ کو سپرد خاک کر دیا۔

۱۴۔ جون روز پنجشنبہ | علی الصباح پڑاؤ کا گشت لگایا اور تقریباً قافلہ کی ہر چھوٹی بڑی ٹکڑی پر نظر دوڑائی مگر نظام الدین لاہوری کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی۔ وسط میں ایک شکستہ قلعہ نظر آیا جسکے اطراف میں پڑاؤ کا بازار تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن چونکہ بندرگاہ ینبوع کی طرف سے جو قافلے مدینۂ منورہ جاتے ہیں اُن کا رہگذر یہی ہے اور اسوقت تو مکۂ معظمہ کا تقریباً پورا قافلہ یہیں یکجا تھا اس لیے بکثرت دوکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت اور دیگر ضروری اشیا کی فراوانی کے علاوہ جو تقریباً ہر پڑاؤ پر ملتی تھیں یہاں سبزی، پیاز اور مسالے بھی زیادہ مقدار میں نظر آئے۔

پڑاؤ چونکہ قلعہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت دیر میں گشت تمام ہوا۔ اپنے مقام پر واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ میر صاحب سے ایک گنی مستعار لیکر بازار سے مجیدیاں بھنائیں اور رحمت شاہ کے مصارف تجہیز و تکفین ادا کیے۔ پھر اُنکے آلودہ بستر اور کپڑوں کو ایک پشاوری مولوی صاحب کی معرفت جو ہمارے ہمراہ تھے مساکین حجاج میں تقسیم کیا۔ عصر کے بعد ایکبار پھر نظام الدین کی تلاش کے لیے نکلا مگر اب کی دفعہ بھی ناکامیاب رہا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ خبر دریافت ہوئی کہ تراع سے حیدر آبادی قافلہ اور حضرت شمس المشائخ معہ اپنے ہمراہیوں کے اور بعض اور ٹکڑیاں ادھر نہیں آئیں بلکہ اُنھوں نے احمدیوں کو مجیدیاں دینے سے انکار کر دیا اور اس بنا پر غائر کا راستہ اختیار کیا جس میں ایک بلند پہاڑی پر سے گذرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

۱۵۔ جون روز جمعہ | آج صبح سے چل چلاؤ کا سامان ہے۔ رحمت شاہ کے انتقال سے میرے شقدف میں جو جگہ خالی ہوگئی تھی میں چاہتا تھا کہ اُس پر پشاوری مولوی صاحب کو بٹھالوں جو بیرحسائی سے برابر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر منازل طے کر رہے تھے۔ مگر جمال باوجودیکہ عہ روپیہ کے بجائے اب اُس سے کہا گیا کہ صرف ۸ ر بخشش کے ملیں گے کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور میزان برابر کرنے کے لیے

خالی شغدف پر میرے زائد سامان کا بورہ لاد دیا۔ قافلہ ظہر کے قریب روانہ ہوا۔ مگر تھوڑی دور بھی نہ گیا تھا کہ ٹھہر گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بدووں کا کوئی اور شیخ نمودار ہو گیا ہے اور حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اس لیے قافلہ آج قیام کرے گا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتہ کے بعد روانگی ہوئی تھی اور اب جو دوبارہ اقامت کی اطلاع ملی تو بہت ناگوار ہوئی جس مقوم کو ہم سبھوں نے ملکر گھیر لیا اور خدا مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے اُس غریب کو بہت ڈانٹا۔

۱٦ - جون روز شنبہ صبح کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معمول کے مطابق تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ہم نے رضائیوں کا تنبو تان لیا تھا۔ چاشت کے اخیر وقت میں تپش سے بچنے کے لیے ہمارے جمالوں کے ساتھ کئی اور بدو اور جمال ہمارے تنبو کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدو احمدی فرقہ کے ہیں، تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُن سے شکایت کی کہ تمام اہل عرب اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں اور تم لوگ کیسے ہو کہ حجاج کو جو اسوقت نہ صرف اہل عرب کے بلکہ خدا اور اُسکے رسولؐ کے مہمان ہیں پریشان کرتے ہو۔ اُن میں سے ایک نے میری گفتگو سننے کے بعد فوراً ہی کہا "اور شریف کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے جو حجاج سے چودہ ۱۴ گنی فی اونٹ وصول کرتا ہے اور جمالوں کو صرف پانچ چھ گنیوں پر ٹرخا دیتا ہے اور باقی خود ہضم کر جاتا ہے۔" احمدی کی اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اور یقیناً امیر الحج کے اس مہمان نوازانہ طرز عمل کے بعد غریب بدووں سے یہ توقع رکھنا عبث ہی ہوگا کہ وہ اپنی روایات مہمان نوازی کو برقرار رکھنے کے لیے اس موقع پر سال بھر کا آزوقہ جمع کرنے کی فکر سے باز رہیں گے۔

بالآخر ظہر کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ مغرب کے وقت بیر الروحہ پر نماز کے لیے قافلہ رکا تو چار پانچ گھنٹے وہیں رُکا رہا۔ معلوم ہوا کہ کچھ بدوی قبائل نے یہاں بھی روک لیا ہے۔ قافلہ چل رہا ہو تو شب کے وقت شغدف میں پڑے رہنے کے سوا چارہ نہیں مگر قافلہ رکا ہوا تھا اسلیے شغدف میں پڑا رہنا کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ میں کچھ دُور تک ٹہلتا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مقام پر قہوہ اور چائے کی چند دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جمال کو ہمراہ لیکر میں بھی وہاں پہونچا اور اُسکے ساتھ بیٹھکر چائے پی۔ عشا پڑھکر پھر شغدف میں سوار ہو گیا۔ اور جب قافلہ چلا تو نیند آ گئی۔

۱۷ - جون روز یکشنبہ صبح کو قافلہ پھر ایک مقام پر رُکا جس کا نام غالباً بحار بتایا گیا۔ یہاں دو طرفہ

پہاڑیاں تھیں جن پہ سے برابر بندوقوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتی تھیں ۔ بعد کو پتہ چلا کہ سوا مجیدی کا مطالبہ ہے ۔ مجبوراً یہ رقم بھی ادا کی گئی ۔ تب قافلہ روانہ ہوا اور دوپہر کے قریب سویقہ میں مقیم ہوا ۔ یہاں کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ دال چاول کا گلنا بھی مشکل نظر آیا ۔ ہم لوگ بازار سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے قریب ٹھہرے تھے ۔ بقیہ قافلہ بازار کے قرب میں اور ہم سے کسی قدر فاصلہ پر تھا ۔ ایک کنواں اُس مقام پر بھی تھا ۔ یہاں لکڑیاں بہت بکنے آئیں جنکو بڑے شوق سے سب لوگوں نے خریدا ۔ رات بہت ٹھنڈی ہوئی ۔ سردی کی وجہ سے اس قدر چھینکے نکل آئے کہ نصف شب کے بعد سونا دشوار ہوگیا ۔ آخر پریشان ہوکر شغدفوں کے اندر پناہ لی ۔

۱۸ - جون روز دوشنبہ سویرے ہی سے روانگی کا اہتمام ہوا ۔ عجلت میں صرف چاول پکائے اور شکر یا پیاز کے ساتھ کھائے گئے ۔ ایک مجیدی آج اور طلب کی گئی تھی مگر مطوفین نے نہیں دلائی طلبہ قافلہ کو جگہ سے بیجا ناپسند کیا ۔ ظہر پڑھ کر سوار ہوئے ۔ عصر کے بعد ایک جگہ ایک پتھر نظر پڑا جس پر اُس خط میں کچھ عبارت منقوش تھی جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ جات سے مشابہ تھی ۔ بے اختیار جی چاہا کہ قافلہ روک کر یہاں قیام کیا جائے اور اس تحریر کو کسی سے پڑھوا کر دیکھا جائے شاید یہ کوئی اہم آثار ثابت ہو ۔ مگر قافلہ کا روکنا بس کی بات نہ تھی ۔ مغرب کے قریب جب ٹھنڈا ہوگیا تو جی چاہا کہ قمری مہینہ کی ابتدا ہے آج کچھ دیر شب ماہ میں اونٹ کی کھلی پیٹھ پر سوار ہونا چاہیے ۔ لہذا نماز مغرب سے فارغ ہوکر جمال کو اپنی جگہ شغدف میں بٹھایا اور اسکے کوتل اونٹ پر تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا ۔ مگر اتنی ہی دیر میں ہچکولوں نے خستہ کردیا ۔ اس منزل میں اگرچہ تمام تر پتھریلی اور ناہموار زمین سے سابقہ رہا مگر مغرب کے بعد ہی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور عشاء کے وقت سے تو ایک نہایت ہی دشوار گذار گھاٹی میں چل رہے تھے ۔ پہاڑی زیادہ بلند نہ تھی مگر راستہ نہایت ناہموار تھا جسکی وجہ سے اکثر اونٹ چلتے چلتے اگلے گھٹنوں کے بل گر پڑتے الحمد للہ کہ مجھے اس قسم کی کوئی اُفتاد نہیں پڑی لیکن جب تک پہاڑی کے اوپر نہیں ہو پہنچ گئے ، ایک منٹ کے لیے بھی چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا ۔ نصف شب کے بعد پہاڑی راستہ تمام ہوا اور مسطح میدان آگیا ۔ جہاں ہو پہنچکر دفعۃً خنکی بڑھ گئی ۔

چھٹی منزل

علی الصباح جو آنکھ کھلی تو ہوائے سحر چل رہی تھی۔ گویا بارگاہ رحمۃ للعالمین کی طرف سے زائرین مدینۂ منورہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے نسیم سحر مقرر ہوئی تھی۔ جیسے جیسے اُجالا ہوتا جاتا تھا، گنبد خضراء کے نظارہ کی امیدیں مبدل بہ اشتیاق ہوتی جاتی تھیں۔ آہ انتظار کی اُس گھڑی کا سماں دکھانا اور اس کا نقشہ کھینچنا امکان میں نہیں ہے جب ہر چند ساعت کے بعد زیارت روضۂ اطہر کی تمنائیں آنکھیں بار بار حد نظر کی طرف دوڑائی جاتیں اور پھر اس خیال سے دل بیتاب کو تسلی دی جاتی کہ ابھی فاصلہ بہت ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔ آفتاب ہر روز نکلتا تھا اور نہایت آب و تاب سے چمکتا تھا۔ مگر اُسکی نمود کا جیسا انتظار آج کیا گیا اور اُسکی روشنی کا جس طرح آج استقبال کیا گیا یہ بالکل نئی بات تھی۔ اب ہر اُس شے پر جو دور سے نظر کے مقابل آجاتی گمان ہونے لگتا کہ گوہر مراد یہی ہے اور جب وہ شے قریب آجاتی اور معلوم ہوتا کہ کوئی درخت ٹیکری یا پتھروں کا ڈھیر ہے تو مایوس نہ ہونے والی آنکھیں پھر کسی دوسری شے پر نگاہ اُمید جما دیتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گذر گیا۔ بالآخر دور سے مسجد شریف کے میناروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور میں شغدف سے کود کر درود شریف اور دیگر ادعیہ پڑھتا ہوا پا برہنہ شغدف کے قریب قریب مگر گنبد خضراء کی تمنائے زیارت میں سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہو گئی میں نے توقف کر کے ضروری دعائیں پڑھیں اور پھر روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ کے قریب جس قسم کی پہاڑیاں ہیں بعینہٖ ویسا ہی پُر پیچ و خم یہ بقیہ راستہ نظر آیا کہ ہر موڑ کے بعد خیال ہوتا تھا کہ اب مدینۃ الرسول کی زیارت نصیب ہوگی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم عرصہ تک چلنے کے بعد جب ایک مقام پر ریل کی پٹری عبور کی۔ تو معلوم ہوا کہ اب منزل مقصود بالکل قریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باغیچوں اور اُجڑی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور کہیں کہیں عبا پوش انسان بھی ملنے لگے۔ آگے بڑھے تو ان عبا پوش اصحاب کا ایک معقول مجمع نظر آیا۔ جنہوں نے نہایت خندہ پیشانی

اور خوش خلقی سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مزوروں کے کارکن ہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد اپنے مزور صاحب کو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اپنے تئیں اُن کا کارندہ بتایا۔ دوپہر کے قریب مدینہ منورہ کی فصیل سے ملحق ایک میدان میں جسکو مناخہ کہتے ہیں شغدف اُتارا گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ میر عبدالعزیز صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے اونٹ ہمراہ نہیں ہیں۔ پہلے تو کچھ دور تک میں نے اُنکو تلاش کیا مگر جب اُن کا پتہ نہ چلا تو میں نے اپنا شغدف مع سامان کے وہیں جمال کے پاس چھوڑا۔ اور اُن صاحب کے ہمراہ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا۔ جنھوں نے نہایت شفقت و کرم سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کا وعدہ فرمایا۔ مناخہ واپس آکر اپنا سامان اُٹھوا لایا۔ اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نماز ظہر کا وقت تھا اس لیے پہلے نماز ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضری سے مشرف ہوا۔ الحمد للّٰہ علیٰ احسانہ۔ اس وقت کی شادمانی و انبساط کا بیان ناممکن ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر بلغ باغ تھا اور رو یاں رویاں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس لطف عمیم پر شکر گزار کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو دربار رسالت میں جبہہ سائی کا افتخار بخشا گیا۔

حضورؐ کا روضۂ اطہر مسجد نبوی کے اندر شمالی و مشرقی کونہ پر واقع ہے۔ نماز کے بعد مزور صاحب کے عامل نے مجھے اور دیگر زائرین کو پہلے کچھ فاصلہ پر قبلہ رُخ کھڑا کیا اور ایک دعا پڑھی۔ سب لوگ اُس کی تکرار آہستہ یا بآواز کہتے رہے۔ بعد ازاں رُخ بدل کر روضۂ اطہر کی جانب متوجہ ہوئے اور بارگاہ والا میں سلام پڑھا۔ سلام پڑھ کر روضۂ اطہر کی جالی کے قریب حاضر ہوئے جس میں تین گول سوراخ اس اندازہ سے رکھے گئے ہیں کہ روضۂ اطہر کے غلاف پر جہاں سنہرے حروف میں حضور انورؐ کا اسم گرامی منقوش ہے ایک سوراخ اس مقام کے مقابل ہے اور بقیہ دو سوراخ ذرا ہٹ کر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی کے مقابل واقع ہیں۔ اکثر لوگ اِن سوراخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اسوقت ہجوم بہت تھا۔ کیونکہ قافلہ کی تمام ٹکڑیاں اپنے اپنے مزورین کے ہمراہ سلام خوانی و زیارت کے لیے جمع تھیں۔ آستانۂ عالی پر صرف چند ساعت کے لیے قیام ہو سکتا تھا۔ لہذا جلدی جلدی لوگوں نے مصافحہ کیا، درود و سلام پڑھا یا دعائیں مانگیں اور گھوم کر شمالی جانب گئے جہاں دیوار پر ایک روشندان ہے جس کی راہ سے بتایا گیا کہ جبرئیل امین علیہ السلام

حجرۂ عائشہؓ یا مسجد نبویؐ میں حاضر ہو کر وحی سناتے تھے۔ یہاں بھی ایک دعا پڑھوائی گئی۔ پھر پائین روضۂ مبارک کی طرف بڑھے اور ایک دوسری جالی کے قریب کھڑے ہو کر جسکے اندر جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۂ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار بتایا گیا، سلام پڑھا۔ حضرت فاطمہ زہراءؓ کی جائے دفن کے متعلق ارباب سیر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جنۃ البقیع میں قبۂ اہلبیت کے نیچے آپ دفن کی گئیں تھیں اور بعض کے نزدیک حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائین روضہ آپ دفن ہوئیں۔ اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ دونوں جگہ آپ کے نشانات مزار بنے ہوئے ہیں جہاں زائرین حاضر ہو کر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صحن مسجد میں حضرت فاطمہؓ کی کیاری بنی ہوئی ہے اور اُسی سے ملحق ایک کنواں ہے جسکے پانی کو آب کوثر کا لقب ملا ہے۔

مزور صاحب کے عامل سید زین العابدین نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ عشا کے سوا جملہ نماز وں کے بعد وہ یا اُنکا کوئی مددگار روضۂ اطہر کے قریب سلام پڑھوانے کے لیے موجود رہے گا۔ اس لیے سب لوگ نماز پڑھ کر یکجا ہو جاتے اور سلام پڑھتے۔ مجھے لکھنؤ سے روانگی کے وقت ہدایت ہوئی تھی کہ روضۂ اطہر کے قرب میں مودب رہوں اور باواز بلند صلوٰۃ وسلام نہ پڑھوں، مگر جو طریقہ یہاں رائج ہے وہ اسکے بالکل منافی تھا۔ بلکہ نماز کے بعد جب زائرین کی مختلف ٹکڑیاں جمع ہوتی تھیں تو اُن کے صلوٰۃ وسلام سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ بہر حال میں حتی المقدور اہتمام کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ البتہ ہجوم کی وجہ سے مجھے کسی قدر وحشت ہوتی تھی اور میں قافلہ کی واپسی کا بیصبری سے انتظار کر رہا تھا کہ سکون کے ساتھ روضہ اطہر پر حاضری سے سعادت اندوز ہو سکوں۔ عصر کے بعد پھر مناخہ گیا۔ میر عبد العزیز صاحب معہ دیگر ہمراہیوں کے اُسی وقت پہونچے اور اپنا سامان وغیرہ دیکھ بھال رہے تھے۔ میں سب کو ہمراہ لے آیا۔ اور نماز مغرب کے بعد مولوی سید احمد صاحب ایجنٹ علی جان کمپنی سے ملا اور حوالہ کا کاغذ دکھا کر روپیہ لیا۔

دوسرے روز جنۃ البقیع میں حاضر ہو کر سب ہمراہیوں کے ساتھ بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھا۔ تیسرے دن سب ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ سید زین العابدین کی معیت میں جبل احد پر جا کر سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھیں گے مگر میں نہ جا سکا۔ ساتھیوں کی واپسی سے قبل میں ڈاکخانہ گیا اور وہاں سے خطوط لایا۔ اور چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی روز ڈاک

جانے والی ہے اس لیے جلدی جلدی وطن کے خطوط لکھے اور عصر سے پہلے پوستہ (ڈاک خانہ) کے حوالہ کیے۔ منگل کو قافلہ پہونچا اور منیجر کو واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس قافلہ کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مدینہ منورہ میں اُس وقت تک حاضر رہوں گا کہ حج کے لیے وہاں سے آخری قافلہ روانہ ہو۔ اس لیے بے فکر تھا۔ مگر احباب اور ساتھیوں کو واپس جانا تھا اس لیے وہ لوگ جلد جلد زیارتوں سے فراغت کر کے تبرکات اور سفر کے لیے اشیاء خوردنی وغیرہ کی خریداری میں مصروف تھے۔ جمعہ کو بعد نماز مغرب جنۃ البقیع میں فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا۔ عم مکرم منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور کی قبر یہیں ہے۔ پہلی بار چونکہ نشان دریافت نہیں کیا تھا اس لیے باوجود تلاش نہ ملی۔ اب کی مولوی عبدالباقی صاحب سے پوچھ کر آیا تو مل گئی قبۂ اہلبیت کے بالکل پشت پر واقع ہے۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قبر کو دیکھتا رہا۔ قبر کی مرمت اور کتبہ میں سیاہی بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے چاہا کہ میں خود اس کا انتظام کر دوں پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیز از جان انور علی سلمہٗ بھی بعد ادائے حج یہاں پہونچیں گے، اس خدمت کے وہی زیادہ مستحق ہیں۔

قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ہمارے مقوم، ترجمان اور جمال سب کی خواہش پر میں نے ایک تحریر اپنے معلم کے نام اس مضمون کی لکھ دی کہ ان اصحاب کے طرز عمل سے شاکی ہونے کی وجہ نہیں بلکہ میں نے برضا و رغبت اپنا اونٹ چھوڑ دیا ہے اور شندف رکھ لیا ہے جو بعد واپسی مکہ معظمہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تمام ساتھی صبح کو مناخہ روانہ ہو گئے تھے میں بعد عصر وہاں اس غرض سے گیا کہ قافلہ روانہ ہو گیا ہوگا اپنا شندف مکان پر اُٹھوا لاؤں۔ مگر شندف نہ مل سکی اطلاع سید زین العابدین کو کر دی۔ اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ شندف مل جائے گا۔

جب تک قافلہ اور ہمراہی موجود رہے مسجد نبوی میں ہجوم کی وجہ سے اطمینان کی حاضری نہ ہو سکی اور ہمراہیوں کی وجہ سے مدینۂ منورہ کے مقیم اصحاب میں سے سوا مولوی سید احمد صاحب اور حافظ شبراتی صاحب کے کسی سے نہ مل سکا۔ مولوی صاحب تو گویا زائرین کے لیے بمنزلہ بنک کے ہیں اس لیے اُن سے ملے بغیر چارہ نہ تھا۔ حافظ صاحب قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے ہی روز آکر ملے اور روز ملتے رہتے۔

قافلہ جا چکا تو حافظ شبراتی صاحب کی وساطت سے مولوی ضیاء الدین سیالکوٹی سے نیاز حاصل ہوا جو مسجد نبویؐ کے قریب ہی ایک رباط میں مقیم ہیں۔ رباط سے مراد وہ موقوفہ مکانات ہیں جو صاحبان خیر کی طرف سے مساکین، مسافرین اور درویشوں کے لیے بنا دیے گئے ہیں۔ مولوی ضیاء الدین صاحب ایک نوعمر بزرگ ہیں جو وطن سے ہجرت کرکے یہاں مقیم ہیں۔ ہندوستان کے حالات سے آپ کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے جملہ ممالک اسلامیہ کے حالات سے آپ باخبر ہیں اس لیے آپ سے مل کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دوسرے روز مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ حضرت شیخ احمد شمس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی بہت مشہور ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ سے زائد کسی شخص کی عظمت نہیں کی جاتی حتی کہ عہد ترکیہ سے والی مدینہ کے سوا صرف آپ ہی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی کھلوا کر روضۂ اطہر کے قریب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمام عرب اور بدوی قبائل آپ کا اس درجہ احترام کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو راہ میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ آپ کا قافلہ پانچوں وقت نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے راہ میں ٹھہرتا ہے۔ نیز یہ کہ عام راستوں کے علاوہ آپ کا قافلہ جس راستہ سے جانا چاہے جاتا ہے۔

حضرت شمس مغربی الاصل ہیں اور شاذلی (قادری) سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اسی برس کے قریب ہوگی اور ضعف اتنا ہو گیا ہے کہ آپ کا مکان اگرچہ مسجد نبویؐ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے مگر سوائے جمعہ کے آپ عام طور پر کسی روز مسجد نبویؐ میں حاضر نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا اور چونکہ آپ کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ واپس جانا چاہتا تھا اس لیے اسکی اجازت بھی حاصل کرنا تھی۔

میں ہندوستان میں بھی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر حضرت شمس کے حسنِ خلاق سے بہت متاثر ہوا۔ آپ مکان کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ صدر دروازہ پر اطلاع کرنے کے بعد ایک خادمہ نے ہم لوگوں کو اندر لیجا کر مجلس میں بٹھایا اور کہا کہ شیخ تشریف لاتے ہیں۔ چند لمحوں میں شیخ تشریف لائے تو چلتے نہایت تپاک سے مصافحہ فرمایا اور مزاج پرسی فرمائی۔ اسکے بعد ایک چھینکہ بھر کے کھجوریں اتارے اور باصرار کھلائے گئے۔ پھر چائے پلائی گئی۔ اور حسب انتہائے گفتگو میں مولوی

عبد الباقی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو یہ سن کر بہت مسرت کا اظہار فرمایا کہ میں حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہوں۔ اور میری اس درخواست پر کہ مجھے ہمرکابی کی عزت بخشی جائے نہ صرف بخوشی اسے منظور فرمایا بلکہ وعدہ فرمایا کہ جب قصد روانگی ہوگا تو آپ کو اطلاع دیدی جائیگی۔ حضرت شیخ کے نصف چہرہ پر ایک سفید رومال پڑا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو جو یوں ہی آہستہ ہوتی ہے بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ آپ میری ہندوستانی نہیں سمجھتے اور میں آپ کی عربی نہیں سمجھتا البتہ لسان قلب سے اگر گفتگو ہو تو یہ دشواری رفع ہو جائے۔ اس جملہ سے بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک مختلف امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت حاصل کرتے وقت میں نے پھر حاضری کی اجازت چاہی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اوقات میں ہرج ہوگا تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ نہیں جب جی چاہے بے تکلف آؤ۔ چنانچہ اسکے بعد ایک بار تنہا اور ایکبار مولوی ضیاء الدین صاحب کے ہمراہ حاضری کی نوبت آئی اور ہر دفعہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ چلتے وقت دروازہ تک پہونچانے آتے۔

میرے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوج میں عطر کا بیوپار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی شیشیاں اپنے ہمراہ لائے تھے اور چلتے وقت میرے سپرد کر گئے تھے کہ کچھ روضۂ اطہر پر اور مسجد نبوی میں خاص خاص مقامات پر صرف کی جائیں اور بقیہ تقسیم کر دی جائیں۔ میں نے انکی جانب سے جہاں اور بزرگوں کو دیں وہاں دو شیشیاں حضرت شمس کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ خوش ہو کر قبول فرمائیں اور دیر تک مجھے اور میر صاحب کو دعائیں دیتے رہے۔

قافلہ کی روانگی کے بعد مسجد نبوی میں ہجوم کم ہو گیا۔ صرف نماز کے اوقات میں مجمع ہو جاتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اب اطمینان سے نماز کے بعد ٹھہر کر تلاوت کرنے اور درود شریف پڑھنے کا موقعہ ملا۔ نیز سید زین العابدین کی وساطت سے خوجوں کے سردار سے اس بات کی بھی اجازت حاصل ہو گئی کہ رات کو بھی مسجد نبوی میں حاضر رہ سکوں۔ نماز عشا کے بعد ہی حرم نبوی کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور جن چند آدمیوں کو رات کی حاضری کی اجازت ہوتی ہے انکے سوا کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ایسے تمام لوگ سنگین مکبر کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں جو منبر شریف سے تھوڑے فاصلہ پر قد آدم بلند بنا ہوا ہے۔ ہمارے قافلہ میں جنوبی امریکہ کے ایک میمن تاجر بھی تھے جنھوں نے زر کثیر صرف کر کے اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے اونٹ مدینہ منورہ میں روک لیے تھے۔ انھیں میں حکیم محمد قاسم سورتی بھی تھے جنھوں نے ازراہِ ہمدردی اسلامی تراوہ میں رحمت شاہ کا علاج کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں مجھے انکی خدمت میں نیاز حاصل ہوگیا تھا۔ شب دوشنبہ کو جب میں نے پہلی بار حرم نبوی میں حاضری شبانہ کا ارادہ کیا اور نماز عشا کے بعد سب ہدایت کبر کے نیچے جاکر بیٹھ گیا تو وہ سیٹھ مع حکیم صاحب اور چند دیگر رفقا کے وہیں نظر آئے۔ انکے علاوہ ایک بدوی عرب بھی تھا۔ غرضکہ ہم سب نصف درجن آدمی تھے۔ مسجد نبوی کے دروازے بند ہوگئے تو ایک خوجہ صاحب نے مجھے اپنے ہمراہ لیجاکر حرم شریف کے مغربی دروازہ سے متصل وضوخانہ اور استنجے خانہ دکھایا۔ اس اثنا میں اکثر جگہ سے روشنی رخصت ہوگئی تھی صرف کہیں کہیں ایک ایک بتی رہ گئی تھی۔ روضۂ مطہر کے اندر بھی صرف چند مومی بتیاں رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب خوجے بھی چلے گئے۔ جن میں سے بعض صحن مسجد میں بستر بچھا کر لیٹ رہے۔ صرف دو ایک مشغول عبادت تھے رہ گئے۔ اب حرم نبوی میں کامل سکون ہوگیا۔ جس کے ہم غلامان رسول مشتاق تھے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بارگاہ رسالت پناہی کے قریب کوئی گوشہ منتخب کرلیا۔ کہ یہی ہماری کامرانیوں اور دلی مرادوں کا اتمام عروج تھا۔ دوسروں کا حال مجھے کیا معلوم مگر میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی وہ تمام ساعتیں جو کسی قسم کی مسرت و انبساط میں گذری ہوں اس رات کے مقابلہ میں بے تکلف قربان کردی جاسکتی تھیں۔ اور میں حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو بارگاہ رسالت پناہی میں یہ سرافرازی نصیب ہوئی۔
شب کا حصۂ وافر اسی عالم سکون میں بسر ہوا۔ اور غلس کے وقت حرم نبوی کا دروازہ کھلتے ہی جب نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی تو میں بائیں جانب کے دالان میں جاکر تھوڑے وقفہ کے لیے لیٹ رہا۔ اور نماز فجر ادا کرکے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس آیا۔

مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ کے لیے بھی میرے پاس کچھ امانت اور خیرات کی رقوم تھیں۔ امانت کو بحفاظت پہونچا دینے میں تو بحمداللہ جلد کامیابی ہوگئی مگر تقسیم خیرات کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ مکہ معظمہ میں بھی رقوم کے تقسیم ہوجانے کے بعد میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہاں جب اسی طریقہ پر ابتدا کی گئی تو میں برداشت نہ کرسکا اور میں نے تہیہ کیا کہ بقیہ چیزیں اور رقمیں خود مستحقین کو تلاش کرکے دو پہنچاؤں۔ اس

غرض کے لیے مدینہ منورہ کے فقرا و مساکین تک پہونچنے میں میرا بہت سا وقت صرف ہوا جس کی وجہ سے مسجد نبوی میں خلاف اوقات نماز زیادہ وقت تک حاضری سے محروم رہا۔ قافلہ کی واپسی کے بعد سے تقریباً ہر روز صبح کو ظہر سے قبل تک اور کبھی کبھی سہ پہر یا رات کو بھی فقرا و مساکین کی تلاش میں وقت گذرتا۔

ایک روز نماز ظہر کے بعد سید زین العابدین صاحب مجھے اور میمن تاجر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کو حرم شریف سے باہر لائے اور مشہد عثمانؓ، حضرت ابو ایوبؓ انصاری کا مکان، دیار حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہ (حضور کے پدر) اور حضرت مالک ابن سنان علمبردار غزوۂ احد کے مزارات کی زیارت کرائی۔

عشاء کے بعد ایک دفعہ حرم نبوی سے گھر جا رہا تھا۔ طبیعت پر کسی قدر حزن طاری تھا۔ راہ میں ایک درویش صورت شخص سے ملاقات ہوئی جو حرم شریف میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے آتے تھے۔ میں نے اپنی قلبی کیفیت کا اُن سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ذکر کیا۔ پہلے وہ سمجھے نہیں، بلکہ ایک مسافر و سائل جان کر اپنے گھر لیجانے اور کھانا کھلانے پر آمادہ ہوئے۔ جب مزید گفتگو سے اُنھیں معلوم ہوا کہ طالب دُنیا نہیں ہوں تو دوسری طرح پیش آئے۔ گھر ساتھ لیگئے۔ اور باوجودیکہ کھانا کھائے ہوئے تھا، باصرار دودھ اور نان خطائیوں سے میری ضیافت کی اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ انکا نام شیخ حُسین ہے، فرقہ شاذلیہ (ناصری) سے تعلق رکھتے ہیں اور فاز (مراکش) کے رہنے والے ہیں۔ جب میں گھر جانے کے لیے رخصت ہوا تو میری استدعا و التجا کے باوجود ہمراہ تشریف لائے اور میرے گھر کے قریب تک پہونچا گئے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہیں۔

دوسرے دن سید زین العابدین صاحب کی معیت میں مسجد قبا کی زیارت کرنے گیا۔ ایک درجن سے زیادہ عورتیں اور مرد ساتھ تھے۔ مسجد قبا شہر سے باہر تقریباً ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور چونکہ راہ غیر محفوظ ہے اسلیے حکومت کی طرف سے گارڈیوں کے ہمراہ مسلح بدو ساتھ گئے تھے۔ مسجد قبا کی زیارت کے بعد مسجد سیدنا عمرؓ، سیدنا علیؓ و سیدنا ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی چکی کی زیارت کی اور وہاں سے بیر خاتم پر آکر پانی پیا جسمیں حضور انورؐ کی انگشتری مبارک گر گئی تھی۔ واپسی میں شہر کے اندر سیدنا عمرؓ حضرت بلالؓ اور سیدنا ابوبکرؓ کی مسجدوں کی زیارت کی۔ سیدنا علیؓ کی مسجد بند تھی اسلیے باہر ہی سے زیارت کر لیگئی۔ زیارت کے موقعوں پر ہر جگہ سید زین العابدین صاحب کچھ دعائیں عربی زبان میں باواز بلند پڑھتے تھے اور سب لوگ اُن الفاظ کی تابا مکان تکرار کرتے جاتے تھے۔ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا خاص ثواب ہے اسلیے وہاں تو جتنی دیر قیام ہوا میں نوافل پڑھتا رہا باقی اور سب مقامات پر بھی کم سے کم دو رکعت نفل ضرور پڑھ لی۔

مسجد قبا کا راستہ ناہموار تھا۔ نیز جن گاڑیوں پر ہم لوگ گئے تھے ان میں کمانیاں نہ تھیں۔ اسلیے آمد و رفت کی مسافت زیادہ نہ ہونے کے باوجود تکلیف اور تھکن بہت ہوئی۔ بعد ادائے نماز ظہر حسب وعدہ شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ فوراً قہوہ سے ضیافت کی اور تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ اور چلتے وقت میرے حزن کو دفع کرنے کی ترکیب بتائی۔

آج ایک بہار کے رہنے والے نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام حامد رسول ہے۔ اور یہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب جو طبی مشن لیکے گئے تھے اسکے ایک رکن تھے۔ اب ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔ ان سے دیر تک عام حالات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ رات حرم شریف میں بسر ہوئی۔ الحمد للہ

چونکہ زیارت حرمین شریفین کے سلسلہ میں مجھے اسکی فکر بھی تھی کہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں بقیہ عمر گذارنے کی صورت پیدا ہو اسلیے مدینہ منورہ میں جن حضرات سے موقع ملتا اس بارہ میں گفتگو کی جاتی۔ مہاجرین میں سے جو اصحاب متوکلین میں ہیں اور حصول معاش کے لیے کوئی کام نہیں کرتے انکی تابعیت ایک دنیا کے کتے سے نہیں ہوسکتی۔ اسلیے ایسے اصحاب کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا جو وہاں کسی قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب سے تو تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ مگر جب تک حجاج کا ہجوم رہا اس بارہ میں گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب انکو فرصت تھی تو صبح ہی کو میں انکے یہاں حاضر ہوا اور دیر تک اس بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ خود متعدد قسم کی تجارتوں میں مشغول ہیں اور کافی تجربہ یہاں کی زندگی کا رکھتے ہیں۔ اسلیے ان کی رایوں سے مجھے بہت مدد ملی۔

ظہر کے بعد شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ پہلے انھوں نے گرم گرم کبابوں اور عمدہ سکی ہوئی روٹی سے ضیافت کی۔ پھر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ رات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی تو منہ چھپائے ہوئے تھے اسلیے کچھ عرض نہ کرسکا۔ یہ گویا میرے حزن کے رفع نہ ہوسکنے کی طرف اشارہ تھا۔

حافظ شبراتی صاحب سے روزانہ کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی اور جب فرصت پڑتی تو وہ میرے ساتھ بھی اپنا وقت گذارتے۔ ان کا قیام میاں مظہر کی رباط میں ہے۔ میاں مظہر صاحب حضرت مجدد سرہندی کی اولاد میں ایک بزرگ کامل گزرے ہیں جن کا مدینہ منورہ میں غیر معمولی ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ یہ رباط انہیں کی بنائی

ہوتی ہے اور اب اُنکے صاحبزادہ میاں احمد کے زیر اہتمام ہے۔ حافظ شبراتی صاحب نے از راہ محبت میری دعوت فرمائی۔ اکیلا، پہلے اُنکی ہمراہی میں اُن کا جائے قیام دیکھ گیا تھا۔ اب دعوت کھانے اپنے میزبان جناب مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ گیا۔ اور وہاں دیر تک ٹھہرا تو رباط کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سرائے کی قطع کی دو منزلہ عمارت ہے جس میں چاروں طرف برآمدہ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ٹھہرنے والوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبا و مہاجرین رہتے ہیں۔ مکان کے ایک قطعہ میں خود میاں احمد صاحب کے اہل وعیال رہتے ہیں۔ صاحب موصوف کے دو بیبیاں ہیں۔ ایک رباط میں رہتی ہیں اور دوسری حرم نبوی کے قریب ایک مکان میں۔ اس رباط کے رہنے والوں کو آپ کے حلقہ میں بھی حاضری دینا ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگ عموماً اور حضرات مجددین خصوصاً پیرزادگی کے عام طریقوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ خواص اور صاحبانِ دل تو ضرور ان باتوں سے بچتے ہیں ورنہ عام طور پر اُن میں بھی وہی سب کمزوریاں موجود ہیں جو دیگر سلاسل و طرق میں پائی جاتی ہیں۔

میاں احمد صاحب اُسوقت موجود نہیں تھے اس لیے اُنکی قدمبوسی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ بلکہ ان سے ملنے کے لیے ایک دن اُنکے بازار والے مکان پر حاضر ہونا پڑا۔

آج خبر ملی کہ ڈاک آئی ہے۔ ڈاک خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاک بازار میں تقسیم ہونے کو دی گئی ہے۔ رباط مظہری میں ایک طالبعلم یسین نامے رہتے ہیں جو مولوی عبد الباقی صاحب سے پڑھتے ہیں اور اس سبب سے تقریباً روزانہ آتے تھے۔ انکی زبانی معلوم ہوا ایک ہندوستانی عبد الرزاق نامی ہیں جو ڈاکخانہ سے خطوط لاکر تقسیم کرتے ہیں۔ اُنکی تلاش میں کئی بار گیا۔ شام کو اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ دوسرے روز ڈاک دیکھکر بتائیں گے۔

رات مسجد نبوی میں بسر ہوئی۔ آج شب جمعہ تھی اس لیے حرم شریف میں حاضر رہنے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا اور ایک بخاری بزرگ سے جن کا اسم شریف محی الدین اور طریقہ نقشبندیہ تھا۔ ملاقات ہوئی۔ چونکہ فارسی میں گفتگو ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اُنکو جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اُنسے اپنے حزن کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رفع حزن کی ایک ترکیب بتائی

دوسرے دن جمعہ تھا خبر ملی کہ شیخ شمس کا قافلہ دوشنبہ کو روانہ ہوگا۔ لہذا صبح کو بازار جاکر کھجور خریدی۔ بعد نماز جمعہ مولوی ضیاء الدین کے ہمراہ رباط مغربی میں گیا جو حرم شریف سے قریب ہی واقع ہے اور

ناظر یا مہتمم رباط سے کچھ دیر بات چیت ہوتی رہتی۔ پھر دار الضیافہ میں جاکر مولوی محی الدین بخاری کی قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عصر کے وقت شیخ حسین ناصری حرم شریف میں ملے تو فرمانے لگے کہ جب تک تنباکو کو مطلقاً ترک نہ کروگے تمہارا حزن دفع نہ ہوگا۔ نماز مغرب کے بعد حکیم حامد رسول کے ساتھ عمر آغا شوجی کے یہاں گیا۔ یہی صاحب ہمارے مزور ہیں۔ عرصہ سے شدید علالت میں مبتلا ہیں اس وجہ سید زین العابدین صاحب کو اپنی طرف سے یہ خدمت سپرد کر رکھی ہے۔

سال میں دو دفعہ روضۂ اطہر کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل کی رات کو روضۂ اطہر پر حاضر ہوکر لوگ مرادیں مانگتے ہیں اور اس غرض کے لیے کہ غسل کرنے میں شرکت ہوجائے پاک کپڑے میں برادۂ صندل وغیرہ رکھکر اور پوٹلی بناکر روضۂ اطہر کی جالی میں ڈالدیتے ہیں اور غسل کے بعد غسل کا پانی تقسیم ہوتا ہے۔ میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میری حاضری کے زمانہ میں غسل ہونے والا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے وعدہ کیا کہ غسل کا پانی لادیں گے۔ دوسرے روز کہ یوم غسل تھا صبح کو میں دیر تک روضۂ اطہر پر حاضر رہا۔ اسی دن ایک صاحب جو ہندوستانی ہیں تشریف لاکر مجھ سے ملے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک خاتون کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ہمراہ لیجاؤں۔ مجھے اس میں تامل ہوا تو فرمانے لگے کہ کم سے کم مکہ معظمہ تک پہونچا دینا۔ مجھے منظور کرنا پڑا۔

میرا شغدف بیرونی مناخہ سے اٹھ گیا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ مل جائیگا۔ اب جو واپسی کا زمانہ آیا تو مجھ کو اسکی فکر ہوئی۔ کئی بار سید زین العابدین صاحب سے کہا۔ کبھی انھوں نے اپنے کسی کارکن کو میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی کبھی خود وعدہ کیا۔ بالآخر ایک دن میں اُنکی معیت میں اندرونی مناخہ گیا تو دیکھا کہ شغدف تو کھلا پڑا ہے اور چٹائی جو اوپر بندھی تھی اور صراحیوں کی زنبیلیں وغیرہ غائب ہیں۔ غنیمت ہے کہ شغدف کا پتہ چل گیا۔

شام کو اُسی طرف پھر نکلا۔ ایک جگہ تازہ انجیر فروخت ہو رہے تھے۔ دو قرش کے سولہ سترہ ملے خوش ذائقہ معلوم ہوئے اور میں سب کھا گیا۔ دن میں اتفاق سے ایک جگہ بہت سے کباب اور ایک ہندوستانی مٹھائی والے کے یہاں سے کچھ مٹھائی لیکر کھائی تھی۔ ان بدعنوانیوں نے طبیعت خراب کردی۔ گرانی سر اور نزلہ پیدا ہوگیا۔ اور دوسرے دن بخار آگیا۔ اتفاق سے ایک شخص عبد الرحمن خیاط سے اُس روز ملنے کا وعدہ تھا اُسی حالت میں اُنکے یہاں چلا تو گیا مگر بخار کے کرب کی وجہ سے بہت بےچین رہا۔ اور ان غریب کو بھی کافی پریشانی

ہوئی۔ مغرب کے وقت تک تو خیر نماز کے لیے حرم شریف جاتا رہا مغرب کے بعد اس قدر اُلجھن بڑھی کہ حرم شریف جانے کا کیا ذکر نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ زیادہ رات گذرنے پر کچھ بخار میں کمی ہوئی تو نیند آئی۔ دوسرے دن اہلیہ مولوی عبد الباقی صاحب کے مشورہ سے ایک سہلہ دوا پی جسکو سنگو یا سنقوح کہتے ہیں۔ اُسکے اثر سے دن بھر پتلے پتلے دست آتے رہے مگر دستوں کا سلسلہ شام تک بند نہ ہوا۔ نصف شب کے بعد کہیں جاکر دستوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ جس سے بہت ضعف پیدا ہوگیا۔

دستوں سے طبیعت مضمحل ہو رہی تھی، اسی حالت میں اطلاع ملی کہ حضرت شمس کا قافلہ دوسرے دن روانہ ہونے والا ہے۔ میں نے بھی سید زین العابدین کو اونٹ کا کرایہ دیدیا، اور حافظ شبراتی اور مولوی یٰسین کی معرفت ضروری چیزیں خریدی گئیں۔ حافظ شبراتی نے چونکہ ہمراہ چلنے کا تہیہ کیا اسلیے مجھے دوسرے ساتھی کی فکر بھی نہ رہی۔ راستہ بھی انشاء اللہ لطف سے کٹے گا۔ ظہر تک طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ ہمت کرکے لباس تبدیل کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے حرم شریف میں حاضر ہوا۔ اور عشا تک برابر احباب سے رخصتی ملاقاتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن سویرے ہی سے رختِ سفر درست کیا گیا۔ شقدف پر چٹائیاں اور کمل منڈھوایا صراحیوں کے لیے زنبیلیں بندھوائیں، اور سامان بھی تیار ہو رہا تھا کہ سید زین العابدین آئے اور یہ خبر سنائی کہ جس اونٹ کا کرایہ دیا گیا تھا وہ نہیں آیا۔ قافلہ باب العنبریہ پر پہونچ گیا تھا جو تبریز کا مقام معین کیا گیا تھا۔ لہذا دوڑتا ہوا وہاں گیا کہ کوئی دوسرا اونٹ خالی ہو تو اُسپر جانے کا انتظام کروں۔ وہاں پہونچکر پہلے تو کورا جواب ملا۔ پھر ایک صاحب نے اطلاع دی کہ ایک جگہ خالی ہے اگر تنہا جانا ہو تو کرایہ طے کرلو۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ حافظ شبراتی کو چھوڑ دوں، اسلیے ناچار تھکا ماندہ واپس آیا۔ مگر حضرت شمس کی ہمراہی میں نہ جا سکنے کا بہت رنج ہوا۔ اور جب سید زین العابدین سے سہ پہر کو ملاقات ہوئی تو غصہ کی وجہ سے بہت درشت گفتگو کی اور اُن سے صاف کہدیا کہ آپ کرایہ کا روپیہ واپس لادیں میں اب خود انتظام کروں گا۔ وہ شام کو روپیہ لانے کا وعدہ کرکے گئے مگر وقت معینہ پر نہ آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ دوڑا ہوا مولوی سید احمد کے پاس گیا اور اُنکے بھائی سید محمود کے مشورہ سے ایک درخواست عربی زبان میں لکھوا کر احمد بن منصور قائم مقام شریف کے پاس لے گیا۔ قائم مقام صاحب اپنے حوالی موالی سمیت بڑی بڑی لگنوں میں اُبلا ہوا پلاؤ اُڑا رہے تھے۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تب مجھے باریابی کا موقع ملا۔ درخواست

لیکر رکھ لی اور دوسرے دن صبح کو مع مترجم کے حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ واپس آکر سب کیفیت سید محمود سے بیان کی اور اُنھوں نے ازراہ محبت مترجم کا انتظام کردینے کا وعدہ کیا۔

صبح ہوئی تو سید محمود کے پاس پھر گیا اور وہیں سے مترجم کو لیکر قائم مقام صاحب کی بارگاہ پر حاضر ہوا۔ یہ صاحب بدوی ہیں اور اپنی تمام نوع کی طرح جہالت کو مایۂ افتخار جانتے ہیں۔ شریف مکہ نے چونکہ بدویوں ہی کے بل بوتے پر ترکی حکومت سے بغاوت کی اور انھیں کی قوت سے حجاز پر تسلط حاصل کیا، اسلیے قائم مقامی یعنی گورنری جیسے ذمہ دار عہدہ پر بھی بدوہی مقرر کیے ہیں۔ قائم مقام صاحب اپنے ملاقات کے کمرہ یا مجلس میں لیٹے ہوئے حقہ نوش فرما رہے تھے۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے میری درخواست ایک اردلی سے منگائی اور مترجم صاحب سے پڑھوا کر سُنی۔ سید زین العابدین پہلے ہی طلب کیے جا چکے تھے، تھوڑی دیر میں وہ بھی ہانپتے کانپتے پہونچے تو اُن سے کسی قدر درشت لہجہ میں بازپرس کی گئی اور فوراً مجھے روپیہ دلا دیا گیا۔ ساتھ ہی مترجم کے ذریعہ سے مجھے اطمینان دلایا گیا کہ حکومت کی طرف سے اونٹ کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اور میں دوسرے قافلہ کے ساتھ روانہ ہو سکوں گا۔ چنانچہ ایک بدو میرے ساتھ کیا گیا جو باب المصری کے باہر لبدیہ (میونسپلٹی) کے دفتر میں مجھے لایا۔ یہاں میں نے کرایہ جمع کیا اور رسید حاصل کی۔ تب جان میں جان آئی، ورنہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وقت پر مکہ معظمہ نہ پہونچا تو حج رہ جائے گا۔ عصر کے بعد پھر لبدیہ گیا اور مقوم کو ساتھ لا کر اپنا مکان دکھایا تاکہ اونٹ یہیں بھیجا جائے۔ میرے ساتھ دو پیپے بھی تھے جنمیں کھجور اور خاک شفا تھی۔ چاہتا تھا کہ مقوم کی معرفت مناسب کرایہ پر ان پیپوں کے ساتھ جانے کا بندوبست ہو جائے مگر مقوم نے کرایہ بہت مانگا لہذا اس بارے میں بھی مولوی سید احمد صاحب سے رجوع کرنا پڑا۔ اُنھوں نے ازراہ ہمدردی وعدہ کیا کہ پیپے رابغ کے ذریعہ براہِ راست جدہ پہونچا دیے جائیں گے۔

حضرت سید الشہدا حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر فاتحہ خوانی نہیں کر سکا تھا۔ اتفاق سے ٹھہر گیا تو سید زین العابدین کے ہمراہ گاڑی پر سوار ہو کر اُس بارگاہِ عالی میں حاضری دے آیا۔ وہاں سے واپس آیا تو جمّال کی صورت دکھائی دی اور معلوم ہوا کہ فوراً روانگی کا سامان کرنا چاہیے۔ وضو کرکے حرم شریف حاضر ہوا۔ اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک پر سلام ودعائے وداع پڑھی اور چاشت کے وقت روانہ ہوا۔ اونٹ تھوڑی دور چل کر مسجد سیدنا عمرؓ

کے سامنے رُکا اور شغدف وہیں اُتار دیا گیا۔ ظہر تک وہیں رہنا ہوا، ظہر کے بعد جمال اونٹ لیکر آیا تو روانگی ہوئی۔ روانگی کے وقت سید زین العابدین اور اُنکے شرکاء سب رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ اُن کا حق مزدوری نا مجیدی تو پہلے ہی ادا کر دیا گیا تھا، کچھ خدمت اسوقت بھی کی گئی بلکہ اس خیال سے کہ اونٹ کے بارے میں اُن سے کافی ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا اُنکو اُنکی توقع سے زائد ملا۔ جس سے وہ بہت خوش خوش رخصت ہوئے۔

مدینہ منورہ میں کوئی بڑی آبادی نہیں ہے۔ لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کے زمانہ میں ساٹھ ستر ہزار کی آبادی تھی۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں حکومت نے مدینہ منورہ کو جنگی مستقر قرار دیا۔ اور اس خیال سے کہ اہالی مدینہ منورہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو تمام شرفا و معززین کو حکومت کے خرچ سے ریل پر سوار کرکے دمشق بھیجدیا۔ حضرت شیخ احمد شمس سے بھی دمشق تشریف لیجانے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے پہلے عذر کیا، جب اصرار زیادہ ہوا تو آپ نے آستانۂ نبوی پر حاضر ہو کر استخارہ فرمایا۔ اور عامل مدینہ کو اطلاع دی کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر گورنر نے کچھ نہ سُنی اور آپ کو بحکم جانب دمشق روانہ کر دیا۔ دمشق کے حاکم نے آپ کی بہت تکریم کی اور پھر مدینہ منورہ واپس پہونچا دیا۔ مدینہ منورہ کی مستقل آبادی میں کچھ تو اس سبب سے کمی ہوئی تھی، باقی جب شریف حسین کا یہاں تسلط ہوا تو بدوی فوج کے مظالم نے ہزاروں باشندوں کو خانماں برباد کر دیا۔ بہت سے لوگ جان و آبرو بچانے کے خیال سے بھاگ گئے۔ اب بمشکل دس ہزار کی آبادی ہوگی۔ آبادی کی کمی کے ساتھ جو لوگ رہ گئے ہیں اُنکی مالی حالت بھی خراب ہوگئی ہے۔ کیونکہ ترکی حکومت کی طرف سے جو وظیفے اور انعام ملتے تھے وہ سب بند ہوگئے۔ صرف زائرین ذریعۂ آمدنی رہ گئے۔ اور جنگ کے بعد سے انکی تعداد بھی بہت قلیل ہوگئی تھی۔ اب صلح کے بعد سے خیر پھر یہ سلسلہ جاری ہوا ہے مگر ترکی کے دولتمند زائرین اب بھی نہیں آتے۔

آبادی کا بیشتر حصہ قدرۃً حرم نبوی کے اطراف میں آباد ہے۔ اسلیے یہاں آبادی گنجان ہے۔ شہر پناہ کے باہر جو مکانات بنے ہوئے ہیں وہ تو اب بالکل ہی غیر آباد رہتے ہیں۔ شہر کے اندر بھی جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے، کچھ چہل پہل تھی، اُنکے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا معلوم ہوتا تھا۔ حرم نبوی کے جنوبی دو پھاٹکوں کے سامنے دورویہ بازار ہے۔ اصلی بازار باب السلام کے سامنے ہے جہاں سے روضۂ مبارک کے پاس حاضر ہونے کا راستہ ہے۔ اس بازار کے ختم پر

باب المصری ہے جسکے باہر بلدیہ کے مقابل غلہ، کھجور اور دیگر اشیائے خوردنی کا بازار ہے جب ریل جاری تھی تو باب العنبریہ سے جہاں اسٹیشن بنا ہوا ہے ریل کی ایک پٹری حرم شریف کے قریب تک بچھا دی گئی تھی - جو اب تک علی حالہ ہے - ریل جنگ کے زمانہ میں بند ہوگئی تھی - مگر اب پھر جاری ہونیوالی ہے - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے حصۂ زیریں میں باب المکہ ہے - جس میں داخل ہوتے ہی داہنی جانب ایک مختصر سا قلعہ ہے - شریف علی حاکم مدینہ جب یہاں آتے ہیں تو اسی میں رہتے ہیں - آجکل شریف علی یہاں نہیں ہیں - قلعہ کے مقابل پوستہ یعنی ڈاکخانہ ہے - اور جوانب میں اندر اور باہر ساحہ ہے جہاں قوافل آکر اترتے ہیں - باب المکہ سے جبل اُحد تک جسکے دامن میں حضرت سید الشہداء کا مزار مبارک ہے کوئی ایک کوس کا فاصلہ ہوگا - مگر امن کا یہ عالم ہے کہ سوائے چہار شنبہ کے جبکہ کثیر تعداد میں لوگ وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں یا ایسی صورت میں کہ زائرین کی معقول تعداد ہو عام طور پر بغیر سرکاری محافظ کی ہمراہی کے کوئی شخص وہاں تک نہیں جا سکتا - اسی راستہ میں ایک جانب ترکی حکومت کے زمانہ کا بے تار کی تار برقی کا اسٹیشن بنا ہوا ہے جس پر اب شریف صاحب متصرف ہیں - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے بالائی حصہ میں ایک دروازہ ہے جسکے باہر "جنۃ البقیع" ہے - یہ مشہور قبرستان بہت وسیع ہے - اس سے متصل ہی ایک نخلستان ہے جہاں ایک جلیل القدر صحابی کا مزار مبارک ہے میں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے جانا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ راستہ محفوظ نہیں ہے - حالانکہ یہ جگہ شہر پناہ سے غالباً دو فرلانگ بھی دور نہیں -

شریف علی جو یہاں کے مستقل گورنر ہیں عموماً یہاں رہتے نہیں، اسلیے قائم مقام صاحب ہی کو یہاں کا گورنر یا عامل سمجھنا چاہیے - شریف حسین کو مدینہ منورہ سے کس قدر دلچسپی ہے، اسکا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خاص حرم نبوی کے مجاوروں اور خدمتگاروں کو پندرہ پندرہ مہینے تنخواہ نہیں ملتی - حرم نبوی کی تعمیر پر شاہان آل عثمان نے جس قدر بے دریغ روپیہ صرف کیا اسکا اندازہ ہر شخص حرم شریف کی زیارت کے بعد کر سکتا ہے - مگر آج یہ عالم ہے کہ حرم شریف کی شمالی دیوار میں اُس مقام پر جسکے نیچے عورتوں کی جالی ہے شق ہوگئی ہے اور اُسکی مرمت نہیں ہو سکتی - مسجد نبوی کے وسیع دالان کے ستون، محرابیں، اور ساری چھت خوشنما پھول بوٹوں سے منقش ہے مگر اب جہاں کہیں چونا اُکھڑ گیا ہے اُسکی درستی نہیں کی جا سکتی - مسجد نبوی کے اندر جو چٹائی کا فرش ہے کہیں کہیں وہ بھی خستہ نظر آیا -

مسجد نبوی، حرم کعبۃ اللہ کے خلاف مستطیل بنی ہوئی ہے۔ وسیع دالان کے جنوبی کونے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اطہر ہے۔ جس کا سبز گنبد سقف مسجد سے باہر نمایاں ہونے کی وجہ سے زائرین کو دور سے زیارت کا موقع دیتا ہے۔ روضۂ مقدس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ممبر شریف ہے۔ اور درمیان میں وہ مبارک جگہ ہے جسے روضۃ من روضات الجنان کا لقب ملا ہے۔ روضۂ اطہر کے گرد کسی دھات کی وسیع جالی لگی ہوئی ہے جس پر گنگا جمنی بھری ہے۔ اس جالی کے اندر بائیں کی جانب ایک پردہ کی جالی ہے جسکے قریب ہی حضرت فاطمہ زہرا کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔ جالی میں متعدد دروازے ہیں مگر مغربی سمت کے دروازہ سے عموماً اغواط یا خوجے صفائی اور روشنی وغیرہ کے لیے اندر حاضر ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر رات کو عموماً برقی روشنی ہوتی ہے جو عشا کے بعد بجھادی جاتی ہے البتہ روضۂ اطہر کے اندر رات بھر شمعیں روشن رہتی ہیں۔ روضۂ مبارک کی جالی کے بائیں میں کچھ فاصلہ پر ایک چبوترہ خوجوں کی نشست کے لیے بنا ہوا ہے۔ اور اسکے بعد ایک درجہ کا شمالی دالان ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس دالان کا اگلا حصہ تو کھلا ہوا ہے مگر پچھلے نصف سے زائد دالان میں لکڑی کی جالی لگی ہوئی ہے۔ جنوبی دالان میں جب مجمع زیادہ ہوتا ہے تو مرد نماز پڑھتے ہیں۔ مغربی دالان کی پشت پر طہارت خانہ اور وضو خانہ ہے اور دروازہ سے متصل ایک مدرسہ ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ مسجد نبوی کے پانچ دروازے ہیں شمال و جنوب میں بالمقابل دو دو اور ایک مغرب میں۔ مشرق میں ایک کھڑکی مثین روضۂ اطہر کے مقابل ہے۔

مدینہ منورہ میں پانی بہ افراط ملتا ہے اور اس میں جتنی خوبیاں ہونا چاہیے سب موجود ہیں میں نے اس سے قبل ایسا خوش ذائقہ پانی کہیں نہیں پیا۔ جو صراحی میں رکھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اس قدر سبک ہے کہ خواہ کتنی ہی مقدار میں پیا جائے کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اس پانی کی خصوصیت ہے جو نہر کے ذریعہ باہر سے آتا ہے۔ ورنہ کنووں کا پانی عموماً کھاری ہے۔ البتہ مسجد نبوی کے کنوئیں کا پانی کھاری نہیں، گو تازہ پیا جائے تو ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

یہاں جملہ اشیاے خوردنی بھی بافراط ملتی ہیں اور بمقابلہ مکہ معظمہ کے اچھی اور ارزاں ہیں۔ عموماً سب چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ ہر قسم کی ترکاریوں کے علاوہ خربوزے، تربوز، کھجور، انگور، انار، اور انجیر وغیرہ نواح میں ہوتے ہیں۔ کھجور تو یہاں کا مشہور ہی ہے مگر میری حاضری کے زمانہ میں کھجور کی

فصل نہ تھی اسلیئے تازہ پھل نہ ملے۔ اور رکھے ہوئے بھی نسبتاً گراں ملتے تھے۔ دودھ، دہی وغیرہ بھی عمدہ اور ارزاں ملتا ہے۔ قہوہ خانوں کی کثرت ہے۔ اور کھانے کی دوکانیں بھی جگہ جگہ ہیں۔ اگرچہ زائرین کے رخصت ہو جانے پر ان میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص تنوری روٹی کھاتا ہے۔ جو لوگ بازار سے نہیں مول لیتے وہ اپنا آٹا بھیجکر پکواتے ہیں۔ یہاں کی روٹی ذائقہ میں مکہ معظمہ اور جدہ کی روٹیوں سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

یہاں کی آبادی ویسی مخلوط نہیں جیسی مکہ معظمہ کی۔ کچھ بخاری اور ہندوستانی ہیں اور باقی سب عرب۔ البتہ عربوں میں مغربی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مکہ معظمہ کی طرح یہاں بھی اصل باشندے بہت کم ہیں۔ بدوؤں کے سوا تقریباً سب بیرونی لوگ ہیں۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بھی عموماً وہی ہیں جو مکہ معظمہ میں برتے جاتے ہیں، مگر اخلاقی حیثیت سے یہاں کے لوگوں کا مرتبہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ایک نمایاں فرق تو لب ولہجہ کی نرمی اور شیریں گفتاری میں نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ میخواری اور دیگر فواحش بھی یہاں عام نہیں۔

تعلیم کی بہت کمی ہے۔ حرم شریف میں بعض علما درس دیتے ہیں یا اپنے گھروں پر کچھ لوگوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک مکتب بھی ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے مگر یہ بالکل ناکافی ہے۔

مدینہ منورہ کوئی تجارتی منڈی نہیں۔ گو گرد و نواح کے قبائل یہیں سے احتیاج زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ینبوع کی راہ سے جملہ اشیائے ضرورت یہاں آتی ہیں۔ ترکی وظائف و انعامات کی بندش اور حکومت ہاشمیہ کی بے اعتنائی کے باعث ہر طرف غربت و افلاس کے آثار نظر آتے ہیں اور مخصوص طبقات کے سوا عام طور پر مذہبیت یہاں بھی زیادہ نمایاں نہیں۔ سب سے زیادہ اُن فقرا و مہاجرین کو دیکھ کر حسرت معلوم ہوتی ہے جو یہاں رہ کر طرح طرح کے جسمانی مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہیں مگر اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پانچوں وقت حرم نبوی میں نماز باجماعت ادا کریں۔ جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے مسجد اوقاتِ نماز میں بھری رہتی تھی، قوافل کے جانے کے بعد جمعہ کے دن بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا تھا کہ صدر دالان پر ہو سکے۔ •

ساتویں منزل

۸- جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلہ نے دوسری راہ اختیار کی - جب تک حوالیِ شہر کے قریب قافلہ رہا، دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد نظر فروز ہوتا رہا تا آنکہ مغرب تک ایک ایک کر کے سب نشانات نظر سے اوجھل ہو گئے - جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شغدف میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا، لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا، لہذا نمازیں بھی شغدف ہی پر پڑھی گئیں - منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہو گئی اور عشا کے وقت بیر الماشی پہونچ گئے -

دوشنبہ ۹- جولائی

بیر الماشی کا پانی مدینہ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی، جسکی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی - کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوئے تھے - بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہو گئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، تربوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا، قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا - سہ پہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا - اب راستہ ہموار اور ریتلا تھا - گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا - عصر کے وقت نماز کے لیے اُترا، عینک شغدف پر رکھدی تھی، اسلیے نماز کے بعد اپنے شغدف کو نہ پہچان سکا اور آگے نکل گیا، دور تک چلتا رہا اور ہر شغدف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہو گیا - ایک بدو سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے وہ پیچھے ہے - لہذا وہیں رُک گیا - کچھ دیر میں شغدف ملا تو اس پر سوار ہوا - خستگی سے حد درجہ طبیعت نڈھال ہو گئی تھی - مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے، اس لیے عادت

کے خلاف قافلہ کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو، جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے۔ جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ تھوڑی ہی رات سے ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی ہوا سرد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رضائی اوڑھنے پر بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف پہونچی۔ اور سردی سے بخار آگیا۔ قافلہ رات ہی میں نائرہ پہونچ گیا تھا، جلدی جلدی شغدف اُتارا اور اوڑھ لپیٹ کر سو رہا۔ منزل پر کچھ سردی کم تھی۔ کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا اور تقریباً ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

یکشنبہ ۱۰ - جولائی

صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب نے سارا کام خود ہی کر لیا۔ اور جب کھانا تیار کر چکے تو مجھے بھی اُٹھایا۔ میں نے پہلے تو تھوڑا سا خمیرہ بنفشہ کھایا۔ اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔ بیر المّاشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے۔ غار سے روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے۔ میں بہت نحیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ عورتیں تک شغدفوں پر نہیں بٹھائی گئیں۔ آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے حجاج۔ تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ لاچار ہو کر جمّال نے ایک خالی اونٹ پر مجھے بٹھا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دُور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا، جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کر ڈالا تاکہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں۔ شتربانے یہ حالت دکھا کر مجھ سے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبوراً مجکو پھر اُترنا پڑا۔ اونٹ پر چڑھتے وقت میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شغدف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے پتھریلی زمین تپ رہی تھی، ...... تلوے بھُنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شغدف کے ہمراہ آگے جا چکے تھے۔ ہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُتار ختم ہو جانے اور ہموار راستہ آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے۔ یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے .

باعث گر پڑا - میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمال سے جا کر اطلاع کی، تب کہیں شغدف پر سوار ہونے کی نوبت آئی - تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے، خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی -

چہارشنبہ - ۱۱ - جولائی

بیر الاشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا - پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شغدف کی آڑ میں لیٹا رہا - بیچارے حاجی شبراتی سارا کام کرتے رہے - پانی یہاں بھی نہایت اچھا تھا - اگرچہ غائر کی سی سردی نہ تھی - عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا - راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رکا رہا - میں شغدف سے اُترا نہیں مگر لیٹے لیٹے بدوؤں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رکا کھڑا ہے - کوئی معقول جواب تو ملا نہیں، لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا اُنھیں میں سے کسی نے روکا ہوگا - اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہوگیا کہ جاتے وقت معقول رقوم دی جا چکی ہیں، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا - راستہ میں رُکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی ہوپنچتے ہوپنچتے آفتاب نکل آیا تھا -

پنجشنبہ ۱۲ جولائی تا پنجشنبہ ۱۹ - جولائی

بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا، اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے - جاتے وقت گرمی بہت تھی - مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہوگئی ہے - ورنہ احرام بند ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی - طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزلوں پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شبراتی کیا کرتے - ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کر دی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کرتا تھا - شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی - راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مستورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی - دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر برساتی پانی جمع ہے وہیں سے مشکیزے بھر لاتے ہیں - اس پانی کی قیمت ضرور زائد تھی -

مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں اور دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی میں اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا - موسم بھی نسبتاً خوشگوار تھا، اور باوجودیکہ حاجی شبراتی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی - ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تقاضائے عمر بربنائے شرارت

سبب پریشانی بنجاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بیچارہ فوراً رفع شکایت کی کوشش کرتا - مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اس سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب ہیں - جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اُس سے کہا گیا، اور اگرچہ اُسکو اور اسکے لڑکے کو کپڑوں کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوائے ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا - اور جب اُسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعاً کوئی مطالبہ نہیں کیا - تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے - جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر حلم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا - اس تبدیلی کا باعث غالباً حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جاسکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فوراً گرفتاری ہوجاتی ہے -

آٹھویں منزل

۱۹- جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے۔ احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قوافل مدینہ منورہ سے واپس آئے اور شریف صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدوقبائل نے لے لیا ہے، تو اُنھوں نے اکثر حجاج کو بلا کر نصف رقم واپس دلا دی۔ میرے لیے بھی دو عدد مجیدیاں وصول کر لی گئی تھیں جو مشفقی میر عبدالعزیز صاحب سے مل گئیں۔

عبدالقادر مطوف کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آ گئے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ بجو صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہٗ خلف اصغر منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور بھی آ گئے ہیں۔ اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں۔ یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنے والے تھے، مگر بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور عید بعد وطن سے روانہ ہوئے۔ عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف و سعی سے فراغت کر کے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔

دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جا کر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی۔ بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا پھر عبدالستار عبدالجبار کی کوٹھی پر جا کر حاجی شبراتی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر جو وہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا۔ اور گھر آ کر اخبار ہمدم کے پرچے اور الناظر پڑھتا رہا۔ خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کر کے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر ادویہ لکھنؤ آ گئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبدالرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنکی معیت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی اور وہاں سے رباط بھوپال جا کر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے لایا تھا، اُنکو دیا۔ پھر بجو صاحبہ کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا، اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے۔ شام کو بازار جا کر مجیدیاں وغیرہ بھنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا۔

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پا گیا کہ ۲۲- جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا، تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کر سکیں۔

نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آجائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کرسکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھ کر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکۂ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے اسلیے اونٹ جابجا رکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتاً آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دو ڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریباً نصف مسافت شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چار دیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ جلدی جلدی شغدف اتار کر اور سامان رکھ کر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبۂ شریف کے رخ پر جو دو درجہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج نے یہیں قیام کرنا پسند کیا اور جابجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کاروان سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانمازیں بچھا کر نماز ادا کرلی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دورویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اُسوقت بازار زیادہ رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شبراتی، جو مکہ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے

برادر عزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی جسکی وجہ سے انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کرسکتے تھے، مکہ معظمہ سے میں نے انکو اپنے اونٹ پر بٹھا لیا تھا تاکہ انھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے بعض دوسرے حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

کیونکہ دیر میں ہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ بیگم صاحبہ وغیرہ کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہوگئی تھی اسلیے ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہو چکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں جاکر بیٹھ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہوگئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب ماہتی مجھے قافلہ حجاج یا منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور جب تک نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ ہونچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی سے تقریباً چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔ قریب ہی بازار بسا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خورد و نوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ جو مکۂ معظمہ میں ہے وہی منا اور عرفات میں بھی ہے۔ بلکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جاکر غسل بھی کیا۔

میر عبد العزیز صاحب کو مکۂ معظمہ ہی میں پیچش کی کچھ خلش ہوگئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اور زیادتی ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے۔ بازار میں جاکر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں آکے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی، اوسپر تیز لُو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔ نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ ادا کرکے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور یہیں اونٹ پر سوار ہوکر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لُو کی تاب لاسکیں وہ پہلے ہی سے جاکر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلے سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا ہوچکنے کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سالہ یوسف اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دینا اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع کردیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر ہونچ گئے۔ اور اُنکے ہونچتے ہی پہاڑی کے لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ یا امام سے قریب ہونے کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کرکے زمین پر جانماز بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے بھی خوب ذوق وشوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر آنے لگی مگر صورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات کے وسیع میدان میں جہاں صبح کو چاروں طرف خیمے، چھولداریاں اور شغدف نظر آرہے تھے اس وقت سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شغدفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے حی (چلو چلو) کا ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار روانگی کے لیے کہنا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع وخشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا جب جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ دیا کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا۔ اور اپنا آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہونچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شغدف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہو گا۔ اور راستہ اتنا وسیع وعریض ہے کہ چار چار پانچ پانچ قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ بمشکل راستہ میں کچھ سجھائی دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آگیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک ہی سمت میں یعنی مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چُنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت کر کے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھائی وغیرہ انور سلمہ کے لیے لیتا آیا۔ حاجی شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے۔ بازار سے واپسی میں اپنے مقام تک پہونچنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جانب شغدفوں کی قطاریں تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ اس لیے شغدفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہر قافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شغدفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک بار اپنے شغدفوں تک رسائی ہوگئی۔ شغدفوں کے آگے ہمنے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ انور سلمہٗ سو گئے تھے اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خرید کیا گیا تھا شغدف میں رکھکر میں بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اُٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ جمال آگئے اور جلدی جلدی شغدف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منا کی جانب روانہ ہوگئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد کے چلنے سے گرد بہت اُڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گرد و پیش کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دوکانوں کا سامان اُٹھ نہیں چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے تھے۔ بائیں جانب مگر ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں نہ جا سکنے کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منا پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک چبوترہ پر شریف صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے قیام تھا اب بھی ہمارے شغدف وہیں اُتارے گئے۔ سامان خورد و نوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شغدف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرۃ العقبیٰ کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کرکے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منا کے بازار کی سڑک کے درمیان میں دو جمرے ہیں اور مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں ایک جمرہ ہے جنکی صورت ایک بھدی لاٹھ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہوگی انکے گرد ذرا اونچی مُنڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چُنی تھیں انہی سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہوکر قربانی کے لیے مذبح کی جانب روانہ ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً چالیس راسیں خرید کر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڈھے اس غرض سے کھُدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں۔ مگر اسکی پابندی کم کی جاتی ہے
بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں
اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ جانور خرید کرکے وہیں ذبح کر دیتے ہیں اور
غریب عربوں کی کثیر تعداد جو وہاں موجود رہتی ہے اور ہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے، ذبح شدہ
جانور دیدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا
باقی کُل راسوں کو ذبح کرکے وہیں تقسیم کر دیا۔ جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن
مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ تین تین
چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خریدے
گئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی۔ نماز ظہر کے وقت وہیں پانی
لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی۔ جو عرب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد راسیں مانگ لیتے تھے،
اُنکے پاس عموماً چھُریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھُریوں سے جانور ذبح کیے گئے۔ بعض وقت یہ چھوکرے
کسی جانور کو پسند کرکے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے۔ اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو
دشواری پیش آتی تھی۔ کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ
جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے
کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا۔ اب کیا تھا وہ میرے ابھر گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے
کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دوں گا۔ میں نے ہر چند سمجھایا مگر نہ مانا۔ اور بالآخر ایک مسلح عرب
کو جو غالباً فوجی تھا بلا لایا۔ وہ مجھکو اپنے ہمراہ ایک راؤٹی میں لیگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی
اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے
کو کچھ بخشش دیدو۔ میں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہو چکا ہے اور اگر اب بھی
تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائگاں جائے، اُس لڑکے کو چونی دیکر اپنی جان چھڑائی۔

جن جانوروں کو بنوا کر گوشت ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں مذبح میں کی گئی اور
ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا۔ اُس نے صرف کھال اُتار کے آلائش نکال دی
اور جانور ہمارے حوالہ کر دیا۔ گوشت کے بنانے کی وہاں کسی کو فرصت نہیں اور دو دو تین تین روپے
دیے جاتے تو شاید بنا دیتا۔

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسر پولیس کے یہاں

چشتی ہوئی۔ مگر اب کی کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کرکے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راوٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر پہونچکر فوراً سر منڈایا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے۔ اتفاق سے اسی وقت شریف صاحب کی سواری مکہ معظمہ کی طرف جارہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جنکے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خستگی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کرکے حاجی برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہوکر باطمینان تمام طواف کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھانے یا قہوہ کی کھلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پاکر اس گھر میں آیا جو مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کرکے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد سے پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دنبہ جو ایک دن قبل ذبح کیا گیا تھا اسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی کی فکر شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرنا تھا میں نے ایک قربانی تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جاکر ایک عمدہ دنبہ مول لیا، قربانی کی اور گوشت بنواکر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے۔ اسی لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض ہیں وہ رمی کرکے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے اپنے

شغدفوں میں سوار ہوں - اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آگئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کردیے گئے - اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پہ ٹھہر جائیں - مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا - اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھاکر شغدف پہ سوار ہوگیا -

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج مکہ معظمہ واپس جارہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا - اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوسکے تھے مگر کہیں عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر انور سلمہٗ کو طواف وزیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا

●●

سہ ماہی مجلہ

فکر و نظر

جس میں

- علوم قرآن و حدیث • فقہ • کلام • تصوف • اسلامی تاریخ
- تعلیم و تدریس • فلسفہ، سائنس • ادبیات • معاشیات • عمرانیات
- سیاسیات • ثقافت و تمدن • قانون و اصول قانون

پر

اسلامی نقطۂ نظر سے مقالات شائع کیے جاتے ہیں

ادارۂ تحقیقات اسلامی

اسلام آباد (پاکستان)

سائنس اور مسلمان

○ مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

— شبیر احمد خاں غوری

○ تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

— ڈاکٹر فواد سیزگین

غوری صاحب کے مضامین خدابخش لائبریری کی
طرف سے کتابی شکل میں زیر اشاعت ہیں، ان میں سے
ایک جو 'معارف' بابت جون ۱۹۶۵ء سے لیا گیا ہے۔
پیش خدمت ہے۔

دوسرا مضمون فواد سیزگین کے فاضلانہ سلسلہ مضامین
کی ایک اور کڑی ہے جو 'فکر و نظر' اسلام آباد، بابت
جنوری تا مارچ ۱۹۹۱ء سے لیا گیا ہے
ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ـــــــــــ ادارہ

جناب شبیر احمد خاں غوری
علی گڑھ

مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

مسلمانوں میں علم ہیئت کا آغاز مسلمانوں میں نجوم و ہیئت کی باقاعدہ ابتدا دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) سے ہوئی، وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے منجمین کو تقرب بخشا، اس کا منجم خصوصی نوبخت تھا، نوبخت کے علاوہ دربار کے ہیئت دانوں میں دو اور مشہور شخص تھے: محمد بن ابراہیم الغزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان کے علاوہ ایک اور مشہور نجومی بھی تھا جس کا نام ماشاء اللہ تھا نوبخت اور ماشاء اللہ ہی نے بغداد کی بنیاد ڈالنے کی مہورت نکالی تھی بہ ۱۵۶ھ میں (اور البیرونی ۱۵۴ھ میں) ہندوستان کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر منصور کے دربار میں حاضر ہوا، جب اس کے حکم سے محمد بن ابراہیم الغزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں منتقل کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں "السندہند الکبیر" کے نام سے مشہور ہوا۔

منصور کے بعد مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا، اس نے بھی نجوم و ہیئت کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس کا منجم خصوصی تیوفیل بن توما الرہاوی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور پھر ہارون (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) خلیفہ ہوا، ہارون کا عہد برامکہ

کی علمی سرپرستیوں کے لیے مشہور ہے۔ انہی کے ایما سے سلمائے حرانی اور ابو سلمان نے بطلیموس کی کتاب المجسطی کا عربی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ شہر جندی سابور میں قائم ہوئی۔ اس کا متولی احمد النہاوندی تھا، جس نے اپنے فلکی مشاہدات کو "الزیج المشتمل" میں قلمبند کیا۔

ہارون کے بعد پہلے امین تخت نشین ہوا، مگر کچھ دن بعد چھوٹے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا اور اسی خانہ جنگی کے نتیجہ میں تخت و تاج کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مامون اور اس کے جانشین | امین کے بعد مامون (۱۹۸ھ - ۲۱۸ھ) سریر آرائے خلافت ہوا، وہ بالطبع عقلیت کا دلدادہ تھا، اور قیام خراسان کے زمانہ ہی میں فضل بن سہل کے زیر اثر نجوم اور جوتش کا معتقد رہ چکا تھا، اس نے یونانی علوم کے نشر و اشاعت پر خاص طور سے توجہ کی اور اس تحریک کو منظم طور سے چلانے کے لیے ہارون کے "خزانۃ الحکمۃ" کی "بیت الحکمۃ" کے نام سے تجدید کی، علم الہیئت کی ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد اور دمشق کے اندر رصدگاہیں قائم کرائیں، اس کی سرپرستی میں آلات رصدیہ میں قابل قدر اصلاح ہوئی اور ان کی مدد سے اس کے ہیئت دانوں نے آفتاب کے "میل کلی" (Eccentricity) خروج مرکز (Eccentricity) اور "نقطہ اوج" (Apogee) کو متعین کیا لیکن ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، اس سے پہلے صرف یونانی حکیم اراتوستھنیس نے شہر اسکندریہ میں تخمینی طور پر اس کا اندازہ لگایا تھا، لیکن مامون نے اصلاح شدہ آلات اور ماہرین ہیئت کی مدد سے اسے تحقیقی طور پر دریافت کرایا۔

عہد مامونی کے منجمین میں یحیی بن ابی منصور، خالد بن عبد الملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری اور سند بن علی زیادہ مشہور ہوئے، لیکن ان سے بھی زیادہ مشہور محمد بن موسی الخوارزمی (بانی علم الجبر و المقابلہ) ہے، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کے "السند ہند الکبیر" کو مختصر کر کے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

کی مدد سے اس ہیئتی نظام کی بنیاد ڈالی جو "السند ہند" کہلاتا ہے اور مسلم علم الہیئت کی اصل سمجھا جاتا ہے۔ اس نئے نظام میں اس نے "اوساط کواکب" کے باب میں سدھانت" کا تقدیلات کے باب میں "زیج شہریار" کا اور "میل آفتاب" کے باب میں "المجسطی" کا اتباع کیا اور عرصہ تک لوگ خوارزمی ہی کی زیج پر اعتماد کرتے تھے۔

مامون کے بعد معتصم (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) پھر واثق اور اس کے بعد متوکل (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) خلیفہ ہوئے۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حبش الحاسب، الکندی اور بنو موسیٰ ہیں۔

حبش الحاسب اجرام فلکی کی گردش کے حساب میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ "الزیج الممتحن" کا مصنف ہے۔ اس کے علاوہ اس نے "زیج السند ہند" کی بھی اصلاح کی اور "جدول الدقائق" کے نام سے ایک "مثلثاتی جدول" بھی مرتب کی تھی، جس میں "اوتار" (Chords) کے بجائے "جیوب" (Sines) پر عمل کیا ہے۔

الکندی دنیا کے بارہ عبقریوں میں سے ایک ہے، اس نے ریاضی و ہیئت پر سو کے قریب کتابیں لکھیں اور "متوسطات" (وہ کتابیں جو اصول اقلیدس اور المجسطی کے درمیان پڑھائی جاتی ہیں) میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، اس کی ایک نجی رصد گاہ بھی تھی، جہاں وہ اجرام فلکی اور مظاہر جو کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ۲۲۲ھ کے اس قسم کے ایک مشاہدے کو اس نے ایک مستقل رسالہ میں قلمبند کیا تھا، کندی عام حکما کے برخلاف عناصر کو تین مانتا تھا، اور آگ کے بطور عنصر ہونے کا منکر تھا۔

بنو موسیٰ نے سامرا میں ایک رصد گاہ قائم کی تھی جو رصد گاہ مامونی کے بعد اسلامی تاریخ کی دوسری مشہور رصد گاہ ہے، وہاں انھوں نے آفتاب کے "میل کلی" کے علاوہ سال شمسی کی مدت کو بھی دریافت کیا تھا اور اسی دریافت کی بنیاد پر کتاب "سنۃ الشمس" لکھی تھی۔ عام عام ہیئت دانوں کے برخلاف بنو موسیٰ نو کے بجائے آٹھ آسمان مانتے تھے۔

متوکل کو اس کے بیٹے منتصر کے ایما سے ترکوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد خلفاء کا عزل و نصب ترکوں کے ہاتھ میں آ گیا، مگر جب ۲۵۶ھ میں معتمد خلیفہ ہوا، تو اس کے بھائی الموفق نے بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا۔ معتمد کی وفات پر اس کا بھتیجا معتضد (۲۷۹ھ۔۲۸۹ھ) خلیفہ ہوا اس نے اپنے حسن تدبیر سے خلافت کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھال لیا۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں ثابت بن قرۃ الحرانی، ابو معشر البلخی، النیریزی اور البتانی ہیں۔

ثابت بن قرہ نے "المجسطی" کا از سر نو ترجمہ کیا اور بعض مقالات کی شروح لکھیں۔ اس نے فلکیاتی مشاہدات پر بھی کئی کتابیں لکھیں، اور تاؤن الاسکندرانی سے جو کوتاہیاں ہوئی تھیں، ان کی اصلاح کی۔ (Trepidation) کا مفروضہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے "علم المثلثات الکرویہ" پر "کتاب فی الشکل الملقب بالقطاع" لکھی جو اس موضوع کی امہات کتب میں محسوب ہوتی ہے۔

ابو معشر البلخی نجوم میں الکندی کا شاگرد تھا۔ وہ اس فن میں متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ اس نے ایران اور ہندوستان کے نجومی لٹریچر سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ وہ قدیم نجوم کی تاریخ کا مستند ماہر سمجھا جاتا ہے،

ابو العباس النیریزی نے "المجسطی" کی شرح کے علاوہ "السندہند" کے انداز پر بھی ایک زیج مرتب کی تھی، اس کے علاوہ ایک اور زیج (زیج معتضدی) معتضد باللہ کے نام پر معنون کی بھی جو البیرونی کے زمانہ تک۔۔ اپنے فن کی معتمد علیہ تصنیف محسوب ہوتی تھی۔ اس نے علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھیں۔

البتانی کا دنیا کے منتخب روزگار ہیئت والوں میں شمار ہوتا ہے، قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے کہ میں تاریخ اسلام میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ارصاد کواکب کی تصحیح اور انکی حرکات کے امتحان میں اس کے مرتبہ کو پہنچا ہو، البتانی نے ۲۶۴ھ سے ۳۰۶ھ تک مشاہدات

کیے۔ رویت ہلال میل کلی، مدت سال، اختلافات قمری، کسوف وخسوف اور اختلاف المناظر کے حسابات کو اس نے بعد کے ہیئت دانوں سے زیادہ صحت ودقت نظر سے بیان کیا ہے۔ البتانی نے "اوتار" کے بجائے "جیوب" کو استعمال کیا اور مثلثاتی نسبتوں کو مقبول بنایا۔

اس عہد کے دیگر مشاہیر ماہرین علم ہیئت میں محمد بن علی نیشاپوری، الماہانی، محمد بن احمد ابن یوسف السمرقندی، سلیمان بن عصمہ اور ابو حنیفہ الدینوری قابل ذکر ہیں۔

محمد بن علی نیشاپوری کی مشہور رصدگاہ کا متولی تھا، جسے طاہری خاندان کے امیر طاہر بن عبداللہ نے قائم کرایا تھا۔ ابن یونس نے اس رصدگاہ کی ایک دریافت کا حوالہ دیا ہے: یہ ۲۳۶ھ میں "استوار خریفی" کے وقت کا تعین تھا، جو ۲۸ ربیع الاول کو دوپہر کے وقت واقع ہوا تھا۔

الماہانی ہندسہ کے ساتھ ہیئت میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ ابن یونس نے اس کے فلکی مشاہدات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے ۲۳۹ھ سے ۲۵۲ھ ہجری تک کیے تھے۔

محمد بن احمد بن یوسف السمرقندی رصدگاہ سمرقند کا متولی تھا، جہاں حسب تصریح ابن یونس اس نے ۲۵۱ھ میں "وسط شمس" کی تحقیق کی تھی۔

سلیمان بن عصمہ بلخ کی رصدگاہ کا متولی تھا، جہاں اس نے ۱۱۵۶ سکندرومی (مطابق ۲۵۲ھ) میں فلکی مشاہدات کرکے ان کو "زیج النیرین" میں مدون کیا تھا۔ اس نے علم المثلثات میں "مساحۃ ذوات الزامی" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، اور ایک رسالہ (اس نے یا شاید ابو جعفر الخازن نے) ان مسائل پر بھی تحریر کیا تھا، جو "حل تعدیلات" میں کام آتے ہیں۔

ابو حنیفہ الدینوری: اپنے عہد کا بڑا فاضل تھا۔ ادب، مذہبیات، حساب اور ہندسہ وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ وہ عربوں کے دیسی علم النجوم کا ماہر خصوصی تھا اور اس موضوع پر اس کی کتاب "الانواء" بقول عبدالرحمن الصوفی بڑی مستند سمجھی جاتی تھی۔ اس کی رصدگاہ اصفہان میں تھی، جہاں اگلی صدی میں عبدالرحمن الصوفی نے بویہی وزیر ابن العمید کی معیت میں اسے دیکھا تھا۔

معتضد باللہ کے جانشینوں کے زمانہ میں حکومت کا ضعف و اختلال بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ ۳۳۴ھ میں عراق میں آل بویہ کا اقتدار قائم ہوگیا، اور خلفاء کی حیثیت محض وظیفہ خواروں کی سی رہ گئی۔

لیکن اس عہد زوال میں ایک مشہور ہیئت داں خاندان کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے، یہ خاندان بنو اماجور کا تھا، جنھوں نے ۲۴۰ھ سے ۳۲۱ھ تک فلکیاتی مشاہدات کیے تھے، اور انھیں اپنی زیج میں قلمبند کیا، جس کا نام "بدیع" تھا۔

قرامطہ اور نجوم و ہیئت کی ترقی — خلافت کے ضعف و اختلال میں سب سے زیادہ حصہ قرمطی یا باطنی تحریک نے لیا، جس نے نصف صدی تک پوری اسلامی دنیا میں اپنے ظلم و ستم اور قتل و غارت سے تہلکہ ڈالدیا تھا، بایں ہمہ اس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کو عموماً اور نجوم و ہیئت کو خصوصاً غیر معمولی ترقی ہوئی، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باطنیت ایک خفیہ تحریک تھی، جو اسلام کی بیخ کنی اور ایرانی سلطنت کے بحال کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، مگر اس میں اور بھی اسلام کے مخالف عناصر مثلاً یہود، صابئہ حران، اور فلاسفہ بھی شامل ہوگئے تھے، اس لیے شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، اس طرح ان کی آئیڈیالوجی فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہوتی رہی، چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبداللہ بن میمون القداح، محمد بن الحسین زیدان، حمدان قرمط اور ابوسعید الجنابی وغیرہم فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے۔

لیکن نجوم و ہیئت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف کا سبب یہ افواہیں تھیں کہ ستاروں کی پیشین گوئی کے مطابق اب (تیسری صدی ہجری کے خاتمہ پر) مسلمانوں کا دین اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والے ہیں، اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت اور مجوسی مذہب بحال ہوں گے۔

مجوسیت پسند نجومیوں نے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتایا تھا، اور یہی وہ وقت ہے جب معتضد کے نالائق جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم

توڑ رہی تھی، اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بےچینی سے انتظار کیا جا رہا تھا، پہلے محمد بن الحسین زیدان کو اپنے متعلق مغالطہ رہا کہ وہ اس انقلاب کو بروئے کار لائے گا، اس کے مرنے پر ابو سعید الجنابی اس خوش فہمی کا شکار ہوا، مگر ۱۵۰۰ سالہ زردشتی گزر بھی گیا اور پیشین گوئی نہ پوری ہونا تھی نہ پوری ہوئی۔

ان پیہم مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے، یا تو احکام نجوم کی اصابت سے یقین اٹھ جائے، یا ان مسلسل تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے، چنانچہ ایران کی نجوم پرست طبیعت نے اسے نجومی حساب کی غلطی ہی پر محمول کیا، اور ہیئتی مشاہدات و حسابات میں صحت اور دقتِ نظر کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ اور اسی احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی علم ہیئت کا عہد زرین بنا دیا۔

اسلامی ہیئت کا عہد زرین چوتھی صدی

چوتھی صدی کے سیاسی انتشار نے ایک بغداد کے متعدد "بغداد" بنا دیے تھے، اور ہر "بغداد" نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں سرگرم کار تھا:

۱۔ سامانیہ خراسان (۲۵۹ھ۔ ۳۸۹ھ) اس دربار کے مشاہیر فضلائے ریاضی و ہیئت میں ابو جعفر الخازن اور محمد بن عبد العزیز الہاشمی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابو جعفر الخازن (زمانہ قریب ۳۴۲ھ) "الزیج الصفائح" کا مصنف تھا، جو علم ہیئت کی مشہور اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی، اس نے "المجسطی" کی شرح بھی لکھی تھی، اور علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھی، ممکن ہے حل تعدیلات پر بھی رسالہ لکھا ہو۔

محمد بن عبد العزیز الہاشمی نے "زیج خوارزمی کی تعلیل" لکھی تھی۔

۲۔ بویہیہ فارس۔ آل بویہ تین بھائی تھے، بڑا بھائی عماد الدولہ فارس میں تھا، اس نے مرتے وقت (۳۳۸ھ) اپنے بھتیجے عضد الدولہ کو اپنا جانشین بنایا، عضد الدولہ ۳۶۶ھ میں باپ کی وفات کے بعد بغداد پر بھی قابض ہو گیا، جہاں ۳۷۲ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔ وہ نجوم میں عبد الرحمٰن الصوفی اور ابن الاعلم کا شاگرد تھا۔ اس کے دربار کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

کوشیار بن لبان: "زیج بالغ" "زیج جامع" اور "مجمل الاصول" کا مصنف ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مشکل منفی کو اس نام سے موسوم کیا۔

احمد بن عبد الجلیل السجزی۔ مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جو بطلیموس کے ارض مرکزی نظریہ کے بالمقابل گردش ارضی کا قائل ہوا۔ اسی اصول پر اس نے اپنا "اصطرلاب زورقی" بنایا تھا۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس نے شکل قطاع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔

شریف ابن الاعلم: عضد الدولہ کا منجم خصوصی تھا، وہ اسی کے کہنے کے مطابق کام کرتا تھا اس کی زیج ابن القفطی (بلکہ قاضی زادہ رومی شارح چغمینی) کے زمانہ تک اس فن کا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔

عبد الرحمن الصوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) "صور الکواکب" کا مصنف ہے، جو آج بھی علم الثوابت کی مہمات کتب میں شمار ہوتی ہے۔

۳۔ بویہیہ بغداد۔ عضد الدولہ کے بعد پہلے اس کا بیٹا صمصام الدولہ اور پھر دوسرا شرف الدولہ تخت نشین ہوئے، شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب سبعہ کی سیر وگردش کا مشاہدہ کرنے کے لیے رصد گاہ مامونی کے انداز پر بغداد میں ایک اور رصد گاہ بنوائی۔ رصد بندی کا کام ختم ہونے پر دو محضر تیار کرائے گئے جن پر ہیئت دانوں کے علاوہ اعیان دربار نے بھی دستخط ثبت کیے تھے۔ مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی: شرف الدولہ کی رصد گاہ کا منتظم اعلیٰ تھا علم ہیئت کے علاوہ وہ آلات رصدیہ کی تیاری سے بھی واقف تھا،

ابو حامد الصاغانی: شرف الدولہ کی رصد گاہ میں جو آلات استعمال کیے گئے تھے ان میں سے اکثر ابو حامد صاغانی ہی کے بنائے ہوئے تھے، اس نے ربع مشرقی کی مدت دریافت کر کے اس کا ثبوت دیا تھا کہ اوج شمس متحرک رہتا ہے۔

ابو الوفا البوزجانی (المتوفی ۳۸۸ھ) علم ہیئت میں دنیا کے مشاہیر فضلاء میں

شمار ہوتا ہے۔ قمر کے "اختلاف ثالث" کی دریافت جس کا شرف ٹیکو براہے کو دیا جاتا ہے، درحقیقت ابوالوفا ہی کا کارنامہ ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ متفقہ طور پر "شکل ظلی" کا موجد ہے۔ اور شاید "شکل مغنی" (Sine Theorem) بھی اسی کی دریافت ہے۔

۴- بویہیہ رے: رے کا پہلا بویہی تاجدار رکن الدولہ تھا۔ اس کے بیٹے اس کے جیتے جی خانہ جنگی ہوتی رہی تا آنکہ عضد الدولہ کی وفات پر فخر الدولہ یہاں کا بادشاہ ہوا۔ ہیئت و نجوم کی سرپرستی میں رے کا دربار بھی دوسرے درباروں سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے مشہور ہیئت داں یہ ہیں:

ابن العمید: پہلے بویہی تاجدار رکن الدولہ کا وزیر تھا۔ مختلف علوم کے ساتھ علم الہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا۔ حسب تصریح البیرونی اس نے "آفتاب کا میل کلی" دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔

ابو محمود الجندی: فخر الدولہ کے دربار کا سب سے مشہور ہیئت دان تھا۔ اس نے "سدس فخری" نام کا ایک Sextant بنا کر فخر الدولہ کے نام پر معنون کیا تھا۔ علم المثلثات الکروۃ کے سلسلے میں اس نے امیر ابو نصر بن عراق کی کوششوں سے واقف ہوئے بغیر "شکل مغنی" کو دریافت کیا تھا، اور اس کا نام "قانون الہیۃ" رکھا تھا۔

۵- بویہیہ اصفہان: فخر الدولہ کی بیوی سیدہ نے اصفہان کی حکومت اپنے ماموں زاد بھائی ابو جعفر کاکویہ کو دیدی تھی، جو بڑا متعصب شعوبی تھا۔ اس میلان کی بنا پر شیخ بو علی سینا جو اسمٰعیلی تحریک کا خاموش مگر سرگرم کارکن تھا، اس کے دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شیخ بو علی سینا فلسفہ اور طب کے علاوہ ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، کتاب الشفا کے جزء ہیئت میں "اختلاف منظر" کی بحث میں اس نے دس شکلوں کا اضافہ کیا اور آخر فن میں ایسی چیزیں بڑھائیں جن کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ علاء الدولہ کے ایماء سے اس نے اپنے شاگرد ابو عبیدہ جوزجانی کے زیر اہتمام ایک رصدگاہ بھی قائم کی

جس کے ذریعہ بہت سے نئے انکشافات کیے، مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصد گاہ جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھی، اس لیے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اس نے طول البلد دریافت کرنے کا ایک طریقہ بھی معلوم کیا تھا۔

۶۔ شاہانِ خوارزم: اس وقت خوارزم کے دو حصے تھے، مشرقی حصہ میں قدیم شاہی خاندان جو اس زمانہ میں آل عراق کہلاتا تھا، حکمراں تھا۔ مغربی حصہ کے حکمراں مامون کہلاتے تھے، مگر بعد میں وہ لوگ مشرقی حصہ پر بھی قابض ہو گئے اور یہاں کے فضلا جرجانیہ (مغربی خوارزم) ہی میں چلے گئے۔ ان میں دو فاضل بہت زیادہ مشہور ہیں:

امیر ابونصر بن عراق، آل عراق کا شاہزادہ تھا۔ وہ مہندسین و منجمین اسلام میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابونصر بن عراق البیرونی کا استاد تھا جس کے لیے اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اس کا مشہور کارنامہ "اکرمانالاؤس" کی اصلاح ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس کا سب سے درخشاں دریافت "شکل مغنی" ہے، جو عہد حاضر میں Sine Theorem کہلاتی ہے۔ ہیئت میں اس نے "المجسطی الشاہی" تصنیف کی تھی اور ابو جعفر الخازن کی "زیج الصفائح" کی تصحیح بھی لکھی تھی۔

ابوریحان البیرونی: مسلمان ہیئت دانوں میں جو شہرت البیرونی کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی دوسرے کو ہوئی ہو۔ "کتاب الہند" کے علاوہ جو نویں دسویں صدی مسیحی کے ہندوستان کی مذہبی و معاشرتی اور علمی و فکری تاریخ کا واحد ماخذ ہے، وہ "قانون مسعودی" اور "کتاب التفہیم" کا بھی مصنف ہے، ان کے علاوہ بھی اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ البیرونی کی "قانون مسعودی" اسلامی علم الہیئت کا نمایندہ شاہکار ہے۔

البیرونی جوانی میں عبد الجلیل السجزی کے اصطرلاب سے متاثر ہو کر گردش ارضی کے نظریہ کی جانب میلان رکھتا تھا، مگر بعد میں اپنے استاد ابونصر بن عراق کے رسالہ "فی القسی الفلکیہ" کو پڑھ کر پھر ارض مرکزی نظریہ کی جانب رجوع کر لیا، جیسا کہ "قانون مسعودی" سے ظاہر ہوتا ہے۔

البیرونی ہی نے ہندوستان کی تاریخ میں سائنٹفک علم الہیئت کا آغاز کیا، اس نے

یہاں کے بہت سے شہروں کا طول البلد اور عرض البلد دریافت کیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم محیط ارضی کی پیمائش ہے، جو سرزمین ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا اور دنیا میں تیسرا تجربہ تھا، (دوسرا تجربہ مامون الرشید نے کرایا تھا)

۷۔ اسمٰعیلیۂ مصر: مصر کے اسماعیلی خلفاء بالطبع فلسفہ وحکمت بالخصوص نجوم وہیئت کے دلدادہ تھے، چنانچہ العزیز باللہ کے ایماء سے ابن یونس نے فلکیاتی مشاہدات کرنا شروع کئے، اور اس کے بیٹے الحاکم بامر اللہ کے عہد میں انھیں ختم کر کے "الزیج الکبیر الحاکمی" کے نام سے مدون کیا جو دنیا کی مشہور ترین زیجوں میں سے ہے۔

اسی زمانہ میں مصر کا دوسرا مشہور ہیئت داں ابن الہیثم تھا۔ اس نے ہیئت اور اعمال رصد پر بھی متعدد کتابیں لکھیں مگر وہ علم المناظرہ کے لیے زیادہ مشہور ہے۔

۸۔ اندلس بھی علم وحکمت اور نجوم وہیئت کی سرپرستی میں پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کے فضلائے ہیئت میں سب سے جلیل القدر مسلمہ بن احمد المرجیطی تھا، جو بقول قاضی صاعد اندلسی اپنے وقت میں اندلس کے ریاضی دانوں کا امام اور فلکیات میں سرآمد فضلائے روزگار تھا۔ اس نے البتانی کی زیج کے ابواب متعلقہ تعدیل کواکب کا اختصار کیا تھا، اور خوارزمی کی زیج کو از سر نو مرتب کیا تھا، اور بجائے فارسی تاریخ کے عربی تاریخیں استعمال کی تھیں، اس کے شاگردوں میں ابن السمح اور ابن الصفار مشہور تھے، یہ دونوں سدھانت (السند ہند) کے پیرو تھے۔

۹۔ لیکن نجوم وہیئت کے اس عہد زریں میں صرف ایک دربار اس علم کی سرپرستی سے خالی ملتا ہے، وہ محمود غزنوی کا دربار ہے، حالانکہ بقول ابن الاثیر وہ علماء وفضلاء کو گھیر گھیر کر اپنے دربار میں لاتا تھا، اس کی وجہ اس کا سیاسی حزم واحتیاط تھا: نجوم وہیئت کے ساتھ اعتناء قرامطہ کا مخصوص شعار تھا، جن کی تخریبی سرگرمیوں سے پورا عالم اسلام لرزہ براندام تھا، محمود بھی ان سے غافل نہ تھا۔ اس لیے وہ کس طرح ان گہواروں کی سرپرستی کر سکتا تھا جو قرمطی تخریب پسندوں کے مرکز تھے، محمود کی اسی قرامطہ بیزاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کو اس کی امید کے مطابق شاہنامہ

کا صلہ نہیں دیا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے البیرونی کو صحیح پیشین گوئی کرنے پر کوٹھے سے نیچے پھنکوا دیا۔ لیکن انکی وفات پر اس کے بیٹے مسعود نے اس فن کی سرپرستی کی۔ چنانچہ البیرونی نے "قانون مسعودی" مسعود ہی کے نام پر معنون کی ہے۔

پانچویں صدی۔ عہد سلاجقہ | مسعودی کے آخری زمانہ میں سلاجقہ اس کے علی الرغم خراسان پر قابض ہو گئے۔

۴۴۷ھ میں انھوں نے بغداد پر بھی قبضہ کر لیا اور بویہی خاندان کو ختم کر کے خود امیرالامراء بن گئے۔ مگر سلجوقیوں کو نہ تو ایرانیوں کی احیائیت پسندی (Revivalism) سے ہمدردی تھی اور نہ وہ اتنے متمدن تھے کہ علم الہیت کی سرپرستی کرتے۔ بایںہمہ انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر انھیں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا کرنا پڑا۔

یہ ضرورت خراج کی ادائیگی کے وقت تعین کی تھی، معتضد باللہ عباسی نے تیسری صدی کے آخر میں نوروز کی اصلاح کی تھی، جسے دو سو سال ہو رہے تھے۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے ۴۶۷ھ میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے وزیر نظام الملک کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس میں ملک مشاہیر ہیئت داں جمع ہوئے۔ مثلاً عمر خیام (جو بقول زکریا قزوینی اس رصدگاہ کا متولی تھا) ابوالمظفر اسفزاری، میمون بن نجیب الواسطی، ابوالعباس اللوکری، محمد بن احمد المعموری وغیرہم۔ اس رصدگاہ کا سب سے بڑا کام نوروز کا تعین تھا، جو ۱۰ رمضان ۴۷۱ھ میں کو واقع ہوا۔ اس کے علاوہ تقویم شمسی کی بھی اصلاح کی گئی اور اسی کی بنیاد پر ہندوستان میں عہد اکبری میں خراجی سال کا تعین کیا گیا۔

رصدگاہ ملک شاہی بقول ابن الاثیر ۴۸۵ھ میں ختم ہو گئی مگر ابھی عمر خیام اور ابوالمظفر اسفزاری وغیرہ زندہ تھے، ان کے فیض تربیت سے دوسرے لوگوں نے ہیئت و فلکیات کے کام کو بعد میں جاری رکھا۔ ان میں دو شخص زیادہ مشہور ہیں۔

عبدالرحمن الخازن: جو ماسکونیات کی مشہور کتاب "میزان الحکمۃ" کا مصنف ہے علم ہیئت میں اس نے "زیج سنجری" تصنیف کی تھی۔

بہاء الدین ابو محمد خرقی: حسب تصریح بیہقی، اس نے علم ہیئت میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں "التبصرہ" زیادہ مشہور ہے۔

ساتویں صدی ہجری۔ یورش تاتار | ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا انتہائی پُر آشوب دور ہے۔ اس زمانہ میں تاتاریوں نے تنہا قصرِ خلافت ہی کو منہدم نہیں کیا، بلکہ علم و حکمت کے اس چراغ کو بھی بجھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو چھ سو سال سے جنوبی مغربی ایشیا میں روشن تھا۔

مگر اس ثقافت بیزاری کے باوجود تاتاریوں کو نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اور انکے خاندان میں منگو قاآن اس فن کا بڑا شائق تھا۔ اسے رصدگاہ قائم کرنے کا بھی شوق تھا، چنانچہ اس نے جمال الدین محمد بن طاہر بن محمد الزاویدی کو بلا کر یہ کام سپرد کیا۔ مگر اس سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی، کچھ دن بعد خواجہ نصیر الدین طوسی کے فضل و کمال کی شہرت سنی، اس لیے جب اس نے ہلاکو کو الموت کی تسخیر کے لیے بھیجا تو اس سے خواہش کی کہ محقق طوسی کو رہا کرا کے دربار میں بھیجدے۔ مگر ہلاکو نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب ۶۵۶ھ میں ہلاکو تسخیر بغداد سے فارغ ہوا تو محقق طوسی نے اسے مراغہ (تبریز) میں رصدگاہ قائم کرنے کی ترغیب دی اس کام کے لیے فضلائے مہندسین و ماہرین ہیئت جیسے موید الدین عرضی، نجم الدین کاتبی فخر الدین مراغی، فخر الدین اخلاطی، محی الدین مغربی اور قطب الدین شیرازی وغیرہم بلائے گئے اور شہر مراغہ کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصدگاہ قائم ہوئی۔

رصدگاہ کا کام ۶۵۷ھ میں شروع ہوا، طوسی کے مشورے سے ہلاکو نے اس رصدگاہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ لیکن ابھی کام مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ ہلاکو نے وفات پائی۔ (۶۶۳ھ)۔ اس کے بعد بھی کام جاری رہا تا آنکہ ۶۷۲ھ میں محقق طوسی نے بھی وفات پائی۔

مگروہ زیچ (زیچ ایلخانی) کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کرچکا تھا۔ زیچ ایلخانی کے علاوہ اس نے "المجسطی" کو بھی "تحریر المجسطی" کے نام سے ایڈیٹ کیا۔ اور بھی کتابیں ہیئت میں لکھیں جن میں "تذکرہ" "رسالہ معینیہ" اور "بست باب" زیادہ مشہور ہیں۔

محقق طوسی کے رفقائے کار میں سب سے بڑے ماہر فن ان کے شاگرد قطب الدین شیرازی تھے، وہ بھی اس فن میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں، "نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" اور "تحفۂ شاہیہ"۔

اگلی دو صدیوں میں کوئی بڑا ہیئت داں پیدا نہیں ہوا، اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا باقی رہا، مگر یہ "تحریر المجسطی" اور "تذکرہ" کے شرح و تحشیہ تک محدود تھا۔ ان میں نظام الدین اعرج کی شرح مشہور ہے، البتہ اسی زمانہ میں محمود بن عمر الجغمینی نے "الملخص فی الہیئۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا، جس کی شرح قاضی زادہ رومی نے کی، بعد میں یہ "شرح جغمینی" ہیئت کی درسی کتاب کی حیثیت سے عرصہ تک ہندوستان و ایران کے اندر متداول رہی۔

نویں صدی۔ رصدگاہ سمرقند

تاتاریوں کی طرح تیموری مغلوں کو بھی نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ تیمور (المتوفی ۸۰۷ھ) کا درباری منجم عبداللہ بن مولانا لسان الدین تھا، شاہرخ کے دربار میں استاد قوام الدین معمار نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، لیکن بذات خاص اس علم سے دلچسپی شاہرخ کے بیٹے الغ بیگ (۷۹۶ھ۔۸۵۳ھ) کو تھی، اس نے اپنے زمانہ شہزادگی ہی میں ۸۲۳ھ میں سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس رصدگاہ کا پہلا متولی اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو مقرر کیا، ان کی وفات پر قاضی زادہ رومی کو اسکی تولیت سپرد ہوئی، اور ان کے انتقال پر رصدگاہ کا انتظام بادشاہ نے اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشجی کے سپرد کیا،

رصدگاہ سمرقند کے مشاہدات کو "زیچ جدید سلطانی" (زیچ الغ بیگ) میں مدون کیا گیا۔

غیاث الدین جمشید کاشی نے لکھا ہے کہ "خسوفات قمر کو ہم نے خود رصد کیا ہے، اور انہی مشاہدات کی بنا پر قمر کے اوساط و تعدیلات کی تصحیح کی ہے، باقی کواکب کے باب میں ہم نے محقق طوسی کی "زیج ایلخانی" پر اعتماد کیا ہے، جمشید کاشی نے "زیج جدید" کے علاوہ اصطرلاب پر بھی ایک رسالہ "طبق المناطق" لکھا، جس کی بعد میں "نزاہۃ الحدائق" کے نام سے شرح کی۔

قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" کا ذکر اوپر آچکا ہے جو اس صدی کے ثلث اول تک ہمارے مدارس کے نصاب میں مشمول تھی۔

مولانا قوشچی نے رصدگاہ الغ بیگ کی تولیت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ "اشکال قمریہ" پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا، اور فن ہیئت میں ایک رسالہ بعنوان "رسالہ فتحیہ" لکھا، جو ہمارے ملک میں عرصہ تک "رسالہ قوشجیہ" کے نام سے داخل درس رہا ہے۔ اکثر علما نے اس پر شروح لکھیں جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی کی شرح مشہور ہے۔

عہد آخر | عجم میں الغ بیگ کے بعد کسی بادشاہ نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کی اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں پیدا ہوا، صرف درسی طور پر ہیئت کا رواج رہا، یا بعض علما نے پچھلی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ان شراح میں عبد العلی برجندی کا نام خاص طور سے مشہور ہے، انھوں نے "تحریر المجسطی"، "تذکرہ" اور "زیج الغ بیگ" کی شروح لکھیں۔ ان کے علاوہ "آلات رصدیہ" پر بھی ایک مبسوط رسالہ لکھا۔

گیارہویں صدی کے علمائے ایران میں شیخ بہاء الدین عاملی کا نام مشہور ہے، وہ ایک شیعی عالم تھے اور ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہیئت میں ایک مختصر رسالہ "تشریح الافلاک" کے عنوان سے لکھا، یہ رسالہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ بعد میں اسکے ساتھ ہندوستان میں خاصہ اعتنا کیا گیا۔

عجم میں تو ہیئت و فلکیات کی ترقی بند ہو گئی مگر ہندوستان میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک بڑی شان سے جاری رہی لیکن اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔

••

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
RECENT PUBLICATIONS

Collected Works of Prof. S. H. Askari	10·00
Amir Khusrau : as a Historian (Second Volume of Prof S. H. Askari's collected works)	25·00
Islam & Muslims in Medieval Bihar (Third volume of Prof. S. H. Askari's collected works)	25·00
Medieval Bihar —Sultanate and Mughal Period (Fourth Volume of Prof. S. H. Askari's collected works).	25·00
An Overview of Sufi Literature in the Sultanate Period : by Dr. Bruce B. Lawrence	10·00
Maktub and Malfuz Literature, as a Source of Socio-Political History : by Prof. S. H. Askari	10·00
The Hindu-Muslim Syndrome; Islam & the Modern World (Problems & Prospects) : by Badr-ud-Din Tyabji	10·00
Islamic Studies : by Dr. Md. Zubayr Siddiqi	10·00
Muslim Thought in a Changing World : by Prof. S. Vahiduddin.	10·00
The Middle East : by Prof. Asaf Ali Asghar Fyzee	10·00
Interfaith Dialogue : by Dr. A. Roest Crollius S. J	5·00
Islam and Indian Culture : by Mr. B. N. Pande	15·00
An Introduction to the Khuda Bakhsh Oriental Public Library : by V.C. Scott O'connor	10·00
Khuda Bakhsh (Biography) : by Mr. S. Khuda Bakhsh & Sir Jadunath Sarkar	10·00
Mughal Art of Miniature Painting, at its Climax : Reproduction of a few Paintings of Akbar's period (from Tarikh-i-Khandan-i-Timurya)	15·00
India's Rich and Valuable Contribution to Persian Literature : by Prof. S.A.H. Abidi	10.00
Tolerance, Democracy & Economics in Islam : by Prof. Jamal Khwaja	20·00
Reconstruction of Islamic Chronology : by Dr. Hashim Amir Ali	10·00
Book Publishing in India : by Mr. Abul Hasan	10·00
Malfuz Literature as a Source of Political, Social & Cultural History Gujarat & Rajasthan in 15th Century : by Dr. Z.A. Desai	15·00
क़ौमी एकता की परम्पराएं : विशम्भर नाथ पाण्डे	5·00
औरंगज़ेब एक नई दृष्टि : ओम प्रकाश प्रसाद	15·00
राष्ट्रीय आन्दोलन और मौलाना आज़ाद : अजय अनुपम	60·00
आरा के मुग़लकालीन कवि दिलदार के दोहे	10·00
18वीं शताब्दी के हिन्दुस्तानी मुहावरों का एक दुर्लभ कोष : तपिश देहलवी	10·00
मोती लाल नेहरू का यु० पी० कांग्रेस में उद्घाटन भाषण 1907	15·00
मौलाना अबुल कलाम आज़ाद की याद में :	15·00

ڈاکٹر فواد سیزگین

ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

غالباً نادرست نہ ہو گا اگر ہم کہیں کہ تاریخ طب تاریخ علوم کا سب سے پرانا شعبہ ہے۔ چونکہ قدماء اور متأخرین سب یہ بات کہتے چلے آئے ہیں لہذا یہ ایک امر معروف ہے۔ تاہم تاریخ طب کی محض قدامت اس مفروضے کی صحت کی ضامن نہیں کہ تاریخ علوم میں یہ شعبہ صحت و انصاف کے بھی قریب تر رہا ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس کی قدامت ، حقیقت سے اور بھی انحراف نیز اس

شعبے میں پیدا ہونے والی غلطیوں کوتاھیوں اور تعصّبات کی تصحیح میں مشکلات کا باعث بنی ہے۔

تین اصول ایسے ھیں جو آغاز ھی سے تاریخ طب کو بنیادی رنگ فراھم کرتے چلے آ رھے ھیں اور ان کے اثرات ھم آج تک محسوس کرتے ھیں وہ یہ ھیں :

۱ ۔ دریافت میں اوّلیت کا اصول جسے یونانیوں نے πρωτής εὐρετής . کا نام دیا

۲ ۔ غلط تاریخ ، خواہ سہواً ھو یا ازروئے تعصّب۔

۳ ۔ اسلاف سے نادرست احکام اخذ کرنا اور پھر اُن کی تکرار۔

پہلی صدی عیسوی میں یونانیوں کے ھاں آغاز سے ، نیز یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے اواخر تک، تاریخ طب کا یہی حال رھا ہے۔

علم طب کو تمام اقوام کی مشترک میراث تصور کرتے ھوئے اس کے ارتقاء سے متعلق اوّلین حقیقت پسندانہ اور بے لاگ موقف ساتویں صدی ھجری کے ابن ابی اصیبعہ کی ,,کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء ،، کی صورت میں ملتا ہے کہ اسی نے طب کے ماضی کا بنی نوع انسان کی عمومی تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا اور وضاحت سے کہا کہ طب وہ میراث ہے جو کل بنی آدم کی مطلوب و مقصود ہے اور ھر قوم کا اس میں حصہ ہے۔ (۱)

طب کی عمومی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا اس میراث میں جو حصہ طے کیا گیا ہے اسے قرین صواب و انصاف تصور نہیں کیا جا سکتا آج کی گفتگو میں اس سے زیادہ کچھ ممکن نہ ھو گا کہ ماضی میں مسلمانوں نے علم طب کے میدان میں جس قدر رسائی حاصل کی اس میں سے چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس

سے ایک تاثر ضرور مل سکے گا کہ مسلمانوں نے جس طرح دیگر سب علوم میں اپنا کردار ادا کیا اسی طرح اس میدان میں بھی ان کا کردار اہم رہا ۔

اس خطبے میں میری کوشش یہ ہو گی کہ پہلے ان کے بنیادی کام سامنے لاؤں اور پھر ان کے انجام دیئے ہوئے عمومی کاموں کی مثالیں پیش کروں جن کی فروع بہت وسیع ہیں ۔

مسلمانوں نے جب دیگر اقوام کے طبّی سرمایۂ علمی کو اخذ کرنا شروع کیا تو ابتدائی طور پر یہ صرف دو شعبوں تک محدود تھا : دوا سازی اور وہ عملی طب جو بحیرہ روم کے طاس کی حدود میں مہذب حلقوں میں رائج تھی کیونکہ اسلام کی آمد سے قبل نظری طب عمومی طور پر اپنا مقام کھو چکی تھی خصوصاً لاطینیوں کے ہاں۔ اور یہ نتیجہ تھا عوامی اور اساطیری طب کے غالب آ جانے کا ۔

اس اعتبار سے ہمیں نظری طب کے احیاء کو قرون وسطیٰ کی تاریخ طب کا سب سے اہم مظہر تصور کرنا ہو گا ۔ کیونکہ نظری طب کا احیاء ۔ جو ایک طرف جالینوس کی کتابوں میں اور دوسری طرف بقراطی طریق علاج کو اپنانے کی صورت میں (جس کی اساس اس امر پر تھی کہ مریض کے بستر کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کیا جائے) ، نقطۂ عروج کو پہنچا ۔ میری رائے میں بذات خود ، تاریخ طب میں مسلمانوں کے لئے ایک باعزت مقام کے اعتراف کے لئے کافی تھاخواہ ان کا کام صرف اسی [احیـاء کے] مظہر تک محدود ہوتا ۔ تاہم منصۂ تاریخ پر جلوہ گر ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی قوم کے ہاں ایسے مظہر کا وجود ہی یہ بشارت دینے کے لئے کافی ہے کہ اگر وہ قوم فوری طور پر بعض تاریخی حوادث کا شکار نہ ہو گئی تو اس میدان میں اور بہت سے اہم نتائج بھی ظاہر ہو کر رہیں

گے - میں سمجھتا ہوں کہ اس میدان کی اہم ترین کامیابی جسے مسلمانوں کے حق میں ریکارڈ پر آنا چاہئیے یہ ہے کہ وہ طب کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی شناخت کر سکے اور بہت جلد انہوں نے دونوں کے درمیان توازن کا ایک عنصر مقرر کر لیا اور پھر اس اصول کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا -

اس ضمن میں دوسری صدی ہجری کے اواخر کے ایک عرب طبیب کا یہ قول لائق توجّہ ہے :

,, دوا اسی وقت ممکن ہے جب مرض کو سمجھ لیا جائے - مرض کی نشاندھی وہ اولین سبب مطلوب ہے ، جس کے حصول سے منتہائے مقصود یعنی شفائے امراض کا حصول ممکن ہوتا ہے اور یہی فن طب کی غرض ، غایت ہے - اگرچہ طب ان فنون میں سے ہے جو علم کے ساتھ ساتھ عملی پہلو پر بھی مشتمل ہے - اور جب کوئی فن ان دونوں پہلوؤں - یعنی علمی و عملی پہلو - پر مشتمل ہو تو لازم ہے کہ علمی پہلو عملی پہلو پر مقدّم ہو کیونکہ علم کے بغیر عمل ممکن نہیں ،، (۲)

یہ اہم اصول جو صرف طب تک محدود نہیں بلکہ دیگر علوم کو بھی محیط ہے تسلسل کے ساتھ نشوونما پاتا رہا اور ,,نظریہ اور تجربہ ،، کی ارتقاء پذیر اصطلاحات کے تحت علم طب کا ایک اساسی رکن بن گیا - (۳)

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عرب اطباء ، اھل یونان کے سعادت مند شاگردوں سے زیادہ کچھ نہ تھے نیز یہ کہ یونانی اطبا کے رسوخ سے آزاد ہونا یا ان پر تنقید کی جسارت کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا -

اس طرح کا حکم جو بار بار لگایا جاتا ہے نہ صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا جو تحریری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس کا تتبع نہیں کیا گیا بلکہ ایک اہم اصول سے ناواقفیت کا بھی پتہ دیتا ہے جو تاریخ علوم میں بحثیت عمومی مسلمان اور عرب علماء کی وساطت سے متعارف ہوا۔ یہ تنقید میں اخلاقی رویے کا اصول ہے۔ مراد یہ ہے کہ ارتقائے علوم کا واضح تصور رکھنے کے سبب وہ لوگ تنقید میں انصاف، راست بازی اور احتیاط کے پابند رہے۔

رہا تنقید کا وہ پہلو جو قدماء کی فروگزاشتوں کی تصحیح سے عبارت ہے سو وہ مسلمان علماء کے ہاں، مختلف میدانوں میں، دوسری صدی ہجری ہی سے نظر آتا ہے۔ یہاں میں طب کے میدان میں بعض مثالوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک مثال وہ [تبصرہ] ہے جو دواؤں کی قوتوں کے سلسلے میں جالینوس کی مقرر کردہ ترتیب سے متعلق جابر بن حیان کے ہاں ملتا ہے۔

چنانچہ جابر نے کہا ہے کہ جالینوس کے ہاں دواؤں کی قوتوں کی ترتیب نامعتبر ہے۔ کیونکہ اس نے فقط حس پر بھروسہ کیا ہے جبکہ کیفیت غالبہ یا کمترین قوت کی تعیین محض احساس کے ذریعے ممکن نہیں۔ خواہ تمام اعضائے حس اس سلسلے میں یکجا ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ دواؤں کی قوتوں اور اثرات کو دقیق ریاضیاتی سطح پر ضبط میں لانا ضروری ہے۔ (۴) مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں جالینوس اور دیگر علماء پر جابر بن حیان کی تنقید (۵) بعض اوقات ایسی شدت بھی اختیار کر جاتی ہے جس سے متأخرین نے پرہیز کیا۔ جابر کے بعض اقوال یہ ہیں:

"اور جالینوس نے اس سلسلے میں سخت غلطی کی ہے"

"یہ سخت اور زبردست ناواقفیت کی بات ہے جیسا کہ

جالینوس نے اپنی کتاب ,,منافع الاعضاء ،، میں بیان کیا ہے ،،

,,جالینوس نے مسئلہ نفس پر ایسی ہی رائے کا اطلاق کیا ہے۔ وہ التباس و تخلیط کا شکار ہے اور نہیں سمجھ سکا کہ اس سلسلے میں کیا کہا جائے ۔ ،،

,,جالینوس نے اس مقام پر وہ غلطی کی ہے جو ضرب المثل بن گئی ہے ،، (٦)

تقریباً ایک صدی بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اسلوب تنقید نے ایک کامل ، پختہ اور معتدل صورت اختیار کر لی ہے اور مسلمانوں نے متعدد ایسی کتابیں تالیف کر لی ہیں جن کا عنوان ہی فلاں یا فلاں پر ,,شکوک،، ہے ۔ مثلاً الرازی کی ,,کتاب الشکوک ،، میں ہم جالینوس کے متعلق اس کا موقف دیکھ سکتے ہیں ۔ رازی طب کو ایک فلسفیانہ علم کی حیثیت دیتا ہے جس میں ۔ بالخصوص اساتذہ کی جانب سے ۔ محض اٹکل سے ٹامک ٹوئیاں مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اخلاقی و فلسفیانہ آداب کا تقاضا یہ ہے کہ اساتذہ کے احترام کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات پر شک کا موقف بھی اختیار کیا جائے ۔ رازی ارسطو سے منسوب اُس قول سے استشہاد بھی کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں افلاطون اور حقیقت دونوں عزیز ہیں لیکن جہاں دونوں میں اختلاف پایا جائے وہاں حقیقت ہمیں عزیز تر ہے۔ رازی کہتا ہے کہ جہاں تک جالینوس کی غلطیوں کا تعلق ہے ، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض بے احتیاطی یا بھول چوک یا ظن و تخمین کے سبب سے ہوں ۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں قانون ارتقائے علوم کے باعث قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ اور جو شخص کسی نئی شے کا اضافہ کر سکتا ہے وہی اسلاف کی علمی رسائی سے مکمل واقفیت رکھتا ہے ۔ (٧) اس سلسلے میں بہترین بات علی بن العبّاس

المجوسی نے اپنی کتاب ,,کامل الصناعة،، کے مقدمه میں کہی ہے جو اس کے ہاں قانون ارتقاء کے واضح تصور نیز ان توقعات سے متعلق ایک تاثر مہیا کرتی ہے جو اساتذہ سے وابستہ کی جانی چاہئیں ۔ وہ بقراط اور جالینوس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بقراط کی کتابیں ابہام کی حد تک مختصر ہیں اور جالینوس کی کتابوں میں اس کے برعکس طول کلام اور بہت زیادہ تکرار ہے ۔ بعد کے یونانیوں مثلاً اریباسیوس [Oribasius/Oriebasius] اور باولس [Paulus](8) کی کتب میں بہت کچھ نقص و خلل ملتا ہے ۔ رہیں رازی کی کتابیں جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب تھا وہ بھی اپنی کتاب ,,الحاوی،، میں تکرار سے دامن نہیں بچا سکا ۔ یہ کتاب بحیثیت مجموعی عملی طب سے متعلق ہے اور جمع و تالیف سے عبارت ہے جس میں بسا اوقات ربط کا فقدان ہے ۔ الغرض علی بن العباس کی رائے میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ملتی جسے کامل کہہ سکیں اور اپنے دور تک اسے کہیں مناسب علمی طریق کار نظر نہیں آیا ۔

ان کے ہاں (۹) عمل ارتقاء کے شعور ، علم طب پر ان کے مسلسل کام ، اور اس کام میں صدیوں تک اطباء کی ایک بڑی تعداد کی شرکت کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے کئی بار علم طب کا تعارف پیش کیا ، اس کے مختلف شعبوں کی درجہ بندی کی اور ایسی حوالے کی کتابیں تالیف کیں جو اسلاف کی کتب سے بہتر تھیں ۔ یہاں ان قدرتی نتائج کی طرف بھی ایک اشارہ مناسب ہو گا جو انہوں نے اس میدان میں حاصل کئے مثلاً مکمل اور باقاعدہ شفاخانوں نیز فن دوا سازی کی تنظیمات کی تشکیل و ترویج جن کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہوں گا ۔ اس وقت میں مسلمان اور عرب اطباء کے چند ایسے کارنامے پیش کرنا چاہوں گا جو تحقیق سے ثابت ہو چکے ہیں ۔

دوسری اقوام کے ہاں جو کچھ علم طب موجود تھا اسے اخذ کرنے کا عمل مسلمانوں کے ہاں پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا ۔ ان کے اولین ترجمے طب عملی اور دواسازی سے متعلق تھے ۔ دوسری صدی ہجری کے اواسط میں انہوں نے اہم طبی کتب مثلاً بقراط اور جالینوس وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا ۔ عرب اطباء کی کتابوں کے مطالعے نیز دیگر مآخذ کی معلومات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ دیگر اقوام کے علم طب سے اخذ و اکتساب کا عمل تیسری صدی ہجری کے وسط تک مکمل ہو چکا تھا ۔ اب ہمارے لئے یہ جاننا ممکن نہیں کہ اس دور میں عرب اطباء کو کس حد تک یہ احساس تھا کہ وہ اپنے یونانی اساتذہ کے بعد طب نظری میں کوئی نئی چیز پیش کرنے پر قادر ہیں ۔ غالباً اس زمانے میں اس میدان میں ان کی تمام تر کوششیں قدماء کی کتابوں کی ترتیب و تلخیص ، تنظیم اور انہیں بہتر انداز میں پیش کرنے تک محدود تھیں ۔ حنین بن اسحاق کی کتابیں اس عمل کی بہترین مثال تصور کی جاتی ہیں ۔

آج نظری طب کے میدان میں مسلمانوں کے جو اہم ترین اور واضح ترین اضافے ہمارے علم میں ہیں ، جن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اطباء تازہ کار اور تعمیری کردار رکھنے والے تھے ، وہ آنکھوں کے علاج سے متعلق ہیں ۔

اس میدان میں دو تصورات جن کی بڑی اہمیت ہے ابوبکر رازی (وفات تقریباً ۳۰۰ ہجری) کے ہاں ملتے ہیں ۔ رازی پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی نسبت سے سکڑتی اور پھیلتی ہے ۔ اس سے بھی اہم اس کی یہ دریافت تھی کہ دیکھنے کا عمل کسی شعاع کے آنکھ سے نکل کر دیکھی جانے والی چیز کی طرف جانے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اصل

صورت حال اس کے عین برعکس ہے کیونکہ شعاع اس چیز سے آنکھ کی طرف آتی ہے۔ یہاں وہ اقلیدس [Euclid] کو رد کر رہا ہے (۱۰) طب کے میدان میں بصارت کے مسئلے پر آخری تصحیح جس میں جالینوس کے خیالات کو رد کیا گیا ، ابن سینا کے ہاں سامنے آئی ۔ تاہم وہ شخص جس نے بصارت کی ان جدید توضیحات کا فیزیائی سطح پر ثبوت فراہم کیا ، پانچویں صدی ھجری کے اوائل میں ، ابن الھیثم تھا۔

بینائی کے مسئلے کو سلجھانے کے ضمن میں مسلمانوں کے ہاں اس کے بعد جو پیش رفت ہوئی وہ بہت دور رس تھی ۔ خصوصاً ساتویں صدی ھجری میں کمال الدین الفارسی کے ہاں کیونکہ یہ شخص بینائی کے مسائل حل کرتے ہوئے بعض ایسے نتائج تک پہنچ گیا جن تک رسائی کہیں انیسویں صدی عیسوی میں آ کر ہوئی ہے۔

تاریخ طب پر بعض کام کرنے والے جو حقیقی تاریخی ادراک سے محروم ہیں ، تاریخ پر روایتی زاویہ نگاہ سے حکم لگاتے ہوئے ، عربوں کو یونانیوں کی تقلید کا الزام دیتے ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ عرب اطباء نے چار اخلاط پر قائم پیتھالوجی کے اصول کو برقرار رکھا ۔ یعنی سودا صفرا ، بلغم ، خون کی ہم آہنگی اور امتزاج ۔ یہ درست ہے کہ عرب اطباء نے یہ بقراطی نظام اخذ کیا اور اس پر قائم رہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئیے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان اطباء نے بہت سے امراض کی خصوصی توجیہات تک رسائی حاصل کر لی تو عملاً اس نظام کی اہمیت ختم ہو گئی ۔ یہاں میں اس کے شواھد کے طور پر چند حقائق پیش کرتا ہوں۔ ابو الحسن الطبری نے چوتھی صدی ھجری میں یہ دریافت کیا کہ خارش کا سبب خارش کا کیڑا ہوتا ہے۔ رازی چھوت سے لگنے والے فحمی بخار :،،ایرانی بخار،، (؟) سے واقف تھا اور اس نے اس ،،دود مدنی ،، (؟) کی مکمل طور

پر نشان دھی کی ہے جو جلد کی داخلی بافت پر قابض ہو جاتا ہے (۱۱)
ابن سینا کا قول تھا کہ مقامی سرطان ، جملہ اعضاء پر مسلط ہونے والے عام سرطان کا پتہ دیتا ہے۔ اس کی رائے تھی کہ تپ دق متعدی مرض ہے اور ممکن ہے کہ سورج کی شعاعیں تپ دق کے مریض کے لئے نقصان دہ ہوں۔ سوزش دماغ کے ضمن میں اس کا خاص نظریہ نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ وہ پوری صحت و وضاحت کے ساتھ سوزش دماغ کو سمجھتا ہے نیز اس میں اور دیگر سوزشوں میں فرق کرتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ابوالقاسم الزہراوی کے ہاں ہمیں دموی امراض کا ایک مفصّل بیان ملتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جوڑوں کی سوزش اور ریڑھ کی ہڈی کی دق پر بھی توجّہ دیتا ہے۔

آئندہ صدی یعنی پانچویں صدی ہجری میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالملک ابن زہر وضاحت کے ساتھ ان اورام سے واقفیت رکھتا ہے جو سینے کو تقسیم کرنے والے پردے (۱۲) کو لاحق ہوتے ہیں اسی طرح غلاف قلب کے اورام [Pericarditis] (۱۳) سے بھی اسے واقفیت ہے۔ ابن زہر پہلا طبیب تھا جس نے غذا کی نالی [Gullet] کے مفلوج ہو جانے کی صورت میں سانس کی نالی کو کھولنے نیز غذا کی نالی یا مبرز [Rectum] کی راہ سے مصنوعی طور پر غذا رسانی کی تجویز پیش کی۔ وہ بہت سے اور امراض کی بھی بڑی وضاحت سے نشان دھی کرتا ہے جن میں معدے کا سرطان بھی شامل ہے۔ (۱۴)

شاید پیتھالوجی یعنی علم اسباب الامراض میں سب سے اعلی مرحلہ جس تک عربوں نے رسائی حاصل کی چھوت کا قانون دریافت کرنے کا مرحلہ تھا۔ اس ضمن میں لسان الدین ابن الخطیب (المتوفی ۷۷٦ھ) اپنی کتاب ,,مقنعة السائل عن المرض الهائل،، (۱۵) میں کہتا ہے :

,,سو اگر کہا جائے کہ ہم چھوت کے دعوے کو کیونکر تسلیم کر لیں جبکہ شرع میں اس کی نفی آئی ہے تو ہم کہیں گے کہ چھوت کا وجود تجربہ ، استقراء ، حِس ، مشاہدہ اور مسلسل اطلاعات سے ثابت ہے اور ان سب پر اس دلیل کی بنیاد ہے۔ جو کوئی اس مسئلے پر غور کرتا ہے یا اسے اس کا ادراک حاصل ہے اس سے مخفی نہیں رہتا کہ جو بھی اس مرض کے مریض سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے اکثر و بیشتر ہلاک ہو جاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ بچ جاتا ہے اسی طرح کسی کپڑے یا برتن کے سبب سے پورے گھر یا محلے میں مرض پھیل جاتا ہے حتی کہ کان کی بالی جس نے پہن لی اس نے اسے ختم کر دیا اور پورے گھر کا صفایا کر دیا اِسی طرح یہ کہ مرض کسی سہر کے ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اکا دکا ملنے جلنے والوں اور پھر ان کے پڑوسیوں میں پھیل جاتا ہے ... (۱٦)

ایسا ھی تاثر اس کے معاصر احمد بن علی بن خاتمہ نے قائم کیا۔ ابن الخطیب اس بات سے بھی واقف تھا کہ چھوت کے اثر نیز اس کی تیزی کا درجہ جسم انسانی کے احوال پر منحصر ہے۔

غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ چھوت کے اس قانون کی دریافت مسلمانوں کے ھاں عملاً اس یونانی پیتھالوجی کے مکمل زوال سے عبارت تھی جس کا انحصار تصور اخلاط پر تھا۔ K. Sudhoff نے یورپ میں وباء و طاعون کے مظاھر پر تحقیق کر کے جب یہ وضاحت کی کہ چھوت کا تصور یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے پھیلنا شروع ہوا تو بیسویں صدی کے اوائل سے مورّخین علمِ طب چھوت کے قانون کی دریافت کو تاریخ طب کا ایک اھم مرحلہ تصور کرنے لگے۔ یہاں اس بات پر حیرت نہ کرنی چاھیئے کہ تاریخ طب کا ایک

مؤرخ (۱۷) ۱۹۲۴ء میں اس موضوع کو پیش کرتے ہوئے اس بات سے کیونکر ناواقف ہے کہ مستشرق M. Müller نے ابن الخطیب کی کتاب کا ترجمہ کر کے ۱۸٦۳ ء میں شائع کر دیا تھا۔ نیز یہ کہ یوروپین اطباء نے بلاشبہ یہ تصور اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا جیسا کہ اور بہت سے افکار اور معلومات کا حال ہے۔

اگر ہم چند الفاظ میں مسلمان اور عرب اطباء کے ہاں تشریح الاعضاء کے موضوع کا جائزہ لینا چاہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس غلط رائے کا ذکر کرنا ہو گا جس کی رو سے اسلام نے انسانی بدن کی چیر پھاڑ کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور اس میدان میں مسلمان علماء نے جو کچھ پیش کیا وہ دیگر اقوام کے پیش رؤوں سے ماخوذ تھا ، خود انھوں نے اس سلسلے میں کوئی نئی چیز پیش نہیں کی ۔ کئی ایک محققوں نے اس پُرانے موقف کا جو علم طب کے اکثر مورخین کے ہاں ملتا ہے ، جواب دیا ہے اور علم التشریح پر رازی ، علی بن العباس المجوسی ، اور ابن سینا وغیرہ کی تحریروں کی طرف بطور خاص اشارہ کیا ہے۔

معاصر محققین میں سے H. Shipperges کو ھی لیجئے ، اس نے ابوبکر رازی کی کتاب ,,الطب المنصوری ،، کو علم التشریح پر اوّلین مکمل کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا کئی بار ترجمہ ھوا اور کئی شرحیں لکھی گئیں اس کتاب کے بعد علی بن العبّاس المجوسی کی کتاب ,,کامل الصناعة ،، سامنے آتی ہے۔ اس میں علم التشریح پر سینتیس باب ھیں جن کی پیشکش انتہائی منظم و مرتب ہے۔ یہ کتاب حسن ترتیب نیز موضوع کے دائرے کی وسعت میں رازی کی کتاب پر فوقیت رکھتی ہے۔ علم التشریح پر علی بن العباس کی اس پیشکش سے قبل ابن سینا کی کتاب ,,القانون ،، میں بھی اس موضوع

پر کچھ مواد ملتا ہے سابق کی یہ سب کوششیں وہ بنیاد تصور کی جاتی ھیں جس پر ابن النفیس نے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا ۔ کیونکہ وہ ,,القانون ،، کی شرح کرتے ہوئے کمال کو پہنچا اور دوران خون صغیر [Lesser Circulation of Blood.] دریافت کر کے اس نے چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ۔

وہ سارا قصہ تو یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ دمشق میں طویل اقامت کے بعد اطالوی عالم Andreas Alpagus ابن النفیس کی شرح کو پاڈوا [Padua] لے گیا اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ھسپانیہ کے Michel Servetus نے اسی ترجمے پر انحصار کیا اور شہرت حاصل کی ۔ اس کی ,,دریافت ،، اسی مواد تک محدود تھی جو اسے ابن النفیس کی کتاب میں ملا ۔ موجودہ صدی کے ربع اول کے اختتام سے لے کر ربع ثالث تک صورت حال یہی رھی ۔

عبداللطیف البغدادی کو لیجئے جس کی وفات ۶۲۹ ھجری میں ہوئی اور جس کا زمانہ ابن النفیس سے تقریباً نصف صدی پہلے کا ہے ۔ اس نے قاھرہ کے نواح میں استخوانی ڈھانچوں پر تحقیق میں شہرت پائی ۔

یہ حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی کہ جالینوس اور دیگر اطبا کا نچلے انسانی جبڑے کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دو ٹکڑوں سے عبارت ہے ۔ یہ جبڑا ایک ھی ھڈی پر مشتمل ہے جس میں کوئی جوڑ نہیں ۔ عبداللطیف بغدادی نے وضاحت کی ہے کہ اس نے حقیقت حال کا ثبوت فراھم کرنے کے لئے تقریباً دو ہزار کھوپڑیوں کا معائنہ کیا ۔ اسی طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ کلائی کی اگلی ھڈی ایک ھی ٹکڑے سے عبارت ہے اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ جالینوس نے خیال ظاھر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جو دلائل ھم نے اپنے خاص اور

ذاتی ذرائع سے حاصل کئے ہیں وہ مشہور قدماء کے اقوال پر انحصار کرنے سے زیادہ شرح صدر کا باعث ہیں۔

فطری سی بات تھی کہ علم التشریح میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام، علم جراحت [Surgery] پر بھی ان کے عبور کی راہ ہموار کرتا۔ اس شعبے میں بھی یونانی اطباء کی معلومات نیز ان کے ہاں مستعمل آلات کی تفصیل ان تک پہنچی۔ لیکن مسلمان جرّاح و طبیب اس میدان میں طریق کار، عملی تجربے، نیز آلات کی تعداد، اقسام اور ترقی کے اعتبار سے اپنے اساتذہ پر سبقت لے گئے۔ ابو القاسم الزہراوی جس کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا ہے اپنے زمانے تک علم جراحت کے بلند ترین مرحلۂ ارتقاء کی نمائندگی کرتا ہے، اگرچہ عمومی اعتبار سے وہ اس میدان میں مسلمانوں کے نقطۂ عروج کا نمائندہ نہیں تیس ابواب پر مشتمل اس کی کتاب ,,التصریف" کا تقریباً نصف حصہ جراحت سے مخصوص تھا۔ یہ کتاب بارھویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی اور اس کا وہ حصہ جو جراحت سے خاص تھا وسعت پا کر ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر گیا۔ اسی لاطینی ترجمے کی بنیاد پر عصر حاضر میں تاریخ طب کے لئے یہ معلوم کرنا ممکن ہو سکا کہ چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں طب کس اعلی سطح تک پہنچ چکی تھی۔

تاریخ طب نے الزہراوی کی کتاب کے جو امتیازات قرار دیئے ہیں میں انہیں شمار نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہی کہنے پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض اہم جراحی عمل جو بعض بڑے ڈاکٹروں سے منسوب کئے جاتے ہیں، زہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک، بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا عمل ہے جس میں سولھویں صدی کے فرانسیسی جرّاح [Ambroise Pare] نے

شہرت پائی - اسی طرح فن تولید [Obstetrics] میں وہ طریقہ جو جرمن طبیب Walcher (المتوفی ۱۹۳۵ء) سے منسوب ہے اور ,,وضع والھر،، Walcher Position کہلاتا ہے - یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ وہ زخموں کی سلائی کے مختلف طریقوں سے واقف تھا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو طریقہ Freiedrich Trendelenburg (المتوفی ۱۹۲۴ء) کی نسبت سے ,,ٹرنڈلنبرگی،، کہلاتا ہے وہ بھی ابوالقاسم الزّہراوی کے ہاں معروف تھا -

یورپ کا پہلا نمایاں جرّاح جو یورپ میں زہراوی اور دیگر جرّاحوں کے پیرو کی حیثیت سے سامنے آیا اور وہاں عربی فن جراحت کو فروغ دیا ، Guy de Chauliac ہے جس کی وفات ۱۳۶۳ ع میں ہوئی۔ یہاں میں خود پر لازم سمجھتا ہوں کہ مختصراً جراحت چشم کے میدان میں مسلمان اور عرب اطباء کے مقام کی طرف اشارہ کروں کیونکہ ہمیں اکثر تاریخ طب میں ایک ایسی رائے سے سابقہ پڑتا ہے جو سراسر غلط ہے - اور وہ یہ کہ عرب اطباء صرف جراحت چشم میں ترقی یافتہ تھے - یہاں، غلط ہونے سے میری مراد بحیثیت مجموعی علم الجراحت میں عرب اطباء کے مقام کا اعتراف نہ کرنا ہے -

جراحت چشم میں عرب اطباء کی مہارت نے جو شہرت پائی اس کا حقیقی سبب اس شعبے کی خوش نصیبی تھی کہ اسے Julius Hirschberg جیسا زبردست عالم میسر آ گیا جس کا شمار طب چشم کے مشہور ترین مورخین میں ہوتا ہے اور جس کو عربی/اسلامی طب کے اس شعبے کا مطالعہ گہرائی اور انصاف کے ساتھ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی - پھر اس نے اس کا اہل یونان کی معلومات نیز آخری چند صدیوں میں طب کی اس شاخ کی کیفیت سے ٹھوس موازنہ کیا -

Hirschberg نے جو اهم تحقیقات پیش کیں ان کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہ ہو گا۔ اسی پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض ایسی معلومات کی طرف اشارہ کرتا چلوں جن تک چوتھی صدی هجری کے عمّار الموصلی نے رسائی پائی۔ Hirschberg کا کہنا ہے کہ : ,,عمّار کی کتاب میں جو پہلو سب سے زیادہ قابل داد ہے وہ اس کے چھ مختصر بیانات هیں جو بڑے مکمل اور زندگی سے بھر پور انداز میں دیئے گئے هیں اور اس کے خاص جراحی تجربوں سے متعلق هیں۔ یہ بہت بڑی حد تک جدید قاری کی دل چسپی کا باعث بنتے هیں۔ یونانی ورثے میں همیں اس سے مشابہ کوئی شے قطعاً نہیں ملتی۔ بعد کی صدیوں میں ایسے دل نشین بیانات جو کمال اهتمام اور باریکی کے ساتھ عمل جراحی کا بیان فراهم کریں ، انیسویں صدی کی ابتداء سے قبل کہیں نہیں ملتے ،، (۱۸) Hirschberg اس موقع پر ذکر کرتا ہے کہ عمّار الموصلی همیں ایسے عمل هائے حراجی کا بیان فراهم کرتا ہے جو اس نے مختلف علاقوں میں انجام دیئے اور ان علاقوں میں امراض چشم کی کیفیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ Hirschberg ، عمّار کے ان کارناموں کا ذکر جغرافیہ کتا راکتیہ (۱۹) (Star — Geographic) مرتّب کرنے کی کوشش کے دوران کرتا ہے۔

,,اهم ترین چیز جو همیں عمّار الموصلی کے هاں ملتی ہے وہ دھات کی بنی ہوئی اُس کی ایک خود ساختہ ، اندر سے خالی ، سوئی کے ذریعے چوس پھینکنے کے طریقے سے موتیا بند کا مکمّل آپریشن ہے۔ اس کی کتاب میں ایک اور اهم بات ، بینائی کو محفوظ رکھتے ہوئے قزحیّۂ چشم [Iris] کو نکال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اهل یونان اور عمّار کے عرب پیش رو یہ آپریشن کر چکے تھے لیکن انہوں نے اسے خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا تھا ، بینائی کے لئے

نہیں " ۔ Hirschberg عمّار کی شخصیت کی مدّاحی میں کہتا ہے کہ "وہ ان اطباء میں سے ایک تھا جن کی مثال تاریخ میں بہت کم پیدا ہوتی ہے " ۔

اب تک میری کوشش یہ رہی ہے کہ بعض شعبوں میں ، عالم اسلام کی سنہری تاریخ میں ، علم طب کا جو معیار رہا ہے اس کی چند مثالیں پیش کروں حفظان صحت کے شعبے نیز طب ، ادویہ اور مریضوں کی غذاؤں سے متعلق تصانیف میں عرب اطباء کے ہاں جو معیار ملتا ہے ، اس کی طرف یہاں اشارہ نہیں کیا گیا ۔ تاہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ پیش رفت عمومی نوعیت کی تھی اور طب کے تمام شعبوں میں تھی ، یہ مزید عرض کر دوں کہ مسلمانوں کے ہاں علمی پیش رفت صرف طب تک یا علم کی کسی اور شاخ تک محدود بھی نہ تھی بلکہ قانون ارتقائے علوم — یعنی یہ کہ علم کا کسی ایک معیّن شعبے میں ترقی کرنا ممکن نہیں جب تک کہ علوم کے دیگر شعبوں کی ترقی اس کے پہلو بہ پہلو جاری نہ ہو — کے مطابق علوم کے تمام گوشوں پر محیط تھی ۔

یہی وہ علم طب ہے جو بیزنطہ [Byzantium]، اٹلی اور سسلی ، کی راہ سے نیز باہمی انسانی روابط کے ذریعے چوتھی صدی ھجری سے لاطینی دنیا میں پہنچنا شروع ہوا ۔ عربی کتابیں لاطینی دنیا میں ترجموں اور سرقوں کے ذریعے نیز بعض حالات میں مشاہیر اھل یونان سے منسوب ہو کر ، پھیل گئیں ۔ اس کی بہت سی مثالیں ملتی ھیں چنانچہ حنین بن اسحاق کی "کتاب العین " ، اسحاق بن عمران کی "کتاب المالینخولیا " اور ابن الجزار کی "کتاب الباہ " وہ کتابیں ھیں جو صدیوں تک یورپ میں جالینوس روفوس اور سکندر طرالیسی [Alexander of Tralles] کی تصانیف کی حیثیت سے متداول رہیں ۔

تاریخ کی نیرنگیوں میں سے ایک یہ ہے کہ الجزائر کے ایک عرب تاجر نے طب کی عربی کتب کو لاطینی دنیا میں منتقل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ۔ یہ معروف شخص جس کا نام قسطنطین الافریقی تھا ، اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ عیسائی تھا یا اپنے راہب دوستوں کی مدد سے ستّر کے قریب طبّی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کرنے کے بعد عیسائی ہو گیا ۔

یہ وسیلہ گویا طبّ جدید کا سر چشمہ تھا جو اہل یورپ کے لئے پھوٹ پڑا ۔ اس کام کی تکمیل اٹلی کی ایک خانقاہ میں ہوئی جہاں بہت سی کتابوں کو جو عرب اطباء کی تالیف تھیں اہل یونان سے یا خود قسطنطین سے منسوب کر دیا گیا ۔

یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخ طب کا یہ مرحلہ شاید سب مراحل سے بڑھ کر تصحیح کا محتاج ہے ۔ یعنی یہ کہ طب کا جو مرحلہ ، مرحلۂ احیاء کہلاتا ہے وہ عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے عمل کو یونانی کتب کا ترجمہ قرار دینے کے علاوہ بہت سے تاریخی حقائق سے انکار اور چشم پوشی کا بھی مرتکب ہوتا ہے ۔

اسی غلط تاریخ نویسی کی ایک مثال یہ ہے کہ مؤرخین طب تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی کی بعض شخصیات کو یورپ میں طب جدید کے اوّلین علمبردار خیال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں حالانکہ درحقیقت یہ لوگ اپنے عرب پیش روؤں کے مقابلے میں کوئی بھی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہے ۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ بس اتنا تھا کہ موٹی موٹی نئی کتابیں تالیف کر دیں جن کا مواد انہوں نے عربی کتابوں کے ترجموں سے نکالا تھا ۔

مستشرقین میں سے بعض محقّقین نے اس حقیقت کا بیان ایک اصولی قدم کے طور پر کر دیا ہے ۔ اب لازم ہے کہ عربی / اسلامی

تہذیب سے نسبت رکھنے والے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کریں۔ تاہم یہ کام ایک بلند علمی اور معروضی سطح پر انجام دیا جانا چاہئے جو تعصّب اور سرسری پن سے پاک ہو۔

حواشی

۱۔ EDITH HEISCHKEL, Die Geschichte der Medizingeschichtsschreibung, in: W. ARTELT, Einführung in die Medizinhistorik, Stuttgart 1949, 205.

۲۔ كتاب السموم لجابر بن حيان . ۱۹۵۸، فيسبادن . ۷۷/أ ـ ۷۷/ب ـ

۳ H. SCHIPPERGES, Die arabische Medizin als Praxis und als Theorie, in: Sudhoffs Archiv 43/1953/ 317-328.

۴۔ مراجع کے لئے دیکھئے:
F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, Leiden 1970, 214-215.

۵۔ جابر بن حیان : کتاب البحث . نسخہ جار الله . ۹۷/ب ـ

۶ P. KRAUS, Jabir b. Hayyan, Cairo 1943, II, 326-330.

۷ S. PINES, Razi critique de Galien, in: Actes du 7e Congres International d'Histoire des Sciences, Paris 1954, 480-487.

۸- "Paul of Aegina" مراد ہے (مترجم)

۹۔ یعنی مسلمانوں/عربوں کے ہاں (مترجم)

۱۰ F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums, III, Leiden 1970, 277.

۱۱۔ اصل عبارت یوں ہے ,,وكان الرازى يعرف الحُمّى الفحمية المعدية : الحمّى الفارسية و عرف الدود المدنى الذى تسلط على نسج الأدمة الدّاخلية تعريفا كاملا ،،۔ خاصی کوشش کے باوجود اس کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا ,,الحُمّى الفحمية ،، سے مراد غالباً Anthrax ہے (مترجم)

۱۲۔ غالباً Diaphragm مراد ہے (مترجم)

۱۳۔ اصل خطبے میں جرمن اصطلاح "Herzbeutelentzündung" دی گئی ہے (مترجم)

۱۴ G. COLIN, Avenzoar, sa Vie et ses Œuvres, Paris 1911 (Bull. de corr. afr. 44).

نیز اس کا مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (بزبان المانوی) میں ج ۲ ، ص ۹۵۸ ، اور ابن زهریر R. Arnaldez کا مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (بزبان انگریزی) میں ج ۳ ، ۹۷۸.

۱۵ - اسے M. MULLER نے Sitzungsberichte der königlich-bayerischen Akademie der Wissenschaften, München. 2/1863/1-34.

میں شائع کیا ۔

۱۶ - مرجع سابق ، ص ٦

وہ مزید کہتا ہے :

جو شخص چھوت کے دعوے کا اس بنیاد پر انکار کرتا ہے کہ مریضوں سے رابطہ رکھنے والے بہت سے لوگ باوجود یکہ بہت سے مریضوں سے ان کا قرب اور مستقل ساتھ رہا ، بچ گئے ، جبکہ کچھ اور لوگ جن کا مطلق رابطہ نہ تھا یا بہت کم رابطہ رہا ، ہلاک ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کو یہ معلوم نہیں کہ قدرت الٰہی کے تحت سلامتی یا ہلاکت کا سبب [مرض کی] استعداد کا ہونا یا نہ ہونا ہے ۔ چنانچہ لوگ اس سمّیت کی آگ کے قرب میں اُن بتیوں کے مانند ہوتے ہیں جو سرکنڈوں میں جلتی ہوئی آگ کے قریب لائی جاتی ہیں ۔ جس بتی کا جلنے تپنے اور دھواں دینے سے تازہ تعلق ہوتا ہے اسے فی الفور آگ لگ جاتی ہے اور یہ اس شخص کی مثال ہے جس میں استعداد مرض وافر ہے ۔ جو بتی خشک ہوتی ہے اور آگ سے اس کا ماضی قریب میں تعلق نہیں رہا ہوتا وہ پہلی بتی کی نسبت زیادہ وقت میں اثر قبول کر کے آگ پکڑتی ہے ، یہ اس شخص کی مثال ہے جس کے ہاں استعداد مرض کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اور جو بتی گیلی اور پانی کا اثر لئے ہوئے ہوتی ہے وہ بہت دیر میں جلتی ہے .... ۔

۱۷ P. DIEPGEN, Die Bedeutung des Mittelalters, in: Essays on the History of Medizine, London 1924, 108-112.

۱۸ - دیکھئے :

SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, 331.

۱۹ - ایضاً ، ص ۳۳۰

اردو ادب

○ اردو ادب کدھر؟
○ــــــــ پروفیسر وہاب اشرفی

خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے، کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد ــــــ یا اظہاری، اقدامی، کیا ہے، کون اس کی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ کا پروفیسر وہاب اشرفی کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

ــــــ ادارہ

پروفیسر وہاب اشرفی
صدر شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی، رانچی

اردو ادب کدھر؟

اردو ادب کدھر؟ میرے نزدیک اس سوال کے تین جواب ممکن ہیں۔ جمود کی طرف، زوال کی طرف، ارتقاء کی طرف۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ اردو ادب اپنی تمام صنفوں میں جامد و ساکت ہے، نئے خیالات، نئے تصورات، نئے تجربے اور نئی معنویت سے یکسر عاری ہے، تو پھر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوگا کہ اس کے مزاج میں تعطّل اور جمود کی کیفیت عیاں ہے۔ اگر اردو ادب زوال کی طرف مائل ہے تو اس کا یہ مفہوم ہوا کہ اس کی اکثر صنفیں نہ صرف یہ کہ اپنا معیار قائم نہ رکھ سکیں بلکہ ان سے متعلق فنکار ان کی رہی سہی ساکھ بھی اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ اس طرح کہ ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اردو ادب کی متعلقہ صنفیں یا ان صنفوں میں سے چند نہ صرف یہ کہ نئی اور تازہ بہ کار جہتوں سے آشنا ہو رہی ہیں بلکہ تخلیقی، فکری اور معنوی اعتبار سے ان کے اندر ایسی قوت پیدا ہو رہی ہے جو انھیں ارتقا کی منزلوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بحث کا ایک نکتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک صنف پامال ہو گئی ہے تو دوسری نت نئے کیف و کم کے ساتھ اُبھر رہی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک فنکار تو بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز ہے لیکن مجموعی طور پر دوسرے افراد صرف خوشہ چینی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر نہ فکری بلندی ہے نہ تخلیقی قوت، نہ تجربے کا میلان۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو ادب مجموعی طور پر مائل بہ ارتقا ہے۔ سوچ کی نئی لہریں اُبھر رہی ہیں۔ تخلیقی سرچشموں میں وسعت آ رہی ہے۔ تجربات اپنی متنوع شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس طرح کہ اردو ادب کی کئی صنفیں آفاقی حیثیت حاصل کرنے کی طرف راجع ہیں۔ میری یہ رائے کوئی Hypothesis پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ٹھوس دلائل دیے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے شعری روایات کو سامنے رکھا جائے۔ ہماری ممتاز صنف غزل کئی پہلوؤں سے اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ ترقی پسندوں نے غزل کو ایک نئی سمت ایک نیا 'Dimension' ضرور عطا کیا تھا۔ یہ وہ روایت تھی جو حالی اور اقبال کے توسط سے ترقی پسند شعرا کے یہاں آئی تھی، تب ہم یہ کہنے لگے تھے کہ غزل نے عمومی طور پر اپنی اس روایت سے ناطہ توڑ لیا ہے، اور محض عشق و عاشقی کے فرضی قصے اور تشبیہ و استعارے کے گھسے پٹے

انداز سے باہر نکل آئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تنقید بھی کی جاتی رہی کہ غزل پر خارجی کیف کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور یہ کہ ترقی پسند اپنے محور سے الگ نہیں ہوتے، دروں بینی ان کے یہاں خال خال ہے۔ جدلیاتی تصور ان پر اتنا حاوی رہا ہے کہ وہ تصورات جنھیں ہم ذاتی اور نجی کہہ سکتے ہیں غزل میں بار نہیں پاتے۔ ہر چند کہ ایسی تنقید یک طرفہ ہے اور حقیقت پر مبنی نہیں لیکن اتنا تو سبھی تسلیم کرلیں گے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ممتاز شعرا نے غزل کے دامن کو فکر و آگہی کے نئے سبق بھی دیے اور اس کے کینوس کو وسیع بھی کیا۔ میری باتیں اور بھی واضح ہو سکتی ہے اگر ہم فیض جیسے شاعر کی مثال سامنے رکھیں یا دوسری سطح پر پرویز شاہدی ہماری نگاہ میں ہوں۔ یہ دو نام میں نے یقینی دو سطح کے شاعروں سے Random samples کی طرح چن لیے ہیں۔ ایک طرف فیض احمد فیض ہیں، جن کی عظمت، شہرت اور رفعت کے بارے میں بہت کم اختلاف ہے تو دوسری طرف پرویز شاہدی ہیں، جن کے فن کی تحسین ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ یہاں ٹھہر کر ان دونوں شعرا کے کچھ اشعار دیکھ لیے جائیں تو بہتر ہے۔

فیض

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

نہ خیالِ وصل نہ عرضِ غم نہ شکایتیں نہ حکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

دست صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

پرویز شاہدی

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک ملکوں کے
"اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہیئے
زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

ان اشعار کے مطالعے سے اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ فیض ہوں یا پرویز شاہدی لفظوں کو ان کے لغوی معنی میں استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس حد تک کہ ہر لفظ ایک تخلیقی عمل سے گذرا ہوا نیا سانچہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں شعرا نے یکسر روایت سے اپنے آپ کو الگ کر لیا ہے۔ بلکہ روایت اور انفرادیت کے ادغام سے ایک واضح شعری رویے کی تشکیل کی ہے۔ ممکن ہے کہ ان شعروں میں ذاتی آلام یا نجی انبساط کا مظاہرہ نہ کیا گیا ہو، لیکن ان میں ذاتی تجربے کی آنچ یقینی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ترقی پسند منشور کو سامنے رکھیں تو ان کی معنویت ایک رخ اختیار کر لے گی، پر اگر اس سے احتراز کریں تو پھر تفہیم کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کی پہچان بھی یہی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعری رویہ صرف ان دو شاعروں ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے ترقی پسند غزل گو شعرا مثلاً سردار جعفری، جذبی، مجروح، تاباں، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کی بھی یکساں میراث ہے۔ مجروح سلطانپوری کا یہ

خیال درست ہے کہ:

"ترقی پسندانہ تغزل ترقی پسند شاعری بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز تو نہیں ہے بلکہ جو ذمہ داریاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے دوسری اصناف ادب کے سلسلہ میں لے رکھی تھیں تقریباً وہی ذمہ داری اس شاعر کی بھی ہے جو ترقی پسند غزل لکھ رہا ہے۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں یہی بات تھی کہ وہ شعر جو ظلم کے خلاف احتجاج بلکہ کسی حد تک آویزش اور مظلوم کی طرفداری کے احساس اور شعور کے نتیجہ میں لکھا جائے، ترقی پسند شعری روایت کا حصہ ہوگا۔ یہ شعر نظم کا بھی ہو سکتا ہے اور غزل کا بھی۔ اگر نظم میں آ رہا ہے تو نظم کے صنفی لوازمات کے ساتھ آنا چاہیے، اور اگر غزل میں ہے تو غزل کی ایمائیت اور استعاراتی دروبست کے ساتھ۔ ترقی پسند تغزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔ کوئی ایسا موضوع کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ہے جو ترقی پسند غزل میں نہ آیا ہو۔"

اس کے بعد غزل گوئی کا جو منظر ہمارے سامنے ہے وہ کچھ دوسری کہانی سنا رہا ہے۔ جدید یا جدید تر غزل گویوں کا مطالعہ بعض حلقوں میں ایک خاص تعصب کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعصب زیادہ تر روایت پسند اور محدود نظریے کے حامل بعض ترقی پسند اصحاب کی فکر کا نتیجہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جدید یا جدید تر غزل نے اس روایت کی توسیع کی ہے جو ترقی پسندوں کا حصہ تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور معنوی سطح پر ترقی پسند ایک Satiety کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے الفاظ کے دروبست تکرار کے باعث اپنی معنویت کھونے لگے تھے۔ یہ تکرار لفظی سطح پر بھی تھی اور فکری سطح پر بھی۔ لہٰذا اس حد سے دوسرے شاعروں کو آگے جانا ہی تھا ورنہ ان کا تخلیقی سوتا خشک ہو جاتا، اور نئے شعری رویے کی کوئی صورت ہی نہیں نکلتی۔ نئے سے زندگی کے نئے مطالبات سامنے تھے۔ یہ مطالبے فکری سطح کے بھی تھے اور تجرباتی حیثیت کے بھی۔ ایسے میں نئے سانچے کی تلاش ایک لازمی نتیجہ تھی۔ لیکن غزل کا سانچہ تو Fix تھا اب دو صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ شاعر غزلوں میں ان ہی استعاروں، پیکروں اور علامتوں سے کام لے جو ترقی پسندوں کے لیے مخصوص تھے یا ماضی کی طرف لوٹ جائے جہاں پہلے ہی سے یہ تمام شعری صورتیں اپنا دم خم Exploit کر چکی تھیں۔ نئے شاعروں کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہ ہوتی۔ یہ بھی تھا کہ نئے شاعروں کے اپنے غم تھے، اپنی آرزوئیں تھیں، اپنے کو پہچاننے کا بھی عمل تھا، اور زمانے نے انھیں جو کچھ دیا تھا اسے آئینہ بھی کرنا تھا۔ رشتے ناطوں کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی جو کبھی صالح قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اجتماعی منظر نامہ بے کیف ہو چکا تھا۔

معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تمدنی حقائق بدل چکے تھے۔ صنعتی اور مشینی دور نے مثبت قدروں کو پامال کر رکھا تھا Urbanization کا عمل تیز ہو چکا تھا۔ وقت کی رفتار وہ نہیں تھی جو پہلے تھی۔ ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعر فکر کے اعتبار سے الگ ہو اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے لفظوں کو ایک بار پھر نئی معنویت سے ہمکنار کرے۔ نئی غزل ان ہی امور سے عبارت ہے۔ اب جب الفاظ ٹکسالی معنویت سے الگ کر دیے جائیں، استعارے کی نئی دوکان سجائی جائے، نئے تجربوں کو نئے محاوروں کی تلاش میں غلطاں کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ان کی تفہیم میں بھی ایسی آسانی نہ ہوگی جو یک لخت معنی کے سب در کھول دے۔ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا۔ اس حد تک کہ کہیں کہیں ابہام کا بردہ خاصا دبیز ہو گیا۔ ابہام کی اپنی منطق ہے، غزل کی ایمائیت تفہیم کے کڑے کوہ طے کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غالب جب انفرادی امتیازات کے حصول میں سرگرداں تھے تو اپنے گنجینۂ معنی کو طلسم کی سرحدوں تک لے جانے میں غیر معمولی قوت تخلیق کا مظاہرہ کر رہے تھے، جدید اور جدید تر شاعروں کے لیے بھی ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنے امتیازات واضح کریں لہٰذا انھیں بھی اپنی قوت تخلیق کو امتحان کے مرحلے سے گزارنا تھا۔ اب جو نئی غزل سامنے آئی تو نئے نقوش کے ساتھ آئی، نئی سج دھج کے ساتھ۔ ایک طرف تو دروں بینی اس کا شیوہ بنی تو دوسری جانب خارجی امور کے احاطے کے لیے کچھ کھردرے انسلاکات بار پا گئے۔ نئی غزل نشانۂ ہدف انھیں کھردرے مظاہر کی بنا پر بنی اور بنتی ہے۔

یہ عام احساس ہے کہ کوئی بھی صنف شاعری کرختگی کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی بات سوچنے کی ہے کہ وہ احساسات جو سبک نہیں، نازک نہیں، ان کے لیے وہی لب و لہجہ اختیار کرنا پڑے گا جو ان کی حقیقی تصویر پیش کر دے، غالباً بعض شعرا کے یہاں کرخت لب و لہجے کا یہی جواز ہے۔ چند اشعار دیکھیے ؎

اتار پھینکوں بدن سے پھٹی پرانی قمیض	بدن قمیض سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں	(محمد علوی)
چاروں طرف بریکیں لگیں ہارن بج اٹھے	رستوں کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی	(بشیر بدر)
ہر لمحہ خوفناک ہے، ہر وقت حادثہ	ہم لوگ کر رہے ہیں سفر پاؤں ان پر	(احمد تبسم)
چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کچھ بولتے نہیں	بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے	(عادل منصوری)
سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر	کسی چھت پر مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں	(محمد علوی)
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں	بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے	(پروین شاکر)
کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم	اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہو گئے	(شمس الرحمن فاروقی)
دیکھیں تو ہاتھ باندھے کھڑے تھے نماز میں	پوچھو تو دوسری ہی طرف اپنا دھیان تھا	(عادل منصوری)

یہ آواز مانوس نہیں ہیں۔ لہجے کا کھردراپن عیاں ہے۔ ایسے افراد جو غزل کی خاص نغمگی پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کے لیے انھیں سہن کرنا آسان نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سماج نے جن پتھروں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے ان سے ہمیں ٹکرانا ہی ہے۔ چاہے اس میں نغمگی اور رجائی بوجھی موسیقی کو ضرب ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیکن نئی غزل کا یہ عمومی مزاج نہیں ہے۔ نہ ان اشعار سے نئی غزل کا پورا مزاج سامنے آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل کا دھیما اور نازک انداز آج بھی پایا جاتا ہے۔ نئی لفظیات کے ساتھ نئے Images کی صورت میں نئی ایمائیت کے حوالے سے ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید کچھ اشعار پیش کیے جائیں ؎

بہت عجیب ہیں یہ درد و غم کے رشتے بھی
کہ جس کو دیکھیے اپنا دکھائی دیتا ہے (خورشید احمد جامی)

کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ ہے نہ خواب
سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے (باقی)

جب نیند آ چکی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں (خلیل الرحمن اعظمی)

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے
اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے (عادل منصوری)

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انسان کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا (حسن نعیم)

کوئی ہے جو مجھے دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے (شہریار)

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہ
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا (وہاب دانش)

سماج کی ناہمواریوں کا ایسا احساس نئے تیور ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ نئی غزل محض کھردرے اور سخت لہجے سے عبارت ہے درست نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر دور نئے تقاضے لے کر آتا ہے۔ ان تقاضوں کو برتنے کے لیے نئے شعری نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جدید غزل کے شاعروں نے نیا لب و لہجہ بنانے کی کوشش کی ہے تو اسے سمجھنے کی ضرورت ہے نہ کہ پست اشعار کی مثالوں سے انھیں بیک قلم رد کرنے کی۔

نظم میں یہ صورت واقعہ اور بھی نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد نے ترقی پسند شاعری کے جائزے میں زیادہ تر ہیئت کی بنیاد پر اسے معمولی اور سطحی ٹھہرایا تھا۔ پھر انھیں ترقی پسند شعراء کے مرکزی اور بنیادی تصورات سے بھی اختلاف تھا۔ چنانچہ نظموں کے سلسلے میں عضویاتی تکمیل کے عنقا ہونے اور خیالات کی تکرار کی بنیاد پر بڑے ہی سخت لہجے میں ترقی پسند نظموں کی تنقید کی تھی حالانکہ فیض کی چند نظمیں ایسی تھیں جن میں غنائیت تجربے کی شدت کے ساتھ ساتھ ایک مربوط ہیئتی اور تکنیکی نظام بھی تھا۔ بہرحال وہ تو جارحیت کے اصولوں پر کاربند تھے۔ اور اچھی نظموں میں بھی کیڑے نکالنے کے در پے، لیکن ان کی تنقید سے اتنا کچھ ہوا کہ بعض نظم نگار قدرے سنبھلے۔ انھوں نے

اپنی نظموں میں عضویاتی تکمیل کا نہ صرف پاس رکھا بلکہ تجربوں کو تجریدی طریقے پر آراستہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جدید اور جدید تر نظم نگار بڑی چابک دستی سے اظہار کے طریقے میں محتاط رہے ہیں۔ اب ان پر تنقید خالص فکری انداز سے ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ موضوعی اعتبار سے ہماری نگاہ میں سماج کا جو ڈھانچہ ہے وہ سرتاسر ناہموار ہے۔ ایسی ناہمواری کو تجربے سے گذار کر ایک ساخت دینے میں نئے شعراء نے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ میں اپنی گفتگو معیاری نظموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کر رہا ہوں، اس لیے کہ نہ تو کسی شاعر کی ساری نظمیں تجربے اور فن کے اعتبار سے معیاری ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ہر تخلیق شاہ کار ہو سکتی ہے۔ بہرحال چند اچھے نمونے پیش ہیں:

۱۔ بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت　　بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا یہ جمِ غفیر　　لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں　　ہر ایک اپنی ہی آواز پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں　　(نظم شب چراغ از محمود ایاز)

۲۔ سڑکوں پہ بے شمار گل خوں پڑے ہوئے　　پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی سب چھتوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے　　سنسان ہیں مکاں کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں　　ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں　　(نظم "میں اور شہر" از منیر نیازی)

۳۔ ہم سب اپنی اپنی لاشیں، اپنی انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستان کی پر ہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔
منتظر مرگ انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سو دیکھ رہا ہے!
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے / بھوتوں کا جلنا دیکھے گا!
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے۔ (نظم کھنڈر، آسیب اور پھول از وحید اختر)

نئی تہذیب نے شہروں کی زندگی کو جو نیا روپ دیا ہے، وہ ان نظموں کے پیکر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سڑکوں پہ بظاہر چلتے پھرتے انسان مردہ لاشوں کی مانند ہیں، احساسات و جذبات سے عاری، جیسے بس زندہ رہنے کے لیے زندہ ہوں۔ خوف پورے ماحول پہ طاری ہے اور ہر شخص اپنی ذات کے خول میں سمٹا ہوا ہے یا سمٹنا چاہ رہا ہے۔ یہ احساسات

ایسے ہیں جن کا تجربہ ایک عام آدمی بھی کرتا ہے یا کرسکتا ہے۔ لیکن تجربوں کو تخلیقی عمل سے گذارنے میں جن وسیلوں کی ضرورت ہے، میرے خیال میں متعلقہ شعرائے انھیں اپنایا ہے اور اس طرح کے حالات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں قنوطیت کا جو پہلو ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ کسی رجائی ذہن کے مالک شخص کے لیے یہ سب باتیں پژمردہ ذہنیت کی عکاس ہوسکتی ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ صورت واقعہ یہی ہے۔ شہروں کے ہنگامے میں زندگی کی ساری مثبت قدریں جس طرح پامال ہو رہی ہیں، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یا تو فنکار ان سے آنکھیں موندلے یا پھر احتجاج کرے۔ میں ایسی شاعری کو احتجاج ہی سمجھتا ہوں لیکن یہ احتجاج نثری نہیں ہے، غیر تخلیقی نہیں ہے بلکہ غایت درجے کی تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ یہاں بہت سی باتیں سائنس ٹکنالوجی، مادّہ پرستی، کرب، تنہائی، علیحدگی اور زندگی کی بے معنویت کے حوالے سے کہی جاسکتی ہیں، لیکن مجھے فی الحال ان امور سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی زندگی شاعر کے لیے ایک Feeding ground ہے۔ اس لیے بھی کہ اسے تخلیق کار ہر لمحہ نبرد آزما ہے۔ ظاہر ہے، نئے تجربوں کے لیے نئے استعارے کی ضرورت ہے۔ اگر شاعر اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بوطیقا کی تشکیل کرتا ہے تو یہ غیر ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے ایک جائز مطالبہ ہے۔

ان باتوں کو سمیٹتے ہوئے میں واضح طور پر اس کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ نئے شاعروں نے جس طرح اپنی بوطیقا کی تشکیل کی ہے وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ اس سے ایک طرف ہماری شاعری نئے رنگ و آہنگ سے دوچار ہوئی ہے تو دوسری طرف ہمارے وہ الفاظ جو تکرار استعمال سے اور اکہری معنویت سے کھوٹا سکّہ بن گئے تھے، وہ نئے لسانی مظاہرے سے تازہ کار اور تازہ دم ہوچکے ہیں۔ یہ ایک واضح سمت ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری مجموعی طور پر نئے علاقے تلاش کرنے پر راجع ہے۔ یہاں کوئی شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ اینٹی غزل، آزاد نظم، ابہام اور اہمال سے شرابور جدید شاعری کس خانے میں رکھی جائے گی۔ میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ ہر وہ تجربہ جو حقیقی طور پر شعر میں ڈھل جائے وہ آج نہ سہی کل لائق ستائش ہوگا۔ یہاں تجربہ اور نقل تجربہ میں فرق کرنا چاہیے۔ جدّت برائے جدّت، ابہام برائے ابہام اور لایعنیت برائے لایعنیت کسی کے یہاں ہو کبھی نہ تو تنقید کی کسوٹی پر پوری اترے گی اور نہ ہی معیاری شاعری کی تخلیق کا سبب ہوگی۔ سچا تجربہ حقیقی تخلیقی کرب اپنی نکاس کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ فنکار اگر بے ریا ہے تو وہ نہ کسی منشور میں بند ہے اور نہ کوئی شعری ہیئت اس کے تجربے کے لیے حتمی بنتی ہے۔ ہر تجربہ اپنی ہیئت کے ساتھ وجود پذیر ہوتا ہے۔ سچے شاعروں کے یہاں جذبے کی شدّت بھی ہے اور سچائی بھی۔ ان کے یہاں ہیئت کے تجربوں کو ان کے مخصوص

جذباتی کیف سے مربوط کرنے کے بعد ہی ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے فیشن پرستی میں جو شاعر بھی نیا بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کے تجربے مانگے کے ہیں، جو ہیئتی توڑ پھوڑ کو خارجی طور پر برتنے پر کمربستہ ہے، اس کا کسی شعوری فلسفے سے دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ جدید شاعروں میں بھی بہت سارے ایسے ہیں جو جدیدیت اور جدت کو فیشن کے طور پر برتنا چاہتے ہیں۔ انھیں پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ میں نام گنوانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اردو شاعری پر بحث تو خاصی ہوتی آئی ہے، فکشن بھی آج کے نقادوں کے لیے ایک ایسی فلڈ ہے جس پر کثرت سے خیال آرائی کی جارہی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ افسانہ کون سا رخ اختیار کر رہا ہے۔ اس باب میں جو روایت بنی ہے، اس سے ہم ناآشنا نہیں ہیں۔ ترقی پسند روایات کے تحت افسانے نے یقینی نہایت ہی ارفع مقام حاصل کر لیا ہے۔ صنف افسانہ کی عظمت اور اس کے وقار کا جواب ہمارے مستند اور معروف افسانہ نگاروں کے یہاں مل جاتا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی اور بہت سارے دوسرے لکھنے والوں نے اس صنف کو معراج کمال تک پہنچانے میں جو سعی کی ہے اس پر خاک ڈالنے کی ہر کوشش تشدد پسندی کی مثال ہوگی، دانشوری کی نہیں۔ ابتدا میں اردو افسانہ سر کے بل کھڑا تھا۔ ترقی پسندوں نے اسے پاؤں پر کھڑا کیا۔ یہ ایک بہت بڑا فنی ریاض تھا جسے ہمارے معروف افسانہ نگاروں نے اختیار کیا اور عوام و خواص دونوں ہی کے دلوں میں عزت و احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صنف ارتقا کی کئی منزلیں طے کر گئی۔ یہ بھی ہوا کہ مختلف لکھنے والوں نے علم کے مختلف جہات کی طرف رخ کیا۔ معاشی، سیاسی اور جنسی افکار خاص طریقے پر افسانے کے خدوخال بنے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ صورتیں جنھیں ہم وقتی کہہ سکتے ہیں انھیں بھی ان افسانہ نگاروں نے برتنے کی کامیاب کوشش کی۔ فسادات پر لکھے جانے والے افسانے اس کی ایک مثال ہیں۔ تب افسانہ فنی لحاظ سے ایک خاص ڈگر پر گامزن تھا۔ ماجرا سازی اور دوسرے قیود سے بری نہ تھا، افسانہ نگار کہانی پن پر خاصا زور صرف کرتا تھا۔ اس طرح کہ ایک عام قاری بھی ان حقائق سے آشنا ہو جاتا تھا جن کا اظہار متعلقہ افسانہ نگار کا منشا ہوتا تھا۔ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ اپنے عظیم افسانہ نگاروں کی راہ پر چلیں یا موضوعات کے اعتبار سے ایسا سانچہ یا ہیئت اختیار کریں جس میں گریز کا پہلو بھی ہو اور اظہار کی نئی صورت بھی ابھرے۔ ان احساسات کو ایک صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

"نیا افسانہ دراصل ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔ وہ ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے چور ہے۔ آزادی کے بعد جو نسل سامنے آئی

تھا، اس کے پاس بغاوت کی مقدس آگ بھی تھی اور عزم و ولولے کا وہ تیشہ بھی جو رسمیات کے ستون کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں منظر نامہ تو آئے دن بدل سکتا ہے، لیکن مزاج کہیں صدیوں میں بدلا کرتا ہے۔ آزادی کے بعد شاعری کی طرح افسانے میں بھی پورے آدمی کو سمجھنے، زندگی کے تمام مناظر میں رکھنے، اس کے سیاہ و سفید ہر پہلو کو پرکھنے اور خارجی اور باطنی تمام تقاضوں کو سمونے اور انسان کو ایک معنوی وحدت، ایک محشرِ خیال اور ایک جہانِ آرزو کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اسلوب و اظہار کی سطح پر لفظ کی معانیاتی کائنات، اس کے تہہ در تہہ رشتوں، علامتی تجریدی اور تمثیلی پہلوؤں اور منطقی معنی سے قطع نظر معنی کے معنی اور ان کے معانیاتی انسلاکات کے تخلیقی امکان کی جستجو ذہنی سفر کا حصہ بن گئی۔ لیکن اس زبردست ذہنی سفر نے بعض بنیادی سوال بھی پیدا کیے، یعنی نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے، کہانی نہیں ہے؟ یا جس حد تک وہ کہانی ہے، وہ نئی نہیں ہے؟ کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کا رد لازم ہے؟"

اس میں جو Rehtoric ہے، اس کو منہا کرنے کے بعد وہی سوال سامنے آتا ہے کہ نئی کہانی کی شکست و ریخت ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت کی گئی یا فنی تقاضے کے طور پر۔ یہ بڑا اہم سوال ہے جس کے بغیر نئی کہانی کا کوئی مطالعہ بھی سودمند نہیں۔ جسے فاضل نقاد نے فرسودہ ڈھانچہ کہا ہے کیا وہ واقعی اتنا فرسودہ ہو چکا تھا جس میں نئے خیالات کی سمائی ممکن نہ تھی۔ میری رائے میں اس کا جواب اس طرح ہے کہ ہمارے مستند افسانہ نگار اپنی حدوں میں وہ کام کر چکے تھے جس سے آگے نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ پھر مغرب میں افسانے کے نئے فنی تقاضے کے تحت جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبر نئے افسانہ نگاروں کو مل چکی تھی۔ اتنا ہی نہیں بعض ایسے فکری پہلو بھی سامنے آچکے تھے جن کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں کے ذہن پر خاصا گہرا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر نئے افسانہ نگاروں نے سب سے پہلے وہ راستہ اپنایا جو ابہام و اہمال کی منزلوں کی طرف لے جاتا تھا۔ اس کی زد میں کہانی پن کی منطقی صورت بھی آئی۔ علامتی لے تیز ہوئی اور افسانے کو شعر کی طرح برتنے کی کوشش کی گئی۔ اس عمل میں لازمی طور پر قاری سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس عمل میں سارے افسانہ نگار ناکامیاب ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض علامتی افسانے خاصے کی چیزیں ہیں جن کی تحلیل ہونی چاہئے۔ لیکن علامت اور تجرید کے نام پر جس طرح رطب و یابس کا ڈھیر سامنے آیا وہ بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کہانی اگر کہانی پن سے بنتی ہے تو اس سانچے کے اندر رہ کر بھی علامتی افسانے تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم سرریلزم اور دادا ازم کی روش اپنائیں، یا "شعور کی رو" اور

تلازمۂ خیال سے جو ساخت بنتی ہو اسی کو سب کچھ سمجھ لیں۔ لیکن عام طور سے ہوا یہی۔ مغرب کے تصور Poison plot کو خاصی اہمیت دی گئی ہے اور اس کے اثر کے تحت کہانی سے کہانی پن کو زبردستی نکال پھینکنے کی آرزو چھوٹے سے چھوٹے نئے افسانہ نگار کے یہاں پیدا ہو گئی۔ یہ بھی ہوا کہ ہر علامتی افسانے کو تجریدی بھی کہا گیا حالانکہ دونوں قسم کی تحریروں میں آسمان و زمین کا بُعد ہے۔ تحریر مصوری کی راہ سے نمایاں ہوتی ہے جب کہ علامت معنوی تہہ داری سے عبارت ہے۔ ان امور کے باوجود اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم کا Academic tension تھا اور جب Academic Tension بن جاتا ہے تو اسے عوام سے الگ ہونا ہی ہے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا کہ افسانہ نگار اور قاری کے درمیان تفہیم کے بارے میں کوئی رابطہ نہیں، اس لئے کہ تفہیم کی الگ الگ سطحیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی بھی تخلیق کار یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی تخلیق کی ترسیل کے لیے ذہن کی کون سی سطح سامنے رکھے۔ خالق کو ذہنی طور پر آزادی ہونی چاہئے کہ اپنے تجربے کو اپنے مزاج کے مطابق فن کی شکل دے نہ کہ وہ کسی قاری کو ذہن میں رکھ کر تخلیقی عمل میں مصروف ہو۔

نئے افسانے کے رشتے سے قدروں کی شکست و ریخت، تنہائی، علیحدگی، بے سمتی اور لایعنیت وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب موضوعی اور Themetic باتیں ہیں۔ بحث تو فنی اصول اور ضابطے کی ہونی چاہیئے۔ میں نے یہ کہا کہ نئے افسانہ نگار نئے سانچوں کی تلاش میں نکلے تو ان کے سامنے کچھ اسطوری سہارے تھے تو کچھ داستانی وسیلے تو کہیں کہیں فقہی، حکایتی اور متصوفانہ ذرائع۔ جن افسانہ نگار دانشوروں نے اپنے مخصوص تجربوں کو اعلیٰ فنی کارکردگی کے ساتھ اپنایا، وہ تو ڈوبنے سے بچے لیکن جبراً جن لوگوں نے ان صورتوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو برتنے کی کوشش کی، وہ نامعتبر بھی ٹھہرے اور افسانوی دنیا میں مقبول بھی نہ ہو سکے۔

افسانے میں نت نئے تجربے کی جو شدت اور آرزو تھی، وہ یقیناً اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے یہ محسوس کر لیا کہ اصل حقیقت تجربے کی سچائی بھی ہے اور اظہار کی سچائی بھی، نتیجے کے طور پر نئے افسانہ نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم کے توازن کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے جدید افسانہ نگاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ چند افسانہ نگار فکر اور ساخت دونوں ہی میں ارتقائی منزلوں سے گذر رہے ہیں۔ میں اپنے ہی صوبے کی مثال دوں تو شاید کافی ہو۔ کلام حیدری ہوں کہ احمد یوسف یا شوکت حیات، حسین الحق ہوں یا عبدالصمد ان سبھوں کے یہاں تخلیقی سطح پر وزن و وقار پہلے بھی تھا اور اب

بھی ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوکت حیات کی ہر دوسری کہانی معنوی فکری اور ہیئتی لحاظ سے ہر طرح جامع ہوتی ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ ہر وہ افسانہ نگار جو فکر و آگہی کے نئے تناظر کو اپنے بھرپور تخلیقی جوہر سے اظہار کی سطح پر لاتا ہے۔ وہ کامیاب بھی ہوتا ہے اور ہر سطح کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی۔ سارے نئے افسانہ نگاروں یا نئی افسانہ نگاری کو ایک لاٹھی سے ہانکنا درست نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ اپنی روایات کی توسیع کرتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اردو ناول نگاری کی سمت و رفتار کا جائزہ لیجیے تو ہندوستان کی حد تک ایک طرح کی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جو کچھ اس ضمن میں کیا ہے وہ ہم سبھوں کے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی بہترین تخلیقی قوت "آگ کا دریا" پر صرف کر دی۔ ان کے نئے ناول اس بلندی کو نہیں چھوتے۔ ویسے ورجینیا وولف کے اثرات سے وہ اب تک آزاد نہیں ہو سکی ہیں۔ انھوں نے انسائیکلو پیڈیائی ذہن پایا ہے۔ جس کا پر توان کی تخلیقی کاوشوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جس طرح پاکستان میں اچھے اور معیاری ناول لکھے جا رہے ہیں، اس کی روایت معلوم نہیں کیوں ہندوستان میں بن نہیں پاتی۔ ہاں حیات اللہ انصاری، جیلانی بانو اور ظفر پیامی کے ناول بس اس حد تک اہم ہیں کہ وہ ناول ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاریخی ناول لکھنے کے معاملے میں قاضی عبدالستار کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب کئی لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے اور ان کی تحریروں کو ادب عالیہ کا درجہ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ انھوں نے جن موضوعات کو اپنے ناولوں میں نشانہ بنایا ہے، وہ بھی اہم ہیں اور جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن اس سے اردو ناولوں کے ارتقائی سفر کا حال پوری طرح روشن نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں پاکستان میں نئے ناولوں کا اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ اس باب میں انتظار حسین کے ناول "بستی" "نشیب" اور "تذکرہ"۔ انور سجاد کے "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ"۔ بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" اور ایوب مرزا کے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر صلاح الدین پرویز کی مساعی کو زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں جن کا بیان یہاں ضروری نہیں۔ جوگندر پال کو میں ناولٹ نگاروں کی صف میں رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ "بیانات" اور "نادید" دونوں ہی ناولٹ ہیں ناول نہیں۔

تنقید و تحقیق کے سلسلے میں میرے دو طویل مضامین کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ایک "اردو تنقید کی نئی صورت" اور دوسرا "اردو تحقیق کی نئی صورت" ان دونوں مضامین میں میں نے تنقید و تحقیق کی

رفتار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان مباحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تنقید کے باب میں صرف اتنا کہوں گا کہ ایک طرف تو نقادوں کا وہ گروہ ہے جو ترقی پسند کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ محمد حسن نے کوشش یہ کی ہے کہ اپنی تنقید میں ان نئے افکار کو بھی پیش کریں جو کبھی ترقی پسندوں کے لیے گوارا نہ تھے۔ سید عقیل رضوی اپنے موقف پر آج بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔ نئے ادب کی تفہیم کے سلسلے میں ان کے مضامین جدیدیت کے حامی نقادوں کے یہاں سخت بحث وتمحیص کا دروازہ کھولتے ہیں۔ لیکن میں یہاں اس بات کو اصرار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے موقف پر پوری طاقت سے، پوری توانائی سے ایک محاذ بنا کر قائم رہنا میرے نزدیک بذات خود ایک اہم بات ہے اسی ڈگر پر چلنے والوں میں قمر رئیس اور اصغر علی انجینیر بھی ہیں۔ ہر چند کہ مجھے ترقی پسندوں کے افکار سے خاصا اختلاف رہا ہے لیکن میں ان کی مساعی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تنقیدی عمل میں نظریہ سازی بھی کی ہے اور ایک Trend Set بھی کیا ہے۔ چونکہ ان کا علاقہ امریکہ کی 'نئی تنقید' کے زمرے میں آتا ہے، اس لیے ان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے نئی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو سمجھنا پڑے گا، جس کی تفصیل میرے متذکرہ مضمون میں آچکی ہے۔ چونکہ جدید تنقید پر ان کے اثرات خاصے گہرے اور دور رس ہیں، اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ ہے۔ محمد حسن عسکری نے علامت نگاروں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور مشرق کی بازیافت میں لگ گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی کے یہاں بھی یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ قدم بھی مستحسن ہوگا۔ ظاہر ہے میں یہاں اردو تنقید کے ارتقا کا کوئی خاکہ پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اس لیے تمام تر نقادوں کی تنقیدات کا جائزہ فی الحال میرے دائرہ عمل سے باہر ہے، لیکن ان امور سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ اردو تنقید کے دو واضح اسکول اپنے امکانات کی تلاش میں پیہم لگے ہوئے ہیں۔

تحقیق کی رفتار بھی جامد و ساکت نہیں ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ قدیم ادب کی بعض ایسی شقیں جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا، ہمارے محققین کی کوششوں سے ابھر رہی ہیں۔ قاضی عبدالودود اور دوسرے بڑے محققین نے جو راہیں استوار کی ہیں ان پر چل کر نئے محقق اپنا وقار قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، سامنے کی مثال رشید حسن خاں کی ہے جن کے یہاں معروضی تحقیق کے کتنے ہی پہلو ابھر رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے ہی بعض دانشورانہ ادبی کام ہمارے سامنے آئے ہیں، جن کا تذکرہ ایک طولانی عمل ہے۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ "سب رس" کے سلسلے میں منظر اعظمی کی وقیع تحقیق سامنے آکر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمثیلیہ کے اجزا و عوامل پر بھی مغربی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ و تحلیل ان

کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

"سب رس" کا ذکر ہو تو دکنیات پر لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہن میں آ رہی ہے۔ قدیم دکنی ادب کی تفہیم کا جو سلسلہ عبدالحق، زورؔ اور سروری وغیرہ نے شروع کیا تھا اسے ہمارے نئے لکھنے والوں نے نہ صرف آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ وزن و وقار بھی عطا کیا ہے۔ نام اس لیے نہیں گنوا رہا ہوں کہ یہ فہرست کبھی مکمل نہ ہو گی۔

اخیر میں، میں لسانیات کے تعلق سے بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ادھر لسانی مباحث بڑی توانائی سے ہمارے ماہر لسانیات کی طرف سے سامنے آ رہے ہیں۔ اردو زبان کے ڈول اور گینڈے پر مسلسل لکھا جا رہا ہے، اور کافی عرق ریزی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ لسانیات کے نظری پہلو پر بھی روشنی ڈالی جا رہی ہے اور متعلقہ اصطلاحات کی گلی پور تعیین ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ ہمارے شعرا اور ادبا کو محدود لسانی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک بھرپور روایت تشکیل پا رہی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب مسلسل ارتقا کی طرف راجع ہے۔ فکری و دانشورانہ سطح پر بھی اور فنی اور تجرباتی لحاظ سے بھی۔

●●

اردو دانشوری

○ آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری
○—— پروفیسر محمد حسن

○ آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ
○—— وامق جونپوری

خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا — اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا — کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟ کسی نے کہا دانشوری یعنی چہ؟ کسی نے کہا چیل کے گھونسلے میں ماش کہاں۔ کسی نے غالب کو ترمیم کر کے کہا:

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں
بے سبب رہا دشمن سارا آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں۔ اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

ادارہ

پروفیسر محمد محسن
پٹنہ

آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری

کسی علمی یا ادبی اصطلاح کو بحث و مباحثہ کا موضوع قرار دینے سے پہلے اس کی تعریف کا تعین ضروری ہے یعنی اس کی وضاحت کہ وہ اصطلاح کس خاص معنی میں استعمال کی جارہی ہے تاکہ مباحثہ میں حصہ لینے والوں کے سامنے اس کا ایک مشترک اور متفقہ مفہوم ہو، اور ہر شخص اسی مفہوم کی نسبت سے گفتگو کرے۔ یہ تعریف ایسی ہونی چاہئے کہ ہر اہل الرائے کو اس سے اتفاق ہو، اسی صورت میں یہ تعریف معروضی سمجھی جائے گی ورنہ اس کی حیثیت موضوعی ہو جائے گی اور بحث و مباحثہ کے نتیجے میں کوئی منصفانہ اور مفید فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ جس کے بغیر بحث و مباحثہ کا حقیقی مقصد فوت ہو جائے گا۔ میرے اس مختصر مضمون کی غرض و غایت یہی ہے۔

دانش کا مصدر دانستن ہے جس کا لغوی معنی "جاننا" ہے۔ اس اعتبار سے علم اور دانش مترادف الفاظ سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن دانش کا لغوی معنی صرف اتنا ہی نہیں ہے، اس میں عقلمندی، دانائی، سمجھ بوجھ جیسے مضمرات بھی شامل ہیں، جس کی تصدیق دانشمند کے لفظ سے ہوتی ہے۔ جس طرح ہر عالم کا دانشمند ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر عالم کا دانشور ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ لیکن ہر دانشمند کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے مگر ہر دانشور کو عالم ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں دانشور کی اصطلاح اتنی ہی بلیغ ہے اور تقریباً وہی مفہوم ادا کرتی ہے جو عہد قدیم میں عربی لفظ حکیم سے ادا ہوتا تھا۔ حکیم کا لغوی معنی بھی وہی ہے جو دانشور کا ہے یعنی عقلمند، دانا، اہل علم۔ اس کے علاوہ حکیم کا لفظ ایک وسیع معنی بھی رکھتا ہے، سب علموں کو جاننے والا۔ اس اعتبار سے فلاسفر کی مغربی اصطلاح کا مفہوم حکیم کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ بعض مستند لغات میں حکیم کے معنی فلاسفر بھی پایا جاتا ہے۔ فلاسفر کا ابتدائی معنی علم و عقلمندی کا متلاشی تھا۔ لیکن بعد میں فلاسفر کے لقب سے اسی کو سرفراز کیا جانے لگا جو اپنے عہد کے مروجہ علوم پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ انگریزی کا لفظ Intellectual جب دانشور کا مترادف سمجھا جاتا ہے تو اس کا مفہوم بھی محض عالم کے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

حکیم سے مراد سب علموں کا جاننے والا اسی وقت تک حقیقت پر مبنی تھا جب علم کے شعبے محدود تھے، ان کی شاخیں

بھی گنی چنی تھیں اور کسی ایک شخص کے لیے اپنے عہد کے علوم سے پوری آشنائی ممکن تھی، مثلاً بو علی سینا کو حکیم بو علی سینا صرف اس لیے نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ طب کا ماہر تھا۔ اس وقت کے سارے علوم منطق، فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم نجوم وہیئت وغیرہ ان سب پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس عہد کے علوم کے اکثر شعبوں پر اس کی تصنیفات تھیں۔ یہی حال یونان کے فلسفیوں سقراط، افلاطون، ارسطو وغیرہ کا بھی تھا۔ یہ سب کے سب اپنے عہد کے علوم کے کم و بیش ہر شعبے پر اپنا انفرادی نقش چھوڑ گیے ہیں۔ عہد قدیم میں ماہر طب کو بھی اسی معنی میں حکیم کہتے تھے اور یہ روایت آج بھی باقی ہے۔ گو آج کا حکیم صرف طبیب ہوتا ہے۔ اس دور کا طبیب، فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم نجوم وہیئت، حیاتیات کی مختلف شاخیں ان سے کماحقہ آشنا ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی علمی، عقلی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر ان علوم کی سرحدوں کو آگے بڑھانے میں اپنا انفرادی رول بھی ادا کیا کرتا تھا۔ آج ہم اس کے اسی خصوصی وصف کی بدولت اسے اہل عقل و دانش یا دانشور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حکیم کی اصطلاح کی طرح فلسفی کی اصطلاح بھی ویسی ہی ہمہ گیر تھی۔ فلسفی صرف اسی کو نہیں کہا جاتا تھا جو محض فلسفہ یعنی مابعدالطبیعاتی مسائل کا علم اور ان کا بیان و تشریح، تجزیہ اور حل سے تعلق رکھتا تھا بلکہ طبیعات، علم کیمیا، علم ہندسہ اور دوسرے سائنسی علوم سے بھی اسے سروکار رہا کرتا تھا۔ فلسفی کی روایتی اصطلاح کا وجود آج بھی ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند میں قائم ہے۔ اس کے سند یافتہ کے لیے فلسفے کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ سائنس، طب، ادب، سماجیات، معاشیات یعنی علم کا شاید ہی کوئی شعبہ ہوگا جس کا فارغ التحصیل پی ایچ ڈی کی سند سے فائز ہونے کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔

دانشور، حکیم، فلسفی کے جس قدیم مفہوم کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے اس کا اطلاق آج کے دانشور پر نہیں کیا جا سکتا۔ حیوانی زندگی کا ارتقا اور علم کی ترقی ان دونوں میں گہری مماثلت ہے۔ علم آدمی کا طرۂ امتیاز ہے اور آدمی حیوانی تخلیق کا شاہکار۔ جس طرح حیوانی ارتقا یا اعضائے جسمانی کی انفرادی بالیدگی، تشکیلی تفریق Differentiation of Structure اور تخصیصی فعلیت Specialisation in Function کے اصول پر کاربند ہے، علوم کی ترقی میں بھی اسی اصول کی کارفرمائی ہے۔ ابتدا میں علم کی قسمیں ہی نہیں بلکہ ہر علم کی شاخیں بھی محدود تھیں۔ چنانچہ ایک شخص کا ہر علم پر دسترس رکھنا ممکن تھا لیکن جیسے جیسے علم کی ترقی ہوتی گئی صرف اس کے شعبے ہی نہیں بلکہ ہر ایک شعبے کی شاخیں بھی کثیر ہوتی چلی گئیں اور آج علم کا ہر شعبہ اس کی نت نئی شاخوں میں بٹ گیا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود علم کے کسی شعبے کی ہر شاخ پر قدرت رکھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج ہم کسی شخص کو اس معنی میں دانشور، حکیم یا فلسفی نہیں کہہ سکتے جس معنی میں یہ اصطلاحیں ابتدا میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس

کے باوجود جو شخص کسی ایک شعبۂ علم کی کسی ایک شاخ کے جز وکل پر قدرت رکھتا ہو لیکن کسی دوسرے شعبۂ علم سے اسے دور کی بھی شناسائی نہ ہو ہم اسے عالم کہہ سکتے ہیں، دانشور نہیں کہیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کا دانشور موجودہ علوم اور ان کی گوناگوں شاخوں سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے علوم کی کم از کم مبادیات سے ایک گونہ آشنائی ضرور ہوگی۔ اس کے بغیر اس کا ذہن کشادہ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ سمجھا جائے گا اس کی تعریف انگریزی زبان میں اس طرح کی گئی ہے:

One who knows everything of something & something of everything.

یعنی وہ جو ہر شے کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا ہو اور کسی شے کی ساری کنہیات سے بخوبی واقف ہو۔ اسی طرح دانشور بھی وہی کہا جائے گا جو اپنے عہد کے دوسرے علوم سے کم از کم متعارف ہو اور ساتھ ہی کسی ایک علم کی کسی ایک شاخ پر اس کی پوری طرح دسترس ہو۔ انگریزی کی اصطلاح Liberal Education سے متصف ہونا ایک دانشور کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر کسی کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں میں بالیدگی، لچکیلاپن اور تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ فکر کی بلندی اور گیرائی، نظر کی وسعت اور دقت رسی دانشوری کی اساس ہیں۔ کسی علم سے حقیقی وابستگی کا ثبوت اسی شخص کے علمی کارناموں میں مل سکتا ہے جس کا اس علم کی ترقی و فروغ میں کچھ نہ کچھ دخل رہا ہو۔ اس کے فکری اور استدلالی صلاحیتوں کی بلوغت اور بلاغت نہایت ضروری ہیں۔ اور یہی اس شخص کی دانشوری کی صحیح علامت بھی ہوگی۔

دانشوری کی اس تشریح و تعریف کے پس منظر میں جب ہم آزادی کے بعد اردو علم و ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک علمی تخلیقات اور کارناموں کا تعلق ہے ہمیں ان کا فقدان نظر آتا ہے۔ آزادی کے بعد حالیہ علوم سے متعلق کوئی ایسی تخلیق شاید اردو میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکے گی جو کسی اہمیت کی حامل سمجھی جائے خواہ وہ علوم سائنسی یا غیر سائنسی ہوں۔ ہندستان کی مختلف اردو اکیڈمیاں نئی کتابوں پر انعام دیتی ہیں لیکن ان کتابوں میں شاید ہی کوئی علمی کتاب بھی شامل ہوتی ہے۔ اب رہے ادبی کارنامے۔ ہمارے بیشتر ادیبوں کا مبلغ علم صفر کے برابر ہوتا ہے ان کا مطالعہ اس صنف ادب سے آگے نہیں بڑھتا جس سے انھیں شغف رہ گیا ہے۔ انھیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہنا بھی شاید روا نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ انھیں دانشوروں کے زمرے میں داخل کیا جائے۔ ہمارے آج کے اردو ادب کے کارنامے عموماً چار صنفوں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ غزل، افسانہ، ادبی تحقیق اور ادبی تنقید۔ جہاں تک مروجہ غزل گوئی اور افسانہ نگاری کا تعلق ہے ان میں دانشوری کا نشان ڈھونڈنے کی کوشش شاید رائگاں ثابت ہوگی۔ علم و دانش سے بہرہ مند ہوئے بغیر بھی محض مشق اور لگن کے نتیجے میں ایک شخص کامیاب غزل گو اور افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید میں البتہ دانشوری کے

نشانات مل سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ تحقیق اور تنقید سب کے بس کی بات نہیں ہوتی، آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کا ہر لکچرر محقق اور نقاد بننے کی ہوس کا شکار ہے چنانچہ آج کے دور میں تحقیق اور تنقید کے میدان میں گھوڑے دوڑانے والے کہاں تک اپنے وقت کے مروجہ علم سے دور کی بھی شناسائی رکھتے ہیں یہ خود ایک تحقیق کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور بقرینۂ غالب اس معاملے کی چھان بین میں ناامیدی کا منھ دیکھنا پڑے گا۔ اب رہیں اردو تخلیق کی دوسری صنفیں یعنی نظم گوئی اور ناول نگاری، ایک دانشور ناول نگار یا نظم کا شاعر وہی ہوگا جس نے مروجہ علوم سے دور کا ہی تعلق رکھا ہے اور ان کی کچھ نہ کچھ خوشہ چینی کی ہے۔ وہ موجودہ سائنس کی چلتی پھرتی دریافتیں، انکشافات اور معروف کارناموں، علم السیاست، سماجیات، اقتصادیات، تاریخ وغیرہ کی مبادیات، اور ملکی اور غیر ملکی ادبی تخلیقات کے جواہر پاروں سے کم از کم متعارف ہے۔ آزادی کے بعد اردو میں سیکڑوں ناول لکھے گئے ہوں گے اور کتنی نظمیں سپرد قلم کی گئی ہوں گی لیکن ان میں مشکل کہیں دانشورانہ سمجھ بوجھ اور دانائی، دقت رسی اور بصیرت، جدت طرازی اور انوکھا پن، ذاتی نظریۂ حیات اور انفرادی انداز فکر و نظر کے نشان مل سکیں گے۔ آج اردو کا فن کار اور اردو کا قاری دونوں ہی کو علوم حاضرہ سے جیسے الرجی ہوگئی ہے۔ اس صورت میں اردو میں دانشوری کا فقدان کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اردو کی دنیا آزادی کے بعد دانشوروں سے خالی ہوگئی۔ کتنے ایسے دانشوروں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جن کی پیدائش اور نشو و نما گو آزادی کے بہت پہلے ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ دانشوری کی شمع سے ہمیں بصیرت افروز کرتے رہے۔ مثلاً ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر غلام السیدین، قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، کرشن چندر بیدی، فراق، فیض وغیرہ وغیرہ جو اب دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند ایسے دانشور آج بھی ہمارے درمیان بقید حیات ہیں جن کی شخصیت اور کارنامے دانشوری کا جیتا جاگتا مفہوم واضح کرنے میں معاون ہوں گے۔ مثلاً آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام، صباح الدین عطاء اللہ پالوی، پروفیسر سید حسن ان کے علاوہ چند ایسے اور نام بھی گنوائے جاسکتے ہیں جن سے یا تو میں ناواقف ہوں یا جس کی اس وقت بازیافت کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں، لیکن انھوں نے بھی آزادی کے پہلے سے ہی اپنی دانشوری کا چراغ جلانا شروع کر دیا تھا اور اب ان میں سے اکثر چراغ سحری کی طرح ہماری نئی نسل کو تادیر بصیرت افروز نہ کرسکیں گے۔ البتہ مجھے کوئی ایسا دانشور نظر نہیں آتا جس نے آزادی کے بعد ہماری توجہ کا مرکز بننا شروع کر دیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب میری کم علمی اور شاید کم نظری ہو۔

••

جناب وامق جونپوری

کجگاؤں - جون پور - یو - پی

آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ

اس وسیع و عریض موضوع گذشتہ ایک کم چالیس برس کی مدت میں راسکماری سے گلگت اور کراچی سے چاٹگام تک کے طول و عرض پر پھیلا ہوا ہے ان چند صفحات اور سیمینار کی قلیل مدت میں جائزہ لینا کافی دشوار کام ہے اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

یوں تو ہر مبصر کے ذہن میں کسی نہ کسی زاویہ سے اس کا نامکمل خاکہ ضرور موجود ہے تاہم جائزہ کی اصطلاح نے موضوع کو دشوار تر بنا دیا ہے۔ دوسری اصطلاح اردو دانشوری کی ہے جو تفصیلات میں جانے کے بعد اردو تک محدود نہیں رہ سکتی جائزہ لیتے ہوئے خود اس کے ماضی اور دوسری زبانوں سے اس کے رشتے کو توڑنا ممکن نہیں ہے لیکن اردو کی دانشوری سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر آزادی کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دانشوری نے جس طرح ماقبل آزادی اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا ویسا مابعد آزادی نہ کر سکی۔ آپس کے نظریاتی یا ذاتی اختلافات پر اس نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں اور دانشوری کے دشمن عناصر سے متصادم ہونے سے گریز کیا۔ اور عصری تقاضوں سے شعوری یا لاشعوری طور پر بے اعتنائی برتی۔ اس لیے ہم آج Intellectual thinking کے بہت کم ایسے نمونے پیش کر سکتے ہیں جن پر ملک و قوم فخر کر سکے۔ اس دور میں دانشوری برسر اقتدار قوتوں سے بچ بچ کر کام کرتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری صلاحیتیں بروئے کار نہ آ سکیں۔

ذیل میں اپنے حافظہ سے چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ عصری دانشوری کن کن حالات تغیرات ایجادات اور تحریکات سے متاثر ہوتی رہی ہے اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے میری نظر میں Intellectual thinking اور creative thinking فکر کی دو مختلف سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اول الذکر اپنے پورے شعور اور علمی صلاحیتوں سے کام لیتی ہے جبکہ creative thinking میں شعور اور علمی صلاحیت کے علاوہ ایک تیسری صلاحیت ضروری ہے۔ جس کو عام فہم زبان میں Sixth sense یا وجدان کہا جا سکتا ہے جب کہ علمی صلاحیت محض عرفان تک محدود ہوتی ہے۔

حصول آزادی اور تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان کی قومی سرکاری زبان ہندی اور پاکستان کی اردو

قرار پائی۔ یہ پہلی تاریخی تبدیلی تھی جس نے عوام اور دانشوروں کے اذہان پر اپنا بہت گہرا اور دوررس اثر چھوڑا۔ نتیجہ میں ہر چند کہ ہندوستان میں اُردو کو ایک منطقائی حیثیت دی گئی تھی بہت سے اُردو دانشوروں نے اُردو کو ترک کر کے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تحریریں بالنفس ہندی کے مقابلہ میں اردو سے زیادہ قریب رہیں۔ ہندوستان کے لاتعداد خانوادے جن کی مادری زبان اُردو تھی۔ روزی روٹی کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر اپنے بچوں کو ہندی کی تعلیم دلوانے لگے۔ اور اس طرح اب تک دو نسلیں اُردو سے نابلد ہو چکی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کا شوق بھی بدل چکا ہے۔ دوسری طرف ان خانوادوں نے جن کے یہاں نجی طور پر اردو کی تعلیم کی سہولتیں میسر تھیں، گھر پر اپنے بچوں کو اردو کی بھی تعلیم دلوائی اور جنھوں نے اپنی روایات کی مدد سے اُردو ادب میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور چند نے نام بھی پیدا کیا۔ مگر زیادہ تر اردو والے اردو کا ساتھ نہ دے سکے جس سبب سے وہ اُردو کے ادب عالیہ اور تخلیقی ادب کے فنی اور ثقافتی نکات سے رفتہ رفتہ بے بہرہ ہوتے گئے۔ جس کا مظاہرہ مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں واضح طور پر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اردو دانی کی سطح اس درجہ انحطاط کا شکار ہو چکی ہے کہ وہ دوسرے تیسرے درجہ کی مزاحیہ شاعری، حکومت کو بھونڈی طرح کوسنے والی سیاسی نظموں یا ترنم سے پڑھی جانے والی زٹل قافیہ غزلوں کی سطح سے اوپر اٹھ نہیں سکتے۔ معیاری ادب جب الفاظ کے ترجموں کے ساتھ دیوناگری میں شائع ہوتا ہے تو کسی حد تک وہ ان کے ڈھانچوں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندی کے لیکھک اردو ادب سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے اور استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ عام فہم اُردو غزل اس لیے بہت زیادہ popular ہوئی ہے کہ اس کے اچھے گانے والے بھی پیدا ہو گئے ہیں جب کہ کلاسیکی موسیقی سے وہی لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جو اس فن سے کچھ نہ کچھ واقف ہوتے ہیں۔ مگر اب حکومت اور ہندی دانشوروں کی طرف سے اردو کی تعلیم پر اس لیے زور دیا جا رہا ہے کہ ملک و قوم کا وہ عظیم سرمایہ اور حسین روایت ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے جس نے جنگ آزادی میں بہت بڑا حصّہ لیا تھا اور جو ہمیشہ اچھے ہندی ساہتیہ کیلیے Freedom اور Tonic کا کام کرتی رہی ہے۔

دوسری طرف پاکستان کے چند دانشوروں نے اردو کو بھی تقسیم کرا کے اس کو اسلامی اردو کا لقب دینا چاہا جس کے سربراہ اردو کے مشہور نقاد اور "پھسلن" افسانہ کے خالق حسن عسکری تھے۔ مگر ان کا یہ Racket بہت دنوں تک نہ چل سکا۔ آج کے پاکستان میں اردو میں دوہے لکھے جا رہے ہیں اور ہائیکو کا زور ہے۔ جمیل الدین عالی اور دوسرے پاکستانی شعرا کے دوہے جس زبان میں لکھے جا رہے ہیں اس کو ہندی، پوربی بولی، اودھی

اور برج کے دوہے کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کتنے کومل کتنے سندر اور تخیل کے اعتبار سے یہ دوہے کتنے معیاری ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبیرؔ، تلسیؔ، میرؔ، اور نظیرؔ پھر سے زندہ ہو گئے ہیں اصلیت تو یہ ہے کہ تقسیم ملک سے زبان نہیں تقسیم ہو سکتی۔ مثال کے طور پر عالی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

عالی تیری کویتا ایسی جیسے پیڑ کھجور   چھایا مانگے پھل مانگے پنچھی سا مزدور
مزدور اور کسان سے مل جا انھیں سے ناتا جوڑ   چھوٹی موٹی سا بنکے بندہ اور جنتر منتر چھوڑ
جھوٹے نے اب تک کیسے کیسے کو کیے برباد   ان سے ناتا جوڑ کے رکھیو اتنا یاد

پاکستان میں چند اچھے اردو دانشور صوبائی عصبیت Provincialism کے شکار ہوئے اور اردو ترک کر کے اپنی اپنی صوبائی زبانوں میں ادب تخلیق کرنے لگے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ ضروری بھی ہے مگر اردو سے یک لخت ناتا توڑ لینا ایک قسم کے جنون کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ پنجابی ادیبوں نے فیض احمد فیض پر بھی زور ڈالا تھا کہ وہ پنجابی میں شاعری کیا کریں مگر ان کو اس کشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔

ہندوستان کے چند اردو دانشوروں نے یہ تجربہ بھی کر دیکھا کہ اردو ادب کا دیوناگری لپی میں ایک رسالہ نکالا جائے جس کے محرک خواجہ احمد عباس تھے اور راقم الحروف بھی ان کے ہمنواؤں میں تھا مگر اس پیش کش کو دونوں ہندی اور اردو والوں نے ٹھکرا دیا۔ باوجود اس ناکامی کے اب اردو ادب پہلے سے کہیں زیادہ ہندی رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ یعنی پہلی بس چھوٹ جانے کے بعد دوسری تیسری بس میں کشمکش کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہیں پر بات ختم نہیں ہوتی۔ اردو کا تمام کلاسیکی اور مسلمانوں کا مذہبی ادب بڑی تیزی سے دیوناگری میں منتقل ہو رہا ہے اور گھروں میں اس سے استفادہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کام کو سب سے پہلے سردار جعفری نے کیا تھا۔ دیوان غالب اور انتخاب میر آمنے سامنے فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کروایا تھا۔ برخلاف اس کے سرکاری Media آکاش وانی نے ہندی اور اردو خبروں کی زبانیں اتنی کلشٹ اور معرب اور مفرس کر دیں کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ دوری ہو گئی اور دونوں کے عام سننے والوں کو اپنے جہل کا احساس ہونے لگا تھا۔ اردو خبروں کی زبان ابھی اسی ڈھرے پر چل رہی ہے جب کہ ہندی خبروں میں باوجود سنسکرت کی آمیزش کے عربی اور فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں کثرت سے آنے لگی ہیں۔ آکاش وانی کو ہندی میں یہ تبدیلی اس لیے لانا پڑی کہ B.B.C. کی ہندی سروس ہندوستانی News اور Talks کے لیے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

پاکستانی دانشوروں نے مشرقی پاکستان میں بنگالیوں پر اردو کو تھوپنا چاہا نتیجہ میں پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ آج بنگلہ دیش ہے۔ ہندوستان کے جنوبی صوبوں میں اسی طرح ہندی کو عوامی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے نتیجہ میں مدراس تامل ناڈو ہوگیا اور آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی بن گئی۔

پاکستان میں جوش کی نظموں کا پس منظر پہلے سے زیادہ دانشورانہ ہوگیا تھا۔ اب تک اردو کی سب سے اچھی خودنوشت جوش کی "یادوں کی برات" ہے مگر اسی میں جب ان کا خالص پٹھانی انداز فکر سر اٹھاتا ہے تو وہ اپنے معاشقوں میں نہایت پھوہڑ بازاری نمائش بین نظر آتے ہیں اور دوسروں کو ننگا نچادینے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے۔ اگر ان حصّوں کو یادوں کی برات سے خارج کر کے دیکھا جائے تو اردو کی خودنوشتوں میں وہ ایک اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں نثری ادب کا کوئی قابل ذکر نمونہ کتابوں کی درآمد بند ہونے کی وجہ سے میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شاعری میں البتہ نظم میں کم اور غزل میں اچھے تجربے کیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیض کے بعد ابھرتے ہوئے شعری متفکرین میں افتخار عارف کا نام آج کل زبانوں پر ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "مہر دونیم" اردو دانشوری میں ایک Break through کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شعر یاد ہے سن لیجیے ؎

یہی معیار تجارت ہے تو کل کا تاجر برف کا باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آزادی کے بعد ہندوستان میں نثر کے کئی اچھے نمونے دیکھنے میں آئے۔ خواجہ غلام السیدین کی کتاب "آندھی میں چراغ" قرۃ العین کا ناول "آگ کا دریا" مولانا ابوالکلام آزاد کی جنگ آزادی کی دستاویزی تاریخ جو مدتوں صیغۂ راز میں رہی، ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "اردو ادب کا سماجی پس منظر" سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی"، عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرۂ خون" کمال احمد صدیقی کی تلاش و تحقیق "بیاض غالب" ڈاکٹر مجاور حسین کی "قومی یکجہتی" کلام حیدری کی کتاب "ادب اور تصوف" ڈاکٹر عقیل کی "نئی علامتی شاعری" معصوم رضا راہی کا ناول "آدھا گاؤں"، جس کو اردو میں تو کوئی جگہ نہ مل سکی البتہ اس کا شمار ہندی کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی کتاب "نظیر اکبرآبادی" ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور جگن ناتھ آزاد کے اقبال پر تحقیقی مقالے، صالحہ عابد حسین کی کتاب "یادگار حالی" ڈاکٹر صبیحہ اختر کی "اردو میں خودنوشت سوانح حیات کی تاریخ" ڈاکٹر روشن کاظمی کی کتاب "طویل نظم نگاری کی روایات اور ارتقاء" آزادی کے بعد سجاد ظہیر کا نثری شاعری کا پہلا مجموعہ "پگھلا نیلم" ہے اور معصوم رضا راہی کی غدر پر نظم "۱۸۵۷ء" اس عہد کی سب سے اچھی نظم ہے۔ طنز و مزاح میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کو حرف آخر نہ مان کر احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اس فن کو آگے بڑھایا۔

طویل نظموں کی کمی اپنی جگہ مسلم مگر برصغیر میں اردو دانشوری نے غزلوں میں بہت اچھے تجربے کیے ہیں۔ نئی علامتیں اور نئی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ اختراعات اور اجتہادات نے بھی قبول عام کی سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ چند دانشوروں نے غزل میں Neo-classicism کی بنیاد رکھی۔ عام طور پر اس دور میں غزلیں بہت کہی جارہی ہیں۔ اور تین چار مصرعوں کی مختصر نظمیں بھی۔ اس کا سبب بھی تاریخی حقائق سے جڑا ہوا ہے۔ زندگی تیز رفتار ہوگئی ہے۔ آج جو ہے کل نہیں رہے گا۔ آج جو کہا جائے، وہ وقتی طور پر آج کے لیے بہت اہم ہے۔ کل نہ معلوم کیا ہو اس لیے آج کی بات آج کہ کر دل ہلکا کرلو۔ اور اس کے لیے غزل سے زیادہ مناسب ترسیل کا کوئی ذریعہ نہیں ایک شعر میں پوری بات مکمل ہوجاتی ہے۔ نظم کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اس کے لیے طویل مدت درکار ہے جو آج میسر نہیں۔ تاہم اس دور میں جو نظمیں منظر عام پر آئی ہیں ان کو بھی دانشوری کا افشردہ ہی کہنا چاہیے مثلاً جاں نثار اختر کی گھر آنگن"، کیفی اعظمی کی نظموں کا مجموعہ" آوارہ سجدے" اور راقم الحروف کی نظمیں۔ نیلا پرچم۔ زمین۔ فن۔ وقت۔ سفر ناتمام اور غزل در غزل۔ اس دور میں پرانے افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے وہ ان کے Pre-independence افسانوں پر کوئی نیا اضافہ نہیں کرتے۔ نئے لکھنے والوں نے کافی تجربات کیے ہیں جن کی حیثیت کا تعین ابھی نہیں ہوسکا ہے۔ البتہ جیلانی بانو نے حیدر آبادی کردار اور حیدر آبادی بولی (Dialect) سے پورا استفادہ کیا اور آج وہ نئے افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلوب بھی نیا ہے۔ مسائل پرانے ہیں مگر حیدر آبادی مسائل کی شکل اختیار کرکے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اردو کے انحطاط کے بعد دانشوروں کا وہ طبقہ جن کو Scientific thinkers کہنا چاہیے، ہندوستان میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اردو میں فارسی رسم الخط کے حروف تہجی ہیں بے علم لسانیات اور صوتیات کے اعتبار سے زواید کو خارج کرکے اردو رسم الخط کو آسان بنایا جائے تاکہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اس کا سیکھنا بے جا مشکلات سے چھٹکارا پا جائے۔ اردو میں چونکہ عربی کی طرح قرأت اور مخرج تو ہوتا نہیں اس لیے اردو کے ہم آواز حروف تہجی میں قطع و برید کی جائے مثلاً الف اور ع میں سے ع نکال دیا جائے۔ "ت اور ط" میں ت کافی ہے۔ "ث، س اور ص" میں سے ث اور ص خارج کردیے جائیں۔ "ذ، ز، ض اور ظ" میں صرف ز باقی رکھی جائے۔ "ہائے ہوز اور حائے حطی" میں حائے حطی نکال دینے سے کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ مزید یہ کہ اب اردو جاننے کے لیے عربی کون پڑھتا ہے اور کون پڑھاتا ہے۔ اور پوری لغت کو رٹنا آسان کام نہیں۔ اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ زیادہ تر عربی کے حروف تہجی کے خارج کردینے سے "ہم آواز" الفاظ کے معانی کا تعین کس طرح ہوسکے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "ہم آواز" الفاظ کے معانی کا تعین سیاق و

سباق عبارت سے ہوگا۔ آخر ہم کس طرح جان جاتے ہیں کہ ایک جگہ "سہارا" کا مطلب مدد ہے اور دوسری جگہ سہارا ایک ریگستان ہے۔ اردو میں اعراب بھی متروک ہیں اس لیے ایک جگہ سمندر سے مراد خشکی کے ہر طرف پھیلے ہوئے گہرے پانی سے لی جاتی ہے اور دوسری جگہ سمندر کا مطلب آگ کے کیڑے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خَلق، خُلق، مَرد، مُرد، دُور، دَور، سِیل، سَیل وغیرہ وغیرہ دوسری طرف تبدیل شدہ املا کے الفاظ کو دیکھیے "باز ایک شکاری پرند ہے۔ زالف سے (بعض) باز (حالتوں) ہائے ہوز سے ہالتوں میں سختی سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔

Intellectual thinking یا دانشوری اب پہلے سے زیادہ سائنٹفک ہو گئی ہے اور Science Oriented بھی یعنی سائنسی حقائق پر بھی تحقیقی ادب پیدا ہو رہا ہے۔

جوہری توانائی اور خلائی سائنس نے دانشوری کا انداز فکر بدل دیا ہے۔ وہ ایک زیادہ ترقی یافتہ ثقافت اور فن کی طرف قدم اٹھا رہی ہے۔ نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاریوں سے اب ایک دانشور اُن ہوا بازوں سے زیادہ واقف ہے جنھوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم گرائے تھے پہلے وہ زمین کو حقیر اور اسفل سمجھتا تھا اور اب وہ اس کے گیت گاتا ہے۔ پہلے دانشوری روایت پرستی کو سینے سے لگائے رکھتی تھی اور اب روایت شکنی اور اجتہاد پر زیادہ زور دیتی ہے۔ شکست و ریخت کا بھی سبق اس نے سائنسی تجربوں سے سیکھا ہے۔

آزادی کے بعد دانشوروں نے دانشوری کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف سمتوں میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ اقتدار، شہرت یا اپنی پوری ذہنی دیانت داری کے ساتھ خدمت قوم و وطن کی خاطر وہ عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ اور چند نے ان میں بحیثیت ماہر تعلیم، ماہر علوم، یا بحیثیت بیوروکریٹس یا ڈپلومیٹس کافی نام بھی پیدا کیا مگر وہ یہ بھول گئے کہ قانون سازی، پالیسی میکنگ اور انتظامیہ کی نگرانی اور ان کا جائزہ اور مناسب دانشورانہ رہنمائی اور تنقید باہر سے کر کے بہتر نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ جب دانشوری کسی مشین کا پرزہ بن جائے گی تو اس کو خود بھی مشین کے ڈھانچے، رفتار، پالیسی اور اس کے کام کرنے کے انداز کا پابند ہو جانا پڑے گا۔ اور خود اس کی فطری صلاحیتیں عضو معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک مثال جس کو لطیفہ ہی کہا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو۔ مسز سروجنی نائیڈو مجھ کو بہت عزیز رکھتی تھیں اور میں بھی ان کی خدمت میں تہذیب کے دائرہ میں رہ کر ان سے گستاخ بھی تھا۔ ایک بار جب وہ لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر آرام کرسی میں بیٹھی ہوئی اپنی الیسیشین کتے سے گیند کھیل رہی تھیں تو میں مخل ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو گورنر بننے سے کیا حاصل ہوا۔ بس یہی کہ یہاں وہاں اودگھاٹن کرتی پھرتی ہیں جس سے بلبل ہند کا گلا رُندھ کر رہ گیا ہے۔ تو محترمہ نے فرمایا تھا:

Young man that you are an idealist horrible, you have gone home with my دکھتی رگ. At this age I need only three things: Comfortable living, even more comfortable travelling and best medical aid in easy reach.

تقریباً یہی بات میں نے ماضی قریب میں اُردو کے ایک بہت بڑے دانشور سے بھی سنی تھی۔ چند دانشور کراچی اور رام پور میں اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کو عصری تقاضوں کی روشنی میں قرآن حکیم کا نیا اردو ترجمہ اور نئی تفاسیر لکھنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر احمد علی کراچی اور رام پور کے عظیم مستشرق اسحاق النبی علوی کے اسمار سرِ فہرست آتے ہیں۔

برصغیر میں آزادی کے بعد دانشوری تین حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو انسانوں کے اجتماعی حقوق کے تحفظ اور فرائض کی ادائگی پر قلمی جدوجہد کو اپنی تخلیقات کی اساس سمجھتے رہے خواہ ارباب حل وعقد سے متصادم ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ دوسرے گروہ نے اپنے دانشورانہ فرائض کو بھلا دیا اور ذاتی مفاد پرستی سے مفاہمت کرلی۔ تیسرا گروہ جس نے فرد کو اجتماعیت پر ترجیح دی اور نتیجہ میں بجائے مشکلات اور مسائل کا اجتماعی طور پر مقابلہ کر کے اس کو حل کرنے اور شکست دینے کے پوری طرح یاسیت کا شکار ہو گیا، اور اس میں لذت لینے لگا۔ شتر مرغ کی طرح اپنے کو خطرہ سے بچانے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیل دیے۔ اور بجائے استیصالی قوتوں سے دست و گریباں ہونے اور انحراف کرنے کے اپنے ہی سے منحرف ہو گیا۔ اور جھنا جھن ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگا۔ یعنی خودکشی کرلی مگر خودکشی تو مسئلہ کا حل نہیں ہوا کرتی۔ جدوجہد میں بڑی طاقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جدوجہد کا حاصل مجاہد کو نہ ملے مگر آنے والی نسلیں تو اس کا صلہ ضرور پائیں گی۔ بزرگ باغ لگاتے ہیں اور بیٹے پوتے اس کا پھل کھاتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے اندازِ فکر کو دانشوری نہیں کہا جا سکتا۔ اباہیلیں اڑانا دانشوری نہیں ہے۔ بے سرو پا باتیں کرنی دانشوری نہیں ہے۔ اس طرح اپنی صلاحیتوں سے کھیلنے والوں کو Pseudo Intellectual ہی کہا جائیگا۔ بقول پروفیسر ممتاز حسین کے T.S.Eliot نے پوری ایک نسل کو بیوقوف بنانے کے بعد اپنے رومن کیتھولک عقیدہ پر ایک طویل مقصدی نظم لکھ ڈالی۔

رہی لہجہ کی بات تو اس کا تعلق دانشورانہ Thinking سے نہیں ہے۔ لہجہ کا بدلتا رہنا زبان وادب کا ایک فطری اور ارتقائی خاصہ ہے جو وقت مذاق اور ضرورتوں کے ساتھ بتدریج بدلتا رہتا ہے۔ اس کا تعلق تاریخی حالات سے بھی ہے۔ آزادی کے بعد پوری زبان وادب کا لہجہ بدلا۔ اور یوں ہی متواتر بدلتا رہے گا۔

زندگی متحرک ہے۔ دیکھا جائے تو زندگی دانشوری کا موضوع ہے اور لہجہ اس کا اسلوبی جامہ۔

خدابخش لائبریری پٹنہ کا یہ سلسلہ بھی Post Independence Intellectual Thinking کا ایک شاخسانہ ہے۔ Mass Communication Research Centre, Jamia, N.Delhi جو اس وقت Education through mass media پر کام اور تجربات کر رہا ہے Audio Visual science oriented way of Intellectual thinking ہے۔ کھلی دانشگاہیں اور تعلیم بذریعہ مراسلات بھی ضرورتِ وقت کی ایجادات اور آزادی کے بعد Intellectual thinking کے نتائج ہیں مگر ان کو مزید وسعت دینا اور عام بنانے کی ضرورت ہے۔ نوجوان دانش جویانِ قوم کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ابھی تک ان سب کی کھپت نہیں ہو سکی ہے۔

باوجود ان سب دانشورانہ مساعی کے ہم میں ایک دانشورانہ جہل بھی ہے اور جو کہنہ (Chronic) ہوتا جا رہا ہے۔ ہم من حیث القوم Make belief یعنی اپنے کو کھوکھلی یقین دہانی کا عادی بنا چکے ہیں جس کے نتیجہ میں نہ ہم تنقید برداشت کر سکتے ہیں نہ نئی نسلوں کو صحت مند ترقی یافتہ اندازِ فکر کے راستہ پر لگا سکتے ہیں۔ مگر دانشوری کو اس بنیادی کمزوری سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اپنے مکان اپنے شہر اور اپنے وطن سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہئے کہ یہ جبلّی اندازِ فکر ہے مگر کیا باوجود وطن سے محبت ہونے کے موجودہ حالات میں اپنے وطن کو بہترین اور حرفِ آخر کہنا درست ہے۔ ہم کو اپنا گھر بہت پسند اور بہت عزیز ہے درانحالیکہ وہ کئی جگہ سے ٹپکتا ہے اور ہر موسم میں تکلیف دہ ہے۔ ہم کو اپنے شہر سے ایک قلبی لگاؤ ہے درآں حالیکہ وہ بہت گندہ ہے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور محلے سیلن سے تر رہتے ہیں۔ ہم کو اپنے ملک سے ایک جذباتی وابستگی ہے درانحالیکہ اس میں غربت، بیکاری اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، ملک کی دولت کی تقسیم بہت ناقص ہے اور لاقانونیت اپنے شباب پر ہے تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ آزادی سے پہلے Intellectual thinking غیر ملکی حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی تھی کہ تم نے ہمارے ملک کو برباد کر رکھا ہے تم یہاں سے چلے جاؤ اور اس کو چلا جانا پڑا۔ آج آزادی کے تقریباً چالیس برس ہو رہے ہیں اور ہمارا آزاد ہندوستان کا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ہم کو برصغیر میں وہ دانشوری نہیں ملتی جو اربابِ حل وعقد سے دوبدو یہ کہہ سکے کہ پراچین کال میں ہمارا پیارا وطن سارے جہاں سے اچھا رہا ہوگا مگر پہلے انگریزوں نے اور اب تم نے اسکو انگریزوں سے بھی زیادہ خراب بنا رکھا ہے۔ تم گوتم بدھ، اشوک، چشتی، گرونانک اور گاندھی کے

حوالے دے کر ہماری حسین برمیرا کو یاد دلا کر، ہمالیہ کو وطن کا سنتری کہہ کر اور ان سب کے گیت سنوا کر ہمکو تھپکیاں
دے کر خواب غفلت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش!
اس وقت کا خیال کرو اور ڈرو۔ محض دکھاوے کی لیپا پوتی سے وطن کے مصائب ختم نہیں ہو سکتے۔
ہم کو ایک عظیم اقتصادی۔ سماجی اور دانشورانہ انقلاب کی ابھی ابھی ضرورت ہے آخر اس تاخیر بیجا کا سبب کیا ہے،
کس کے مفاد کے تحفظ کے لیے اس عظیم انقلاب کو صدیوں پر ٹالا جا رہا ہے؟ نصف صدی تو ہونے کو آئی۔ ہم
کبتک اسکا انتظار کرتے رہیں گے۔ ایسلیے اسوقت ہمکو Quite flows the Don, Spartacus اور
For whom the bell tolls جیسے Powerful ناولوں کی ضرورت ہے۔ اقبال کی نظم "فرمان خدا"
جیسی شاعری کی ضرورت ہے۔ کرسٹوفر کوڈول کی تنقیدوں جیسی تنقید کی ضرورت ہے۔ پیبلو پکاسو کی گورنیکا جیسی مصوری
کی ضرورت ہے۔ پال روبسن کی موسیقی جیسی موسیقی کی ضرورت ہے۔ یعنی اس وقت برصغیر کو ایک Dynamic
یا متحرک اور جرأتمند دانشوری کی ضرورت ہے۔ Intellectual thinking آخر میں سمع خراشی کی
معذرت چاہتے ہوئے ایک نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مزید مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ Intellectual
thinking اور Computerised thinking کا مسئلہ ہے مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی دماغ
سے زیادہ مکمل اور بڑا کمپیوٹر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ Computer سے ضروری معلومات اور اعداد
و شمار تو بغیر وقت برباد کیے ہوئے حاصل کیے جا سکتے ہیں مگر کوئی تخلیقی کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس
وقت تو یہی صورت ہے آئندہ کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ تحقیقی کاموں میں اس مشین کی مدد سے کسی
اطلاع یا عدد کی صحت یا عدم صحت دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یوں تو دانشوروں نے Scientific
fictions میں یہاں تک Wishful intellectual thinking کی ہے کہ انسانوں کی دنیا میں Robots
کی صنعت قانوناً اس وقت ممنوع ہو جائے گی جب اس مشینی انسان میں محبت، نفرت، پیار، طیش کے جذبات اور
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکیں گی اور جس کو آسانی سے مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔
نیوکلائی جنگ کے متعلق دانشوری کی بے اعتنائی کا احساس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کا عام آدمی سوچتا
ہے کہ مرگ انبوہ جشن دارد۔ مرنا تو ہے ہی وہ چاہے غربت کا شکار ہو کر مرے یا جنگ سے۔ نیوکلائی جنگ میں اس کو
تسکین بخش یہ پہلو نظر آتا ہے کہ اس کے ساتھ vested interest والا بھی فنا ہوگا۔ عوام کے اس جذبہ کو
دور کرنے کی کوئی وقیع کوشش اردو دانشوری نے اب تک نہیں کی ہے۔

●●

تازہ دانشوری

○ دکھ کا دودھ
ڈاکٹر سعید اختر درانی

○ ہم
ضیا جالندھری

یہ دو نظمیں ہم احمد ندیم قاسمی کے شاندار رسالہ "فنون" کے تازہ نمبر بابت جنوری ۱۹۹۱ء سے نقل کر رہے ہیں۔

ادارہ

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

دُکھ کا دُودھ

مَیں ہوں گوالا، مَیں ہوں گوالا
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری
ہے کوئی پینے والا ؟
دُکھ کے دُودھ کا اِمرت، مورکھ
تیرے سارے سُوکھے پَودے
پھر سے کرے شاداب
تیری سوکھی دھرتی اُگلے
موتی موتی پھول چنبیلی
لعلوں لعل گُلاب
دُکھ کے رس سے سُوکھی مِٹّی
ہِردے کی سیراب
دُکھ کے باج ہیں نَیناں اندھے
اور کُل جگ سُنسان
دُکھ کا اِمرت پی کر جھُومیں
بِروہی کے اِکھ سے سوتے

میٹھے میٹھے، دِھیمے دِھیمے
دُکھ کا اِمرت پی کر جب وہ آنکھیں موند کے کھولے
دھنک کے ساتوں رنگ دکھائے چِتر کار وِدوان
دُکھ سے پھُوٹے گیان دھیان کی گنگا
دُودھ سے اس کے شوبھا گیان جلوان
مَیں ہوں گوالا، مَیں ہوں گوالا ——
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری
ہے کوئی دُودھ آدھاری ؟
میں ہوں گوالا، میں ہوں گوالا
ہے کوئی پینے والا ؟

••

جناب ضیا جالندھری

ہم

بچھی ہوئی ہے بساط کب سے
زمانہ شاطر ہے اور ہم
اس بساط کے زشت و خوب خانوں میں
دستِ نادیدہ کے اشاروں پہ چل رہے ہیں
بچھی ہوئی ہے بساط ازل سے
بچھی ہوئی ہے بساط جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے
بساط ایسا خلا ہے جو وسعتِ تصوّر سے ماورا ہے
کرشمۂ کائنات کیا ہے
بساط پر آتے جاتے مُہروں کا سلسلہ ہے

بساطِ ساکت ہے وقتِ مطلق

بساط بے جنبش اور بے حس ہے
اپنے مہروں سے لاتعلق ہے
اس کو اس سے غرض نہیں ہے
کہ کون جیتا ہے
اور کس نے شکست کھائی

وجود حادث، وجود مُہرے

بساطِ ساکت کی وسعتوں میں
زمین، اہلِ زمین، افلاک، اہلِ افلاک
اپنی اپنی معیّنہ ساعتوں میں ایسے گزر رہے ہیں
کہ جیسے آنکھوں سے خواب گزریں

بساط پر جو بھی ہے
وہ ہونے کی مہلتوں میں اسیر
بہم بدل رہا ہے
وجود وہ حدّتِ رواں ہے
جو نت نئی ہیئتوں میں باقی ہے
اور اس کو فنا نہیں ہے

جہاں پہاڑوں کے آسماں بوس سلسلے ہیں
وہاں کبھی بحر موج زن تھے
جہاں بیاباں میں ریت اُڑتی ہے
بادِ سموم گونجتی ہے

وہاں کبھی سبزہ زار و گلگشت کا سماں تھا
بلند و بالا، حقیر و ہیچ
اِس شکست و تعمیر کے تسلسل میں بہہ رہے ہیں
شکست و تعمیر کے تسلسل میں تو ہے، میں ہُوں

ہم ایسے مُہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
جنھیں تمنّا کے رنگ دِکھلا دیے گئے ہیں
مگر وسیلوں پہ قدغنیں ہیں
جنھیں محبّت کے ڈھنگ سِکھلا دیے گئے ہیں

پہ دست و پا میں سلاسل نو بنو
تو گردن میں طوق پہنا دیے گئے ہیں

جو ہے جواب تک ہُوا ہے، جو ہو رہا ہے
اُس سے کِسے مَفَر ہے
کوئی جو چاہے
کہ عہدِ رفتہ سے ایک پَل پھر سے لوٹ آئے
کہا ہوا لفظ اَن کہا ہو سکے
تو اُس آرزو کا حاصل وہ جانتا ہے
بہت سہی اختیار و امکاں
مگر ہواؤں کے سامنے
برگ و خس کی تابِ مجال کیا ہے

نموئے غنچہ میں اُس کا اپنا کمال کیا ہے

تری نگاہوں میں تیرا غم کوہ سے گراں تر ہے
تو سمجھتا ہے
تیرے سینے کے سُرخ لاوے سے
شہر و قریہ پگھل رہے ہیں
خزاں زمستاں تری اُداسی کے آئینے ہیں
تو مشتعل ہو تو زلزلوں سے زمین کانپے
تجھے گماں ہے
کہ گُل کِھلے ہیں ترے تبسّم کی پیروی میں

یہ پھُول کو اختیار کب تھا
کہ کون سی شاخ پر کِھلے
کون کنج میں مسکرائے
اور کن فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیرے
نحیف شعلہ جمال کونپل
جو دستِ نازک کی نرم پوروں سے دھیرے دھیرے
دریچۂ شاخ کھول کر
صبح کی سپیدی میں جھانکتی ہے
یہ سوچتی ہے
کہ باغ سارا اُسی کے دم سے مہک رہا ہے
اُسی کے پرتو سے گوشہ گوشہ دمک رہا ہے
اُسی کے دیدار میں مگن

خوشبوؤں سے بوجھل ہواؤں میں
شوخ تتلیاں رقص کر رہی ہیں

وہ بے خبر ہے
کہ شاطرِ وقت کی نظر میں
کوئی اکائی
شجر حجر ہو کہ ذی نفس ہو
نظامِ کُل سے الگ نہیں ہے
وہ یہ نہیں جانتی کہ ہستی کے کارخانے میں
اس کا ہونا نہ ہونا بے نام حادثہ ہے
اور اس کے حصے کا کُل اثاثہ
وہ چند لمحے، وہ چند سانسیں ہیں
جن میں وہ خواب دیکھتی ہے
سلیقۂ ذات سے چمن کو سنوارنے کا
بہارِ جاں کو نکھارنے کا

(۲)

بجا کہ ناپائدار ہے یہ وجود میرا
ہیں غیر فانی حیات کے سلسلے میں
اِک بیچ کی کڑی ہوں
رہینِ گردش بھی، مرکزِ کائنات بھی ہوں
جو میں نے دیکھا ہے، وہ مرے خوں میں رچ
گیا ہے
جو میں نے سوچا ہے، مجھ میں زندہ ہے
اور جو کچھ سنا ہے مجھ میں سما گیا ہے
ہوا کی صورت ہر ایک احساس
میری سانسوں میں جی رہا ہے
ہر ایک منظر مرے تصور میں بس گیا ہے
میں ذاتِ محدود اپنی پہنائیوں میں
اِک کائنات بھی ہوں

مری رگوں میں وہ جوششِ جاوداں رواں ہے
جو شاخ میں پھول کی نمو ہے
جو بحر میں موج کی تڑپ ہے
پرِ کبوتر میں تابِ پرواز ہے
ستاروں میں روشنی ہے
میں اپنے ہونے کے سب حوالوں میں رونما ہوں
میں جا بجا صورتِ صبا ہوں
غزالِ خوش چشم کی کلیلوں میں کھیلتا ہوں
ہمکتے بچے کی مسکراہٹ ہوں
پیرِ شب خیز کی دعا ہوں
میں مہر میں، ماہتاب میں ہوں
یہ کیسی چاہت ہے جس سے میں
ایک مستقل اضطراب میں ہوں
وہ کون سی منزلِ طلب تھی
کہ رانجھا رانجھا پکارتی ہیر

آپ ہی رانجھا ہو گئی تھی

فلک سے انوار
کوہ سے چشمے
شاخ سے پھول پھوٹتے ہیں
مگر ہر اک پھول میں نمی بھی ہے روشنی بھی

زباں میں الفاظ،
آنکھ میں دید،
دل میں احساس رکھ دیے گئے ہیں
یہ لفظ، احساس، دید اک دوسرے کا پیوند ہو گئے ہیں
نمود و تخلیق کے عمل بار بار دہرائے جا رہے ہیں
جمالِ ارض و سما کی تکمیل ہو رہی ہے
محبّت اعجازِ سرمدی ہے

تمہاری آنکھوں کی مسکراہٹ میں
میری چاہت کی روشنی ہے
یونہی شگوفوں کے پاس بیٹھی رہو
شعاعوں کو عارض و لب سے کھیلنے دو
ہوا کے ہاتھوں کو اپنے گیسو بکھیرنے دو
بہار کی ساری خوشبوئیں
اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو
مرے چشم و دل کو یقیں دلاؤ
کہ تم فقط خواب ہی نہیں ہو

گزرتے بادل کا کوئی عکسِ رواں نہیں ہو
تم اِک حقیقت ہو، محض وہم و گماں نہیں ہو
مرے قریب آؤ اور مری ذات کو مٹا دو
مجھے تم اپنے جمال کی ضو میں جذب کر لو
وصال میں فرد کی فنا ہے
وصال میں فرد کی بقا ہے
بہار کی دید عارضی ہے
بہارِ تجرید دائمی ہے

وداع کے وقت آنسوؤں میں
وہ سارے منظر جھلک رہے ہیں
جو شاخِ جاں پر گلوں کی صورت کھِلے ہوئے تھے
وہ سارے امکاں جھلک رہے ہیں
جو کرچی کرچی بکھر گئے ہیں
بکھرنے والوں کو اپنے مرکز کی آرزو ہے

نہیں مجھے اس طرح نہ دیکھو
کہ جیسے نظروں میں روح تک اُمڈی آ رہی ہو
یہ ہاتھ کچھ دیر اور رہنے دو میرے ہاتھوں میں
کچھ نہ بولو
کہ میں یہ نایاب لمحے آنکھوں میں جذب کر لوں
یہ شانیے روح میں چھپا لوں
ہر ایک لمحہ اِک ارمغاں ہے

تمھاری چاہت کا ارمغاں ہے
یہ ثانیے ایسے پھول ہیں
جو کہ کھلتے رہتے ہیں دل ہی دل میں
شگفتہ رہتے ہیں رہتے دم تک

یہ چند لمحے کسی کسی کے نصیب میں ہیں
وگرنہ عمریں
غموں کے کانٹے نکالنے میں گزر گئی ہیں

(۳)

وہ شام ہوٹل میں اس طرح آئی
جیسے دشمن کی فوج اُترے
جگہ جگہ جست اور کانسی کے برتنوں جیسے چہرے
جھم جھم کھنک رہے تھے
تمام ہوٹل جگر جگر جگمگا رہا تھا
میں کنجِ تنہائی میں تحیر سے دیکھتا تھا
کہ کیسے خوش باش ہیں جنھیں یہ خبر نہیں ہے
کہ ان کی بنیاد اکھڑ چکی ہے

ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں
شجر پھلوں سے لدے ہیں لیکن
جڑوں کا زہر ان پھلوں کے ریشوں تک آگیا ہے

جو حال اب ہے کبھی نہیں تھا
حیات خوار و زبوں تو تھی لیکن اتنی خوار و زبوں نہیں تھی

وہ دیر سے انتظار گہ میں
ہر آنے والے کو نظروں نظروں میں ناپتی تھی
لباس کی شوخی و جسارت
سنگھار کی جدت و مہارت کے باوجود
اس کا گوشۂ چشم عمر کی چغلی کھا رہا تھا
نگاہ نو وارد اجنبی پر پڑی تو اس طرح مسکرا دی
کہ جیسے اُس کی ہی منتظر تھی
اُٹھی، قریب آئی اور بولی
میں ایک مدت سے خدمتِ خلق کر رہی ہوں
دُکھے دلوں کا علاج کرتی ہوں
رنگ اور روشنی کے شہروں میں
شامِ تنہائی کی دل افسردگی سے واقف ہوں
آپ اکیلے ہیں تو کوئی انتظام کر دوں
یہاں سے میں دُور دُور ملکوں کو
ہر طبیعت کے گاہکوں کی پسند کا مال بھیجتی ہوں
وفا، محبت پرانی باتیں ہیں اب انھیں کون پوچھتا ہے
بڑے بڑے اُونچے اُونچے لوگوں سے رات دن میرا واسطہ ہے
یہ صاحبانِ وقار و نخوت
خریدنا اور بیچنا خوب جانتے ہیں
یہ دام دیتے ہیں اور راحت خریدتے ہیں

بجا ہے یہ بھی کہ بے بسوں کی انا و عزت خریدتے ہیں
مگر جب آتے ہیں بیچنے پر
تو بے تکلف ضمیر تک اپنا بیچ دیتے ہیں
جاہ و ثروت کی منڈیوں میں
میں کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو
آج کی رات کا کوئی انتظام کر دوں

وہ شام کے وقت خوں میں لت پت
سڑک کنارے پڑا ہوا تھا
گزرنے والوں سے کہہ رہا تھا
ہمیں ہمارے محافظوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ
وہ خواہشِ اقتدار و دولت میں
ہم کو نیلام کر رہے ہیں
اخوت و اتحاد کا درس دینے والے
خود اپنے بچوں کے خوں سے
حرص و ہوس کی شمعیں جلا رہے ہیں
ہماری اقدار
آج متروک فیشنوں کے لباس کی طرح
ان کی نظروں سے گر چکی ہیں
اب اُن کی اولاد اُن کی ریشہ دوانیوں سے پناہ
تازہ بتازہ نشوں میں ڈھونڈتی ہے
انھی کی شہ پا کے نسلِ نو
اپنی پیاس اِک دوسرے کے خوں سے بجھا رہی ہے
یہ سنگدل جشنِ مرگِ انبوہِ بے گناہاں منا رہے ہیں
کوئی ہمیں ان عجیب صورت
حریص، بے مہر کرگسوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ

یہ نغمۂ کائنات کی بے سُری صدائیں ہیں
کوئی ان سے نجات کا راستہ بتاؤ

(۴)

ہم اپنے خوابوں میں جی رہے ہیں
ہم اپنے صبح و مسا سے تنگ آ کے
خواب بُنتے ہیں اور خوابوں میں جی رہے ہیں

بساطِ ساکت سے کوئی شکوہ
نہ شاطرِ وقت سے گلہ ہے
ہمیں شکایت ہے آدمی سے
کہ آدمی آدمی کا دوزخ بنا ہوا ہے

عجب تضادات کا مرقع ہے آدمی بھی
یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں جمال بھی ہے
صداقت و حسن کا طلب گار بھی وہی ہے
بہیمیت اور وحشت و جبر کا پرستار بھی وہی ہے

زمیں پہ قابیل کے قبیلے کی رسمِ بیداد اوج پر ہے
مگر ہمارا عذاب اُس سے بھی تلخ تر ہے
کہ ہم جو ہابیل کے حواری تھے
عہدِ ہابیل میں بھی زنجیر ہی رہے ہیں
شباہتوں کے فریب خوردہ تھے، یہ نہ جانا
نقاب پوشوں میں کون کیا ہے
ہمیں تو غم تھا کہ نشۂ اقتدار
قابیل ہو کہ ہابیل
جس کسی کو چڑھا
وہ انسانیت کو تاراج کر گیا ہے

ہمارے خوابوں سے ڈر رہے ہیں
وہ ڈر رہے ہیں کہ خواب الفاظ میں ڈھلے تو
دروغ کے پردے چاک ہوں گے
اور ان کے چہروں کا غازہ اُترا
تو آئنے بھی عذاب ہوں گے

ہم ایسے ٹھہرے
جنھیں ارادے دیے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
ہمیں شکستیں ہوئیں مگر ہر شکست مہمیز ہو گئی ہے
ہمارے ساتھی گرے پہ رفتار اور کچھ تیز ہو گئی ہے

یہاں کی سنگین بے حسی میں
ہماری کوشش کا حال یہ ہے
کہ جس طرح کوئی تیتری
اِک خزاں زدہ باغ بے نمو میں
بھری بہاروں کی جستجو میں
تبسمِ گُل کی آرزو میں
شجر شجر شاخ شاخ بے تاب پھر رہی ہو

ہمارے ہوتے بہار آئے نہ آئے لیکن
ہمیں یہ تسکین ہے کہ ہم نے
حیاتِ ناپائدار کی ایک ایک ساعت
چمن کی ہیئت سنوارنے میں گزار دی ہے
فضائے ہستی نکھارنے میں گزار دی ہے

••

بازیافت

○ مولانا مودودی کی دوسری قدیم ترین تحریر

حوادث سمرنا ______

مودودی صاحب کی دو قدیم تحریریں آپ ملاحظہ فرما چکے، ایک 'جرنل نمبر ۵' میں اور دوسری 'معیارِ تحقیق' نمبر ۱ میں۔ وہ دونوں ۱۹۱۹ء کی تحریریں تھیں۔

پیشِ نظر کتابچہ پر اکتوبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس تحریر کا بڑا حصہ ترجمہ ہے، لیکن، یہ ملاحظہ فرمائیے کہ ترجمہ بھی کیسا اور برمحل لگتا ہے۔ آخری صفحہ خالص ان کی اپنی تصنیف/ تحریر ہے۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

مترجمہ

مولینا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیق واقعات مظالم کا نتیجہ ہے جو لوزین کی انجمن عثمانی نے شایع کی ہے

ناظم دار الاشاعت سیاسیات شرقیہ نے

بماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

عبد الحمید کے اہتمام سے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کے شائع کیا

بار اول

قیمت [illegible]

باسمہٖ سبحانہٗ

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

ذیل کی رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیقات واقعات مظالم کا نتیجہ ہے، یہی وہ رپورٹ ہے جس کی اشاعت کو برطانوی حکومت نے مناسب نہیں خیال کیا چنانچہ دارالعوام میں جب ایک ممبر نے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا تو جواب میں خود مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے یہ کہا کہ سر دست حکومت اس کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھتی، کیونکہ اس کی اشاعت سے سمرنا کے تصفیہ یا مسلمیت ممکن ہے کہ خطرہ میں پڑ جائے اور ہمیں پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں لیکن لوزین (سوئٹزرلینڈ) کی انجمن عثمانی نے ترکی و اطالوی حکومت کے ذریعہ سے اس کو حاصل کر کے یورپ میں شایع کر دیا ہے، ہم جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رکن اول وفد خلافت کے ممنون ہیں کہ انکی عنایت و کرم سے یہ رپورٹ ہمیں ہاتھ آئی۔

ناظم دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ دہلی

تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ التوائے جنگ کے بعد سے ولایت سمرنا کے عیسائیوں کی حالت بالکل قابل اطمینان تھی اور انکی مذہبی و تمدنی زندگی کے

نے ترکی حکومت میں کوئی خطرہ نہ تھا پس اگر اسی خطرہ کی بنا پر مجلس صلح نے سمرنا کو یونان کی حکمبرداری میں دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ایک غلطی تھی اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے یہ غلط واقعات مجلس تک پہنچائے ہیں،

۲- ان افسوسناک واقعات کی حقیقت مذہبی تعصب میں ڈھونڈی جا سکتی ہے، یونانی حکام نے ان لوگوں کی روک تھام میں کچھ نہیں کیا جو عام یونانیوں میں مذہبی جنون کو ترقی دے رہے ہیں بلکہ بہت جلد ان کے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کا قبضہ قیام امن کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ اپنے زعم میں ایک صلیبی فاتح کی حیثیت سے سمرنا میں داخل ہوئے تھے

۳ جو واقعات شہر سمرنا میں ۱۵ اور ۱۶ مئی کو اور اس کے بعد دوسرے مقامات میں پیش آئے ان تمام کی ذمہ داری یونان کے سپہ سالار اور چند دیگر ذمہ دار فوجی افسروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے فرائض کی طرف سے پوری غفلت برتی خود یونانی حکومت نے اس ذمہ داری کو تسلیم کیا ہے،

کچھ تھوڑی سی ذمہ داری سمرنا کے ترک افسروں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے یونانی قبضہ سے پہلے ان قیدیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا جو قید خانوں سے بھاگ کر مسلح ہو گئے تھے.

۴- سمرنا کی آبادی پر جو ہولناک مظالم ہوئے اور جنکی بدولت ساری ولایت کی سر زمین خون سے سرخ ہو رہی ہے اس کی پوری ذمہ داری حکومت یونان پر عاید ہوتی ہے. کیونکہ

(الف) اس نے مجلس صلح کی ان ہدایات پر عمل نہیں کیا جو اسمنی کو بذریعہ تار بھیجی گئی تھیں،

(ب) اس نے اتحادی نمایندوں سے استمزاج کیے بغیر جن کو نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا اپنے سپہ سالار کو اجازت دیدی کہ ایدان، قصابہ اور منیسہ کی طرف فوجیں بھیجے، حالانکہ یہ علاقے اس رقبہ میں داخل نہیں جو یونان کی حکمبرداری میں دیا گیا،

(ج) اس نے مقبوضات کی توسیع کے شوق میں باشندوں کی حفاظت اور آسایش کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں زبردست جوش پھیل گیا اور حاکمانہ قوت سے ٹکرا گیا،

۵ - سمرنا کی یونانی گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام ان حرکات کے بھی ذمہ دار ہیں، جو مسلح یونانی عوام نے کی ہیں، کیونکہ انھوں نے ان عوام کو باقاعدہ فوج کی طرح استعمال کیا اور تمام ملک میں انہیں پھیلا دیا۔

۶ - ولوی مینندریں جو مصایب نازل ہوئے ان کی سب سے بڑی وجہ یونانیوں کا غیر منصفانہ قبضہ تھا، یونانی فوج کا ہر قدم جو آگے بڑھتا تھا خوفناک حوادث اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، صدیوں سے جو نفرت و عداوت یونانیوں اور ترکوں میں قایم ہے اس نے ظلم وستم کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے، لیکن انصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو صرف یونانی اس کے ذمہ دار نہیں ہیں ؎۱

برغاموہ منیسہ، اور یوڈمیش کی بربادی کے بھی تقریباً یہی وجوہ ہیں،

؎۱ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف یونانی ہی نہیں بلکہ اتحادی بھی ہیں،

۷۔ مگر صرف یونانی ہی (اور یونانی کمانڈر خصوصیت کے ساتھ) مینیمن کے اس قتل عام کے ذمہ دار ہیں جو برغامو کے واقعات سے متاثر ہو کر یونانی فوجوں نے کیا ہے یونانی کمانڈر کا فرض تھا کہ برغامو کی مدافعت سے برافروختہ سپاہیوں کو اپنے قبضہ میں رکھتا، مگر اس نے انہیں بے لگام چھوڑ دیا،

۸۔ اگرچہ موجودہ حالت نسبتاً ساکن ہے، لیکن ولایت ایدان میں ابھی تک امن قائم نہیں ہو سکا، سب سے زیادہ یہ بات کہ اندرون ملک سے تجارتی تعلقات بالکل منقطع رہیں،

یہ سب کچھ بلاشبہ نتیجہ ہے یونان کے فوجی تسلط کا اور اس حالت جنگ کا جو بے قاعدہ ترک سپاہیوں اور باقاعدہ یونانی افواج کے درمیان قائم ہے،

ارکان مجلس

برسٹل :۔ نمایندۂ امریکا

بناوسٹ :۔ نمایندۂ فرانس

ہیسر :۔ نمایندۂ برطانیہ

ڈال اولیو :۔ نمایندۂ اٹلی

کمیشن کی دوسری رپورٹ

اور اسکی تجاویز

ا ولایت سمرنا میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے ،وہ حد سے زیادہ افسوسناک ہے۔کیونکہ :-

(الف) یونان کا عارضی قبضہ جس کا مقصد محض امن قایم کرنا تھا دراصل ایک دوامی الحاق کی سی شکل اختیار کر گیا ہے، یونانی حاکم اعلیٰ نے حکومت کی باگ کلیتہً اپنے ہاتھہ میں لے لی ہے اور ترک حکام سے تمام انتظامی و فوجی اختیارات لے لیے گئے ہیں، ان کے تعلقات قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے منقطع کر دیے گئے ہیں اور ترکی پولیس اور جندارمہ کو منتشر کر دینے کی وجہ سے وہ اب بالکل بے دست و پا ہو گئے ہیں،

-(ب) سمرنا پر قبضہ قایم رکھنا یونان کے لیے بے شمار مالی و جانی قربانیوں کا باعث ہوگا جن کو اگر محض ایک غیر ملک میں امن قایم کرنے کے لیے وہ پیش کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے اور اس کو اس قدر قربانیوں پر مجبور کرنا صریح ناانصافی ہے،

(ج) یونانی قبضہ اپنی موجودہ شکل میں امن قایم کرنے کی بجائے مقبوضہ باشندوں کے لیے ایک مصیبت ثابت ہو رہا ہے،

۲- پس ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں، کہ:-

(الف) اگر سمرنا پر یونانی فوجی قبضہ کا مقصد باشندوں کی حفاظت اور قیام امن ہی ہے، تو یہ کام یونانی فوج سے بہتر اتحادی افواج کرسکتی ہیں پس مناسب ہوگا کہ اتحادی فوجیں ایشیائے کوچک میں انتظام کرنے کے لیے یونان کی بجائے خود اپنی فوجیں بھیج دیں،

(ب) یونان کا قبضہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ مجلس صلح سمرنا کو یونان سے کامل طور پر ملحق کردے،

(ج) مگر سمرنا کے دوامی الحاق کا فیصلہ حقوق قومیت کے مسلمہ اصول کے خلاف ہوگا، کیونکہ ساری ولایت میں سوائے شہر سمرنا اور ایوالیق کے ترکی آبادی کو زبردست اکثریت حاصل ہے، ہم اس بات کو صاف طور سے ظاہر کردینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ترک کبھی اس الحاق کو پسند نہ کریں گے وہ صرف ایک زبردست فوجی قوت کے آگے سر تسلیم خم کرسکتے ہیں سو یہ ظاہر ہے کہ اتنی قوت مہیا کرنا یونان کے بس کی بات نہیں،

(۳) ان حالات میں ہم حسب ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں،

(الف) جس قدر جلد ممکن ہو یونانی افواج سے سمرنا خالی کرالیا جائے اور انکی جگہ صرف اتنی افواج اتحادی افسروں کے ماتحت بھیجی جائیں جو انتظام کے لیے کافی ہوں،

(ب) یونانیوں کی تسلی کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کے چند دستے سامنے دیئے جائیں مگر ان کو سخت حکم ہو کہ ترکوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں،

(ج) اتحادی افواج کے ملک میں داخل ہوتے ہی قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اتحادی افسروں کے ماتحت اپنی جندارمہ کو دوبارہ مرتب کرے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ملکی انتظام اس جندارمہ کے ہاتھ میں دے کر اتحادی فوجیں واپس بلالی جائیں

(۴) احرار اناطولیہ نے بارہا اس کا اعلان کردیا ہے کہ ہماری تحریک صرف یونانیوں کے مقابلہ میں ہے۔ پس انکی فوجی تیاریاں روکنے کے لیے ضروری ہے کہ انکی شکایات کو رفع کیا جائے اور سمرنا کو قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت کی جانب منتقل کردیا جائے ورنہ بصورت دیگر خود اتحادی سمجھ سکتے ہیں کہ ترکی حکومت یا ترک لیڈروں کی خاموشی بلکہ اظہار وفاداری کی تہ میں کیا ہے۔

دستخط

برسٹل	بناوسٹ
ہیئر	ڈال اولیو

انجمن عثمانی کا نوٹ

اس سے پہلے دنیا سن چکی ہے کہ یونان کو ولایت سمرنا میں امن قایم کرنے کا مقدس کام سپرد کیا گیا ہے جہاں صدیوں سے کہیں بدامنی کی معمولی علامتیں بھی نہیں دیکھی گئیں، اب ہم اس سے زیادہ ستم ظریفانہ ایک اور تجویز سن رہے ہیں جو دراصل شرافت اور کمینگی کی جنگ میں شرافت کی ہولناک شکست کا ایک نیا نتیجہ ہے اس تجویز کا ماحصل یہ ہے کہ مجلس اقوام اناطولیہ کی "باغیانہ تحریک کے استیصال پر یونان کو مامور کرے، اسکے صاف و صریح معنی یہ ہیں کہ یونان کی تمام سفاکیوں کی ناپاک ذمہ داری مجلس اقوام اپنے اوپر لے لے۔

جانتے ہو یہ "باغیانہ تحریک" کیا ہے؟ یہ وہ مقدس تحریک ہے جس کا مقصد ایک مظلوم قوم کے لیئے اپنے حدود قومیت میں آزادی طلب کرنا ہے جسے ہر قوم کا جائز حق تسلیم کرلیا گیا ہے۔

اس غیر معقول تجویز کے متعلق لوزین کی انجمن عثمانی مہذب دنیا کے سامنے چند اہم پہلو روشن کردینا چاہتی ہے،

اول وینزلوس کی فوج کو ولایت سمرنا میں امن و سکون پیدا کرنے کے لیئے بھیجا گیا تھا، مگر اس نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک اس کے برعکس کیا اس نے آبادیوں کی آبادیاں جلا ڈالیں خاندان کے خاندان تباہ کردیئے اور ساری ولایت میں ادھر سے ادھر تک خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم کردیا،

اتحادیوں کی مجلس صلح نے ایک کمیشن اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ ان واقعات کی تحقیق کرے جو سمرنا کے متعلق مشہور ہیں۔ اس نے طویل تحقیقات کے بعد ان تمام واقعات کی تصدیق کی اور وینزلوس کی فوج کو ان کا ذمہ دار قرار دیا، ہم اس اپیل کے ساتھ اس رپورٹ کو بھی شایع کرتے ہیں، جو متحدہ کمیشن نے پیش کی تھی،

۲۔ مجلس صلح نے اپنے متحدہ کمیشن کی سفارشوں پر عمل کرنے کی بجائے یونانیوں کے عارضی قبضہ کو قایم رہنے دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ یونانی سفاکیوں کی تصدیق کے بعد بھی اس نے وینزلوس کی اس تجویز کو ٹھنڈے دل سے سنا کہ جنوبی یورپ کے سفاکوں کو ایشیا میں اپنی خونریزیوں کا حلقہ وسیع کرنے کا موقعہ دیا جائے

۳۔ سمرنا کے اندوہناک واقعات کے بعد وینزلوس کے لیڈروں کو اندرون ملک میں بڑھنے کی اجازت دینا صاف طور سے یہ معنی رکھتا ہے کہ ابتک جو کچھ ہوا وہ اتحادیوں کی مرضی سے ہوا، اور اب وہ اس سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کس ظلم کا ایک انسان تصور کرسکتا ہے۔

۴۔ سمرنا کے عارضی" قبضہ ہی سے ترکوں میں ایک زبردست قومی جوش پیدا ہوگیا ہے، لیکن اگر یونانی درندوں کو اس سے آگے بڑھنے کی اجازت دی گئی تو یقیناً ترک جان سے ہاتھ دھو کر تلوار نیام سے نکال لیں گے۔ اور پھر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ اسوقت کتنی خونریزی ہوگی،

۵۔ آج کل سارے عالم اسلامی میں ایک زبردست مذہبی جوش پیدا ہے جس کی وجہ محض ترکی کے مصائب ہیں پس اگر یونانیوں کی ہمت افزائی کر کے

ان کے مصائب کو اور زیادہ کیا گیا، تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانان عالم کس قدر مشتعل ہو جائیں گے،

۶ - سمرنا میں یونانی فوج کا مسلسل قیام اور زیر تجویز پیش قدمی ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دے گی کہ ہمیشہ کے لیے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان صلح کا قیام ناممکن ہو جائے گا، جو دنیا کے امن کے لیے بہت مفید ہے

اگرچہ امید نہیں کہ مجلس صلح وزیز لوس کی تجویز کو منظور کرلے گی[۵۱]، تاہم موقعہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہم اس تجویز کی شدید مخالفت کرتے ہیں، اور مجلس صلح کو پھر آگاہ کرتے ہیں کہ مشرق میں امن کا قیام اسوقت تک ناممکن ہے، جب تک تھریس اور سمرنا میں ایک ہی یونانی سپاہی موجود ہے،

ترکی قوم کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ جو چیز ہے وہ دولت برطانیہ کی وہ خفیہ اعانت ہی جو مسلمانوں کے جانی دشمن یونان کو دی جا رہی ہے، کیا یہ سچ نہیں کہ برطانی حکومت کی عظیم الشان عمارت جن بنیادوں پر قایم ہے ان کا بڑا حصہ اسلامی ہے،

حسن علیچہ

(معتمد انجمن عثمانی لوزین (سوئٹزرلینڈ))

---

[۵۱] اگرچہ مجلس اعلیٰ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا، لیکن اس معاملہ میں اپنی کامل غیر جانب داری کا اعلان کر دیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اتحادی یونان اور ترکی کو ان کے خیال پر چھوڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ مظلوم کی بے بسی کو جانتے ہوئے ظالم کے حرکات سے چشم پوشی کرنا درحقیقت ظالم کی اعانت کرنا ہے

انگلستان کی مزدور پیشہ جماعت

کے جذبات

ترکوں کو اسوقت ایسے بے رحم سرمایہ داروں کی جماعت نے گھیر لیا ہے جو اپنے زبردست حلقۂ استبداد کو عالمگیر وسعت دینے کے لیے حیوانی قوتیں استعمال کر رہے ہیں، اس جماعت کی سرداری کا فخر برطانیہ عظمیٰ کو حاصل ہے جو ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں اور ڈیڑھ کروڑ مصریوں کو غلام بنانے کے بعد بھی شکم سیر نہیں ہوئی، اور اب دولت کی بھوک اسے عراق، فلسطین کیطرف لیجا رہی ہے تاکہ اپنے اسیرانِ بلا کی طویل فہرست میں ان کو بھی شامل کر دے۔

ضرورت نہیں کہ اس نہب و سلب کے وجوہ پر ہم کوئی بحث کریں دنیا کو معلوم ہے کہ انگریزوں نے "ہمدردی بنی نوع انسانی" سے مجبور ہو کر ملکوں اور قوموں کو "مہذب بنانے" کا مقدس کام اپنے ذمہ لیا ہے، امرتسر میں ڈائر کی گولیاں اور اسکندریہ میں النبائی کے بم اپنی خدمت کو انجام دے چکے ہیں، اب یہی سبق مشرق و مغرب کے دوسرے ملکوں کو بھی سکھانا ہے۔ دنیا اگر تمدن کے اوصاف کو اصلی رنگ میں دیکھنا چاہے تو اس فسانۂ خونیں کا مطالعہ کرے

مسلمانوں کو یونانی جس ہولناک طریقوں سے برباد کر رہے ہیں وہ انکی

ذمہ داری انگلستان کی سرمایہ دارانہ ہوسناکی ہی پر عائد ہوتی ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہی یونان جسکو بحری ناکہ بندی سے مجبور کرکے انگریزوں [۱] نے جرمنی کی طرفداری سے باز رکھا تھا، آج اتحادی قوتوں کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے اپنا حصہ مانگتا ہے اور ایشیائے کوچک کی ایک زرخیز سرزمین پر بلا وجہ اس کا حق تسلیم کرلیا جاتا ہے،

اب ہم پھر دنیا کو بتلانا چاہتے ہیں کہ اس "انصاف" سے مسلمانوں کو کیسے کیسے عظیم الشان فائدے حاصل ہوئے ہیں، سمرنا کے ساحل پر قدم رکھتے ہی یونانی عیسائی مسلمانوں کو مہذب بنانے کے مقدس کام میں مشغول ہوگئے کس طرح؟ گھروں کو لوٹ کر، اور لوٹنے کے بعد جلا کر، عورتوں کو بے حرمت کرکے اور بے حرمت کرنے کے بعد قتل کرکے، جہاں جہاں وہ گئے غارتگری کا بازار گرم کیا،

آبادیوں کے لیے مشکل تھا کہ انکی گولہ باری سے بچ جائیں، زمینداروں کی خوش قسمتی تھی اگر انکی کھیتیاں پامالی سے محفوظ رہیں، بوڑھوں اور بچوں کے لیے ان کے قانون میں امان نہ تھی، اور مسجدیں اور خانقاہیں انکی نشانہ بازی کی مشق سے کسی طرح نہ بچ سکتی تھیں

---

[۱] اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے جس یونانی ڈویژن نے سمرنا پر قدم رکھا تھا وہی ڈویژن تھا جس نے جنگ کے زمانہ میں ایتھنز پایہ تخت یونان کے سامنے انگریزی اور فرنچ تحت البحر کشتیوں کو گولہ باری کرکے ڈبو دیا تھا،

ان حرکات کے مقابلہ میں اگر مسلمان بھی عیسائیوں کے ساتھ ایسے ہی بیہودانہ برتاؤ کریں تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں، مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ اُنہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

جنرل ٹاؤن شنڈ سے پوچھو کہ عراق کی جنگ میں جب وہ اور ان کے ساتھی گرفتار ہو گئے تھے تو ان کے ساتھ ترکوں نے کیسا سلوک کیا تھا

سمرنا کے انگریزوں سے دریافت کرو کہ جب سمرنا کی فضا میں ایک ترکی ایروپلین نے دو انگریزی ہوائی جہازوں کو گرادیا تھا تو ترکوں نے ہوابازوں کا جنازہ کس شان سے نکالا تھا،

مگر آج اتحادی اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ابتک اگر حیوانیت سے اجتناب کیا ہے، تو یہ انکی بے وقوفی تھی بنی نوع انسان کی ایک شریف ترین قوم پر ان وحشیانہ مظالم کے سلسلہ کو جاری رکھنا دنیا کے اشتراکیت کے لئے ایک بدنما داغ ہے جس کو جلد سے جلد مٹا دینا تمام اشتراکیوں کا فرض ہے، خصوصاً برطانیہ عظمیٰ کی مزدور پیشہ جماعت پر اس ذمہ داری کا سب سے زیادہ بار ہے،

ہم کو معلوم ہے کہ ایک زبردست نظام تبلیغی کے ذریعہ مزدور پیشہ جماعت کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ترکوں نے آرمینیا میں قتل وغارت کا بازار گرم کیا ہے، اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب ان کے گناہوں کی سزا ہے مگر ہم تمام مزدوروں کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ وہ سب قصہ افسانہ تھا، جو کچھ ابتک دنیا کو سنایا گیا ہے، اب دنیا کو اسے بھول جانا چاہیے، آرمینیا میں

اگر کبھی خونریزی ہوئی ہے تو اس کی تمام ذمہ داری زار کی فنا شدہ طاقت پر عائد ہوتی ہے، جس نے اپنی مرکزیت، کو مضبوط کرنے کے لئے خفیہ انجمنوں کے ذریعہ ایک طرف ارمنوں کو شورش اور اضطراب کی جانب مائل کیا اور دوسری جانب تمام ترکوں اور کردوں کو ارمنوں کے خلاف بھڑکایا، تاہم اگر غارتگری کی ذمہ داری ترکوں پر عائد کر ہی دی جائے، تو اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ ان کو غیر قوموں پر حکومت کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے،

ہم تمام ایسے لوگوں کو جو انسانیت کو حیوانی اثرات سے آلودہ نہیں دیکھنا چاہتے "دی گرین ہیرالڈ لیگ کی شرکت کے لئے دعوت دیتے ہیں جسکا مقصد اقوام عالم کو غلامی سے نجات دلانا ہے، عیسائیوں کے بنیادی اصولوں میں ایک زرین اصول یہ بھی ہے، کہ

"دوسروں کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو"

لیکن کیا یہ عیسائی (؟) پسند کریں گے کہ ان کو آگ میں جھونک دیا جائے ان کے بچے قتل کئے جائیں، اور انکی بیٹیوں کی عصمت دری کی جائے،

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب حرکات ان لوگوں سے سرزد ہوئی ہیں جن کے ایک ہاتھ میں بائبل ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تو ہم کو ایسے عیسائیوں کی ایمانی حالت پر سخت افسوس ہوتا ہے،

"برٹرینڈ ڈی کولونا"

مسلمانو

فرصت کی آخری گھڑیاں ہیں اور دنیا میں کچھ کر دکھانے کے لیے اللہ کی طرف سے تم کو چند گنی ہوئی ساعتیں دی گئی ہیں اگر انکو تم نے محض جلسہ بازی اور شور و شغب میں گذار دیا تو یہ یقین رکھو کہ پھر تمہارے لیے دنیا میں زندگی کا کوئی حق باقی نہ رہیگا۔

ایشیائے کوچک میں اسلامی حمیت کی آخری نمایش ہے، اور ایک تھکا ہوا ہاتھ دین الٰہی کے مقدس علم کو سر بلند کئے ہوئے ہے اگر تم نے جلدی اس کی مدد نہ کی تو پھر تم کو اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھنا پڑے گا جس کا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پس وقت ہے کہ جہاد بالقلب و باللسان سے چند قدم آگے بڑھاؤ، دنیا کے تمام عیسائی یونانیوں کی مدد کر رہے ہیں، پھر یہ کیا بے غیرتی ہے کہ تم نے ترکوں کو تنہا چھوڑ رکھا ہے، اگر اپنی جانیں تم کو عزیز ہیں اور میدان شہادت سے بھاگتے ہو تو کم از کم یہ تو کرو کہ ان کو روپیہ[لہ] سے مدد دو اور انکے زخمیوں کے لیے ایک ٹپی فنڈ بھیجو!

"ابو الاعلیٰ"

لہ تمام رقوم مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کو ارسال فرمائیے، اور جو صاحب ٹپی سسٹم میں شریک ہوں ان کو بھی مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے خط و کتابت کرنی چاہیے،

اہم رسائل کا اشاریہ

○ اقبالیات (سہ ینگو) کے مشتملات کا اشاریہ

○ ——— جاوید اشرف

○

خدا بخش لائبریری سے 'العصر' (الہ آباد)، 'ادیب' (فیروزآباد)، 'ادیب' (لکھنؤ)، 'معیار' (پٹنہ)، 'زبان' (سنگرول)، 'عصری ادب' (دہلی)، 'صبح امید' (لکھنؤ)، 'تحریر' (دہلی)، کے اشاریے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس شمارے میں 'اقبالیات' (سرینگر)، کا اشاریہ ملاحظہ فرمائیں، ساتھ ہی اقبالیات کے ان شماروں میں اقبال کے جو نوادر شائع ہوئے ہیں وہ بھی یکجا دیدیے گئے ہیں۔

○ ادارہ

جاوید اشرف
لائبریری اسسٹنٹ
خدابخش لائبریری، پٹنہ ۴

اقبالیات (سرینگر) کے مشتملات کا اشاریہ

۱۹۸۱ء ——— ۱۹۸۹ء

اقبال شناسی کی تعلیم وتربیت، اقبال کی حیات اور فکر وفن پر تحقیق کے لیے ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (سرینگر) میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۸۱ء میں "اقبالیات" کا پہلا شمارہ زیر ادارت پروفیسر آل احمد سرور قائم ہوا، جس کے اب تک پانچ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنی نوعیت میں بتخصیص اقبال تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل گرانقدر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی تین شماروں کی ادارت پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی، چوتھا پانچواں شمارہ پروفیسر امین احمد اندرابی کی ادارت میں شائع ہوا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال (اپریل میں) اقبال کے یوم وفات کے موقع پر خصوصی بزم مقالات کا اہتمام ہوتا ہے۔ اب تک اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب، اقبال کی شاعری اور شعریات، تشخص کی تلاش اور اقبال، جدیدیت کے متعلق اقبال کا رویہ، اقبال کی بہترین نظم یا غزل، جیسے عنوانات پر سیمینار ہو چکے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اقبالیات پر تحقیق کا کام بھی چل رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر چمن لال رینہ نے "اقبال اور آروبندو" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نیز سات اسکالروں کو اقبالیات پر ایم۔ فل۔ کی ڈگریاں بھی تفویض ہو چکی ہیں، جو حسب ذیل ہیں۔

"اقبال اور ہیومنزم" (شفیقہ رسول) ۱۹۸۱ء، "اقبال کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ" (امین اندرابی) ۱۹۸۱ء، "حالی، اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری، تقابلی مطالعہ" (نصرت اندرابی) ۱۹۸۱ء، "اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ" (بلقیس سراج) ۱۹۸۱ء "اقبال پر غالب کے فکر وفن کا اثر" (زاہدہ پروین) ۱۹۸۲ء، "اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" (زرینہ بٹ) ۱۹۸۲ء

اقبال انسٹی ٹیوٹ سے اب تک نصف درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "اقبال کے مطالعے کے تناظرات" پروفیسر آل احمد سرور)، "اقبال اور تصوف" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغرب" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغربی فکر" (پروفیسر وحید الدین)، "اقبال مصلح قرن آخر" (علی شریعتی/ترجمہ کبیر احمد جائسی)، "اقبال کے شاعرانہ فلسفے کے چند پہلو" پروفیسر عالم خوندمیری)، "ٹیگور، سری آروبندو اور اقبال" (اس۔ کے۔ گھوش)۔ ان مطبوعات کے علاوہ مزید گیارہ کتابیں زیر طبع ہیں جو مستقبل قریب میں منظر عام پر آجائیں گی۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اس مختصر تعارف کے بعد "اقبالیات" ۸۹ - ۱۹۸۱ء کے مشتملات کا موضوع وار اشاریہ بترتیب ابجدی پیش کیا جارہا ہے۔ گو یہ اشاریہ مختصر سہی لیکن بلحاظ اہمیت و افادیت بیش قیمت ہے۔ اس اشاریے سے ایک خاص بات یہ بھی وا انکشاف ہوتی ہے کہ ادارے نے اپنے مجلے کو محض اقبالیات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اقبال کے ماسوا جوش، حسرت، فانی اور فراق جیسے شعرا کے لیے بھی قلب اقبالیات میں ایک گوشہ رکھ چھوڑا ہے۔ یہ گوشۂ دیگراں ادارے کے وسعت ظرف، وسعت نظر اور وسعت فکر کا پتہ دیتا ہے جو اقبال کا خاصہ تھا۔

اقبالیات

ابلیس۔ اقبال اور گوئٹے کی نظر میں (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● احمد امین کے افکار پر اقبال کا اثر (بدرالدین بٹ) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اسلوبیات اقبال (گوپی چند نارنگ) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اداریہ/اقبالیات (آل احمد سرور) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (آل احمد سرور) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● ایضاً (آل احمد سرور) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● ایضاً (محمد امین اندرابی) اقبالیات ع۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● ایضاً (محمد امین اندرابی) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال، استعارہ، امیج، علامت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کی رفتار (ادارہ) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات (ادارہ) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (ادارہ) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور آزاد (ریاض الرحمٰن شروانی) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور گوئٹے (مسعود حسین خاں) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور مذہبی حسیت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کا اسلوب بیان (اسلوب احمد انصاری) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط (مسعود حسین خان) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کا شعری لہجہ (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کا عروضی نظام (شمس الرحمٰن فاروقی) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نظریہ زبان (اکبر حیدری) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کا نعتیہ کلام (مرزا کمال الدین شیدا) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کا فن ایک عمومی جائزہ (آل احمد سرور) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نقش باز آفرینی (سید مہدی غزوی) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کی ایک تکنیک۔ مسجد قرطبہ کی روشنی میں (قاضی غلام محمد) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کی ایک غزل

/ اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کی بہترین اردو غزل (شوریدہ کاشمیری) اقبالیات ع۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● اقبال کی بہترین اردو نظم (آل احمد سرور) اقبالیات ع۴ اپریل ۸۸ء ● اقبال کی سیاسی فکر (آل احمد سرور) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کی شاعری اور پیکر تراشی (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی شعری زبان (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کی فارسی شاعری کی معنویت (آصف نعیم) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی کثیر الجہت مقصدیت (مرغوب بانہالی) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت (محمد امین اندرابی) اقبالیات ع۵ اپریل ۸۹ء ● ایضاً (غلام رسول ملک) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی معنویت (آل احمد سرور) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی نظم "بوئے گل" کا تجزیہ (آصف نعیم) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کے دو خطوط بنام بی بی آمنہ (اقبال) ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کے علائم فارسی میں (آصف نعیم) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کے علائم (شمیم حنفی) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۶۸ء ● حضرت اقبال کے مذہبی افکار کے متعلق میرے افکار (مفتی جلال الدین) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کے ہیئتی تجربے (رحمن راہی) اقبالیات ع۳ اپریل ۸۶ء ● بزم انجم — ایک تجزیہ (غلام رسول ملک) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● کرنل بشیر حسین زیدی کا ایک خط آل احمد سرور کے نام بسلسلہ اقبال (کرنل بشیر حسین زیدی) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● پیام مشرق کی ایک نظم "لالہ میں نکتہ سوز" کا مطالعہ (مرغوب بانہالی) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● تسخیر فطرت ایک مختصر جائزہ (رحمن راہی) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● تنہائی — ایک سرسری جائزہ (رحمن راہی) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● جاوید نامہ کی تکنیک (غلام رسول ملک) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● جبریل و ابلیس (آل احمد سرور) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً شکیل الرحمن اقبالیات ع۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● حسرت موہانی اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع۲ ۱۹۸۲ء ● حضرت میر سید علی ہمدانی کی مدح علامہ اقبال کے قلم سے (سید محمد کمال الدین) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● دو غزلیں (قاضی غلام محمد) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● رمزیت اقبال کا فن (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ع۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● ساقی نامہ" ایک اسلوبیاتی جائزہ (پی۔ این۔ پشپ) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ساقی نامہ (قدوس جاوید) اقبالیات ع۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● سلطان — (نظم اقبال) (مفتی جلال الدین) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شاعری — اقبال کی پہلی شناخت (مظہر امام) اقبالیات ع۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● شاعری، قرآن اور اقبال (مفتی جلال الدین) اقبالیات ع۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شعاع آفتاب (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع۴ اپریل ۸۸ء

● شمع امید (نظم اقبال) (مسعود حسین) اقبالیات ع ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شعر اقبال کی تفہیم میں ہیئتی طریقہ کار کی اہمیت (وارث علوی) اقبالیات ع ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ضرب کلیم کا اسلوب (آل احمد سرور) اقبالیات ع ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● عصر حاضر کے ایران میں اقبال کی معنویت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● محاورہ مابین خدا وانسان (غلام رسول ملک) اقبالیات ع ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● مسجد قرطبہ (عالم خوندمیری) اقبالیات ع ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● مناظر فطرت اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء۔

گوشہ جوش ملیح آبادی

اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش شاعر یا صحافی (غلام رسول ملک) اقبالیات ع ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شاعری (مظہر امام) اقبالیات ع ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ع ۵ اپریل ۱۹۸۹ء۔

گوشہ حسرت موہانی

حسرت موہانی اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت، شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کا تصور عشق (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کی غزل کا نشان امتیاز (مظہر امام) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کے چند اشعار (قاضی غلام محمد) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● محشر عل حسرت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء۔

گوشہ فانی

آبلہ پا فانی (زبیر رضوی) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ع ۲ ۸۲ء ● فانی کا تخلیقی ذہن (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء ● فانی کا شعری کردار (شمیم حنفی) اقبالیات ع ۲ ۸۲ء ● فانی کی غزل گوئی ایک نفسیاتی مطالعہ (غلام رسول ملک) اقبالیات ع ۲ ۱۹۸۲ء۔

فراق گورکھپوری

روپ کی عشقیہ شاعری (شکیل الرحمن) اقبالیات ع ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● غیر متوازن، متوازن شاعر (فراق) (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ع ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● فراق کا شعری ادراک (حامدی کاشمیری) اقبالیات ع ۴ اپریل ۸۸ء ● فراق کی غزل (سکینہ فاضل) اقبالیات ع ۴ اپریل ۸۸ء ● کچھ فراق کے بارے میں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ع ۴ اپریل ۸۸ء ● مقام فراق (مسعود حسین خان) اقبالیات ع ۴ اپریل ۱۹۸۸ء۔

●●

اقبالیات سے ماخوذ نوادر - ۱

پروفیسر آل احمد سرور

علامہ اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط

اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ ہم پروفیسر منظور الامین صدر شعبہ ماس کمیونیکشن کشمیر یونیورسٹی کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے ان خطوط کی نقلیں ہمیں مرحمت فرمائیں۔ پروفیسر منظور الامین جب دھاروار میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر تھے تو وہاں کے ایک کارکن نے اُن سے اُن خطوط کا ذکر کیا جو اقبال نے اُن کی والدہ کو لکھے تھے۔ منظور الامین صاحب اُن کے گھر گئے اور وہاں جا کر انہوں نے ان خطوں کو نقل کر لیا۔ وہ اصل خط بھی حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے یہ سوچا کہ یہ خط کسی قومی ادارے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہونے چاہئیں۔ نقلیں اُن کے پاس محفوظ رہیں اور انہوں نے اپنے پرانے کاغذات میں سے ہمارے لیے مہیا کی ہیں۔ ہم اس کے لیے بقول اقبال "سراپا سپاس" ہیں۔ خطوں کی صحت اور استناد کا ہمیں یقین ہے۔ ویسے ہم اصل خطوط حاصل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ دونوں خطوط بی بی آمنہ کے نام ہیں اور جمال الدین صاحب ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس بیجاپور کی معرفت بھیجے گئے ہیں۔ پہلے خط میں اقبال نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ رومی کا ترجمہ انگریزی میں منظوم نہ کرنا چاہیے تھا۔ عام طور سے دوسری زبانوں کے ترجمے نثر میں بہتر ہوتے ہیں۔ اقبال نے نہایت انکسار سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انگریزی عروض کی ٹکنیک سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں حالانکہ وہ انگریزی ادب کے استاد رہ چکے تھے، خود اچھی انگریزی لکھتے تھے اور انگریزی کے ادب عالیہ سے اُن کی واقفیت گہری تھی۔ ملٹن اور انگریزی کے رومانی شعرا خصوصاً ورڈس ورتھ سے انہوں نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ ایک اور اہم بات جو اس خط سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رومی کے شارحین کے مقابلے میں اقبال رومی کی روح سے زیادہ آشنا تھے اور اس وجہ سے وہ رومی کی ترجمانی ان شارحین سے مختلف کرتے تھے۔

دوسرا خط بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے صاف کہا ہے کہ وہ صوفی نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندستان میں جس روپ میں تصوف اس دور میں ملتا ہے اُس سے انہیں اختلاف ہے اور وہ اسے ہندستان میں اسلام کے اخلاقی زوال کے اسباب میں سے ایک خاص سبب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا اشارہ یہاں ان صوفیوں کی بے عملی اور مزاج خانقاہی کی طرف ہے۔ انہوں نے ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ جدید دور کی تشکیک اور دہریت کے زہر کا تریاق رومی کے یہاں مل جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اقبال رومی کا ایسا انتخاب چاہتے تھے جو جدید ذہن کو اپیل کر سکے۔ [دونوں خطوط کے عکس اگلے صفحات میں پیش ہیں۔]

DR. SIR MOHD. IQBAL KT.
M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 23rd June 1934

Dear Madam,

Judging from what you say of the opportunities you have had of learning the English language your progress is indeed remarkable.

I fear however that it was a mistake to try a verse translation of Rumi. I am very sorry to say that I cannot undertake to correct your work, partly because I am not very (well) acquainted with the technique of English verse, and partly because my health is indifferent and I have got a good deal of private literary work of my own to do. Moreover my understanding of Rumi is very much different to the interpretations of his commentators.

Yours Truly
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

DR. SIR MOHD. IQBAL KT. ۸۰۳

M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 3rd July 1934

Dear Madam,

Thanks for your letter. I regret very much to say that I am not a Sufi and do not believe in the ways of modern Indian Sufism which I regard as one of the main causes of the moral decay of Indian Islam. But I do regard Rumi's Mathnavi as a kind of antidote to the poison of modern Scepticism and Atheism. For this reason I think the book should be made known to the modern educated Muslims. But the busy man of our times cannot manage a book which comprises 26000 verses. Selections will have to be made with due regard to the needs of our times, and notes will have to be added in the light of modern thought and enterprises. Selections of the Mathnavi have been made in all ages, but these are of no use or of very little use to us moderns. We shall have to make our own selections. To a certain extent this work has been done by Qazi Talamuz Husein M. A., of the Usmania University, Hyderabad in a book recently published and called Maratal Mathnavi. The Book, however, is of use only to the man who knows Rumi already. I have long cherished the desire of making a selection, but my health has gone down during the year so that, I shall have to abandon many of my projects now. I have told my clerk to send you a copy of my 'Javeed Nama' which I hope, will give you some idea of my attitude towards Rumi and to the bigger problems which confront modern Islam. I am only a Barrister and not a judge of the High Court. Please do not address me as such.

Bibi Amina Sahiba,
C/o Jamaluddin Sahib,
Retd. Sub-Inspector of Police
BIJAPUR
(Stamped 3rd July 1934) Naulakha

Yours Sincerely
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

اقبالیات سے ماخوذ نوادر - ۲

پروفیسر مسعود حسین خاں

علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

علامہ اقبال کے شایع شدہ خطوط کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے لیکن ہنوز اس سلسلے میں باب "فتوح" بند نہیں ہوئے ہیں۔ اینگلو عربک کالج، دہلی (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے میرے ایک پرانے ساتھی سید خلیل احمد صاحب حال میں سری نگر تشریف لائے تھے۔ مسیحا و خضر سے بہتر اس ملاقات کے دوران ان سے کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی بات آگئی۔ "غالب ڈے" کا تذکرہ آگیا اور پھر اس دعوت نامے کا جو اس سلسلے میں علامہ اقبال کو بھیجا گیا تھا۔ اتفاق سے علامہ کا جواب ان کے پاس تبرک کے طور پر محفوظ رہ گیا تھا۔ میرے اصرار پر انہوں نے اس خط کی فوٹو کاپی بھیجنے کا وعدہ کیا اور پھر اسے ایفا کیا۔ یہ اب ہدیہ ناظرین "اقبالیات" ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

سید خلیل احمد

آنریری مجسٹریٹ، باغ والا والا

جامع مسجد - دہلی

۳۰ جولائی ۱۹۸۲ء

ڈیر مسعود صاحب

السلام علیکم! مزاج گرامی

آپ کے علم میں ہے کہ اینگلو عربک کالج اورینٹل سوسائٹی کا آپ سب اشخاص نے مجھے وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا تھا۔ ہم لوگوں نے غالب ڈے شاندار منایا تھا۔ ہز ہائی نس سر آغا خان نے غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی تھی۔

مشاعرے کے لیے صدارت کی دعوت سر اقبال کو دی گئی تھی۔ چوں کہ موصوف علیل تھے، اس لیے شرکت نہ کر سکے اور خط تحریر کیا تھا جس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ بعد میں خط و کتابت جاری رہی۔ چند خطوط مزید ہیں لیکن فائل جس میں سر اقبال کے علاوہ دیگر نامور اشخاص کے خطوط بھی ہیں، اس وقت نہ مل سکی۔

فقط

خیر طلب

خلیل احمد عفی عنہ

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

لاہور ۲۹ اکتوبر ۳۵ء

جناب من — آپ کا ماہنامہ مجھے کل ملا ہے
جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

میں قریباً دو سال سے علیل ہوں۔ گلے کی بیماری ہے
جس کی وجہ سے میں کسی قسم کی تقریر نہیں کر سکتا۔ میرا ابتک یہ کم
کو ادا کر رکھا تھا اب کے رسالہ اخفی رہ جاتا ہوں تا ہم
افسوس ہے کہ علالت کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لئے
نا ممکن ہے — بہر حال آپ کی اس سعی کی جو حالات کی
قدر شناسی پر مبارکباد کہتا ہوں — والسلام

محمد اقبال

اقبال ۱۹۲۵ء کے علی گڑھ میں

کرنل بشیر حسین زیدی کا خط سرور صاحب کے نام

۲۵ جون

آپ نے علامہ اقبال کے میرے یہاں دوپہر کے کھانے پر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۲۹ کو وہ میرے یہاں تشریف لائے تھے۔ سر راس مسعود وائس چانسلر اور خواجہ غلام السیدین بھی کھانے پر شریک تھے باقی حضرات کے نام یاد نہیں۔

کھانے کے بعد میں نے اُن سے عرض کیا آپ جہاں جاتے ہیں لوگ آپ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے ہیں میری ایک مختلف درخواست ہے اور وہ یہ کہ آپ میرے اسکول میں تشریف لا کر میرے بچوں سے اپنا کلام سنیں۔ انھوں نے مسکرا کر اس درخواست کو قبول فرمایا۔ میں نے کئی دن تک بہت محنت کر کے چند لڑکوں کو علامہ کی کئی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھنا سکھائیں۔ ان میں مرثیہ ہسپانیہ خاص طور قابلِ ذکر ہے، اس کی لے ایسی پُر اثر اور دردناک تھی کہ علامہ اقبال روتے رہے۔ دیگر حاضرین پر بھی بہت اثر ہوا۔ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا...

پس نوشت!

آپ نے اور ملاقاتوں کے متعلق بھی پوچھا ہے۔ اقبال اور میں ۳۲ء کے آخر اور ۳۳ء کے شروع میں لندن میں مقیم تھے میں تھرڈ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں رامپور کے نمایندے کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ علامہ شام کو کئی مرتبہ تنہا ہوتے تھے میں بہت دفعہ انھیں اپنے ساتھ کسی تفریح کے مقام پر لے جایا کرتا تھا راونڈ ٹیبل ختم ہوئی تو انھوں نے ایک دن فرمایا کہ میں سپین جانا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ چلو۔ میں نے معذرت کی کہ نواب صاحب رامپور میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ وہاں جا کر مسجد قرطبہ لکھیں گے۔ آج تک افسوس ہے کہ نواب صاحب کی ذرا سی ناراضگی کا خیال کر کے میں نے سنہری موقع ضایع کر دیا۔

●●

اردو اکادمیاں

○ مہاراشٹر اردو اکادمی

مہاراشٹر اردو اکادمی

یہ اکادمی بھی ملک کی بعض دوسری اچھی اکادمیوں کی طرح اردو زبان و ادب کی مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔ مرحوم خواجہ عبدالغفور اور مرحوم ظ۔ انصاری اپنے اپنے وقت میں اسے مضبوط کرتے رہے، آگے بڑھاتے رہے۔ اب یوسف ناظم صاحب کی سکریٹری شپ میں یہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس اکادمی کا رسالہ امکان دہلی، بہار، بنگال، اڑیسہ، راجستھان، کشمیر، کرناٹک اور یوپی اردو اکادمیوں کے پرچوں کی مانند معیاری تحریریں پیش کرتا رہا ہے۔ یہ رسالہ سہ ماہی ہے، ۱۹۸۰ء میں نکلا۔ امکان میں شامل بعض تحریریں جو ہمیں اہم لگیں، باقی رہنے والی لگیں، اور مہاراشٹر سے نکلنے والے پرچے کی نمایندہ تحریریں لگیں، انھیں افادۂ مزید کی خاطر خدا بخش جرنل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

ڈاکٹر خواجہ عبد الغفور

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی

ایک جائزہ

مہاراشٹر کے سرحدی علاقے دولت آباد پر علاء الدین خلجی کے کئی اثرات نمایاں ہوئے جو ان علاقوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر دور رس اثر انداز ہوئے اس کا ایک پہلو ان علاقوں کی بولی تھی جہاں پر حملہ آوروں کی زبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جو آگے چل کر دکنی کہلائی ـــ اس عہد کے مہاراشٹری صوفیوں اور سنتوں جیسے گیانیشور، مکتا بائی، سنت نام دیو، ایکناتھ، تکارام رام داس اور امرت رائے وغیرہ کی ملفوظات اور اشعار میں اردو الفاظ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

یہ چند نقوش ہیں جو ریاست مہاراشٹر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں معاون ثابت ہوئے مہاراشٹر اور اردو کا یہ خوب صورت اور تاریخی رشتہ آج بھی سرسبز و شاداب ہے آج ریاست میں مراٹھی کے بعد اردو بولی اور لکھی جانے والی دوسری بڑی زبان ہے اردو کے کئی سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے مہاراشٹر کو اپنا وطن ثانی بنایا اور یہاں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ قلم نے اس میں بڑا اہم بلکہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اس پس منظر میں مہاراشٹر اردو اکادمی کا قیام ریاست میں اردو کے مفاد، تبلیغ اور اشاعت کے لئے ایک مثبت اور مفید اقدام تھا چنانچہ ۱۶ر اپریل ۱۹۷۵ء کو اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ۲۰ر اپریل ۱۹۷۵ء کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند عالیجناب فخرالدین علی احمد کے دست مبارک سے اس کا افتتاح انجام پایا تقریب کی صدارت کے فرائض گورنر مہاراشٹر عالی جناب علی یاور جنگ مرحوم نے انجام دیئے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے پیش نظر اردو کے فروغ اور ترقی کے لئے باقاعدہ لائحہ عمل اور نصب العین ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے مگر چند اہم اور بنیادی مقاصد کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان کی ہمہ جہتی ترقی۔

تراجم اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ریاستی زبان مراٹھی اور اردو کے درمیان تخلیقی خیالات کے تبادلہ کا فروغ۔

اردو میں جرائد و رسائل اور کتب کی اشاعت کی ذمہ داری اور ایسے کاموں کی امداد۔

مہاراشٹر میں مقیم ادبا و شعراء کو بورڈ کی منظوری سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد۔

اردو کی ادبی تنظیموں اور ادبی سرگرمیوں کو مالی امداد۔

ریاست میں اردو کی حوصلہ افزائی کے لیے سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس، ورک شاپ اور نمائشوں کا انعقاد اور ایسی سرگرمیوں کی امداد

لائبریریوں اور ریڈنگ روم کے لئے کتابوں اور رسالوں کی فراہمی

ریاست میں رہنے والے ادبار اور شعرار کو مختلف ادبی میدانوں میں اعلیٰ ادبی حصے پر، ہر عنوان اور موضوعات پر شائع شدہ تخلیقات پر انعامات۔

بورڈ کی سرگرمیوں نیز اردو بولنے والوں کی ضروریات سے وقتاً فوقتاً حکومت کو آگاہ کرنا۔

اردو کے فروغ کے سلسلے میں پالیسیوں کی تشکیل میں حکومت کو مشورہ نیز ان پر عمل درآمد میں مدد۔

ان خطوط کی روشنی میں آج بہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے آٹھ سالہ مختصر مدت اکادمی نے ان تمام مقاصد پر مناسب عمل کیا ہے اور مہاراشٹر میں اردو کی فضا کو خوش گوار بنایا ہے۔

کتابوں مخصوصاً ادبی کتابوں کی اشاعت ہمیشہ سے اردو قلم کاروں کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اس کی وجہ اردو میں ایسے پبلی کیشنز یا اداروں کی کمی ہے جو ادبی کتابوں کو اہتمام سے شائع کرسکیں۔ اس سلسلے میں مہاراشٹر اردو اکادمی نے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد دینے کی اسکیم مرتب کی ایک اندازے کے مطابق اب تک سو مسودوں کو اشاعت کے لئے منتخب کیا گیا اور امداد دی گئی پچھلے سال یعنی ۱۹۸۱-۸۲ء میں کل ۲۶ مسودوں کو ۵۸،۷۵۰/- کی مجموعی رقم سے نوازا گیا جن میں گیارہ مسودے تادم تحریر کتابی صورت میں شائع ہو چکے اور ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران ۵۱،۱۸۰/- کی رقم ۲۲ مسودوں کی اشاعت کے لئے دی گئی۔

غیر اردو داں حلقوں میں اردو لکھنے پڑھنے کی کافی دلچسپی اور اشتیاق پایا جاتا ہے۔

سال ۱۹۸۱-۸۲ء کے دوران ۱۷ اداروں کو غیر اردو داں حضرات کے لئے کلاسوں کے لئے ۲۰،۴۰۰/- کی رقم منقص کی گئی جبکہ ۸۲-۸۳ء میں مزید ۱۴ کلاسوں (3) کے لئے ۵۰،۴۰۰/- رقم منظور کی گئی اور ریڈرشپ اور قارئین کے دائرے کو وسعت دینے کے لئے اردو اکادمی نے مہاراشٹر کی منتخبہ لائبریریوں، کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابوں، رسالوں کی امداد مہیا کی گئی۔ ۱۹۸۱-۸۲ء میں حکومت کی منظور شدہ ۲۶ لائبریریوں کو کتابیں اور رسالے فراہم کئے گئے، جبکہ امسال ۸۲-۸۳ کے دوران ۵۲ لائبریریوں کو خطیر رقم کی کتابیں اور رسالے دیئے گئے، اس کے علاوہ خانقاہ نقش بندی، ٹرسٹ لائبریری بالاپور، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونہ، انجمن ترقی اردو (مراٹھواڑہ) انجمن اسلام کریمی لائبریری بمبئی نایاب مخطوطوں، قلمی کتابوں اور مسودوں کے تحفظ کے لئے مزید ایک لاکھ مہاراشٹر اردو اکادمی دیئے گئے۔ طلبار کی حوصلہ افزائی اور ان میں اردو کے شوق کو جگائے رکھنے کیلئے ادبی سرگرمیوں مثلاً مضمون نویسی، تقریری مقابلے، مشاعرے، نمائش اور دیگر اداروں کو ۵۰۰/- سے ۸۰۰/- تک کی رقم فراہم کی جاتی ہے، ۸۲-۸۳ء میں کل ۱۷ کالج سوسائٹی اور عوامی اداروں کو ۳۴۰۰/- کی مالی امداد دی گئی اس کے ماسوا دھولیہ کی ایک اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن کو سیمینار کے انعقاد کے لئے ۵۰۰/- دیئے گئے۔

طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے ایس ایس سی، ایچ ایس سی، بی اے اور ایم اے کے اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبار کو خصوصی انعامات سے نوازا جاتا ہے، اس سلسلے میں پونے ڈویژن اورنگ آباد ڈویژن، ناگپور ڈویژن کے علاوہ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، شری شیواجی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی، پونہ یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی کے طلبار کو انعامات سے نوازا

جاتا ہے۔ تعلیمی خدمات کے سلسلے میں یہ کہنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اردو اکادمی کے مالی تعاون اور کوششوں سے بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام عظیم افسانہ نگار کرشن چندر سے منسوب چیئر کے طور پر عمل میں آچکا ہے۔ ریاست مہاراشٹر میں مقیم ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کی ادبی اہمیت اور حیثیت کے مطابق انعامات سے نوازا جاتا ہے انعامات کے لئے مختلف موضوعات مثلاً شاعری، ناول، افسانہ، کہانی، سائنس و تکنیکی ادب، ترجمہ، تنقید و تحقیق، بچوں کا ادب اور صحافت کے تحت انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں اس کے سوا ممتاز ادبی شخصیتوں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر خصوصی اعزاز عطا کئے گئے ہیں۔ اور مستحق، معذور، خستہ حال فن کاروں کو بھی خصوصی امداد دی جاتی ہے۔

اردو تھیٹر اور ڈرامہ آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھوتا گیا اس لئے اردو اکادمی نے اردو ڈراموں کے فروغ اور لوگوں میں اس کی دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے کل مہاراشٹر یک بابی اردو ڈراموں کے انعامی مقابلے منعقد کئے گئے۔ جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں اور لوگوں میں اردو ڈراموں سے دلچسپی اور شوق بڑھتا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ ماہی رسالہ "امکان" شائع کیا جاتا ہے جس نے اپنے معیاری و ادبی مضامین اور انتخاب نظم و نثر کی وجہ سے بہت جلد اہل علم و ادب میں اپنا منفرد مقام بنا دیا ہے امکان کو ہند و پاک کے بیشتر ممتاز اہلِ قلم کا تعاون حاصل ہے اپنی شاندار خوبصورت طباعت کے لئے اسے دو بار صدر جمہوریہ کا انعام بھی مل چکا ہے۔

نیز علامہ اقبال کی بانگِ درا کا مراٹھی ترجمہ اور مشہور مراٹھی لطیف شورجیت کار کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے آئندہ کے پروگرام زیرِ غور ہیں۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے ریاست مہاراشٹر کے مختلف علاقوں میں سیمینار اور حسب موقع دیگر پروگرام مثلاً ممتاز ادیبوں شاعروں کی بمبئی میں آمد پر استقبالیہ تقریب اور اعزازی نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے چنانچہ ادھر چند برسوں میں مخدوم محی الدین جلیل مانکپوری، فانی بدایونی، آغا حشر کشمیری، پریم چند، حسرت موہانی اردو صحافت، تعلیمی کانفرنس، اردو کی ترویج میں اہلِ برار کا حصہ، اردو ادب میں طنز و مزاح، جنگ آزادی میں اردو کا حصہ اور برج نرائن چکبست کی شخصیت اور شاعری پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے مشہور اہل قلم نے اپنے مقالات سے سامعین کو نوازا۔

اس کے علاوہ رام لال شہریار کنہیا لال کپور گوپی چند نارنگ علی جواد زیدی احمد ہمیش انتظار حسین، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، رئیس امروہی، احمد فراز اور شان الحق حقی کی بمبئی میں آمد پر استقبالیہ نشستیں منعقد کی گئیں اردو اور مراٹھی کا لسانی و تہذیبی رشتہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کو رسم الخط سکھانے کے مسائل اور ان کے حل مراٹھواڑہ کا اردو کو فروغ دینے میں حصہ اور ایسے ہی قابلِ توجہ عنوانات پر مزید سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔

اس مختصر سے وقت میں ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی اردو اکادمی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ اور اس کی کارگزاریوں پر کما حقہ روشنی ڈالی جاسکے مگر اس چھوٹے سے خاکہ کے ذریعہ جتنی اور جس قدر بھی روشنی پڑ سکتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مہاراشٹر اردو اکادمی ایک فعال اور سرگرم ادارہ ہے جو ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کا چراغ جلائے ہوئے ہے۔

●●

سیّد یحییٰ نشیط

اردو مراٹھی کے مسلم شعراء کا ہندوی رجحان

سرزمین ہند میں اسلامی تمدن فاتح قوم کا تمدن تھا۔ اس شجرِ برگ وبار اور تمدن کی جڑیں عرب کے ریگستان میں گہری اتری ہوئی تھیں اور اس کی شاخیں سواحلِ روم و یونان سے لیکر مشرق الہند تک سایہ فگن۔ اُن علاقوں کی تہذیبی فضاؤں میں بھی پھول رہی تھیں۔ ہمارے یہاں کی ویدانتی تہذیب کی پیوند کاری سے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں اور یہ درخت نہایت گھنا اور چھتہ دار بن گیا۔ اس کے زیرِ سایہ ادب کی تخلیق کرنے والے ہندو و مسلم شعراء کا اس ملی جلی تہذیب سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلم شعراء ویدانت سے برابر متاثر ہوتے گئے اور اپنی تحریروں کے نادر نمونوں سے ہندو مذہبی ادب میں اضافہ کیا۔

ان شعراء نے گو کہ مذہب کی توسیع، ترویج اور تبلیغ کے حتمی دعوے نہیں کیے، لیکن مذہب کی تکریم و تبریک ہی کو وسیلۂ نجات تسلیم کر لیا اور عوام کے ذہن سے مطابقت رکھتے ہوئے مذہبی قصص و روایات کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا کہ عوام و خواص اس کے گرویدہ ہوگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ رامائن و مہابھارت، مراثیِ انیس اور رامداس کے ابھنگوں کو ایسے لوگ بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں، جن کا اس معاشرت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

برادرانِ وطن کی مذہب کو مسلم شعراء نے بنظرِ استحسان اور احترام و اکرام سے دیکھا ہے۔ انھوں نے دیوی دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے ترانے گا کر اپنی وسیع المشربی، صلح کل طبیعت اور کشادہ قلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اسلامی روایات و اصطلاحات کے علاوہ ہندو اساطیر و علامات اور تمثیلات و تلمیحات کا سہارا لیکر انھوں نے انسانیت کی اصلاح کی۔ اخلاق کا تصفیہ اور نفوس کا تزکیہ کیا۔ سیرت کی تعمیر، باطن کی تطہیر، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کے لئے انھوں نے جو ادب پارے پیش کیے ان کا مرجع و مصدر مذہبی کتب ہی رہے ہیں۔

یہاں اردو اور مراٹھی کے چند ایسے مسلم شعراء کا تعارف اور ان کے کلام کا جائزہ مقصود ہے جن کی تخلیقات میں ہندو مذہبی رجحان بہت گہرا ہے۔ اس اعتبار سے پہلا نام حسین عنبر خاں کا لیا جا سکتا ہے۔ مراٹھی کی قدیم صوفیانہ شاعری میں ان کی معتبر آواز ہے۔ ان کے والد یا قوت عنبر کو دولت آباد میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہتے ہوئے مشہور ہندو سنت جناردن سوامی، ایناجی پنت اور چاند صاحب بودھلے کی مصاحبت نصیب ہوئی۔ جن کے زہد و عرفان اور روحانیت کا دور دور تک چرچا تھا۔ حسین عنبر خاں کی اسی زاہدانہ ماحول میں نشو و نما ہوئی اور ان حضرات ثلاثہ سے انھوں نے فیضان حاصل کیا۔ ویدانتی تعلیم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور دھیرے دھیرے اُسی رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی لکھی ہوئی گیتا کی تفسیر गीता भावार्थ दीपिका مراٹھی کے مذہبی ادب میں معروف ہے۔ اس میں ۷۸۱ ابیات ہیں۔ وجہ تصنیف بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ـــــ

अच्युता श्रम निवृत्तिना यादिकी । गीतेंचिया प्रतिश्लोकी ।
केली ओवी येकियेकि । परि श्लोकार्थ संपूर्ण नसे ।।

اپنی اس تصنیف کے لئے انھوں نے شنکر اچاریہ کے بھاشیہ اور شری دھر سوامی کے ویاکھیانوں سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

भाष्य शांकरराचार्यांचे । आणि व्याख्यान श्रीधर स्वामींचे ।
पाहोनिया टीका भग्वद्गीतेची । महाराष्ट्र भाषेने कीजे ।

حسین عنبر خاں کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کر دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں جس سے ان کی زبان دانی، ہنرمندی اور فنی چابکدستی کا پتہ چلتا ہے گیتا کے نویں ادھیائے کے پہلے شلوک کا یہ ترجمہ دیکھیے:۔

"چونکہ تو نکتہ چینی نہیں کرتا۔ اس لئے میں نہایت خفیہ انسانی اور خدائی
علم بتاتا ہوں۔ جسے جان لینے کے بعد تو برائی سے آزاد ہو جائے گا۔"

اس خیال کو حسین عنبر خاں یوں نظم کرتے ہیں۔

निंदा न करितीया तुज । बोलतो हे अत्यंत गुज ।
भक्ति सहित ज्ञानराजा । जे जाणोनि मुक्त होसी ।।

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مراٹھی کے اس مسلم شاعر نے بھگوت گیتا ہی میں اپنی زندگی کا سراغ پا لیا تھا اور تا حین حیات اسی زمزمہ خوانی میں وہ مشغول رہا۔

اسی عہد میں حسین عنبر خاں کے معاصر سید امین، کشن گیتا ارجن گیتا لکھ کر اردو میں گیتا کے ترجمے اور تفسیر کی بنا ڈالتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں سید امین کا سلسلۂ ارادت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (م ۱۰۸۶ھ) کے سلاسل کے ایک بزرگ حضرت خواجہ عارف گنج بخش سے جوڑا ہے۔ یہ مراٹھواڑے کے باشندے تھے۔ زور مرحوم نے سید امین کی ایک کتاب "مجذوب السالکین" کا تذکرہ اردو مخطوطات کی فہرست میں کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندو۔ مسلمان سنتوں اور صوفیوں کے اقوال جمع کر دیئے ہیں۔ کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ مذکور کروں صوفیائے ہر دو قوم کا بیچ دکھنی زبان کے"....
یوں ہر ایک قوم اپنی اپنی زبان میں علیحدہ علیحدہ ناؤں رکھے ہیں تو میرے جیو میں
آیا کہ مسلمانی ہور ہندوی مذہبی لفظاں جمع کر کر واسطے صوفیانِ ہر دو قوم کے
ایک رسالہ بناؤں تا کہ صاحب منصوبوں کے کام آوے۔"

(تذکرہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۲۱۹)

کتاب کے اختتام پر سید امین یوں گویا ہیں۔

"لیکن اگر مسلمانی ہور ہندوی کتابوں کا ہور بیدوں کا مذکور کرتا تو عبادت دراز ہوتی۔ اس واسطے اب مختصر کیا۔"

مجذوب السالکین میں درج شدہ ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سید امین کو برادرانِ وطن سے اور ان کے مذہب سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ زیر تذکرہ کتاب میں جگہ جگہ مراٹھی اقوال، دوہرے اور اشعار درج ہیں، جن میں اخلاقی و مذہبی درس دیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سید امین کی کشن گیتا کے اقتباسات میں پیش نہیں کر سکا۔

سترہویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ کے ایک اور شاعر شیخ سلطان مراٹھی میں شاعری کرتے تھے۔ کراڈ کے قریب کاردے گاؤں ان کا آبائی وطن تھا، وہ اگرچہ کرجنسی تلذذ، عریانی و فحاشی اور جذباتی پراگندگی کا اپنی عشقیہ لاونیوں میں بے محابہ استعمال کرتے تھے، لیکن ضلع ستارہ کے ایک بزرگ گوپال ناتھ کی صحبت اختیار کرنے کے بعد ان کی کایا پلٹ گئی، مجازی عشق کی جگہ عشق حقیقی سے قلب معمور ہوگیا اور لاونی گانے والا شاعر کیرتن کار بن گیا۔ گوپال ناتھ کے ہندو تلامذہ میں یہ سلطان شاگرد "آبا صاحب" جیسے معزز لقب سے یاد کیے جانے لگا۔ آر۔ سی۔ ڈھیرے کے مطابق شیخ سلطان کی ۵ تصانیف (۱) ستی انوسیا (۲) گیتی جنم (۳) ہنومنت جنم (۴) کولھاٹیا چے چرتر اور (۵) شیواری کتھا مراٹھی کے قدیم ادب میں دستیاب ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں مختلف تمثیلوں کے ذریعہ درسِ سلوک دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ شنکر جی کی حمد و ثنا بھی کی ہے، جس میں تقدس و عقیدت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کی دو آرتیاں اور تین مراٹھی پد بھی ملتے ہیں۔

شنکر جی کی توصیف بیانی میں اردو کے شعراء بھی رطب اللسان رہے ہیں سترہویں صدی کے دو دکنی شاہوں شاہانہ ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے بعد اپنا کچھ وقت شاعری کے لیے بھی نکال لیا کرتے تھے ان میں پہلے شاہ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو (م ۱۶۲۷ء) ہیں۔ اپنی کتاب "نورس" میں انھوں نے کئی دیوی دیوتاؤں کی ستائش کی ہے، ایک نظم میں شنکر کی لفظی تصویر ملاحظہ کیجیے۔

بھیرو کرپور گورا بھال تلک چندرا
ترِی نیترا، جٹا مکٹ گنگا دھرا
ایک ہست رنڈ نرا ترسول جگل کرا
باہن بل ورد سینت جات گسائیں ایشورا
کاس کرت کنجر پریشٹھ چرم ویاگرا
سرپ سنگار نشٹھن پر چھائیں کلپ ترا
رمن دا دن مردنگ دھام کیلاش تدورا
ابراہیم اکہت لچھن راگ بھیرو مہا اتم سندرا

اور دوسرے شاعر عادل شاہ ثانی شاہی (م ۱۶۷۲ء) نے اپنے دادا ابراہیم کی پیروی کرتے ہوئے شنکر کی تعریف و توصیف اس طرح کی ہے۔

بھیروں بھید لچھن جات سو مہا سندر گورو رن گھن سار
ترلوچن، چندریس، مکٹ مدہ گنگا، سرپ سنگار
ایک ہست منڈ نر، ترسول جگل کر، تجیں سمرن چھتر سنکھا دھار
آسن گج بریشت ویاگرم چرم رچت، پربت مندر، بردنگ نجاوت نار

(کلیاتِ شاہی ص ۱۰۰–۱۰۱)

سولہویں سترہویں صدی میں مہاراشٹر کی سرزمین پر جس قسم کے روحانی، مادی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی افکار اور نظام ہائے زندگی کا شجر پروان چڑھ رہا تھا اس کی آبیاری صوفی، سنتوں نے اپنی مقدس تعلیم کے ذریعہ کی تھی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ مہاراشٹر کے کبیر شیخ محمد (م ۱۶۶۰ء) کی خدمات بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔

قادریہ سلسلے کے ایک جلیل القدر بزرگ محمد غوثؒ کے مرید راز محمد کے یہ لڑکے تھے۔ راز محمد رشد و ہدایت کی مسندِ عالیہ پر متمکن ہو کر زہد و ریاضت اور توحید و معرفت کے اسرار و رموز، سالکانِ تشنہ گان کو سمجھایا کرتے تھے۔ ان کے مریدین میں کئی نام غیر مسلموں کے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً چاند صاحب بودھلے برہمن سنت، لیکن راز محمد سے نسبتِ ارادت استوار ہو جانے کے بعد سے چاند صاحب قادری کہلائے۔ دیوگری کے دامن میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

چاندصاحب کے شاگردوں سے میں جنارد ن پنت جیسے معروف سنت کا شمار ہوتا ہے، جو ایکناتھ کے گرو تھے۔ شیخ محمد نے اس سلسلے کو "یوگ سنگرام" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

धन्य चांद बोधले । त्यांनी जानोपंत लोधले ।
त्याचे शिष्य झाले । एको जनार्दना ।

شیخ محمد نراکار نرگن خدا کی پرستش کرنے کے باوجود سگن وساکار روپ کے قائل ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

ज्यासी रूप नाही रेखा । तो, अव्यप्त माझा सखा ।
भावभक्ती चिया सुखा । साकारला ।।
साकारला हरी । गोकुळां भीतरी ।
गौळणी सुंदरी । मोहियेल्या ।।

ادھر اردو ادب میں شیخ محمد کے معاصر محمد نوشہ گنج بخش (م ۱۶۵۴ء) مجسّم تنزیل اللہ کے قائل نظر آتے ہیں۔ اگرچہ کہ آپ کا یہ تصور ہمہ اوست کے دائرے میں آتا ہے، لیکن اس کی حدیں خدا کے سگن ساکار والے تصور سے جا ملتی ہیں۔ اپنی ایک نظم "ناد" میں وہ کہتے ہیں۔

دیکھ قدرت کے کھیل، پیارے دیکھ قدرت کے کھیل
آپے دیا، آپے باتی، آپے لاٹ اور تیل

آپے چاندن ہو دکھلائے آپے کرے اندھیر
آپے دیا جلائے دیکھے آپے کرے بسیر
آپے نرگن آپے سرگن آپے دبھا بسیر
آپے سودا آپے پرکاسا آپے آپ آپ غیر

برہان الدین جانم کے ہاں "آپس سہج روپ سہج بھیا" میں بھی یہی تصور کار فرما ہے۔
شیخ محمد حقیقی رام کی توضیح کرتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں۔
رام سے مراد دسرتھی رام نہیں ہے۔ اپنے والدین کو کاندھے پر بٹھا کر مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرانے والے شراون کمار کو جب دسرتھ راجہ کا تیر لگا تھا تو مرتے وقت اس کی زبان پر رام کا نام آیا تھا۔ اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے وقت تو دسرتھ کا لڑکا رام عالمِ وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ شیخ محمد کا رام وہ ذات الورا ہستی ہے جو دائم وقائم ہے۔ شیخ محمد کے اسی خیال کا پرتو دکنی شاعر شاہ تراب کی مثنوی "من سمجھاون" کے ان اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔

صفت کر اول اوس کی جو رام ہے گا
اُسی رام سوں ہم کو آرام ہے گا

سدا رام کے نام سوں کام ہے گا
ہمن دھیان اوس کا صبح شام ہے گا
وو ہی گل وو ہی مُل وو ہی جام ہے گا
وو ہی ساقیٔ بزم گلفام ہے گا

شاہ تراب چشتی نے رام اور رحیم کے فرق کو اپنے ان اشعار میں مٹا دیا ہے۔ کبیر داس کی یہ آواز۔

بھائی رے دوئی جگدیش کہاں تے آیا
اللہ، رام، کریما، کیسو، ہری حضرت نام دھرایا

اُن کے یہاں دب جاتی ہے اور صرف رام کے نام ہی میں تمام صفاتِ الٰہیہ مدغم ہو جاتے ہیں۔ مسلم معاشرے میں یہ تصور پیش کرنے میں بڑی جسارت کی ضرورت تھی، شاہ تراب نے بہر حال اسے پیش کر دیا۔ محولہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاہ تراب نے ہندو اساطیر اور فلسفہ ویدانت کی شرابِ طہورہ کو تصوف کے جاموں میں بھر دیا ہے۔ اور اس ذاتِ واحد ساقیٔ بزم گلفام کا تخیل اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر مذہب کے تصورِ الٰہ پر وہ منطبق ہو جائے۔ ملّی و مذہبی اتحاد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

احترام مرشد اور الحرام شیخ کے متعلق شیخ محمد کے یہاں نہایت غلو پڑتا گیا ہے۔ ان کے یہاں مرشد کے سامنے مرید کی عاجزی اور انکساری کی انتہا ہے۔

माझे चित्त आहे । तुझ्या पाया पाशी ।
तुजविण परदेशी । हिंडे जण ।
तुजविजण एक । तवकृपा ऐक्य ।
परब्रह्मीचे सुख । तुझेनि मज ।।

مرشد کے متعلق اس طرح کا تصور محمد نوشہ گنج بخش کے یہاں بھی ملتا ہے۔

مرشد کے پگ میں دھر، چرن کنوں چت لائے
سانچے لیکھے لائے نہیں، آخر مائی کھائے — اور

جو مرشد کے پگن پر نوشہ دھرے دھیان
دولت دنیا دین کی پاوے سچ کر مان

یہاں تک تو شیخ محمد اور اردو کے دیگر شعرا کا تذکرہ ہوا۔ مراٹھی ادب کی ورق گردانی کرنے پر مہانو بھاوی سمپردائے کے ایک مسلم شاعر شاہ حسین عرف شاہ منی بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بھگوان دتاتریہ کے اُپاسک मुनीद स्वामी کے ہاتھ پر شاہ منی نے ناری میں گنگا کے کنارے بیعت کی تھی اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے بھجنوں میں لگ گئے تھے۔ ان کی सिद्धान्त बोध مہاراشٹر کے بھاوکوں میں نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ شاہ منی دریائے بھیما اور سرسوتی کے سنگم پر واقع پیر گاؤں میں ۱۷۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان چار پشتوں سے دیوی دیوتاؤں کا معتقد تھا۔ گرو سے بیعت کرنے کے بعد یہ کرشن بھکتی میں لگ گئے اور ستارا ضلع کے پھٹاری منڈل میں اپنی تصنیف सिद्धान्त बोध سن ۱۷۷۸ء میں مکمل کی۔ مراٹھی ادب کے محقق آج گانئی کر اس کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

" मराठी भाषेत ह्या पहिल्या प्रतीच्या ग्रंथात मोडण्यासारखा हा ग्रंथ आहे, पण आमच्या अरसिकतेमुळे त्याचे योग्य स्थान त्याला अद्याप मिळाले नाही. त्याच्या वाणीचे तेज इतके उज्ज्वल आहे की केवळ परमेश्वरी प्रसादाचेच ते फळ होय, असे म्हटल्याशिवाय राहवत नाही."

شری کرشن کے متعلق شاہ منی کا یہ عقیدہ ہے کہ ـــ

" तू सर्व भोगून अलिप्त । सोळा सहस्त्र अंत:पुरात । "

اس عقیدے کی وضاحت کے لئے انھوں نے نارد کی ایک پوری تمثیلی نظم کر دی ہے۔ یہ عقیدہ شاہ منی کے ہمعصر اردو شاہ تراب چشتی اور سولہویں صدی کے صوفی برہان الدین جانم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ شاہ تراب من سمجھاون میں کہتے ہیں۔

کشن بھوگ لیکن ابھوگی رہے گا
وہ جوگیوں میں مل کر اجوگی رہے گا
یہ سب خلق کو جس ستی کام ہے گا
وہی ساقی بزم گلفام ہے گا

اور جانم کا انداز ملاحظہ فرمایئے۔

سولا ہسے گوپیاں کا کانا بال برم تو چاری
یوں دیکھ بھوگ ابھوگی ہونا بوڑے گیان بچاری
پھل تس کے نابات چٹے ہے گربدے ہو بن کاری
لوکاں یہ مت کچھ الادہی جن بوجھ بھنتوں لادھی

شاہ منی کی تمثیلی انداز میں لکھی ہوئی اس نظم میں نارد کا دریا میں ڈوب کر عورت کی شکل اختیار کر لینے اور ایک منی سے پھر ازدواجی رشتہ استوار کرنے کے بعد اس سے ایک سو ایک بچے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کم و بیش اسی طرح کا قصہ دکنی شاعر مختار، بلاقی اور قریؔ کے معراج ناموں میں بھی نقل ہوا ہے۔ لیکن ان کے یہاں نارد کے بجائے ایک یہودی کا ذکر ہے جو آنحضرتؐ کے سفر معراج کا منکر تھا۔ اس طرح کی ایک روایت کا ہر دو مذہب میں آجانا تہذیبی اختلاط ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

یہاں مراٹھی کے تمام مسلم شعراء کا جائزہ لینا تو ممکن نہیں۔ صرف ان کے نام کی فہرست ہی ترتیب دی جائے تو وہ بھی کافی طویل ہو جائیگی لہٰذا ان متذکرہ شعراء پر اکتفا کرتے ہوئے میں اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔

••

آغا جمیل کاشمیری

آغا حشر اور بمبئی

انیسویں صدی کے اواخر میں ایک بیس سالہ سرو قد نوجوان جس کے کتابی چہرے میں بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں سے ایک میں ہلکی سی کجی تھی، بنارس سے آئی ہوئی ٹرین سے بمبئی اسٹیشن پر وارد ہوا۔ یہ نووارد بنارس کے ایک کشمیری خاندان کا چشم و چراغ تھا، اس کی ولادت بنارس میں ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ بمطابق ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو ہوئی تھی۔ جس کا زائچہ خاندانی روایات کے بموجب مرزا محمد بقا نے ۲۰ ربیع الثانی کو مرتب کیا تھا۔ جس کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا تھا۔ جس نے ۱۵ برس کی عمر میں فارسی عربی اور دینیات کے مشہور استاد مولوی حافظ عبدالصمد سے درسِ نظامی کی تکمیل کی تھی جو ۱۶ سپاروں کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ جے نرائنس اسکول بنارس میں مڈل کے درجات تک انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کر چکا تھا۔ جو جے نرائنس اسکول کے اردو فارسی اور عربی زبان کے استاد مولوی حمید الدین کی عدم موجودگی میں ان کے حسب ہدایت اسکول کے مختلف درجات میں فارسی کا درس بھی دیا کرتا تھا۔ اور ان کی ایک شاگردہ لعبہ جے نرائنس اسکول کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ کی صاحبزادی اس نوجوان سے کبھی کبھی عربی صرف و نحو کا درس لیا کرتی تھیں ـــ جس نے ملا غنی کشمیری کی فارسی غزلوں پر غزلیں کہی تھیں۔ اور مرزا محمد حسن فائز بنارسی سے جو مقامی مشن اسکول میں اردو کے استاد تھے اور بعد میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو کے صدر ہوئے، اپنے ابتدائی اردو کلام پر اصلاح لی تھی۔ جس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بنارس میں آئی ہوئی "جوبلی کمپنی" کی طرف سے طلبا کو رعایتی ٹکٹ نہ دیئے جانے پر مقامی روزنامے "رفیع الاخبار" میں کمپنی کے ڈراموں کے خلاف مضامین لکھ کر ہندوستانی ڈرامے پر تنقید کی ابتدا کی تھی۔ جس نے جوبلی کمپنی کے مشہور ڈرامہ نگار احسن لکھنوی سے بحث کے دوران ایک دن یہ کہا تھا کہ جیسا ڈرامہ آپ لکھتے ہیں، ویسا ڈراما میں ایک ہفتہ میں لکھ سکتا ہوں۔ اور اس دعویٰ کے عملی ثبوت کے طور پر صرف اٹھارہ برس کی عمر میں ان کے ڈرامے "چندراولی" کے مقابلے میں اپنا سب سے پہلا ڈرامہ "آفتابِ محبت" لکھ کر ۱۸۹۷ء میں جواہر اکسپریس بنارس سے شائع کرایا تھا۔

یہ وہی صاحبِ قلم تھا جس کے شاعرانہ ذوق اور ڈرامے لکھنے کے شوق نے اسے مزید تعلیمی مشاغل سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ وہی صاحبِ فکر و نظر تھا جس کی تعلیم سے بیگانہ وشی کو دیکھتے ہوئے والدین نے اسے بزنس کی طرف متوجہ کرنا چاہا ـــ یہ وہی سرمستِ حیات کا پروانہ تھا جس نے میونسپلٹی کی ملازمت کے لیے والد کے دیئے زرِ ضمانت کی آدھی رقم راستے میں دوستوں کی خاطر تواضع میں خرچ کر دی تھی اور دریا دلی کے اس مظاہرے کے بعد احساسِ ندامت و شرمندگی کے تحت اس کے قدم خود بخود گھر کی بجائے اسٹیشن کی جانب اٹھ گئے تھے۔ شاہراہِ شعر و ادب کا یہ وہی غریب الوطن مسافر تھا جس نے بمبئی پہنچ کر اپنے ایک عزیز دوست عبداللہ بنارسی کے یہاں عافیت کا سانس لیا تھا۔ اور شہر میں ورود کے پہلے ہی دن ایک شعری نشست میں شرکت کے بعد "بمبئی پنچ" کے ایڈیٹر مولوی فرخ

قلمی جنگ کی ابتدا کردی تھی ـــــ مشاعروں میں شرکت اور "بمبئی پنچ" میں شائع شدہ مضامین کی وساطت سے بمبئی کے ادبی حلقوں نے شروع میں اس نووارد کو آغا محمد شاہ حشر کے نام سے جانا اور پہچانا۔ اور رفتہ رفتہ آغا حشر کے نام سے شہرت کے بام عروج کا چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔

قابل مبارک باد ہے سرزمین بمبئی جہاں ایک دوست کی وساطت سے حشر کی کاؤس جی سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور دوسری ملاقات کے نتیجے میں وہ ان کی الفریڈ کمپنی میں ۲۵ روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے۔ اس طرح ڈرامے کے انقلاب کے پیغمبر کا ظہور ہوا جس کے اجتہادات سے اس فن کی بنا پائیدار ہوئی اور جس کی جنبش قلم سے نئے شاہکار وجود میں آئے۔ ۱۸۹۹ء میں حشر نے الفریڈ کمپنی کے لئے اپنا پہلا تجارتی ڈراما "مرید شک" لکھا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ شیکسپیر کے ڈرامے ونٹرس ٹیل (Winter's Tale) سے ماخوذ ہے۔ حشر نے "مرید شک" کے گانوں کے کتابچے میں ناظرین کو یوں رجوع کیا ہے:-

"آج میں آپ کی نکتہ بیں نگاہوں کے سامنے وہ ناچیز تصنیف پیش کرتا ہوں جس کا نام "مرید شک" ہے۔ یہ ڈراما بھی اس غیر ملکی ساخت کے دل و دماغ کی کوشش کا مجموعہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کو اہل یورپ الہامی فرشتے کا لکچر یا کتاب زندگی کی تشریح سمجھتے ہیں۔" اس عرض داشت میں وہ مزید فرماتے ہیں ـ "کاغذ کے سادہ صفحوں میں انسان اور انسان کے جذبات کی جیتی جاگتی تصویر کس ادا سے دوڑتی پھرتی ہیں، اس کا پورا فوٹو دکھانا اور اس میں وفا، جفا، الفت، نفرت، عیاداری، ریاکاری، اخلاق، نفاق، مختلف اقسام کے رنگ بھر کر جان ڈال دینا شیکسپیر کے ہی دل و دماغ کا کام تھا۔ جس کی تحریر کے طرز، پلاٹ کی خوبی، سبجیکٹ کا التزام اور ان کے علاوہ رزلٹ میں گوناگوں کر دینے والی کیفیات کا احساس اس بات کی گواہی دیکر ثابت کر رہا ہے کہ یہ نامور مصنف نیچرل کالج کا پاس شدہ گریجویٹ ہے۔ اور کتاب فطرت کا شروع سے لیکر آخر تک مطالعہ کر چکا ہے۔" جس تاجدار سخن کے سحر قلم نے اس طرح اہل دلوں پر فتح یاب ہو کر عزت اور شہرت کے ڈنکے بجا رکھے ہیں، اس کی کسی تحریر کو اپنی زبان میں لینا یا اس کے حسن مذاق اور کوائف معاشرت کو اپنے ملک کے طبائع و ضروریات زندگی کے ساتھ ایک پتے پر رکھ کر دکھانا جس قدر اہم اور دشوار ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی غیر زبان کے ترجمے میں دس پانچ دن اپنا خون پانی ایک کیا - دو چار راتیں آرام کی خواہش اور جلتے ہوئے لیمپ کے سامنے آنکھوں کی روشنی کھو کر صبح کی ہو۔"

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ اس کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوا ہوں جس کو کمال ترجمہ کہتے ہیں مگر اس قدر کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ میں نے شاہد فرنگ کو ایشیائی لباس و ہندوستانی مذاق کے گہنوں سے ایک ایسی بنی بنا دیا ہے جو جلوہ افروزی کے وقت جاں ربا تو نہیں مگر دلربا ضرور ثابت ہوگی۔"

پانچ ماہ بعد اسی کمپنی کے لئے حشر نے "مار آستین" لکھا۔ یہ ڈرامے بمبئی کے اسٹیج پر بہت کامیاب ہوئے اب حشر کی مانگ ایک ایک کمپنی کی طرف سے ہونے لگی آخرکار وہ نوراجی پری کی کمپنی میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے جہاں ۱۹۰۱ء میں انہوں نے "اسیر حرص" لکھا۔ اسیر حرص شریڈن کے ڈرامے پزارو (Pizarro) سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کی گانے کی کتاب میں حشر کا خود نوشتہ التماس بہت طویل ہے۔ اس کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"اگر بکرماجیت کے زمانے میں کالی داس نے اس فن پر بہت روشنی ڈالی مگر اس زمانے میں اس کا نشان صرف دسہرہ کے سوانگوں میں نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں اس فن کا پھول اول اول روما کے بت خانے سے پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ روما، ایران اور یونان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان میں اس کی خوشبو پھیل گئی۔ مگر یونان کی طرح انگلستان نے بھی ڈراما کے پاؤں میں مذہبی زنجیریں ڈال دیں۔ فرق اتنا تھا کہ وہاں ناٹک کے پردے میں دیوتاؤں کے بھجن الاپے جاتے تھے۔ اور یہاں دین مسیح کے پیرو اپنی

روحانی کرامات کے جلوے دکھاتے تھے۔ صدہا برس تک ڈرامے کی یہی حالت رہی۔ رفتہ رفتہ زمانے کے ساتھ اس نے بھی پلٹا کھایا اور مذہبی قید خانے کی زنجیریں توڑ کر دنیاوی اسٹیج پر آزادی کی ہوا کھانے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۵۶۴ء میں ڈرامانویسی کا آفتاب عالمتاب لنکاشائر کے قصبہ اسٹریٹ فورڈ میں طلوع ہوا (شیکسپیر پیدا ہوا) جس کے پروازِ قلم نے اس فن کے ہر پہلو کو جذباتِ انسانی و فلسفیانہ شعاعوں سے منور کرکے روشناسِ عالم بنایا۔ اگرچہ شیکسپیر سے پہلے "جان للی" نے دل کش نثر اور جان بیل نے نظم کے خوشنما انداز پیدا کر دیئے تھے۔ رابرٹ گرین نے کامیڈی اور کرسٹوفر مارلو نے ٹریجیڈی میں روح پھونک دی تھی مگر ملکہ الزبیتھ کے گولڈن ایج میں جس نے ڈرامے کو معراجِ کمال تک پہنچایا وہ ملک الشعرا شیکسپیر کا قلم تھا— خود نوشتہ التماس میں حشر مزید فرماتے ہیں۔

"میں ۱۸۹۹ء میں الفریڈ کمپنی میں پلے رائٹر مقرر ہوا تو مالکِ موصوف کے حسب الارشاد WINTERS TALE کا ترجمہ کرکے اردو میں انگریزی ڈرامانویسی کی عمارت قائم کی جس کا بنیادی پتھر خود مسٹر کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے۔ پانچ مہینے بعد اسی عمارت میں "مار آستین" کی ایک منزل اور زیادہ کی۔ شکر ہے کہ دونوں چیزیں پبلک کو پسند آئیں اور ہندوستانی اور انگریزی اخبارات نے ریمارک دے کر میرے حوصلے کو تقویت دی اور اس عمارت میں "اسیرِ حرص" کے نام سے ایک منزل اور اضافہ کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ بھی قدرداں پبلک سے قبولیت کا تمغہ حاصل کرے۔" یہ ڈراما پبلک میں بہت مقبول ہوا۔

حشر کی مقبولیت دیکھ کر کاؤس جی نے ان کو اپنی الفریڈ کمپنی میں ۲۰۰/- روپے ماہانہ پر پھر واپس بلا لیا جہاں ۱۹۰۲ء میں انہوں نے شہید ناز لکھا جو شیکسپیر کے Measure for Measure سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کے گانوں کی کتاب کی تمہید سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور اس بات کا اندازہ لگایئے کہ اس دور میں پبلک کا کیا مذاق تھا اور ڈرامے کا فن کس کسمپرسی کے عالم میں تھا:۔

"موجودہ زمانے کی اور حیرت انگیز ایجادوں میں سے ایک تعجب خیز ایجاد وہ برقی شعاعیں ہیں جنکو انگریزی میں ایکس ریز کہتے ہیں، جنکی وساطت سے بند مکان کی تاریک سے تاریک کوٹھری میں رکھی ہوئی چیز کا عکس مکان کے باہر سے ہی لے لیا جاتا ہے"۔— آگے چل کر اس تمہید میں حشر یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس آتا ہے کہ ڈرامے کی تاریک حالت پر اس نئی روشنی کی ایکس ریز بھی کچھ روشنی نہ ڈال سکی۔ تصنیف و تالیف کے آسمان پر ستارۂ سحری کی چھیکی چھیکی روشنی کی طرح چند! افسانوں اور ناولوں کی کہیں کہیں جھلک ضرور نظر آتی ہے مگر ڈرامے کی قسمت کا آفتاب جو افقِ مغرب سے طلوع ہوا تھا زمین مشرق میں بالکل قریب غروب پہنچ گیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس اہم فرض کا بوجھ کس پر ڈالا گیا۔ ناٹک کے منشیوں پر جنکو علاوہ صدہا ناگفتہ بہ مشکلات کے ایک ادق مشکل یہ بھی درپیش ہوتی ہے کہ ناسمجھ پبلک کے خوش کرنے کے لئے ہر سنجیدہ اور نتیجہ خیز معاملے کو ایسے مذاق سے بدل دے کہ جس سے مزاہ تماشے کی ساری خوبیاں ملیا میٹ ہو جائیں۔ مگر تماشائی یہی راگ گاتے نکلیں کہ پیسے وصول ہو گئے۔

بمبئی کے قیام میں ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک اڈلجی بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لئے ۱۹۰۶ء میں "سفید خون" اور ۱۹۰۷ء میں "صید ہوس" — سہراب جی آگرا کی کمپنی کے لئے ۱۹۰۸ء میں "خواب ہستی" اور ۱۹۰۹ء میں "خوبصورت بلا" ڈرامے لکھ کر حشر نے اپنی شہرت میں چار چاند لگائے۔

بمبئی کے دورانِ قیام میں حشر ڈرامانویسی کی مشغولیت کے باوجود دیگر اصنافِ ادب سے بے تعلق نہیں رہے اپنے قریب ترین دوست ڈاکٹر امرت لعل کے انتقال پر جنکی وساطت سے وہ دوسری بار کاؤس جی سے ملنے گئے تھے انہوں نے فارسی زبان میں جو مرثیہ لکھا تھا وہ ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کے نقطہ نظر سے آپ اپنی مثال ہے۔ یہ مرثیہ رسالہ

شکسپیر میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ علمی ادبی نشستوں کی شرکت کے علاوہ مزید تحصیلِ علم کے شوق سے وہ بے پروا نہیں تھے۔ کریمیہ لائبریری بمبئی کے لائبریرین نے ایک تقریر میں ان کے شوقِ کتب بینی کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ آغا صاحب کا شوقِ مطالعہ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ لائبریری شہر سے دور الفریڈ تھیٹر سے قریب صرف آغا صاحب کی علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے بنائی گئی ہے۔

بمبئی کے قیام میں حشرؔ انجمن ضیاء الاسلام کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ۸ر فروری ۱۹۰۰ء کے جلسے کی صدارت عالی جناب منشی محمد حسن صاحب تعبہ جے۔ پی۔ رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے۔ حشرؔ نے "معجزات القرآن" کے عنوان پر ایک مبسوط لکچر دیا۔ انجمن کی فضا میں فصاحت و بلاغت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جن سے مدد۔ جوش اور تاثیر کے دریا برس رہے تھے۔ تقریر کے آخری حصہ نے حاضرین کے دلوں میں جوہرِ فیاضی کو جنبش دی۔ لوگ انجمن کی امداد پر آمادہ ہوئے اور ایک معقول رقم چندے میں جمع ہوگئی۔ ۹ر فروری ۱۹۰۰ء کے جلسہ میں جس کی صدارت عالی جناب سیٹھ عبد الحسین صاحب کے صاحبزادے سر آدم جی پیر بھائی کر رہے تھے۔ حشرؔ نے "مکارمِ اسلام" کے عنوان پر تقریر کی۔ تقریر کا آخری حصہ چندے کی تمہید تھی جس نے لوگوں میں عام جوش پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ مولانا مولوی سجاد حسین صاحب احمد آبادی نے اپنا بیش قیمت جبہ اتارا اور "برگِ سبز ست تحفۂ درویش" کہہ کر انجمن کو نذر کر دیا۔

۱۱ر فروری ۱۹۰۰ء کے جلسے میں جس کی صدارت سیٹھ فضل بھائی کے صاحبزادے سر کریم بھائی ابراہیم صاحب رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے حشرؔ نے "اب ہم کو کیا کرنا چاہیے" کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ سکریٹری انجمن کے الفاظ میں "اس وقت کمال گویائی آپ کی نطق آفرینی سے متعجب اور حیران ہو رہا تھا۔" ۱۱ر فروری ۱۹۰۰ء کے جلسے کی صدارت حشرؔ نے کی اور سکریٹری جلسہ کے بقول۔ اپنی صدارتی تقریر میں دیگر اصحاب کی تقریروں کی تائید و توضیح میں اپنی وسیع معلومات کے خزانے سے ایسے جواہر نگار پیش کئے جن سے ان ٹکڑوں کے کمال کی پیشانی زیادہ آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگی۔" اسی سال ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والیِ افغانستان کی ہندوستان میں تشریف آوری سے قبل انجمن ضیاء الاسلام نے ایک اور جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مولوی رفیع الدین احمد بیرسٹر ایٹ لا نے کی تھی۔ اس جلسے میں آغا حشرؔ نے جو تقریر کی تھی اس کی تعریف میں بحوالہ سکریٹری انجمن اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ "خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست" جب ہز مجسٹی ہندوستان تشریف لائے تو ان کے استقبال میں حشرؔ نے فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھا جو ماہنامہ "البدر" کانپور میں شائع ہوا تھا اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

مہ رخے نازنینے جامہ زیبے سیم تن خندہ برلب، جام برکف، جلوہ پاش و برق بار

جان پرورے، دلبرے، شکبوئے، ماہروئے خوش نظر، والا گہر، لیلیٰ ادا، شیریں وقار

ناز آفریں، نازنیں، ناز گستر، ناز پرور گلبدن، گل پیرہن، گلگوں قبا، گلگوں عذار

آئینہ رو، شعلہ خو، یاسمیں بو، سمن بر جلوہ بخشِ شامِ غم، صبح آفرینِ روزگار

غمزۂ بیباک او صد نخوتِ دارا شکن عشوۂ چالاک او پنجہ کشِ اسفندیار

زور آور، زور و ور، طرۂ پرپیچ خنجرِ چینِ جنبش، حرب زن، فرش گداز

پے بہ پے بوسہ دادم، برگ نسیم، جستم و درد باز پرسیدم کہ اے جان در لبم بر تو نثار

گفت نازم چو آمدی؟ خندید و با صد ناز گفت اے فصیح کاشمر اے شاعرِ معجز نگار

آنم از مشرق بہ مغرب نور افشانی کنم آنم اندر عالمِ ایجاد چوں شمس النہار

از نسیمِ جودِ ما گلشن بہ داماں ہر چمن از نسیمِ لطفِ ما فردوس در ہر کوہسار

آغا حشرؔ نے مغربی ڈرامے کے پیکر کو ہندوستانی ملبوس پہنا کر زبان و بیان کے زیورات اور آتش نوا خطابت سے آراستہ

کرکے شائقین کو ڈرامے کی افادیت کی جانب متوجہ تو کر لیا تھا مگر وہ مقصدِ حیات جس سے معاشرے میں زندگی، خیال میں وسعت اور روح میں بالیدگی پیدا ہو مالکانِ کمپنی کی ڈراموں میں بے جا مداخلت سے اس نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتا تھا' جہاں تک حشر اسے لے جانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ملازمت کی قید سے آزادی حاصل کرکے حیدر آباد کے ایک تعلقہ دار راجہ راگھوانندر راؤ کی شرکت میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی اور اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے ڈرامے کی زمین کو ہموار کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ کمپنی کے ساتھ اسی زمانے میں وہ بمبئی سے ترک سکونت کرکے حیدر آباد پہونچے جہاں انہوں نے "سلور کنگ عرف نیک پروین" ڈراما جو ہنری آرتھر جونس اور ہنری ہرمن کے "سلور کنگ" سے ماخوذ ہے لکھ کر ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں "یہودی کی لڑکی" لکھ کر ہندوستانیوں کے خوابیدہ ذہنوں کو حرکت وعمل کی طرف راغب کیا۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۱۳ء کو جب ان کی کمپنی شہر در شہر کا دورہ کرتی ہوئی لاہور پہنچ چکی تھی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی نظم "شکریہ یورپ" کے اس بند کو پڑھکر ہندوستانی مزاج کو ایشیاء کے تصور سے آشنا کیا۔ یہ بند حکومت نے ضبط کر لیا تھا ؎

اے زمینِ یورپ! اے معراجِ پیرامن نواز   اے حریفِ ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیادِ الگن کا شانہ ہے   تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشک حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے   خونچکاں رودادِ اقوام گریباں چاک ہے
حرف تضحیف ستم ہے فلسفہ دانی تری   آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
عظمت دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے   دھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکت مشرق کو سونا کر دیا   جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اٹھ رہا ہے شور غم خاکسترِ پامال سے   کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزار ما غریباں نے چراغ نے گلے
نے پرے پروانہ سوزو نے سراید بلبلے

۱۹۱۴ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر اپنا پہلا ہندی ناٹک "بلوا منگل" پیش کرکے ہندو ناری کے وقار کو بلند کیا۔

۱۹۱۵ء میں کمپنی کے ساتھ ایک بار پھر انھیں لاہور جانا پڑا جہاں "انجمن حمایتِ اسلام" کے سالانہ جلسے میں انہوں نے اپنی نظم "موجِ زمزم" پڑھکر ہندوستانیوں کو اتحاد کا جوہری انجکشن دیا فرماتے ہیں (اقتباس نظم موجِ زمزم) ؎

آسماں ہے محفلِ ہستی میں میخانہ مرا   کہکشاں میری صراحی چاند پیمانہ مرا
ہر نفس سے بربطِ گیتی پہ ہوں مضراب زن   اضطراب برق ہے اک رقص مستانہ مرا
ساغرِ ہستی میں ہوں میں ارتعاشِ موجِ نور   جلوہ زارِ زندگی ہے مجھ سے میخانہ مرا
بارشِ مستی کے جلوؤں سے ہے فردوس آفریں   ہے شرابِ نور سے شاداب ویرانہ مرا
نکہتِ صہبائے مستی سے ہے تعمیرِ حیات   دہر میں اک موجِ رنگ و بو ہے کاشانہ مرا
دولتِ صبح قدم ہے مایۂ شام حدوث   گلشنِ جنت تو اے رضواں ہے بیعانہ مرا
جرعۂ جامِ مئے گلرنگ ہے ایک ایک حرف   بزمِ کن کو مست کر دیتا ہے افسانہ مرا

شعلہ آشامِ محبت زآتشِ دیرینہ ام
ساقی ام در مشرب و خمخانہ اش در سینہ ام

اسی زمانے میں ان کی اہلیہ سخت علیل تھیں۔ اہلیہ کی مسلسل علالت سے حشر کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۶ء

میں ان کی اہلیہ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ دل برداشتہ ہو کر سیالکوٹ میں انہوں نے انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی بند کر دی اور بنارس واپس چلے آئے جہاں جے۔ الف۔ میڈن اینڈ کو کی جانب سے ان کو دعوت نامہ ملا اور وہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نگار کلکتہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ۱۹۱۹ء میں "مدھر مرلی"۔ "بھارت رمنی"۔ اور ۱۹۲۰ء میں "جگیرت گنگا" ہندی ناٹک لکھ کر عورت کے وقار کو ہندوستانی معاشرے میں ایک نیا موڑ بخشا۔ ۱۹۲۱ء میں ہندی ڈرامے "پراچین اور نوین بھارت" میں حشر "پربھاشنکر" کے مکالمے میں ہندوستانی معاشرے سے یوں گوگزار دکھائی دیتے ہیں :۔

پربھاشنکر۔۔۔ "بیشک۔ دیش کے پرانے ہنر اور پرانی کاریگریاں مٹ جانے کے کارن، ضرورت کی سب چیزیں مہنگی ہو جانے کے کارن، آٹا چاول کے بدلے دونوں وقت سوکھے چنے بھی نہ جڑنے کے کارن، آج بھارت میں جو پہلے سونے کا بھارت کہلاتا تھا، لاکھوں آدمی پیٹ کے لئے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ لیکن بھارت ماتا کے ان بچوں کو بھکاری بننے کے لئے کس نے بادھ کیا۔۔۔۔ تم امیروں نے! ان کو بھیک مانگنا کس نے سکھایا، دیش کے دکھ سے بے پروا تم دھنوانوں نے!!۔۔۔۔ اگر تم امیر لوگ دیش کی پرانی کاریگریوں کی رکھشا کرتے اور تم لوگ غیر ممالک کی کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے بدلے ملک کے کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو مول لینا اپنا دھرم سمجھتے۔ اگر تم اپنے روپئے زمین میں گاڑنے اور بینکوں میں جمع کرنے کے بدلے انھیں روپیوں سے آرٹ اسکول اور کارخانے کھول کر اپنے دیش کے بھوکے غریبوں کو کوئی ہنر یا دھندا سکھلاتے تو آج یہ سب دیش کی گلیوں میں بھیک مانگتے اور اسٹریلیا۔ فی جی موریشس۔ کناڈا میں چنڈال پیٹ کے لئے بوٹ کی ٹھوکریں کھاتے کبھی نظر نہ آتے۔"

آغا حشر یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی اخلاقی، تہذیبی اور تعلیمی وسعتیں مغربیت کی تنگ نظری سے آزاد ہو کر ملک و قوم کے سامنے اپنے اصل روپ اور رنگ میں آجائیں، مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ایک ایک کر کے روزمرہ کی محسوسات کی دنیا میں اپنی اپنی شکل اختیار کر کے ہر فرد کے سامنے آئے اور اپنی اپنی کارکردگی سے خوابیدہ فطرت ہندوستانیوں کو بیدار کرے ایسے اثرات بہر حال میں انسانی ذہنوں پر کلام اور اداکاری سے بالواسطہ پیدا ہوتے ہیں۔ حشر اپنے ڈرامے "ترکی حور" میں جو ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر کھیلا گیا تھا۔ ڈرامے کی افادیت کے متعلق اپنے نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبوں حالی کو رشیدہ کے ایک مکالمے میں اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

"ناٹک بھی سوئے ہوئے کو جگانے، اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش و جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لکچر سن کر برسوں میں پیدا ہوتا ہے، وہی جوش و جذبہ انسان کے اندر بہتر ناٹک صرف ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے۔"

اسی ڈرامے میں رشیدہ کے مکالمے سے وہ ہندوستانیوں کے مسائل حیات کی یوں نشان دہی کرتے ہیں۔

"ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا، اور سادے طور پر زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا۔ آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام، اور شراب کے نجس چھینٹوں کی پکھتی بنا رہا ہے۔ امیر تو امیر، غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصّہ چائے اور سگریٹ پر، اور دو حصّے شام کے وقت شراب کی دکان پر

بھینٹ چڑھا دیتے ہیں — فضول خرچی اور شراب خوری کی لہروں میں تندرستی، دولت، عزت سب کچھ تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔ ان برائیوں کا بیان یہی اس ناٹک کا مضمون — اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف ملک کو توجہ دلانا یہی اس ناٹک کا مقصد ہے —"

کلکتہ میں "مڈن اینڈ کو" کے لئے ۱۹۲۲ء میں "پہلا پیار عرف سنسار چکر" ۱۹۲۳ء میں "بھیشم پتامہ" ۱۹۲۴ء میں "آنکھ کا نشہ" ہندی ناٹک لکھ کر حشر نے معاشرے کی پستی کو بار بار پیش کیا۔ آغا حشر کا وطن پرست دل اور دقیقہ رس شعور بار بار خفتہ ذہنوں کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ درخشاں ماضی کا آئینہ دار ہو جائے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے ہندی اردو ڈراموں میں اپنے آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی سے کرداروں کی تخلیق کی۔

۱۹۲۴ء میں حشر نے اپنی دوسری تھیٹریکل کمپنی (نیو تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ) کی بنیاد بنارس میں ڈالی۔ جو شہر در شہر کا دورہ کرتی ہوئی جب ۱۹۲۸ء میں پٹنہ پہنچی تو اس کمپنی کو مہاراجہ چرکھاری نے خرید لیا۔ اور حشر نے اپنا ہندی ناٹک "سیتا بن باس" جو بنارس میں ۱۹۲۸ء میں لکھا گیا تھا چرکھاری کے اسٹیج پر پیش کیا۔

حشر کی باشعور سیاسی بصیرت اس وقت اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ معاشرے میں کچھ یکجہتی کا مفہوم اسی وقت معنی خیز ہو سکتا ہے جب ہندوستان میں اچھوتوں کا درجہ دوسرے ہندوستانیوں کے برابر ہو۔ "سیتا بن باس" میں شترگھن سے کلام کرتے ہوئے شری رام چندر جی کے مکالمے میں حشر کے خیالات کا یوں اظہار ہوتا ہے:-

شری رام چندر جی — "کیا برہمن، شتری، ویش کے سمان شودر، پرش اور استری سے جنم نہیں لیتے — منش سماج میں پل کر بڑے نہیں ہوتے — منشیوں جیسا روپ، گن سبھاؤ، ہردے، بدھی، گیان، وویک نہیں رکھتے — امیری، غریبی، مان، اپمان، امرت، وش، شراب اور آشیرواد کا بھید نہیں سمجھتے — چرسکی اور شکشا کے ابھاؤ کے سوا اُن میں، اور دوسرے منشیوں میں کیا بھید ہے۔

شترگھن جس کی جڑ کھوکھلی ہو وہ درکش۔ جس کے استھمب بودے ہوں وہ چھت — جس کی نیو ہل رہی ہو۔ وہ گھر۔ جس کے نچلے بھاگ میں آگ لگی ہو وہ جہاز، اور جس دیش کا ایک بڑا بھاگ نیچ جاتی میں جنم لینے کے کارن اپنے ماتر بھومی کے کروڑوں بچوں کو بل ہیں، شکشا ہیں، ادھیکار ہیں، داس بنا کر سدا اپنے پیروں کے نیچے رکھنا چاہتے ہوں وہ دیش کبھی دیر تک سر اونچا کئے ہوئے، اپنی جگہ استھر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے شودروں کو بھی سماج کا پروجینہ انگ جانو — ان کے ساتھ نیائے کرو اور ان کی پکار کو بھی منشیہ کی پکار سمجھو —"

آغا حشر کی یہ عملی تحریکیں جب اتنی کامیاب نہیں ہوئیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے تو اُن کے ذہن میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا جذبہ جاگ اٹھا — یہ شرف اسی سرزمین بمبئی کو حاصل ہے۔ جہاں آغا حشر نے "امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی" کے اسٹیج پر ۱۹۲۹ء میں اپنا اردو ڈرامہ "رستم سہراب" پیش کیا۔ جس نے ہندوستانیوں کے ذہن میں خود اعتمادی کی شمع روشن کی اور گرد آفرید کے مکالموں کی للکار نے ان کے جذبات کو پیغامِ حریت دیا۔

گرد آفرید — "ایران کے دلیرو۔ یہ دوست نما منافق جس کے پاس مردانہ روح، شرم،

ایمان کچھ نہیں ہے۔ ذاتی مفاد کی نگہداشت جس کا اصول، مطلب پرستی جس کی زندگی کا معیار و معراج، اور دغا جس کا ضمیر ہے، اپنی گویائی کی حرارت سے دل میں ہمت کے لہراتے ہوئے چشموں کو خشک کرکے تمہیں بھی اپنی طرح مردودِ خلائق بنانا چاہتا ہے۔ خدا نے ہمیں اس نگوساری و خواری سے بچالیا ـــــــ بہادرو۔ سہراب اس دنیا میں دنیا سے کوئی علاحدہ چیز نہیں ـــــ وہ بھی تمہاری طرح اپنی زندگی کی مدت اور موت کے وقت سے بے خبر ہے۔ اس لئے تنکے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو ـــــ اُٹھو، اُٹھو ـــــــ مست ہاتھی کی طرح جھوم کر، آندھی کی طرح تھپلا کر، بادل کی طرح گرج کر، پُرغیض بجلی کی طرح تلواریں کھینچ کر حفاظتِ وطن کے لئے اُٹھ کھڑے ہو ـــــ جہاں بزدلی ہے وہیں شکست ہے ـــــ اور جہاں جرأت ہے وہیں فتح ـــــ

بمبئی سے کلکتہ واپس جانے کے بعد بھی حشر کلکتہ کے اسٹیج سے ۱۹۲۹ء میں "دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا"۔ ۱۹۳۰ء میں "بھارتی بالک عرف سماج کا شکار"۔ ایسے ہندی ناٹکوں سے ہندوستانی ماحول کا تجزیہ کرنے میں ہندوستان کے کسی مصلح قوم سے پیچھے نہیں رہے اور ۱۹۳۱ء میں اپنا ہندی ناٹک "دل کی پیاس" لکھ کر انہوں نے اصلاح معاشرے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

کلکتہ کی فلمی دنیا کو "شیریں فرہاد"، "عورت کا پیار"، "یہودی کی لڑکی" ایسی شہرۂ آفاق ناطق فلمیں دینے کے بعد حشر بغرض علاج ۱۹۳۲ء میں لاہور گئے جہاں حکیم فقیر محمد چشتی نے ان کا علاج شروع کیا۔ مسلسل محنت نے حشر کی صحت کو خراب سے خراب تر کردیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے لاہور میں ایک فلم کمپنی "حشر پکچرس" کی بنیاد ڈالی اور "بھیشم پتامہ" ڈرامے کی شوٹنگ میں منہمک ہوگئے۔ مرض میں افاقہ نہیں ہوا اور صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ آخر کا ڈراما نویسی کا وہ آفتاب عالم تاب جو افق بمبئی سے ڈرامے کی دنیا میں طلوع ہوا تھا، اور اپنی ضوفشانی سے ہندوستانی اسٹیج کے ذرے ذرے کو درخشاں اور معاشرے کے ایک ایک سائے کو متحرک کرچکا تھا، لاہور میں ۲۸ر اپریل ۱۹۳۵ء کو غروب ہوگیا۔ اور وہیں ۲۹ر اپریل کو میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں مدفون ہوا۔ مگر اس کی ڈراما نگاری کا فن، اس کی خطابت، اور حقائق آشنا کردار شاہراہ تمثیل نگاری کے لئے، ماضی میں بھی مشعلِ راہ تھے۔ آج بھی ہیں، اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔

●●

ڈاکٹر ظ. انصاری

یادِ رفتگاں : کرشن چندر

عظمت تو کسی کے ساتھ دفن نہیں ہوتی لیکن ۸۰ لاکھ ذی روح کے اس شہر میں کوئی ایک بھی ایسا پھیلا ہوا وجود نظر نہیں آتا جو مخالف متضاد، رنگ برنگے چھوٹوں بڑوں کو دور و نزدیک سے یوں سمیٹ کر بیٹھ جائے کہ بیچ کی سب دیواریں اور سارے فاصلے ناپید ہو جایا کریں۔ یہ کمال اس شخص میں تھا جس کی بڑائی تحریر و تصنیف کے علاوہ، حد درجہ خاکساری اور خاکساری میں پوشیدہ تھی۔ ایک کرشن چندر کے اٹھ جانے سے ہماری روز کی زندگی میں کیسی کمی ہو گئی ہے۔

عاشق آدمی تھے کرشن چندر، انھیں زندگی کی ہر ایک خوبصورتی سے عشق تھا، خوبصورتی میں کہیں نہ کہیں کانٹے بھی ضرور ہوں گے۔ بچے زندگی کا حسن ہیں۔ مگر شرارتوں سے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ عورتوں کے کانٹوں کی چبھن سے تو شاعری بھری پڑی ہے۔ کسانوں کی سادہ زندگی کے حسن میں ان کی محرومی، افلاس اور گندگی کے علاوہ رسم و رواج کے گلے سڑے بندھن، شہر کے حسن میں دھاندلی، بے ایمانی، رسوائی اور سو طرح کے بکھیڑے، کرشن چندر حسن کو کانٹوں سمیت قبول کرتے اور آہ، کراہ دونوں کو کبھی افسانوں اور ناولوں کی صورت میں، کبھی افسانہ نما طنزیہ مضامین کی شکل میں ڈھال دیتے۔ ایسے میں افراط تفریط تو ہوتی ہی ہے۔ کم و بیش چالیس برس انھوں نے لکھا اور اس چالیس برس کی مدت میں ہماری قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی کا کون سا ایسا اہم واقعہ ہے جس کی لرزش ان کے قلم نے قبول نہ کی ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ ایک انتھک مصنف تھے یا اپنے وقت کے بڑے SEISMOLOGIS، کہ ان کی تحریروں نے لاکھوں بندگانِ خدا کے سوتے ہوئے شعور کو جگایا اور جاگتے شعور کو حرکت و حرارت بخشی ہے

میں نے انہیں ۴۶ء میں پہلی بار دیکھا تھا، پستہ قد، موزوں ہاتھ پاؤں، کشادہ پیشانی دلکش ذہین شرمیلی آنکھیں، بھرا ہوا سرخی مائل چہرہ، بے داغ، نفیس مگر سادہ لباس، تب تک ان کی افسانہ نگاری کافی شہرت پا چکی تھی۔ نامور لوگوں میں شمار تھا، مگر وہ ادیبوں کے ایک جلسے میں آئے بھی، گئے بھی۔ اور سوائے چند ملاقاتیوں کے کسی کو ان کی موجودگی کا علم تک نہ ہوا۔ وہ خود اپنے ذکر سے، اپنے منوانے بھنوانے کی ہر ایک کوشش سے بے نیاز تھے، بے نیاز سے کبھی کسی پر مسلط ہوتے نہ دیکھا، نہ سنا، اور تو اور اپنے سے کم رتبہ لوگوں کی دلجوئی کرنے میں وہ پہل کرتے اور ایسے دھیمے لہجے میں سمجھاتے، بہلاتے مناتے کہ آدمی آپ ہی آپ پگھل جائے۔

میری "بزدلی" اور گستاخی — دونوں سے دل ہی دل میں کڑھتے، خفا ہوتے، مگر دو ایک موقعوں کے سوا کبھی خفگی ظاہر نہ کی۔ میری "بزدلی" اس انتہا کو پہونچی ہوئی ہے کہ بعض اوقات اجنبی کو بے غیرتی نظر آنے لگتی ہے۔ اپنا آدمی آپس میں، گالم گلوچ کرنے لگیں، کوئی میرے منہ پر زور زور سے طنطنہ جتانے لگے، ایسے تب پر اتر آئے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور میں وہاں سے فرار اختیار کرتا ہوں یا پھر بتاشے کی طرح گھل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک بار دو واقعے اس پہلو سے کرشن چندر کے دو مختلف رُخ دکھا گئے۔ واقعے یوں ہیں۔

غالباً ۱۹۵۹ء کی ایک شام تھی، میں ماسکو سے بمبئی آیا ہوا تھا چند روز کے لئے۔ اور دوسری شام کی پرواز سے باہر جا رہا تھا۔ اس روز کرشن چندر نے اپنے چار بنگلے والے پرانے ٹھٹھار بنگلے میں میری دعوت کی۔ ایک بڑے عالم دین کی کار مع ڈرائیور لیے وہاں پہونچا۔ دس بارہ اہل قلم موجود تھے اور بدبخت ٹھرے کا دور چل رہا تھا۔ کھڑکیاں تک بند کر رکھی تھیں کہ کہیں شراب بندی سے اخلاق سدھانے والوں کو بُو نہ مل جائے۔ اندر دھواں گھٹ رہا اور دھوئیں سے زیادہ جوش و خروش، ہنگامہ، للکاریں، پینا ایک تہذیب ہے۔ اور بدتہذیبی کا ایک بہانہ بھی، ہمارے قبیلے میں دونوں طرح کی مخلوق پائی

جاتی ہے۔ کرشن چندر ایک تو ویسے ہی نہایت مہذب اور دلدار آدمی۔ دوسرے خود میزبان۔ تو بس بچھے جا رہے تھے۔ نشہ قائم کرنے کے لئے مجھے بڑا سا پیگ پلا دیا۔ پسینے پھوٹ گئے۔ اتنے میں ایک صاحب نے جملہ کسا۔ دوسرے نے شہ دی۔ وقت گذرتا رہا۔ خدا جانے کب کا، کہاں کا غبار تھا کہ ایک اہم اہل قلم نے مجھے تضحیک اور توہین کا نشانہ بنا لیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اتنے میں باہر ٹارچ جلنے بجھنے کی جھلک دکھائی دی۔ میں چپکے سے سرکا، باہر نکلا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ کرشن چندر باہر تک پچھتاتے اور مناتے ہوئے آئے۔ یعنی وہ دوسرے کی طرف سے برابر معذرت کئے جا رہے تھے۔

کمپاؤنڈ میں دیکھا کہ باوردی پولس اس لمبی سی کار کو گھیرے کھڑی ہے ڈرائیور بدحواس ہے۔ بونٹ اور ڈگی کھولی گئی۔ تلاشی ہوئی۔ میں اندر واپس جانے کے بجائے اسی میں بیٹھ واپس ہو لیا کہ مبادا کوئی اور آفت آئے۔ قیام گاہ پر آ کر دیکھا کوٹ وغیرہ وہیں رہ گیا تھا اور کوٹ میں سفر کے کاغذات بھی۔

دوسرے دن پھر پہنچا کہ سامان جو رہ گیا ہے لے لوں۔ کرشن چندر میرے کل رات والے اچانک فرار پر رنجیدہ تھے۔ کپڑے اٹھائے۔ انھوں نے کہا: میں بھی پہنچانے چلوں گا۔ باہر اندھیری اسٹیشن کے قریب ایک جوان سردار جی اپنے چار پانچ لفنگوں سمیت لٹھ لئے کھڑے تھے کہ آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ کرشن چندر گاڑی سے اترے، سردار جی کو ایک طرف لے گئے۔ سمجھایا کہ انھیں ابھی ہوائی جہاز سے باہر جانا ہے۔ پھر لوٹ میں نپٹ لیں گے۔ وہ کہاں ماننے والے۔ کار کے سامنے ڈٹ گئے اور ڈنڈا گھمانے لگے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو کرشن چندر کو جلال آ گیا۔ رات کے واقعے کا غصہ بھی ابل پڑا۔

"دیکھ لے سردارا! میں بھی پنجابی ہوں۔ تو نے خود کو سمجھا کیا ہے"؛ اور آستین الٹ، جھپٹا مار سامنے آ گئے۔ اب معاملہ آبرو کے علاوہ ہماری جان کا تھا میں اور ایک ہمراہی پنڈت جی بھی لڑنے مرنے کو تیار، سامنے آ گئے۔ لفنگوں کا ٹولا ٹپٹا گیا۔ راستہ صاف ہو گیا۔ برسوں مجھے یقین نہیں آیا کہ ہم لوگ اس قدر بے قابو بھی ہو سکتے تھے۔ اور کرشن چندر کو ایک دم اپنا "پنجابی" یا جنگی ہونا یاد آ سکتا تھا۔

دل میں نے ان کا کئی بار دکھایا — اور ہر بار انجانے میں۔ مثلاً مجھے خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اوپر تو طنز کا وار مسکرا کر سہہ سکتے ہیں۔ سلمیٰ صدیقی کی طرف سوئی کی نوک ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ میری اور موصوفہ کی نوک جھونک ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ ذرا کوئی بات منہ سے نکلی اور وہ بے قابو ہو گئے۔ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنا "پنجابی" ہونا اچانک انھیں یاد آ گیا۔

ایسے نرم گفتار اور دریا دل آدمی تھے کہ ان کا اور غصے کا ساتھ ناقابلِ یقین تھا۔ آدھی رات کا وقت۔ میں ان کے گورو لواس (کھار) والے مکان سے رخصت ہونے کو تیار تھا کہ کھڑکی پر دستک ہوئی۔ خود لپک کر باہر ہو گئے۔ ایک دور کے نیاز مند پٹے ہوئے خستہ حال کھڑے تھے۔ کرشن چندر ننگے پاؤں واپس اپنے کمرے میں گئے۔ کمرے سے باہر کے دروازے تک۔ کچھ کھسر پھسر کی اور چلے آئے۔ مجھے ذرا دیر کو اور روک لیا۔ تاکہ میں آنے اور جانے والے کو دیکھ نہ پاؤں۔ ظاہر ہے ناموری، مقبولیت اور قوتِ برداشت کا ٹیکس بھر کر آئے ہوں گے۔ ایک دو نہیں۔ درجنوں ضرورت مندوں کے ساتھ اسطرح سلوک کیا کرتے کہ ایک ہاتھ سے دیں تو دوسرے کو خبر نہ ہو

اور خوبصورتیوں کے علاوہ دسترخوان کی خوبصورتی بھی انھیں بہت عزیز تھی۔ بڑا وسیع دسترخوان تھا ان کا۔ خشک و تر ہر قسم کا اہتمام رہتا تھا۔ ہندی اور گجراتی، مراٹھی اور سندھی، علمی اور فلمی ہر قماش کا لیکھک ان کے مکان پر روشن خیال ہو جایا کرتا تھا اور وہیں ملنے میں مزہ بھی آتا تھا۔ چھوٹے بڑے اکھڑ، الھڑ اور نستعلیق کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ سب کا خاطر کر رہے ہیں۔ حکومت ہند نے اندر کمار گجرال کے زمانے میں ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کا طے کیا۔ فلم بنانے کے قریب تھی کہ میں بمبئی میں وارد ہوا۔ خبر ملتے ہی بلا بھیجا۔ میں نہ گیا کہ خواہ مخواہ صورت دکھانے کیا جاؤں فلم بن چکے گی تو ہو آؤں گا۔

ایک دن صبح سویرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھلا تو آپ موجود۔ شیو تک نہیں کیا تھا۔ بیس پچیس کیلومیٹر کے فاصلے تک ایسے ہی نہار منہ چلے آئے تھے۔ چلئے میرے ساتھ، تیار ہو جائیے۔ آج اور کل میں آخری شاٹ ہونے والے ہیں۔

عرض کیا کہ میں مدحیہ قصیدہ نہیں پڑھنے والا۔ پھر بلاوجہ جلوے میں کنکری کیوں ڈلواتے ہیں۔ نہیں ملنے۔ جانتا ہوں آپ اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں۔ پھر بھی چلنا ہے۔

میں پہونچا اور جیسے ہی کیمرے نے مجھ پر زوم (ZOOM) کیا میں نے پوچھا: کیوں جناب یہ کیا تماشا ہے۔ عمر بھر تو حکومت اور اس کے پرزوں کے خلاف دل کا بخار نکالتے رہے اور اب اس سے اپنی برات نکلوا رہے ہیں۔ (کچھ اسی قسم کا سوال تھا) ہنس دیئے۔ جواب دیا۔ اور دھوسودن کو، جو فلم ڈائرکٹ کر رہے تھے اشارہ کیا کہ رد کنامت۔ وہ میرے بھی دوست تھے۔ چلنے دیا۔ سوال جواب ہوتا رہا اور بعد میں دیکھا تو اس کا بیشتر حصہ ڈاکومنٹری میں جوں کا توں موجود تھا

بعد میں کہنے لگے: بھئی مجھے تو تمہارا رول بڑا پسند آیا۔ اب تک کئی پروڈیوسر تم پوچھ چکے ہیں۔ دے دوں پتہ؟ تم فلم میں کام کروگے؟ کبھی تم۔ کبھی آپ

میں دو برس دہلی میں رہا اور کئی وقفوں سے کوئی گیارہ سال سوویت یونین میں، یہاں اور وہاں جب بھی آتے، محفل جماتے۔ کس کو یقین آئے گا کہ محفل آرائی کے وقت انھیں اپنے دشمن بھی دوست نظر آنے لگتے تھے۔ ان دنوں ہنس راج رہبر صرف کرشن چندر اور امی کے عزیز داروں پر ترکش خالی کر رہے تھے۔ کرشن چندر جب بھی دہلی آتے، ان کی خیریت ضرور پوچھتے۔ شام کو رہبر اور مخمور جالندھری اور فکر تونسوی کی تلاش شروع ہوتی (یہ سب منھ پر اور پیٹھ پیچھے کرشن چندر کے آرٹ کے شدید مخالف تھے) پھر سارے قبیلے کو لئے ہوئے وہ کسی نہ کسی اڈے پر پہونچتے۔ سب کو معلوم تھا کہ میز پر سے بل خود اٹھائیں گے اس لئے کوئی ہاتھ نہ روکتا۔ اور ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ اپنا ذکر نکال کر صفائی دینے یا منوانے "بیٹھے ہوں۔ فی البدیہہ بذلہ سنجی میں انھیں لکھنؤ والوں کا سا ذوق تھا۔ مگر اپنے جانے پہچانے مخالف کو کبھی طنز یا پھبتی کا نشانہ نہیں بناتے تھے۔

بہی مٹھائی کھانے والوں میں بلا کی مٹھاس ہوتی ہو۔ مٹھائی پر وہ مکھی کی طرح گرتے تھے۔ بیوی روکتی تھیں۔ ڈاکٹر روکتے تھے۔ سامنے تو مان لیتے پھر بچوں کی طرح کسی بہانے باہر نکل کر کہتے، یار پیڑے کھانے جائیں۔ اسٹیشن کے پاس والی دوکان کی قلاقند عمدہ ہوتی ہے، ادھر چلیں۔ اور کھڑے کھڑے دو نا صاف کر دیتے۔ خود کم کھاتے، ساتھ والے کو زیادہ کھلاتے

جب بھی مٹھائی کھاتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب کسی لوکل اسٹیشن پر رخصت ہوتے وقت وہ اپنی جیبیں ٹٹولتے اور جتنے پیسے نکل آتے ان کی مٹھائی لے کر آگے بڑھا دیتے۔ ہاں، بس کافی ہوگی۔ رات کو اس سے زیادہ نہیں کھانی چاہئے"

ایک بار چھپا چھپا کر کھا رہے تھے۔ سلمیٰ صدیقی نے بھانپ لیا۔ روکنے کے ارادے سے آگے بڑھنے والی تھیں کہ شرارتی بچے کی طرح ہاتھ پیچھے کو کر لئے اور چہرے پر بھولپن طاری کر لیا۔ ایسے ہی ماسکو میں ایک بار میں نے انھیں وھسکی کی بوتل تحفے میں لے جا کر دی۔ جلدی سے بغل میں چھپالی۔ اور باڈی گارڈ کے آتے ہی اچھلنے کودنے لگے گویا کچھ نہیں، ہنسی کی کوئی بات ہو گئی ہے۔ وہ بھی ساٹھ برس کے اس شریر بچے پر بے اختیار یوں ہنس پڑیں جیسے کبھی بندرابن میں کسی "ماکھن چور" پر رادھا نے قہقہے لگائے ہوں گے۔

کرشن چندر کو شاید اپنے آخری دنوں کی خبر تھی ایک بار (۶۸ء میں) دل کا سخت دورہ پڑا۔ دو مہینے لوٹ پوٹ کے اچھے ہو گئے۔ پھر بدپرہیزیاں اور اپنے بعد کے انتظام۔

خواجہ احمد عباس ان کے واحد دوست، مونس و ہمدم ہیں جن سے لین دین کا کوئی حساب نہ تھا۔ ان سے دل ملا ہوا تھا۔ کبھی حرف شکایت لب تک نہ آیا ہر مسئلے میں وہ ان سے ضرور مشورہ کرتے۔ بیوی بچوں کے مستقبل کی فکر ہوتی تو انھی کے مشورے سے احتیاطی تدبیریں شروع ہوئیں۔ وہ ایک بے غرض اور پکا آدمی ہیں۔ جلوت کے اتنے نہیں، جتنے خلوت کے شریک تھے۔ طے پایا کہ جشن منایا جائے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے، کہ ان دنوں، سیاستدانوں سے زیادہ اہل قلم کے میزبان رہا کرتے تھے، وزیر اعظم کے ہاتھوں بیل منڈھے چڑھانے کی تدبیر کی۔ سارا اہتمام شاندار رہا۔ تھیلی بھی نذرانے میں ملی، سپاسنامہ بھی۔ دھوم دھام بھی، مگر نجانے ان کی تقدیر کا کون سا اسرار تھا کہ جب بھی کوئی ستارہ ان کے لئے چمکتا، دوسرا غائب ہو جاتا۔ "شاعر" کا خاص نمبر ان پر نکلنے والا تھا کہ دل پر سخت حملہ ہو گیا۔ "پدم بھوشن" خطاب ملا، ماں دنیا سے سدھار گئیں۔ عالی شان جشن منایا گیا، چہیتی بہن رخصت ہو گئی۔ ریڈیو کے (آل انڈیا) پروڈیوسر ایمریٹس مقرر ہوئے۔ جاں نثار بھائی چل دیا۔

بڑا اعزاز ملنے سے ڈرنے لگے تھے۔ اور اس سے بھی کہ "آگے آگے دیکھئے، ہوتا ہے کیا"

قلب کے تیسرے حملے میں انھوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ کیا وصیت کی، کیا نہیں، کچھ نہیں معلوم۔ البتہ جب ان کا جنازہ گھر کے ہال میں رکھا گیا تو میں نے، کسی کے کہنے پر، ایک قرآن خواں حافظ جی کو بلوایا۔ قرآن خوانی ہوئی تو پھر کسی کو گیتا خوانی اور گرنتھ خوانی کا خیال آیا۔ وہ بھی ہو گئی۔ "ارتھی اٹھا کر لے جانے لگے تو سردار جعفری کی ہچکی بندھ گئی۔ عمر بھر کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ جنازے کے جلوس میں ڈیڑھ دو سو آدمی شریک ہو سکے۔ مجھے اس دن اپنی زبان کی بے بسی کا درد اٹھا کہ مرنے والے کو زندگی میں اتنی محبتیں میسر آئی تھیں جتنی وکٹر ہیوگو کو فرانس میں اور ٹالسٹائی دستوئیفسکی کو روس میں ملی ہوں گی۔ مگر جب ان کا جنازہ اٹھا ہے تو دور دور تک سڑکیں بند ہو گئی تھیں۔ اور ان کی موت قومی تاریخ کا ایک واقعہ ہو کر رہ گیا۔

کرشن چندر کی تصنیفوں میں، جل پھر خوبانی، فٹ پاتھ، سمندر اور سڑک کے الفاظ اور ان کے تلازمے اتنی بار دہرائے گئے ہیں کہ وہ گویا مرحوم مصنف کی ایک شناخت بن چکے ہیں۔ ابھی ان کو آنکھ بند کئے ایک سال نہ ہوا تھا کہ ان کے علاقے کی سب سے نئی سڑک "کرشن چندر مارگ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور وہ بھی "دو فرلانگ لمبی سڑک" جو سمندر کنارے سے چلتی ہے۔ اس پر فٹ پاتھ بن رہا ہے اور فٹ پاتھ کے شہزادے پڑے رہتے ہیں۔

●●

سید نعیم الدین

برار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء

اکثر سلاطین و امرائے دکن کے آبا و اجداد کا تعلق ایران و توران سے تھا اس لئے یہ فطری امر تھا کہ وہ اپنی موروثی ثقافتی زبان فارسی کو فروغ دیتے لیکن انکا ایک ناقابل فراموش کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی کے مقابلے میں بیشتر اپنے علاقے کی زبان یعنی دکنی اردو کو اہمیت دی اور خود بھی اس کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا اور اہل قلم کو بھی اس میں تخلیق و تصنیف کی ترغیب و تشویق کی ان کے علاوہ صوفیائے کرام کو بھی اپنا روحانی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے مقامی زبان سے بہتر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ غرض دونوں طبقوں کو مساعی کے نتیجے میں دکن کے بعض مرکزی مقامات از قبیل بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی ہی میں قدیم اردو کے اہم مرکز بن گئے۔ برار دکن ہی کا جزو رہا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اٹھارھویں صدی سے ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

گو برار کی حالت ایک ادبی جزیرے کی سی تھی، تاہم برھانپور اور اورنگ آباد سے اس کے تعلقات تھے، اور شمالی ہند سے بھی اہل علم و ادب یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم برار کے مشہور شاعر غلام مصطفیٰ انسان شمالی ہند سے تشریف لائے تھے۔ ان کا انتقال ایلچپور ہی میں ۴۲ ۱۱/ ۱۷۲۹ میں ہوا۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں لکھا ہے کہ وہ علوم ہندی سے اس حد تک واقف تھے۔ کہ پنڈت اپنی مشکلات حل کرانے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ شعر ہندی (کبت اور دوھا) خوب کہتے تھے۔ (۱) انسان کے انتقال کے وقت دوسرے مشہور ایلچپوری شاعر آقا محمد امین وفا (پیدائش ۱۱۱۰/ ۱۶۹۸) تقریباً ۳۲ سال کے تھے۔ ان کی دو غزلیں تذکرہ گلشن گفتار میں مرقوم ہیں۔ وفا کے معاصرین میں نورالدین حسین خاں رنگیں (۱۱۷۰/ ۱۷۴۳) رسا بالاپوری (۱۱۶۵/ ۱۷۵۲ سے پہلے) شاہ غلام حسین ایلچپوری اور روضۃ الاولیاء کے خالق، مودی عبدودی قابل ذکر ہیں ان میں غلام حسین گلی سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غلام حسین کا زمانہ ولی کے بعد کا ہے جن کی تاریخ وفات ۱۱۳۳/ ۱۷۲۰ اور ۱۱۳۸/ ۱۷۲۵ کے درمیان مانی جاتی ہے (۲) حضرت غلام حسین کا زمانۂ حیات ۱۱۲۹ — ۱۱۳۰/ ۱۷۱۶ — ۱۷۱۷ (۱) آزاد بلگرامی سرو آزاد، ۱۹۱۳ ص ۲۴۷، ۵ (۲) جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول۔ ۱۹۷۷ ص ۵۳۹ اور ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء کے درمیان ہے۔ اس وقت شمالی ہند ہی میں نہیں دکن میں بھی سراج اورنگ آبادی (م ۱۱۷۷) اور عزلت (م ۱۱۹۸) کے ہاتھوں زبان نکھرنے لگی تھی، اور بس پر فارسی اسلوب حاوی ہونے لگا تھا لیکن دیوان غلام حسین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ برار جیسے دور افتادہ علاقے

میں دکنی ایک عرصے تک اپنی قدیم گدّی پر مزے سے براجمان رہی۔ اور غلام حسین نے اودھو نامہ، لگن نامہ، یکرنگ نامہ، سکھی نامہ، جھولنا نامہ، اور کچھ غزلیں اس طرح ہندیت میں ڈوبی ہوئی لکھیں کہ انھیں قدیم دکنی ادب کے سلسلے کی آخری کڑیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں ہمیں ڈاکٹر پرکاش مونس کا یہ مقولہ یاد آتا ہے "من سمجھاون قدیم دکنی سلسلۂ ادب کی آخری کڑی ہے، ولی کے زمانے سے اردو مصنفین کے یہاں ہندیت پر فارسیت کو ترجیح دینے کا جو رجحان ہو چلا تھا۔ وہ 'من سمجھاون' میں بالکل مفقود ہے 'من سمجھاون'، صحیح معنوں میں ہندی اور اردو ادب کا مشترک سرمایہ ہے"۔ (اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر الٰہ آباد ۱۹۷۸ ص ۲۷۲) لیکن ہمارے خیال میں دیوانِ غلام حسین کی دریافت کے بعد پرکاش مونس کا یہ قول ترمیم طلب ہو جاتا ہے۔ یعنی ہماری رائے میں شاہ تراب کی من سمجھاون کو نہیں ان کے بعد آنے والے غلام حسین کی اودھو نامہ جیسی منظومات کو قدیم دکنی کے سلسلے کی آخری کڑیاں تسلیم کرنا چاہیے۔ کلامِ غلام حسین کی لسانی اہمیت دیگر شعرائے دکن کے مقابلے میں یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے اشعار میں کہیں کہیں پیا، ممری، تموت جیسے برج کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ برج کے میٹھے منوہر الفاظ دکن کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئے تھے۔ ایلچپور ہی کے ایک اور شاعر حضرت موسوی کے مجموعۂ کلام روضۃ الواصلین میں مجھے کچھ اشعار بزبانِ گوالیاری، نظر آئے۔ برج کے الفاظ خاص طور پر غلام حسین کی سانجھ پڑی چوندیس، والی غزل میں اودھونامہ میں ملتے ہیں۔ زیر بحث غزل کی یہ ردیف خسرو سے منسوب اس بیت سے ماخوذ ہے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس

اس سلسلے میں معنی خیز بات یہ ہے کہ غلام حسین نے بھی یہ غزل اپنے مرشد کی وفات پر لکھی ہے چند اشعار سنیے۔

سووت سووت رین دن کھویا سورج ڈوبا جائے
چاند نہ نکسا بھیا اندھیرا سانجھ پڑی چوندیس
رین اندھیری بات کٹھن اور نپٹ بکٹ بے گیات
کیوں کر پہنچوں دور ہے ڈیرا سانجھ پڑی چوندیس
ایک چلی ہے پنیا بھر بھر ایک بھرن کو آئے
یہ پنگھٹ کا ہیرا پھیرا سانجھ پڑی چوندیس
جیسے بادل چاند کو گھیرے ہوئے گھٹا اندھکار
جم نے آکر جیو کو گھیرا سانجھ پڑی چوندیس
چل گھر اپنے سنگ گرو کے چھیرا ہو کے حسین
پنچھی لینے چلے بسیرا سانجھ پڑی چوندیس

عروض کے لحاظ سے اس کی تقطیع کی جائے تو متقارب کا سالم رکن فعولن بھی آیا ہے اور اس کے مختلف زحافات بھی جگہ جگہ بے ترتیب آئے ہیں۔ ہر مصرعہ سات رکن کا ہے، یہ اردو شعرا کے معمولات کے خلاف ہے اور اردو غزلوں میں عموماً پورا شعر ۶ یا ۸ رکن کا ہوتا ہے یا مضاعف ہوا تو بارہ یا سولہ رکن کا ہوتا ہے۔ اس غزل کی ہر بیت چودہ رکن کی واقع ہوئی ہے۔ ماہرین عروض کا اس پر اتفاق ہے کہ متقارب ومتدارک کے یہ اوزان چھندس سے ماخوذ ہیں۔ عربی فارسی شعرا نے ان اوزان میں بہت کم کہا ہے، نظم طباطبائی اپنی تصنیف "تلخیص عروض وقافیہ" میں کہتے ہیں۔ عربی کے اصول سے یہ صحیح نہیں۔ معلوم ہونے مگر میر نے خصوصاً چوتھے دیوان میں غزلیں کہی ہیں" ان اوزان کی شیرینی کی داد دیتے ہوئے نظم طباطبائی نے مزید لکھا ہے کہ "عروض کے جو اوزان چھندس سے مطابقت رکھتے ہیں اردو میں زیادہ مستعذب ہیں۔ اور ہونا بھی چاہیے" (ص ۲۷) بہرحال یہ ظاہر ہے کہ غلام حسین کی اس غزل میں ایک مخصوص اداسی سی بسی ہوئی ہے جو کسی محبوب شخص کی موت پر فطری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے۔ سانجھ پڑی چوندیس کی تکرار سے پیدا ہونے والے اندھیرے کی شدت کا احساس ہوتا ہے، زبان کی سادگی خلوص پر دلالت کرتی ہے اور بیان کا علامتی انداز

دل کو اپیل کرتا ہے ۔ پنگھٹ سے پنیا بھر بھر کر جانا، بادلوں کا چاند کو گھیر لینا، پنچھی کا اپنے آشنا کی طرف اڑنا شام کے اندھیرے کا چھا جانا، یہ سب دنیا سے آخری سفر کی بڑی عمدہ اور موثر علامتیں ہیں ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ولی اردو غزل کو فارسی غزل کے سانچے میں ڈھال چکے تھے، اور شمالی ہند میں میر، درد وغیرہ فارسی رنگ میں رنگی ہوئی غزلیں پیش کر رہے تھے ۔ اس زمانے میں ہندی افکار و طریقۂ اظہار کی آئینہ دار یہ غزل ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے کہ دیوان غلام حسین کی دیگر غزلوں میں ایرانی اسلوب جاری ہے ۔ کہیں کہیں سعدی، رومی، اور حافظ کے اثرات جھلک اٹھے ہیں ۔

غلام حسین نے نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ ان میں لگن نامہ ایک زمانے میں ایلچپور کی میلاد خوانوں کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھیں، یہ نہایت دلکش تمثیلی نظم ہے جس میں روح کو دلہن قرار دے کر اس کے اصلی مقام یعنی عالمِ آخرت سے لو لگانے کی بات کی گئی ہے ۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

تنا کو اے سہیلیاں میٹھے بچن سناؤں
ٹک کان دھر سنو تو پیو سو لہا سلاؤں

غلام حسین کی دوسری نادر نظم "بیجر نگ نامہ" کا موضوع ہندو مسلم اتحاد ہے، یہ اس موضوع پر اردو کی سب سے قدیم نظم ہے ۔ اس میں وہ کبیر کے انداز میں ظاہر پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی خبر لیتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔

مسلمان تسبیح لبی پھرا دیں
و ہندو بھی مالا بغل کے دکھائیں
دکھاتے ہیں لوگوں کو ملتے پھرا کر
آپس من کا من کا نہ پھیریں ہرا کر
بغل میں بھیوں کر کا لیکے دفتر
نہ بجھیں پرت پنتھ کا ایک انچھر

اسی طرح کرشن کے دوست اودھو پر لکھی ہوئی ان کی نظم اودھو نامہ، اودھو پر مستقل حیثیت سے تصنیف شدہ پہلی اردو نظم ہے ۔ غلام حسین نے ہندی کی مشہور صنفِ سخن جھولنے، کو بھی اپنایا ہے ۔ شانتی اس کے اظہار کے لیے دوہے، چوپائی اور سورٹھے کے ساتھ ساتھ جھولن بھی کارآمد مانا جاتا ہے ۔ چھٹو لال شکلا کے نزدیک اس کی ۲۶ اور قدر بگرامی کے خیال میں اس کی ۷، ۱۲ نزاکتیں ہوتی ہیں ۔ اردو میں یہ صنفِ سخن بہت کم استعمال ہوئی ہے ۔ اس لحاظ سے غلام حسین کا جھولنا نامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہاں یہ اضافہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ غلام حسین کی موضوعِ بحث غزل اور ان نظموں میں سے اکثر کو میں ۱۹۵۷ اور اس کے مابعد کے نوائے ادب، اردو ادب کے شماروں میں منظرِ عام پر لا چکا ہوں ۔ اس وقت مولوی مہدی کی روضۃ الواصلین کا مختصراً تعارف کرا دوں ۔ اس میں سورٹھے اور اور دوہے جیسی ہندی اصناف سخن تو ملتی ہی ہیں ۔ ان کے علاوہ موسوی نے ایک نظم "فی لسان الہند" لکھی ہے اور دوسری "بزبان گوالیاری" علاوہ ازیں انھوں نے ہندستانی موسیقی کی طرز میں بھی کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں ۔ غرض روضۃ الواصلین کی بھی بڑی لسانی اہمیت ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ایلچپور اور دیگر مقامات کے مہدوی حضرات نے قدیم اردو میں بڑی وقیع منظومات پیش کی ہیں ۔ ہندی فرقے ہی سے منسوب انیسویں صدی ایلچپور کے نواب خاندان کے ایک فرد نواب نامدار خاں نے جرنیل، کے تخلص کے ساتھ بڑی سادہ اور دلکش زبان میں شاعری کی ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندستان میں انگریز کے قدم جم چکے تھے ۔ چنانچہ نواب اسی احساس کے تحت کہتے ہیں ۔

اپنے تئیں متابعت دِل ضرور ہے
تم بھی چلے چلو جہاں انگریز لے چلے

جنرل کا دیوان ۱۲۳۱ھ میں مکمل ہوا ۔ منشی حشمت رائے تخلص جانباز نے اس کی تاریخ تکمیل لکھی ہے (ورق ۶۴ب) دیگر علاقوں کی طرح اس وقت برار کی بھی حالت اچھی نہیں تھی

چنانچہ جرنیل کا آشوب نامہ اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے، بہرحال انھوں نے ان حالات میں بھی اپنی رنگین مزاجی برقرار رکھی جیسا کہ ان کی ہولی پر لکھی ہوئی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے جرنیل کے بعد امجد حسین خطیب (المتوفی ۱۹۰۵) کا دور آتا ہے جنھوں نے نعت گوئی میں منفرد حیثیت حاصل کی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اہنا پرشاد طرف ایلچپوری کے علاوہ داغ کے شاگرد منشی محمد حیات خاں منظہر مرتضی پوری (المتوفی ۱۹۲۶) نے کلاسیکی انداز کی بڑی استادانہ، دلآویز غزلیں لکھیں کچھ شعر سنیے۔

ہنستے ہیں اگر وہ تو تڑپتا ہے مرا دل
کچھ ان کی ادا ہی میں ہے انداز جفا اور
دل میں ہے کبھی درد کبھی سوزش فرقت
اقلیم محبت کی ہے کچھ آب و ہوا اور
اضطراب دل کی صورت میں دکھاؤں کیا تمہیں
برق کے شعلے کی کھینچے گا کوئی تصویر کیا

اسی زمانے میں محرم کی مجلسوں کے لیے مراٹھی کے پاوڑے کی طرز میں شائق کلام گاؤنی، حمزہ، ارمان بالاپوری، افضل آکولوی وغیرہ نے گیت نما نظمیں لکھیں منظہر کے شاگردوں میں آکولہ کے بشیر احمد شہید اور امراوتی کے پروفیسر منظور حسین شور نے شہرت حاصل کی۔ برار میں اردو شاعری کو عصری حقائق سے نزدیک لانے میں قیصر بدنیروی عم امراوتی (المتوفی) کے ساتھ پروفیسر شور کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے رومان سے انقلاب تک جدید زندگی کی تقریباً ہر منزل کی بات اپنے منفرد انداز میں کی ہے۔ انہیں کسی منظر کو بصری متحرک پیکر کے ذریعے پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔

وہ طوفان کے ہل چلنے لگے سیاں کھیتی میں
وہ کشتی آکے ڈوبی گوہر میں قطروں کی بستی میں
وہ ابھرے موج کے سینے سے گردابوں کے پیارے
وہ رقصاں ساز طوفاں پر ہوئے شاداب انگارے

(رلاع، امراوتی ۱۹۴۶، نبض دوراں کراچی ۱۹۵۹ ص ۱۹۴)

انہیں شاعر نفسیات داں کہیں تو بجا ہوگا اس لحاظ سے کہ وہ بطون انسان کو کیفیات کو بڑے واقف کارانہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں ذرا ہنسی اور مسرت کے سلسلے میں یہ دقیق النظری ملاحظہ کیجیے۔

کچھ ایسے زخم بھی ہوتے ہیں جن کے ایماء سے
ہنسی نہ آئے مگر ہنستے جاتے ہیں چہرے
مسرتوں کے بھی جھونکوں سے کانپ جاتے ہیں
تھپیڑے وقت کے ایسے بھی کھلتے ہیں چہرے

(چہرے)

وہ غم میں بھی سرور کا پہلو دیکھ لیتے ہیں اور طوفان سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہیں۔

ہیں کتنے غم جن کو سرور انگیز ہوتی ہے
ہیں کتنے گیت جن کی لو ہوا سے تیز ہوتی ہے
کھنچا ہے جن کا خط رہ گذر طوفاں کے دھاروں پر
بڑی مشکل سے ان کو نیند آتی ہے کناروں پر

وہ ہندستان سے ہجرت کرنے والے تنہا پاکستانی شاعر ہیں جو وہاں رہ کر

اے ہمالہ کے چومتے بادل
مجھ کو ہندستان لیتا چل

کہنے کی جرات رکھتے ہیں۔

شور کی طرح قیصر کی شہرت برار کی سرحد تو پار نہ کر سکی مگر ان کا پڑھنے والا ان کی اعلیٰ فنکاری پر ایمان لائے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے اکثر اشعار موسیقیت میں سرشار ہیں ذرا یہ اشعار سنیے اور ان میں نون اعلان اور نون غنہ کی تکرار سے جو موسیقیت پیدا ہوگئی ہے اس کی داد دیجیے:

پھولوں کے چاک داماں غنچوں میں سوز پنہاں
گلشن بہار میں بھی بے کیف و درد ساماں
سوز دروں نہیں ہے جوش جنوں نہیں ہے
دل ہی سے عاشقی تھی دل ہی میں خوں نہیں ہے

(طوفان و ساحل دہلی ۱۹۵۰، ص ۷۷)

وہ لہجے کے شاعر ہیں یعنی انہیں پڑھتے ہوئے لہجے کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو کبھی خدا نہ دکھائے وہ ساعتیں
دور وزہ زندگی کیلئے اشکبار ہوں
چمکتی ہے اگر اے باغباں تقدیر گلشن کی
بلا سے بجلیاں برباد میرا آشیاں کر دیں

قیصر تمام عمر مصائب میں مبتلا رہے لیکن ان میں بڑی جرأت وجسارت تھی چنانچہ انھوں نے شکارِ غم ہونے کے باوجود غم شکار بننے کی بات کی:

ہجومِ رنج میں بھی غم شکار ہو کے چلو
چلو جدھر کو نسیم بہار ہو کے چلو

قیصر کے مجموعہ کلام طوفان وساحل (مطبوعۂ دہلی ۱۹۵۸) کی تقریباً ہر نظم وغزل میں ان کی فنی دست رس کی شہادت ملتی ہے قیاس کہتا ہے کہ زبان وفن پر یہ قدرت قیصر کو اُس زمانے کے مشہور شاعر و شاعر گر حضرت حبیب الرحمٰن صدیقی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ موصوف نے مرہٹی زبان کے مشہور شاعر سریش بھٹ کو اپنی زبان میں غزل لکھنے کا شوق بھی آپ ہی کی صحبتوں میں ہوا گورنمنٹ اُردو ہائی اسکول امراوتی کی معلّمی کے زمانے میں ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی آپ کے تربیت یافتہ اردو سخنوروں میں قیصر کے علاوہ رشید کیفی اور شارق نیازی کے اکثر اشعار ان کے لطافتِ احساس کا شاہکار ہیں بالخصوص موسیقیت کلامِ شارق کی بھی امتیازی خصوصیت ہے اس خوش نغمگی نے ان کے یہاں خاص کر غم واندوہ کی ترجمانی میں بڑا پُر تاثیر حسن پیدا کر دیا ہے شارق کا یہ شعر ان کے احساس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ ان کی قدرتِ تخیل پر دلالت کرتا ہے:

ہوا میں اڑ گئی شارق پیامِ شوق کی بات
ہمارے کام نہ آئی صبا کی نامہ بری

(ص ۶۷، صبح کا ساقی، آکولہ ۱۹۶۹)

غرض کلامِ شارق میں جو کلاسیکی رچاؤ اور سوز ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے

ڈاکٹر منشا کا کلام بھی اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہے جب وہ "نوائے دل" سناتے ہیں یا "ذکرِ خوباں" کرتے ہیں تو شاعروں میں چھا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب "ذکرِ خوباں" کے ہی نہیں۔ "عکسِ دوراں" کے بھی قائل ہیں اور یہ کام بھی انھوں نے نہایت صنّاعانہ انداز میں انجام دیا ہے ان کی "تضمیناتِ اقبال" بھی خوب ہیں۔

دیگر شعرائے جدید میں جانے پہچانے نام یہ ہیں۔ خورشید آرا بیگم، بغدادی بیگم، گل شیر خاں ببر، اثر بدیزدی، رشید اللہ خاں جوہر، مشرف امراوتی، سردار خاں، اثر بالاپوری، حفیظ اللہ خاں بدر، ساز بالاپوری، مشکل افکاری، افسر آفاقی، میر عنایت علی، مصور کارنجوی، لال خاں فردوسی، سوز شوری، اسیر، ظریف ایلچپوری، عبدالصمد جاوید، جوش ایلچپوری، بسمل آکولوی، طالب کوری، شاہد انصاری، ظفر ایلچپوری، منظر، حیدر بیابانی، متین اچلپوری، مشتاق نقوی، افسر، طالب شادانی، نعیم نامی، پیارے لال، تمکین الرحمٰن، حنیف خلش، محبوب راہی، مردان علی خاں نشاط، ذکا صدیقی، ضیا صدیقی۔

یورپ کی علامت پسندی کی تحریک کے زیرِ اثر دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تقریباً ۱۹۵۵ء سے شاعری نے نئی کروٹ لی اس رجحان کے مبلغین نے شاعری کو ایک مستقل خود مختار فن کی حیثیت سے دیکھا اور برتا اور اپنے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی استعمال اور ٹھوس پیکروں پر زور دیا اس قبیل کی نئی شاعری کے ممتاز نمائندے مرہٹواڑہ دقاضی سلیم ناگپور میں مدحت الاختر اور ہمارے علاقہ برار میں سیّد صفدر ہیں۔ نئے قسم کے گیت لکھنے والوں میں متین اچلپوری اور نئی طرز کو غزل لکھنے میں ضیا صدیقی نے امتیاز پیدا کیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ برار میں شروع سے آج تک گیسوئے شعرِ اُردو کو سنوارنے والے موجود رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بمطابقت زمانہ قدیم وجدید مسنی دہلی، ترقی پسند اور نئی ہر قسم کی شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ آج بھی یہ کارواں خدمت زبان وادب کی غزل کو طرف رواں دواں ہے

ڈاکٹر سید نعیم الدین

قدیم اردو اور تہذیبی ہم آہنگی

برعظیم ہند میں زمانۂ قدیم سے ہندو مسلم ثقافت کے اختلاط کی مثالیں فنِ تعمیر، فنِ موسیقی اور ادب۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں نظر آتی ہیں۔ دورِ تعلیم کی تعمیرات میں سے مقبرۂ ہمایوں پر نگاہ ڈالیے اس کے گنبد ایرانی طرز کے تو چاروں طرف کی بُرجیاں مقامی اسلوب میں ہیں اختلاط کی یہی کچھ کیفیت امیر خسرو (م ۱۳۱۲) اور سلطان حسین شرقی کے کارناموں کے نتیجے میں موسیقی میں پیدا ہوئی۔ باہمی ربط و ضبط کا سب سے پیارا اور نیارا ثمر اردو زبان کی شکل میں نظر آتا ہے۔

اردو کا مولد بھارت ہے اس کا قدیم نام ہندی ہے اس میں مسلم فاتحین کی آمد کے بعد عربی، فارسی اور ترکی الفاظ داخل ہوئے اور یہ زبان مقامی لوگوں کے ساتھ ارتباط و اتحاد کا ایک اہم واسطہ بن گئی اور تیرہویں / چودھویں صدی عیسوی ہی سے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (م ۱۲۶۵) اور امیر خسرو (م ۱۳۱۳) جیسے صوفیائے کرام نے اسے اظہارِ ذات کا وسیلہ مانتے ہوئے۔ اس میں دوہے لکھ کر ثقافتی ہم آہنگی کی راہ میں پہلا قدم اٹھایا۔

سائیں سیرت گل گئی ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیوساں جب لگ ہوسوں کیہہ

(گنج شکر)

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(خسرو)

چودھویں صدی کے ہمارے صوبہ مہاراشٹر کے ایک سنت کوی نامدیو (م ۱۳۵۰) کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کا ہندی کلام سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں محفوظ ہو گیا ہے۔

اردو کی قدیم ترین مستقل تصنیف کدم راؤ پدم راؤ پندرہویں صدی میں لکھی گئی (سولہویں صدی کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ اس صدی کے مشہور شہنشاہ بابر کی زبان پر دفتی اور پانی کے الفاظ آئے اس نے ایک فارسی شعر میں بھی دو اردو الفاظ جو ہمارے استعمال کے ہیں کی پہلی بار ہم نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ اسلامک کلچر میں نشاندہی کی ہے) کدم راؤ پدم راؤ نظامی بیدری نے ۱۴۳۰ اور ۱۴۳۵

کے درمیان لکھی۔ اس میں نفی کے اظہار کے لئے مراٹھی کا "نکھ" اور تاکید کے لیے حرف "ح" نظر آتا ہے۔ شاعر نے مراٹھی افعال اچھے اور آنے بھی بلا تکلف استعمال کیے ہیں اس میں سنسکرت کے ساتھ فارسی الفاظ اور رام و لچھمن کے ساتھ نوح و ایوب کی تلمیحات بھی ملتی ہیں یہ ایک راجا موسوم بہ کدم راؤ اور اس کے ناگ ذات کے ایک وزیر پدم راؤ اور ایک جوگی رگھورنات کی خالص ہندستانی الاصل داستان ہے۔ نظام بیدری کے علاوہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں شمس العشاق میراںجی (م ۱۴۹۶) باجن (۱۵۰۶ء) محمود دریائی (م ۱۵۳۶) علی جیوگام دھنی (م ۱۵۶۵) اور برہان الدین جانم (م ۱۵۸۲) کے کلام میں اسلامی اور ہندی اثرات کی آمیزش ثقافتی ہم آہنگی کا بڑا واضح پر درد مثالیں پیش کرتی ہے۔ ان اہل دل حضرات کا مشرب وسیع تھا چنانچہ انھوں نے جنتا کے دلوں کو موہنے کے لیے بول چال کی عام زبان میں ہندی اور ان میں بھارت کے مخصوص تصورات و تلمیحات سے کام لیتے ہوئے شعر لکھے مثلاً میراںجی پنچ بھوت اور دس اندریوں سے واقف تھے جیسا کہ ان کے رسالہ چہار شہادت کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

پنچ بھوت دس اندریں بھوگ
چندر، سور، پنچ پاکر سنجوگ

(ص ۸۹، رسالہ مغز مرغوب و چہار شہادت)
مرتبہ محمد ہاشم علی، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء

باجن، دریائی اور علی جیو بھارتی موسیقی سے شیدائی تھے انہوں نے ہندی راگنیوں کے مطابق شعر لکھے اس سلسلے میں کلام باجن کی کیا بلحاظ قدامت کیا بلحاظ معنویت بڑی اہمیت ہے باجن درویش اور ابدال کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت، جوگی، جٹادھاری اور اپاسی کو نہیں بھولے:

پڑھ پنڈت پوتھیں دھویاں
سب جانہ سدھ بدھ کھویاں
سب جوگیاں جوگ بسارے
یہ تپی تپ بکارے
ایک درویش ہوئے کر آئے
ہوئے قلندر روپ پھرائے
ایک ابدال ہوئے ابد ہوتے
ایک باندیہیں باہا ہوتے
ایک جہنگم جٹادھاری
ہور ہندو نس اندھیاری
ایک رہیں اپاسی راشن باگیں
ایک ہوئی بھیکاری تجھی مانگیں

(ص ۳۳، نوائے ادب، خزائن رحمت
از ڈاکٹر شیخ فرید اکتوبر ۱۹۷۰ء)

برہان الدین جانم کی کشادہ نظری کفر میں بھی نورِ ایمان دیکھ لیتی ہے وہ اپنی نظم ارشاد نامے میں کہتے ہیں ۔

کفر کے ہردے دیکھیا نور
نور کے ہردے دیکھ کفر

صوفیانہ مسائل مثلاً ذکر و فکر، مشاہدہ و مراقبہ کو تشریح کرتے ہوئے بھی وہ نرگن، ترلوک، نرنکار، انتردشٹ، اندی اور متھن جیسی ہندی اصطلاحات کا کہیں کہیں سہارا لیتے ہیں۔ انھوں نے شری کرشن کی سولہ ہزار گودیوں اور ہندو اساطیر میں سے راہوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جانم نے دوہے کی بحر میں لکھی ہوئی نظم سکھ سہیلا میں ہندی لفظوں اور بیکوں سے غضب کا رس پیدا کر دیا ہے ان کے نزدیک ارباب طریقت کی بات ہی اور ہے :

لوگاں یہ مت پرکھ الادی
جن بوجھ پرکھتوں الادی

علاوہ ازیں یہ کہنا کہ آکاش میں اپنا پنتھ پکشی ہی پہچان سکتا ہے اور سمندر میں مارگ کا پتہ مچھلی ہی کو ہو سکتا ہے خالص ہندی تخیل ہے۔ سولہویں صدی میں بیجاپور اور گولکنڈہ اردو کے اہم ادبی مرکز تھے۔ گولکنڈہ کے سلاطین قطبیہ میں سے ابراہیم قلی نے تلگو شعرا کی سرپرستی کی۔ اس کے فرزند قلی قطب شاہ (م ۱۶۱۲) کو اپنے دیس کے سارے رسم و رواج اور تہوار پسند تھے اس نے بسنت اور آغاز برشگال یعنی مرگ پر بڑی پُرلطف نظم نما غزلیں لکھی ہیں بسنت پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
پیا پگ پر ملا کر لیلائی پیاری
بسنت کھیلی ہوا انگ انگ سنگارا

اسی عصر کے ایک شاعر حسن شوقی (م ۱۶۳۳) کو نگاہ میں پوری انسانیت ایک ہے چنانچہ اس نے اپنی مثنوی فتح نامے میں سعدی کے ایک مصرع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کو اس طرح تضمین کی ہے

کہے شیخ سعدی نے عالم کو پند
بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

(ص ۸۳، دیوان حسن شوقی
مرتبہ جمیل جالبی کراچی ۱۹۷۱)

نیک رفتاری اور نیک کرداری کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں

ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے
ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے

شاعر کے نزدیک مکہ اور دوار کا، قابلِ احترام ہیں :
(ص ۷۳)

جس شہر میں بستا ہے تو سب جگ ہے تیرا معتقد
مومن کہیں مکہ یہی کافر کہتے ہیں دوار کا

اسے اپنے ملک ہند کو طوطی ہونے پر ناز ہے اور وہ بنگال کی شیرینی کا لذت شناس ہے

چو من گیت بارے دریں بوستاں
کہیں جس کو طوطی یہ ہندوستاں

(میزبانی نامہ)

تجدلب شکر کے قول تھے
معمور بنگالہ ہوا

(دیوان ص ۱۳۱)

وہ فتح نامہ نظام شاہ میں اپنے ممدوح کو کبھی دارا و بہرام سے تو کبھی ارجن و بھیم سے مشابہ قرار دیتا ہے اس کے سنیاسی، پنچی، وید مالا، دھوز بید، امر بید کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں وہ دیگر شعرائے دکن کی طرح مراٹھی الفاظ مثلاً سارکھا، گھانے، آسنے، نکو بلا تکلف استعمال کرتا ہے ایک غزل میں "نکو کرو" ردیف استعمال کی ہے جس سے پوری غزل میں بڑا درد بھرا لہجہ پیدا ہو گیا ہے۔ بن اپنے مؤرہوں سکی دنڈ نکو کرو (غزل نمبر ۲۲)

شوقی کا خلاق ذہن ایرانی طرز میں زلف کو مار قرار دینے پر اکتفا نہیں کرتا وہ صندل کا ذکر کر کے اسے ہندستانی رنگ دیدیتا ہے اور یہی رنگ ایک شعر میں صوفیوں کے ساتھ جوگیوں کا ذکر کر کے ہندوستایا گیا ہے (غزل نمبر ۸)

سترہویں صدی ہی کے اوائل میں شمالی ہند میں افضل نارلفظ (۱۶۲۶ سے قبل) نے ہندی صنف سخن بارہ ماسا کا اپنا کر ایک بکٹ کہانی لکھی جس میں ایک ہجر نصیب عورت کے دلی جذبات کی ترجمانی بڑے اثر آفریں انداز میں کی گئی ہے یہ ہندی روایات میں ڈوبی ہوئی ہے اس میں پپیہا کی پی پی اور کوئل کی کو کو نے خالص بھارتی فضا پیدا کر دی ہے ساتھ ہی اس میں فارسی کے الفاظ و اشعار بھی ہیں اس طرح یہ دو تہذیبوں کی ہم آہنگی کا دلآویز نمونہ ہے۔

پپیہا پیو ہون ان پکارے
پکارے دادر و جھینگر جھنگارے

ادے جب کوک کوئل نے سنائی
تمامی تن بدن میں آگ لائی

سنی جب دور کی آواز بن سوں
شکیب از دل گیا آرام تن سوں

(ص ۳۱۷، بکٹ کہانی مرتبہ مسعود حسین و ہاشمی)
مشمولہ قدیم اردو، جلد اول ۱۹۶۵ء حیدرآباد

اسی عصر میں محدود پیمانے پر فکر و نظر کے لحاظ سے باہمی یگانگت کی ایک جھلک جیسی امین الدین علی (م ۱۶۷۵) کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے عناصر اربعہ کے ساتھ ہندو فلسفے کے زیر اثر خالی کو بھی ایک عنصر مانا ہے اور ہر عنصر کے پانچ گنا بتائے ہیں۔ عدل نصرتی (م ۱۶۸۴) وجہی

غواصی ، ابن نشاطی ، نامی اور ہاشمی جیسے قدیم شعرا بھی بھارتی تہذیب کے دلدادہ تھے انھوں نے جنتا کی بھاشا استعمال کی اور ہندی تلمیحات و استعارات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ عبدل نے ۱۶۰۳ میں ابراہیم عادلشاہ ثانی (م ۱۶۲۷) کی مدح میں ابراہیم نامہ لکھا (۱۶۰۳) اور اپنے ممدوح کو اندر سے بھی بڑھا دیا اس نے رقص و موسیقی کی اصطلاحات بھی ماہرانہ انداز میں استعمال کی ہیں ایک لفظی تصویر ملاحظہ ہو جس میں رقاصہ بھوؤں میں ملبوس رنگ بھوی پر آتی ہے:

کوئی پھول ابھرن کیا سب سنگار
رہیا باس بھر کر سو رنگ بھوم ٹھار

(بیت نمبر ۱۰۴۷، ابراہیم نامہ
مرتبہ مسعود حسین علی گڑھ ۱۹۶۹)

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وجہی سبرس میں اپنے ممدوح کو روایتی انداز میں حاتم سے مشابہ قرار دینے کے بجائے، وہ ہندو راجا بلی اور راجہ کرن سے مشابہ قرار دیتا ہے (بیت نمبر ۲۰۰) دکنی کی بہترین نثر تصنیف سب اس مصنف وجہی میں بھی بھارتی معاشرت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں وہ ابتدا ہی میں ممدوح کے پان دے کر مان دینے کی بات کرتا ہے جو خالص ہندستانی تصور ہے وہ جس علاقے میں رہتا ہے اس پر اسے ناز ہے:

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ملک بہو تیج خاصہ رہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ رہے

وجہی کی طرح ہاشمی دکن کی ہندستانی تہذیب کا ترجمان ہے اور اسے اس پر فخر ہے: ترا شعر دکھنی ہے دیکھ بول
ہاشمی نے ہندی شاعری کے تتبع میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کیا

سترہویں صدی کے اواخر میں ولی (م ۱۷۲۰ - ۱۷۲۵ کے درمیان) نے اردو شاعری کو نکھار کر ایسا رنگ و آہنگ عطا کیا کہ شمالی ہند کے اہل سخن بھی اس کی اس کرامت کے قائل ہو گئے اس کا کلام شاہد ہے کہ اس نے ایرانی الفاظ و علامات کے ساتھ ہندی الفاظ و تلمیحات کا بھی سہارا لیا ہے بعض غزلوں کی پوری فضا ہندستانیت سے معمور ہے مثلاً وہ غزلیں جن کے مطلعے یہ ہیں:

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

کوچۂ یار عین کاسی ہے
گی سول وہاں کا باسی ہے

ولی کو اپنے وطن کے رام اور لچھمن بھی عزیز ہیں اور کنول اور بھونرا بھی۔ ولی کے شمالی ہند کے متبعین میں آبرو (م ۱۷۳۳) اور شاہ حاتم (۱۷۸۱) کے ہاں بھی ہندیت نمایاں ہے آبرو نے بسنت کو ردیف بنا کر ایک غزل لکھی اس کا ایک شعر سنیئے:

ٹیسو کے پھول نہیں ہے دیکھتے ہیں کوئلے
آئی جنوں میں آگ برہ کو لگا بسنت

ہولی میں عوام کے ساتھ ساتھ ہمارے شعرا نے بھی رنگوں سے جھولی بھری ہے: حاتم کہتے ہیں۔

مہیا سب ہیں اب اسباب ہولی
اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی

لگی پچکاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے

کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری
کوئی چمپا برن عمروں میں تھوری

آبرو کے معاصر فائز (م ۱۷۳۸) نے یہاں کی جوگن اور تنبولن پر نظمیں لکھیں اور پنگھٹ کی تصویر بڑے دلربایانہ انداز میں کھینچی۔ انھیں پنگھٹ پر کھڑا کی کو دیکھ کر اریسی، ربھا اور ادھکا یاد آجاتی ہیں۔

اسی زمانے میں دکن میں شاہ تراب چشتی، موہوی مہدوی ایلچوری اور غلام حسین ایلچوری نے برادران وطن کے بعض تصورات کو اپنے کلام میں جگہ دے کر ان سے دینی قربت کا احساس دلایا۔ شاہ تراب نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ ہندوؤں کو مذہبی اور فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم گیان سروپ میں اپنے وطن ترنال اور اس کے مندر کا ذکر کیا ہے اور من سمجھاون میں پانچ بان اور سولاد ھار چکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں من سمجھاون سب سے مشہور ہے جسے ڈاکٹر دلوی اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے الگ الگ بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے من سمجھاون دراصل مراٹھی کے سنت کوی رامداس کے مناچے شلوک کا آزاد ترجمہ ہے۔ باہمی قربت کے لیے محض ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کافی نہیں ایک دوسرے کے مذہب و ثقافت کے کلیدی الفاظ و اصطلاحات سے واقفیت بھی مطلوب ہے۔ اسی طرح صحیح معنوں میں رواداری کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں اور ہم میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم اصلاً عالم ارواح سے تعلق رکھتے ہیں جہاں دوئی کا نام و نشان نہیں چنانچہ غلام حسین اپنی نظم یک رنگ نامہ میں جسے میں ہندو مسلم وحدت پر اردو میں قدیم ترین نظم سمجھتا ہوں کہتے ہیں:

دہیں سوں اسی بھانت کیوں ہو سنا آئے
یہیں آکے جھگڑا دوئی کا مچائے

غلام حسین نے کبیر کے انداز میں ہندو مسلم دونوں کو ان کی ظاہرداری پر لعن طعن کیا ہے:

مسلمان اللہ کا نام بولیں
وہ ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں
زباں سوں کہیں دل سوں اپنے بساریں
وہ حاضر کو غائب سمجھ کر پکاریں

اصل تہذیب تہذیب نفس اور تزکیہ باطن سے عبارت ہے:

مسلمان سب غسل کر پاک ہوویں
وہ ہندو بھی اشنان کر تن کو دھوویں
ایسی کو ہٹا کو بھریں ہو کے چھیلا
کریں تن کو اُجالا رکھیں دل کو میلا

وہ پریت کی ریت سے قائل ہیں وہ علم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے

مسلماں پڑھے ہیں مسلماں کتاباں
وہ ہندو کریں بید پوتھی کی باتاں
بغل میں بھریں مکر کا لیکے دفتر
نہ سمجھیں پرت پنتھ کا ایک اچھر

پریت پنتھ پر چلنے والا ہی صحیح معنوں میں مہذب ہے وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہے وہ کسی کو دلآزاری کا روادار نہیں حافظ نے کہا ہے

جاش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن
در شریعت ما غیر ازیں گناہ نیست

اور ہمارا شاعر بھی یہی کہتا ہے:

مت کسے آزار دیوے اور جو دل چاہے سو کر
کوئی گنہ دوجا برا جیوں مردم آزاری نہیں

انیسویں صدی میں ایسے ہی صلح کل رویے کا شاعر نظیر اکبرآبادی ہے جو برادرانِ وطن کے تہذیبی جلوؤں کا ذکر نہایت ذوق و شوق سے کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

●●

ڈاکٹر شیخ فرید

اُردو صحافت اور تحریکِ آزادی

وفا کی صبح، محبت کی شام ہے اُردو
کہ اتحادِ وطن کا پیام ہے اُردو

اُردو زبان و ادب اور صحافت نے آزادی کی جنگ میں شروع سے حصہ لیا۔ تحریک آزادی کے فروغ۔ اشاعت اور کامیابی میں اِس زبان اور اِس کے بولنے والوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ اِسی زبان نے

"انقلاب زندہ باد"

کا ولولہ خیز نعرہ دیا۔ ہماری زبان کے ادبا، شعراء، نے ۱۸۵۷ء کے پہلے، ۱۹۴۷ء کے بعد ایک اور اس کے بعد بھی آج تک رائے عامہ کی تربیت اور ہمدردی میں، قومی اور ملی جذبات کو ابھارنے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہے۔ ہمارے صحافیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ احتجاج کیا۔ انکے غائر مطالعے سے "آزادی کی کہانی اردو کی زبانی" آسانی سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اِس موضوع پر جو کام ہوا ہے وہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔

عبدالرزاق قریشی کی "نوائے آزادی"
خلیق انجم کی مرتبہ — "ضبط شدہ نظمیں"

وغیرہ قابلِ ذکر، اہم تصانیف ہیں۔ رسائل اور جرائد کے "جنگِ آزادی نمبر" بھی شائع ہوئے ہیں۔ "صحافت" پر کام کم ہوا ہے اور جو کچھ ہے وہ رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ مسودات کی شکل میں ہے۔

"جنگِ آزادی میں اُردو صحافت کا حصہ" صبر آزما اور دقت طلب موضوع ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے تمام اردو اخبارات کا مطالعہ فرصت اور عمر کا تقاضا کرتا ہے۔ اِس راہ میں جو "ہمت شکن" مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان سے اربابِ نظر واقف ہیں۔ جہاں اور جن کے قبضہ میں یہ متاعِ گراں مایہ ہے۔ وہ اُسے ہر نظر سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اداروں میں یہ سرمایہ اس طرح محفوظ ہے کہ اُسے سورج کی دھوپ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان سے کون کہے کہ "اس کو بچا بچا کے نہ رکھیں"۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ تمام سرمایہ یا سرمایہ کا بڑا حصہ کسی ایک جگہ دستیاب نہیں ہوتا۔

میرے مضمون کی ناکامی اور رُخنہ زنی میں، ان موانعات کے علاوہ، میری علمی بے بضاعتی اور محدود مطالعے کو بڑا دخل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اِس موضوع کے تفصیلی بیان کیلئے سفینہ درکار ہے۔ اور یہاں "علم" سینہ اور سفینہ دونوں میں نہیں ہے۔

صحافت۔

صحافت کیا ہے؟ حقائق اور واقعات کے بیان اور آگاہی کا صحافت ہے ۔ صحافت زندگی کے حقائق کی ترجمان ہے ۔

ادب زندگی کا عکاس ہے ۔ ادب اور زندگی میں گہرے رشتہ ہیں غالباً اسی تعبیر کے پیشِ نظر برنارڈ شاہ نے کہا ہے ۔

ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM

" تمام اعلیٰ ادب صحافت ہے "

صحافت کا زندگی اور ادب سے جو گہرا تعلق ہے وہ ظاہر ہے ۔ زندگی اپنے اردگرد کے واقعات سے ناتا جوڑے ہوئے ہے ۔ ان واقعات کے تانے بانے سے ادب بن رہا ہے ۔ ادب کے ذریعہ انسانی جذبات اور احساسات ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔ یہ تمام عناصر صحافت کا مواد ہیں ۔

جمہوری دور میں، عصرِ جدید میں صحافت کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ صحافت میں زبردست قوت ہے ۔ اگر صحافت حق و عدل، خیر و فلاح کے لئے کام کرے تو انسانیت کے لئے ایک مفید طاقت ہے ۔ وہ حاکم و محکوم کے درمیان ایک رابطہ ہے ۔ عوام و خواص کے درمیان ایک رشتہ ہے رائے عامہ کو ہموار اور متاثر کرنے کا مؤثر ادارہ ہے صحافت معاشرتی، عمرانی اور سیاسی آثار پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ ان کو بناتی ہے ۔ بدلتی ہے ۔ آزادئ رائے کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے ۔ قلم میں زبردست طاقت ہے ۔ شہنشاہِ جلال الدین اکبر ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا تھا ۔

ولیم اسٹیڈ نے کہا ہے جب[1] . . . " اخبار نویس کی صورت دیکھ کر شیطانوں کا باوا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے "

آخری زارِ روس نے کہا تھا جب[2] . . . " اے قلم، تو نہایت خوب صورت ہے لیکن میری سلطنت میں تو شیطانوں سے بھی بدتر ثابت ہوا "

جمہوریہ دنیز لا (امریکہ) کے صدر کاسٹر کا قول ہے جب[3] . . . " اگر جہنم کا بھی پھاٹک کھلا دیکھوں تو اتنا نہ ڈر سکوں گا ۔ جتنا اخبار نویس کے قلم سے ڈرتا ہوں "

صحافت اور پہلی جنگ آزادی ۔

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی لڑی گئی ۔ اس میں ناکامی نے عوام و خواص کو ایک نیا حوصلہ دیا ۔ ناکامیوں کی بنیاد پر آزادی کی جد و جہد دوبارہ شروع کی گئی ۔ اس مہم نے قربانی، ترک (تیاگ) اور اہنسا کے ذریعہ برطانوی سامراج کے روشن آفتاب کو " گھور اندھیارے " کے غار میں ڈھکیل دیا "

اِس جد و جہد میں، سیاسی، سماجی، مذہبی، فوجی رہنما شامل تھے، ابتدا میں بادشاہِ دہلی بہ نفسِ نفیس اِس جنگ میں شریک رہا ۔ ہر قسم کے پیشہ ور تھے ۔ معمولی گل کش سے لے کر اعلیٰ حاکم تک شریک تھے ۔ صحافی بھی

ص۱ / ص۲ / ص۳ الہلال ۹ ستمبر ۱۹۱۲ء ص۱۲ (مخزونہ خدابخش لائبریری پٹنہ)

میدان میں آگے رہے[1]

پہلی جنگِ آزادی کے دوران، صحافت ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ ملک میں مختلف پرچے جاری تھے۔ ان کا سرمایہ — شعر و سخن۔ ادب۔ قانون۔ مزاح۔ ہزل۔ مذہبی مباحث۔ وغیرہ امور کے دائروں تک محدود تھا جدید علوم سے بے خبری تھی۔ اخبارات میں اداریے (Editorials) نہیں ہوتے تھے۔ سرخیوں کے تحت، مختلف شہروں کی خبریں یکجا کر کے شائع کیجاتی تھیں[2]

اس عہد کے چند اخبارات یہ ہیں:۔

دہلی کے اخبارات:۔ اردو اخبار ۱۸۳۶ء — مظہر الحق ۱۸۴۳ء — سید الاخبار ۱۸۳۷ء — صادق الاخبار کریم الاخبار ۱۸۴۵ء۔

پنجاب کے اخبار:۔ کوہ نور ۱۸۵۰ء — دریائے نور — لاہور گزٹ ۱۸۵۵ء۔

سیالکوٹ کے اخبار:۔ ریاض الاخبار — چشمۂ فیض ۱۸۵۲ء — خورشید عالم — ہمائے بے بہار (لاہور) نور علی نور — وکٹوریہ پیپر ۱۸۵۳ء۔

ملتان کے اخبار:۔ ریاض نور ۱۸۵۲ء — شعاع الشمس ۱۸۵۳ء — گلزار پنجاب ۱۸۵۰ء۔ مطلع الانوار ۱۸۵۴ء۔

بنارس کے اخبار:۔ زائرین ہند — باغ و بہار — بنارس گزٹ — آفتاب۔

انیسویں صدی کے نمایاں اخبار:۔ — مہذب لکھنؤ۔ ہندوستانی (لکھنؤ) قیصر الاخبار — احسن الاخبار (الہ آباد) اکمل الاخبار (دہلی) پنجابی اخبار (لاہور) رفیقِ ہند — آفتابِ پنجاب (لاہور) کشف الاخبار (بمبئی) شمس الاخبار (مدراس)۔

دکن کے اخبار:۔ — شمس الاخبار — جریدۂ روزگار — اخبارِ صبح — طلسم حیرت — عمدۃ الاخبار یادگارِ زمانہ — ظہیر الاسلام — منظر العجائب — تحفہ — احسن الجرائد — حدیقۂ شعرا۔ حاکم — مخبرِ دکن — نیر آصفی — آفتابِ دکن۔

قاسم الاخبار — میسور اخبار — منشور محمدی — خورشیدِ دکن — آصف الاخبار — ہزار داستان — اخبارِ آصفی — دکن اخبار — افسر الاخبار — ملک و ملت۔

پنجاب:۔ — اخبارِ عام — پیسہ اخبار — وکیل۔

---

[1] خطباتِ گارسن دتاسی۔ خطبہ نمبر ۹ ص ۸۱۴
[2] شولاپور کی ایک خبر ملاحظہ کیجیے گا۔

مذکورہ بالا اخبارات کے متعلق ہمدست معلومات سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ۱۸۵۷ء میں اردو اخبارات نے کیمدی کردار ادا کیا۔ اور ان اخبارات ان کے ایڈیٹروں کو مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو اخبار (دلی) کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ صادق الاخبار کے ایڈیٹر کو تین سال کی سزا ہوئی۔ کئی اخبارات نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی کی شاطرانہ چال نے چند اخبارات نکلوائے۔ بعض اخبارات میں فرقہ وارانہ مضامین شائع ہونے لگے۔ اس طرح اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اخبارات نے تحریک کا ساتھ نہ چھوڑا۔

گلشن نوبہار پر مقدمہ چلا۔ پریس ضبط کر لیا گیا۔ ریاض الاخبار پر بھی یہی قیامت گذری۔ چند اخبارات بند ہو گئے کچھ نئے اخبار سامنے آئے۔

رفتہ رفتہ بغاوت کی آگ فرو ہوئی۔ حالات سنبھلنے لگے قوانین کی سختی کم ہوئی۔ تو کئی اخبارات نکل آئے۔ ان میں سے بعض مشہور ہوئے۔

اس دور میں لکھنؤ ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اودھ اخبار ہندوستان اور اودھ پنچ — نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ان اخبارات نے ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی۔ اودھ پنچ مسلسل برطانوی حکومت سے برسر پیکار رہا۔ قومی تحریک میں اس کا خاص رول رہا ہے [۱]

بعض اخبارات مثلاً کوہ نور۔ ہما (لاہور) سرکار کی وفاداری کے گیت گاتے رہے۔ ان کے عنوانات "مژدہ فتح دہلی" جیسے ہوتے تھے۔ دیکھئے! غلامی کا طوق کتنا حسین ہوتا ہے۔ جادوئے محمود سے ایاز کی بے بصر آنکھیں اسے "ساز دلبری" تصور کرتے ہیں۔

قاضی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ "اس دور کی صحافت میں کوئی سیاست نہ تھی" [۲]

علامہ یوسف علی نے "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ اخبارات کی خبریں عموماً افواہوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ باغیوں کی ترتیب و تنظیم سے ان کو سروکار نہ تھا۔

اس کے برعکس، جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اخبار بھی تھے لکھنؤ کے سحر سامری نے واجد علی شاہ کی معزولی کا ذکر بڑے حسرت ناک انداز میں کیا ہے۔

بقول احسن مارہروی — مصنف تاریخ نثر اردو — لکھنؤ کے طلسم اخبار۔ نے واجد علی شاہ کے خلاف انگریزوں کی مفسدانہ حرکات کا پوست کندہ حال (بیان) شائع کیا ہے۔

صادق الاخبار برطانیہ کا کٹر مخالف تھا۔ اس اخبار نے شاہ نعمت اللہ کی پیشن گوئی — سلطنتِ برطانیہ کے ختم ہونے کی اطلاع۔ شائع کی تھی۔ اس کی اشاعت کی پاداش میں اسے تین سال کی سزا ہو گئی تھی۔

لوائے آزادی میں قریشی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ

"دہلی اردو اخبار میں ہندوستانی ریاستوں اور دہلی کے دربار کی خبروں کے ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر برائی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض

---

[۱] مثالیں ضمیمہ میں دی گئی ہیں۔
[۲] نگار ۱۹۴۵ء

سمجھتا تھا اس کے ذہن میں امیر اور غریب، ہندو مسلم اور سکھ کا امتیاز نہ تھا، ص۱

اِس اخبار میں انگریزوں کے ظلم وستم کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ یا سازش ہوتی تھی مولانا امداد صابری نے لکھا ہے۔ کہ

"لاہور اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ کنور نہال سنگھ نے دوست محمد خان (والیٔ افغانستان) کو لکھا ہے کہ تمھارے ساتھ ہوکے میں مقابلہ سپاہ انگریز کا کروں اور فرزندِ خان مذکور کو طلب کیا ہے۔ کہ میں اسکو فوج سکھ کا سپہ سالار بناؤنگا۔ اور مشہور ہے کہ نیپالی لوگ بھی اس سازش میں شامل ہوجائیں گے" ص۲

ہندوستان کے علاوہ، غیر ملکوں میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہورہا تھا۔ اس قسم کی خبریں طلسم (لکھنؤ) نمایاں طور پر شائع کیا کرتا تھا۔ ہرات کے علاوہ شولاپور میں ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی خبر ملاحظہ کیجئے۔

شولاپور۔ صاحب ٹائمس کو کسی نے خبر دی ہے۔ راقم نے اس کی یہ نقل کی ہے کہ جب سے لشکرِ انگریز مہم فارس کی طرف راہی ہوا ہے۔ یہاں ہر اشرار برسرِ فساد ہے۔ رعایا کے درپئے تباہی ہوا ہے۔ خصوص قوم روہیلہ سرکشی سے درپئے آزار ہے۔ قتل وغارت ان کا شعار ہے۔ اہلِ شہر کا خوف...... سے برا حال ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن نہ پسے۔ یہ خیال ہے جب ۲۷ رجمنٹ نے کوچ کیا۔ غارتگروں نے موقع پاکر یہ امر پوچ کیا کہ نواح شہر کے اکثر گاؤں اور قریہ کو لوٹا۔ وہاں کے باشندوں پر تکلیف کا آسمان ٹوٹا۔ ۲۰ ویں ماہ گذشتہ (۲۰ دسمبر ۱۸۵۶ء) کو جب ۲۵ رجمنٹ وہاں سے روانہ ہوئی۔ تعلقہ پور کا گاؤں ٹوٹا، ظلم کیا۔ کیا نہ ہوا۔ تب بنگلے کے سوار گرفتاری کو بڑی تیاری اور سامان سے گئے۔ اور بہت روہیلے اسیر ہوئے۔ پابہ زنجیر ہوئے مگر اس پر مفسدوں کو دشواس نہ ہوا۔ سیاستِ حاکم سے ہراس نہ ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد شیلہ پور کے متصل موضع۔ برسلو۔ میں ڈاکہ پڑا" ص۱

انیسویں صدی کے اواخر میں صحافت نے نیا موڑ اختیار کیا۔ افکار کی آزادی کی قدر بڑھی۔ پنڈت گوپی ناتھ کے اخبار عام اور مولوی محبوب عالم کے پیسہ اخبار اپنے مواد، کی پیش کشی اور معیار کے لحاظ سے مقبول ہوگئے۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس زمانہ میں کانگریس کے نصب العین۔ آزادی۔ کی حمایت کرنے والے۔ اودھ پنچ ہندوستان۔ ایڈوکیٹ (لکھنؤ) اور قیصر الاخبار تھے۔

اودھ پنچ حکومت کے سخت خلاف تھا۔ حکومت پر سخت تنقید کرتا تھا۔ اس کے الفاظ سخت، تخاطب کا انداز بھی سخت ہوتا تھا۔

گلیڈ اسٹون ـــ وزیر برائے ہند ـــ کو لکھا۔

گلیڈ سٹن ـــ مگر اب تو بدنامی کا ٹوکرا تمہارے ہی سر ہے۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ اس کے مستحق تم ہی ہو میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ رفاہ واصلاح، آرائش وزیبائش ظاہری ٹیم ٹام اوپری لیپ پوت کے لئے تمہاری ذات مخصوص ہے۔ مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم ہو جیسے ہندوستانی جودت سے تم پولیٹکل دسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا اور تیار ہانڈی تم خوب چُن سکتے ہو۔ مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول۔

ص۱ نوائے آزادی ص۶/ تاریخ صحافتِ اردو ص۱۲۸

ص۲ تاریخ صحافت اردو ص۱۲۸ ص۱ اردو صحافت کی تاریخ ص۱۳۵

بکائن کے پھول تم نہیں جانتے۔ کہ فارن پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔

کہتے ہیں جو کوئی چھچوندر مار ڈالتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے ۔۔۔۔۔۔

تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام تمہارے سپرد ہوں "

مہاراجہ کشمیر کو تخت نشینی کے بعد ایک سمت خط لکھا۔

"مہاراجہ صاحب ـــــ آج کل طویلہ عالم میں لیتا ہے، عرصۂ کائنات میں وہ بہنچ ہے کہ ہر متنفس محتاج پند و انداز نظر آتا ہے مگر تم جانو

میری نگاہِ بلند انوازی سے آج تک کبھی بھی پڑی ہی نہیں ۔ اور خاص کر جب محل موقع دیکھتا تھا۔ اپنے مذہب میں آ ئی پر چوکنا حماقت اور گناہ دونوں خیال کیا جاتا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔

آج کل ریذیڈینٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے۔ تمہاری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ برمحل کارروائی کرنے والے تو گھاٹ کے منتظر رہتے ہیں والیانِ ملک کچھ آتے دن تو مرتے نہیں۔

غالباً لوہا گرم ہے۔ پیٹا جائے۔ مگر میں تم کو ایک گر
بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کرنا مگر اوستان نہ کھونا
قیام ریذیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے "

یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب مہاراجہ کشمیر۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور ان کو ریذیڈینٹ کے تقرر اور قیام کو منظور کرنا تھا۔

اودھ پنچ کے علاوہ، دوسرا کون ان لفظوں میں مہاراجہ کو ہدایت کر سکتا تھا۔

زمانہ ۱۹۰۴ء کے مختلف شماروں میں "بھارت متر" کے ایڈیٹر ـــــ بال مکند گپتا ـــــ نے اودھ پنچ کے بارے میں لکھا۔ کہ اس میں کئی خوبیاں تھیں۔ تین خاص خوبیاں یہ تھیں

(۱) آزادی سے لکھتا تھا۔ موقع کی دل لگی کرتا تھا

(۲) وہ جانتا تھا۔ کہ اس ملک کے لیے کس قسم کی پالیسی درکار ہے۔ رعایا کا طرفدار تھا

(۳) زبان صاف تھی۔

لکھنؤ کے ہندوستان کے بارے میں گپتا کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

"اس نے شروع ہی سے ملکی معاملات میں ہاتھ ڈالا
اور ملکی معاملات پر آرٹیکل لکھنا شروع کیا
مدراس میں کانگریس ہوتے ہی پریسیڈینٹ گھوش

کی تقریر کا پورا ترجمہ ہندوستانی کے ایک ہی نمبر میں شایع کیا" ۔۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ لکھتا تھا۔ بہت آزادی سے نڈر ہو کر لکھتا تھا:

لاہور کے رفیقِ ہند کی بھی یہی پالیسی تھی۔

ص۱ شارب ردولوی۔ مقالہ۔ اودھ پنچ۔ ادیب علی گڈھ ص۲

بیسویں صدی سیاسی اعتبار سے تیز و تند اخبارات سے شروع ہوئی ۔ زمیندار ۔ الہلال ۔ ہمدرد ۔ ہندوستانی ۔ ان میں نمایاں ہیں ۔ وینک (امرتسر) ۔ دیش (لاہور) ۔ اردوئے معلی (حسرت) مدینہ (بجنور) ۔ مسلم گزٹ (لکھنؤ) وغیرہ آزادی کے نقیب تھے ۔

الہلال میں مولانا آزاد نے

— الجہاد فی سبیل الحریت —

کے عنوان سے جو مقالات قلمبند کئے ۔ اس میں قوم کو انگریزوں کی شاطرانہ چال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"ہندو مسلمانوں کا سوال بھی
ایک بازیگر کا کھیل ہے"

مولانا جوہر نے فروری ۱۹۱۴ء کے کامریڈ میں لکھا کہ

"ہندو مسلم اتحاد کا جو مسئلہ ہندوستان کے اتحاد میں حائل ہے ۔ ان شکوک اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں جو دونوں طرف سے اس لئے پیدا ہوئیں کہ ان لوگوں پر ایک جعلی قسم کی قومیت مسلط کرنے کی بے سود اور احمقانہ کوششیں کی گئیں"

حسرت کے اردوئے معلے کا انداز ملاحظہ کیجئے ۔

"ہم لوگوں کا فرض ہے کہ امر حق کے اظہار میں باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین کامل رکھتے ہوئے راہ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے حاصل نہیں ہوا کرتی ۔

یہ جو حکومت کی جبروت سے بہ ظاہر تحریک حریت کو شکست فاش ہوئی ہے ۔ اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔

سردست ہمارے نزدیک ہر محب ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمت دفائی یعنی Passive Resistance کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے ۔ بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے"

اردوئے معلی ۔ مئی ۱۹۰۷ء ص۱

بیسویں صدی کے اوائل میں خصوصاً ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان پریس کے قوانین زیادہ سخت بنا دئے گئے تھے ۔ کئی اخبارات قانون کی گرفت میں آ گئے ۔ خلافت تحریک نے کئی اخبارات — ہمدرد ۔ اردوئے معلی — زمیندار — خلافت — وغیرہ کی اشاعت میں اضافہ کر دیا ۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کا طویل ہنگامہ خیز دور ہے ۔

"جنگ عظیم کے بعد صحافت" کے جائزہ کے پہلے اس لب و لہجہ کا اندازہ ضروری ہے جو ہمارے آزادی کے نقیب اخبارات کا تضاد و شایس ملاحظہ کیجئے —

"اصلاحات کے سلسلے میں امید کی جاتی ہے کہ برٹش حکومت میں نوآبادیوں کو بھی حق دیا جائے گا ۔ اور اگر اس میں

---

۱ بحوالہ صحافت ۔ پاک و ہند میں ۔ خورشید الاسلام ص ۳۴۳

ہندوستان کے حقوق کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ تو اور زیادہ پیچیدگی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان اس ذلت کو ہرگز برداشت نہ کریگا۔ کہ اس کی قسمت ایسے لوگوں کے تصرف میں آئے جو اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھیں"

خطیب جنوری ۱۹۱۸ء

"ہوم رول کے مطالبہ کا عام انکار ......
...... سارے ہندوستان میں غیظ و غضب
کی آگ بھڑکا دے گا"

خطیب مئی ۱۹۱۸ء

جنگ آزادی میں ہمارے صحافیوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ سیاسی طنز نگاروں میں مولانا آزاد — قاضی عبدالغفار — مولانا ظفر علی اور محمد علی جوہر ممتاز مقام رکھتے ہیں — مولانا ظفر علی خاں سیاسی طنز کے بادشاہ تھے۔

یہ خوبی ان کو ورثہ میں اپنے والد بزرگوار — مولوی سراج الدین احمد خان — مالک و مدیر — زمیندار سے ملی تھی۔ انھوں نے دلچسپ اور دلکش پیرایۂ ظرافت میں مختلف پولیٹکل اور سوشیل امور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضامین "اپریل فول" کے نام سے مختصر کتابچہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ایک سادہ کسان کی دعا۔

زمیندار — ۱۱ نومبر ۱۹۰۳ء

"اے میرے اچھے خدا! مجھے معلوم نہیں کہ تو کون ہے؟
کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ مگر مولوی صاحب بتلاتے
ہیں کہ تو ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تیرے ہونے میں شک نہیں...

اے اللہ میاں، میں نے کبھی کوئی قصور نہیں کیا اگر کبھی کچھ کیا ہے
تو مجبوری اور لاچاری سے کیا ہے۔ میں نے نیل والے صاحب
کی بھینس چرائی۔ مگر نیل والا صاحب جان بوجھ کر اس بھینس کو
میرے کھیت میں چھوڑ دیتا تھا۔ اور میری کھیتی کو برباد کرایا
کرتا تھا۔

اے خدا! انگریزی راج کے امن و آسائش اور ترقی سے
تمام ہندوستان حصہ لیا۔ اور سوا میرے تمام ملک کے فرقے
خوش حال اور فارغ البالی سے گذارہ کرتے ہیں......

اے خدا! ایک سوکھا سڑا بنیا میرے گاؤں میں آکر کبھی تراز د

مارتا ہے۔ کبھی دھوکہ بازی کرتا ہے۔ کبھی بہی میں جھوٹی رقمیں
درج کرتا ہے۔ کبھی سود در سود سے بیرا لپھوبیتا ہے۔

دیسی ریاستوں کے متعلق ایک تجویز۔

زمیندار۔ یکم اپریل ۱۹۰۲ء

"جس طرح ہندوستان کے مختلف انتظامی شعبوں میں خرابیاں اور نقائص پائے جانے پر ہر ایک صیغہ کی اصلاح ودرستی کے لئے کمیشن مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی طرح دیسی ریاستوں کی حالت کی اصلاح کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور اس کو ہدایت کی جائے۔ کہ جو خرابیاں دیسی ریاستوں میں بالفعل موجود ہیں ان پر ایک مفصل ومبسوط رپورٹ لکھ کر پیش کریں"

اس کام کو جس خوبی سے دیوان سنگھ مفتون نے ریاست (ہفتہ وار) میں کیا۔ وہ ہماری صحافت کا ایک "ناقابلِ فراموش" کارنامہ ہے۔

لارڈ مارلے کی آخری تجویز۔

یکم اپریل ۱۹۰۹ء

ہز ایکسیلنسی لارڈ منٹو نے .....

کلکتہ کی روز افزوں آبادی کے مضرات سے متاثر ہو کر یہ فرمایا تھا۔
کہ اگر یہ آبادی اسی طرح بڑھتی گئی۔ اور مجھے اس بات کی ضرورت محسوس
ہوئی کہ پایہ تخت کلکتہ سے تبدیل کیا جائے تو میں رنگون یا کشمیر کے سوا
کسی دوسری جگہ کی سفارش کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ خبر آج تک بالکل کانفڈنشیل رہی ہے اور تا حال کانفڈنشیل ہے اور
کانفڈنشیل طور پر اس وقت وزیر ہند سے خط وکتابت شروع ہو گئی ہے"

صحافت۔ جنگِ عظیم کے بعد

جنگِ عظیم کے بعد ایک انقلابی اور ہنگامہ خیز سیاسی دور آیا۔ اس دور کے اثرات اور تقاضوں سے کئی اخبارات — روزنامے، ہفتہ وار — منصۂ شہود پر آئے حکومت کی پابندیوں اور سختیوں کے باوجود اخبارات کا سیلاب نہ رک سکا۔

اس دور میں اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ پریس چھین لئے گئے۔ ایڈیٹر قید وبند کی ابتلا میں پھنس گئے۔ مگر زبان اور قلم پر قدغن لگانا آسان نہ ہوا۔

۱۹۱۹ء کے بعد زمیندار نے ایک نئی کروٹ لی۔ مولانا ظفر علی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ پریس ضبط ہوا۔ اس کے شعلہ بیان ایڈیٹر — عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر تھے۔

۱۹۱۹ء کے بعد لاہور سے سیاست نکلا۔ یہ اخبار تحریک خلافت اور ترک موالات کا ترجمان تھا۔ جلیان والا باغ کے سلسلے مورد عتاب ہو کر ضمانت اور پریس کھو بیٹھا۔ ایڈیٹر گرفتار ہو گئے۔

۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے پیغام جاری کیا۔ اس اخبار نے تحریک خلافت اور ترک موالات کی زوردار ترجمانی کی۔ اس کے فلسفہ کے تعلق سے معرکۃ الآراء مضامین / اداریے لکھے لوگوں کو عدم تشدد (اہنسا) کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔

حکیم اجمل خاں کی سرپرستی میں قاضی عبدالغفار نے دہلی سے صباح نکالا۔ حکومت کی سخت گیری کے بارے میں لکھا۔ کہ

"گو میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ دفتری اقتدار کا پنجہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی اخباروں پر زیادہ آسانی سے چلایا جاتا ہے لیکن یہ بھی کچھ ایسے آداگون سے واقف ہو گئے ہیں کہ اگر ایک دفعہ ان کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔ تو پھر دوبارہ بدلے ہوئے روپ میں جلوہ افروز ہو کر اپنے عزم واستقلال کا ثبوت دیئے بغیر نہیں رہتے" ۱؎

اس دور میں صحافت نے عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی۔ تحریک ترک موالات۔ تحریک ہجرت کی تبلیغ کی۔ ان کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا۔ جلیان والا باغ اور دیگر روح فرسا سانحات اور جگر خراش واقعات کی الم ناک پیرایہ میں تفصیلات بیان کیں۔

ڈاکٹر اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مسجد کانپور کی شہادت کے بیان میں اہلِ صحافت کے قلم نے جو خون کے آنسو روئے ہیں۔ ان کی سرخی سے ادب کا دامن آج تک تابناک ہے۔ شبلی کا پُر درد نوحہ اور سید سلمان کا الم ناک نثری مرثیہ — "یہ زمین پیاسی — (الہلال) ...... آج بھی ہماری نظروں کے سامنے اس قیامت خیز منظر کو پیش کر دیتا ہے۔

ان تحریروں اور بیانات نے عام ذہن میں انقلاب کی جوت جگا دی۔ رائے عامہ بدلتی گئی۔ اخبارات نے بے باکی اور بے خوفی سے قابلِ تحسین انداز میں اپنے فرض کو ادا کیا۔ قربانیاں دیں۔ اس عہد کی صحافت کی سب سے بڑی خدمت عوام کے دلوں سے حکومت کے خوف کا اخراج تھا۔

اخبارات کی تعداد میں روز افزوں اضافے ہوتے گئے ان کی مقبولیت کے دو ذریعے تھے۔

۱۔ بے خوفی۔ بے باکی

۲۔ عوام کی ترجمانی

جن اخبارات نے صحافت کی آزادی کو برقرار رکھا۔ ان کو حکومت کے سخت قوانین اور دارو گیر کی چوکھٹ پر قربانیاں دینا پڑیں۔ سیاسی اور صحافی حالاتِ حاضرہ پر منظومات پیش کی گئیں۔ زمیندار کے مزاحیہ کالم — "افکار و حوادث" — نے دھوم مچادی — اس کے پہلے یہ کالم — اپریل فول — کے نام سے تھا۔ سیاست کے "راز و نیاز"، حریم حکومت کے پردے اٹھا دیئے۔ اور ہر کس "ناشندہ"، راز ہو گیا۔

۱؎ صحافت پاک و ہند میں ص ۴۱۹

عوام کے دل "رازہائے سربستہ کے سراپردہ" اور آنکھیں رموزِ سلطنت کی آئینہ دار "ہوگئیں۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک صحافت کا انداز معمولی رہا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک حقوق کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی۔ زمیندار اور ہمدرد کی پالیسی نمایاں تھی۔ الہلال (آزاد) نے ایوانِ حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ آزادی کے متعلق الہلال کی تحریریں اپنا اثر کرتی رہیں۔ اس نے لکھا کہ

"وہ جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس لئے بہتے دیکھتی ہے
کہ وہ آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے
یقیناً وہ آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی
۲ ستمبر ۱۹۲۷ء

سعد پاشا زاغلول کے اقوال کے تحت۔

"ہمارا مطالبہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے
ہمارا مطالبہ صرف ایک لفظ ہے
"آزادی"
ستمبر ۱۹۲۷ء

۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں مرقوم ہے کہ
"انقلاب کا موجب نہ تنہا جماعتیں ہوتی ہیں نہ صرف
افراد۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں
اور ایک نئی فضا تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

الہلال کے مضامین اور طرزِ بیان کے عام سیاسی اثرات و نفوذ طوالت کا باعث ہونگے۔

اس دور کے چند خاص اخبار یہ ہیں۔

انقلاب۔ احسان۔ سیاست۔ احرار۔ مجاہد۔ نیشنل کانگریس۔ زمزم۔ پاسبان۔ الجمعیت۔ ہمدم۔ پیام۔ عصرِ جدید۔ ہند۔ خلافت۔ ہلال۔ ہمدرد۔ الاماں۔ وحدت۔ حق پر فراز۔ شہباز۔ اجمل۔

مختلف روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات قومی مسائل پر متفق رہے بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ مگر تمام اخبارات بدیسی راج کے خلاف آواز بلند کئے ہوئے تھے۔ آزادی کے خواہاں تھے۔

۔ اس دور میں صحافت ایک دارالعلوم کا درجہ رکھتی تھی۔ بغیر ساز و سامان کے بھی وہ صحافت کا سپاہی "آزادی کی لڑائی لڑتا تھا۔

اجمل پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ اخبار ملت۔ دہلی نے لکھا تھا۔
"اجمل کی زندگی اور کامیابی سے ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر
سرمایہ کے کوئی اخبار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ سمجھ لینا چاہئے۔
کہ خلوص، نیک نیتی اور سچائی بھی کوئی سرمایہ ہے"

نکتہ آفریں بات یہ ہے کہ

"بات کے کارکنوں کو بھی یہی دعویٰ ہے کہ اگر ہم ایمانداری
خوش معاملگی۔ خلوص اور نیک نیتی سے کام کریں گے تو
ہمارے کام کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی"

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی صحافت تمام سیاسی مسائل۔ حالات اور واقعات کی آئینہ دار ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے نظریات نے مسلم اخبارات کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۔ نیشنلسٹ
۲۔ مسلم لیگی

ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی، فسادات کے زور نے صحافت کی سطح کو بلند نہیں ہونے دیا۔ کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔

۱۹۳۷ء کے بعد ۱۹۳۹ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جنگ کے بعد سیاسی آزادی کے دور کے آنے کی امید تھی نئی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا۔

جوش نے کہا تھا کہ

نادان اگر رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے۔

۱۹۴۰ء میں کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں کوئٹ انڈیا، کا نعرہ بلند کیا۔ تمام لیڈر گرفتار ہوگئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوگیا۔

اس دور میں صحافت کا معیار نہیں بدلا۔ گروہی صحافت کو عروج حاصل ہوا۔

مختصر یہ کہ

آزادی کی جدوجہد میں صحافت نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے اخبارات لب ولہجہ میں نرمی تھی بعد میں تیزی پیدا ہوگئی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس میں تندی آگئی۔ "آزادی" سے متعلق ایک وافر ذخیرہ ہمارے پاس جمع ہوگیا۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں ایسا مواد نہیں مل سکتا۔ جو عام وخاص ذہن کو بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کر سکے۔ اپنے مطالعہ کی بنا پر میں یہ بات یقین اور دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں / ہمارے صحافتی محاذ ہیں ۔

— جیل بھرو تحریک
— عدم تعاون کی تحریک
— خلافت تحریک
— بدیسی مال کا بائیکاٹ

وغیرہ تھے۔ اس ادبی تحریک کے زیرِ اثر عوامی تحریک پروان چڑھتی رہی برطانوی سامراج اور جاگیردارانہ تہذیب کی مسلط کی ہوئی غلامانہ ذہنیت کا مقابلہ کیا گیا۔ ہماری صحافت نے قومی شعور کو بیدار کیا۔ نیشنل کانگریس وجود میں آئی تو اس کے نام اور کام سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

غیر ملکی حکومت سے ٹکر تھی۔ حاکم و محکوم کا پیچیدہ اور نازک رشتہ تھا۔ صحافت بے باک اور بے خوف رہی۔ نئے قوانین کے نفاذ کو بادی النظری میں محکوم قوم کے حق میں "مفید" سمجھا گیا۔ مگر یہ سب سیاسی داؤں پیچ تھے۔ حکومت

وقت نے ان سے ہماری تہذیب پر، زندگی پر مہلک وار کئے۔ صحافت نے ان ضربوں کے نشانات بتلائے۔ ہم کو اپنی تہذیب سے محبت سکھائی۔ اتحاد کا شعور پیدا کیا۔ ہمارے چند عمرانی، معاشرتی، اقتصادی مسائل بھی تھے۔

ملک میں محنت کش طبقہ —— کسان مزدور

متوسط طبقہ

دولت مند طبقہ

فکر و نظر کے مختلف زاویے رکھتا تھا۔ ان کا اختلاف اور پریشانیاں آزادی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ ہمارے اخبارات نے ان رکاوٹوں کو بڑی عمدگی سے دور کیا۔

۱۔ عوام کے احساس کو بیدار کیا

۲۔ ان کو مقابلہ کا شعور اور ہمت عطا کی۔

کہ وہ آزادی کی جد و جہد میں شریک ہو کر اپنی درماندگی، غربت کس مپرسی اور بدحالی کو دور کریں۔ ہمارے اخبارات نے جرأت سے کام لیکر عام سماجی برائیوں پر نشتر زنی کی۔ اور اس طرح سماجی تعمیر کی مستحسن خدمت انجام دی۔ لوگوں کی گراں خوابی کو دور کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو مغربی سیاست کی شاطرانہ چالوں کی پول کھولنے پر آمادہ کیا۔

عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اخبارات کا زیادہ حصہ ہے۔ متذکرہ امور پر مثالیں فراہم نہ ہو سکیں۔ ادھر ادھر سے چند اشارات دیے گئے ہیں۔ اس مضمون کو "اعلان بیداری" اور "اعلان آزادی" کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

اخبارِ عالم —— ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستان! بڑھو! — آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں، بڑھو!
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو — کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو!
بیٹھے ہو، پاؤں توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم — دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں، بڑھو!
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے — چلا رہا ہے طوطیِ ہندوستان، بڑھو!

۱۹۴۷ء میں ۱۵ اگست کو جب آفتاب تازہ، اپنی جلو میں مو گردش شمس و قمر لئے ہوئے، "سامان صد ہزار بہاراں" کے ساتھ طلوع ہوا، تو وجد نے "اہل نظر" کو یوں مبارکباد دی۔

گلشن کا، انقلاب نے نقشہ بدل دیا — شاہین شکارِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج
سب تاجران طوق و سلاسل چلے گئے — اے وجد! لطفِ عرض متاعِ ہنر ہے آج

معین شاکر

تحریک آزادی میں حسرت کا رول

ہندستان کی تحریک آزادی میں حسرت موہانی کا رول بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک ان کی تحریریں تقریریں اور عملی کارروائیاں جدید ہندستان کی جدوجہد میں عام طور سے اور مسلمانوں کی سیاست میں خاص طور سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ انہوں نے خلافت تحریک کے زمانے میں کیا کیا یا ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس میں (احمد آباد) کامل آزادی کی تجویز رکھی حالانکہ خلافت تحریک سے بہت پہلے اور ۱۹۲۱ء کے بعد بھی ان کی شخصیت کی چھاپ آزادی کی جدوجہد پر تو اور بہت گہری تھی لیکن اس کو حسرت موہانی کی بدقسمتی پر محمول کیجئے یا مسلمانوں کی کہ ان کے سیاسی رول کا خاطر خواہ تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا ان پر لکھنے والوں نے زیادہ توجہ ان کی شاعری پر کی، ان کی سیاست کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا، کچھ مضامین جو ان کی سیاست اور سیاسی رول کے بارے میں لکھے گئے ہیں وہ تشنہ اور سرسری نوعیت کے ہیں ان کو پڑھنے سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ حسرت ایسے شاعر، سیاستداں تھے جو ہر ایک سے اختلاف کرتے تھے یا جھگڑا کرتے تھے، ان تحریروں میں حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں شاذ و نادر ہی ذکر ملتا ہے۔

آزادی ملنے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں آزادی کی جدوجہد کے بارے میں اچھا خاصا کام ہوتا رہا ہے۔ کچھ مغربی اور امریکی محققین نے بھی اس سلسلے میں اچھی تحقیق کی ہے، لیکن کسی نے اب تک آزادانہ طور پر حسرت کی سیاست کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کا ذکر عام طور پر ان کے ان ساتھیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی سوجھ بوجھ حسرت کے مقابلے میں یقیناً کمتر درجہ کی تھی وہ کانگریس سے وابستہ رہے لیکن کانگریسیوں نے انہیں بھلا دیا، وہ مسلم لیگ میں رہے، لیکن مسلم لیگیوں کو بھی ان سے کوئی محبت نہیں رہی (شاید اسی لئے پاکستانی مورخین بھی حسرت موہانی کا ذکر زیادہ نہیں کرتے)

حسرت موہانی کے رول کے ساتھ اس ناانصافی کے وجوہات کئی ہیں، کچھ بنیادی نوعیت کی ہیں اس لئے ان کی وضاحت ضروری ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں ایسے مورخین اور سیاستدانوں کی کمی نہیں ہے جو مسلمانوں کے رول کو آزادی کی تحریک میں منفی اور فرقہ پرستانہ سمجھتے ہیں، یونیورسٹیوں میں اور یونیورسٹیوں سے باہر ایسے انٹلیکچول موجود ہیں جو اس واہمہ MYTH کو دہراتے رہتے ہیں ان کا جواز یہ ہے کہ مسلمانوں نے انگریزوں کی مخالفت نہیں کی۔ کانگریس سے علیحدہ رہے۔ کانگریس کے اجلاسوں میں ان کی تعداد ہمیشہ کم رہی، علیحدگی پسند تحریک شروع کی اور پاکستان کا مطالبہ کیا یہ سب نصف سچائیاں ہیں اور معاملہ اگر اتنا ہی سادہ ہے تو تاریخ اور تاریخ نگاری اور تاریخی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ مؤثر پروپیگنڈہ تو ہو سکتا ہے، صحیح تاریخ نہیں ہو سکتی، مؤثر پروپیگنڈہ اس لئے کہ ابھی تک تحریک آزادی کا علاقائی اور طبقاتی نقطۂ نظر سے بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے، اگر تحریک آزادی کو کچھ رہنماؤں اور افراد کی تاریخ سمجھا جائے گا تو نتائج بہرحال گمراہ کن ہوں گے، سطحی طور پر لکھے جانے والی تاریخ میں حسرت کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی، دوسری وجہ تحریک آزادی کا کردار اور اس کا تجزیہ ہے یہ پیچیدہ مسئلہ ہے پہلی بات تو یہ کہ تحریک آزادی کو کانگریس کی تاریخ سے جوڑ دیا جاتا ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں ۱۸۸۵ء سے پہلے ہونے والی ساری تحریکوں اور ساری قربانیوں کو یکسر تحریک آزادی سے الگ کر دینا پڑے گا دوسری غلط فہمی یہ بھی ہوتی ہے کہ کانگریس کا مسلک، قومیت اور کانگریس سے وفاداری قوم پرستی ہے ایک مشکل یہ بھی پیش آتی ہے کہ کانگریس میں

اداروں میں مختلف افراد اور مکاتیب فکر کا غلبہ رہا ہے۔ کانگریس کے مقصد کی وضاحت میں بھی کافی پس و پیش سے کام لیا جاتا رہا ہے مثال کے طور پر ۱۹۲۹ء سے قبل کانگریس کا مقصد کامل آزادی نہیں تھا بلکہ جو افراد اس کی بات کرتے تھے ان کی مخالفت کی جاتی تھی ایک اور مشکل یہ سمجھنے میں بھی پیش آتی ہے کہ کانگریس میں غلبہ کن طبقات کے افراد کا رہا ہے۔ اور اس تحریک کا فائدہ کن طبقات کو ہوا اور آزادی کے بعد ہوگا یہ بات ضرور ہے کہ کانگریس کے رہنماؤں کا تعلق اعلیٰ یا متوسط طبقوں ہی سے تھا اس کو ہمارے استحصال کرنے والے طبقوں کی حمایت حاصل تھی، اس کی ایک مثال کانگریس کا ہر اس کا اجلاس ہے اس کے انعقاد کے لئے بڑے بڑے تاجر، بڑے زمیندار مذہبی پیشوا، بڑے صنعت کار، اور پڑھا لکھا طبقہ پیش پیش تھا کانگریس کی پالیسی جیسے سودیشی وغیرہ کا فائدہ بڑی حد تک، ہمارے عوام کو نہیں بلکہ ملوں کے مالکوں کو تاجروں کو اور سود خواروں کو ہونے والا تھا عام طور پر کانگریس کا مقصد یہی تھا کہ امیروں کو ان کی جائداد و دولت سے محروم نہیں کیا جائے گا، ذاتی ملکیت کے ادارے کا تحفظ کیا جائے گا، آزاد ہندوستان میں امیر و گدا دونوں کے لئے جگہ ہوگی۔ طبقاتی جنگ سے پرہیز کیا جائے گا، محنت و سرمایہ زمیندار اور کسانوں کے درمیان باہمی تعاون ہوگا، جب بھی کسانوں کی تحریک چلی یہی کہا گیا کہ اس کا قومی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے گنٹور نادا ویگی کو فوراً ختم کرایا گیا۔ ۱۹۲۸ء کی باردولی ستیہ گرہ کو غیر سیاسی قرار دیا گیا حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء کے بعد بھی کسانوں کی تنظیم کو کانگریس کے پروگرام کی تائید میں استعمال نہیں کیا گیا، بپن چندر کا کہنا ہے کہ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے گاندھی جی اور کانگریس نے ایک بھی NO TAX مہم نہیں چلائی ۱۹۲۲ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے صاف صاف اعلان کیا کہ کسانوں کا زمینداروں کو لگان نہ دینا کانگریس کے ریزولیشنوں اور ملک کے مفاد کے خلاف ہے، زمینداروں کو بھی اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگریس کا مقصد ان کے قانونی حقوق پر حملہ کرنا نہیں ہے اگر کسانوں کو زمینداروں سے کچھ شکایات ہوں تو انکو باہمی مشوروں کے ذریعے طے کیا جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ تحریک آزادی کے رہنماؤں کا سماجی نقطۂ نظر اکثر صورتوں میں رجعت پرستانہ ہی رہا۔ اسی رجعت پرستی کی بنیاد پر تحریک کی تشکیل دی گئی، ہندو مذہب یا قدیم ہند یا آریائی تہذیب کی مفروضہ برتری اور جدید، مغربی تہذیب پر حقارت کی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ جب یہ تحریک مختلف شہروں میں پھیلی تو اس کا فائدہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اٹھایا۔ اور اس کی رہنمائی بھی ان ہی کے ہاتھوں میں رہی یہ بات تقریباً سارے صوبوں میں صحیح ثابت ہوئی۔

یہ قومی تحریک کا غالب رجحان تھا مجھے یہاں یہ نہیں کہنا ہے کہ اس تحریک میں دوسرے رجحانات نہیں تھے مجھے ان سینکڑوں اور ہزاروں مخلص مجاہدین کی آزادی کی نیت اور عمل کی صلاحیت پر کوئی شبہ نہیں ہے جن کا واحد مقصد ہندوستان کی آزادی اور عام ہندوستانی کے مفاد کی تکمیل تھی، لیکن انہوں نے کانگریس کے سیاسی فلسفہ اور نظریہ کی تشکیل میں فیصلہ کن رول ادا نہیں کیا۔ یہاں اس حقیقت کو ہم بڑی روایت اور چھوٹی روایت سے تعبیر کر سکتے ہیں، چھوٹی روایتیں اہم ہیں لیکن وہ غالب روایت نہ بن سکیں میں اس بات کو بھی نہیں مانتا کہ قومی رہنما بڑے سرمایہ داروں کے اور بڑے زمینداروں کے ایجنٹ تھے لیکن شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے نظریات اور ان کی سیاست ان طبقوں کے مفاد میں تھی، حسرت موہانی کا تعلق قومی تحریک کی ان چھوٹی روایتوں سے رہا۔ حسرت یہ بھی کہ انہوں نے غالب رجحان اور غالب نظریہ کے خلاف شعوری جد و جہد کی، اس کام میں کامیاب ہوتے نظر آنے سے کم نہیں ہے، لیکن ناکامی بھی کچھ کم شاندار اور کم عظیم نہیں ہے حسرت کی پوری سیاسی زندگی اسی نظریہ اور رجحان سے عبارت ہے۔

حسرت کا تعلق ہندوستانی سیاست اور خاص طور سے یوپی کی مسلم سیاست سے بہت گہرا تھا اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدا تک مسلمانوں کی سیاسی روایات کافی حد تک مزاحمت کی تھی، اس روایت کے علمبردار برطانوی سامراج کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اس کو صرف احیا پسندی سمجھنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ مسلمان رہنما دوسرے طبقوں کے ساتھ مل جل کر بیرونی طاقت سے لڑنا چاہتے تھے اور کا رویہ مسلمانوں کی حکومتوں کی سمت ہمدردانہ تھا سرسید کی علی گڑھ تحریک اسی روایات کا انحراف تھی، علیگڑھ تحریک نے مسلم افراد کے ایک طبقہ کو عروج دیا جو سلطنت برطانیہ کے وفادار تھے۔ لیکن آخر الذکر کو ان پر پورا بھروسہ نہیں تھا سر انٹونی میکڈونل اس کی ایک مثال ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے غلبہ کی ہمت افزائی کی جائے۔ کیونکہ مسلمان سلطنت برطانیہ کے وفادار نہیں ہو سکتے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب سے فارسی کو ہٹا دیا گیا، تحصیلداروں اور ڈپٹی کلکٹروں کی ایک فہرست کو اس لئے منسوخ کر دیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک انکوائری کمیٹی بٹھائی گئی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ محکمہ پولیس میں مسلمان کیوں زیادہ ہیں۔ ایسے احکامات صادر کئے گئے کہ حکومت کے تمام شعبوں میں ہر پانچ ہندوؤں کے مقابلے میں صرف تین مسلمان ملازم رکھے جائیں فارسی رسم الخط بدل کر دیوناگری رسم الخط کئے جانے کے مطالبہ کی سرکاری طور پر ہمت افزائی ہونے لگی اسے

علی گڑھ تحریک کو دھکا پہنچا مسلمانوں میں حکومت کے خلاف بے چینی بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوانوں کا ایک گروہ پرانی رہنمائی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے لگا یو پی میں پرانے رہنماؤں کو اہل ثروت وجاہ (Men of Property and influence) اور نئے رہنماؤں کو ترقی پسند نوجوان young gentlemen of progressive tendencies کہا جانے لگا یہ ینگ جنٹلمین برطانیہ کے وفادار نہیں تھے۔ بلکہ اس کے خلاف تھے، برطانوی نوکر شاہی کو وہ مسلم مفاد کا دشمن گردانتے تھے۔ مخالف سامراج ہونے کی وجہ سے اسلام کے ترقی پسندانہ کردار کے قائل تھے علیگڑھ تحریک کے مسلک کے خلاف، کانگریس کے حامی تھے اور کانگریس کے انتہا پسند گروہ Extremist group سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے تھے حسرت موہانی ینگ جنٹلمین گروپ کے اگر سب سے پہلے رکن نہ ہوں لیکن ایک ممتاز اور فعال اور سب سے زیادہ articulate رکن تھے۔ اس گروہ کے دوسرے ارکان شیخ نذیر حسین قدوائی، عبد الرحمٰن بجنوری، نواب اسمٰعیل خان، عزیز انصاری، ڈاکٹر انصاری، قاضی عبد الغفار، سید حسن بلگرامی، غلام الثقلین کمال الدین جعفری۔ خلیق الزماں وغیرہ شامل ہیں۔ اس پس منظر میں حسرت موہانی کے نظریات اور رد عمل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں اردوئے معلیٰ نکالا یہ ایک ادبی اور سیاسی جریدہ تھا اس کی سیاست دوسرے اردو جریدوں سے بالکل مختلف تھی۔ حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری تک اس میں سودیشی کی حمایت اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کے بارے میں مسلسل مضامین شائع ہوتے رہے ہیں حسرت نے ہندستان کی آزادی پر بھی کئی مضامین لکھے، کانگریس کے بارے میں لکھتے ہوئے اعتدال پسندی moderates and liberals پر سخت تنقیدیں کیں۔ انتہا پسندوں کی بہ بانگ دہل حمایت کی۔ ان کا مقصد اور واحد مقصد ہندستان کی آزادی تھا اس اصول کے لئے وہ کسی طرح سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے اردوئے معلیٰ ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں۔

"…. دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندستان کے سوا کوئی اور بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں، پس عقل سلیم کس طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندستان ہی ایک ایسا ملک باقی ہے جس کی قسمت میں محکومی دوام لکھ دی گئی ہو۔ یہ گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے غرضکہ ارباب دانش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لئے ہندستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اپنی موجودہ صورتحال میں اس کا چند سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔" اعتدال پسندوں اور مسلم لیگ کی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوشحال محکوم بن جائیں، یہ لوگ آزادی ہند کی خواہش کو خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، ان کا دائرۂ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے ان کی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف ہے اور اسی لئے قطعی طور پر غیر طبعی اور ناقابل قبول" جب پہلی بار اردوئے معلیٰ بند کرنا پڑا۔ تو وہ مطمئن تھے کہ جریدے نے اپنا فرض ادا کیا اور اس کی وجہ سے آزادئ خیال اور طلب حریت کا جذبہ جمہور میں عام ہو چکا ہے سودیشی اور بائیکاٹ کی روز افزوں ترقی کا زمانہ شروع ہو چکا ہے"۔ جس فرد نے بھی کامل آزادی کی بات کی حسرت اس کے مداح ہو گئے اور جس سیاسی جماعت نے اس اصول کی تائید کی، حسرت اس کے حامی، کوئی اس کی مخالفت کرتا، حسرت ان پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اس میں چھوٹے یا بڑے سیاست داں کی تخصیص حسرت نے کبھی نہیں کی، ڈاکٹر انصاری ہوں یا مظہر الحق، گاندھی ہوں یا جناح، گوکھلے ہوں یا موتی لال نہرو، سردار پٹیل ہوں یا مولانا آزاد، حسرت نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ ان کی کمزوریوں کا پردہ چاک کیا حسرت موہانی کانگریس کے باقاعدہ رکن تھے لیکن جب کامل آزادی کے طرف داروں کو کانگریس چھوڑنی پڑی تو حسرت بھی کانگریس سے الگ ہو گئے جب مسلم لیگ نے اس اصول کی سچائی کو تسلیم کر لیا، حسرت اس میں شریک ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا میں حسرت موہانی کو کامل آزادی کے حصول اور سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کے امکانات نظر آئے ۱۹۱۸ء کی سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسرت موہانی کا گہرا تعلق "ریشمی خطوط" کی سازش سے تھا اس "سازش" کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغرب سرحد سے حملہ اور اندرون ملک مسلمانوں کی بغاوت کی مدد سے برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی ہندستان چھوڑ کر افغانستان چلے گئے، ہندستان میں اس پر عمل آوری کے لئے جن پر یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی، حسرت موہانی بھی تھے جہاں تک یو پی کی سیاست کا تعلق ہے۔ وہ مسجد کانپور کا قضیہ ہو یا یونیورسٹی کی تحریک، حسرت موہانی کا شمار صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا رہا ان تحریکوں میں انہوں نے ہمیشہ برطانوی حکومت کی مخالفت اور آزادی کے حصول کے مقصد کو

سامنے رکھا۔

جب ترکی کی سالمیت اور ادارۂ خلافت کے تحفظ کا سوال درپیش آیا حسرت موہانی خلافت تحریک میں شامل ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ خلافت تحریک میں کئی اعتدال پسند علماء اور مسلم رہنما شامل تھے اس کو گاندھی جی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف کانگریس کو کئی مسلم رہنما فراہم کئے بلکہ علاقائی رہنماؤں کو کل ہند سطح کا رہنما بھی بنا دیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کی یہاں مثال دی جا سکتی ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خلافت تحریک میں کس رہنما نے کیا رول ادا کیا، اس کا تجزیہ بہت کم کیا گیا ہے اور شاید اسی لئے جو مقام حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کو ملنا چاہئے وہ نہیں ملا۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے رہنماؤں کے اختلافات کانگریس اور گاندھی جی کے بارے میں رویہ، تشدد اور عدم تشدد کے اصول کے بارے میں اختلاف رائے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کے وسائل وغیرہ کے سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

حسرت موہانی اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کی وجہ سے خلافت تحریک کو ہمیشہ زیادہ ادبی میلیٹنل اور زیادہ مؤثر بنانا چاہتے تھے خلافت کا مسئلہ مذہبی تو تھا ہی لیکن حسرت موہانی اسے سراسر سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس تحریک کو مخالف سامراجی خطوط پر چلایا جائے اس کے لئے دستوری طریقے مؤثر نہیں ہو سکتے تھے اس لئے انہوں نے جارحانہ (militant) طریقوں کو اپنائے جانے پر زور دیا۔ گاندھی جی سے اختلافات کی شروعات یہیں سے ہوئی ۱۹۱۹ء میں جب گاندھی جی سے حسرت موہانی، شردھانند اور شنکر لال بینکر نے کہا کہ خلافت کا مسئلہ کو پنجاب کے مارشل لاء سے بھی جوڑنا چاہئے تو گاندھی جی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پنجاب مارشل لاء ایک مقامی مسئلہ ہے جب حسرت موہانی نے کہا کہ اکثریت کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہوگا تو گاندھی جی نے دھمکی دی کہ وہ خلافت کی تحریک سے الگ ہو جائیں گے نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی کی خلافت کانفرنس میں حسرت موہانی نے برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویز رکھی گاندھی جی اس کو بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے لیکن بنگال خلافت کانفرنس (فروری ۱۹۲۰ء) نے جب اس تجویز کو مان لیا تو گاندھی جی نے مخالفت ترک کر دی اسی طرح جون ۱۹۲۰ء میں حسرت نے اعلان کیا کہ اگر برطانوی تسلط کو ختم کرنے کے لئے افغان فوج ہندستان میں آئے گی تو وہ اس میں شامل ہو جائیں گے، اس کی تائید شوکت علی، آزاد، سبحانی اور ظفر علی نے بھی کی، شاید یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی نے کھل کر ۱۹۲۰ء میں گاندھی کے کھدر اور چرخے کے اصول کی مخالفت کی۔

حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا اہم واقعہ ۱۹۲۱ء کا احمد آباد کا کانگریس اجلاس تھا اس کی سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی نے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس کا مقصد مناسب اور موزوں طریقوں سے کامل آزادی ہونا چاہئے کامل آزادی کے بغیر خلافت کا مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکے گا حسرت موہانی نے یہ بھی کہا کہ اگر مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آتا ہے تو ہندستانیوں کو بندوق کی گولیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے عدم تشدد اور ترک موالات کا اصول ناکارہ ثابت ہوگا۔ ضروری ہے کہ خود حفاظتی کے لئے تشدد کے اصول کو مان لیا جائے اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت گاندھی جی کی ان کے خیال میں جب تک ہندو مسلم اتحاد کا خواب حقیقت نہیں بن جاتا کامل آزادی کے تصور کو کانگریس کے لائحہ عمل میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے لفظوں میں گاندھی نے یہ کہا کہ مکمل آزادی کے لئے ماحول سازگار نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "حسرت موہانی کی اس تجویز سے مجھے رنج ہوا کیونکہ اس سے احساس ذمہ داری کی کمی کا پتہ چلتا ہے"

گاندھی جی مخالفت کے باوجود حسرت موہانی نے یہ تجویز واپس نہیں لی اور اس کو کانگریس کے عام اجلاس میں پیش کر دیا۔ یہی تجویز جب مسلم لیگ کی سبجکٹ کمیٹی کے سامنے آئی تو اس کی مخالفت

حکیم اجمل خان ڈاکٹر انصاری اور سید رضا علی نے کی یہ تجویز ۳۶ کے مقابلے میں ۲۲ ووٹوں سے رد کردی گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی حسرت نے کامل آزادی کے تصور کو یا برطانوی سامراج کی مخالفت کو ترک نہیں کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اعلانیہ اپنی تقریروں میں تشدد اور گوریلا طریقۂ جنگ کی تبلیغ کی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ تقریر کی:-

"یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا کا اعلان کردیا جائے۔ لیگ کے جو مقاصد ہیں وہی کانگریس اور خلافت کے بھی ہیں صرف مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت مسلم لیگ سے مخصوص ہے۔ چاہئے یہ کہ اول سوراج حاصل کیا جائے اور اس کے بعد حقوق کی حفاظت .... اگر گورنمنٹ خلافت اور پنجاب کے مسائل طے نہ کرے تو مسلم لیگ کا مقصد کامل آزادی سے بھی زیادہ ہونا چاہئے۔"[۱۲]

۱۹۳۵ء کی اصلاحات سے قبل حسرت موہانی نے مسٹر حسین تدوائی، آزاد سبحانی، سید ذاکر علی سید حسین ریاض کے ساتھ مل کر ایک آزاد سیاسی پارٹی کی تشکیل کی۔ یہ کامل آزادی کے حصول کے لیے اور ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی یہ ایک مخلصانہ کوشش تھی۔[۱۳]

حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور سیاست کا ایک اہم پہلو انتہا پسندانہ سیاست پر ایقان ہے وہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کئے جانے کو جائز سمجھتے تھے یہ ہندوستانی انتہا پسندی کی روایت رہی ہے بال گنگا دھر تلک، آربند گھوش اور بپن چندر پال نے ہندو مذہب کو سیاست کا جزو لاینفک بنایا قومی آزادی، اتحاد، وغیرہ کی تفسیر اور تشریح بھی مذہبی اصطلاحات میں کی۔ چونکہ انہیں اعتدال پسند گروہ سے اختلاف تھا اس لئے اپنی تحریک کو عوامی بنانے کے لئے مذہب کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے۔

حسرت موہانی شاید مسلم رہنماؤں میں تلک کے سب سے بڑے مداح تھے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہندو انتہا پسندی کے خلاف اردو اخباروں نے اور اعتدال پسند مسلمانوں نے جیسے امیر علی محسن الملک وغیرہ نے سخت تنقید کی لیکن حسرت موہانی کے خیالات پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔

"پالیٹکس میں ہم متعدد اسے وطن پرستان سر تلک اور سر گردا مراد بابو آربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازمی سمجھتے تھے چنانچہ اس حیثیت سے فرد شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بے زاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا قرار شدہ لال چندی کانگریس سے ہے اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق بجانب ہے۔"[۱۴]

تلک کی شخصیت ان کے لئے زیادہ پرکشش اس لئے تھی کہ وہ تلک کو حریت اور وطن پرستی کا سب سے بڑا نمائندہ مانتے تھے، تلک کی قربانیوں حق گوئی اور اصول جمہوریت پر ایقان، حسرت کے نظریات سے میل کھاتا تھا اردوئے معلیٰ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"جو تلک اپنے ہم وطنوں کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ظاہری اور باطنی قابلیتوں پر اعتماد کرکے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی ضائع قوت وجبروت کو یقیناً دوبارہ حاصل کرلیں گے غرض کہ جن کی عمر کا ہر لحظہ اسی فکر میں گزرتا ہے کہ کسی طرح ہندستان اور اہل ہندستان کو آزادی نصیب ہو۔"[۱۵]

حسرت موہانی بھی تلک کی طرح دستوری طریقوں سے بے زار تھے کیونکہ بیرونی سامراجی حکومت میں دستوری اور حقوق کی بات بے معنی ہوتی ہے اس لئے انہوں نے سودیشی برطانوی مال کا بائیکاٹ

اور دفاعی مزاحمت کی ہمیشہ تائید کی۔

"ہم نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ ان تمام تحریکوں کی اعانت ہر حال اور ہر وقت اپنے اوپر لازمی سمجھتے ہیں اگر تحریر کے ذریعے سے ممکن نہ ہوگا تو تقریر کے ذریعے سے اور اس سے نہ ہو سکے گا تو عملی کارروائی تحریر و تقریر دونوں سے زیادہ مفید اور زیادہ ضروری ہے اس سے ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی"۱۶

حسرت موہانی قانونی طریقوں کے کھوکھلے پن سے بخوبی واقف تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ قانون برطانوی سامراج کی ہی حمایت اور حفاظت کر سکے گا اور اس کو نافذ کرنے والے اسے محکوموں کے خلاف ہی استعمال کریں گے۔

جب تک ہندستان میں مجسٹریٹ۔ پولیس کے ہی اعلیٰ افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹوں کوشش کر جس کی تردید کا فرضی ملزم کو کوئی موقع نہ ملتا ہے نہ مل سکتا ہے فیصلہ مقدمہ سے قبل ہی کر لیا کریں گے جب تک وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وارنٹ جاری کریں گے اور پھر خود ہی اس کا انصاف کرنے بیٹھیں گے اس وقت تک مقدمات میں عموماً پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً خالص انصاف پا رہا کی امید کرنا اوّل درجے کی حماقت ہے کیونکہ پولیٹیکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی ہو جاتی ہے کہ ملزم کو اکثر فرنگیوں اور فرنگی حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے یوروپین مجسٹریٹ کے دل میں اس کی جانب سے بعض کدورت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اس کو الزام نہیں دے سکتے"۱۷

اس خیال کے پیش نظر حسرت نے کبھی تشدّد کی بات کبھی گوریلا جنگ کی بات کی اور کبھی دفاعی مزاحمت کی۔ دراصل دفاعی مزاحمت کا اصول شری آربندو نے پیش کیا تھا لیکن اس کی تائید میں حسرت موہانی نے لکھا اس پر شری آربندو کو بھی رشک ہوگا۔

"حاکم سے محکوم اپنے ملکی حقوق کو تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں اوّل درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دست طلب دراز کر کے جس کا بے کار ہونا قطعی ثابت ہو چکا ہے دوسرے خون ریزی اور فساد کے ذریعے حاکم کو مغلوب اور مجبور کر کے جس کی بظاہر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی، پس ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی کارروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم گداگری کی ذلت گوارہ کریں جنگ و جدل کی آزمائش میں پڑیں بلکہ ان دونوں سے علیحدہ رہ کر دفاعی مزاحمت کے درمیانی طریقے پر چلنا شروع کر دیں جو مفید ہونے کے بجائے کبھی مضر ہو ہی نہیں سکتا اور یہی وہ بات ہے جس کی بناء پر مزاحمت کی پالیسی کو طلب کی پالیسی پر صریحاً ترجیح حاصل ہے کیونکہ بحالت ناکامی گداگر کی طبیعت مایوسی کے ایسے غار میں گر جاتی ہے جس سے دوبارہ نکلنا ان کے لئے بالکل محال ہو جاتا ہے لیکن برخلاف اس کے مزاحم اگر ناکام بھی رہے تو دوران مزاحمت میں ایسی قوت اور تجربہ حاصل ہو جاتا ہے اس کا فائدہ کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا"۱۸

گاندھی جی سے اختلاف کی وجہ یہی تھی کہ حسرت نے عدم تشدّد کو اصول کے طور پر کبھی بھی نہیں مانا، انہوں نے باردولی پروگرام کو صرف اس وجہ سے رد کر دیا کہ جب مذہب تشدد کی تلقین کرتا ہے

تو عدمِ تشدد کو کیسے مان لیا جائے ۲۱۔ حسرت موہانی نے اسی شدت اور اسی خلوص کے ساتھ سودیشی کی حمایت کی، ایک سودیشی اسٹورس کھول کر شبلی کی روسے "سنئے" لکھی ہے کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "سردی کی رات حسرت نے کمبل اوڑھے بغیر گذاردی کیونکہ وہ کمبل "ولایتی" تھا۲۲ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت موہانی کے نظریات پر تلک کے فلسفۂ سیاست کا اثر کتنا واضح تھا۔"

حسرت موہانی نے تلک سے یہ بھی سیکھا کہ ہندستان کی آزادی دراصل یہاں کے محنت کش طبقوں کی آزادی ہوگی، ان کی فلاح و بہبودی کے لئے یہاں کی قومی تحریک، سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو اس مقصد کے لئے جدو جہد کرنی چاہئے یہی بات حسرت موہانی کو کیونزم کی طرف کھینچ لائی، انقلابِ روس کے بعد ہی حسرت موہانی نے ہندستان میں بھی ایسے نظام کے قیام کے لئے اپنی شاعری اور اپنی تقریروں میں تبلیغ شروع کردی ۱۹۲۰ء میں اردو وہ خلافت کانفرنس ہوئی، اس کی صدارت مشر حسین قدوائی نے کی اس میں حسرت موہانی نے بھی حصہ لیا، ان کی تقریر میں بالشویکوں کی فتح کے خیر مقدم کا رجحان نمایاں تھا، ۱۹۲۴ء میں ہی حسرت موہانی کانپور میں ایک نیشنل کیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۲۵ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کانفرنس ہوئی اس کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر حسرت موہانی تھے ان کے خطبۂ استقبالیہ کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہلِ ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں البتہ بعض صریح غلط فہمیوں کی بناء پر کمیونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے ہم لوگ عدم تشدد کو ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے "۲۳ کیونزم کے پرچار کو وہ آزادی کی تحریک کا ایک جز سمجھتے تھے۔

"آزادیٔ کامل کا کل جائز طریقوں سے قائم کرنا سوراج کی ہیئت سوویت ری پبلک کی طرح ہو جہاں کیونزم کے اصولوں پر عمل کیا جائے، سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں، مزدوروں کی فلاح اور آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندستان کی سیاسی جماعت کے اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک یہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے، کیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے "۲۳

حسرت کیونزم کے روح کو سمجھتے تھے اس فلسفہ اور روح کی مذہب میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا اپنے خطبۂ استقبالیہ میں انہوں نے کہا کہ :-

"واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذہب کے بارے میں انتہا درجہ کی رواداری کو مناسب سمجھتے ہیں، جو شخص ہمارے اصولوں کو نہ مانے وہ ہمارے فریق میں داخل ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی یا بودھ، مذہبی شخص ہو یا مذہب بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے

ہمارے بعض مسلمان لسندر بلا وجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت حال اس کے خلاف ہے مثلاً کم ازکم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی سخت ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشا ربھی زیادہ یہی ہے کہ خلقِ خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مالداروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ پر ہی دیا گیا ہے"[۲۴]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حسرت موہانی نے نہ صرف مزدوروں کی بات ہی نہیں کی بلکہ انہیں منظم کرنے کے لئے کوششیں بھی کیں، ان کی شکایات کو دور کرنے کے لئے سیاسی جماعتوں کو تیار بھی کیا اس کی ایک مثال کانپور کا یہ واقعہ ہے۔ چوہدری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"کانپور کانگریس کا اجلاس مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو کی زیرصدارت ہوا۔ جب سب لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے میرے کان میں کہا "مولانا حسرت موہانی مزدوروں کے حامی ہو گئے ہیں اور یہاں آکر مزدوروں کی شکایتوں کے بارے میں کانگریس رہنماؤں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ انہیں دروازہ پر روک دیا گیا اور وہ دھمکی دے رہے ہیں کہ وہ دروازہ توڑکر پنڈال میں آجائیں گے، جواہر لال میں اور عزیز انصاری یہ دیکھنے کے لئے گئے کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور بڑی تعداد میں مزدور ہما کما ڈ نڈ میں داخل ہو گئے تھے عزیز کے ہاتھ پر لاٹھی پڑی اور سر پر میرے پڑی اور اس وقت تک کہ میں کچھ سمجھ سکوں میں نے دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی پنڈال میں جاکر صدر سے بحث کر رہے تھے لیکن بات چیت سے مولانا مطمئن ہو گئے"[۲۵]

حسرت موہانی نے اپنی شاعری میں بھی کیمونزم کا بار بار ذکر کیا ہے[۲۶] حسرت موہانی مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن رہے اور اس کی مجلس عاملہ میں بھی برسہا برس شریک ہوتے رہے اور وہ ہمیشہ کامل آزادی کے طرفدار رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک وفاقی حکومت کا بھی تصور پیش کیا۔ اس سے ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور سیاسی بصیرت کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے وہ ہندستان کی تقسیم کے خلاف تھے، اور اس کے بجائے وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں کی اقلیتوں کے مسائل کا وفاقی حکومت کے ذریعے حل ممکن ہے وہ ایسی وفاقی طرز حکومت چاہتے تھے جس کے صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں اگر مرکزی حکومت مسلمان کی اکثریت کے صوبوں کے ساتھ انصاف نہ کرے تو یہ صوبے وفاق ہند سے بالکل باہر نکل آتے ہیں اور اگر ہندو اکثریتی صوبے نو آبادیاتی طرز حکومت پر قناعت کرلیں تو اسلامی اکثریت کے صوبے آزاد حکومت بنا لیں"[۲۷] ان کے خیال میں ہندستان میں پانچ جمہوریتیں قائم ہوں!۔

مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان، مرکزی ہندستان، جنوب و مشرقی ہندستان، جنوب مغربی ہندستان ان سب کو وفاقی حکومت کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے"[۲۸]

بغور دیکھا جائے تو حسرت موہانی کا وفاقی حکومت کا تصور ہندو مسلم تنازعہ اقلیتوں کے مسائل اور قومیتوں کی ترقی کا بہترین حل معلوم ہوتا ہے" حسرت موہانی کی سیاسی ڈائری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی اسکیم جناح، گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کے سامنے پیش کیں اور سی راج گوپال اچاری کو انہوں نے اپنا موافق بھی بنا لیا تھا"[۲۹]۔ گاندھی جی نے بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا تھا حسرت کے الفاظ میں "رات کو گاندھی جی کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا تھا"

خدا کی شان جو شخص ڈومینین اسٹیٹس کا شیدائی اور کامل آزادی کا دشمن تھا اب بالکل میرا ہمنوا ہو گیا ہے "۳۰
لیکن برطانوی سامراج کو کچھ اور مقصود تھا۔

حسرت موہانی کی سیاسی شخصیت کا ایک اہم پہلوان کی حق گوئی بیباکی اور غیر معمولی جرأت تھی ان کی زندگی سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جا سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیا وہ اپنے اصولوں کی قیمت دینا جانتے تھے انہوں نے کبھی برٹش حکام کے آگے سر جھکایا اور نہ ہندوستانی لیڈروں کی خوشامد کی ان کی طرز زندگی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"مرجس مسٹن اور ان کے مانند جملہ ارباب قہر و غرور کو معلوم ہو تا چاہئے ان کی نا راضی اہلِ دولت و جاہ کے لئے خواہ کیسی ہی مہیب اور اہم کیوں نہ ہو مگر ہم سے آزاد فقیروں کا اس سے مرعوب و مغلوب ہونا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے "۳۱

اسی طرح جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۱۶ء میں آگرہ میں ہوا تو مسجد کانپور کے واقعہ کے سلسلے میں ہارڈنگ کا شکریہ کا ریزولیشن پیش کیا گیا۔ حسرت نے اس کو نہ صرف ناپسند کیا بلکہ مخالفت کی۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے کانگریس کے اجلاس کے بعد گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے کیلئے گئے۔" مگر عرض و معروض و جواب کے بعد وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا تو حسرت چپکے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل آئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں "۳۲۔

جب بھی انہیں یہ احساس ہوا کہ گاندھی جی کی پالیسی بھی غلط ہے فوراً مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے یہی بات جناح کے ساتھ بھی جناح اپنی مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچے ہوئے تھے مسلم لیگ کے مسلم رہنما سارے اختیارات انہیں سونپنا چاہتے تھے اجلاس (الہ آباد) میں آئے ہوئے پچاس ہزار شرکا کی بھی یہی خواہش تھی۔ حسرت موہانی تنہا اس تجویز کے خلاف تھے اس وقت تقریر کرنا بھی مشکل تھا حسرت موہانی بضد تھے اپنی تقریر میں کہا۔

"میں پاکستان کا موئد ہوں لیکن پاکستان کا ڈومینین کا قائل نہیں بلکہ پاکستان جمہوریت کا علمبردار ہوں اور یہی نکتہ میرے اور قائد اعظم کے درمیان خلیج پیدا کر رہا ہے "۳۳

حسرت موہانی کا یہی رویہ آزادی کے بعد بھی قائم رہا، ہندوستانی لیڈروں کا ایک طبقہ یہ چاہتا کہ ہندوستانی مسلمان اس ملک کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے پاکستان پر نکتہ چینی کرے، سردار پٹیل نے تو وفاداری کی شرط ہی لگا دی تھی حسرت موہانی خاموش رہے پاکستانی حکومت کی پالیسیوں کو ناقص سمجھنے کے باوجود کچھ نہیں کہا کیونکہ ہندوستانی حکومت کی خوشامد کی بو آتی تھی "۳۴

حسرت موہانی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ اسمبلی کی کارروائیوں میں گہری دلچسپی بھی لیتے تھے لیکن جب دستور میں مخصوص قسم کا وفاقی طرز حکومت کو قبول نہیں کیا گیا تو انہوں نے دستور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا دیسی ریاستوں کے بارے میں حکومت ہند کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے سردار پٹیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے وہی کیا جو ہسٹنگز، ولزلی اور کلائیو نے کیا تھا، تم نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادی چھینی ہے، تمہارے محکمہ پر خدا کی لعنت ہو "۳۵۔ حیدرآباد میں ہندوستانی افواج کی فتح پر مبارکباد دینے کے لئے یوپی اسمبلی میں تجویز پیش ہوئی تو اس کی مخالفت کرنے والے بھی تنہا حسرت تھے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد سے کہا:
"۱۸۵۷ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سر سید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداریٔ برطانیہ کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلا شرط وفاداری سکھلاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور محدود کر دینے کے درپے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ آزادی کے بعد جس طرح سے مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے جس حقیقت پسندی سے سوچا اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔"

۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء .... مسلمانوں کو اظہار مایوسی کی ضرورت نہیں اگر ضرورت ہو تو انہیں حکومتِ موجودہ کے خلاف گوریلا طریق جنگ اختیار کرنا چاہیے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء .... فضل الحق بھی ملنے آئے وہ انڈیا کے مسلمانوں کی مدد کا جذبہ لے کر مشرقی پاکستان سے آئے ہیں آدمی مخلص معلوم ہوتے ہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مگر آگاہ کر دیا کہ بحمد اللہ کم سے کم یوپی کے مسلمان اب لوگوں کی مدد کے بغیر بھی اپنی حفاظت کر لیں گے۔"

۱۵ اگست ۱۹۴۹ء "آج یوم آزادی کے سلسلے میں راجہ جی کے یہاں شب کی دعوت تھی میں بھی مدعو تھا مگر موٹر یا سواری کا انتظام نہ ہو سکا اس لئے نہ گیا علاوہ ازیں حاصل شدہ آزادی کو حقیقی آزادی سمجھنے کا ابھی میرے دل کو اطمینان نہیں ہے"۳۶

حسرت موہانی کے اس طرح کے کتنے ہی واقعات یہاں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے اوپر بیان کئے گئے چند واقعات ان کی سیاسی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ حسرت موہانی تحریک آزادی کے سرفروش مجاہد تھے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد حسرت موہانی جیسے رہنما نایاب اگر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں وہ تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے ان کی سیاسی نظر بہت دور رس اور سیاسی فکر عقلیت پسندانہ اور سائنٹفک تھی۔ آزادی سے قبل کی ہندو اور مسلم سیاست میں شاید ہی کوئی ہو جس نے مسلسل اور پیہم کامل آزادی کی بات کی ہو۔ آزادی سے محبت اور سامراج سے نفرت کے پیچھے صرف جذبہ اور جوش کارفرما نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد ان کی سامراجیت کی گہری سوجھ بوجھ نوآبادیاتی ملکوں پر اس کے تباہ کن اثرات انصاف اور حقوق کی پامالی اور ذہنی اور تہذیبی غلامی کی لعنت تھی، برطانوی حکومت سے نفرت اور برطانوی حکام سے بیزاری جس شدت سے حسرت کی شاعری اور تقریروں اور تحریروں اور عمل میں ملتی ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کوئی ہو وہ بخوبی واقف تھے کہ عام ہندو اور عام مسلمان کامل آزادی چاہتا ہے لیکن رہنماؤں کی مصلحت اور بزدلی انہیں حقیقت پسند بننے سے روکتی ہے۔ احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں بھی انہیں یہی بات دکھائی دی۔ کانگریس کے پرچوں میں شاید اس کا ذکر نہ ملے لیکن یہ صحیح ہے کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں انہیں ۲۵ فیصد اور عام اجلاس میں ایک تہائی اراکین ان کے حامی تھے۔

حسرت موہانی کا تعلق ہندوستان کی انتہا پسندانہ سیاست سے تھا مسلمانوں میں وہ اس روایت کے سب سے اچھے نمائندے ہیں۔ لیکن ہندو اور مسلم کی تخصیص کے بغیر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی ایمانداری کسی اور رہنما میں نہیں ملے گی، حسرت موہانی تلک کا بڑا احترام کرتے تھے ان سے بڑھ کر تعریف حسرت نے کسی لیڈر کی نہیں کی لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ سامراجیت کی تاریخ شاہد ہے کہ سامراجی حکام عام طور پر نوآبادیاتی ملکوں کے استحصال کرنے

والے طبقوں سے مل کر ہی حکومت چلاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں جاگیردارانہ سماج یا سرمایہ دارانہ نظام کے وجود میں آنے سے قبل کے استحصال کرنے والے طبقے ہی زیادہ آسانی سے بیرونی حکام سے سمجھوتہ اور معاہدہ کرتے ہیں ان ہی طبقوں سے حسرت کی زبان میں "اہل ثروت و جاہ" کچھ افراد و قومی تحریک میں بھی شامل ہوجاتے ہیں، رہنما بھی بن جاتے ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر بیرونی حکومت یا سامراج دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی اور معاشی نظریات میں ملکی استحصال کرنے والوں کے حامی ہی رہتے ہیں وہ رہنما بھی جنہوں نے مکمل آزادی کی بات کی، ان کی نظر سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بربریت اور ظلم پوشیدہ رہا خود تلک نے کوکن کے زمینداروں (کھوت) اور سود خوروں کے مفاد میں تھا حسرت سے کبھی اس طرح کا سیاسی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ دوسرا فرق مذہب اور سیاست کے اتحاد کی نوعیت کا ہے، تلک اور ان کے ساتھیوں نے سیاست کو اتنا مذہبی بنادیا تھا کہ اس میں اقلیتوں کو اکثریتی غلبہ کا گمان ہوتا تھا، ان کے ہیرو اور تاریخی شخصیتیں، تاریخی حقائق سے بے نیاز ہو کر گمراہ کن توہم پرستوں کو فروغ دینے لگی تھی۔ حسرت نے کبھی ایسا نہیں کیا ان کے نزدیک سیاسی مقصد سب سے زیادہ اہم رہا مذہب کا استعمال رجعت پرست سیاست یا احیاء پسند ذہنیت کی تشکیل کے لئے کبھی نہیں کیا۔ انہوں نے مذہبی عمل اور رواداری کی ہی ہمیشہ تلقین کی۔ ان کے اکثر ساتھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سماجی معاملات میں تنگ نظر رہے۔ حسرت موہانی چونکہ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں افادیت کے قائل تھے اس لئے وہ سماجی مسائل کے بارے میں کھلا ذہن رکھتے تھے۔

کمیونسٹ پروگرام اور کمیونزم کے فلسفے سے حسرت موہانی کی دلچسپی اتفاقیہ نہیں تھی ۱۹۰۶ء سے ہی وہ جن حالات کا اظہار کر رہے تھے، اس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ کمیونزم کی سمت جھکاؤ تھا کمیونسٹ پارٹی کی دستاویزات کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ کانپور کی پہلی کمیونسٹ کل ہند کانفرنس سے قبل ہی حسرت موہانی نے ایک نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے، کانپور کانفرنس کے خطبۂ استقبالیہ میں جو باتیں انہوں نے کیں اور کمیونسٹ پارٹی کو جو پالیسی اپنانے کی تلقین کی وہ کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ کمیونزم اور مذہب کے بارے میں ان کے تاثرات کئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئے ایسا لگتا ہے کہ مذہب کے بارے میں حسرت کا رویہ ہی زیادہ صحیح تھا، جو پروپیگنڈہ کمیونزم کے خلاف کیا جا رہا ہے وہ مذہب کو "افیون" سے تعبیر کرتا ہے، پوری طرح صحیح نہیں ہے خود مارکس نے جب یہ لکھا ہے اس مضمون میں وہ مذہب کو مصائب اور اضطراب کا علاج مذہب میں تلاش کرنا نہ صرف زندگی کے حقیقی مصائب کا اظہار ہے بلکہ ان کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ مذہب کچلے ہوئے انسان کی آہ، سفاک دنیا کا نرم دل اور بے روح حالات کی روح ہے۔ مذہب عوام کی افیون ہے۔

مذہب کو فریب حسرت کچھ کرمٹانا حقیقی مسرتوں کا مطالبہ ہے موجودہ حالات کے تعلق سے فریب کے ترک کرنے کا مطالبہ دراصل اس بات کا مطالبہ ہے کہ ان حالات کو ختم کیا جائے جن کے لئے فریب ضروری ہے اس لئے مذہب کی تنقید مختصراً آنسوؤں کا سمندر کی تنقید ہے جن کا ہالہ مذہب ہے مزے کی بات یہ ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کو ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا جاتا ہے اس پر الزام ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں "حد سے زیادہ مخلص" تھے۔ گاندھی جی پر ان کی تنقید اور کمیونزم اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات کی بنیاد جذباتیت کو ٹھہرایا جاتا ہے[37]۔ ان پر یہ الزام ہے کہ وہ جی (انارکسٹ) تھے کیونکہ ان کا سیاسی شعور بغاوت کی منزل پر رک جاتا ہے اور ان کے بہترین لائحہ عمل نہ وضاحت پائی جاتی ہے اور نہ استقامت[38] کہا ہے، دراصل مذہب کے بارے

جب مارکس نے لکھا تو اس کا مقصد مذہب کے اس رول کو اجاگر کرنا تھا جو استحصال کرنے والوں کو legitimacy فراہم کرتا ہے۔ لینن اور گرامچی کی تحریریں بھی حسرت موہانی کے نقطۂ نظر کی ہی تائید کرتا ہوں، ہمارے خیال میں حسرت کی سیاست کے بارے میں اس طرح کی تنقید غیر منصفانہ ہے گاندھی اور قائد اعظم انکی تنقید پر اسر حق بجانب ہے اس طرح کی تنقید پنڈت نہرو اور رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی کی تھی کیا وہ بھی جذباتی تھے؟ جس شخص کی ساری زندگی غیر مصلحت پسندی اور غیر مصلحت کوشی سے عبارت ہو اس پر اس طرح کا الزام لگانا زیادتی ہے ہاں جو عام طور پر جو مفہوم کامیابی کا لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کامیابی حسرت کو نہیں ملی۔ لیکن ایسی کامیابی سے ان کو کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی، مجنوں گورکھپوری کا یہ خیال ہے کہ حسرت کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت کی کمی تھی، صحیح نہیں ہے۔ کیا ہندوستان تحریک آزادی کے کسی بھی رہنما کے لائحہ عمل میں ایسی وضاحت اور استقامت ملتی ہے؟

دراصل یہ پوری بحث ہی لغو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وضاحت اور استقامت کا انحصار مختلف طبقات کے مفاد سے وابستہ رہتا ہے مثال کے طور پر ہر بڑے لیڈر جیسے گاندھی جی، نہرو، مولانا آزاد ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ نے پارلیمانی طرز حکومت کی سختی سے مذمت کی تھی لیکن آزادی کے بعد ان سب رہنماؤں نے اسے تسلیم کر لیا، کیوں؟ گاندھی جی پورے خلوص کے ساتھ اس ملک کے اقتدار کو کسانوں کے ہاتھوں سونپنا چاہتے تھے لیکن ملک سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں گیا، کیوں؟ پنڈت نہرو پورے خلوص سے اشتراکیت کے طرف دار تھے، لیکن ان کی ساری اقتصادی پالیسیوں نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا۔ کیوں؟ کسان کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت اور استقامت کی کمی تھی؟

ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے لکھا ہے کہ:

"مرگ حسرت کا ماتم کرنے والے دیارِ شوق کے باشندے ہوں گے نہ کہ سیاست کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کو وجدانی طور پر اس کا احساس تھا کہ اگرچہ انہوں نے اپنی عمر سیاست کے پاپڑ بیلنے میں گزاری لیکن آئندہ نسلیں انہیں ان کے سیاسی کارناموں کے سبب سے یاد نہیں رکھیں گے"....

حسرت نے اپنے سیاسی عقائد کی خاطر مصیبتیں جھیلیں اور سیاست کی دیوی پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا، لیکن سیاست بڑھتی ڈھلتی چھاؤں ہے یہ دنیا کی طرح کبھی کسی کی ہوئی اور نہ ہوگی آج دیارِ سیاست میں حسرت کا نام لینے والا کوئی نہیں [۳۱]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

"کیسی کچی بات کسی نے کہی کہ سیاست کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ اور منہ کالا ہوتا ہے، سوائے حسرت کے" [۳۲]

حقیقت یہ ہے کہ حسرت سیاست کو بڑھتی ڈھلتی چھاؤں سمجھتے تھے اور نہ کوئلہ کا کاروبار، سیاست کو ہمیشہ انہوں نے میدان عمل اور اپنے عقیدے کی تشہیر کا مؤثر ذریعہ سمجھا، حریت اور بغاوت، انصاف اور مساوات، جمہور کی خوشحالی اور بہبودی ان کے نزدیک سیاست دانوں کے یا اہل ثروت وجاہ کے ذاتی مفاد کے فروغ دینے کے لیے پرکشش نعرے نہیں تھے بلکہ ایسے اصول تھے جن کے حصول کے لیے بڑی سی بڑی قربانی دی جا سکتی ہے حسرت اپنے دوستوں کو بھی پہچانتے تھے اور دشمنوں کو بھی۔ سیاست نے انہیں دوستوں سے محبت و خلوص اور دشمنوں سے نفرت سکھائی۔

وقتی طور پر شاید حسرت کی سیاست اور سیاسی زندگی کو نظر انداز کر دیا جائے یا بھلا دیا جائے

لیکن ان کے کارناموں کو ہمیشہ کے لئے بھول جانا تاریخ کو اور خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے دیکھنا چاہئے کہ یہ عمل کب تک جاری رہتا ہے ممکن ہے یہ عمل برسوں جاری رہے اگر ہر زمانے کے تاریخ عصری تاریخ ہوتی ہے اور حسرت موہانی کی شخصیت کا تجزیہ آج کے حالات کے پیش نظر کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج کے ہندستان کے لئے حسرت بالکل اجنبی ہوں گے اور یہ ہندوستان بھی ان کے لئے اجنبی ہوگا۔ جس تہذیبی ماحول میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کا تصور بھی حسرت کے ذہن میں نہیں ہو سکتا سیاست دانوں کے بارے میں کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن چاپلوسی اور خوشامد انٹلکچول اور دانشوروں کا طرہ بن گیا ہے۔ سرکاری کمیٹیوں پر نامزدگی توقیر کی بات سمجھی جانے لگی ہے۔ ان اداروں اور افراد کی طرفداری میں ہمیں کوئی شرم نہیں ہوتی، جو بھاگلپور کے شرمناک واقعات کے ذمہ دار ہیں۔ پتہ نہیں ہم کس تہذیب کے وارث ہیں اور کس تہذیب کے علمبردار ہیں بھلا ایسی دنیا اور ایسی فضا میں حسرت موہانی حق شناس وحق پسند وحق یقین وحق محسن کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے **

***

سید آل رسول برکاتی مارہروی

فلسفۂ عشق کے علمبردار
شاہ برکت اللہ پیمیؔ

ہندستان ہر دور میں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت ستان رہا ہے۔ تاریخ و تہذیب کے لمبے سفر میں ہندستان نے کبھی کثرت کو قربان کرکے وحدت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس ب یہ تھا کہ ہند کے فکر و فلسفے کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے یشہ سے ایک ترقی پذیر اکائی رہا ہے جس نے ایک طرف خود ہی باشندوں کے مختلف رنگوں کو یک رنگ بنانے اور دوسری طرف عناصر کے اجنبی نظریات کو ہم آہنگی عطا کرنے کی کوشش کی۔

ت وپش کے اس صدیوں طویل سفر کے کسی موڑ پر وادیٔ سندھ کی یب کا یہ دوآبہ آریوں کے ملن کے بعد ترو ینی میں بدل گیا۔ ایک رنگ کے رنگ میں یوں ملا کر سب ایک رنگ ہوگیا۔ لطف یہ کہ ہر منفرد رہا۔ جغرافیائی اصطلاح میں رنگوں کی یہ دھنک ہند کہلائی جو سنسکرت میں سندھو اور عربی (قرآن) میں سندس ہوا۔ پھر ے ہندوستان کے مسلمان فاتحین، جو اس دھرتی پر بسنے کے یہاں کے لئے اجنبی یا غیر ملکی نہ رہے۔ ہندوستان نے زندگی قوی فلسفے کے دائرے میں رہتے ہوئے بہت جلد ایک ایسے اعلیٰ ی نظریئے کو فروغ دیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ۔ اب یہ دونوں دھارے ایک ہوکر ہندی یا ہندوستانی نے لگے۔ تاریخ ہند کا یہ کارواں ایکتا کی پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ ت کی دھوپ چھاؤں کے ساتھ اس پگڈنڈی نے شاہراہ کا روپ لے لیا۔ ہندوستان نے اپنی یک جہتی کو نئی سمتیں بخشیں اور کثرت میں وحدت کے اپنے قدیم روپ کو نت نئے زیور عطا کئے۔ ہندی یا ہندوستانی کا یہ نظریہ ہند کے باشندوں کے تمام طبقوں میں رچ بس گیا تھا۔ اسی تصور کے علمبردار تھے شاہ برکت اللہ جنھوں نے سترہویں صدی عیسوی میں صوبجات متحدہ یعنی موجودہ اترپردیش کے ضلع ایٹہ کو اپنے وجود سے مشرف فرمایا۔ یہی وہ ضلع ایٹہ ہے جس نے ہندوستان کو مہاکوی تلسی داس (مقام پیدائش سوروں) اور سلطان العاشقین امیر خسروؒ (مقام پیدائش، پٹیالی) جیسی عظیم ہستیاں عطا کیں۔

شاہ برکت اللہ کا تعلق سادات زیدیہ سے ہے جو عراق کے واسط شہر سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور بلگرام ضلع ہردوئی کو اپنا مسکن بنایا۔ شاہ برکت اللہ اپنے والد میر اویس کی وفات کے بعد بلگرام میں رہ نہ پائے۔ کالپی تشریف لے گئے اور وہاں سید فضل اللہ کالپوی سے بیعت ہوکر مارہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی) آئے۔ یہ گیارھویں صدی ہجری کے آخری دو چار برس کی بات ہے۔ آپ کے دادا میر عبدالجلیل کوئی چالیس پچاس سال پہلے مارہرہ کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ شاہ برکت اللہ نے اپنے دادا کی خانقاہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ لیکن گوندل نامی مقامی باشندوں کی شرارتوں سے تنگ آکر آپ دادا کی خانقاہ سے اٹھ آئے اور قصبے سے باہر

ایک نئی بستی بسائی ۔ اس کا نام پیم نگر برکات نگری رکھا ۔ آج یہ میاں کی بستی یا بستی پیرزادگان کے نام سے مشہور ہے ۔

شاہ برکت اللہؒ کی پوری زندگی اس ہندوستانی ثقافت کی مظہر ہے جو لگ بھگ چار سو برس پہلے ہندوستان جنت نشان کی باتیں تھیں ۔ ویدانت کی تعلیمات اور مسلمان صوفیوں اور عالموں کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی ثقافت کو فروغ ملا ۔ مسلمان صوفیوں نے مذہبی اختلافات کو ایک طرف رکھ کر ایکتا پر زور دیا ۔ مسلمان صوفیوں اور بھگتی تحریک سے تعلق رکھنے والے سنتوں کے اثر سے ہندوستانی سماج پر انوکھا نکھار آیا ۔ ہندوستان کی اس مشترکہ ثقافت کے فروغ میں شاہ برکت اللہؒ نے بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ انھوں نے ہندو مسلم ایکتا کو انسانیت کی نجات کی بنیاد بتایا ۔ ملّا کی تسبیح اور پنڈت کی مالا الگ الگ ہو سکتی ہے مگر ان میں توحید کا ڈورا ایک ہی ہوتا ہے ۔

ہزاراں خانہ ویک خانہ سازے
ہزاراں شیشہ ویک جلوہ سازے

(ریاض عشق)

ہزاروں خانے بنے مگر بنانے والا تو ایک ہے ۔ ہزاروں شیشے سجے مگر جلوہ تو ایک ہی ذات کا ہے ۔

آنکہ باخود آشنا شد دل گزشت از دین و کیش
ہیچ کر اوراخیال سبحہ و زنار سے نشد

(دیوان عشقی)

جو آدمی خود کو پہچان کر دل سے دین دھرم کے فرق کو دور کر دے ایسے آدمی کو تسبیح اور مالا میں کوئی امتیاز نہیں ۔

در صنم خانہ و مسجد نگر از دیدۂ دل
عشقیا ہست عیاں جلوۂ برکات الہ

(ترجیع بند)

دل کی آنکھ کھول کر بت خانے اور مسجد کو دیکھو ۔ ہر جگہ پیدا کرنے والے کی برکتوں کا جلوہ ہی نظر آئے گا ۔

شاہ برکت اللہ کا تعلق ہندی شاعری کے اس اسکول سے ہے جسے رہیم واد کہا جاتا ہے ان کا دور ریت کال کا دور تھا ۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے انھوں نے اپنی روحانی کیفیتوں کے اظہار کیلئے ہندی کا سہارا لیا ۔ اس طرح مثنوی ریاض عشق، دیوان عشقی، ترجیع بند رسالہ چہار انواع، رسالہ سوال وجواب اور عوارف ہندی کا مصنف شاہ برکت اللہ عشقی اپنے ہندی دیوان پیم پرکاش میں شاہ برکت اللہ پیمی کے روپ میں جلوہ گر ہوا ۔

پیم پرکاش ۱۶۹۸ء یعنی دور عالمگیری میں تصنیف ہوا ۔ یہ دیوان تین حصّوں پر مشتمل ہے ۔ ایک حصّے میں دوہے ہیں جن کی تعداد دو سو دوہے دوسرے حصّے میں کبت وغیرہ ہیں ۔ تین سے دس مصرعوں پر مشتمل اور مختلف اوزان اور راگوں میں موزوں یہ نظمیں ایک سو تیرہ ہیں ۔ تیسرے حصّے میں پانچ تختے اور دس دوہے سوال وجواب کے روپ میں ہیں ۔ پیم پرکاش کی زبان برج بھاشا ہے ۔ لیکن اس میں اودھی، پانچالی اور بندیلی بولیوں کا رنگ بھی موجود ہے ۔ شاہ برکت اللہ ہندی، فارسی، عربی اور سنسکرت کے ماہر تھے ۔ اودھی بولی کے علاقے ہردوئی میں پیدا ہوئے چونکہ ان کے مرشدوں کا تعلق کالپی ضلع جالون سے تھا اس لئے بندیلی بولی کا رنگ بھی چڑھ گیا ۔ مارہرہ میں آکر پانچالی بولی کے ربط میں آئے ۔ لیکن چونکہ عوامی زبان برج بھاشا تھی اس لئے آپ نے اپنے پیغام کے پرچار کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا ۔

شاہ برکت اللہ پیمی کا پیغام تھا پریم، محبت، عشق

عشق کا نور اندھیرے پر پڑا جس کے بعد کائنات وجود میں آئی عشق ہی اس کائنات کی روح ہے عشق ہی زندگی کی دھڑکن ہے، عشق ہی زندگی ہے جس نے عشق کو جان لیا اس نے گویا دکھ کو سکھ میں اور موت کو زندگی میں بدل لیا عشق انسانی اخلاق کی تکمیل کی بنیاد ہے عشق میں فنا ہو کر ہی انسان کو بقا حاصل ہو سکتی ہے ۔ بوند جب تک الگ تھلگ رہتی ہے بوند ہی کہلاتی ہے اور جب اپنے وجود کو فنا کر کے ساگر میں مل جاتی ہے تو ساگر بن جاتی ہے

پیمی قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علمبردار ہیں

پیمی ہندو ترک میں، ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت میں دیپ ایک ہی بھائے

ہندو ہو یا مسلمان، ہر دو میں ایک ہی خدا کا ظہور ہے جس طرح مندر ہو یا مسجد ایک ہی طرح کا چراغ دونوں جگہ جلتا ہے اور اس کی روشنی ایک سی رہتی ہے ۔ پاکیزگی و نفس کا نسخہ

من پارا تن کی کھرئی، دھیان گیان رس موئے
برہہ اگن سو پھونک دے، نرمل کندن ہوئے

ہیجی کہتے ہیں کہ من یا نفس پارے کی طرح ہے جسے کسی کل قرار نہیں۔ اسے بدن کی کٹھالی میں بند کر دو یعنی ریاضت اور تقویٰ کی قید میں ڈال دو۔ پھر اس میں علم اور عبادت کا رس گھولو۔ اب اس مرکب کو ہجر یعنی یادِ خدا کی آنچ میں تپاؤ۔ تبھی نفس کندن ہوگا۔

فلسفۂ وحدت الوجود:۔

تُو بن، میں تُو ایک ہیں، اور نہ دوجا کوئے
میں تُو کہنا جب چھٹے، وہی وہی سب ہوئے

نظریۂ اتحاد:

بلونت بگنتھ ہے، بچھڑن نرک سمان
بیگ ملو من جانو تے، بن بچھڑ جیہ جان

یعنی وصل، اخوت و آشتی جنت ہے۔ الگ تھلگ رہنا، عداوت و منافرت دوزخ کی طرح ہے۔ جس سے ملو کھلے دل سے ملو، ٹوٹ کر ملو، جی جان سے ملو۔ ایسے ملو کہ پھر کبھی الگ نہ ہو۔ جب تک انسان ایک طرف انسان کے ساتھ اور دوسری طرف خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ منظور نہ کرے گا تب تک اسے روحانی آسودگی نہیں مل سکتی۔

دیا ہوکے اور ناہیں، لاج ہوکے کھور ناہیں
یا تیں من ماہیں، جو رت ہو اَریں اَریں

—

روپ جیسو چندرماں، سپورن دکھائی دیت
گُن کے بندھان، بن گُن کیس ڑیں لڑیں!

—

سیٹھ ہُوکی اپمان، ہیجی کہا کہوں ایسو!
گل میں ٹلبائی جان، سٹھ کی ترپ ترپ

—

آہجی آمرا شائی، پائی ہے کنہائی
سا یجی کہو موسوں، کاہے بولت برہ ہاریں

اس گیت میں ہیجی کہتے ہیں میرا مطلوب مجھ سے کیوں ناراض ہے؟ شاید اس لئے کہ میں نے سخاوت اور محبت سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ اے میرے مالک! مجھے معاف کر دے کیونکہ تو ساری اچھائی اور سچائی کا سرچشمہ ہے اور میں ان اوصاف سے محروم ہوں۔ میری کشتی کو ساحل تک پہنچا دے کیوں کہ تو بڑی عظمت والا ہے۔ اور میں سراپا برائی ہوں۔ اے میرے مالک! مجھ تک اپنی آواز پہنچا۔ تو ہی حق ہے، تو ہی نیکی ہے، تو ہی حسن ہے۔

گیتا میں مکمل انسان کے چار اوصاف بتائے گئے ہیں۔ یوگ، کرم بھکتی اور گیان۔ شاہ برکت اللہ نے صدق، عدل، حیا اور علم کو انسان کی شخصیت کی تکمیل کی بنیاد قرار دیا ہے۔

ست جو جائے تو رہے کیا، نیت گئے سب جائے
لجیا بنا نمج ہے، بن بدیا نہ اگھ اٹھے

انسان میں صدق و صفا کے بنا کچھ نہیں رہ جاتا۔ نیت یعنی عدل کے نہ رہنے سے سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ جس انسان میں شرم و حیا نہیں ہوتی وہ بے شرم ہو جاتا ہے اور جو آدمی علم سے محروم رہتا ہے وہ حیوان بن جاتا ہے۔

لاالٰہ اونچے کہو، نیچے اِلّا اللہ
آواگون بچار کے دیکھو کے اَنساہ

ہیجی یوگ کی مشق کی تلقین کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے ذکرِ نفی و اثبات کہا جاتا ہے۔ جب سانس چھوڑو تو مایا موہ کی سبھی مورتیوں کو دل سے نکال پھینکو اور جب سانس اندر کھینچو تو ربِ واحد کو اپنے دل میں بٹھالو۔ سچا یوگ یہی ہے۔

اِنَّ اللہ بِکُلِّ شَیٍٔ، ایسیں تجیو محیط
رو ئی تار جیوں چیر میں، تیوں جگ میں جگ میت

ہیجی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ ہر جگہ اسی ربِ عظیم کا ظہور ہے۔ جس طرح کپڑے میں تانے بانے کے روپ میں روئی رہتی ہے اسی طرح کائنات میں اللہ کا جلوہ موجود ہے۔

تولا جیوں نینا کرو، باٹ پیم کے کھول
کر مجھو تا گیان سوں درسن نگ نت تول

ہیجی کہتے ہیں کہ اگر اپنے مطلوب کا دیدار کرنا ہے تو آنکھوں کو ترازو بناؤ اور عشقِ حقیقی کو باٹ بناؤ اور جس طرح وزن کرنے والا ترازو کے پلڑوں اور کانٹے پر ایک سی نگاہ رکھتا ہے اسی طرح تم بھی یکسوئی کے ساتھ مراقبے میں ڈوب جاؤ تبھی دیدار کا نگینہ حاصل کر سکتے ہو۔

من اُتم، تن پاگلہ، جاہ پیم جٹ سار
گرو سکھادت دھیان سوں پنکت ہوئے اُلجھ

دل کی مثال حرف جیسی ہے اور بدن تختی کی طرح ہے۔ یہ دونوں

چیزیں موجود ہیں تو آؤ مکتبِ عشق میں چلیں۔ جہاں گرو یعنی مرشد عشق کا سبق پڑھاتا ہے۔ اگر مرشد کی نگاہِ کرم ہوگئی تو ہم بھی عشق کے علم میں کامل ہو جائیں گے۔

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سمجھ پری
تن من میں پیتم کی آگ بری تب سمجھ پری
موجوں کے بھیر کو جو دلِ غیر بوجھتا
جب سندھ کے بھنور میں پری تب سمجھ پری
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیرِ سیس دھری تب سمجھ پری
جت تت پھرے سے من کو تسلی نہ کچھ بھی
جب دل کی کیل سانجھ اری تب سمجھ پری
کنجِ غمی میں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہجر ہی لگائی جھری تب سمجھ پری
پوچھا نہ عشقیا زِ خرد راہ بیم کا
جب عشق شُدّہ بُد ہری تب سمجھ پری

اس ریختے میں بیمی کہتے ہیں کہ دنیا کے مایا موہ میں رہتے ہوئے معرفتِ الٰہی کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ شعور تبھی آتا ہے جب انسان اپنی انا کو فنا کر دے۔ گیان حاصل کرنے کے لئے عشق کا ہون سنگا ناپڑتا ہے۔ خدا کو اسی وقت پا سکو گے جب مخلوق کا ساتھ چھوڑ کر خالق سے لو لگاؤ۔ جذبۂ عشق وہ چیز ہے جسے غیر تو کیا خود عاشق بھی نہیں سمجھ سکتا۔ عرفانِ ذات ہونے کے بعد ہی بندے کو اپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے مخملی تکیوں اور نرم سیج کا تیاگ ضروری ہے۔ معرفتِ الٰہی کے حصول کے لئے دنیا کے عیش و آرام ترک کرنے ہوں گے۔ معرفتِ الٰہی محض عقل گھوڑے دوڑانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے سول کی استقامت لازمی ہے محبوب سے بچھڑنے میں جو مزہ ہے وہ ملن میں کہاں۔ وصل کے بعد تڑپ کہاں باقی رہتی ہے۔ عارف بننے کے لئے ضروری ہے کہ عشق عقل پر غالب آجائے کہاں ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ یہ سوال تو عقل والے کرتے ہیں۔ دل والا تو بس یہی کہتا ہے کہ جو ہے سو ہے۔

بیم پرکاش کے کچھ لطیف مقولے

پی دیکھے نہیں رہ سکوں، دیکھیں رہو نہ جائے

مطلوب کی جدائی شاق گذرتی ہے اور جب وصل ہو جاتا ہے تو یہ خلش تڑپاتی ہے کہ پھر جدا ہونا پڑے گا۔ یہاں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے جب کوہِ طور پر حضرت موسٰی علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی اور جب اللہ نے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ کچھ صوفیا کا کہنا ہے کہ موسٰی علیہ السلام کی بے ہوشی اس لئے نہیں تھی کہ وہ اللہ کی تجلی برداشت نہیں کر سکے۔ بلکہ وہ بے خودی وصل کے بعد ہجر کی خلش کے سبب تھی۔

دھوئی جائیں گے پاپ سب، پر سولالن پائے

جو شخص مایا موہ سے منہ موڑ کر تن من کی مکمل طہارت کے ساتھ معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں دو زانو ہو جائے اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے۔

سُورا سوئی سراہیے، کرے نسانے چوٹ

جو شخص دنیا کی شان و شوکت، دھن دولت کی جستجو کرتا ہے وہ سب سے زیادہ بزدل اور مفلس شخص ہوتا ہے۔ بہادری تو یہ ہے کہ اپنا سب کچھ حق کی خاطر کے لئے قربان کر دیا جائے۔

ہم تم ایکے ہوئیں گے جو رہی چھٹے یہ آنٹ

طالب و مطلوب کے ملن میں انانیت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اپنے گھر کو راج تج، پرجا کاہے ہوت

انسان کو اس کے خالق نے بادشاہ بنایا ہے۔ جو خود حاکم ہو وہ محکوم کیوں بنے بھلا؟

بیمی سو جگ مُکت نہ پاوے پِی کر جانے دوئے

دوئی غلامی ہے۔ آزادی کا راز ایک ہو جانے میں چھپا ہے۔

ہم میں سیام، سیام مدھ ہم ہیں، تم جن انت بکھانز

انسان بھگوان میں، بھگوان انسان میں۔ وحدت الوجود کا یہ نظریہ ہی انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ باقی ساری چیزیں فضول ہیں۔

منساقر کیوں بیمی، سیوا سب گئی پھیس

سارے مذہبی مشاغل ایک طرف اور عشقِ حقیقی ایک طرف۔ ساری ریاضتیں، سارے مجاہدے بے کار ہیں اگر دل پوری طرح معبودِ حقیقی میں نہ لگا ہو۔

شاہ برکت اللہ کا زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا جسے ہمارے تنگ نظر مورخین نے مذہبی تعصب کا زمانہ کہہ کر اچھالا ہے۔ اورنگ زیب ہی کو نشانۂ ملامت کیوں نہ بنایا جاتا ہے۔ کیا آج کے اس جمہوری دور میں نسلی منافرت کے جھگڑے نہیں ہیں؟ سب کچھ وہی ہے سارے مسائل وہی ہیں لیکن کتنے لوگ عشقی یا بیمی بننے کی کوشش کرتے ہیں؟

سرور قیوم خاں

ہندِ قدیم کے بارے میں عرب سیاحوں کے تاثرات

عرب اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں کئی مورخین نے یہ لکھ دیا ہے کہ ان کے یہ رابطے اس وقت سے قائم ہیں جب سے یہ دنیا وجود میں آئی۔ یعنی جب حضرت آدم کو خدا نے جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا تو وہ لنکا میں اترے (اس زمانے میں لوگ ہندوستان ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے) اور حوا عرب کی زمین پر۔ پھر ان دونوں کا عقد ہوا اور نسلِ انسانی وجود میں آئی[1]۔ اس میں شک نہیں کہ مورخ نے اس روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کئی حوالے بھی درج کیے ہیں مگر پھر بھی یہ بات افسانوی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ سنہ ۹۵ قبل مسیح کے قریب عرب سیاحوں کے جہاز تجارت کی غرض سے ہندوستان کے ساحلوں پر منڈلاتے نظر آتے تھے۔ ہندوستان اور عربوں کے تعلقات اسی زمانے سے قائم ہوئے اور ان میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ تاجروں کے علاوہ متعدد عرب مورخ اور جغرافیہ نویس بھی قدیم زمانہ میں ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں نہ صرف ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے وہ ہو کر گزرے یا جہاں وہ گئے بلکہ ہندوستان کے رسم و رواج اور دوسری خصوصیات کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ یہ تاثرات بڑے خوش گوار ہیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عرب سیاح زمانۂ قدیم میں بھی ہندوستان کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

عرب سیاحوں کا سب سے پہلا سفرنامہ جس میں ہم کو ہندوستان کا ذکر ملتا ہے سلسلۃ التواریخ ہے جسے آٹھویں صدی کے ایک مشہور عرب تاجر سلیمان التاجر نے لکھا تھا۔ بعد میں اس کتاب میں ایک دوسرے عرب سیاح ابو زید حسن سیرافی نے اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کئی مورخین کا یہ خیال ہے کہ سلسلۃ التواریخ جس کو ۱۸۱۱ء میں لینگلس نے پیرس میں شائع کیا وہ کتاب نہیں جس کو سلیمان اور ابو زید نے لکھا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ سلیمان اور ابو زید کی کسی دوسری کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ بعد میں آنے والے عرب سیاحوں نے اپنے اپنے سفرناموں میں ہندوستان کے بارے جو واقعات اور روایتیں لکھی ہیں ان میں سے متعدد واقعات اور روایتیں سلسلۃ التواریخ کی روایات سے حرف بہ حرف ملتی ہیں۔ اس لیے ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سلسلۃ التواریخ جو پیرس میں شائع ہوئی بلاشبہ وہ قطعی طور پر وہی کتاب ہے جس میں سلیمان نے اپنے ذاتی مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔

سلیمان سیلون (جس کو اس وقت سراندیپ کہتے تھے) بھی گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان میں جن جن جگہوں پر گیا وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ نیح بالوس (چٹاگام)۔ ۲۔ کم کم۔ یہ راجہ بلہرا کے زیرِ نگین تھا۔ ۳۔ کوکم لی (کولام یا کیولان) ابن بطوطہ نے اسی مقام کو "کولم" لکھا ہے۔ اس سے مراد جنوبی ہند سے ہے۔ ۴۔ بلاد الفلفل (ملابار)۔ ۵۔ نیوا۔ ملابار کے قریب کا علاقہ۔ ۶۔ جزر (گجرات)۔ ۷۔ طافن (کچھ مورخین نے اس کو طاقن بھی لکھا ہے جو موجودہ اورنگ آباد کے قریب دکن میں تھا)۔ ۸۔ رہمی (ڈھاکہ کے قریب

---

[1] سید سلیمان ندوی: ہند و عرب کے تعلقات

یہ سفرنامہ آج سے تقریباً گیارہ سو برس قبل (۲۳۷ھ ۸۵۱ء) لکھا گیا۔ اس میں سلیمان نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ اور پہلو پر بحث کی ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ یہ چین سے کئی گنا بڑا ہے۔ یہاں کے دریا بھی کافی بڑے ہیں اور ریگستانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا سمندر ہرگند (بحر ہند) ہے۔ (سلیمان کے بعد دوسرے عرب سیاحوں نے بھی بحر ہند کو ہرگند[1] لکھا ہے۔ اصل میں ہرگند سمندر کے اس حصہ کو کہتے تھے جو جنوبی ہند کے کناروں سے ہٹا تھا۔)

اہلِ ہند کے لباس کے بارے میں سلیمان لکھتا ہے کہ یہ لوگ دھوتی پہنتے ہیں۔ یہ ایک موٹا دھاری دار معمولی قسم کا کپڑا ہوتا ہے جس کو کمر سے باندھ لیا جاتا ہے۔ یہاں کی عورتیں اور مرد دونوں زیور پہنتے ہیں اور سونے جواہرات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ہر صبح کو کھانے سے قبل غسل کرتے ہیں۔ جب مرد عبادت کرتے ہیں یا کوئی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں تو اپنی عورتوں سے علٰحدہ رہتے ہیں بلکہ ان کو دروازے کے باہر رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی غذا کے متعلق سلیمان نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستان والے چاول کثرت سے کھاتے ہیں اور روٹی کا استعمال کم کرتے ہیں۔ گوشت بھی کھاتے ہیں لیکن جانوروں کو مسلمانوں کے طرز سے ذبح نہیں کرتے بلکہ ان کے سر پر اتنی زور سے ضرب لگاتے ہیں کہ وہ مرجاتا ہے۔

یہ لوگ شراب کو برا سمجھتے ہیں بلکہ سرکہ سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی بادشاہ شراب پیتا ہے تو اس کی بادشاہت نہیں رہتی کیوں کہ شراب پینے کے بعد وہ جنگ وجدال نہیں کر سکتا اور دوسرے امور سلطنت کو بھی بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

ہندوستانی شادیوں کے متعلق اس کی رائے ہے کہ یہ لوگ بالکل چینی طرز پر شادی کی رسوم انجام دیتے ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں نے اس طرز کو چینیوں سے لیا ہے یا چینیوں نے ہندوستانیوں سے شادی کے موقع پر ایک دوسرے کو بڑے بڑے تحفے دیتے ہیں اور بڑے بڑے ڈھول بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ مرد بہ یک وقت جتنی بھی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔

سلیمان نے سراندیپ کے راجہ کی وفات پر جو رسوم ادا کی گئیں ان کا چشم دید حال تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ کے جسم کو ایک نیچی گاڑی پر رکھ دیا گیا اس طرح کہ سر گاڑی کے نیچے لٹک رہا تھا اور بال زمین کو چھو رہے تھے۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے اس جنازے کے ساتھ تھی جو جنازہ پر سے گرد جھاڑتی چلتی تھی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی: "اے لوگو دیکھو یہ شخص کل تمہارا بادشاہ تھا۔ یہ تم پر حکومت کرتا تھا۔ تم اس کا کہنا مانتے تھے لیکن آج اس نے اس دنیا کو چھوڑ دیا۔ موت کے فرشتہ نے اس کی روح نکال لی۔ تم ایسی زندگی کے فریب میں نہ آنا۔" اس کی تقریر کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ اس کے بعد اس بادشاہ کے جسم کو صندل اور کافور ڈال کے جلا دیا گیا۔ پھر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ تقریباً سارے ہندوستان میں مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔ اکثر راجہ کی لاش کے ساتھ اس کی بیویاں بھی جل جاتی ہیں۔

ہندوستان کے طریقۂ انصاف کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ملزم کی آزمائش مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کسی بڑے جرم کا مرتکب سمجھا جاتا ہے تو اس کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آزمائش دینی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ پر پان کے سات پتے رکھے جاتے ہیں جس پر ایک جلتا ہوا سرخ لوہا رکھا جاتا ہے جس کو وہ ہاتھ میں لیے آگے پیچھے چلتا ہے۔ پھر وہ لوہے کو پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد ملزم کے ہاتھ پر ایک چمڑے کی تھیلی چڑھا دی جاتی ہے اور اسے بند کر کے بادشاہی مہر لگا دی جاتی ہے۔ تین دن کے بعد اس تھیلی کو کھولا جاتا ہے اور ملزم کو دھان کوٹنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اگر اس کے ہاتھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور اس آدمی کو جس نے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بے گناہ ملزم کو اس تکلیف کے عوض جو اسے پہنچی ہے، سونا دے۔

---

[1] ہرگند دریا بحر ہند کے لیے پہلی بار سلیمان نے استعمال کیا تھا۔ ہرگند ہندی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ سلیمان نے اپنے سفرنامے میں ہرگند اسی طرح تحریر کیا ہے اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ عرب اس وقت حرف "گ" استعمال کرتے تھے۔

سلیمان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان میں چوری کو بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا ہمیشہ موت ہوتی ہے۔ سزائے موت کا طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو ایک لمبی نوک دار لکڑی پر اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ لکڑی اس کے منھ سے نکل آتی ہے اور جب تک دم نہیں توڑ دیتا اس لکڑی کو نہیں نکالا جاتا ہے۔ دوسرا بڑا جرم زنا ہے۔ اگر کوئی مرد کسی غیر عورت سے اس کی مرضی سے ناجائز تعلق کرتا ہے تو دونوں کو قتل کر دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی مرد کسی عورت پر جبر کرتا ہے اور عورت بے گناہ ثابت ہو جاتی ہے تو مرد قتل کر دیا جاتا ہے اور عورت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مجرم کو قید خانے میں قید کیا جاتا ہے تو اس کو سات دن تک نہ کھانا دیا جاتا ہے اور نہ پانی۔

سلیمان نے ہندوستان کے فرقوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں ایک ایسا فرقہ ہے جو جنگلوں اور پہاڑوں پر گھوما کرتا ہے، اس فرقے کے مرد عام لوگوں سے نہیں ملتے۔ ان کو سنیاسی کہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ننگے رہتے ہیں اور گھنٹوں سورج کے سامنے منھ کر کے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں اکثر شیر کی کھال ڈالے رہتے ہیں۔ ایک سنیاسی کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ ایک سنیاسی ایک مقام پر سورج کی طرف منھ کیے بیٹھا تھا۔ جب سولہ (١٦) سال کے بعد میں (سلیمان) وہاں واپس آیا تو وہ سنیاسی اسی جگہ پر بیٹھا تھا جہاں آج سے سولہ سال قبل میں نے اسے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر سلیمان کو بہت تعجب ہوا۔

سلیمان نے ایک جگہ ہندوستان کے ایک راجہ بلہرا کے بارے میں لکھا ہے کہ بلہرا ہندوستان کے تمام شہزادوں میں ایک بلند اور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ ہر شخص اس کی فضیلت اور بزرگی کا معترف ہے۔ ہندوستان کے دوسرے خود مختار حکمراں بھی بلہرا کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے دربار میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جب بلہرا اپنا کوئی نمائندہ کسی راجہ کے پاس بھیجتا ہے تو وہ اس کی بڑی عزت کرتا ہے۔ بلہرا بہت سی باتوں میں عرب کے خلیفہ کی تقلید کرتا ہے مثلاً جس طرح خلیفۂ بغداد اپنی فوج کے افراد کو ماہانہ زر نقد عطا کرتا ہے اسی طرح بلہرا بھی فوجیوں کو تنخواہ دیتا ہے۔ اس کے پاس بھی بہت سے ہاتھی گھوڑے اور دولت ہے۔ یہاں پر تاتاری درہم کا رواج ہے۔ ان سکوں پر راجہ کی تخت نشینی کی تاریخ پڑی رہتی ہے۔ برخلاف اس کے عرب کے سکوں پر سن ہجری پڑا ہوتا ہے۔ بلہرا اور اس کی رعایا اہل عرب سے بہت محبت کرتے ہیں اور عرب والے بھی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بلہرا کی حکومت سمندر کے کنارے کوم کام (کوں کان) سے لے کر چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ بلہرا کا سب سے بڑا دشمن جزر کا راجہ ہے (خرداذبہ نے اس راجہ کا نام جرز لکھا ہے۔) اس راجہ کے پاس بہت بڑی فوج ہے۔ یہ راجہ عرب کے خلیفہ کو اپنا دوست تسلیم نہیں کرتا لیکن اس کی بزرگی کا قائل ہے۔ اس راجہ کو اپنی دولت اور طاقت پر گھمنڈ ہے۔ اس کے پاس گھوڑے اور ہاتھی لاتعداد ہیں۔ اس کی ریاست سے ملحق ایک چھوٹی حکومت ہے جس کا نام طافی ہے۔ یہاں کی عورتیں ہندوستان میں سب سے زیادہ گوری اور خوب صورت سمجھی جاتی ہیں۔ اس حکومت کا راجہ اپنے پڑوسیوں کو دوست رکھتا ہے کیوں کہ اس کے پاس فوج بہت کم ہے۔ عربوں کے بارے میں اس کا عقیدہ وہی ہے جو راجہ بلہرا کا ہے۔ اس ریاست سے ملی ہوئی دوسری ریاست رہمی کی ہے۔ اس کے راجہ کے پاس کافی فوج ہے جب یہ جنگ کے لیے جاتا ہے تو تقریباً ۵۰ ہاتھی اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس کی فوج کا سارا دار و مدار ہاتھیوں پر ہوتا ہے اس لیے یہ صرف جاڑوں میں جنگ کے لیے نکلتا ہے۔ اس ریاست میں کپڑا نہایت عمدہ اور مہین قسم کا بُنا جاتا ہے۔ کپڑے کا ایک تھان انگوٹھی میں انگ کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے راجہ خود مختار ہیں اور اپنی حدود میں بالکل آزاد ہیں۔ جب کوئی راجہ کسی دوسرے راجہ پر فتح یاب ہوتا ہے تو اس علاقے پر حکومت کرنے کے لیے اسی راجہ کے خاندان میں سے کسی آدمی کو گورنر مقرر کر دیا جاتا ہے اور یہ گورنر فاتح راجہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنا کوئی آدمی وہاں مقرر نہ کرے تو مفتوح علاقے کے رہنے والے اس کا حکم نہیں مانتے۔ یہاں فوج میں لاتعداد سپاہی ہوتے ہیں جن کو راجہ سے تنخواہ نہیں ملتی (بجز بلہرا کے) اور جب یہ لوگ جنگ کرنے جاتے ہیں تو اپنے کل اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔

سلیمان التاجر کے ۲۰ سال کے بعد سنہ ٢٦٣ھ مطابق ٨٧٦ء میں ابوزید حسن سیرافی نے اس کے سفرنامے کا تکملہ کیا۔ یہ عرب سیاح خلیج فارس کی

مشہور بندرگاہ سیراف کا رہنے والا تھا اور سیراف، ہندوستان اور چین کے درمیان تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ ابوزید تقریباً ۸۷۵ء میں ہندوستان آیا تھا اور مندرجہ ذیل مقامات کو اس نے دیکھا تھا۔ ۱۔ جادہ (یہاں کا راجہ مہراج کہلاتا تھا۔) ۲۔ قمار (راس کماری) ۳۔ جنوبی ہند کے مختلف حصے۔ ۴۔ ملتان۔ (یہاں پر ایک لکڑی کا بت تھا جس کے جسم پر سرخ سرخ کھال لپٹی تھی۔ اس کی دو آنکھوں کی جگہ دو لال تھے اور سر پر سونے کا تاج تھا)۔

ابوزید ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں کچھ بادشاہ ایسے ہیں جو تخت پر بیٹھنے سے پہلے کچھ رسوم ادا کرتے ہیں۔ مثلاً جس وقت کوئی نیا بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو اس خوشی میں چاول پکائے جاتے ہیں اور کیلے کے پتوں میں رکھ کر تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بادشاہ تین چار سو آدمیوں کو مدعو کرتا ہے۔ اس کے جو خاص خاص ساتھی ہوتے ہیں وہ بادشاہ کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ پہلے خود کچھ پکے ہوئے چاول کھاتا ہے پھر باقی چاول دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ جو لوگ یہ پکے ہوئے چاول کھاتے ہیں ان کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ فوت ہو جائے تو یہ تمام لوگ اس بادشاہ کی چتا میں جل کر جان دیں۔ جب کوئی شخص آگ میں جلنے کی خواہش کرتا ہے تو اسے بادشاہی دربار سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مقام پر جاتا ہے جہاں لکڑی کا ڈھیر لگا ہوتا ہے اس کے تمام عزیز و اقارب اس مقام پر موجود ہوتے ہیں کبھی کبھی یہ عزیز و اقارب اس جلنے والے آدمی کے سر کے اوپر ایک ایسا تاج بنا کر رکھ دیتے ہیں جس میں جلتے ہوئے کوئلے ہوتے ہیں۔ ان جلتے ہوئے کوئلوں پر صندل چھڑکتے ہیں اور جب یہ خوب تیز دہکنے لگتے ہیں تو وہ آدمی ادھر اُدھر گھومنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا سر جلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور اس کی کسی بھی حرکت سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف ہے۔ پھر وہ بہت اطمینان کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں پھاند پڑتا ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ ابوزید نے اپنے سفرنامہ میں یہ بھی درج کیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جلنے والا آگ کے پاس پہنچ کر ایک چاقو سے اپنا پیٹ اس طرح پھاڑتا ہے کہ سینہ تک چاک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے اپنے جگر کو نکال لیتا ہے اور پھر آگ میں پھاند پڑتا ہے۔

ابوزید پہلا عرب سیاح تھا جس نے ہندوستان کے شاعروں کی طرف توجہ کی۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کے شاعر بادشاہوں کی شان میں اشعار کہا کرتے ہیں اور ان کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ علمی مجالس بھی ہوا کرتی ہیں۔ ان مجلسوں کی بدولت لوگوں کو پیغمبروں کی زندگی کے حالات اور مذہبی قوانین معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے مندروں اور بتوں کا ذکر کرتے ہوئے ابوزید نے لکھا ہے کہ ہندوستان والے مندروں پر بڑی رقم خرچ کرتے ہیں۔ ملتان میں ایک بہت مشہور بت ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ مہینوں کا سفر طے کر کے آتے ہیں۔ ان بت خانوں میں کچھ مخصوص قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی ماؤں کے جب اولاد نہیں ہوتی تو اس بت کے سامنے آ کر یہ منت مانتی ہیں کہ اگر ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ اس کو بت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ پھر اگر ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ بت کی پجارن بنا دی جاتی ہے۔

ہندوستان کے لوگ اپنی نجات کے لیے فلاح عامہ کے کئی کام کرتے ہیں۔ مثلاً وہ راستوں پر سرائے بنواتے ہیں تاکہ مسافروں کو آرام ملے۔ وہاں پر ہر قسم کے سامان کی دکانیں ہوتی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے اپنی ضروریات زندگی فراہم کر سکیں۔

ہندوستان کے بادشاہوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ بڑی شان و شوکت سے رہتے ہیں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں پہنتے ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے خزانوں میں قیمتی موتیوں کا انبار ہوتا ہے اور یہی ان کی دولت سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر بادشاہ اپنی عورتوں کو پردہ نہیں کراتے۔ ان کے دربار میں ہر شخص کو خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان بادشاہوں کی بیویوں کے سامنے آنے کی اجازت ہے۔ درباری اور فوجی افسر بھی موتی پہنتے ہیں۔ سردار لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر چلتا ہے۔ لوگ اس کے سر پر مور کے پروں کی بنی ہوئی چھتری لگائے رہتے ہیں تاکہ دھوپ نہ لگے۔

ہندوستان کے لوگ مرنے کے بعد آواگون پر بہت عقیدہ رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک راجہ چیچک کی بیماری میں مبتلا ہوا۔ جب اچھے ہونے کے بعد اس نے اپنا چہرا آئینہ میں دیکھا تو اس کو بڑا رنج ہوا۔ اس نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اس دنیا میں کوئی شخص میری جیسی بری شکل لے کر زندہ رہنا پسند نہ کرے گا۔ بہتر یہ ہوتا کہ مری روح میرے اس بدشکل جسم سے نکل کر کسی اور جسم میں پہنچ جاتی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک جلاد کو بلا کر اپنا سر کاٹنے کا حکم دیا۔ جلاد نے اس کا سر کاٹ دیا۔ پھر اس کو جلا دیا گیا۔ اس وقت ہر شخص کو یقین تھا کہ اس راجہ کی روح ضرور کسی خوب صورت جسم میں داخل ہو گئی ہوگی۔

ہندوستان کے موسموں سے بحث کرتے ہوئے ابوزید نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستان میں بارش کا موسم جس کو برسات کا زمانہ کہتے ہیں گرمیوں کے بعد تین ماہ تک رہتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں دن رات پانی برسا کرتا ہے۔ جاڑوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ برسات آنے سے پہلے یہاں کے لوگ لکڑی کے مکان بنا لیتے ہیں اور جب برسات شروع ہوتی ہے تو ان مکانوں کو بند کر کے ان کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر یہ اپنے مکان سے باہر نہیں نکلتے جب تک کہ بہت سخت ضرورت پیش نہ آئے۔ کاریگر اپنے گھروں میں کام کرتے ہیں۔

تیسرا جہاز راں سیاح بزرگ بن شہریار (سنہ ۳۰۰ھ) تھا جو عراق سے ہندوستان کے سواحل ہوتا ہوا چین تک اپنے جہاز لے جایا کرتا تھا۔ اس جہاز راں نے ہندوستان کے کچھ علاقوں کو تو خود دیکھا اور کچھ مقامات کے بارے میں دوسرے جہاز رانوں سے معلومات حاصل کر کے ایک کتاب عجائب الہند لکھی۔ اس کتاب میں کشمیر زیریں (پنجاب)، جنوبی ہند اور گجرات کے مختلف مقامات اور واقعات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بزرگ بن شہریار کی کتاب فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۶ء میں لیڈن میں چھپی۔

چوتھا مشہور عرب سیاح، جغرافیہ نویس اور مورخ ابوالحسن المسعودی تھا۔ اس کا زمانہ دسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ اس نے اپنی عمر کے پچیس سال سیر و سیاحت میں گذارے۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز اپنے وطن بغداد سے سنہ ۳۰۰ھ (مطابق ۹۱۲ء) میں کیا۔ عراق، شام، ارمینیا، روم (ایشیائے کوچک)، افریقہ، سوڈان، چین، تبت، ہندوستان اور لنکا کی سیاحت کی۔ اس وقت المسعودی کی دو کتابیں کتاب التنبیہ والاشراق اور مروج الذہب و معادن الجوہر موجود ہیں جن کی مدد سے ہم اس کی زندگی کے حالات اور اس کے قلم بند کیے ہوئے اس کے سفر کے حالات معلوم کر سکتے ہیں۔

المسعودی لکھتا ہے کہ ہندوستان زمین کا وہ حصہ ہے جہاں عقل مندی اور انصاف ایک عرصۂ دراز سے رائج ہے۔ ہندوستان کے لوگ ایک بادشاہ برہما کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ اس نے تین سو چھیاسٹھ (۳۶۶) سال تک حکومت کی۔ اسی قوم کے لوگ ہمارے زمانے (المسعودی کے آنے کے وقت) تک موجود ہیں جن کو برہمن کہتے ہیں۔ اس قوم کے مرد اور عورتیں زرد رنگ کا ایک تاگا اپنے گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔

المسعودی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج کل جہازوں کی کمپنیوں اور جہازوں کے نام الگ الگ ہوتے ہیں اسی طرح جہازوں کے مالکوں کی نسبت سے اس زمانے میں ہندوستان میں جہازوں کے نام بھی رکھے جاتے تھے۔ یہ نام صرف انھیں جہازوں کے رکھے جاتے تھے جو بحر ہند میں آتے جاتے تھے۔

ہندوستان کی زبانوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہاں پر بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں اور یہاں مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اپنے عقائد میں بڑے کٹر ہیں۔ ایک مقام پر لکھتا ہے کہ ہند کی زبان سندھ کی زبان سے مختلف ہے۔ بالجر کے رہنے والے (جو کہ بلہرا کی ریاست میں ہے) کیریا کیمر میں (جو دریائے جمنا کے علاقہ کی زبان کہا جاتا ہے)۔ تھانہ، سوپارا اور تھانہ کے علاقہ میں لاریہ زبان بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہت موروثی ہوتی ہے۔ اسی طرح وزارت بھی موروثی سمجھی جاتی ہے اور قاضی کا عہدہ بھی موروثی ہوتا ہے۔ چالیس سال کی عمر سے کم کا فرد شاہی تخت پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔

المسعودی نے ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بادشاہ

نے شطرنج ایجاد کی تھی یہ بادشاہ سلطنت کے امیروں کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ شطرنج کے مختلف مہروں کی شکلیں حیوانوں اور انسانوں جیسی بنائی گئی تھیں۔ اسلامی ممالک میں شطرنج اور چوسر کے کھیلوں کا جو رواج ہوا ہے وہ یا تو ہندوستان کے ذریعہ یا پھر فارس کے ذریعہ پھیلا۔ (عہد عباسی کے شعرا نے اس شطرنج کے متعلق بہت سی نظمیں اور قصیدے کہے ہیں۔)

ہندوستان کی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے المسعودی لکھتا ہے کہ یہاں کی قوموں میں برہمنوں کا درجہ سب سے بلند ہوتا ہے۔ ہر ہندوستانی ان کی عزت کرتا ہے۔ یہ لوگ کسی بھی جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ یہ لوگ زیادہ تر مذہبی کام انجام دیتے ہیں۔

ہندوستان کی وسعت بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ خراسان سے سندھ اور تبت تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر مختلف بادشاہوں کی حکومت ہے اور مختلف حکومتوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور مختلف مذہب پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہر ہندوستانی کا یہ اعتقاد ہے کہ انسان کی روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے جس کو آواگون کہتے ہیں۔ ہندوؤں کو اپنی ذہانت، فلسفہ اور رنگ کے صاف ہونے پر ناز ہوتا ہے۔

المسعودی کے بعد دوسرے عرب سیاح جو ہندوستان آئے یا مختلف ذریعوں سے یہاں کے متعلق معلومات حاصل کیں ان کے نام یہ ہیں۔ ابوالفرج (۹۰۰ء)، اصطخری (۹۵۰ء)، ابن حوقل (۹۷۵ء)، مقدسی (۹۸۵ء)، البیرونی (۱۰۳۰ء)، ادریسی (۱۱۵۰ء)، یاقوت (۱۱۷۹-۱۲۲۹ء)، قزوینی (۱۲۰۳-۱۲۷۳ء)، دمشقی (۱۳۲۵ء)، ابوالفدا (۱۲۷۳-۱۳۳۱ء)، ابن بطوطہ (۱۳۵۵ء)۔ ان عربوں کے بیانات ہندوستان کے بارے میں قریب قریب وہی ہیں جو سلیمان، ابوزید اور مسعودی کے ہیں۔

●●

مشرقی کتابخانے

- کتب خانہ جامع القیروین
  - میمن عبدالعزیز
- قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے
  - پیر حسام الدین راشدی
- حرمین کے کتب خانے
  - نور احمد فریدی

مشرقی کتاب خانوں پر خدا بخش جرنل میں وقتاً فوقتاً وہ مواد یکجا پیش کیا جاتا رہے گا، جو اب تک بکھرا ہوا ہے۔

پیش نظر مقالوں میں 'کتاب خانہ جامع القرویین' معارف جولائی ۱۹۲۴ء سے اور 'قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے'، 'حرمین کے کتب خانے' الزبیر، کتب خانہ نمبر ۱۹۶۷ء سے لیا گیا ہے۔

اس کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔

—ادارہ

میمن عبدالعزیز صاحب
پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور

کتب خانہ جامع القرویین (فاس)

پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہمارے مکرم جناب محمد شفیع صاحب ایم اے کے شغفِ علمی کی رہینِ منت ہے، کہ اب یہ مطبوعات کے لحاظ سے ہندوستان کی بڑی سے بڑی لائبریریون سے کسی طرح پیچھے نہ رہی، اے کاش ان غیر معمولی مقدار کی جرمن و فرنچ مطبوعات کی جگہ عربی کتابین ہوتیں کہ اس کے مستفید ین بہ نسبت اون کے کہیں زیادہ ہیں، ان دنوں دو فہرستیں منگائی گئی ہین برنامج جامع القرویین اور برنامج رباط الفتح۔ اوّل بسبب عربی ہونے کے زیادہ مفید ہوسکتی ہے، اپنے ملک کو چونکہ بلادِ مغرب کے متعلقہ معارف سے عاری پاتا ہون اس لیے ان مختصر سطور کو حوالۂ قلم کرنے کی جرأت کرتا ہون،

یہ جامع مسجد یا یونیورسٹی[1] جس مین صرف چند سال پیشتر (۲۰۰۰) طلبہ، (۵۰۰) مدرس اور (۲۷) ہزار سے زیادہ کتابین تھین اور اب بھی وہ (۵۰۰)[2] طلبہ اور (۱۴۱۲) کتابین اپنے اندر رکھتی ہے، دنیائے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، الجامع الازہر (مصر) جامع الزیتونہ (تونس) جامع بخاری جامع قرطبہ اور المستنصریہ (بغداد) وغیرہ سب اس سے متاخر ہین، اس لیے پہلے پہل یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کیا ہے،

---

[1] معجم العمران ۲، ۱۸، ۳،

[2] مقدمہ برنامج جامع القرویین،

بنائے جامع

حسن اتفاق سے مغرب کی معتبر تاریخ الانیس المطرب القرطاس فے اخبار موک المغرب

ومدینہ فاس لابن ابی زرع جو ۷۲۶ھ تک کے وقائع پر مشتمل ہے اندنون پیش نظر ہے، مصنف نے از

ص ۳۲ تا ص ۵۱ نہایت بسط سے اس کے عہد بعہد کی تاریخ تغیرات و تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے،

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرچشمہ کو بلادِ مغرب کی تعلیم و تلقین، اور تہذیب و تدریب مین کس

قدر دخل ہے، مراکش مین بہت سی جوامع ہین مگر تقدیر کے دست انتخاب نے جو ناموری اسکے

نصیب مین لکھی تھی اوسکا عشر عشیر بھی اور ون کو نہ ملی،

الغرض ابن ابی زرع کی القرطاس سے جو مغربی[1] رسم الخط مین چھپی ہے، بدقت تمام

کچھ حصہ پڑھکر قارئین کے پیش نظر کرتا ہون،

امام[2] ادریس (بانی دولت ادارسہ) کے عہد مین جامع الشرفا مین نمازِ جمعہ ہوا کرتی تھی،

پھر اور ادریسی حکمرانون کے عہد مین بھی یہی معمول رہا، جامع القرویین کی جگہ بالکل میدان تھا اور کچھ

درخت تھے جو ایک شخص کو اپنے والد سے ترکہ مین ملے تھے، جب امام ادریس کے ہان اطراف واکناف

کے وفود آنے لگے تو از انجملہ ایک قیروان کا وفد بھی تھا، جس مین ایک مبارک اور نیک نہاد

خاتون ام القاسم فاطمہ بنت محمد الفہری القیروانی بھی مع اپنے خاوند اور بہن وغیرہ کے تھی، یہ

لوگ جامع مذکور کے قریب فروکش ہوئے اور پھر یہین کے ہو رہے، جب فاطمہ کا خاوند اور اسکی

بہن مرگئی، تو اسکو ورثہ مین بڑی جلیل القدر دولت ملی جو ہر طرح حلال و طیب تھی، فاطمہ نے اسکو

---

[1] یہ ہمارے مشرقی رسم الخط سے بجید مختلف ہوتا ہے اور اپنے اصل یعنی کوفی رسم الخط سے بنایت قریب،

[2] القرطاس مطبوعہ فاس (مراکش) ص ۳۲

وجوہ خیر مین صرف کرنا چاہا، زمین خریدلی اور بروز شنبہ یکم رمضان ۲۴۵ھ مین اسکی بنا رکھی اور نہایت تندہی سے اوسکو تعمیر کرایا، اور یہ کنوان جو جامع مین ہے اسی نے بزمانۂ تعمیر بنوایا تھا، وہ اس طویل مدت مین روزے رکھتی رہی، اور پھر اتمام کے بعد پہلے پہل اسی نے دوگانۂ شکر ادا کیا، اوس وقت اس مین چار صفین اور ایک مختصر سا صحن تھا، اور مغربی اور شرقی دیوارون کے مابین ڈیڑھ سو بالشت کا فاصلہ تھا، (ذکرہ ابو القاسم ابن حسنون نے تفسیر و فی تاریخ مدینۃ فاس، بقول بعض یہ دو بہنین تھین، فاطمہ ام البنین اور مریم دختران محمد الفہری - فاطمہ نے جامع القرنین بنوائی، اور مریم نے جامع اندلس، پھر زناتہ (ایک بربری قبیلہ) نے اپنے عہد حکومت مین اوسکو بہت وسعت دی، جس کے حدود اب بھی نمایان ہین مسجد شرفا مین گنجایش نہ تھی اس لیے ۳۰۷ھ مین جمعہ کی نماز یہین پڑھی جانے لگی، اسکے پہلے خطیب شیخ صالح ابو محمد عبد اللہ بن علے الفارسی تھے، الخ

اس اقتباس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ قرومین منسوب بہ قیروان ہے جیسا کہ ہم اپنے مضمون المعز اور ابن رشیق مین بھی اس سے پہلے لکھ چکے ہین،

اہل مراکش، ان کے شیوخ، علما، و صلحا، اپنے شغف علمی اور حفظ و ذکا کے لیے بلاد مغرب مین غیر معمولی شہرت رکھتے ہین، شیخ عبد الحی الکتانی شیخ الطریقۃ الکتانیہ نے جو فرانسیسی حمایت سے پہلے بھی جامع مذکور کے شیوخ اور ملک کے نامور علما مین شمار ہوتے تھے، بہت تلاش و جستجو کے بعد اس کتبخانہ کی فہرست مرتب کی ہے، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب تک ہمارے علما کو یہ اجنبی غاصب بیدار نہین کرتے وہ باین ہمہ اہلیت کام سے جی چراتے ہین، اور زاویۂ خمول سے نہین نکلتے، تعجب ہے کہ حقیقی محنت تو وہ کرین اور نام ہو الفرڈبل سند و بہ معارف (امانیڈ محکمہ تعلقات) کا

؎ بروایت تماحب ... ۲۴۵ھ مین ہوئی، ممکن ہے یہ سال اتمام ہو اور وہ سال آغاز،

اذا انشد بشار[1] فقل ۶ ف حماد

مراکش پر ہرچند سنۃ اللہ کے مطابق کئی حکومتون کا دور دورہ رہا، مگر چونکہ سب اسلام کا دم بھرتی تھین اس لیے کسی نہ کسی شکل مین یہ کتبخانہ بھی باقی رہا، بلکہ اکثر بادشاہون کے عہد مین اس مین معقول اضافہ بھی ہوا، مثلاً سلطان ابوالعباس منصور بن احمد الذہبی السعدی اور سلطان ابو عبداللہ سیدی محمد (موجودہ شریفی حکومت کے اسلاف مین سے) کے زمانہ مین، مگر چونکہ بہت سے زمانون مین اس کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا اس لیے جو علما و طلبہ کتابین مستعار لیجاتے تھے وہ بہت کم واپس کرتے، نیز حفاظت اور جلد بندی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اس لیے بہت سی کتابین دیمکون کی نذر ہوگئین، چنانچہ اسکی پرانی فہرست اس مدعا کی شاہد ہے: کیا اس سے بھی بڑھکر کوئی ابتری ہو سکتی ہے کہ منتظم کتبخانہ کا مشاہرہ نصف ڈالر (۸؍) ماہوار تھا، مگر پچھلے زمانون مین یہ حالت نہ تھی، ابن فرحون ابوالعباس احمد بن الصقر الخزرجی کے حالات کے ضمن مین لکھتا ہے،

وتولی احکام مراکش والصلوٰۃ	وہ کچھ دنون مراکش کے قاضی اور اسکی مسجد کے امام رہے
بمسجد ھا مدۃ ثم احکام بلنسیۃ	پھر بلنسیہ کے قاضی بنے، مگر جب ابو یعقوب عبدالمومن
فکان بھا قاضیا۔ ولما صار الامر	کا عہدِ حکومت آیا تو انکو کتبخانہ عالیہ کی خدمت سپرد کی
الی ابی یعقوب عبدالمؤمن الزمہ	جو ان کے ہان بڑے سے بڑے مناصب مین شمار ہوتی
خدمۃ الخزانۃ العالیۃ وکانت	تھی اور جس کے لیے بہترین فضلا اور ماہرین چنے
عندھم من الخطط الجلیلۃ التی	جاتے تھے، " " " " " "
لا یتین بھا الا علیۃ اھل العلم واکابرھم، " " " " " " " " " " "	

[1] جب تمہین بشار اپنا سخن سنا تو کہو نہ ہے حماد! یکر بشار حماد کے خیالات چرا کر باندھتا ہی، الدیباج المذہب ق۶۹ ا

گویا یہ منصب ایک جج کی منتہائے ترقی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کتبخانون کتابون سے لبالب ہونگا منحم العمران[1] مین لفظ مراکش کے ضمن مین لکھا ہے کہ، مکتبۃ السلطان مین ایکہزار قلمی کتابین ہین جو مولائی حسن (موجودہ دولت شریفیہ کے ایک سلطان) نے قرطبہ و غرناطہ کے کتبخانون سے نقل کرائی تھین،

اب بھی اس شکست وریخت کے باوجود یہان ایک بڑی مقدار مین دہ دہ نوادر خطیات پائی جاتی ہین کہ شاید ہی کہین اور ہون، نیز علما کے خطوط، بادشاہون کے طغرا وغیرہ، قدیم سے قدیم تحریر چوتھی صدی کی ہے، پانچوین اور چھٹی صدی کی تحریرین تو بہت زیادہ ہین، مثلاً صحیح النبی کی ایک جلد ہے جسپر الطاہر بن مفوز کے ہاتھ کا اجازہ سنہ ۴۸۱ھ کا لکھا ہوا ہے، صحیح مسلم کا ایک نسخہ ہے جو ایک ہی جلد مین ہے اور جو ایک زبردست ادیب کا نقل کیا ہوا ہے، اور جسکی سنہ ۵۷۵ھ مین ابو بکر ابن الخیر الاندلسی نے تصحیح کی ہے، تفسیر ابن ابی منین کا نسخہ سنہ ۵۹۵ھ مین خود مصنف کے سامنے پڑھا گیا ہے، اب مین اپنے استقرائے ناقص کی بنا پر اس کتبخانہ کی بعض اہم اور نایاب کتابونکی مختصر سی فہرست دیتا ہون،

تفسیر

جامع احکام القرآن ابو عبداللہ القرطبی متوفی سنہ ۶۷۱ھ یہ تفسیر ۸ جلدون مین ہے،

البحر المحیط لابی حیان (چھپ گئی ہے) اس کے آٹھ قلمی نسخے ہین،

قانون التاویل لابی بکر بن العربی المالکی

تفسیر الماوردی

قرأت

الوقف والابتدا لابو بکر بن الانباری،

---

[1] ۱۳۱۶ء ۲

حدیث

شرح البخاری لابن بطال،

" " للمہلب (؟)

القبس شرح موطأ مالک بن انس } قاضی ابوبکر بن العربی،
المسالک شرح موطأ مالک

محاذی[1] موطا مالک (یعنی موطا مہدی ابن تومرت بانی دولت موحدیہ) پوری لکھا کار ہے۔

الاحکام الصغری والکبری عبدالحق الاشبیلی

مسند عبد بن حُمید،

کتاب الزہد والرقائق لعبداللہ بن المبارک ہے مکتوبہ ٥٦٢ھ اسکی اہمیت بالکل ظاہر ہے،

البدایۃ والنہایۃ[2] (مشہور محدثانہ اور نادر تاریخ) لابن کثیر

کتاب الوہم والایہام لابن القطان۔

الاکمال للامیر ابن ماکولا؛ } صاحب برنامج نے انکو بذیل حدیث شاید اس لیے کہ انکے مصنفین محدث تھے درج کردیا ہے
تاریخ ابن ابی خیثمۃ متوفی ٢٧٩ھ
جمہرۃ نسب قریش للمصعب الزبیری

نحو

شرح جُمل الزجاجی،

الافصاح شرح ایضاح ابی علی الفسوی،

الافعال لابن القطاع قدیم نسخہ، رامپور مین بھی اسکا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہے،

[1] معارف:- یہ کتاب چھپ گئی ہو، اور کتبخانہ دارالمصنفین مین پیرس سے خرید کرائی ہے۔ [2] معارف: نہایت کمیاب ہے

مشکل اعراب اشعار الستة لابن خروف النحوی الحضرمی - اسکا ایک نسخہ مکتبۂ رباط الفتح مین بھی ہے،

المقنع لابن عصفور،

الاسئلة لابن السید البطلیوسی جس سے سیوطی نے اشباہ ونظائر نحویہ مین بہت کچھ لیا ہے،

لُغت

مختصر العین، امام زبیدی کی مشہور روزگار قاموس،

دیوان الادب، فارابی جو جوہری صاحب صحاح کے ماموں ہین،

تکملۃ القاموس، سید مرتضیٰ بلگرامی خود انکے اپنے خط کا نسخہ،

کتاب الفرق فی اللغۃ، جاحظ

کتاب الالفاظ المغربة بالالقاب المعربة، ابن قتیبہ

تاریخ

رحلۃ البلوی سنہ اتمام ۸۱۹ھ ہے۔

ادب

خریدۃ القصر عماد اصفہانی، قسطنطنیہ مین بھی ہے،

شرح مقصورۃ حازم للغرناطی،

شرح دیوان المتنبی للافلیلی جو اسکی بہترین شرح ہے مکتبۂ الرباط مین بھی اسکا ایک نسخہ ہے،

الفصوص لصاعد اللغوی، یہ بے حد نادر اور جلیل القدر تصنیف ہے۔

طب

الاستقصاء والابرام فی علاج الجراحات للامام محمد بن فرج القہری (سرجری) جراحی کی نادر تصنیف

الفرڈبیل کے پہنچنے سے پہلے دو سال سے یہ کتبخانہ بند تھا، اسنے حکومت کو اطلاع کیا جسپر دولت حسنیہ کی طرف سے ایک باقاعدہ ضابطہ مرتب کیا گیا جو علاوہ اس کتبخانہ کے کتبخانہ جامع الصیف اور کتبخانہ فاس جدیدہ پر بھی مشتمل تھا، اس ضابطہ مین حسب ذیل دفعات ہین بغیر خاص اطمینان کے کتابین مستعار نہ دیجائین، کتابون کی باقاعدہ تین طرح کی فہرستین مرتب کی جائین جو کتابین باہر مستعار جاچکی ہین وہ واپس منگوائی جائین یا انکی نقل یا قیمت حاصل کیجائے ہر ہفتہ کے دوشنبہ اور پنجشنبہ کو سابق الذکر کتبخانہ اور ہر ہفتہ مین ایک بار باقی دونون کتبخانے عام مسلمانون کے فائدہ کے لیے کھولے جائین، وغیرہ وغیرہ قرائن بتارہے ہین کہ ایک عرصہ تک مراکش کے کتبخانے بھی دوسرے متمدن ملکون کے کتبخانون کی طرح ایک باقاعدہ نظام کے ماتحت آرہے ہین، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی کتبخانون کے مالکون کو اب تک یہ فکر نہین کہ اپنے کتبخانون کو انکا جزو بناوین تاکہ پبلک کو پورا استفادہ ہو،

واللہ ولی ذلک

پیر حسام الدین راشدی

قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے

میں چند روز پیشتر بھی قاہرہ کے اس عظیم الشان عجائب گھر کو دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس موقع پر میرے ساتھ پاکستان کا صحافتی وفد بھی ساتھ تھا۔ یہ قوم تو جانی پہچانی ہے۔ لکھتے لکھاتے تو یہ لوگ رات دن ہیں لیکن کتاب جس چیز کا نام ہوتا ہے وہ نہ کبھی پڑھتے ہیں۔ اور شاید نہ وہ اس لذت سے آشنا ہیں۔ چنانچہ جب ہم پندرہ بیس آدمی سب ایک ساتھ اُن کمروں میں پہنچے تو ایک ہڑ بونگ مچ گیا۔ اچھی طرح دیکھنا اور ان میں دلچسپی لینا تو خیر دور کی بات تھی ان کے منہ میں فقط کتابوں کی میناکاری اور ان پر سونے چاندی کا کیا ہوا کام دیکھ کر پانی بھر آیا۔ یہ دیکھا وہ دیکھا۔ ادھر بھاگے، اُدھر بھاگے۔ الغرض ایک ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی ضائع کر کے چلے آئے۔ بعض حضرات نے غیر معمولی دلچسپی دکھانے اور اپنا شغف ظاہر کرنے کے لیے ساتھ میں کاغذ اور پنسل بھی لیا تھا کہ کچھ نوٹ کریں۔ اور ان کی تاریخی اہمیت لکھیں۔ لیکن جب کتابوں کے نام اور ان کے ہجے دیکھے۔ تو غالباً نوٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور پھر کسی نے کچھ نہ لکھا۔

میں چند دن کے بعد تنہا گیا تاکہ ایک دفعہ اچھی طرح اس بیش بہا ذخیرہ کو دیکھ لوں۔ چنانچہ دروازہ پر رکھی ہوئی کتاب میں اپنا نام اور پتہ درج کیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پہلے تو جا کر دارالکتب کی شائع کردہ کتابیں خریدیں۔ اس کے بعد اطمینان کے ساتھ میوزیم میں پہنچ کر ایک ایک کتاب دیکھنی شروع کی۔ شیشہ کی بہت سی الماریاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خطاطی کے نمونے اور وصلیاں آویزاں تھیں۔ تصاویر بھی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔

میرے سامنے سینکڑوں نوادر کھلے ہوئے رکھے تھے۔ بعض کتابوں کے نوٹ لیے۔ اور پہلے تو بنگاہ غائر دیکھنا شروع کیا لیکن جب دیکھا کہ شاید وقت گزر جائے اور میں ایک بھی کمرہ ختم نہ کر سکوں گا۔ تو پھر میں نے سرسری جائزہ لینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ خاص خاص کتابوں کی فہرست بھی مرتب کرتا گیا۔ اس سرسری مطالعہ میں بھی میرے پانچ گھنٹہ صرف ہوئے اور جب میں نیچے اُترا تو اس وقت شام ہو چکی تھی کتب خانہ بند ہو رہا تھا۔ اور کلرک، کارندے اور افسر اپنا اپنا کام سمیٹ کر تھکے ہارے نیچے اتر رہے تھے۔

اس وقت جو میں نے فہرست مرتب کی تھی اس کو یہاں پیش کر رہا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو بھی اس میوزیم کے نوادرات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے۔

مصحف:

(۱) بخط ابی سعید الحسن البصری (کتابت ۷۷ھ)، (۲) فوٹو گراف کاپی مصحف سیدنا عثمانؓ (یہ بہت چھوٹی تقطیع کی حمائل کے دو صفحے تھے)، (۳) بخط احمد بن الاسکاف الوراق (کتابت رمضان ۳۴۰ھ) (۴) بخط امام جعفر صادق المتوفی ۱۴۸ھ، (۵) بخط علاء الدین محمد الحسینی (کتابت ۱۱۴۰ھ)، (۶) بخط قاری۔ نسخہ فارسی (کتابت ۱۲۶۷ھ) (۷) بخط محمد بن محمد بن جعفر۔ نسخہ فارسی۔ سلطان فتح علی شاہ (قاچار کی فرمائش پر لکھا) ۱۲۲۲ھ

بعض کلام مجید مطلاء اور مذہب کلاں اور خورد تقطیع کے نہایت ہی خوش خط بڑے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں جنکی کتابت کے سال یہ ہیں ۷۰۴ھ، ۸۱۴ھ، ۸۸۵ھ ایک کلام پاک ارغون شاہ کی ملکیت کا بے انتہا دیدہ زیب رکھا ہوا تھا۔ ارغون شاہ کا انتقال ۷۵۰ھ میں ہوا ہے۔ بعض کی کتابت حسب ذیل سنین میں ہوئی تھی۔

۷۱۳ـ ۸۷۳ـ ۵۶۰ـ ۹۱۲ـ ۹۴۴ـ ۹۵۷ـ ۹۶۹ـ ۸۴۵ـ ۹۶۴ـ ۸۷۶ھ،

لاہور کے ایک مشہور خطاط حافظ روح اللہ کے لکھے ہوئے دو تین کلام مجید بھی موجود تھے بعض کی تقطیع بڑے سائز اور ایک کی بیبی تقطیع تھی۔ حافظ کا پورا نام یوں لکھا ہوا تھا۔ حافظ روح اللہ بن حافظ محمد حسین لاہوری!

بعض کا خط موٹا اور بعض کا باریک لیکن اتنا دلکش اور دیدہ زیب تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ کتابت کے سال یہ تھے۔ ۱۱۰۷ـ ۱۱۰۹ـ ۱۱۰۸ھ

ایک کلام مجید۔ بخط قطب الدین ۱۱۹۷ھ بھی اسی شوکیس میں رکھا ہوا ہے جس میں حافظ روح اللہ کے کتابت شدہ کلام مجید رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تمام کلام مجید مختلف سائز اور مختلف قسم کے کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ خط کا حسن اور طلاکاری اور نقش سازی کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس یہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

ترکی سلاطین کے کتبخانوں کے یا خاص ان کے مطالعہ کے کلام مجید بھی بڑی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بعض کے نام یہ ہیں:۔

(۱) مصحف بخط یاقوت ـ ۶۹۰ھ، (۲) مصحف بخط یاقوت ـ ۶۸۹ھ (۳) مصحف بخط یاقوت ـ سنہ لکھا ہوا نہیں، (۴) مصحف بخط الیاس محمد بن الیاس ـ ۷۰۲ھ، (۵) مصحف بخط عبدالرحمن بن

ابی الفتح فرغ ۵۹۹ھ (سلطان سلیم کے لیے لکھا گیا تھا) (۶) مصحف بخط نسخہ فارسی بقلم محمد بن احمد التبریزی ۹۸۸ھ (۷) سورۃ الفتح نسخہ فارسی بقلم شاہ محمود النیشاپوری ۹۶۵ھ (۸) مصحف بخط بہاء الدین محمد بن ابی الفضل لاہجانی کتابت ۱۰۹۷ھ۔

عربی کی کتابیں:-

اسی بڑے کمرہ میں جس میں کلام مجید رکھے ہوئے ہیں بعض شوکیس ایسے بھی ہیں جن کے اندر عربی زبان کی ایسی کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو یا تو مصنف کے اپنے خط میں ہیں یا پھر کسی باکمال کاتب یا مصنف کے ہمعصر کی کتابت شدہ ہیں۔ ہر صدی کے لیے جدا جدا الماری مخصوص کی گئی ہے اس ترتیب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خط اور کتابت کے فن نے کس طرح ارتقائی منزلیں طے کی ہیں چند کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) المجالسۃ وجواہر العلم۔ شیخ ابی بکر احمد بن مروان الدینوری۔ بخط علی بن محمد المعروف بسنجادی بتاریخ ۶۳۶ھ (۲) تاریخ بغداد للخطیب، بخط عبد القادر بن ابی صالح الجیلی بتاریخ ۵۳۱ھ (۳)۔ مقامات حریری، ابی محمد القاسم الحریری البصری بخط مصنف بتاریخ ۵۰۴ھ (۴)۔ مختارات اشعار العرب، لابن الشجری المتوفی ۵۴۲ھ بخط مصنف، (۵) مختصر المسند الجامع الصحیح للامام مسلم۔ کتابت ۶۴۴ھ (۶) التحریر فی شرح الجامع الکبیر الجزء السابع، جمال الدین محمود بن احمد بن عبد السید الحصیری البخاری المتوفی ۶۳۶ھ بخط مصنف بتاریخ ۶۲۶ھ (۷) الجامع البہی لدعوات النبی صلعم شیخ ابی الکریم عبد السلام بن محمد الاندرسبانی بخط مصنف بسال ۵۴۱ھ (۸)۔ المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد۔ للذہبی المتوفی ۷۴۸ھ بخط مصنف ۷۰۴ھ (۹) مصباح المجتہد وکفایۃ المنفرد، محمد بن الحسین التنوفی بخط مصنف سال ۵۶۹ھ (۱۰) شرح الکافیہ ابن الحاجب تالیف رضی الدین محمد بن الحسن الاسترآبادی المتوفی ۶۸۶ھ بخط عماد الدین یحییٰ ابن القاسم الصنعانی شارح الکشاف سال ۷۳۲ھ (۱۱) نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض شہاب الدین احمد بن محمد الخفاجی المصری المتوفی ۱۰۶۹ھ بخط مصنف سال ۱۰۵۸ھ، (۱۲) طبقات الکبریٰ لابن السبکی بخط مصنف، (۱۳) المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیہ شہاب الدین ابی العباس احمد بن محمد القسطلانی المتوفی ۹۲۳ بخط مصنف سال ۹۰۴ھ۔ (۱۴) المنن والاطلاق فی بیان وجوب التحدث بنعمۃ اللہ علی الاطلاق شیخ عبد الوہاب بن احمد بن علی المعروف بالشعرانی المتوفی ۹۷۳ بخط مصنف سال ۹۶۰ھ (۱۵) الالقاب لابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۰۲ھ بخط مصنف، (۱۶) الطالع الانوار من مطالع الانظار للبیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ بخط ابی عبد اللہ محمد المعروف بابن جماعت سال ۸۰۹ھ (۱۷) مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب جمال الدین عبد اللہ بن ہشام الانصاری المتوفی ۷۶۱ بخط حافظ ابن ہشام، شہاب الدین احمد بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ۔ سال ۸۳۵ھ، (۱۸) مشکل القرآن ابی محمد عبد اللہ بن مسلم المعروف با ابن قتیبہ الدینوری التوفی ۲۷۶ھ بخط محمد

بن احمد بن یحییٰ کتابت ۶،۳،۷ھ (۱۹) در الحکم للثعالبی النیسابوری المتوفی ۴۲۹ھ بخط یاقوت مستعصمی کتابت ۶۸۱ھ، (۲۰) کتاب الاغانی الجزء الرابع۔ ابو الفراج الاصفہانی المتوفی ۳۵۶ بخط محمد ابی طالب البدری کتبہ ۶۱۴ھ، (۲۱) المدونۃ الکبریٰ مالک بن انسؓ المتوفی ۱۷۹ھ دو صفحات کے فوٹو گراف رکھے ہوئے ہیں یہ اس نسخہ سے لیے گئے ہیں جو سلطان مراکش کی ملک تھا۔ اور جسکی کتابت ۳۸۴ھ میں ہوئی تھی۔ یہ سب سے قدیم ترین نسخہ اس کتاب کا ہے۔ (۲۲) الجامع الصحیح للامام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ بخط بن احمد بن عبد اللہ القردی کتابت ۱۳۱ھ (۲۳) الجامع الصحیح للامام بخاری اس نسخہ پر سال ۴۴۴ھ کے نوٹ حاشیوں پر ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت اس سے بھی قبل ہوئی ہے۔

فارسی ادب:

فارسی ادب اور زبان کے بھی بہت سے نادر مخطوطے الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں نقش و نگار اور طلاکاری اور خط کی گل کاری دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے ایک خاص کمرہ ان چیزوں کے لیے مخصوص ہے ۱۰-۱۲ شوکیس مخطوطوں سے بھرے ہوئے ہیں دیواروں پر مختلف خطاطوں کی وصلیاں اور مصوری کے نمونے آویزاں ہیں، شاہنامہ خمسہ نظامی، جامی، حافظ اور مولانا روم کے بیشمار مصور اور مطلا نسخے کھلے ہوئے رکھے ہیں۔ بعض نسخوں کی فہرست یہ ہے۔ یہ تمام نسخے ہر لحاظ سے نادر روزگار تھے۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔

(۱) دیوان حافظ مصور مذہب منقش، ۹۷۳ و ۱۰۹۱ھ (۲) خمسہ نظامی کے مصور نسخے گیارہویں صدی اور اس سے پیشتر کی صدیوں کے (۳) دیوان قاسم الانوار (۴) دیوان جامی (۵) جواہر التفسیر التحفۃ الامیر ملا کاشفی (۶) بوستان سعدی، بخط میر علی الحسین الکاتب السلطانی (۷) دیوان محمد اصفہانی ۱۲۴۱ھ (۸) انتخاب شعرا فارسی:۔ دیوار پر لگے ہوئے شوکیس میں رکھا ہوا تھا۔ یہ حد حسین اور منقش یہ ہندستان میں لکھا گیا ہے ایک صفحہ پر ایک تصویر ہے جس میں چند مشہور شعرا بیٹھے ہوئے شعر و سخن ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔ اس مرقع میں یہ شعرا ہیں حسن، جامی، متین، سید، نوید، نظمی، حیا، ملا عطار اللہ سہا، موئد، جامی سفید ریش خوبصورت اور وجیہ ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کی صورت کو حسین اور جمیل بنایا گیا ہے۔ جامی کے سوا باقی شعرا جوان ہیں۔ سب کے چہرے پر داڑھیاں اور سر پر پگڑیاں۔ یہ نسخہ ۹۲۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ دوسرے صفحہ پر سید اور شائق کی غزلیں ہیں، ہم وزن اور ہم قافیہ غالباً تمام کتاب میں انتخاب کا طریقہ یہی ہوگا۔ سید کی غزل کا مطلع یہ ہے۔

برآں کس خانۂ از بہر بودن مختصر گیرد ۔۔۔ چو زنبور عسل از شہد راحت کام بر گیرد

مقطع:

مہاراجہ چو خورشید جہاں تابست لئے سید ۔۔۔ چہ کم گردد از و گر ذرہ را از خاک بر گیرد

ثنائی کی غزل کا مطلع یہ ہے:

عطا کن نالۂ یارب کہ رنگ از اثر گیرد   دگر دست دعائے دہ کہ دامان سحر گیرد

(۹) بوستان سعدی المتوفی ۶۹۱ھ بخط سلطان علی الکاتب سال ۸۹۳ اس نسخہ کی تصاویر بہزاد کی موقلم کی رہین منت ہیں (۱۰) سلسلۃ الذہب جامی المتوفی ۸۹۸ھ کتابت ۹۵۸ھ (۱۱) دیوان عرفی المتوفی ۹۹۸ھ کتابت ۱۰۷۳ھ (۱۲) دیوان خسرو دہلوی المتوفی ۷۲۵ھ بخط منعم الدین الاوحدی الحسینی سنہ ۹۲۱ھ (۱۳) کلیات سعدی المتوفی ۶۹۱ھ یہ جمع کی ہوئی ہیں علی بن احمد بن ابی بکر المتوفی ۷۲۶ھ کتابت ۹۴۹ھ (۱۴) تحفۃ الاحرار جامی بخط علی سنہ ۹۱۱ھ (۱۵) المواہب العلیۃ حسین واعظ کاشفی المتوفی ۹۰۶ھ بخط علی بن محمود الکرمانی ۹۰۳ھ (۱۶) تحفۃ الاحرار جامی کتابت ۹۸۹ھ (۱۷) ہفت اورنگ جامی کتابت تورک باقر سنہ ۹۷۸ھ (۱۸) خمسہ نظامی المتوفی ۵۹۶ھ کتابت ۹۸۳ھ (۱۹) خمسہ خسرو دہلوی کتابت ۱۱۰۲ھ (۲۰) دیوان حافظ المتوفی ۷۹۲ھ بخط علاء الدین رزہ کتابت ۹۷۷ھ مصور (۲۱) دیوان گلشنی شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم المعروف بہ گلشنی المتوفی ۹۴۰ھ (۲۲) کلیلہ و دمنہ۔ مصور (۲۳) مثنوی مہر و مشتری۔ احمد عصار کتابت ۹۹۸ھ (۲۴) شاہنامہ فردوسی المتوفی ۴۱۶ھ بخط صفی قلی بن الفرہاد کتابت ۱۰۶۶ھ (۲۵) شاہنامہ فردوسی بخط نامعلوم کتابت ۸۵۰ھ (۲۶) شاہنامہ فردوسی بخط سمرقندی یعنی ۸۴۴ھ (۲۷) شاہنامہ فردوسی بخط لطف بن عیسیٰ شیرازی کتابت ۹۷۶ھ شاہنامہ کے یہ چاروں نسخے مصور، مطلا اور دلفریب خط میں ہیں۔ (۲۸) مانی اور بہزاد کی تصاویر کے البم بھی دیواروں کے شوکیش میں رکھے ہوئے ہیں اور کئی خوبصورت اور خوش خط وصلیاں دیوار پر آویزاں ہیں جن میں کاتبوں نے مختلف خط کے نمونے دکھلائے ہیں، بعض وصلیاں آیات کی ہیں اور بعض پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ (۲۹) انتخاب شعرائے فارس: یہ انتخاب سلطان علی کے خط میں ہے اور سنہ کتابت ۹۰۱ھ ہے اور یہ سلطان ابوالنصر بایزید کے لیے لکھا گیا تھا۔ انتخاب ان شعرا کا ہے۔ حافظ، امیر خسرو، خواجہ خسرو، شیخ کمال خواجہ سلمان، جامی، ثنائی، عصمت بخاری، ناصر بخاری (۳۰) منتخب کلام شاہی پہلے صفحہ کی لوح پر فتح علی شاہ قاچار کی سنہری مہر لگی ہے۔ کاتب عزالدین محمد الحسینی ہے اور سنہ کتابت ۹۸۷ھ صفحۂ اول پر یہ اشعار ہیں۔

اے نقش بستہ نام خطت بر سرشت ما   ایں حرف شد ز روز ازل سرنوشت ما

کارم بسینہ تنم وفائے تو کشتن است   خود عقل خندہ می زند از کار زشت ما

از شرمسار ماندہ ز تقصیرہائے خویش   لطف تو خود نمی نگرد خوب و زشت ما

صفحہ دوم:

اے شیخ شہر اگر بہ خرابات بگذری   رشک آیدت بکعبہ ہمچوں بہشت ما

بگذر ببوئے تربت شاہی کہ بشنوی   بوئے ونازطینت عنبر سرشت ما

بتغصیر وفا عیبم مکن کز آب چشم من — ہنوز اندر دہم تخم وفا میرروید از گل ہا

گر از گردون ملالے باشدت برعشق الاکن — کہ عشق آمد دریں مشکل مدد رحل مشکل ہا

اسی کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کے دروازہ کا عنوان یہ ہے "کمرۃ الاوراق البردیۃ" اس میں PAPYRUS پر لکھے ہوئے قدیم ترین خط اور مکاتیب شیشوں کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں بعض خط ثابت ہیں بعض بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ روشنائی پھیکی پڑ چکی ہے۔ ان خطوط کے سنین یہ ہیں:- ۱۴۲ھ، ۱۷۸ھ، ۱۸۶ھ، ۲۲۳ھ، ۲۴۱ھ، ۲۶۴ھ، ۲۸۵ھ، ۲۷۲ھ، ۲۹۹ھ، ۳۴۷ھ، ۴۲۵ھ، ۴۵۹ھ۔ ایک کتاب یہاں اور بھی نظر آئی ہے الجامع الحدیث تالیف ابی محمد عبداللہ بن وہب الفہری القریشی اس مصنف کی پیدائش سال ۱۲۴-۱۲۵ھ میں ہوئی ہے یہ تیسری صدی کی ابتدا میں کتابت کیا گیا ہے۔ ایک خط ولید بن عبدالملک (۸۶-۹۶ھ) کے زمانہ کا اسی کاغذ پر یونانی اور عربی زبان میں لکھا ہوا رکھا تھا۔ ایک اور خط بھی ولید کا اس کے بھائی عبداللہ بن عبدالمالک کے نام ہے جو اس وقت مصر کا گورنر تھا۔ ان خطوط کے متعلق دار الکتب المصریہ نے انگریزی زبان میں تین جلدوں کی ایک کتاب شائع کی ہے اور عربی زبان میں ایک جلد کی کتاب۔

بڑے کمرے میں جہاں کلام مجید کے قدیم نمونے اور مصنفوں کے اپنے ہاتھ کی لکھی کتابیں موجود ہیں وہاں چند شوکیس ایسے بھی ہیں جو ترک سلاطین کے کلام مجید دکھاتے ہیں اور ان میں ترکی زبان کے مخطوطے ہیں۔ میر علی شیر نوائی کے ترکی دیوان کے چند بہترین نسخے بھی شوکیسوں میں کھلے ہوئے اپنے حسن اور زینت کی بہار دکھا رہے ہیں۔

اسی کمرہ کے ایک حصہ میں چند شوکیس رکھے ہوئے ہیں جن میں علامہ المرحوم تیمور پاشا کی ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ مثلاً قلمدان۔ فاؤنٹین پن، پیپر ویٹ۔ خوردبین، دوات، ہاتھ کی لکڑیاں، چائے کے پیالے، کھانے کی پلیٹیں وغیرہ وغیرہ۔ غالباً یہی قلم اور دوات ہوں گے جن کے ذریعہ اس عالم بے مثل نے عربی ادب اور تاریخ پر بیش بہا مضامین سپرد قرطاس کیے۔ علامہ تیمور پاشا کا کتب خانہ بھی دار الکتب کے سپرد کیا گیا ہے جس کی فہرست چھاپی جا رہی ہے اور خزانہ تیموریہ کے نام سے چار جلدیں اب تک چھپ بھی چکی ہیں۔

●●

نور احمد فریدی

حرمین کے کتب خانے

۱۔ کتب خانہ مجیدیہ مکہ مکرمہ

حرم مکی میں باب السلام کے اندر دائیں جانب ایک دروازے پر "فِیھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ" کا کتبہ نصب ہے۔ یہ کتب خانہ مجیدیہ کا داخلی دروازہ ہے۔ مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران حاجی لوگ نماز اور طواف کے بعد مکہ مکرمہ کے بازاروں میں نکل جاتے ہیں اور خرید و فروخت کی گرم بازاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کئی باب الصفا کی طرف صفا اور مروہ کے درمیان "سعی" کی والہانہ کیفیات سے ایمان تازہ کرتے ہیں۔ کئی مصلی حنفی میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اور جو علمی ذوق رکھتے ہیں ان کا اکثر وقت اس تاریخی کتب خانہ میں گذرتا ہے۔

پہلے یہ کتب خانہ مصلی شافعی میں قائم تھا۔ ایک بار مکہ مکرمہ میں شدید بارش ہوئی اور حرم شریف سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اس سے کتب خانہ کو شدید نقصان پہنچا اور ہزاروں کتابیں ناکارہ ہوگئیں۔ اب بھی بہت سی کتابوں پر اس سیلاب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مقام خاصا اونچا ہے۔ اور کتابیں اس جگہ مقابلتاً زیادہ محفوظ ہیں۔

اس کتاب خانے کی اکثر کتابوں پر سلطان عبد المجید خان ترکی شہنشاہ کی مہر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں شاہی کتب خانے سے یہاں منتقل ہوئیں۔ اس لیے ابتک یہ نادر کتب خانہ سلطان مرحوم سے منسوب چلا آتا ہے۔

کتب خانہ کافی کشادہ اور ایک بڑے ہال پر مشتمل ہے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں استادہ ہیں۔ درمیان میں ڈیسک اور کرسیاں رکھی ہیں جن پر بیٹھ کر اہل ذوق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مصلی حنفی کا دار المطالعہ بھی اسی کتب خانہ سے وابستہ ہے۔ صبح کو یہاں سے قرآن مجید اور دینی کتب کے نسخے لیجا کر وہاں رکھوا دیئے جاتے ہیں اور شام کو اٹھا لاتے ہیں۔ ایک ملازم سارا دن وہاں ان نسخوں کی دیکھ بھال کیلئے بیٹھا رہتا ہے۔

قرآن مجید کے نسخے یہاں دنیا بھر کے تمام رسم الخطوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کے سائز بھی غیر معمولی طور پر طویل و عریض ہوتے ہیں۔ کتب خانے کے ملازمین بڑے با اخلاق ہیں۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور چائے سے تواضع کرتے ہیں۔ کتب خانہ کا ایک ناظم اعلیٰ ہے اور ایک ان کا نائب ہے۔ دو تین ملازم ہیں یہ سب لوگ بڑی مستعدی سے مصروف کار رہتے ہیں۔

قرآن مجید تفاسیر احادیث، فقہ، تاریخ، سیر وغیرہ کی الگ الگ فہرستیں چھپی ہوئی ہیں۔ جو مختلف ڈیسکوں پر پڑی رہتی ہیں۔ لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق کتابوں کے نام لکھ کر دیتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

مجھے تاریخ کی چند کتابوں کے بارے میں اطمینان کرنا تھا۔ خاص کر ابن خلدون کا وہ حصہ جو واقعات کربلا سے متعلق ہے کیونکہ ہمارے یہاں ابن خلدون کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے واقعات تاریخ کامل سے لیکر درج کئے گئے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اصل نسخے سے وہ اوراق نکال لیے گئے تھے اور دوسرا واقعہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا تھا جو دوسری تاریخوں میں ابن خلدون کے حوالے سے ملتا ہے۔ اس کتب خانہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنفین اور مؤلفین کے اپنے قلمی نسخے یہاں ملتے ہیں اور ان پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ مزید براں بعض نسخے سلطان عبدالمجید کی مہر سے مزین ہیں۔ تاریخ کی بے شمار ایسی کتابیں یہاں موجود ہیں جو افادیت کے اعتبار سے بیحد اہم ہیں مگر آج تک طبع نہیں ہو سکیں اور اکثر تاریخیں حشو وزوائد سے پاک ہیں۔ ہمارے یہاں خاص طور پر جو کتابیں نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ تحریف سے بچ نہیں سکیں اور ایسی حرکتوں سے ہی امت مسلمہ میں انتشار پیدا کیا گیا ہے۔

ہمارے علم دوست حضرات خاص کر مورخین اور مصنفین اگر بخت کی یاوری سے ارض مقدس میں تشریف لے جائیں تو اس کتبخانہ سے ضرور استفادہ کریں اور متنازعہ مقامات کا ان نسخوں سے مقابلہ کریں جو دستبرد زمانہ سے تاحال محفوظ چلے آتے ہیں۔

۲۔ کتب خانہ شیخ الاسلام

یہ عظیم الشان کتب خانہ مسجد نبویؐ کے بالکل قریب ہے۔ باب جبرائیل سے نکل کر ایک پختہ گلی آتی ہے۔ جس میں سنگ مرمر کا فرش کیا ہوا ہے۔ غالباً یہاں جنازے کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے جنوبی دروازے سے نکل کر سامنے گلی میں بائیں ہاتھ کو حضرت ابی ایوب انصاریؓ کا مکان ہے جس پر "دار ابی ایوب انصاری" کا کتبہ نصب ہے۔ جب ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے حضرتؐ نے اسی تاریخی مکان میں قیام فرمایا تھا۔ عشاق رسالتؐ یہاں کھڑے ہو کر روضۂ اطہر کی طرف منہ کر کے درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس مکان کے عین سامنے شیخ الاسلام کا عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ دراصل یہ مکان حضرت امام حسنؑ کا ہے۔ ترکوں کے زمانے میں مدینہ طیبہ کا شیخ الاسلام اس عمارت میں رہتا ہو گا۔ آجکل کتب خانہ کا کام دے رہا ہے۔ مدینہ طیبہ کے قیام میں علمی ذوق رکھنے والے حجاج یہاں آتے اور ان نایاب کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں جب احقر کو اس کتبخانہ سے استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی تو اس کے لائبریرین شیخ ابراہیم ہمدانی تھے۔ اسی برس کے پیر مرد تھے۔ بیحد خوش اخلاق اور فرض شناس بزرگ تھے۔ جوں ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے وہ اہلاً سہلاً کہتے ہوئے آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ اندر فرش پر خوشنما

غالیچے بچھے ہوئے تھے اور ان پر منقش مسندیں اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ شیخ نے ہمیں ان مسندوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند حاجی ہم سے پہلے ایسی دوسری مسندوں پر بیٹھے کتابوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ شیخ نے دریافت کیا آپ کون کون سی کتابیں دیکھنا پسند کریں گے۔

میں نے انھیں عرض کیا آپ اپنے کتب خانہ کی نادر اور قلمی کتابیں دکھائیں۔ شیخ اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھے اتنے میں ان کا ملازم چائے لے آیا۔ ہم چائے پی رہے تھے۔ لیکن ہماری نظریں کتب خانہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بڑی الماریاں دیواروں کے ساتھ ایستادہ تھیں اور کتابیں جزدانوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ جزدان گتے کے تھے۔ ایسی احتیاط آج تک کم از کم میری نظر سے کہیں نہیں گذری تھی۔ شیخ چار پانچ جزدان اٹھا لائے۔ ایک جزدان سے قرآن مجید نکال کر آگے بڑھایا اور بتایا کہ یہ خلیفہ مامون الرشید کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک اور جزدان سے دوسرا مصحف نکالا۔ فرمایا۔ یہ سلطان مصطفےٰ خان شہنشاہِ ترکی کی والدہ کا لکھا ہوا ہے یہ مصاحف کوفی رسم الخط میں خوبصورت جدولوں کے درمیان بڑی ہنرمندی سے لکھے ہوئے تھے ان میں سے ایک مصحف حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہند کا بھی تھا جس کا عکسی نسخہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے طبع کرایا تھا۔ اسی طرح کئی نادر تاریخی مصاحف شیخ نے دکھائے جن پر کاتبوں کے دستخط اور سنہ تحریر درج تھے۔ اس کے بعد شیخ نے تفاسیر، احادیث اور فقہ کے نادر قلمی نسخے دکھائے ان میں سے بعض اصلی نسخے تھے جو آج تک طبع نہیں ہو سکے تھے۔ ان سب پر شارحین، محدثین اور فقہا کے دستخط ثبت تھے۔ میں نے شیخ سے تاریخ اور سیر کی کتابیں طلب کیں حضرت شیخ اور ان کا ایک خادم برابر ہماری طرف متوجہ تھے۔ شیخ جزدان اٹھا کر لاتے اور کتابیں نکال کر آگے بڑھاتے جب ہم دیکھ چکتے تو ان کا خادم جزدان میں ڈال کر انھیں اصلی جگہ میں رکھ آتا۔

شیخ نے پہلے عربی میں لکھی ہوئی ایک ایک کر کے پیش کیں بعد ازاں فارسی کی تاریخیں دکھائیں انہیں سے اکثر میری پڑھی ہوئی تھیں خصوصیت یہ تھی کہ بعض اصل نسخے تھے جو مصنفین اور مؤلفین نے خود اپنے قلم سے لکھ کر بند کئے تھے۔ صوفیا کے تذکروں میں سے "اخبار الاخیار" اور "سفینۃ الاولیا" شیخ نے آگے بڑھائے اول الذکر حضرت محدث دہلوی اور موخر الذکر دارا شکوہ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے ان پر انکے اپنے دستخط موجود تھے۔ مثنوی مولانا رومؒ دیکھنے کا اشتیاق تھا کیونکہ ہمارے یہاں مثنوی کے جو نسخے متداول ہیں عام طور پر نولکشور کے طبع شدہ ہیں ان پر خاصی تحریف کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میرے ذہن میں تھا ؎

چوں صحابہ حب دنیا داشتند مصطفٰے را بے کفن بگذاشتند

مجھے یقین تھا کہ یہ الحاقی ہے۔ چنانچہ مثنوی کے قلمی نسخے کو جس پر حضرت مولانا رومؒ کے دستخط ثبت تھے کھول کر دیکھا تو اس میں یہ شعر نظر نہ آیا۔ اسی طرح چند اور اشعار بھی نظر نہ آئے جو ہمارے نسخوں میں ان بزرگوں کے لیے تضحیک کا موجب بنے ہیں۔

ہم کتابوں کے دیکھنے میں محو تھے کہ دفعۃً حرم سے اذان کی آواز آئی جس پر سب لوگ کتابیں چھوڑ سرعت سے باہر نکل آئے اور شیخ نے بڑی محبت سے ہمیں خدا حافظ کہا۔ اتنے میں خادم کمرے کو مقفل کر چکا تھا ہم نے کتب خانہ پر نگاہِ واپسیں ڈالتے ہوئے حرم شریف کا رخ کیا ●●

مراسلات

○ جرنل ۵۳ کے مسامحات

○ —— جناب عبدالرؤف خاں

○ استاد احمد معمار کی ڈائری ؟

○ —— جناب شبیر احمد خاں غوری

○ "ہند عہد اورنگ زیب میں" کے بارے میں

○ —— جناب مصطفیٰ شروانی

جرنل کے بارے میں آپ کی تنقیدوں، فہمائشوں
اور مشوروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

ادارہ

مراسلات

جرنل ۵۳ کے مسامحات

جناب عبدالرؤف خاں
حمیدیہ لائبریری، بھوپال

جرنل ۵۳ ص ۱۵۱ سطر ۶ پر حضرت اقدس میاں نعیم شاہؒ کا سنہ وفات ۱۲۷۳ھ ارقام فرمایا ہے مگر مادۂ تاریخ "بہ بہشت نعیم شاہ امام (۷ + ۷۰۷ + ۱۷۰ + ۳۰۶ + ۸۲) کے اعداد کا میزان ۱۲۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ مادہ بشکل قطعہ تعمیہ تدخلہ کے ساتھ نظم ہوا ہو۔ ص ۱۵۵ پر تصنیف "گلستانِ رحمت (۵۶۱ + ۶۴۸ = ۱۲۰۹ھ) دراصل تاریخی نام ہے جس کی طرف شاید صاحب مقالہ کی توجہ منعطف نہ ہو سکی۔ مقالہ "وقائع روزگار" ص ۱۷۹ سطر ۲ میں جناب وفا کشمیری کے سفر کا سنہ ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء تسوید فرمایا ہے لیکن اس کی تائید میں جو فارسی عبارت تحریر فرمائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے سیاحت کا سال ۱۲۸۵ھ تھا، "... در اوائل موسم برسات یک ہزار و دو صد ہشت و پنج ہجری ..." (سطر ۶ صفحہ ایضاً) ظاہر ہے کہ کاتب کی کرشمہ سازی نے "بست" کو "ہشت" بنا دیا۔ اسی صفحہ ۱۷۰ سطر ۱۲ پر "مقبول خرد (۱۲۲۵)" سے مطلوبہ اعداد برآمد نہیں ہوتے بلکہ ۱۲۲۵ کی بجائے صرف (۸۰۴ + ۱۷۸) ۹۸۲ ہی مستخرج ہوتے ہیں چنانچہ اس میں "گردیدہ" کے اعداد ۲۴۳ کا اضافہ اور کرنا چاہیے تھا، یعنی مقبول خرد کے بعد قوسین میں ۱۲۲۵ ثبت فرمانے کی بجائے "مقبول خرد گردیدہ" کے بعد (۱۲۲۵ھ) ہونا چاہیے۔ ص ۱۸۳ پر حضرت خواجہ بزرگ معین الدین سجزی علیہ الرحمہ کے سال ولادت، سن مبارک نیز سنہ وفات کے سلسلہ میں حسب ذیل قطعہ:

سہ گونہ بود وجودِ شریف دو عالم — شفیع یوم جزا آمد آں ز رو آنشہ
حسب بآل عبا ہست ہم نسب بہ علی — وفات یافت چو لاریب ہم بحق پوشید

میں "بحق پوشید" (۱۱۰ + ۳۲۲) کے اعداد کا میزان ۴۳۲ ہوتا ہے۔ جبکہ قطعہ کی تشریح فرماتے ہوئے صاحب مقالہ رقمطراز ہیں: "اور 'ہم بحق پیوست' سے تاریخ وفات شریف اخذ کیا ہے" اس فقرہ کے اعداد ۶۳۳ ہی ہوتے ہیں جو "آفتاب ملک ہند" (ص ۱۸۲ سطر ۱۸) کے اعداد کے مساوی ہیں اور یہی سال وفات اکثر محققین نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ یہ فقرہ قطعہ میں موجود نہیں۔ بہتر ہوتا کہ حضرت اجمیریؒ کی عمر شریف جو ۹۶، ۹۷ سال سے زیادہ ازروئے تحقیق جدید نہیں پہنچتی، ادارہ کی طرف سے فوٹ نوٹ ثبت فرما دیا جاتا کیونکہ مذکورہ قطعہ کی رو سے "بآل عبا" (۳۳ + ۷۳) ۱۰۶ سال ہوتی ہے۔

• ص ۱۸۴ سطر ۱۴ پر "شیرازہ جمعیت" (۵۲۳ + ۵۲۳) کے اعداد کی میزان بھی ۱۰۴۶ ہوتی ہے نہ کہ ۱۲۲۰ھ ص ۲۱۶ کی

آخری سطر پر برہان خاں کی وفات کے مادہ ’’قصد نخ‘‘ کے اعداد کا میزان (۱۹۴ + ۶۵۰) ۸۴۴ ہوتا ہے جسے ۱۱۹۳ھ کے مطابق بتلایا ہے ۔ ’’قصد نخ‘‘ کے اعداد سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون سا سنہ ہے جو ۱۱۹۳ھ کے معادل ہے ۔

● ص ۵، نیز مقالۂ سکہ شناسی کے دیگر صفحات پر لفظ ’’جہانپناہ‘‘ آیا ہے۔ جسے محترم مقالہ نگار نے اس سے دار الخلافہ سمجھنے والوں کے خلاف دلائل دیے ہیں لیکن خاکسار (جو ہندی و تاریخ کا نہایت ادنیٰ طالب العلم ہے) کی اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ لفظ ہندی ’’ [illegible] ‘‘ میں جہاں پناہ (بادشاہ) کے بجائے مستعمل ہے چنانچہ اس سلسلہ میں بیا دور از کار بحث کی ضرورت نہ تھی ● ص ۴۴ سطر ۲ اپر مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے سلسلہ میں ’’... اس طور پر سنہ ۱۸۸۲ء کے اواخر میں مدرسۃ العلوم کے قیام ... تھیں‘‘ اس کے برعکس ص ۴۶ سطر ۷ پر تحریر ہے ، ’’۲۴ مئی ۱۸۷۵ء .. مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی. قیاساً عرض ہے کہ پہلا سنہ (شاید) ۱۸۷۲ء ہو ● ص ۶۳ اپر جناب کاتب کی سبقت قلمی نے استفادہ کو ’’استعفادہ‘‘ (سطر ۱۰) کر دیا ہے

● انگریزی حصہ کے ص ۶ سطر ۳۶ پر ایک اصطلاح ’’ "Untimly Death" ‘‘ ۔ استعمال ہوئی ہے (ایک اور صفحہ پر بھی) خاکسار کے نزدیک اس کے لیے صرف "SUDDENDEATH" ہی کافی تھا کیونکہ موت وقت موعود ہی پر آتی ہے جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے البتہ اچانک ضرور واقع ہو سکتی ہے ۔

●●

جناب شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

استاد احمد معمار کی ڈائری؟

محترم ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے کسی یورپین کی معیت میں " تاج محل کے معمار " کے مسئلہ کو حل کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں خود " معمار تاج " نادر العصر استاد احمد کی ڈائری سے استشہاد کیا ہے، جس کے لیے بجا طور پر مبارک باد دی جاسکتی ہے کہ

ع   ایں کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند۔

اس ہیچمدان کو نہ تعمیرات سے دلچسپی ہے نہ دوسرے فنون لطیفہ سے۔ مجھے استاد احمد معمار سے صرف اس وجہ سے دلچسپی ہے کہ:

(۱) وہ ہندستان کے ریاضی دانوں کے ایک عظیم المرتبت خانوادہ کے مورث اعلیٰ ہیں جس نے کئی نسلوں تک بڑے جلیل القدر ریاضی داں پیدا کیے۔

(۲) وہ خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتے تھے، کیونکہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ مہندس کا ریاضی و ہیئت میں امتحان لینے کے لیے اُسے چوتھی صدی ہجری کے مشہور ہیئت داں عبدالرحمٰن الصوفی کی کتاب "صور الکواکب" کا (جو اپنے موضوع کی ادبیات عالیہ میں آج بھی محسوب ہوتی ہے) فارسی میں ترجمہ کا حکم دیا۔

(۳) ان کے پوتے امام الدین ریاضی نے "تذکرہ باغستان" میں لکھا ہے کہ " استاد احمد معمار کے مشہور ایرانی عالم ملا مرشد شیرازی سے (جسے بعد میں شاہجہاں نے حکومت خاں کے خطاب سے نوازا) مناظرے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر حق بجانب استاد احمد معمار کی طرف آتا تھا۔

یہ بھی عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ملا مرشد شیرازی وہ عبقری وقت تھا جس سے عہد شاہجہانی میں ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی تجدید ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مناظرے سنی شیعہ مناظرے ہی نہیں تھے بلکہ علمی تھے جن کی اگر آج تفصیل مل جائے تو اس سے عہد شاہجہانی میں علوم حکمیہ بالخصوص ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی کیفیت معلوم کرنے میں بڑی

قابل قدر مدد ملے گی۔

اس لیے مجھے یقین واثق ہے کہ استاد احمد معمار کی ڈائری میں جس سے محترم ڈیسائی صاحب نے تاریخ تعمیرات کے ایک متنازعہ فیہ مسئلے کو باحسن وجوہ حل کرنے میں مدد لی ہے، استاد احمد معمار کی علمی زندگی بالخصوص ریاضی و ہیئت سے متعلق بھی بہت سے نکات و افادات مل جائیں گے۔

مجھے محترم ڈیسائی صاحب کی خدمت میں کوئی بار نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ کسی طرح آپ کی وساطت بلکہ سعی و سفارش سے اس ہیچمداں کو بھی استاد احمد معمار کی ڈائری کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے۔

اگر وہ ڈائری ان کی ذاتی ملکیت ہے تو کسی طرح آپ ان سے اس دیرینہ نیاز مند کی خاطر اس کا زیراکس منگالیں۔

اور اگر کسی لائبریری یا میوزیم کی ملکیت ہے تو از راہ نوازش کریمانہ وہاں سے اس کا زیراکس حاصل کرلیں۔

مجھے یقین واثق ہے کہ ؎

بر کریماں کارہا دشوار نیست

●●

جناب مصطفیٰ اشروانی
حمایت نگر حیدرآباد

ہند عہد اورنگ زیب میں کے بارے میں

"خدا بخش لائبریری جرنل" کا ضخیم شمارہ، ۵۹ تا ۶۲ بمصداق "طویل بود حکایت دراز تر گفتم" موصول ہوکر اسس وجہ سے بھی لائق تحسین وستائش ہوا کہ اس چہ نمبری شمارہ میں مختلف فنون ادب شعر وسخن مذہبیات تاریخ و فلسفہ کو بے حد خوبی سے یکجا فرمایا گیا ہے۔

مرزا سمیع اللہ بیگ نواب مرزا یار جنگ بہادر مرحوم سابق چیف جسٹس حیدر آباد ہائی کورٹ کی تحقیقی تصنیف "ہند عہد اورنگ زیب میں" مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۴ کا دستخطی نسخہ میرے پاس والد ماجد پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم مغفور کے خزینہ علمیہ سے موجود ہے۔ اس پر نواب مرزا یار جنگ مرحوم نے ۲۰ بہمن ۱۳۳۴ف مطابق ۱۹۲۴ء کو اپنے قلم سے والد ماجد مرحوم کی خدمت میں تصنیف پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے:۔

> جناب من تسلیم۔
>
> یہ کتاب دراصل برٹش انڈیا کے حالات کے لحاظ سے لکھی گئی ہے اور اسکی تقسیم برٹش انڈیا میں ہی زیادہ تر ہوگی حیدر آباد سے تعلق نہیں یہاں تو صرف چند احباب کی خدمت میں جو صاحب رائے ہیں بھیجونگا۔ مرض کا علاج اور پھر کسی قوم کے مرض کا علاج اسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک صحیح تشخیص نہ ہو۔ میں نے اس کتاب کے باب دہم میں تشخیص کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں آپ کے قیمتی اور قابل قدر تجربہ و رائے سے مستفید ہونا چاہتا ہوں میری استدعا ذیل کے مطبوعہ خط میں ہے۔"
>
> نیاز مند
>
> سمیع اللہ بیگ

مرزا سمیع اللہ بیگ مصنف "ہند عہد اورنگ زیب میں" کی خود نوشت تحریر کا عکس

حیدرآباد دکن
۲۰ نومبر ۳۳ء

وجناب من لدُ التسلیم
یہ کتاب دراصل برٹش انڈیا کے حالات سے کم ربط رکھتی ہے
[illegible] ہے اور اصلی تقسیم برٹش انڈیا کی
میں زیادہ سروکار حیدرآباد کے کشمکش
یہاں تو صرف چند احباب کی خدمت میں [illegible] حیدرآباد [illegible]
[illegible]
اور قابل قدر تحریر [illegible] میری [illegible] کے مطبوعہ حلقہ میں [illegible]

MIRZA YAR JUNG

اس کتاب کا صرف باب دہم لکھنا میرا اصلی مقصد تھا لیکن جس رائے کا اظہار باب مذکور میں کیا گیا ہے اسکی تائید کرنے کے لئے مواد کی ضرورت تھی۔ لہذا باب دوم تا باب نہم لکھے گئے جن میں زیادہ تر ہندوستان کی وہ تمدنی حالت دکھائی گئی ہے جو عہد اورنگ زیب میں تھی اور اسکے ثبوت میں ایک ایسے انگریز سیاح و تاجر کے سفرنامے سے اقتباسات کئے گئے ہیں جس نے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور جسکا تفصیلی حال تمہید میں دیا گیا ہے۔ میں جناب کی خدمت میں یہ کتاب اس غرض سے روانہ کرتا ہوں کہ جن مسائل پر تاریخی واقعات کی مدد سے میں نے باب دہم کے تینوں حصوں میں بحث کی ہے انکے متعلق جناب کی آزادانہ رائے معلوم کرنے کا مجھے شرف حاصل ہو تاکہ اپنے ہندو مسلمان برادران وطن کے ہر طبقہ کے اصحاب کے اصلی خیالات و جذبات سے مجھ کو آگاہی ہو جائے اور انکی مدد سے میں اپنی رائے میں اصلاح کر سکوں۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ جناب کی رائے جناب کے نام گرامی کیساتھ پبلک میں یا آئندہ کسی مضمون میں بغیر آپ کی اجازت کے نہ پیش کرونگا۔ جواب دینے کی نسبت میرا مطالبہ درخواست کسی قدر سخت ہے اور اس سے آپ کی تضیع اوقات ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن میں اس کتاب کے متعلق کوئی مفصل و مکمل تقریظ نہیں چاہتا بلکہ صرف تبادلہ و درستی خیالات مقصود ہے اسلئے اگر ان مسائل پر کم از کم چند سطروں میں بھی آپ اپنی ذاتی آزادانہ رائے تحریر فرما دینگے تو میرا مقصد حاصل ہو جائیگا اور اس کے لئے کل کتاب کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ صرف باب دہم کے تینوں حصوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ میں بحیثیت ایک کمترین خادم قوم یہ درخواست کرتا ہوں اور تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ فقط

راقم
[illegible]

خدا بخش نوادر

باخرزی بخط قاضی عبدالودود

سید نفیسی

باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر

رباعیات باخرزی: نسخۂ خدا بخش کا عکس

رباعیات: تعارف اور متن

صلاح الدین خدا بخش

سعید نفیسی

شیخ العالم سیف الدین ابوالمعالی سعید بن مطهر قاهندی باخرزی از بزرگان مشایخ صوفیه اواخر قرن ششم و اوایل قرن هفتم بود و بواسطهٔ جلالت قدری که میان معاصران خود داشته او را شیخ العالم میگفتند - در بسیاری از کتابهای تاریخ و تصوف از آن جمله در حبیب السیر و هفت اقلیم و نفحات الانس و طرائق الحقائق و سفینة الاولیاء و خزینة الاصفیا و مجالس العشاق تألیف کمال الدین حسین گازرگاهی کما ینبغی ذکری ازو رفته است - وی را معاصر فریدالدین عطار و نجم الدین کبری دانسته اند و از خلفای نجم الدین شمرده اند -

مؤلف حبیب السیر میگوید مسعود توقتی بیکی مادر منکو قاآن پادشاه مغول با آنکه ترسا بود در ایام دولت پسر خویش هزار بالش نقره به بخارا که مسکن او بود فرستاد تا مدرسه بسازند و مستغلات خریدند و بر آن بقعه وقف کردند و تولیت آن مدرسه و موقوفات آن را بوی داد

برخی دیگر وی را معاصر سعدالدین حموی و نجم الدین رازی و رضی الدین علی لالا غزنوی و مجدالدین بغدادی دانسته اند -

درباره وی کراماتی آورده اند از آن جمله خوندمیر در حبیب السیر و جامی در نفحات الانس آورده اند که روزی بر سر جنازه درویشی حاضر شد گفتند تلقینی بگوی و وی پیش روی آن مرده بایستاد و این رباعی را خواند :

گر من گنه جمله جهان کردستم — عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم — عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

هم جامی در نفحات الانس آورده است که پس از تحصیل و تکمیل علوم بخدمت شیخ نجم الدین کبری
رسید تا از جمله مریدان وی درآمد، و نجم الدین او را در دو چله نشاند و در چلهٔ سوم بدر
خلوت وی رفت، و انگشت بر در خلوت زد، و آواز داد که ای سیف الدین،

منم عاشق مرا غم سازگار است   تو معشوقی ترا با غم چه کار است

برخیز و بیرون آی. آنگاه دست وی بگرفت، و از خلوت بیرون آورد، و بطرف بخارا روانه
کرد. وقتی برای شیخ نجم الدین از طرف خطا چنگیز کی آمده بودند. گفت زنان با اصحاب
گفته است که ما امشب بلذتی بستر و به استقبال خواهیم نمود. شما نیز در موافقت ترک
ریاضت کنید، و بفراغت آسودگی بسر برید. چون حضرت شیخ این بگفت، شیخ سیف الدین
آن شب با بریقی بزرگ پر آب کرد، و بر در حضرت شیخ بایستاد. چون وقت صبح بیرون آمد
وی را دید، گفت نه شما را گفته بودیم که امشب بلذت و حضور خود مشغول باشید؟
چرا خود را باین ریاضت و رنج انداختی؟ گفت "شما فرمودید که هر کسی
بلذت و حضور خود مشغول شود، مرا هیچ لذت ورای آن نیست که بر آستانهٔ حضرت
شیخ بایستم. شیخ فرمود که بشارت باد ترا که سلاطین در رکاب تو بدوند. لاری.
یکی از سلاطین بزیارت شیخ سیف الدین آمد و در وقت باز گشتن از شیخ درخواست که الطفی
تبرک شیخ دارم، التماس میکنم که شیخ قدم رنجه فرمایند، تا بدولت خود سوار کنم. شیخ التماس
وی را مقبول داشت، بدر خانقاه آمد، پا در رکاب آن بگذاشت تا سوار شود، اسب را گرفتی

سرد و غنائی در در بود، تقریباً پنجاه گام در رکاب شیخ بدوید - شیخ ابا یا دری گفت «حکمت در سرکشی این اسب آن بود که شیخ در خدمت شیخ الاسلام نجم الدین بودیم، مارا اشارت داد که پادشاه هم در رکاب تو بدود» - اکنون این مصداق سخن شیخ گشت.

امین احمد رازی در هفت اقلیم میگوید که وی در عصر هلاکو خان بوده و برخی بر بیند

که منکوقاآن با آنکه بت‌پرست دین مسیحا مینمود، در بام دولت پسر خود را بابا نزار بالش نقره به بخارا فرستاد که در آنجا مدرسه ساخته اند و تولیت آن را به شیخ سیف‌الدین تفویض فرموده - پیداست که این همان نکته است که در حبیب السیر آمده و مولف هفت اقلیم در آن اندک تصرف کرده است

از این سخنان برمی‌آید که وی در آغاز کار جزو اصحاب نجم الدین ابوالجناب احمد بن عمر خیوقی خوارزمی معروف به نجم الدین کبری یا طامة الکبری عارف مشهور متولد در ۵۴۰ که در روز دهم جمادی الاولی ۶۱۸ بدست لشکریان مغول در خیوه یا خیوق کشته شده بوده است و بدینگونه جوانی را در خوارزم گذرانده و پیش از کشته شدن نجم الدین در ۶۱۸ از جانب وی به بخارا رفته و طریقه کبرویه را که بدو منسوب است در آنجا انتشار داده است - بدینگونه با گروهی از بزرگان تصوف که جزو اصحاب نجم الدین کبری بوده اند مانند فرید الدین عطار معاصر بوده

که او نیز در ۶۱۷ به دست لشکریان مغول کشته شده؛ سعدالدین ابوالحسن یا محمد بن
معین الدین مؤید بن جمال الدین ابوبکر بن عبدالله بن عثمان بن علی بن ابو عبدالله محمد بن
حمویه معروف به سعدالدین حمویه یا سعدالدین حموی عارف مشهور متولد در شب
یکشنبه ۱۱ ذی الحجه ۵۸۶ و متوفی در ۱۲ ذی الحجه ۶۴۹؛ نجم الدین ابوبکر عبدالله

بن محمد بن شاهاور اسدی رازی معروف به نجم الدین دایه درگذشته در ۶۵۴؛ و
مجدالدین ابوسعید شرف بن مؤید بن ابوالفتح بغدادی خوارزمی که در ۶۰۶ یا ۶۱۶ به امر
علاءالدین محمد بن تکش خوارزمشاه کشته شده؛ و رضی الدین علی بن سعید بن عبدالجلیل لالای
غزنوی درگذشته در ۶۴۲ در حلقهٔ مریدان نجم الدین کبری محشور کرده است-

در تاریخ رحلت وی اختلاف هست: مؤلف آتشکده در ۶۲۹ و مؤلف هفت اقلیم در ۶۴۹
و مؤلف مجالس العشاق در ۶۵۵، و دیگران همه در ۶۵۶ نوشته اند. داراشکوه در سفینة
الاولیاء و مفتی غلام سرور لاهوری در خزینة الاصفیا تصریح کرده اند که ۶۳ سال عمر کرده
است - حتی مؤلف خزینة الاصفیا این قطعه را در تاریخ رحلت وی سروده است:

مقتدای کفر شیخ سیف الدین — بادت چون از جهان بجست بار
کشف اسرار و شمس انوار است — سال تاریخ آن شه ابرار
باز سرور بگو بر حلت او — سیف ایمان و شیخ کفار

جمله کشف انوار و شمس انوار و سیف ایمان شیخ کفار بحساب جمل ۶۵۸ میشود.
معتبرترین سندی که در دست هست اینست که علی بن ... بن محمد حمادی بخاری که از مریدان

وی بوده، در کتاب الحمائل المنهاجیه که در احکام نجوم تالیف کرده، جرجگاه رحلت وی بامداد روز یکشنبه ۲۴ ذی القعده ۶۵۹ه وقت نماز خفتن پس از هفت روز رنجوری ضبط کرده است - اگر ۷۳ سال عمر کرده باشد در ۵۸۶ه بجهان آمده است -

در این شهر دیری نیست که وی در پایان زندگی در بخارا زیسته، و همان جا درگذشته است - مولف طرائق الحقائق در باب مرقد وی می نویسد: "راقم حروف در ذی القعده الحرام سنه یک هزار و سیصد و شانزده ببخارا بود، از دروازه قریشی بیرون رفت، برای زیارت مزار شیخ العالم طرف مشرق شهر بخارا اتفاق افتاد - بسیار سخت و آن باغ و عمارت و خانقاه با امر امیر تیمور در سال هفتصد و هفتاد و هشت بنا گشته و کاشیهای قیمتی دارد، و بعضی بی انصافها خراب کرده و بیرون می برند، و مزار اولاد و نواده های شیخ و میر علی خطاط در آن تعلق میباشد، مکانی با نضیحت."

نوشته اند که شاعر معروف رضی الدین نیشاپوری متوفی در ۵۹۸ه مداح وی بوده، و قصیده در مدح وی سروده که این شعر معروف از آن است -

چو رسی بطور سینا ارنی بگو و بگذر که سوال لن ترانی نپذیرد جواب لن ترانی

هر چند که رضی الدین نیشاپوری در ماوراءالنهر و خصوصا در بخارا زیسته و در دیوان وی مدایح

بسیار دور نیست که جذبهٔ روحانی وی در سیف‌الدین اثر گذاشته، این نکته درست نمی‌نماید
زیرا که نه تنها قصیده بدین وزن و قافیت در دیوان وی نیافتیم، چون وی در ۵۹۸
درگذشته و بحساب پژوهش این کمترین سیف‌الدین باخرزی در ۵۸۶ م بجهان آمده، در
۵۹۸ عمر رضی‌الدین درگذشته وی ۱۲ ساله بوده است؛ و ممکن نیست این نکته درست باشد

سیف‌الدین باخرزی در نظم و نثر فارسی استاد و شیوا بوده و از آنجمله به زبان فارسی
در معنی عشق اثری مانده است و نیز اشعاری که بیشتر آنها رباعیات است بکوشش اینجانب در
جاهای مختلف ضبط شده‌اند. در بارهٔ اشعار فارسی وی دو منبع مهمی که در دست است:
نخست یک نسخه ... البیاض از خاندان سعدالدین حموی شامل آقای مجدالدین نصیری
در ... آن را از گنجینه کتابهای عالی و ... انتشارات دانشگاه تهران شمارهٔ
۱۳۳ چاپ ۳۲۹ (ص ۶) آورده‌ام و این نسخه برای نظام‌الدین ابو محمد اسحق بن نجم‌الدین
... از بازماندگان سعدالدین حمویه و پسر او کمال‌الدین محمد و پسر وی ...
محمد ... نوشته شده و اشعار سیف‌الدین باخرزی را ...
ظهیرالدین حسن بن ناصر بن جلال بن ... مسعود بن لطیف کرمانی در ۷۳۶ بخط خود نوشته است.
دوم مجموعهٔ البیت شامل غزلیات سلمان ساوجی متوفی در ۷۷۸ و دیوان رکن‌الدین صاین
هروی متوفی در ۷۸۵ و دیوان فصیحی متوفی در ۱۰۴۶ و دیوان میرزا ... پسر ظهیرالدین

پادشاه مودود چند متوفی در ۹۶۴ھ و کلیات منیر لاهوری متوفی در ۱۰۵۴ھ
در رباعیات سیف الدین باخرزی که در کتابخانهٔ خدابخش در بانکی پور در شهر پتنه
در هندوستان موجود است، و صاحب کتابخانه در زندگی خویش مقاله‌ای در مجلهٔ انجمن
خاورشناسی آلمان در ۱۹۰۵ بدین عنوان نوشته است

Saifuddin Bakharzi by S. Khuda Bakhsh
M.A. B.C.L. Zeitschrift der Deutschen
Morgenlandischen Gesellschaft –
Neunundfunfzigster Band, Leipzig
1905 PP 345-354

اصل رباعیات را که درین منابع بنام سیف الدین باخرزی آورده اند با هم گرد آورده و
به ترتیب حروف تهجی بجا در یک جا داده ام و نخست دو قطعه منسوب باو
و سپس رباعیات او را میآورم.

هر که ما را خوار دارد شاد و برخوردار باد — وانکه ما را رنجه دارد راحتش بسیار باد
وانکه اندر راه ما خاری فکند از دشمنی — هر گلی کز باغ وصلش بشکفد بی خار باد
ای همایون مرغ بیپر چون بمشرق بگذری — گر توانی بر جناب صاحب اعظم پری
مجلس عالی شهنشاه غمیدان قطب دین — ای کمال تو چو عقل از وصمت نقصان بری
هست در زیر نگین خاتم اقبال تو — گنبد پیروزه همچون حلقهٔ انگشتری
راه بیرون شد نمییابد سپهر تیزرو — از حدود عرصهٔ جاه تو از پهناوری
نصرت حق را درین دولت معین چون توئی — پس اگر نکنی بر دز حشر چه عذر آوری
اندرین ملت که بادا تا قیامت پایدار — دانش و پیری و اسلامست شرط سروری
چون جوانی بیهنر جوید سری نزدیک عقل — عاملان پیر را عیبی نباشد پیری
هدهد قواده در جائی که باشد تاجدار — عار نبود باز را در عهد او بی افسری
عاقلان را کنج بهتر چون سفیهان سر شوند — دار چون منبر شود بهتر بود بیمنبری
زاحتساب زید او مرد خران نغش را — آسمان بیرون نیارد روز از بیچادری
نایب صدر قضا قاضی ظهیر الدین که هست — زیور الفاظ را پیرایهٔ درّ دری
آرزو بودم قبول خدمت تو لاجرم — تحفه کردم عقد مروارید نظم از بیزری
گرچه دادم تربیت ده زانکه مرخورشید را — نیست مانع قرب و بعد از طبع گوهر پروری

اینک رباعیات منسوب باو که از منابع مختلف گرد آمده است:

بر چهره چون خون جگر نیست ترا	۱	دل در کف صد گونه خطر نیست ترا
دردم ز آنست که با همه درد و الم	—	یک ذره ز درد من خبر نیست ترا
بگرفت بدست زلف چون شستش را	۲	بشکست بمشت نرگس مستش را
امید من آنست بزودی شه بدبیر	۱۵	چشم تر او خشک کند دستش را
آنیم که پیر برنگیرد لت ما	۳	بر چرخ برین برنهد سر ثبت کت ما
گر سگ بچه برابد از محنت ما	—	آن سگ بچه شیر گردد از غیرت ما
فسق و فساد در دهر روزه ما	۴	پر شد ز حرام کاسه و کوزه ما
بخند در روزگار و میگر بد عمر	۱۳	بر طاعت و بر نماز د بر روزه ما
بی علم و عمل بهشت یزدان مطلب	۵	بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود	۲۶	آزار دل هیچ مسلمان مطلب
دانی چه بود ثمره خرابات نخست	۶	اسب و کمر و کلاه در بازی جست
چون مست شوی بپای تو میگرد دست	۳۲	گویند نشین هنوز باقی برست
مستوفی عشقت شمار روز نخست	۷	تحصیل غمت بنام من کرد درست
آنگاه برات اشک بر چشم داد	—	غم باقی کرد و گفت در عهده تست
دنیا که بهر پایه ز دستی دگر است	۸	هر ره در بلندی ده پست دگر است
همچون زنگان بیحیا هر لعبتی	—	آرامگهش کنار مست دگر است
عشق ارچه بلای روزگار است خوشست	۹	وین باده اگرچه با خمار است خوشست
ور زین عشق اگرچه کاریست بزرگ	—	چون با تو نگاری سرو کار است خوشست
در فرقت تو نظاره کردن چه خوشست	۱۰	وز مردم بو کناره کردن چه خوشست
آن دل که درد و هجر الم نبود	۳۵	آن دل بهزار پاره کردن چه خوشست
جان دزدن مرد بی ادب لرزانست	۱۱	گر زر بدهی ادب خری ارزانست
از بی ادبی کسی بجایی نرسید	۳۰	تا که ادب تاج سر مردانست
آبست بتحقیق مثال دل دوست	۱۲	میداز بخاطر که مثالش نیکوست
گر صاف بود نهان نماند ز تو هیچ	۴۳	ور تیره بود نهان بود هر چه در اوست

هر نقطه که در دایرهٔ قسمت اوست ١٣ بر حاشیهٔ مائدهٔ نعمت اوست

در سینه هر ذره اگر بشکافند ١٣ دریا دریا جهان جهان رحمت اوست

بر تخت وجود هر که صاحبجاست ١٤ او را سوی عالم حقیقت راهست

هر نور یقین که در دل آگاهست ٧ از گفتن لا اله الا اللهست

تا دل ز بد و نیک جهان آگاهست ١٥ دستم ز بد و نیک جهان کوتاهست

زین پیش دلی بود و هزار اندیشه — اکنون همه لا اله الا اللهست

با عشق تو عهد جان ما مشتاقیست ١٦ ماییم و غم عشق تو تا جان باقیست

غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله ٣١ می خون جگر مردم چشمم ساقیست

گردی که بزیر پای هر حیوانیست ١٧ زلف صنمی و عارض جانانیست

هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست ١٧ انگشت وزیر یا سر سلطانیست

اندر ره عشق چون تو کی پیدا نیست ١٨ مستان شده ایم هیچ می پیدا نیست

مردان رهش بهمت دیده روند — زان در ره عشق هیچ پی پیدا نیست

این اسب قلندری همه تاخته نیست ١٩ وین مهرهٔ انجمن همه باخته نیست

گر کافر و مومنست بره پیش آید ٤٦ از روی نیاز با همه ساخته نیست

در عالم خاک باد پا کشیدم و رفت ٢٠ صد دشمن و دوست بر سر اکشیدم و رفت

با نیک و بد زمانه ام کاری نیست — دامن ز همه چنانکه داشت بکشیدم و رفت

با یار تو گر سخن نباید گفت ٢١ بالعربی زبان او نمی باید گفت

لا تفعل و افعل نکند چندین سود — چون با عجمی کن و مکن باید گفت

هر گشت بمثال پاسبان کوییت ٢٢ میگردم گرد آسمان کوییت

باشد که بر آید ای صنم روز شمار — نامم ز جریدهٔ سگان کوییت

ما را همه ره بکوی ناکامی باد ٢٣ وز سوختگی بهرهٔ ما خامی باد

ناکامی ما چو هست کام دل دوست — کام دل ما همیشه ناکامی باد

زد کردهٔ ما قبول کس کم یابد — عیشی مطرب و نشاه هر دم یابد

چون صبح ولای حق دمیدن گیرد ۲۵ جان از همه آفاق رمیدن گیرد
جایی برسد مرد که در هر نفسی — بی زحمت دیده دوست دیدن گیرد
نه با تو بخلوت نفسی یار توان زد ۲۶ نه بی تو دم عشق کسی یار توان زد
نه نیز ز دست جور خصمان تو دست — در دامن غیر یار دستی یار توان زد
افسوس که شرح عشق را دانه نماند ۲۷ امید به هیچ خویش و بیگانه نماند
دردا و دریغا که درین مدت عمر ۴۲ از هر چه بگفتیم جز افسانه نماند
آن روز که زرگان گردون زده اند ۲۸ مهر زر عاشقی دگرگون زده اند
واقف نشوی بر آنکه پس چون زده اند — کین زر ز سرای تحمل بیرون زده اند
قومی بگزاف در غرور افتادند ۲۹ وندر طلب حور و قصور افتادند
معلوم شود چو پرده ها بردارند . — کز کوی تو دور دور افتادند
— (دلهای خراب ما عمارت که کند ۳۰ وین کرده گناه ما کفارت که کند
ما بر سر خاکها زیارت کردیم ۱۶ تا بر سر خاک ما زیارت که کند
مردان رهت میل بهستی نکنند ۳۱ خودبینی و خویشتن پرستی نکنند
آنجا که مجردان حق می نوشند — خمخانه تهی کنند و مستی نکنند
جانا اگرم هزار جان خواهد بود ۳۲ قربان تو بر جمله روان خواهد بود
نامردم اگر به هیچ روی گویدا ۴۰ تا بوی تو در جهان [جان] خواهد بود
گرچه ز گناه جست و جو خواهد بود ۳۳ آن یار عزیز تندخو خواهد بود
از خیر محض جز نکویی ناید ۳۹ خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود
با قوت پیل مور پیدا باید بود ۳۴ با ملک سکندری عور پیدا باید بود
گیرم که تو سرفراز عالم شده ۲۷ آخر نه بزیر گور پیدا باید بود

گر هیز تو طبع بد آموز بود ۳۵ بدبختم اگر بخت تو فیروز بود
تو خفته و بود دلش بعشرت ۲۷ کوتاه حرسم که چو بیدار شوی روز بود

هرگز رخ سیاه ما در نشود ٣٦ تا معصیت از وجود ما در نشود
پر می نشود دکاسه سر ز هوس ١٩ هر کاسه که سرنگون بود پر نشود
پیریم ولی چو عشق ما سر آید ٣٧ از ما همه بوی طرب و ناز آید
از زلف دراز تو کمندی فکنیم — در گردن عمر رفته تا باز آید
خون ای دل و چشم نهاگستی دست بدار ٣٨ کان زخم چشیده و دیده لب کار
زان رفتن همچو جوی خون بر رخسار — یاد آور و جای جای نه پای ای یار
آن خال بر آن روی دل افروز نگر ٣٩ بر بر چه سرا دادست فیروز نگر
مانند شب سیاه دلسوختگان ٤٩ سر برزده از میانه روز نگر
تا کس چو حقیقتی رسد پیش نگیر ٤٠ آزاد اگر فرو فتد دستش گیر
هست از ازل نمود هشیاری دان ٣٦ هشیار که بی ادب بود تسمش گیر
ای مستر تو در پیشم بر صاحب راز ٤١ پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز ١ محروم ز درگاه تو کی گردد باز
غافل منشین که خویش و مانیست عزیز ٤٢ هر دم که بر آید از تو جانیست عزیز
عمریست که آمدست و خواهد رفتن ٣٨ ضایع مکنش که میهمانیست عزیز
پیدا شده رفیق دوری که مپرس ٤٣ وز ناکس و کس رسیده جوری که مپرس
یاری که از و توقع پرسش بود ٤٧ پرسید مرا ولی بطوری که مپرس
دارم گنهان ز قطره باران بیش ٤٤ دل هست مرا ازین تپش خسته و ریش
با ما گویش گفت بلای درویش ٦ تو در خور خود کنی و ما در خور خویش
هستیم بحضرت تو شتی درویش ٤٥ غرق گنه و امید رحمت در پیش
با ما سخنی گوی که چون گوته شود ٥ آن را ساز ای بهانه رحمت خویش
ای کرده جهانیان بیازار تو زیف ٤٦ گر جان بتو بخشم نه درخیست و نه حیف
سعد بود گر ز تو آن گید کیف — گر ان زلو سم کنی شکنند کیف

هر روز بروی نسیم گلشن نمناک ۴۷ چون غنچه گریبان صبوری زده چاک
باشد که بگوئید گل نورسته زکاه — یاران من خبری زان دل نورفته بخاک
کردم بطواف خانهٔ یار آهنگ ۴۸ سنگی دیدم فتاده آنجا بر سنگ
چون بود تهی زیار نا کرده درنگ — برگردیدم شکسته زبان سر دل تنگ
بگذر بدیار یار من ای باد شمال ۴۹ بر خاک رهش بجای من دیده بمال
در قصهٔ حال من گذار تو سوال — هل بات من الهجر علی احسن حال
سیفا ز جفای دهر بسیار منال ۵۰ هرگز نکند زمانه اظهار ملال
کین دولت دیگران واین محنت تو ۵۱ چون نیک نگه کنی خیالست خیال
گر با غم عشق سازگار آید دل ۵۱ بر مرکب کام خود سوار آید دل
گر دل نبود کجا وطن سازد عشق — ور عشق نباشد بچه کار آید دل
دستار سر و کفش من و جبه بهم ۵۲ قیمت کردند یک درم چیزی کم
بنی خاک رسم ز خاک ره چیزی کم ۱۸ آوازه که من شنیده اند در عالم
از حال سماع گشتوای مرد تمام ۵۳ این کار رسول حقست نه بازیچهٔ عام
مردان خدای را حلالست حلال — رندان دغای را حرامست حرام
گر من گنه خلق جهان کردستم ۵۴ عفو تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم — عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم
آمد شب هجر و تو نباشی دارم ۵۵ دو روزه که من است نه پیمانه مانم
در وصل تو بسته بود جان با جانم — چون رفتی ز دلت شد درمانم
یا نفس نفیس در منبر دم چه کنم ۵۶ وز کردن فعل خود برادرم چه کنم
گیرم بکرم درگذرانی گذری — زین شرم که دیدی که چه کردم چه کنم
عمرم بسبیر و همه گنه می بینم ۵۷ سر تا سر نامه را سیه می بینم
در مزرع خود نگشته ام تخم نکو ۱۴ بگذشتم بهر درو رسیده گه می بینم

در جنگ چو آهنیم و در صلح چو موم ۵۸ بر دوست مبارکیم و بر دشمن شوم
از غیرت ما تبر شکند آثار بمصر — در هیبت ما برند زنار بروم

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم ۵۹ با عافیت آشنا و همخانه شوم
ناگاه پری‌رخی بمن برگذرد — برگردم از آن حدیث و دیوانه شوم

بر کس ستم و رنج این تن خس ننهم ۶۰ در پیش قناعت قدمی پس ننهم
چون بار کسی کشید نمیتوانم — باری کم از آنکه بار بر کس ننهم

ما در نعمت آتشین جهان را حکمت ایم ۶۱ در ملک غمت ز دو جهان تاخته ایم
در راه سمند ما چنان تیز دو است — کز کون و مکان بیرون سرک تاخته ایم

گفتیم که ما ز عقل ابیم جدا ایم ۶۲ از راه وفای یار ما بیم شده ایم
آزرده ظاهریم و باطن نه چنان ۴۵ از عشق تو ما چنانکه میدانیم شده ایم
یک جو ایام بزاری خوشیم ۶۳ گر چه تلخ بود از سر ما بتحمل کنیم
چون غنچه سراپای ما از تلخی عشق ۶۹ لذت کسی طمع حاتم بزاری قبول کنیم

ما عادت خود بهانه جوئی نکنیم ۶۴ جز راستی و درستخوئی نکنیم
آنها که بجای ما بدیها کردند — گر دست دهد بجز نکوئی نکنیم

زنجیر در سرای شاهی مائیم ۶۵ خواص جواهر الهی مائیم
از ماه گرفته تا بماهی مائیم ۴۴ با این همه گنده گدائی مائیم

مائیم که در هیچ حسابی نائیم ۶۶ پر مشغله و میان تهی چون نائیم
روزی که حساب گنده مردان طلبند — زان کمتر کمترین کمتر مائیم

امروز که در نگاه داری و توانی ۶۷ بیخی که بر آرد دست آرد بیخ آن
پیش از تو از آن دیگران بود جهان — بعد از تو از آن دیگران باشد جهان

ای لطف تو اسباب جهان یار جهان ۶۸ در باغ تو گل جهان بود خار جهان
زانسان همه کسی گل ده بادار دلو ۳ تا مست بجهان آید و هشیار جهان

یارب نظری بر من سرگردان کن ۴۹ تدبیر من دلشده حیران کن
با من مکن آنچه من سزای آنم — آنچ از کرم و لطف تو آید آن کن

ای دل پس از این بی رخ زیبا چو کنی ۷ بی غمزه و بی زلف چلیپا چو کنی

چون می بینی که از کست آدمی هستیت — بنشین پس کار خویش و تنها چو کنی
ای
ای صراف وجود ما
هر صبح با غلامان بیا بر در ما ۲۳ مقصود دل تو بر نیاید آنگه گله کن
اقوال بعزم و فلح پنهان مکن ۲ دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار و فردا با من ۲۸ آ از کرم تو میسزد آن میکن
از دیده سنگ چون چکاند غم تو ۳ بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کش و همه همت تو کش غم ۹ تا از پس من کسی نماند غم تو
ای نالکه پیر قرطه پوش از غم تو ۴ وی خرقه ابد باره نوش از غم تو
فریاد دو دیوان مسیکر وحش از غم تو — در میکده جوش و خروش از غم تو
سبحان الله کاری غم تو بر خسته دلم غلیم بازی غم تو
گفتی که غمم هست چنین مجنون کرد — آری غم تو غم تو آری غم تو
تا کی بود این جور و جفا کردن تو ۶ بیهوده دل خلق آزردن تو
تیغست بدرت اهل دل خون تا کرد — گر در تو رسد خون تو در گردن تو
عشقیست که پیر تو بر او ایراد و بیا ۷ کاولیست که هرکار بیرون آید ازد
گه در کشمکش کند که جان رقص اید ۸ گه دلخستگی که بوی خون آید ازد
در کوشش ذکر حق زمان از همه به ۶ طاعت که بشب کنی گمان از همه به
خواهی که از زیل چراغ بهشت ان گوی ۲۱ نان ده بجهانیان که نان از همه به
بو ایما

ای لطف عمیم تو خطاپوش همه ٧٩ وی حلقهٔ بندگیت در گوش همه
بردار خدایا ز کرم بار گناه ٢ در روز فرومانده گی از دوش همه

مردی بلید بلند همت مردی ٨٠ زین تجربه کرده خرد پروردی
گو را به تصرف اندرین مخزن خاک — بر دامن همت نه نشیند گردی
با محنت دل اندوه قرینم کردی ٨١ محتاج به یکسان چو یتیم گردی
این مرتبهٔ مقربان درگهت ٥٠ آیا بچه خدمت این چنینم کردی
گه همدم یار نازنینم کردی ٨٢ گه با غم و درد همنشینم کردی
تا یافتم از کمترکی خویش گسل — مشهور همه ادی زمینم کردی
ای دل تو دمی مطیع سبحان نشدی ٨٣ از خوی بدت هیچ پشیمان نشدی
درویش شدی و زاهد و دانشمند ١٢ این جمله شدی ولی مسلمان نشدی
هر چند که دیوانه و مستم داری ٨٤ در کعبه نشسته بت پرستم داری
هر نیک و بد کلام مرا دستی نیست — در دست توام تا که چه دستم داری
بر سنگ قناعت ار عیاری داری ٨٥ از نیک و بد جهان کناری داری
گر با همه کس به خلاف که رود — در کار نشوی اگر از کاری داری
ای دل به علی اگر موافق باشی ٨٦ اندر ره دین مومن صادق باشی
یا مومن پاک باش یا کافر صدق ٢٥ کافر باشی به که منافق باشی
دنیا گذرد العتت لهو جیش و لهی ٨٧ خواهیش ... دگران خواه همی
زین منزلت البته همی باید رفت — خواهی به هزار سال و خواهی به دمی
گر بی ملت خود نقش کنم برنانی ٨٨ ور نان تان به همه پیش سگی بر کانی
آن سگ سالی گرسنه در کمبدانی ٤٤ از ننگ بر آن نان نظر نکند و انی
ای دل چه بود که ترک بیداد کنی ٨٩ از منزل آخرت یکی یاد کنی
گر نامهٔ اعمال ترا بنمایند ١١ بینی دیوان آه و فریاد کنی
ای مردان های دای جوانمردان بوی ٩٠ مردی کن و دستگاه داری هر کوی
گر پیر آید چنانکه آید و کاند موی — نومیدانه که از درکت ناگردانی ردی

نیم

گذشته از کتابهای چاپی و چند مرجع دیگر که پیش ازین ذکر کردم برخی ازین رباعیها در چند کتاب خطی بشرح زیر نیز آمده است :

۱- سفینه که در شیراز برای یک تن از وزیران قرن هشتم تاج الدین احمد گرد آمده و نسخهٔ اصل آن در کتابخانهٔ شهرداری اصفهان است.

۲- مجموعهٔ از رباعیات بنام نزهة المجالس که جمال الدین خلیل شروانی بنام شروان شاه علاء الدین فریبرز (۶۴۲ - ۶۴۹) گرد آورده و نسخهٔ از آن که تاریخ ۲۵ شوال ۷۳۱ دارد جزو مجموعهٔ بشمارهٔ ۷۶۶ با نسخهٔ از دیوان فخر الدین عراقی در کتابخانهٔ جار الله افندی، و عکسی از آن در کتابخانهٔ ملی موجود است.

برخی ازین رباعیات را هم در سفینه‌های مختلف ضبط کرده‌اند. پیداست که پاره‌ای از آنها در کتابهای مختلف بنام سرایندگان دیگر مانند امام عمر خیام و خواجه افضل الدین کاشانی نیز آمده است، از آن جمله شماره‌های ۵، ۱۶، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۳۶، ۳۷، ۴۱، ۴۴، ۵۱، ۵۴، ۵۹، ۶۳، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۷، ۷۸، ۸۱، ۸۵، ۹۰، بنام ابوسعید ابوالخیر عارف مشهور نیز آمده است.

خدا بخش لائبریری جرنل کا آئندہ شمارہ

مخطوطاتِ تصوّف

کے موضوع پر ہوگا

یہ مجلہ جنوبی ایشیائی تصوّف سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔

:(جس میں):

تقریباً سوا سو اہم مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے کتب خانوں میں محفوظ تصوّف کے ایسے مخطوطات کی فہرستیں بھی شامل ہوں گی جو اب تک طبع نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ فہرستیں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

تعداد صفحات تقریباً ۷۰۰ ——— آفسٹ کی معیاری طباعت

باذوق حضرات پیشگی آرڈر فرما کر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر

نسخهٔ رباعیاتش، که محفوظ است در کتابخانه خدابخش پتنه، دارای ۱۵ رباعیات است بعضی از آنها هم منسوب بخیام اند؛ و بگمانِ غالب این کلامِ باخرزی ست نه کلامِ خیام۔ چنانکه هم محمد بشیر الحق بیدل دیسنوی دانش پژوه هندی گمان میبرد، و آنها چنین اند:

سیف الدین باخرزی	خیام
در عالم خاک در باد چاشیدم و رفت	در عالم خاک، خاک پاشیدم و رفت
صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت	صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با نیک و بد زمانه ام کاری نیست	با چون و چرای تو مرا کاری نیست
دارنده چنانکه داشت باشیدم و رفت	چندانکه بداشتی بپاشیدم و رفت
	(نسخهٔ چاپی نولکشور و نسخهٔ چاپی روز بازار، امرتسر، هندستان)
هرگز شبِ سیاه مادر نشود	شب نیست که عقل در تحیر نشود
تا معصیت از وجود مادر نشود	زگریه کنار من پر از در نشود
پر می نشود کاسهٔ سر از هوس	پر می نشود کاسهٔ سر از سودا
کاسه که سرنگون بود پر نشود	کاسه که سرنگون بود پر نشود
	(نسخهٔ چاپی نولکشور و نسخهٔ چاپی روز بازار امرتسر، هندستان)
یک جو ز ایام نداریم خوشیم	یک جو غم ایام نداریم خوشیم
گر چاشت بود شام نداریم خوشیم	گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چو پخته بما می رسد از مطبخ عشق	چو پخته بما می رسد از مطبخ غیب
از کس طمع خام نداریم خوشیم	از کس طمع خام نداریم خوشیم
	(نسخهٔ چاپی امرتسر)

سیف الدین باخرزی

گردی که بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست
انگشت وزیر یا سر سلطانیست

افعال بدم ز خلق پنهان میکن
دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطف تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

خیام

خاکی که بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خست که بر کنگرهٔ ایوانیست
انگشت وزیری و سر سلطانیست

(نسخهٔ دستی خطی و نسخهٔ چاپی تصحیح سلیمان ندوی)

غمهای جهان بر دلم آسان میکن
وافعال بدم ز خلق پنهان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

(ایضاً)

گر من گنه روی زمین کردستم
عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

(نفحات الانس)

رضا قلی هدایت صاحب ریاض العارفین میگوید که تعداد رباعیاتی که مشترک‌اند ما بین ابوسعید ابوالخیر و باخرزی
...یح خط کم از کم سی عدد یست ـ مشتی نمونه از خرداری که تصدیق این قول کند اینست ـ

رباعیات باخرزی

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت آشنا دمی هم خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن بر گذرد
برگردم ازان حدیث و دیوانه شوم

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت گنشت دمی هم خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن بر گذرد
برگردم ازان حدیث دیوانه شوم

رباعیات باخرزی

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطفِ تو امیداست که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

ای سرّ تو در سینهٔ هر صاحبِ راز
پیوسته در رحمتِ تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطره باران بیش
دل هست مرا ازین غمش خسته و ریش
با ما کرمش گفت بلا ای درویش
تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

باعشق تو عهد جان ما مشتاقیست
مائیم و غم عشق تو تاجان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خونِ جگر مردم چشم ساقیست

از دیده سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کشم و همه غمت نوش کنم
تا از پس من بکس نماند غم تو

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

گر من گنه روی زمین کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

ای سرّ تو در سینهٔ هر صاحبِ راز
پیوسته در رحمتِ تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
از شرم گنه فگنده ام سر در پیش
آواز آمد که شاد باش ای درویش
تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

ما عاشق و عهد جان ما مشتاقیست
مائیم ز درد عشق تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خونِ جگر مردم چشم ساقیست

از دیده سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا نداند غم تو
دردی خورم و غمت همی نوش کنم
تا آنکه بکس دگر نماند غم تو

رباعیات باخرزی

بی علم و عمل بهشت یزدان مطلب
بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود
آزار دلِ هیچ مسلمان مطلب

گر جرم زگناه جست و خواهد بود
آن یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که به شب کنی نهان از همه به
خواهی زپل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

با محنت و اندوه قرینم کردی
محتاج به یک نان جو نیم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
آیا به چه خدمت این چنینم کردی

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

از چرخ و فلک گردش یکسان مطلب
در دورِ زمانه عدل سلطان مطلب
روزی که به رنج کردر جهان خواهی بود
آزار دلِ هیچ مسلمان مطلب

گویند به حشر گفتگو خواهد بود
وان یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی نه آید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که به شب کنی نهان از همه به
خواهی زپل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

با فاقه و فقر همنشینم کردی
محتاج به یک نان شبینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
یارب به چه خدمت این چنینم کردی

(ترجمہ از مقالات مطبوعہ مجلۂ معارف، اعظم گڑھ، ہند ۶۷ (۵) ۶۸ (۳)، مئی و ستمبر ۱۹۵۱ء)

••

رباعیات شیخ العالم

رباعیات باخرزی

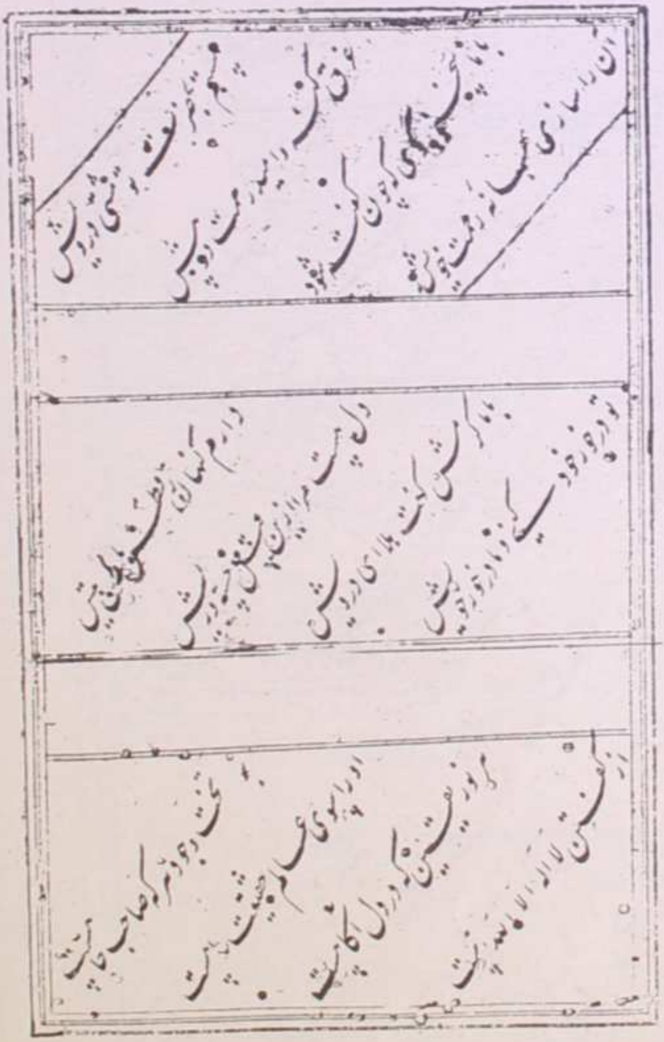
نسخۂ خدا بخش کا عکس

رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی

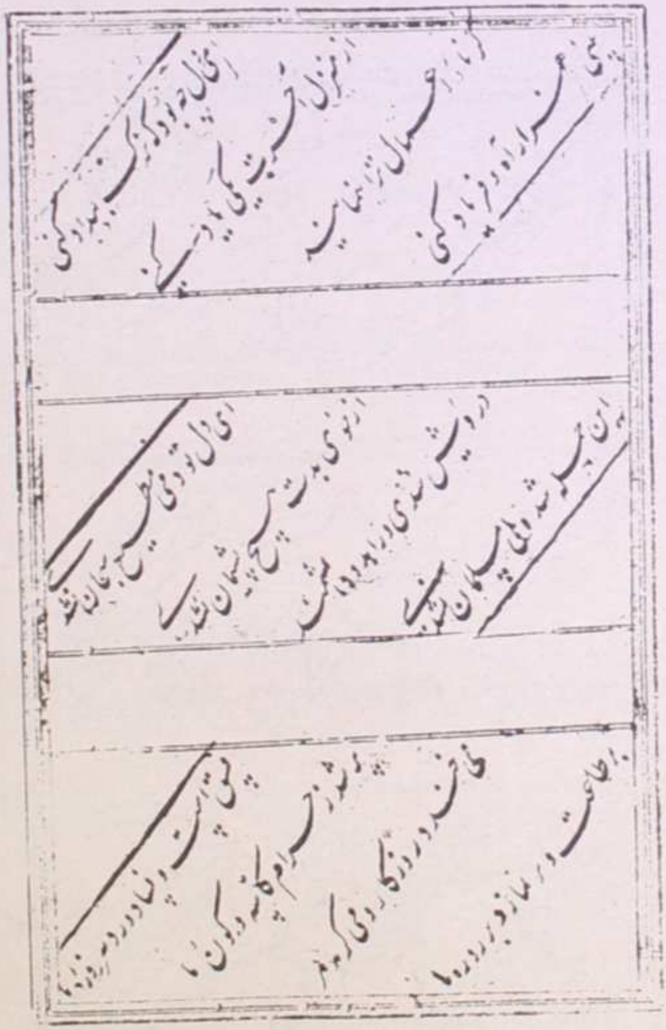
قدس الله تعالی سره العزیز روح وروحه

ای مهر تو در سینهٔ هر صاحب راز
پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کس گردد باز











نکهت دو زلف یار چو ساطع نیست
ز حسرت چشم گلرخان گردد نیست
بزن صبحی و عارض جانانه نیست
ز روی یار پیچیده پای مرغ نیست

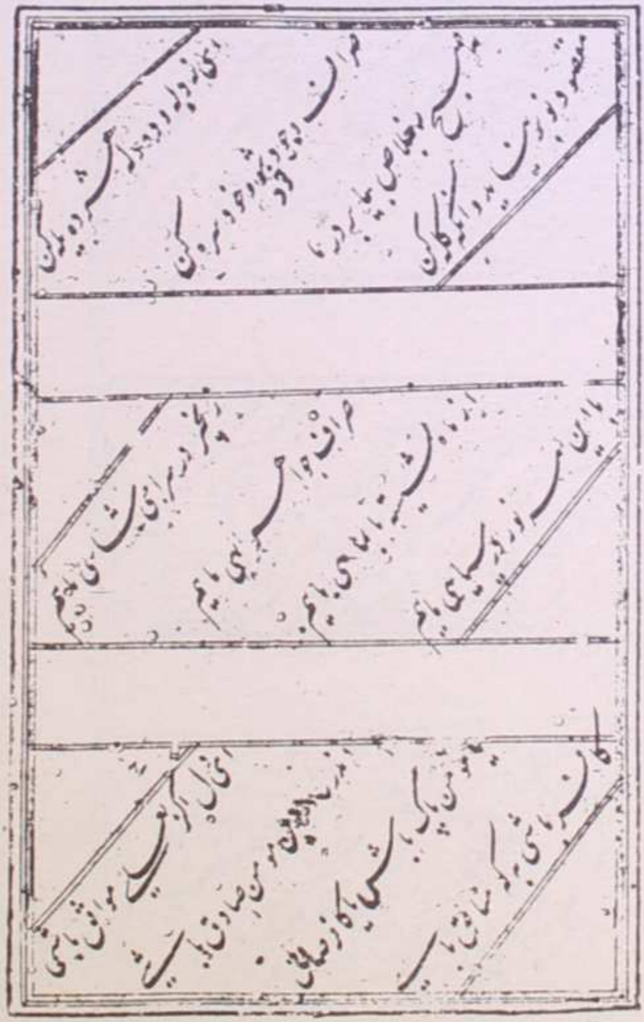
من غافلم ز رنگ دم مزنی کم
دل ما زمین ... غم مزنی کم
فتنه گر و در ره غم مزنی کم
سر از پی من شنیده اند و رعام

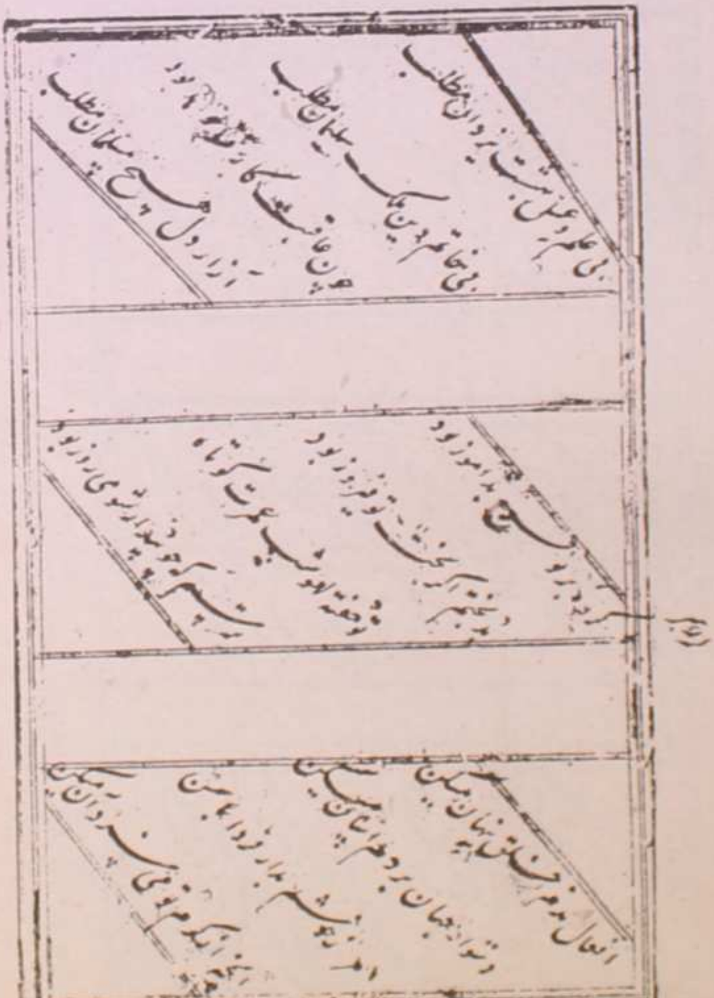
کار سر گشته گرفتن او ور شود
پی زلف تو کار پس ... دوس
تا معصیت از دو دو ما در شود
بر از غم پیما ما در شود

در عالم بالا و دنیا کسی بیچاره‌تر از من نیست
صد دشمن و دوست بیزار شده از من نیست
با یکی و دو در با هم گوهر کانی نیست
دارم خاک به در خانه باشد مردن نیست

کس ز رخ برق ربایان از رمه
دعایت به برشان آن از رمه
ای سرو ... طرازان نگری
ان ده به ... تابان زمین

ای کردی ... خیال کس کم پایه
نیت ... احبات مردم باید
... بیا ... ولا و دری
... بس ... و شاطر مردم باید





از پس صبح قیامم بود از عمر نصیبم
چون شب هجر سیاهی زده از بخت عشق
بی تو بشت بود بر من تو بیم
گر تو بر این امیدم بود از عمر نصیبم

فغان از دل تیغ سر مردم دوخت
از پی او دل بیکسی جای بیفکند
گر سر بیدی او بر خرمی او بسوخت
جان در تن مردی او بسوخت

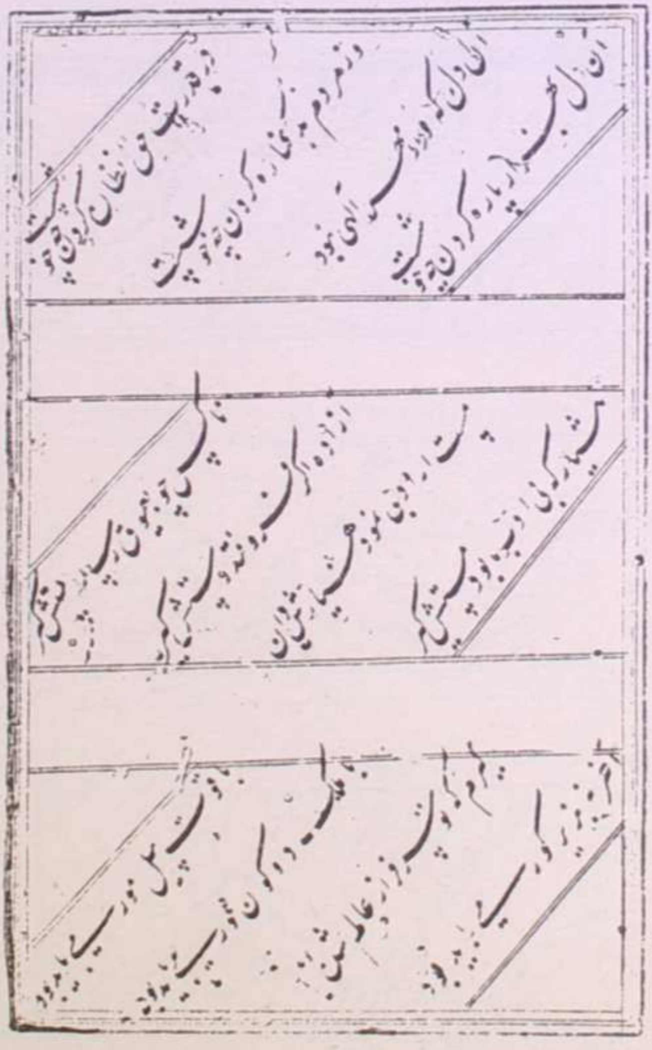
می زدن با سر مردم چشم بیافت
عشق شفق و بیغم در دو وصل بیا
با غم عشق تو با جان یافت
با عشق تو عهد جان شناخت

غزلیات

دل در دو جهان بسته [illegible] قیمت
اسب و کمر و کلاه و زر و زیور چه حیثیت
چون [illegible] بست [illegible] گردد چه حسرت
گویند ز نسرین [illegible] تهمت

گر [illegible] بیمار [illegible] کردی
گر [illegible] در [illegible] کردی
[illegible] نشان
[illegible] کردی

[illegible] چو [illegible] کوی
خواهش [illegible] گلبند [illegible]
[illegible] الغیب [illegible] بدست
[illegible]



عاشق مسکین کجا [illegible] بایست عزیز
هر دم که برای از تو جدا [illegible] بایست عزیز
عمر بایست که با ما [illegible] وفادار من
ضایع [illegible] کس [illegible] میان نیست عزیز

بی تو [illegible] جو [illegible] خواهد بود
آن یار [illegible] که [illegible] خواهد بود
زنجیر [illegible] مخلص [illegible] بندی ناید
بر [illegible] عاقبت که خواهد بود

جانا که [illegible] ز هجران تو خواهد بود
زان [illegible] تو [illegible] ان خواهد بود
هر دم که [illegible] شادی کردم
یادی [illegible] ان خواهد بود

نفس باقی [illegible] در عهده [illegible]
از [illegible] است [illegible] چشم [illegible]
تحصیل [illegible]
[illegible]

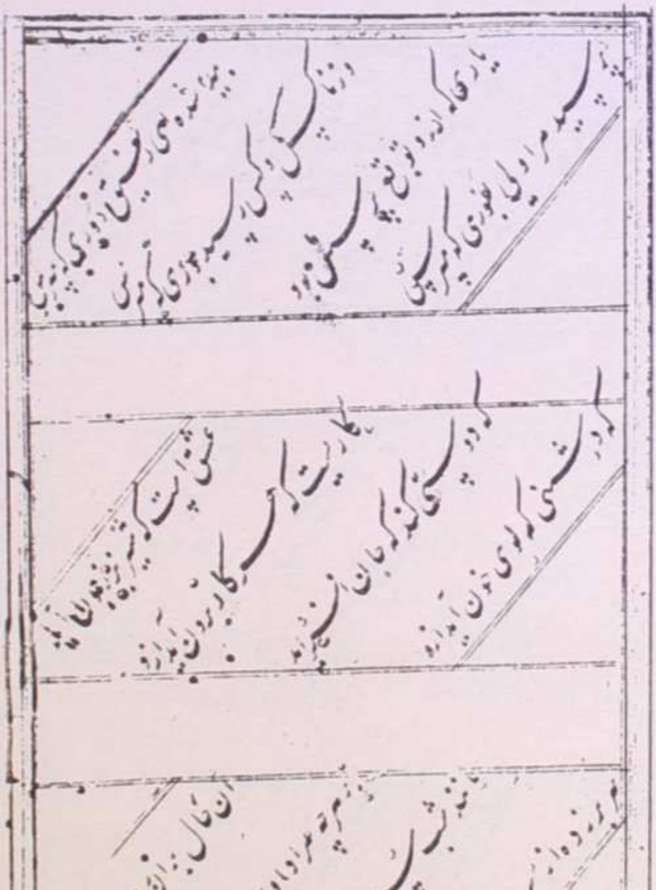
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
مثال دل [illegible]

گر کار تو خود وحشی تمیز زبانی
وآن زن که تنم پیش سگی از تو توانی
آن چشم که سالی که [illegible] وکیدانی
[illegible] ز آن آن زر [illegible]

[illegible] ما در لغت از آمده ایم
از راه دوان باده بیا [illegible]
از پیش تر ما مرم و با جمن [illegible] یان
از خود بس [illegible] ما ایم

این [illegible] قلندری [illegible] خوبیست
وین [illegible] انجمن [illegible] خوبیست
[illegible] و دو منت [illegible] پیش است
[illegible] از [illegible] با خوبیست



با دولت و ندره دولت پیر گردی
چندان که بکیسه بان جوانی پیر گردی
این مرتبه عشق بان دراز است
اما که بخدمت بی اعتبر گردی

چشم بد ز دعای دو مرتب ریثال
پیری که بکمال از زمانه ز اعدای ملال
سیمین دولت و کبر ان بن مخبث تو
چون ماه سیمین حسن الرجال

تمت کتبه فقیر حمید خوئه

داخل کتب خانه نواب سید فدا حسن خان دام اقبالهم
گردید سیزدهم جنوری سنه ۱۸۶۴ع
مطابق سیوم شعبان سنه ۱۲۸۰
کتبه حاجی محمد فدا حسین عفی عنه
مقام لکهنؤ

50.

با محنت و اندوه قرینم کردی   محتاج بیک نان جوینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست   آیا بچه خدمت اینچنینم کردی

51.

سیفا ز جفای دهر بسیار منال   هرگز مکن از زمانه اظهار ملال
کین دولت دیگران وین محنت تو   چون نیک نگه کنی خیال است خیال

• •

42.

افسوس که مرغ عشق‌را دانه نماند   امید بهیچ خویش و بیگانه نماند
دردا و دریغا که درین مدت عمر   از هر چه بگفتیم جز افسانه نماند

43.

آبست به تحقیق مثال دل دوست   میدار بخاطر که مثال نیکوست
گر صاف بود نهان ندارد ز تو هیچ   ور تیره بود نهان بود هر چه دروست

44.

گر طاعت خود نقش کنم بر نانی   وان نان بنهم پیش سگی بر خوانی
آن سگ سالی گرسنه در کبدانی   از ننگ بران نان نزند دندانی

45.

گفتیم که ما از فقرائیم و نه ایم   از راه روان پارسائیم نه ایم
آراسته ظاهریم و باطن نچنان   افسوس چنانکه می نمائیم نه ایم

46.

این اسپ قلندری همه تاخته نیست   وین مهره انجمن همه باخته نیست
گر کافر و مومنست بره پیش آید   از روی نیاز با همه ساخته نیست

47.

پیدا شده ای رفیق دوری که مپرس   وز ناکس و کس رسید جوری که مپرس
یاری که ازو توقع پرسش بود   پرسید مرا ولی بطوری که مپرس

48.

عشق است که شیر نر زبون آید ازو   کاریست که هر کار برون آید ازو
گه دوستی کند که جان افزاید   گه دشمنی که بوی خون آید ازو

49.

آن خال بران روی دلافروز نگر   بر هر چه مراد اوست فیروز نگر
مانند شب سیاه دل سوختگان   سر بر زده از میانهٔ روز نگر

34.

دنیا گذرانست بهر بیش وکمی   خواهیش بشادی گذران خواه غمی
زین منزلت البته همی باید رفت   خواهی بهزار سال و خواهی بدمی

35.

در قدرت حق نظاره کردن چه خوشست   وز مردم بد کناره کردن چه خوشست
آن دل که درو مهر النبی نبود   آن دل بهزار پاره کردن چه خوشست

36.

ناکس چو بعیوق رسد پستش گیر   آزاده اگر فرو فتد دستش گیر
مست ار ادبی نمود هشیارش دان   هشیار که بی ادب بود مستش گیر

37.

با قوت پیل مور می باید بود   با ملک دوکون عور می باید بود
گیرم که تو سرفراز عالم شدهٔ   آخر نه بزیر گور می باید بود

38.

غافل منشین که خوش زمانیست عزیز   هردم که برآید از تو جانیست عزیز
عمریست که آمد است وخواهد رفتن   ضایع مکنش که میهمانیست عزیز

39.

گرچه زگناه جست و جو خواهد بود   آن یار عزیز تندخو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید   خوش باش که عاقبت نکوخواهد بود

40.

جانا اگرم هزار جان خواهد بود   فرمان تو بر جمله روان خواهد بود
نامردم اگر بهیچ شادی کردم   تا بوی تو در جهان خواهد بود

41.

مستوفی عشقت صنما روز نخست   تحصیل غمت بنام من کرد درست
آنگاه برات اشک بر وجهم راند   غم باقی کرد وگفت در عهدهٔ تست

26.

بی علم و عمل بهشت یزدان مطلب   بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود   آزار دل هیچ مسلمان مطلب

27.

گر رهبر تو طبع بدآموز بود   بدبختم اگر بخت تو فیروز بود
تو خفته نبو و شب عمرت کوتاه   ترسم که چو بیدار شوی روز بود

28.

افعال بدم ز خلق پنهان میکن   دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من   آنچه از کرم تو می سزد آن میکن

29.

یکنخود ز ایام نداریم خوشیم   گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته بما میرسد ازمطبخ عشق   ازکس طمع خام نداریم خوشیم

30

جان در تن مرد بی‌ادب ارزانست   گر زر بدهی ادب خری ارزانست
از بی ادبی کسی بجائی نرسید   حقا که ادب تاج سر مردانست

31.

با عشق تو عهد جان ما مشتاقیست   مائیم و غم عشق تو تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله   می خون جگر مردم چشمم ساقیست

32.

دانی چه بود شرط خرابات نخست   اسپ وکمر وکلاه در بازی چست
چون مست شوی پایتو میگردد سست   گویند نشین هنوز باقی بر تست

33.

گه همدم یار نازنینم کردی   گه با غم و درد همنشینم کردی
تا یافتم از گم شده خویش نشان   مشهور همه روی زمینم کردی

18.

دستار من و کفش من و جبهٔ بهم   قیمت کردند یک درم چیزی کم
آوارهٔ من شنیده اند در عالم   من خاکرهم زخاک ره چیزی کم

19.

هرگز شبهٔ سیاه ما دُر نشود   تا معصیت از وجود ما در نشود
پر می نَشود کاسهٔ سر ما ز هوس   کاسه که سر نگون بود پر نشود

20.

در عالم خاک و باد چاشیدم و رفت   صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با نیک و بد زمانه ام کاری نیست   دارنده چنانکه داشت باشیدم و رفت

21.

در گفتن ذکر حق زبان از همه به   طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی که ز پل صراط آسان گذری   نان ده بجهانیان که نان از همه به

22.

ردکردهٔ ما قبول کس کم یابد   پذیرفتهٔ ما حیات سرمد یابد
هر کس که بما کند تولا روزی   عیش و طرب و نشاط هردم یابد

23.

ای نه دله و دو دله هزده یله کن   صراف وجود شو و خود سره کن
هر صبح باخلاص بیا بر در ما   مقصود تو بر نیاید وانگه گله کن

24.

زنجیر در سرای شاهی مائیم   صراف جواهر الهی مائیم
از ماه نشستهٔ تا بماهی مائیم   با این همه نور در سیاهی مائیم

25.

ای دل اگر بعلی موافق باشی   اندر ره دین مومن صادق باشی
یامومن پاک باش یا کافر صدق   کافر باشی به که منافق باشی

10.

هر شب بمثال پاسبان کویت   میگردم گرد آستان کویت

باشد که برآید ای صنم روز حساب   نامم ز جریده سگان کویت

11.

ای دل چه بود که ترک بیداد کنی   از منزل آخرت یکی یاد کنی

گر نامهٔ اعمال ترا بنمایند   بینی و هزار آه و فریاد کنی

12.

ای دل تو دمی مطیع سبحان نشدی   از خوی بدت هیچ پشیمان نشدی

درویش شدی و زاهد و دانشمند   این جمله شدی ولی مسلمان نشدی

13.

فسق است و فساد ورد هر روزهٔ ما   پر شد ز حرام کاسه وکوزه ما

می خندد روزگار و میگرید عمر   بر طاعت و بر نماز و بر روزهٔ ما

14.

عمرم بسر آمد و گنه می بینم   سر تا سر نامهرا سیه می بینم

در مزرعه خود نکشته ام تخم نکو   کشتم بدرو رسید و که می بینم

15.

بگرفت بدست زلف چون شستش را   بشکست بمشت نرگس مستش را

امید من آنست بزودی نه بدیر   چشم تر او خشک کند دستش را

16.

دنیای خراب ما عمارت که کند   وین کرده گناه ما کفارت که کند

ما بر سر خاکها زیارت کردیم   تا بر سر خاک ما زیارت که کند

17.

گردی که بزیر پای هر حیوانیست   زلف صنمی و عارض جانانیست

هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست   انگشت وزیر یا سر سلطانیست

2.

ای، لطف عمیم تو خطاپوش همه وی حلقه بندگیت در گوش همه
بر دار خدایا ز کرم بار گناه در روز فروماندگی از دوش همه

3.

ای لطف تو امسال همان پار همان در باغ تو گل همان بود خار همان
زان بر همه کس کشاده بادا در تو تا مست همان آید و هشیار همان

4.

هر نقطه که در دایرهٔ قسمت اوست بر حاشیه مایده نعمت اوست
در سینه هر ذره اگر بشکافند دریا دریا جهان جهان رحمت اوست

5.

هستم بحضرت تو مشتی درویش غرق گنه و امید رحمت در پیش
با ما سخنی گوی که چون گفته شود آنرا سازی بهانهٔ رحمت خویش

6.

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش دل هست مرا ازین تپش خسته و ریش
ب ما کرمش گفت علا ای درویش تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

7.

بر تخت وجود هر که صاحب جاهست اورا سوی عالم حقیقت راهست
هر نور یقین که در دل آگاهست از گفتن لا اله الا الله است

8.

سبحان الله شگوف کاری غم تو بر خسته دلم عظیم باری غم تو
گفتی که غم منت چنین مجنون کرد آری غم تو غم تو آری غم تو

9.

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کشم و همه غمت نوش کنم تا از پس من بکس نماند غم تو

and whole-souled religious belief. Throughout the Rubāiyat there runs a deep religious undercurrent which is alike refreshing and invigorating. He was permeated through and through with the divine fire which glowed clear and bright in line and which has found a noble expression in the opening Rubāiyat.

Whether he rises to the lofty conceptions of Omar Khayyam or not is a question which need not be discussed or debated here but there will hardly be two opinions upon the intrinsic worth and value of his Rubāiyat.

He does not scoff at things divine nor regard life purely from the point of view of physical pleasure or sensual gratification. But, to our mind, that which ensures his immortality is that he, like a true prophet, saw with clearness and expressed with force, that religion consists not in the repetition of set formulae or in the exercise of ordained practises, but in single-hearted love and devotion to the Almighty and in honest and straightforward dealings with one's fellow-creatures. The poet, living in a century of storm and stress and finding himself surrounded by a flood of ungodliness arrives at the unwelcome conviction of the unreality and hollowness of life and takes upon himself to preach by precept and example that true nobility of soul is attained by self-abasement and true religious life reached by sincere and genuine beliefs and not by their counterfeits.

It is possible, though we have no clear proof of it, that he spent the later portion of his life in silence and solitude brooding over things divine or mourning over things temporal, watching the gathering storm slowly rising over the Muslim horizon and adorning the title of the Shaikh-ul-Alam which his contemporaries conferred upon him in recognition of his intellectual attainments and saintly virtues.

Might we not say with Swinburne:

Shall he not win from latter days
More than his own could yield of praise?

بسم الله الرحمن الرحیم

رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی قدس
الله تعالی سره العزیز وروح روحه

1.

ای سر تو در سینه هر صاحب راز پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هرکس که بدرگاه تو آید به نیاز محروم ز درگاه تو کی گردد باز

S. Khuda Bakhsh, Saifuddīn Būkharzī.

Our Ms. of Saifuddīn's Rubāiyat is written in fine, clear nastaliq, within gold ruled columns, with an artistic heading at the beginning. It is not dated but it apparently belongs to the fifteenth century. Of the life of the author we possess the barest and vaguest outline. The notices in the biographies are provokingly short and unsatisfactory. It is all the more to be regretted as we should have liked to know the gradual growth of his intellectual power, the successive stages through which he passed bringing him ultimately into prominence, the political influence, if any, that he possessed or wielded. For the solution, however, of these questions we seek in vain in the meagre biography of our author which has floated down to us through the stream of ages. The biographers have contented themselves with recording that he was a celebrated personage of his time, that after the completion of his studies he became a disciple of Najmuddin Kubra who sent him as his *Khalifa* to Bukhara. So far we are upon solid ground in as much as the biographers are absolutely agreed upon these points but further and beyond we are in entire darkness. Even the very date of his death is differently given by different-authors. According to some he died at Bukhara in 648 A. H. but according to others in 658 A. H. Suhaf (صحف Bankipur Ms. Folio 381 B) rejects both these dates and fixes 659 A. H. as the year of Saifuddīn's death. We are, however, inclined to accept 658 A. H. as the correct date and the story related in Haft Iqlim (Folio 202 A, Bankipur Library) lends colour and support to this theory.[1]) It is there stated that Saifuddīn was entrusted with the charge of the madrasah which the mother of Mangu Khan had founded and endowed at Bukhara.[2]) This fact, if correct, clearly indicates that our author was not altogether unknown to fame or fortune and that he must have possessed a personality strong and powerful enough to allure and attract and rivet the attention of a court neither very spiritual nor intellectual either.

Thus much we know of our author. The Rubāiyat numbering only fifty-one consist of either splendid invocations to the Almighty or solemn elegies upon the waning glory of Islam or dignified satires upon the pharisaic artificiality of the Muslims. They are too few indeed to give us a glimpse of the life of the author or warrant us to construct a biography out of them. Possibly Saifuddīn wrote many more which have perished. Some of the Tazkiras, indeed, quote Rubāiyat of Saifuddīn omitted in our Ms.

Whatever else Saifuddīn may have been there is one thing which his Rubāiyat amply demonstrate and it is his deep-seated

1) For further authorities see Jami's Nafhāt (نفحات الانس جامی) p. 495 Cal. Ed.; Makhzan ul-Ghara'ib (مخزن الغرایب) Ms. p. 340.

2) Howorth, History of the Mongols Part I p. 188.

Saifuddīn Bākharzī.

By

S. Khuda Bakhsh, M. A., B. C. L.

Europe is familiar enough with the mystical muse of Jalal-uddin Rumi, the ripe and mellowed wisdom of Sadi, the passionate lyrics of Hafiz, the cynical and sceptical utterances of Omar Khayyam and other Persian poets of lesser note, but still there are many poets—singers of sweetest songs—whose works have not yet seen the light of day. The Khuda Bakhsh Oriental Public Library at Bankipur is perhaps the richest and finest in India in Divans. The Mss. are not merely exquisitely written and magnificently illuminated, but the Library can claim possession of some Divans which are all but unknown. This observation does not apply merely to the poetical collection but equally well to the historical and theological collections. We have already published an extract from the scarce and invaluable work of Ibn Ḥazm, entitled Jamharatu-n-Nasab and we now publish the Rubāiyat of Saifuddīn Bākharzī. We shall shortly be in possession of a complete Catalogue which is being done with great care and industry by Maulavi Muqtadir of Calcutta and the assistant Librarian Maulavi Shihābuddīn.

Before I pass on to the life of Saifuddīn, I might mention here some of the Divans and poetical works which, so far as we have been able to ascertain, are exceedingly rare.

1. Ghazaliyat of Salman of Sawa (d. 778 A. H.).
   our copy is dated 811 A. H.
2. Divan of Ruknuddin Ṣāin of Herat (d. 785). ركن الدين صائن
   our Ms. is dated 883 A. H.
3. Divan of Faṣīḥī (d. 1046) ديوان فصيحى هروى.
   This Ms. was written two years before the death of the author.
4. Divan of Mirza Kamrān (d. 964 A. H.) (Son of the Emperor Babar).
   This Ms. bears the autograph of some of the Mughal Emperors.
5. Kulliyat of Munir Lahauri (d. 1054 A. H.)

Amrik Singh

Shahidganj dispute

The Muslims claimed it (Gurdwara Shaheed Ganj in Lahore in the mid-30s) to be a mosque though it had been a gurdwara for about two centuries. The court turned down the Muslim contention and this led to a prolonged confrontation in which, as in the present case, a large number of valuable lives were lost. The British government however did not budge from the position upheld by the court.

The interesting thing is that even after 1947, when there is hardly anyone to visit the gurdwara, the character of that building has not been changed and it has not been converted into a mosque. If this can happen in Pakistan, which according to its Constitution is described as an Islamic state, can India which describes itself as a secular state act differently?

(Source : Times of India, Patna, dt.10/11/1990.)

difficult for Sir Sikandar to remain leader of the party.

As a last resort, the premier sought the governor's help who exercised his extraordinary powers and disallowed introduction of the bill.

In a memorable address to the assembly, the premier made three points firstly, he said that if today the Muslims got enacted a new law to get back Masjid Shahid Ganj then the Hindus too would demand restoration of their temples which had been seized during the Muslim rule; his second point was that the Muslims were in a minority in seven provinces out of the eleven in British India and if in Punjab they showed no consideration to the sentiments of non -Muslims their co-religionists in other provinces could not expect a better treatment; thirdly he said that it was not at all proper to nullify a decision of the highest court of the province on the strength of their majority in the legislature.

The Unionist Party had always been painted by the nationalist minded people as an organisation of toadies and decadent feudal lords. But looking back we find that the Unionist leaders represented a more healthier attitude on several socio-economic problems than the nationalists of those days. While making a comparison between the present-day controversy over Ram Janambhoomi in Ayodhya and that concerning the Shahid Ganj mosque in Lahore one cannot fail to notice that in accepting the high court verdict the Muslim leaders showed commendable restraint at that time.

It is also apt to remember that even after the partition nothing was done in Pakistan to reconert the Shahid Ganj monument into a mosque. There is a lesson for our present-day leaders if they care to recall the forgotten controversy of more than half a century.

(Source: The Times of India,Patna, dt.18.6.90)

parts of Punjab. So important was the matter that Mr. Jinnah announced a special session of the Muslim League to consider ways of recovering the mosque. However, the city of Lahore did not witness any large scale rioting during the period in which the controversy raged over northern India. One person who acted with restraint in the matter was Mohammad Ali Jinnah, president of the Muslim League. It should be remembered here that Jinnah, in those days, was not too fond of agitations and defiance of authority. Being a man of secular tastes in his private life he was hardly touched emotionally by disputes involving mosques and temples. But as leader of the Muslim League he could not afford to remain indifferent if such a controversy.

In February 1936 he came to Lahore had made it clear that he would intervene in the matter only if the Muslims of the city gave an undertaking that they would abide by his decision. During his stay in the city he first met the Punjab governor and tried for the release of Muslim agitators. The governor agreed to free them if the civil disobedience movement was stopped and nothing was done to break the law for recovery of the mosque. This was agreed and the agitators were released.

Later Jinnah met the Sikh leaders also and impressed upon them the need of communal amity. They received him well and also allowed any Muslim to go anywhere near the site. Before going back to Bombay Jinnah constituted a committee for settling the issue. The committee which they called Shahid Ganj Reconciliation Board had among its members people like Dr. Iqbal, Raja Narindernath, Sardar Ujal Singh, Sardar Sampooran Singh and Pandit Nanak Chand. Unfortunately the committee could not achieve much. However, Jinnah could certainly ease the tension.

After a year and half, the Muslim leaders of Lahore again requested Jinnah to come there since their appeal in the Lahore High Court had reached a crucial stage and his assistance was considered important to plead the Muslim case. But Jinnah did not agree with the suggestion. He said that he had earlier gone to Lahore as a mediator and it would look odd if he went there to plead the case of one party. He suggested the name of another barrister, an Englishmen, who was ultimately engaged.

Looking back on these events after more than half a century one feels some admiration for Jinnah who emerges as a dignified man of moderate views, not given to communal passions and breast-beating which were characteristic of most of the Muslim politicians. This is also in sharp contrast to the role played by some of the present-day Muslim politicians who have been spearheading the movement for the recovery of Babri Masjid in Ayodhaya.

Meanwhile some of the Muslim leaders got the idea that the mosque's recovery would become legally possible if the Legislative Assembly in Punjab passed a new act to exempt mosques from the law of limitation. At the instructions of Dr. Iqbal Malik Barkat Ali, a senior advocate and an ardent suporter of the Muslim League, prepared a draft of such a Bill to be introduced in the legislature. It was to be applied with retrospective effect to make possible recovery of Masjid Shahid Ganj.

The proposed bill was publicised in such a way that many Muslim members of the Unionist Party pledged their support to it. The premier, Sir Sikandar Hayat Khan, in any case, could not remain indifferent to the goings on in the camp of Dr. Iqbal. If the trend had continued there would have been a rift in the Unionist party on communal lines, making it

Som Anand

Shahidganj dispute

IT all happened nearly 54 years ago. In India people have almost forgotten the story but in Lahore echoes of it are still heard. There had been, during the British period, innumerable disputes relating to mosques and temples but the controversy which erupted in the capital of United Punjab in 1935 was unprecedented considering the anger it generated. Recalling the events of this Lahore temple-mosque dispute of 1935 one can vary well understand the anger and tension generated by the Babri Masjid-Ram Janambhoomi controversy.

This mosque was built by one of prince Dara Shikoh's employees. There was a Kotwali adjacent to the mosque. During the Mughal period, when the Sikhs were in revolt in Punjab, this kotwali was used as a place where Sikh dissidents were brought to be punished. Thus the kotwali was witness to a lot of bloodshed.

Among the dissidents who were thus tortured to death in this kotwali was one Bhai Taro Singh whom the Sikhs revered and when they came to rule over the city in later years they constructed his smadhi at the site of the kotwali. This is how the mosque, adjacent to it, acquired the name of Masjid Shahid Ganj.

This mosque, like many other in the city, was occupied by the Sikhs often decline of the Mughal rule. Even during the British period it was not restored to the Muslims. The Sikhs used it as a community kitchen (langar) and for various other purposes. In June 1935 Sikh 'jathas' started coming to a Lahore and it was rumoured that they wanted to demolish Masjid Shahid Ganj

It seems that the British administration of Punjab was quite willing to help them in this task. This is borne out of the fact that when the Sikhs actually started demolishing the mosque and a delegation of Muslim leaders went rushing to the governor, Sir Herbert Emerson, with the request that the demolition be stopped and the mosque be given to the custody of the Archaeological Department, the governor avoided the issue.

This inflamed Muslim sentiments. The agitation continued till the beginning of 1936. In the meantime a legal defence committee was formed for the recovery of the mosque and the dispute was brought to the court of Lahore's district judge, Mr. Sale. The Muslim claim rested on the contention that according to the tenets of Islam a mosque always remained a mosque, they should be allowed to offer their prayers in Masjid Shahid Ganj.

An appeal was then made against this decision to the Lahore High Court and a full bench of the Court heard this which also rejected the appeal.

The controversy over this mosque brought communal tension to a pitch not only in the capital but also in other

history, its culture, its rituals, its tradition, *Hadis*, its law, *sharia*, its jurisprudence, *fiqh*, one always finds a non-Muslim with no sympathy with the religion and indeed in most cases no real insight into the subject, ready with his 'learned findings'. The *Encyclopedia of Islam* is full of such fallacious and incorrect observations.

This has been going on for centuries, and represent a Second Crusade against Islam, this time by the pen and not by the sword. For the most part the Muslims' own incompetence, lethargy and internecine strife and dissension, gave a golden opportunity to these anti- Muslim orientalists, who were backed by the colonialists and imperialist exploiters.

I want to tell them that times have changed and they must change their attitudes too. The modern Muslim intelligentsia is not going to put up with this intellectual arrogance and is not going to lend a passive ear to the lecturing of so called western 'authorities' on their religion, their religious practices and the history and sources of their religion. The time has come when these practices must stop, and instead of lecturing the Muslims about their own religion these 'authorities' should seek knowledge from the real sources. Cheap jibes like 'What Islam?' and 'Which sources?' do not affect the argument. One could point out that questions like these can be asked of almost any religion - Christianity, Judaism, Buddhism, Hinduism and even communism. Where will you find a monolithic, indivisible religion or 'ism' in the world adaptable to a single, indisputable interpretation? Western scholars must change their attitude to Islam or leave it alone. Enough is enough.

OO

people of Persia and indeed the people of all the countries who have preceded the advent of the last of the prophets and about whom the *shara* is silent, we should have the same attitude and belief. And to label anyone as *kafir* without any reason should not be a matter to be taken lightly at all. And the reality of idol-worship of these [Hindus] is this, they [Hindus] have carved out their images and concentrate and meditate about some angels whom by Divine decree have influence over this world, or the spirits of some perfect saints, who after relinquishing this body, have influence in this world, or some friends [of God] who in their own imagination these people [the Hindus] consider immortal like *Khizr*, Peace Be Upon him. And because of the devotion and concentration, after a lapse of time, they form a sort of relationship with the person of that image. And because of this they satisfy some of their this-worldly and other worldly needs. And this conduct [of the Hindus]has a similarity with that of the Muslim sufis' practice of *Zikr-i-rabita* (remembrance and meditation connecting one with a spiritual guide). They [Muslim mystics] try to picture their *pir* (before their mental eye) and draw spiritual benefit from this. The only difference is that they do not carve out the image of their *pir*. And in this sense they [Hindus] are not similar to the infidels of Arabia who considered their idols themselves as capable of affecting things and not consider as media of the Divine; they considered these idols as Gods of earth, and God as the God of the heavens, and this is *shirk* in the Oneness of God. And their [the Hindus]prostration is a prostration of supplication and not of worship of the Divine - just as in their custom, instead of salutation, there is prostration before their mothers, fathers, teachers and religious guides; and they call it *dandot*. It does not follow from their belief in the transmigration of the soul that this is *Kufr*."

All this discussion makes it pretty clear that Dr. Robinson neither understood the problem nor sought guidance from the writings of the relevant authorities.

And at this point it seems appropriate to speak bluntly of a general feature of Western writing on Islam.

For the past several hundred years Muslims have been addressed by self-appointed Western authorities on Islam upon what Islam is. There is hardly any field of human learning concerning Islam and the Muslims, in which the 'authoritative opinions' of non-Muslims, mostly missionaries fired with crusading zeal have not been served up to the Muslim world. Be it Islam itself, the life of the Holy Prophet, Peace Be Upon him, its customs, its

among them (in the past).]

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ

[For each nation there is a messenger]

and other verses, to India too prophets and apostles were sent and their accounts in their books are clearly mentioned and from whatever remains of these books it is evident that [the prophets of Hindus] had attained to perfection and completeness.

And Universal Divine Mercy has not overlooked the reform of His servants in this vast country. And it is well known that before the coming of the Last Prophet Peace Be Upon him, prophets were sent to each nation. And obedience to and submission to these prophets was incumbent upon those people, and obedience and conformity to the prophets of other nations was not. And after the advent of our Prophet who is the last of the prophets, Peace Be Upon him, and is sent for the whole of humanity, and his religion cancels all the religions of East and West, no one has any ground for disobeying him till the last day. Thus from the time of his advent till this day, two thousand one hundred and eighty years have passed. Anyone who does not look to him [for salvation] is a *Kafir* while the people who preceded this period [his advent] were not *Kafir* according to holy verse:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

[We did a foretime send
Apostles before thee: of them
There are some whose story
We have related to thee,
And some whose story
We have not related to thee.. (S.XL, A.78)

[Allama Yusuf Ali in his note to this *ayah* says:
"God sends messengers of His Truth to every people. There are some whose names are known to us through the holy Quran, but there are a large number whose names are not made known to us through that medium. We must recognise the Truth wherever we find it."]

concerning most [former] prophets there is no comment; thus it is better for us to observe silence about them. Neither are we obliged to consider their followers as infidels nor are we obliged to bring about their destruction; nor we are obliged to cherish the belief of their deliverance, and it is well supported that one should think well of them and that bigotry should not enter into it. Concerning the

based the principles of faith on that and they called the knowledge of this process the laws of religions [*dharma shastra*] — in other words the art of religous beliefs which is a sort of *llm-i-Kalam*. They classified the human race into four groups and deriving four different codes of conduct from that book they assigned each to a particular group. And they based the details of conduct and behavior on it [*darma shastra*] and called this art as the laws of conduct [*Karma shastra*] — in other words laws governing behaviour which are like *fiqh*. They do not believe in the abrogation of religious laws, and since according to the dictates of reason and of men's temperaments changes in the man's conduct and behaviour during each period of time is inevitable, they divide the long life of the world into four periods. Each period is called *yug* and for each of the four *yug* the laws of human conduct and behaviours are deduced from these four volumes. Whatever interference and changes their predecessors have made, are without authority and without value. All their sects believe in the Unity of God [*tauhid*] and consider the world as His creation and as perishable. And they [Hindus] believe in the final annihilation of this world and in the resurrection of human beings and in the punishment and reward of bad and good actions. And these people [Hindus] have acquired an excellence in the learning of philosophical and traditional sciences, in ascetic practices and strivings and in the search for truth and reality and divine revelation, and their libraries are extant even today. And their custom of idolatry is not due to their belief in *shirk* [partnership in Divinity] but has another explanation.

The wise sages of these people [Hindus] have divided the whole span of human life into four parts. The first part is for acquiring knowledge and proper behaviour. The second is for earning a living and raising a family. The third is for learning right conduct and behaviour and for purification of the self. The fourth is for practising severance of worldly connections and leading a secluded and celibate life (which is the apogee of human achievement) and final deliverance which they call *maha mukti*. And the rules and regulations of their religion are fully codified. Thus we know that the religion was codified and now stands abrogated. And in the *shariat* [the Islamic law] no other abrogated religion is mentioned except the religions of the Christians and the Jews, though many religions are abrogated, and many religions were either confirmed or cancelled. And one should know that according to the holy verses:

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

[And there never was a people, without a warner having lived

such time as a man named *Vyas* was born, and at the instigation of *Satan* has completely destroyed their religion and made current idolatry and *shirk* [belief that others share in divine powers with God]. After that all the Hindus became *mushrik* [believers in *shirk*] and started worshipping the manifestations [of God] *surat parasti*. Indeed there have been different religious codes for different communities among them [castes] like Kayat [Kayasths] and Mahajan and Khatris, from ancient times. And a parallel could also be found in our ancient religious codes. For instance each branch of the Israelites adhered to a special set of commandments. Further in our own religious laws *(sharia')* Bani Hashim are entitled to *Khums* and forbidden to accept *zakat* or charity,and all the Quraish are distinguished by possession of the right of *Khilafat*; and there is no *jazia* for the *mushrikin* of the Arabs - Do not accept from them anything except (acceptance of) Islam or sword. In short the incarnations, *avatar*, of the Hindus were the manifestation of Divinity, whether it be manifested in a human being or a lion or a fish - like the staff of Hazrat Musa [Moses] or the camel of Hazrat Saleh. But the common folk among these people [Hindus]because of their lack of understanding did not distinguish between the manifestations [created beings] and the manifestor [the Creator] and made all of them the worshipped one [*ma'bud*] and thus fell into the abyss of perdition. And the same is the state of many groups of the Muslims like the people who construct *ta'zia* and the attendants at the tombs and (the followers of) *Jalaliyan* and *Madariyan*. Only God is the real knower of the truth. The End.

FATWA OF MIRZA MAZHARJAN-I-JANAN

It was asked whether the non-Muslims [*kuffar*] of India, like the Arabian *mushrik* have a baseless religion or whether they had a true religion which was abrogated; also what should be believed about their predecessors. On the basis of research and fair dealing [1] write concisely:

One should know that whatever is known from the ancient books of the Hindus is that at the time of the creation of the human race Divine Grace, for the reform and well being of their living [on this planet] and in life after death, sent a book named *Veda* in four volumes comprising decrees about right and wrong, permissible and forbidden things and information about the past and the future, through an angel named *Brahma* who is instrumental in the creation and destruction of the world. And their [the Hindus] religious guides [*mujtahid*] derived six religions from that book, and

Answer: The inferece from the Quranic verse: وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا
فِيهَا نَذِيرٌ (S. 35, A. 24)

[And there never was a people, without a warner, having lived among them (in the past)] is this, that to every people نذیر (warner from evil) have been sent who deter people from vice and from violating [human] rights. such warners may have been prophets or learned people (*ulama*), or preachers, or saints, or gnostics (*'urafa*). And if one investigates the account of different [nations] such as Rum, Abyssinia and Turkistan and <u>Kh</u>ata and <u>Kh</u>utan, one does not find any trace of prophets that may have been among them. On the other hand [the people of these nations] do not even understand the meaning of the word *nabi* (prophet). Belief in their [i.e. of the above-mentioned sages] greatness and the high esteem of their worship and in pious people and those who forsake the world and recluses, is quite firm in their hearts. God's dealing with each sect is different, depending upon its capacity to receive [what He sends] and upon their different sources of knowledge. In the Arab world, from Yemen to Syria and Egypt, Divine guidance was manifest in one manner. [God] appointed apostles and prophets, and bestowed upon them the power to work miracles, and gave them books. The 'knowledge of the unseen' علم غیب may have come to some of the people through some other people but because of the distance in time or in space, the people of these territories recognised the 'knowledge of the unseen' علم غیب only in this manner; a messenger comes and delivers the message verbally or brings a written espstile with him; and indeed these people demanded form the messenger a proof of the validity [of his claim]. And indeed among the present day nobles, kings, and *sultans* the same procedure is established. They despatch a *firman* or a royal decree by the hand of some trusted person and as a proof of its authenticity some things such as a palanquin, an elephant or an army accompany him. Thus for the people of these territories, that is the Arab world, the mode of guidance was established in this way. For the Hindus this mode was not a reliable one. But they reconginsed the manifestation of the Divinity in some things and also [its manifestation] in speech or words of the Divinity itself, and also in the performance of actions attributed to Divinity and miracles, and sovereignty over the population, as the viceregency of the Divinity among the people. [As such was the manner of the understanding of the Hindus] thus the dealings with them were also fashioned accordingly. Thus they were given instructions and for a long time their guidance depended on such a pattern, as is evident from the book of Yog Bashist and the Ramayan and Bhagavat [Gita] until

I have written a *tazkirah* of *Hazrat Sayyid Sahab* of *Bansvi* which was publish two or three years ago. In this, from page 275 for ten pages, under the caption of "The Saints of Former Times", I have discussed it in some detail (with reference) [in fact the whole chapter runs into more than twenty pages- KHQ].

To the best of my knowledge the following gentlemen in London possess a copy of "*Tazkirah Hazrat Sayyid Sahab Bansvi*" by me; if you wish to consult it yourself you may get in touch with any one of them:

1. Dr. Francis Robinson (Holloway College) 2. Prof. Ralph Russell 3. Mian Mahmud Abdul Bari Ansar (son of Maulana Jamal Mian Sahab)

I hope these few lines would be enough for your inquiry.

Are you related to Maulana Hamid Hasan Qadiri Sahab?

Praying for you,

Mohammmad Raza Ansari

(This letter is undated but the PO stamp of Lucknow gives the date 11 Nov. 1988).

Since Maulana Raza Ansari referred me to the *Tazkirah*, I proceeded to obtain a copy, and after much effort got one by the courtesy of Mahmud Mian. In the chapter to which Maulana Raza Ansari referred he has fully and exhaustively dealt with the problem under discussion, and it was a matter of satisfaction to me that he has taken the same view as I hold. He has referred to two *fatwas* of two very eminent mystics and scholars of their times, Mirza Mazhar Jan-i-Janan and Shah Abdul Aziz Dihlavi. Their famous *fatwas* on the subject - the apostles of the Hindus - have always been known to Muslim scholars and frequently referred to, but they have never been translated fully even in Urdu. In view of their importance I give here these two *fatwas* in full in English translation.

FATWA OF SHAH ABDUL AZIZ

Question: Constant reports, accounts and indications make i abundantly clear that in India there have been many (*avatar* incarnations of God whom some Hindus have regarded as th Creator and others as their guides. And there have also been king of great power, glory and following. From the beginning of creation what prophets have been sent to these people? And what book ha been given for their guidance, either in an Indian language or an other language? Was such a book sent to (these people) or was it not And if the answer is in the negative then what is the reason for it?

wrote:

"Hazrat Shri Krishan ji Peace Be Upon Him, the Prophet of India"

حضرت سری کرشن جی علیہ السلام پیغمبر ہندستان

at another place he writes:

حضرت سری کرشن جی علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے...

[As regards to Hazrat Sri Krishan, Peace Be Upon Him, this *faqir* (Hasrat) follows the path of love of my *pir* and the *pir* of all *pirs*, Hazrat Sayyid Abdur Razzaq Bansvi...]

Can it not be deduced from all this that among all the prophets and apostles that God sent to India in ancient times, hundreds and thousands of years before the advent of Islam, according to him [Hasrat] Sri Krishanji's name is also included?

I request you kindly to give me the benefit of your august opinion.

Maulana Mufti Raza Ansari's reply:

Dear Mr. Qadiri,

Not only did the late Hasrat Mohani believe in the coming of prophets to India; every Muslim who believes in the Holy Quran does so. To every land of God an apostle or a prophet has been sent (and in this general principle the particular instance of India is also included).

In the *Quran-i-Sharif* the mention has been made numerous times of sending a *nazir* (warner) to "every hamlet" or "every nation" or"every town". After mentioning the Holy names of the glorious prophets of different lands the *Holy Quran* says:

"We have told you the names of some prophets but there are other prophets whose names we have not told you."

From these passages the only conclusion that can be drawn is that to India too, before the advent of the Last Prophet (Peace Be Upon Him and His Progeny and upon His companions), prophets and apostles were sent whose names we do not know. Elders of the *ummah* who were endowed with *kashf* (spiritual insight and revelation)and *Karamat* (non-prophetic miraculous powers) have even indicated the places where the prophets of India had their tombs, now obliterated. These include Hazrat Mujaddid Sahab, Alf-i-Sani, Maulana Shah Abdul Aziz Dihlavi, Hazrat Mirza Janjanan; and during our period, Shaikh-ul-Hadis Maulana Zakaria Sahab and Maulana Ashraf Ali Thanvi too believed this.

Now some unkind but not unfounded observations. I may or may not be right, but I suspect that these "authorities" and "scholars" are allergic to the use of the expression the prophets of the Hindus. If some innocuous words like saint, holy person, spiritual guide or religious leader had been used for Sri Krishan instead of "prophet of India", I suspect that these susceptible "authorities" would not have raised their eye brows. They cannot reconcile their sentiments with the basic truth of the matter. If that is the case, so be it. Hasrat in his characteristic manner, without fear or favour, used just this expression, and moreover inspired readers of, and writers in, his magazine *Urdu-i-Mualla* to write a full length article using this very title. That was the measure of the strength of his conviction, a conviction which is sadly lacking in present-day 'scholars' and 'authorities'.

As the learned scholar, Dr. Robinson specifically mentioned Maulana Mufti Muhammad Raza Sahab Ansari Farangi Mahli's name and quoted his authority to 'refute' an irrefutable fact, I considered it only fair to consult the Maulana and to seek his opinion about it.

Without any previous acquaintance or introduction, I wrote a short letter simply asking the question. I must record my profound gratitude to him for very promptly replying to my letter.

Those who have had the unfortunate experience of contacting and consulting officials or scholars in South Asia will concur with me that this quality -- a prompt reply -- is not in the nature of the scholars or authorities of that part of the world. Even libraries, booksellers and publishers do not bother even to acknowledge the receipt of any letter, let alone reply to it. You direct an inquiry to them and wait until eternity, hoping for a response that never comes. Hence my gratitude to the Mufti Sahab.

I give a literal translation of both the letters here. The inquirer after the truth can make up his own mind. The truth of the matter remains unchanged; it is as I have stated it.

My letter to Maulana Mufti Raza Ansari Sahab (dated 29 Oct. 1988):

Dear Sir,

I apologise for any inconvenience and approach you with an inquiry on question of doctrine.

In connection with Maulana Sayyid Fazlul Hasan Hasrat Mohani, I have noticed in a few places in his own writings that he believed in the coming of prophets to India. For instance, at one place, while mentioning certain names in dedicating his *divan* he

certainly not only read these words but, we assume, appreciated Hasrat's verses too, because Hasrat always presented his compositions, writings and publications to his *pir khana* (the house of his spiritual guides). There is not a single word of Maulana Abdul Bari, either written or oral, expressing disapproval of Hasrat's views - either of Hasrt's own views regarding Sri Krishan or of his ascribing these views to Maulana Abdul Bari's father, Shah Abdul Wahab Sahab Farangi Mahli. Moreover, Hasrat's statement that Sri Krishan was a prophet of India and that his *pir* Shah Abdul Wahab Farangi Mahli and head of his mystic order, *pir* of *pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) also held the same view appeared in 1923; and in all the sixty six years that have elapsed since then not a single person (including the Farangi Mahlis) has dared to point an accusing finger at him.

To conclude: no authority, either in the west or in the east, can alter the fact that in the light of the clear verses of the Glorious Book, *Quran-i-Majid* Muslims believe that God did send His prophets to all nations and all lands. All the mystics in the Indian subcontinent also, undeniably, believe that God did send His prophets to India. The remarkable feature of Bansa Sharif and Farangi Mahlis' mystics has been that, while other mystics stop short of naming any of these prophets, these have clearly given Sri Krishan's name. Finally it is highly significant that not a single person, throughout this long period of history, either among the mystics of other orders or even among the *ulama*, who are supposed to be more rigid, inflexible and firm in all such matters, has ever raise any objection to Shri Krishan's name being mentioned in this connection or issued any *fatwa* censuring those who have done so.

If today any person disapproves of the linking of the name of Farangi Mahal or Bansa Sharif with such ideas then he should say clearly that he is not concerned with the views of the elders of either Bansa Sharif or Farangi Mahal and he himself does not share these views. But no-one has any authority whatsoever for saying that Hasrat, his *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) and his *pir* of *pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) did not consider Sri Krishan as *Nazir* (نذیر) sent to India.

This may or may not "transform our understanding [or misunderstanding ?] of the relationship between these representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in the eighteenth and nineteenth-century Awadh." But the truth is too sacrosanct to be tampered with to meet the wishes of any scholar.

groups or individuals may differ in this practice in their own limited way; but the general statement holds true, particularlv in the school of *tariqat* and *shariat* to which Hasrat and his *pirs* belonged. Thus Hasrat not only used علیہ السلام indicating that Sri Krishan was a prophet but more emphatically and clearly added the words پیغمبر ہندستان i.e. prophet of India.

Then again in a short preface to his seventh *divan*, as I stated on page 18 of my book, he very clearly and unambiguously says:

حضرت سری کرشن جی علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے...

[Regarding Hazrat Shri Krishana (peace be upon him)
I am a follower of the path of love of my *pir* and *pir* of *pirs*
Hazrat Sayyid Abdul Razzaq Bansvi]

These two clear statements, taken together with other references elsewhere in his prose and poetry (to some of which I have made reference, with English translations), make Hasrat's position so clear that no discussion is needed on this point. Any statement or views, no matter how 'authoritative', that runs counter to it, is, so far as Hasrat's own views are concerned, valueless. No authority can challenge this statement of Hasrat's position. There are two more points to be taken into consideration.

Firstly Hasrat has clearly stated that his *pir* (Shah Abdul Wahab) held the same attitude towards Sri Krishan as Hasrat himself. His words can have no other meaning. How can anyone claim that Hasrat was misinformed about the opinions and attitudes of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli)? Hasrat does not content himself with speaking of the belief of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) but goes right to the top, to the leader of spiritual order; to the ".. *pir* of all the *pirs*, Hazrat Syed Abdul Razzaq Bansvi...". Will any 'authority' dare to claim that Hasrat was either unawere of or was deliberately misquoting and misjudging the attitudes of the great spiritual guide of his own mystic order, Hazrat Shah Abdur Razzaq Sahab of Bansa Sharif? One may disagree with Hasrat's position and censure him for his beliefs about Sri Krishan but that is debatable and falls outside our scope of present discussion. Though we shall see that no-one has done it.

The second point is this: when Hasrat wrote these words in the preface of his seventh *divan* in 1923, the head of Farangi Mahlis at that time, the great spiritual leader and guide of this mystic order and the illustrious son of Shah Abdul Wahab Sahab Firangi Mahli, Maulana Abdul Bari Farangi Mahli was still alive. He most

that in the early twentieth century, Maulana Abdul Bari of Firangi Mahal wrote of Shah Abdur Razzaq of Bansa inspiring Hindu *faqirs* to the extent that they succeeded in meeting Krishna (*Fuyuz-i Hasrat-i Bansa*, Lucknow, 1345 A.H.,128), but that this was far from saying that the saint of Bansa believed that Krishna was prophet. Perhaps the author has evidence for his assertions, in which case he should refer to it. As matters stand, he would appear to be trying on his authority, and no other, to transform our understanding of the relationship between the representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in eighteenth and nineteenth-century Awadh. (*The Bulletin of the School of Oriental and African Studies*)

The whole problem has three facets, First is the basic question: what does Islam say about apostles being sent to India and the Indian people?

Secondly, what are Hasrat's views and what does he believe and profess?

Thirdly, what are the views of the saints of Bansa Sharif and the elders of Farangi Mahal; and indeed other saints and sufis?

The first question has been dealt with adequately in the first chapter of my book, where I have shown with reference to very clear verses of the Holy Quran that Islam clearly states that God has sent His prophets to all nations and all lands. India, obviously, is no exception. God's apostles were sent to India, and no authority can change or alter this fact. This is why sufis of all orders, without actually naming persons or places [as in the case of Hazrat Mujaddid Alf-i-Sani] have affirmed this. This point is so clear that it needs no elaboration or discussion, and is beyond dispute.

Now the second question, which is more closely relevant to our purpose. Hasrat, in his poetry and prose, has very clearly stated that he considers Sri Krishan as an apostle of God sent to India in pre-historic times, and that his (Sri Krishan's) message was that of LOVE.

In the dedication of his *divan* he has referred to Sri Krishan as

سری کرشن جی مہاراج علیہ السلام پیغمبر ہندستان

As everybody knows different phrases like رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ and so on, with slight variations, in essence mean the same thing and conventionally have come to be used for particular groups or categories of holy personages. Thus علیہ السلام conventionally and popularly is used only after the names of holy persons whom Muslims consider to be prophets of God. There may be exceptions, and minor

Ahmad Sirhindi, who is generally called the *Mujaddid Alf-i-Sani* (the Renewer of Islam at the beginning of the second millennium of the Islamic era) has written on this point. In a letter (number 259) addressed to Khwaja Muhammad Sa'id he says, '... Reviewing of the position of nations of the past, it seems evident there is hardly any land to which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which apparently lacks any such distinction, I feel that prophets have been sent here too.... And in certain cities of India it seems as if the light of the prophets gleams like a torch in the darkness of *shirk* [polytheism]; and if I wished I could name such cities...."

From this attitude the question naturally arises as to whether one should seek the prophets sent to India in the past among the figures of Indian mythology. On this point all except a few of the Muslim theologians of India are silent. They must have felt a natural reluctance to see Hindu demi-gods as prophets. But there have been some *Sahib-i-Kashf* (saints who have received spiritual illumination) who quite clearly believe that Krishna was one of the Indian apostles, and, moreover, very prominent among them.

But it seems that there are some who have failed to grasp the problem and to understand its full significance. Thus one learned scholar, an expert on Islam and its history in South Asia, Dr. Francis Robinson writes:

"There are unsupported assertions that are plain wrong. Take two examples. 'A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides', we are told on page 15, 'was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. 'If this were true, it would be of considerable significance, but there is no evidence for it in anything the *'ulama'* of Farangi Mahal have written or said. Again he asserts (p.16) that Saiyid Shah Razzaq of Bansa, to whom many Firangi Mahalis owed allegiance, held similar beliefs about Krishna and that there are several stories to this effect in his *malfuzat*, the *Manaqab-i Razzaqiyah* by Mulla Nizamuddin of Firangi Mahal (died 1748). But there is no mention of Krishna anywhere either in the original work or in the later editions of it. This understanding, moreover, is confirmed in a communication of 15 August 1986 from Mufti Muhammad Raza Ansari of Firangi Mahal, who is the leading expert on the sources for the Firangi Mahal and Bansa families, and who also goes on to say

The question of the prophets sent by God in historic and prehistoric times to the subcontinent of India has given rise to some controversy, and to still more misunderstanding. The matter is adequately dealt with in Chapter I of my book, Hasrat Mohani, Delhi, 1985. What I said there is as follows:

> A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. The idea that God had sent His prophets to India long before the coming of the Muslims was not a new one. Muslim thinkers in India had struck by such verses of the Qur'an as the following:
>
> And the Unbelievers say:
> "Why is not a Sign sent down
> To him from his Lord?"
> But thou are truly
> A warner, and to every people
> A guide.[1]
>
> Never did We send
> A warner to a population
> But the wealthy ones among them
> Said: "We believe not
> In the (Messenger) with which
> Ye have been sent".[2]
>
> Never did We destroy
> A population, but had
> Its warners.[3]
>
> These are only some of the verses to this effect. In the light of these verses no Muslim thinker could fail to see that a country with so vast a population as India could not have been without its true apostles. Thus the famous 16th-17th century mystic, scholar and religious philosopher, Shaikh

1. Sura XIII, Ayah 7, trans. 'Abdullah Yusuf Ali. Lahore, n.d. pp. 604-5.
2. Sura XXXIV, Ayah 34, trans. 'Abdullah Yusuf 'Ali, Lahore, n.d., p. 1145.
3. Sura XXVI, Ayah 208, trans, 'Abdullah Yusuf' 'Ali, Lahore, n.d. p. 971.

Dr. K.H. (Khalid Hasan) Qadiri

(son of famous scholar Late Prof. Hamid Hasan Qadiri)

Presently working in Deptt. of Urdu,

London School of Oriental and African Studies.

Writer of epock-making book "Hasrat Mohani".

THE PROPHETS OF INDIA

By
Dr.K.H. Qadiri,
London

Printer	:	Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi.
Publisher	:	Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 650109, Telex: 22-430 KBL IN)
Editor	:	Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	:	Rs. 300/- (Inland) U$ 60 (Asian Countries) US 120 (Other Countries) Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-

CONTENTS

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

63—68

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

63------68

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA